عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر

(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

مقالہ نگار:

روبینہ شاہین

ایم اے (اردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

(اردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اپریل ۲۰۰۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ایڈوانس انگریجوایٹ سٹڈیز اینڈ ریسرچ کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

پیش کار: روبینہ شاہین رجسٹریشن نمبر: 332-Ph.D-urdu-2005

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان وادب اردو

ڈاکٹر رشید امجد ....

نگران مقالہ

ڈاکٹر شذرہ منور ....

ڈین فیکلٹی آف ایڈوانس انگریجوایٹ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

ڈاکٹر عزیز احمد خان ....

ریکٹر

....

تاریخ

اقرار نامہ

میں ،روبینہ شاہین، حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رشید امجد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

روبینہ شاہین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ،اسلام آباد

اپریل ۲۰۰۹ء

تصدیق نامہ

روبینہ شاہین نے اپنا مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو) ''عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' میری نگرانی میں لکھا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی اور تنقیدی دونوں حوالوں سے پی ایچ۔ڈی کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ اس مقالے کو جانچ کے لیے بیرونی ممتحنین کو بھجوایا جائے۔

ڈاکٹر رشید امجد

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالے کا دائرہ کار

اس مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی تعریف و فرق پر بحث کی گئی ہے۔ داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ افسانوی نثر میں شامل ہیں اور باقی تمام اصناف مثلاً سیرت، سوانح، مضامین، انشائیہ، مقالہ، تاریخ، صحافت، مکتوبات وغیرہ غیر افسانوی نثر میں شامل ہیں۔ سیاسی و سماجی پس منظر پیش کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون سے حالات و واقعات تھے جن کے پیش نظر شرر نے غیر افسانوی نثر لکھی۔ مختلف تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ جان سکیں کہ ان تحریکوں نے شرر کے فن پر کیا اثرات مرتب کیے۔ شرر کی حیثیات، ادبی زندگی کا آغاز جیسے موضوعات بھی پہلے باب میں شامل ہیں۔ دوسرا باب عبدالحلیم شرر بطور سیرت و سوانح نگار کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اس باب میں سیرت و سوانح نگاری کے آغاز و ارتقاء اور شرر کی سیرت و سوانح نگاری کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب شرر بحیثیت مضمون و انشائیہ و مقالہ نگار کے طور پر لکھا گیا ہے۔ مضمون و انشائیہ کے آغاز و ارتقاء اور شرر کی مضمون نگاری کی خصوصیات، ان کے انشائیوں کے موضوعات و اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم عبدالحلیم شرر بطور مورخ و رپورتاژ نگار و نقاد کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ فن تاریخ نویسی ایک مطالعہ، عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی کے محرکات و مقاصد اور ان کی تاریخی کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہم عصر مورخوں میں ان کا مقام و مرتبہ اور بطور رپورتاژ نگار و نقاد جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

باب پنجم شرر بحیثیت صحافی کے لکھا گیا ہے۔ صحافت کا آغاز و ارتقاء شرر کا صحافتی زندگی کا آغاز اور ان کے مختلف رسائل و اخبارات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو صحافت میں شرر کے مقام و مرتبہ وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

باب ششم عبدالحلیم شرر بحیثیت مکتوب نگار اور ان کا اسلوب کے موضوع پر مشتمل ہے۔ خطوط نگاری آغاز و ارتقاء، شرر کے خطوط اور ان کے موضوعات، شرر کی شخصیت خطوط کے آئینے میں اور ان کے خطوط کی اہمیت و افادیت شرر کا اسلوب جیسے موضوعات شامل ہیں جب کہ آخری باب مجموعی جائزہ پر مشتمل ہے۔

ABSTRACT

RESEARCH AND CRITICAL ANALYSIS OF ABDUL HALEEM SHARER'S NON FICTION PROSE

This thesis has been divided into seven chapters. Definition and difference between novel and non fiction prose has been deliberated upon in the fist chapter. Story, novel, drama and tale are part of non-fiction prose. And remaining all kinds like, Seerat, biography, subjects, diction thesis, history, journalism, books etc are included in non-fiction prose. In retrospect, political and social aspects have also been highlighted so as to ascertain the events and circumstances that led Sharer to write non fiction prose. Certain movements have been mentioned to identify their effects on Sharer's skills. Topics like beginning of Sharer's literary life and his abilities are also included in the first chapter.

Second chapter deals with Abdul Haleem Sharer as a biographer. Commencement and evolution of biography and research and critical analysis of Sharer's biography as been carried out in this chapter.

Third chapter discusses Sharer as an essay, composition and dialogue writer. Beginning and evolution of essay and composition and Sharer's relating skills have been researched and analyzed. Distinctiveness in essay writing, dialogue writing, composition writing, the topics and writing style of Sharer has also been evaluated.

Sharer has been a great historian and critics. A study of history writing is an art. Motives and objectives of Abdul Haleem Sharer's historical writings and history books written by him have been analyzed in depth. His rank and standing amongst the contemporary historians have also been discussed in the fourth chapter.

Fifth chapter relates to Sharer as a journalist. Beginning and evaluation of journalism, Sharer's life as a journalist and research and analysis of various papers & periodicals has been carried out. Discussion on Sharer's standing in Urdu journalism has been discussed here.

Sharer's style and protocol as a book writer is quite persuasive. Evolution of letter writing has been briefly touched upon in chapter six. Sharer's letters, topics of effects letters on his personality in the light of these letters, its significance etc have been included in this chapter.

Seventh, the last chapter summarizes Sharer's contribution towards Urdu literature. Beyond doubt, Sharer's contributions can be termed as consecration in the realm of literary circles.

مقالے کے مقاصد

یہ تحقیقی مقالہ عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر کے حوالے سے اس بنیادی مسئلے کا محققانہ اور ناقدانہ تجزیہ ہے کہ شرر کی غیر افسانوی نثر بھی اتنی اہمیت کی حامل ہے جتنی کہ ان کی افسانوی نثر۔

عبدالحلیم شرر (۱۹۲۶ء۔۱۸۶۰ء) اردو ادب کا ایک اہم نام ہیں۔انہوں نے ناولوں کے ساتھ ساتھ سیرت وسوانح، مضمون وانشائیہ ومقالہ، تاریخ اور بطور مدیر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں پر مختلف پہلوؤں سے تحقیقی وتنقیدی کام ہوا ہے۔لیکن ان کی غیر افسانوی نثر پر کوئی مربوط کام اس طرح سامنے نہ آیا جس طرح آنا چاہیے تھا۔اس مقالے میں عبدالحلیم شرر کی سیرت نگاری، سوانح عمریاں، مضامین، انشائیہ ومقالہ، تاریخ نگاری، مکتوب نگاری اور اخبارات ورسائل کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس طرح شرر تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔اسی طرح ان کی غیر افسانوی نثر بھی اسلوب و مواد دونوں حوالوں سے انفرادیت کی حامل ہے۔شرر کو تاریخی ناول نگاری کی ہیئت، تکنیک پر زبردست گرفت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔یہ صورت حال ان کی غیر افسانوی نثر کی بھی ہے جس طرح عبدالحلیم شرر نے اپنے تاریخی ناولوں میں ہیئت اور تکنیک پر بہت توجہ دی۔اسی طرح ان کی سیرت کی کتب، سوانح عمریاں، مضامین، انشائیے، مقالے، تاریخ، خطوط اور بحیثیت صحافی ان کا فن بھی اپنے فنی لوازمات پر پورا اترتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور انہیں دکھ تھا کہ مسلمانوں کی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں اس کیفیت کو انہوں نے ناول نگاری کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچایا۔اگر چہ شرر کو تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔لیکن ناولوں کے علاوہ انہوں نے وہ کام کیے جنہوں نے اردو ادب میں ان کی مختلف حیثیتوں کو مستحکم کیا ہے اور انہیں بطور نثر نگار کے متعارف کروایا ہے۔شرر کی بہت ساری حیثیات ہیں۔ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ادراک ان کی غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے ہوتا ہے۔وہ نئی تہذیب کے مخالف نہ تھے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی تہذیبی اقدار کو برقرار رکھنا چاہیے۔اس کے ساتھ ہی ان کا نقطۂ نظر یہ بھی تھا کہ اپنے زمانے کی نئی نسل اور بعد والوں کے لیے اسلامی ثقافت کو محفوظ کیا جائے۔ایک طرف آپ نے افسانوی نثر لکھی اور دوسری طرف غیر افسانوی نثر کا سلسلہ شروع کیا۔جس کا مقصد اپنے عہد کی نئی نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کی یہ قدریں ہمیشہ محفوظ رہیں۔

مضامین شرر کے حوالے سے شرر کا نظریہ حیات اور اسلامی تاریخ و ثقافت سے ان کی واضح وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔سوانح عمریوں کے انتخاب میں بھی ان کی پسند کا اظہار ہوتا ہے۔ سیرت نگاری کے حوالے سے شرر کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ادراک ہوتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے اسلامی تاریخ کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ انہی کا کام ہے۔ بحیثیت صحافی انہوں نے اپنے فن کا اظہار جس طریق سے کیا ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔

شرر کی سوانح عمریوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں ایسی شخصیات کا تذکرہ ہے جن سے ایک پورے عصر کی ترجمانی ہوتی ہے۔شرر کے سوانحی مضامین اور مشاہیر اسلام کا سلسلہ مجموعی قسم کی سوانح نگاری کی ترقی میں بہت مدد و معاون ثابت ہوا۔

عبدالحلیم شرر نے اخبارات و رسائل بھی نکالے اور اپنی سوچ و نظریات کو عوام الناس تک پہنچایا۔ بحیثیت مورخ آپ نے اسلامی تاریخ، گزشتہ لکھنو، سندھ کی تاریخ پر قلم اٹھا کر اپنے فن کا اظہار کیا۔ان سب اصناف کا جو غیر افسانوی نثر پر مشتمل ہیں اس مقالے میں تنقیدی و تحقیقی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر چہ شرر کی بنیادی حیثیت تو ایک تاریخی ناول نگار کی ہے مگر نثر کے شعبے میں انہوں نے دیگر اصناف میں بھی اپنی تخلیقی اپج کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کا امتیاز اپنی انفرادیت کے ساتھ تاریخی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ ہمارے لیے اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کی بیشتر غیر افسانوی نثر اسلامی تہذیب و تمدن اور تاریخ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اس عہد میں ان کی غیر افسانوی نثر اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے۔ بلکہ اسلوب کے اعتبار سے ایک ایسا نیا تخلیقی منظر نامہ بناتے ہیں جن کے عناصر بعد میں آنے والوں کے لیے بعض سطحوں پر رہنمائی کا وسیلہ بھی بنے ہیں شرر نے غیر افسانوی نثر کو کئی ہیئتوں میں لکھا ہے یوں شرر کے ہاں ہمیں غیر افسانوی نثر میں تکنیکی سطح پر جدتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ غیر جانبدارانہ انداز میں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ غیر افسانوی نثر میں شرر کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس مقالے میں عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر کا جائزہ اس طرح لیا گیا ہے جس سے ان تمام اصناف اور ان کے مقام کا تعین بھی ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے شرر کی غیر افسانوی نثر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سامنے آنے والے حقائق کو تمام دلائل کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔یوں امید ہے کہ اردو زبان و ادب کے مقام و مرتبہ کے تعین میں نکلنے والے مستقبل کے محققین کو زیادہ بہتر مواد و معلومات میسر آئیں گی اور دلائل کی مدد سے مباحث اور تحقیقات کے امکانات سامنے آئیں گے۔امید ہے کہ یہ تحقیق عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر کے مقام و مرتبہ میں پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

اظہار تشکر

سب سے پہلے میں اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں جو اس پوری کائنات کا خالق ہے۔تمام علمی وفکری سر چشموں کا مالک وخود مختار بھی ہے۔اس مقالے کے پایہ تکمیل پر میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہوں کہ جس نے مجھے حرف وقلم سے رشتہ استوار کرنے کے قابل بنایا، یہی وہ ذات ہے جس نے مجھے ہمت، حوصلہ اور ثابت قدمی عطا کی۔اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کا کرم میرے شامل حال نہ ہوتا تو میں ہرگز یہ کام نہ کرسکتی۔ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔خدا کی محبوب ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکور ہوں کہ جن کی بدولت مجھے عرفان علم ملا، جن کی رحمت میرے ساتھ رہی۔

اپنے مقالے کے نگران ڈاکٹر رشید امجد کی بے حد مشکور رہوں کہ جنہوں نے خاکے کی تیاری سے لے کر تکمیل مقالہ تک کے مراحل کو میرے لیے آسان بنایا۔ان کی مہربانیوں، کرم نوازیوں اور رہنمائی کے شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں جو میں ادا کروں۔انہی کے بہترین مشوروں اور حوصلہ افزائی کی بدولت مقالہ نویسی کا ہر مرحلہ بخیر وخوبی انجام تک پہنچا۔استادگرامی نے علم و دانش کے دروازے میرے لیے وا کیے رکھے انہی سے میں نے فکر کی روشنی مستعار لی۔ میں اپنے استاد محترم کو دل کی گہرائیوں سے سلام عقیدت پیش کرتی ہوں کہ جنہوں نے مجھے مقالہ لکھنا سکھایا۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ریکٹر جناب ڈاکٹر عزیز احمد خان کی بے حد مشکور رہوں کہ جنہوں نے تحقیق کے دروازے مجھ پر وا کیے۔ڈاکٹر سعیدہ اسداللہ، ڈاکٹر شندرہ منور صاحبہ کی بھی بے حد ممنون ہوں۔

ڈاکٹر آفتاب، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر نوازش علی، پروفیسر احمد جاوید، پروفیسر رفیق بیگ، ڈاکٹر عابد سیال ، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر حافظ نعیم، ڈاکٹر روبینہ اور ڈاکٹر فوزیہ صاحبہ کے قیمتی مشوروں اور تجاویز کا شکریہ۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جو کہ بڑی ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔انہیں پنجاب یونیورسٹی میں اپنی دوست فریحہ کے ساتھ جب اپنی آمد کا منتظر پایا تو احسان مندی کے جذبات نے مجھے پگھلا کر رکھ دیا۔دل کی گہرائیوں سے ان کی مشکور رہوں۔ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، پروفیسر فتح محمد ملک کی بھی بے حد مشکور رہوں۔

میں اپنے مرحوم والدین کی بھی مشکور رہوں کہ جن کی شفقتوں اور محبتوں نے علم کے دریچے میرے لیے وا کیے۔انہی کی دعاؤں کے طفیل آج مجھے یہ مقام ملا ہے۔میرے رب نے میرے والدین کی دلی خواہش کو پورا کیا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میں اپنے مرحوم والدین کی نذر کروں۔اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند کرے کہ جنہوں نے میرے لیے علم کا دیا روشن کیا تھا۔

اپنے جیون ساتھی ملک عنایت علی خان (ایڈووکیٹ) کی شکرگزاری کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ جن کیا حسانات کے بوجھ تلے میں دبی ہوئی ہوں۔انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اپنے قیمتی لمحے میری نذر کیے،

لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد کی مختلف لائبریریوں تک لے جانے، کتب کی فراہمی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ ان تمام مراحل پر اگر مجھے عنایت صاحب کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو تحقیق کے مرحلے میرے لیے دشوار ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر دے۔

اپنی بڑی بہن ملکہ خاتون کی تہہ دل سے مشکور ہوں جس کی علم دوستی نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ اپنی بہن امتیاز بیگم اور ان کے اہل خانہ کی مشکور ہوں کہ جنہوں نے میرے حوصلے بڑھائے، میں اپنے بھانجوں جمال احمد، جنید اقبال، مزمل علی خان مہوش اور رجا جاوید کے لیے دعا گو ہوں کہ جن کی محبتیں میرے ساتھ رہیں۔ خاص طور پر اپنی بیٹی اروما ایمان فاطمہ کی مشکور ہوں کہ جس نے مجھے کام کرنے کا حوصلہ دیا۔ جس کی دعاؤں اور خواہشات نے میرے حوصلے بلند رکھے۔ بڑے بیٹے محمد حاشر محمود اور چھوٹے بیٹے عمر عبداللہ کے لیے دعا گو ہوں جن کی محبتیں میرے شامل حال رہیں۔ پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ میرے معصوم بچوں کی محبتوں اور شفقتوں کے نام ہے۔ ایسی محبتیں جو الفاظ کی محتاج نہیں۔ میرے ذخیرہ الفاظ میں ایسا حرف تشکر موجود نہیں جو میں ان کی نذر کروں۔ اپنے سسر حاجی ملک غلام سرور، ساس عجائب سلطان کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مقالہ نویسی کے دورانیہ میں مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے مکمل طور پر دور رکھا۔ میری نند نے نہ صرف دعاؤں کا ورد جاری رکھا بلکہ میرے کچن کی مصروفیات میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر دے۔ تیمور خان، خرم شہزاد، وقار علی، بھائی شہزاد، مہتاب خان، چچا تاج محمد خان، حاجی محمد سرور، سردار خان کا بھی شکریہ جو میرے لیے دعا گو رہے۔

اپنی دوست ہما ظفر، نادیہ احسن، کرن ہارون، ادیبہ لطیف، شگفتہ نسرین، راحیلہ زاہد، رضوانہ مبارکہ اور عماریہ کی نیک خواہشات کی میں تہہ دل سے قدر دان ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو نیک تمناؤں کا اجر دے۔

پیاری اور مخلص دوست فریحہ کے شکریہ کے لیے الفاظ نہیں ملتے کہ جس نے قدم قدم پر نہ صرف میرا ساتھ دیا بلکہ کام کرنے کا حوصلہ بھی دیا۔ میرے لیے اپنے قیمتی لمحات زیست وقف کیے، پی ایچ ڈی میں داخلے کے مراحل سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک میرے ساتھ رہی۔ فریحہ کے ابو اور بھائی بہنوں کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں۔

میں بھائی محبوب عالم کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے مقالے کی کمپوزنگ میں بڑی محنت اور تعاون کا ثبوت دیا۔ اپنے قیمتی وقت اور مشوروں سے نوازا۔ میں ان تمام ہواؤں، دلکش فضاؤں، راستوں اور بے خواب راتوں کی ممنون ہوں جنہوں نے دوران تحقیق میرا ساتھ دیا۔ ان تمام کتب خانوں کا شکریہ جنہوں نے مجھے کبھی خالی ہاتھ واپس نہ کیا۔ خدا کرے کہ یہ اسی طرح قائم و دائم رہیں۔ علم کی تلاش میں نکلنے والے ان سے فیض یاب ہوتے رہیں۔

میں کورس ورک کے دورانیے کے تمام اساتذہ کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے علم کی روشنی پھیلانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ میں یونیورسٹی لائبریری سٹاف اور پی ایچ ڈی کورس کے کوارڈینیٹر کی بھی مشکور ہوں۔

آخر میں میں اپنی زندگی کے ان قیمتی لمحوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو میں نے اس تحقیق کی نذر کیے۔ ان تمام احباب کی مشکور ہوں جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ میری مدد فرمائی۔

باب اوّل

افسانوی وغیر افسانوی نثر اور عہدِ شرر کا ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی جائزہ

الف۔ افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی تعریف وفرق

فکشن **Fiction** اور نان فکشن **Non Fiction** انگریزی زبان کے لفظ ہیں اور عموماً اردو میں بھی اسی طرح **مستعمل** ہیں۔ البتہ اردو میں فکشن کا ترجمہ افسانوی اور **Non Fiction** کا ترجمہ غیر افسانوی کیا جاتا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر اس وقت لکھی جب مسلمانانِ ہند انحطاط وزوال کے عہد سے گزر رہے تھے اور انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے۔ مسلمان شدید احساسِ کمتری کا شکار تھے۔ ان کی یہ حالت تھی کہ جو کچھ ان کے ہاتھ سے چلا گیا تھا اسے خیالی طور پر حاصل کرنے کے لیے مضطرب و پریشان تھے۔ ایک طرف قدیم طبقہ تھا جو قدیم روایات کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا تو دوسری طرف پڑھا لکھا جدید طبقہ جو چاہتا تھا کہ قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو کنارے پر لگایا جائے۔ شرر نے ان دونوں طبقوں کے ذہنی خلفشار کو پہچان کر اپنے فن کی بنیاد ایسے واقعات پر رکھی جو اسلام کی برتری کے مظہر اور ترجمان ہیں اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کی سیاسی حالت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے اندر حُبِ قوم **وملت** کا جذبہ ابھارنے اور بہتر انداز سے زندگی بسر کرنے کے لیے شرر نے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر لکھی۔ ذیل میں **Fiction** اور نان فکشن **Non Fiction** کی تعریفیں دی جا رہی ہیں تا کہ افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا فرق معلوم ہو سکے۔ ان تعریفوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہے کہ افسانوی اور غیر افسانوی نثر کسے کہتے ہیں؟

نیو بک آف نالج میں فکشن اور نان فکشن کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے:

Basically, literature is divided into two classes: Fiction and nonfiction. "Fiction" comes from the latin Fingere, which means "to form". fiction is something that the writer makes up. technically, of course, every writer

makes up somehting namely, his book, story, or report. but the novelest uses his imagination. He is not required to be as accurate in his details as, say, the scientist. although fiction is usually in the form of prose-a novel or short story, for instance-ficiton also takes other forms. It can be a play, like william shakes peares. Hamlet, or a poem, like Robert Browing's pied piper of Hamelin.

the second main division of literature is nonfiction. the writer of nonfiction tries to stick to facts as he knows them. He does not invent an interesting story. Biographies, autobiographies, diasies, histories, and essays fall into the category of nonfiction.

An autobiography gives the author's own life-story Biogaphy is a life story of some body other than the author. An essay, a short piece of prose, discusses something from a personal point of view. History quite often enters the realm of literature, when its content and style are superior. Sometimes a book on science, if the ideas and facts are beautifully expressed, becomes nonfiction literature.[1]

درج بالاتعریف سے ہم یہ مراد لے سکتے ہیں کہ بنیادی طور پر ادب دو حصوں پر مشتمل ہے فکشن اور نان فکشن ۔ فکشن لاطینی زبان کے لفظ **Fingese** سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں (بنانا: **To form**) فکشن دراصل مصنف کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے ۔ تکنیکی لحاظ سے مصنف اپنی کتاب، کہانی یا رپورٹ کی شکل میں بناتا ہے مگر ناول نگار

اپنے ذہن کے تصورات کا استعمال کرتا ہے اس سے یہ ہرگز توقع نہیں کی جاتی کہ وہ تمام جزئیات کو بالکل من وعن ہی بیان کرے فکشن نثر کی صورت میں ہوتا ہے جیسا کہ ناول اور مختصر کہانی۔ فکشن کی کئی اور صورتیں بھی ہیں۔ یہ کھیل (ڈرامے) کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ شیکسپیئر کا 'Hamlet' یا نظم کی صورت میں جیسے رابرٹ براونگ کی نظم 'Pied piper of hamlin' فکشن کا دوسرا حصہ نان فکشن ہے۔ نان فکشن کا مصنف کوشش کرتا ہے کہ وہ حقیقت پر ہی انحصار کرے۔ وہ کوئی نئی کہانی تخلیق نہیں کرتا۔ خودنوشت، سرگزشت، ڈائریاں، تاریخی کہانیاں اور مضامین اس ہی حصے میں شامل ہیں۔ autobiography میں مصنف اپنی زندگی کے بارے میں تحریر کرتا ہے۔ Biogrophy میں مصنف کسی اور کی زندگی کے بارے میں تحریر کرتا ہے۔ مضمون مختصر نثری ادب کی مثال ہے۔ جس میں مصنف اپنا ذاتی نکتہ نظر بیان کرتا ہے۔ تاریخی کہانیوں میں کہانی کا مضمون اور انداز برتر ہوتا ہے۔ سائنسی کتاب میں خیالات اور حقائق خوب صورت انداز میں بیان کیے جاتے ہیں جو نان فکشن کا روپ دھار لیتے ہیں۔

اردو میں فکشن کا ترجمہ 'افسانہ' ہے۔ ایک نظر مختلف لغات میں موجود فکشن کے مفہوم اور تعریف پر ڈالتے ہیں تا کہ معلوم ہوسکے کہ اردو میں فکشن سے مراد کیا ہے:

نوراللغات اردو: داستان، قصہ، کہانی، سرگزشت، حال روداد (قلق)

پوچھے اس سے اس کا افسانہ

کس پری رو کا ہے یہ دیوانہ[۲]

فرہنگ آصفیہ: حکایت بےاصل، قصہ، کہانی، من گھڑت کہانی، گھڑا ہوا قصہ، جھوٹی بات، سرگزشت، حال، ماجرہ، ذکر، افسوس، حسرت، پچھتاوا، ملولا مشہور شہرت یافتہ[۳]

قومی انگریزی اردو لغت: تصوری، خیالی، تخیل داد، خصوصاً کوئی خیالی کہانی، گھڑت، جھوٹ، افسانہ، ناول، مختصر کہانی یا ناولٹ کی صورت میں خیالی واقعات کا نثری اظہار، گھڑنے یا خیال آرائی کرنے کا عمل (قانون) یہ مفروضہ کہ جھوٹ کو بھی سچ کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔[۴]

جامع اللغات: ۱۔ قصہ، کہانی، داستان

۲۔ سرگزشت، حال، روداد ۳۔ جھوٹی بات، بےاصل

۴۔ مشہور بات، چرچا، ذکر، مذکور۵۔ طول، طویل بات، لمبا قصہ[۵]

فرہنگ اصطلاحات: افسانہ، عمل فرضی، واہمہ، کہانی Fiction[۶]

لغات کشوری: افسانہ، کہانی۔قصہ[۷]

جامع اللغات فارسی اردو: افسانہ، قصہ، کہانی، سرگزشت، مشہور چیز[۸]

لغات النساء: من گھڑت کہانی۔گھڑا ہوا قصہ، جھوٹی بات[۹]

اردو عربی المعجم: قصہ، (ج) قصص[۱۰]

جامع اللغات اردو: قصہ، کہانی، داستان، جھوٹی بات[۱۱]

اردو پنجابی لغت: قصہ، کہانی۔افسانہ، گھڑت، گل، بیان ذکر، کوڑی، جگ بیتی، منی برمنی بات، ہوئی بیتی، جیڑی جیون را کوئی پاپ اکھاڑے[۱۲]

اردو پشتو لغت: قصہ، قیصی، مشہور، دوروغ خبرہ، ورہ قصہ (شارٹ سٹوری)[۱۳]

علمی اردو جامع لغت: ۱، داستان، قصہ کہانی، سرگزشت، حال روداد، (۲) مشہور (۳) بے اصل بات (۴) طول طویل بات، چرچا ذکر (۶) (ادبی اصطلاح) خیالی واقعہ یا کہانی جس کے افراد اور کردار فرضی ہوں۔انگریزی Fiction کا ترجمہ (۷) وہ مختصر سی کہانی جس میں زندگی کے کسی ایک خاص پہلو کو اجاگر کیا جائے انگریزی Short Story کا ترجمہ[۱۴]

جدید اردو لغت: حکایت بے اصل[۱۵]

لغات نظامی اردو: قصہ، کہانی، داستان، جھوٹی بات، سرگزشت، ذکر اذکار، چرچا، شہرت[۱۶]

فرہنگ اقبال: داستان، سرگزشت[۱۷]

اردو لغت: قصہ، کہانی، فرضی بات[۱۸]

لغات سعدی: قصہ کہانی[۱۹]

قائد اللغات: (۱) کہانی، قصہ، داستان (۲) روداد، حال، سرگزشت (۳) مشہور (۴) بے اصل بات

(۵)طول وطویل بات (۶)چرچا، مذکور، ذکر [۲۰]

اردو بلوچی لغت: قصو، پیرا، حال، بیان، دروغین، ماتور، پچار، فرائیں، دارزیں، قصو، مشہوریں، ٹوک آزمانک[۲۱]

انگریزی ڈکشنریوں اور انسائیکلوپیڈیا میں **Fiction** سے مراد یہ ہے:

THE NEW OXFORD ENCYCLOPEDIC

I. feigning, invention; thing feigned or imagined, invented statement or narrative, literature consisting of such narrative, esp. novels. 2. conventionally accepted falsehood.[۲۲]

لٹریچر میں فکشن کیا ہے؟

ENCYCLOPAEDIA OF GENERAL KNOWLEDGE

:In Literature, what is fiction;

"It is a literary work portraying imaginally characters and events, as a novel, story, or play.[۲۳]

NEW WEBSTER'S DICTIONARY OF THE ENGLISH LANGUAGE DELUXE ENCYCLOPEDIC:

"a false hood, a prose narrative of imagined events in the form of a novel, ,or a short story, the act of inventing or imagining. Law an assumption that something false may be accepted as true..[۲۴]

THE NEW BOOK OF KNOWLEDGE:

The word "fiction" comes from the latin word "fictio",

which means "something invented." So in a broad sense, fiction is any narrative that is not completely a fact, though very often it is based on fact".[٣٥]

ENCYCLOPEDIA AMERICANA INTERNATIONAL

Fiction is narrative literature created from the author's imagination rather than from fact. The novel and short story are the literary forms most commonly called fiction, but narrative poetry and drama (including opera librettos) are also forms of it. In addition, other types of literature such as epic poetry, fables, and myths , are mainly fictional. Fictional elements also may be introduced into types of writing that are generally classified as nonfiction, such as biography (fictional biography) and history (historical fiction) see also novels; short story.[٣٦]

WEBSTER'S NEW WORLD DICTIONARY

1 any thing made up or imagined as a statement, story; etc.2 a literary work portraying imaginary characters and events as a novel, story or play such works collectively.3.Law something accepted as fact for convenience,although not necessarily true[٣٧]

ENGLISH TO ENGLISH AND URDU DICTIONARY

"Invented narrative"

من گھڑت قصہ، کہانی، بے بنیاد بات، بناوٹی باب، گھڑا ہوا قصہ۔[۲۸]

DICTIONARY OF LITERARY TERMS

Narrative writing imagination or invented and drawn from the imagination of the author rather than from history or fact. Though the term is most frequently associated with novels and short stories, the drama, narrative poetry, fables, fairy tales, and folklore, may contain fictional elements.[۲۹]

THE CONCISE ENGLISH-PERSIAN DICTORNARY

Fiction

افسانہ، قصہ، داستان، اختراع، جعل، خیال، وہم، دروغ، فریب، بہانہ[۳۰]

CASSELL'S NEW FRENCH-ENGLSIH DICTIONARY

"Fiction, Figment, Fabrication,Fable"[۳۱]

WEBSTER'S NEW WORLD DICTIONARY OF THE AMERICAN LANGUAGE

1. an imaginary statement story, etc. 2. any literary work with imaginary characters and events as a novel, play, etc. [۳۲]

THE OXFORD ILLUSTRATED DICTIONARY

1. Feigning, invention, thing feigned or imagined, invented statement or narrative; literature consisting of such narrative, esp. novels. 2. conventionally

accepted falsehood; legal.[۳۳]

THE AMERICAN HERITAGE DICTIONARY

1. an imaginative creation or a pretense that does not represent actuality but has been invented.2. The act of inventing, an imaginative creation or pretense. 3. A lie. 4. a .A literary work whose content is produced by the imagination and is not necessarily based on fact.b. The category of literature comprising work of this kind, including novels, short stories, and plays.5. Law something accepted. as fact without any real justification merely for the sake of convenience .[۳۴]

THE CONCISE HERITAGE DICTIONARY

1. something invented or imagined .2. a The category of Literature with imaginary characters and events, including novels, short stories, etc. b. A work of this category."[۳۵]

THE STUDENTS STANDARD ENGLISH URDU

Fiction:

۱۔ گھڑت، من گھڑت، ایجاد

۲۔ بناوٹی، ہوئی بات، گھڑا ہوا قصہ، گھڑی ہوئی بات، بناوٹی بات

۳۔ افسانہ، فسانہ، کہانی، قصہ

قانونی امور میں سہولت پیدا کرنے کے لیے کوئی مفروضہ خواہ غلط ہو یا صحیح، فرضی امر قانونی، مفروضہ۔[۳۶]

DICTIONARY OF LITERARY TERMS AND LITERARY THEORY

A vague and general term for an imaginative work, usually in prose. At any rate, it does not normally cover poetry and drama though both are a form of fiction in that they are moulded and contrived-or feigned fiction is now used in general of the novel the short story, the novel and related genres [۳۷]

NON FICTION غیر افسانوی نثر کی تعریفیں

THE CHAMBER'S DICTIONARY

"of a literary work with out any deliberately fictitious elements purely factual"[۳۸]

COLLIN'S ENGLISH DICTIONARY

"Writing dealing with facts and events rather than imaginative narrations.2. relating to or denoting non fiction"[۳۹]

THE OXFORD REFERENCE DICTIONARY

" a classfication of literature that includes books in all subjects other than fiction" [۴۰]

FUNK & WACHALL'S STANDARD DICTIONARY

"prose literature other than fiction, as historical works, biographies, etc"[۴۱]

CHAMBERS ENGLISH STUDENT'S DICTIONARY:

" books about real events or things which exist, as opposed to stories the library has a large nonfiction section".[٢٢]

CHAMBER'S EVERDAY PAPERBACK DICTIONARY

"of a literary work without any deliberately fictitious material".[٢٣]

CHAMBER'S TWENTIETH CENTURY DICTIONARY:

"of a literary work without any deliberately fictitious element (non-fiction novel, one whose material is entirely drawn from people and events in real life".[٢٤]

THE CONCISE OXFORD DICTIONARY OF CURRENT ENGLISH

" Literary work other than fiction, including biography and reference books"[٢٥]

A DICTIONARY OF LITERARY TERMS

opposed to fiction and different from drama and poetry. It is that branch of literature which introduces ideas of judgments based upon facts and reality. Autobiography, biography, the essay and history are types of non fiction. However, drama and some poetry contain non-fiction elements. It also contains some imaginative (invented) passages.[٢٦]

THE OXFORD ILLUSTRATED DICTIONARY

"Prose writings that are not fiction, peotry, or drama."[۴۷]

THE AMERICAN HERITAGE DICTIONARY

"literary works other than fiction and non fiction-"[۴۸]

THE CONCISE HERITAGE DICTIONARY:

"prose works other than fiction."[۴۹]

NEW WEBSTER'S DICTIONARY OF THE ENGLISH LANGUAGE DELUXE ENCYCLOPDIC EDITION

"any prose work that is not fictional as essays, biographies, and histories."[۵۰]

READER'S DIGEST GREAT ILLUSTRATED DICTIONARY

"prose works other than fiction."[۵۱]

CHAMBER'S CONCISE USAGE DICTIONARY

"books, magazines etc. giving facts, information etc, i.e; not stories, novels, play, poetry."[۵۲]

CHAMBER'S CONCISE 20th CENTURY DICTIONARY

"of a literary work, without any deliberately fictitious element"[۵۳]

قومی انگریزی اردولغت: غیر افسانوی، کوئی نثری تصنیف جوافسانوی نہ ہوجیسے انشائیہ سوانح یا تواریخ[۵۴]

مختلف ادباء کے نزدیک Fiction اور Non Fiction کی تعریفیں

غیر افسانوی نثر کے لیے انگریزی زبان میں **Non Fiction** کی اصلاح مستعمل ہے۔

Fictionیا افسانوی نثر سے مراد وہ نثر ہے جس میں کسی طرح کا کوئی قصہ، کہانی، داستان شامل ہو۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ... فکشن انگریزی زبان کا لفظ سہی لیکن اب اسے بے شمار دوسرے انگریزی لفظوں کی طرح اردو ہی کا سمجھنا چاہیے۔ اوّل اس لیے کہ ایک عرصے سے اردو میں مستعمل ہے دوسرے یوں کہ اس کا مترادف و متبادل نظر نہیں آتا۔ تیسرے اس واسطے کہ صوتی اعتبار سے یہ خوش آہنگ ہے اور اسے اپنا لینے میں کسی قسم کی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ ۵۵

ڈاکٹر ارتضٰی کریم کے بقول:

> اردو میں افسانوی ادب کی اصطلاح انگریزی لفظ Fiction کے مترادف ہے بلکہ کثرت استعمال سے لفظ Fiction جوں کا توں اردو میں مستعمل ہو چکا ہے۔ لفظ فکشن یا افسانوی ادب اپنے آپ میں کافی وسعت رکھتا ہے۔ اسی لیے مختلف مکاتیب فکر کے نزدیک اس کے مفہوم میں کہیں کم کہیں زیادہ فرق ہے۔ ۵۶

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ارتضٰی کریم کی تعریفیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ فکشن انگریزی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں افسانوی ادب کی اصطلاح انگریزی لفظ **Fiction** کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے افسانوی ادب میں چار اصناف ادب کو شامل کیا ہے جن میں داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تعریف سے ثابت ہوا کہ لفظ فکشن افسانوی ادب کے لیے یا افسانوی نثر کے لیے مستعمل ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں:

> اردو میں فکشن یا افسانوی ادب کے قدیم ترین نمونے داستان کی شکل میں ملتے ہیں۔ دکنی کی مثنویات ہوں یا سب رس کے طرز کی تمثیلیں۔ شمالی ہند میں بکٹ کہانی کے نام سے منظوم 'بارہ ماسا' ہو یا 'دہ مجلس' ان میں سے ایک بھی قصہ، کہانی یا افسانوی عنصر سے خالی نہیں ...... مغرب کے زیر اثر ۱۸۵۷ء کے بعد فکشن کا روپ اردو میں داستان کے بجائے ڈرامہ اور ناول میں تبدیل ہو گیا ...... ابھی اردو ڈرامہ اپنے قدم جما ہی رہا تھا کہ مغرب سے فکشن کی ایک اور ادبی صورت ناول کے نام سے اردو میں داخل ہو گئی ...... اردو ناول اور ڈرامہ کی عمر مشکل سے پچیس تیس کی حدود میں داخل ہوئی ہوگی کہ یلدرم اور پریم چند

کے ہاتھوں مختصر افسانہ بھی اردو میں در آیا۔ ......بیسویں صدی کی معروف وتغیر پسند زندگی میں اس کے لیے گنجائش باقی نہ رہی۔ اس لیے داستانوں کا سلسلہ خود بخود ختم ہوگیا۔ البتہ فکشن کے تین روپ ناول، افسانہ اور ڈرامہ ابھی تک ساتھ ساتھ چل رہے ہیں... دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اردو فکشن یا اردو کا افسانوی ادب چار مستقل اصناف کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔[۵۷]

افسانوی ادب کے نثری ذخیرے کے لیے انگریزی زبان میں **Prose Fiction** کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ہماری زبان اردو میں بھی اب فکشن کا لفظ ہی موزوں مروج اور مستعمل ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

نثری افسانوی ادب کے لیے انگریزی میں **Prose Fiction** کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں بھی اب فکشن کا لفظ ہی زیادہ مروج اور مستعمل ہے ... فکشن... ایسی ہر تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے۔ فکشن کے زمرے میں آئے گی۔ اسی لیے اس کا دائرہ کار وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔ داستان، ناول اور افسانہ (طویل یا مختصر) بھی، ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی یہاں تک کہ منظوم داستانیں بھی اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے۔[۵۸]

ڈاکٹر شہناز انجم رقمطراز ہیں:

ادبی نثر (یہ دو اقسام میں پائی جاسکتی ہے) ۱۔ سادہ ادبی نثر، اس زمرے میں تنقید و تحقیق، تجزیاتی زبان اور خاکہ، تاثراتی تحریریں، مکاتیب اور انشائیے وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں منطقی ربط ہوتا ہے۔ ۲۔ ادبی تخلیقی نثر: اس میں ایک طرف ادب لطیف اور شعری نثر شامل کی جاسکتی ہیں تو دوسری طرف تخلیق افسانہ، ناول وغیرہ کا شمار بھی اس میں کیا جائے گا۔[۵۹]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادبی تخلیقی نثر میں فکشن کی دو اقسام آجاتی ہیں افسانہ اور ناول۔ سادہ ادبی نثر میں ہم نان فکشن کو لاسکتے ہیں۔ اس لیے کہ غیر افسانوی نثر میں بھی تخیل، کہانی پن اور قصہ کو جگہ نہیں دی جاتی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کا خیال ہے کہ: "علمی نثر، بول چال کی نثر، اور تخلیقی نثر ......موسیقیت کے عناصر علمی نثر میں سب سے کم ہوتے ہیں۔ بول چال کی زبان میں نیم محسوس اور تخلیقی نثر میں نمایاں ہوتے ہیں"۔[۶۰]

ڈاکٹر عنوان چشتی نے یہ تقسیم آہنگ کی بنا پر کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علمی نثر، بول چال کی نثر اور تخلیقی نثر میں آہنگ یعنی موسیقیت کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ نثر کی کس قسم میں کتنا عنصر آہنگ کا پایا جاتا ہے۔ افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا تعلق بھی انہی تین اقسام سے ہے۔ افسانوی نثر میں ناول اور افسانہ شامل ہے جس پر اظہار خیال کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں:

> ناول اور افسانہ اس کو کہتے ہیں جو زمانہ کا جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہو۔ صاف صاف چربہ اتارے اور اس کے رسم و رواج، رسم و آداب، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے اور مافوق العادات و واقعات کو دخل دے یا اگر دے تو ان کی تاویل بھی اس خوبی سے کرے کہ عوام ان کو واقعہ سمجھنے لگیں۔[۶۱]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ **Fiction** افسانہ کے بارے میں پریم چند کے کیا خیالات ہیں۔ بقول آغا محمد باقر: ''افسانے اور قصے سننے کا شوق انسان کے دل میں فطری طور پر موجود ہے جب اردو زبان نے مستقل حیثیت اختیار کی تو اس میں بھی افسانوں اور قصوں کی ضرورت محسوس ہوئی''۔[۶۲]

آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ:

> فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو فکشن کے لیے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے... انگریزی کی ایسی اصطلاحیں جن کے مترادف الفاظ ہمارے یہاں نہ ہوں اور جو ہمارے صوتی نظام کے مطابق ہوں۔ انہیں جسیہ لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔[۶۳]

ہم نے مختلف ادیبوں کی آرا کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ نتیجہ اخذ ہو سکے کہ ہمارے ادیبوں کے نزدیک فکشن اور نان فکشن سے کیا مراد ہے اور کون سی اصناف ادب فکشن کے زمرے میں آتی ہیں اور کون سی اصناف نثر نان فکشن کے زمرے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر اور اس کی اصناف کی درجہ بندی کچھ اس طرح سے کی ہے:

> قدیم فکشن ...... نقل، حکایت، رومانی کہانی یا داستانی کہانی (بہ شمول لوک کتھا)، داستان
>
> جدید فکشن: مختصر افسانہ (بہ شمول مختصر افسانہ) افسانچہ یا فی افسانہ، ناول (بشمول ناولٹ)۔
>
> ڈراما (کئی ایکٹ کا یک بابی، اسٹیج ڈراما اور ریڈیو ڈراما)

انشائیہ: (بہ شمول تمثیلی ،طنزیہ،مزاحیہ وغیرہ مزاحیہ انشائیہ)

مقالہ: (مختصر اوسط حجم کا یعنی رسالہ،طویل یعنی کتاب)

سوانح: دوسروں کی سوانح، آثار (مصنف کی تحریروں سے ماخوذ) سوانحی لغت

خاکہ:

آپ بیتی یا سرگزشت: آپ بیتی روزنامچہ یا ڈائری، یادداشتیں یا یادنگاری

سفرنامہ:

رپورتاژ:

ملاقات نگاری یا گفتگو

مکتوبات بہ شمول مراسلہ......[۲۴]

ڈاکٹر گیان چند نے افسانوی وغیرافسانوی نثر کے بارے میں جو خیال پیش کیا ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رومانی کہانی، داستان،مختصر افسانہ، ناول اور ڈراما افسانوی نثر کے زمرے میں آتے ہیں۔ جب کہ انشائیہ، مقالہ، سوانح، خاکہ،آپ بیتی، سرگزشت، سفرنامہ، رپورتاژ، ملاقات نگاری یا گفتگو،مکتوبات وغیرہ غیرافسانوی نثر میں شامل ہیں۔

بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

اردو (یا کسی بھی زبان کے) نثری ذخیرے کومزاجاً دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) افسانوی ادب (ب) غیر افسانوی ادب

(ا) افسانوی ادب

(Fiction) کی چار اقسام ہیں۔

۱۔ داستان

۲۔ ناول

۳۔ افسانہ

۴۔ ڈراما

(ب) غیر افسانوی ادب

غیرافسانوی ادب میں فکشن کے علاوہ ہر طرح کی نثری تحریریں شامل ہیں۔اس کی متعدد شکلیں ہیں:

۱۔ مضمون ۲۔ مقالہ ۳۔ انشائیہ ۴۔ سوانح ۵۔
آپ بیتی۔ ۶۔ مکتوب ۷۔ خاکہ ۸۔ تبصرہ ۹۔
طنزومزاح ۱۰۔ سفرنامہ ۱۱۔ ترجمہ
۱۲۔ نثرلطیف (نثری نظم) ۱۳۔ اقبالیات [۲۵]

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اردوادب کے نثری ذخیرے کی تقسیم افسانوی اور غیرافسانوی ادب کے طور پر کی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ Fiction کے زمرے میں چاراصناف ادب شامل ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ اورڈراما اور ان چارنثری اصناف ادب کےعلاوہ باقی نثری اصناف غیرافسانوی نثر میں شامل ہوتی ہے۔

منصف خان سحاب نے اپنی کتاب نگارستان میں اس کا خاکہ کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

اس خاکے سے بھی ثابت ہے کہ نثر کی دو اصناف ہیں۔ایک افسانوی اور دوسری غیر افسانوی یعنی Fiction اور Non Fiction فکشن کے زمرے میں داستان ،ناول،افسانہ اور ڈراما شامل ہیں۔ جب کہ Non Fiction میں مضمون، مقالہ، سوانح، سفر نامہ، انشائیہ، خاکہ، خط اور مزاحیہ ادب شامل ہے۔پس ثابت ہوا کہ داستان، ڈراما، افسانہ اور ناول کو چھوڑ کر باقی تمام اصناف نثر غیر افسانوی ہیں۔ بقول بشیر جامی:

> اردو میں نثری اصناف کی جتنی قسمیں متعارف ہوئی ہیں ان کی اپنی اپنی ایک شناخت ہے۔ ایک پیٹرن ہے ایک ماحول ہے ایک تنہا کشش ہے ایک مخصوص معیار ہے ایک ابلاغیت کا عہدیتی شعور ہے ایک پر وقار تہذیبی تجزیہ ہے ایک پر اسرار موج کا طلسماتی دریا ہے اور ادبی قبیلوں کی روش سفری کا ٹوٹتا بنتا ......بکھرتا سنورتا ......جلتا بجھتا......ھارتا جیتا......ہنستا گاتا چمک دار سفر ہے۔[۲۷]

درج بالا تعریفوں سے ثابت ہوا کہ ادب دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔فکشن اور نان فکشن:

- فکشن اصل میں مصنف کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔
- فکشن نثر میں ہوتا ہے۔
- یہ ایک تصوراتی تحریر ہے۔
- فکشن میں تصوراتی کردار خصوصی معنی رکھتے ہیں۔
- اس میں تصوراتی کہانی بیان کی جاتی ہے۔
- فکشن کا لفظ لاطینی زبان سے ماخوذ ہوا۔
- فکشن میں حقائق کو سامنے رکھ کر اس میں تصوراتی رنگ بھی بھرا جاتا ہے۔
- فکشن میں داستان، ڈراما، افسانہ اور ناول شامل ہیں۔

- مختلف لغات میں اس کے معنی داستان، قصہ، کہانی، سرگزشت، حال، روداد، حکایت بے اصل، گل، من گھڑت کہانی، ماجرا، ذکر اذکار، تخیل داد، لمبا قصہ، طویل بات، عمل فرضی، واہمہ، بیان، جگ بیتی، منی برمنی کے ہیں۔
- مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جاتا ہے فکشن کے زمرے میں آئے گی۔اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثال بھی۔داستان، ناول، افسانہ (طویل یا مختصر) بھی ناولٹ اور ڈرامے بھی حتیٰ کہ منظوم داستانیں اردو کی مثنویاں جن میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے۔افسانوی نثر

کے زمرے میں شامل ہیں۔

Non Fiction غیر افسانوی نثر کی درج بالا تعریفوں سے ثابت ہوا کہ غیر افسانوی نثر وہ نثر ہے جو کہ اس ادبی کام کو ظاہر کرے۔ جو ناول، افسانہ، ڈراما کے تخیلاتی کرداروں اور واقعات پر مشتمل نہ ہو۔

- وہ ادبی کام ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر مفقود ہوں۔
- وہ نثری کام جو افسانوی نہ ہو۔ مثال کے طور پر مضمون، سوانح اور تاریخ
- ایسی تحریر جو مبنی بر حقیقت ہو اور وہ واقعات جو تخیل کے بغیر بیان کیے گئے ہوں غیر افسانوی نثر کہلاتی ہے۔
- جو افسانہ کا متضاد ہو اور ڈراما اور شاعری سے مختلف ہو۔
- یہ ادب کی وہ شاخ ہے جو ان مختلف خیالات کو بیان کرتی ہے جو مبنی بر حقیقت ہوں۔ مثلاً خودنوشت، سوانح عمری، مضمون اور تاریخ یہ غیر افسانوی نثر کی اقسام ہیں۔
- وہ ادبی کام جو افسانوی نہ ہو اور جس میں سوانح اور حوالہ جات کی کتب شامل ہوں۔
- غیر افسانوی تحریریں وہ ہیں جو حقائق اور سچائی پر مبنی ہوں جو کہانی کی صورت میں نہ ہو۔
- نان فکشن کا مصنف کوشش کرتا ہے کہ وہ حقیقت پر ہی انحصار کرے۔ وہ کوئی نئی کہانی تخلیق نہیں کرتا۔
- ایسا ادبی کام جو دانستاً مافوق الفطرت عناصر سے پاک ہو۔
- ایسی کتابیں جو حقیقی واقعات اور چیزوں کے متعلق ہوں اور کہانیوں کے برعکس ہوں۔
- ادب کی وہ درجہ بندی جس میں وہ تمام کتب شامل ہیں جو افسانوی نہ ہوں

ب۔ سیاسی وسماجی پس منظر

جدید اردو ادب کے معماروں میں سے ایک مولانا عبدالحلیم شرر بھی ہیں ۔انہوں نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں۔سر سید احمد خان کی تحریک علی گڑھ کے خیالات و رجحانات کو پھیلانے اور استحکام بخشنے میں مولانا شرر نے بہت کام کیا۔زندگی و ادب کے رشتے کو انہوں نے شعوری طور پر تلاش کیا ہے۔مولانا کو تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے۔لیکن ان کی غیر افسانوی نثر بھی اہمیت کی حامل ہے۔تاریخی ناول نگار کے حوالے سے شرر کا صرف ایک پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر نہ صرف ناول نگار ہیں بلکہ وہ سیرت نگار،سوانح نگار،مضمون نگار،انشا ئیہ نگار اور صحافی بھی ہیں۔ انہوں نے ڈرامے اور تاریخ بھی لکھی اور شاعری بھی کی۔بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

> پچھلی اور رواں صدی کے مابین مولانا عبدالحلیم شرر کی شخصیت عجیب وغریب اوصاف کی حامل اور علم وادب میں محیر العقول کارناموں کی مالک نظر آتی ہے۔سرسید احمد خان کے دور میں میدان ادب میں آنے والا یہ ادیب بیسویں صدی کے ربع اوّل تک جب تحریک خلافت کی گرم بازاری زمانے کی سردمہری کی تاب نہ لاکر دم توڑ چکی تھی ۔داد علم وسخن دیتا رہا۔شرر نے علم وفن کے جس کوچے میں بھی قدم رکھے وہاں اپنی شخصیت اور علمیت کے گہرے نقوش پا چھوڑے۔[۲۸]

مولانا شرر نے افسانوی اور غیر افسانوی دونوں طرح کی نثر لکھی ہے۔مولانا کا میدان ادب وسیع تھا اس لیے اس کا صحیح جائزہ لینا پس منظر کے وسیع مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔مولانا کے ماضی و حال دونوں اہم ہیں۔مولانا نے انگریز کے ہندوستان آنے سے پہلے کی خوش حالی کا بھی جائزہ پیش کیا ہے اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کی داستانیں بھی اشاروں کنایوں میں سنائی ہیں ۔انگریزی نظام کے تحت معاشرتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کی تفصیل بھی مہیا کی ہے اور لوگوں کی قلب ماہیت کا واضح نقشہ بھی پیش کیا ہے ۔اقدار کی تبدیلی پر نوحہ خوانی بھی ان کے فن میں موجود ہے اور روزمرہ کے سیاسی واقعات پر ردعمل بھی ظاہر کیا گیا ہے۔غرض شرر کے فن میں ہندوستان کی نصف صدی کے سیاسی سماجی ،معاشرتی ،تہذیبی اور معاشی حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ قاری ان کے فن کا جب مطالعہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو اس دور میں محسوس کرتا ہے۔ڈاکٹر محمد اسلام کی رائے میں:

> ادیب اور شاعر دنیائے آب وگل کے رہنے والے اور سماج کے ایک رکن ہوتے ہیں۔وہ

اپنے گردوپیش میں سے اپنی تخلیقات کے لیے مواد فراہم کرتے ہیں اور ان کے گردوپیش کے حالات وروایات ماضی سے اثر قبول کرکے مستقبل پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔اس لیے کسی شاعر یا ادیب کو سمجھنے کے لیے اس کے ماضی اور حال کے سیاسی ،سماجی،تہذیبی ،مذہبی اور ادبی حالات وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔[۶۹]

عبدالحلیم شرر کا زمانہ(۱۸۶۰ءتا ۱۹۲۶ء)ہندوستان کا اہم اور نازک دور تھا۔اسی زمانے میں زندگی کے تمام شعبوں ،سیاست، مذہب،تہذیب اور ادب وغیرہ میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔مشترکہ تہذیب کے مٹنے کے آثار نظر آنے لگے اور مشرقیت پر مغربیت کے اثرات روز بروز بڑھنے لگے۔عبدالحلیم شرر کے عہد کے حالات جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے عہد سے پہلے کے سیاسی وسماجی حالات کا مختصراً جائزہ لیں تاکہ وہ تمام کیفیتیں واضح ہوجائیں جنھوں نے شرر کے عہد کی تشکیل کی۔

عہد مغلیہ کا دورِ آخر/دورانحطاط وزوال:

مغلوں کے زمانے میں تہذیب وتمدن نے جو ترقی کی تھی۔وہ ہندوستانی تاریخ کا زریں باب کہلانے کا مستحق ہے۔جن بادشاہوں نے اپنے حسن تدبر،حسن انتظام اور فہم وفراست سے اس تہذیب کو پروان چڑھایا تھا۔اس تہذیب و تمدن کی باگ ڈور نکمے بادشاہوں اور نااہل جانشینوں کے ہاتھوں میں آئی تو اپنا وقار کھو بیٹھی۔بقول محمد اسماعیل ذبیح:

اورنگ زیب کا دور حکومت ہمارے سامنے واضح نمونہ ہے وہ سادگی ،درویشی اور تقوی میں بھی مثالی حکمران تھا۔اس نے ملک میں شریعت کے قوانین بھی نافذ کردیے تھے لیکن اس وقت ہندوستانی معاشرہ میں جو اخلاقی زوال پیدا ہو چکا تھا۔اس کو اورنگ زیب جیسے بہادر اور متقی حکمران روک نہ سکا۔[۷۰]

ڈاکٹر عبدالقیوم کا کہنا ہے کہ:

مغلوں کے زمانے میں تہذیب وتمدن کو جو ترقی ہوئی۔وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔لیکن جن بادشاہوں نے اپنے تدبر،حسن انتظام اور غیر معمولی جرات اور فراست سے کام لے کر اس تہذیب کی آبیاری کی تھی۔اس کی شادابی نکمے بادشاہوں اور نااہل جانشینوں کے سبب قائم نہ رہ سکی۔بلکہ مدت سے سوئے ہوئے فتنوں نے سر اٹھایا اور مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تمام تخریب پسند قوتیں جمع ہوگئیں۔[۷۱]

مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ایک ایسا زوال بھی آیا۔ جس نے پوری تہذیبی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ ایک طرف تو سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں اور دوسری طرف اخلاقی قدریں تباہ ہوئیں۔ اس زوال نے احساس شعور تک کو ختم کر ڈالا اور سماجی زندگی کو اعلیٰ اقدار سے محروم کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات نے شہزادوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ بقول کرم حیدری: ''۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت میں کمزوری اور انتشار کے آثار پیدا ہو گئے تھے''۔[۴۲] اس خانہ جنگی نے رہے سہے وقار کو اور زیادہ گرا دیا۔ ایک طرف تو اخلاقی اور اجتماعی تصورات کا زوال ہوا تو دوسری طرف ملک کی اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی جس دولت کو تعمیر ملک کے کام آنا چاہیے تھا وہ باہمی جنگ و جدل کی نظر ہونے لگی۔ ایک طرف امراء نے لوٹ کھسوٹ شروع کر دی تو دوسری طرف تخت سلطنت کے ورثاء نے دولت اپنے ذاتی عیش و آرام پر خرچ کی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں: ''امراء نے ہر طرف لوٹ کھسوٹ شروع کر دی اور تخت سلطنت کے وارث بے دریغ دولت اپنے ذاتی عیش و آرام کے لیے خرچ کرنے لگے جس سے تنظیم میں خلل واقع ہو گیا اور سلطنت کا اقتدار ختم ہونے لگا''۔[۴۳]

مغلیہ سلطنت کے زوال نے بہت سی اخلاقی اور سماجی خرابیوں کو جنم دیا۔ قوم میں بے جا غرور، فرائض سے غفلت، حالات سے بے خبری اور بدلتے ہوئے رجحانات سے ناواقفیت کے جراثیم نشوونما پانے لگے۔ بادشاہوں کے عیش و عشرت اور آرام طلبی نے تیموری وقار کو خاک میں ملا دیا۔ نیک و بد کی تمیز ختم ہونے لگی۔ فوجی تنظیم پر نظر ثانی نہ کی گئی۔ ملکی معیشت کو سنبھالنے کا ہوش کسی کو نہ رہا۔ نہ انتظام سلطنت میں دلچسپی لی گئی۔ وہ مغلیہ دربار جہاں ملکی اور قومی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا تھا۔ سازشوں کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم رقمطراز ہیں:

> ......تیموری اولاد میں ایسے ایسے نااہل اور ناکارہ شہزادے تخت پر بیٹھ رہے تھے جو تلوار اٹھانا تو درکنار اپنے رتبے تک سے ناواقف تھے...... دہلی میں لال قلعے کی دیواروں کے نیچے لوگ بدامنیوں کا شکار ہونے لگے اور آئے دن کی تبدیلیوں اور سازشوں سے یہ عاجز آ گئے تھے۔[۴۴]

شرر کی پیدائش کے وقت مغل حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور بہادر شاہ ظفر کی حکمرانی بھی اختتام پذیر تھی۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے تمام انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا کہنا ہے:

> اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شہزادوں کی خانہ جنگی، آرام طلبی اور عیش پسندی نے اخلاقی اقدار اور مغل سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور آخری عہد میں اس تہذیب و تمدن کے آثار بھی مٹنے لگے جو ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی زندگی کے بہت بڑے

اور شان دارباب کی نشاندہی کرتے تھے۔[۷۵]

اخلاقی پستی اور طوائف الملوکی کے اس عالم میں ملک کے اندر اور باہر نئے نئے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ایک طرف مرہٹے برصغیر پر اپنا راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔دوسری طرف مغربی سرحد سے ایک خوف ناک آندھی ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور یورپ کی تجارتی کمپنیاں بڑی توجہ سے اس ناٹک کو دیکھ رہی تھی۔ادھر شاہی فوج جس پر سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن وامان کا دارو مدار تھا۔ابتر حالت کو پہنچ گئی تھی... مغلوں کی کمزوری کی وجہ سے مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں نے ستم ڈھائے اور رہی سہی کسر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ان حملہ آوروں نے ہندوستان کی زمین پر خون بہایا اور دوسری طرف دولت سمیٹ کر چلتے بنے۔بقول صاحبزادہ عبدالرسول:

> نادر شاہ کے حملے سے مغل حکومت کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا۔صوبائی حکام نے جگہ جگہ خود مختاری اختیار کرنا شروع کر دی۔دہلی کی رونق ختم ہوگئی۔جن علاقوں سے حملہ آور فوج گزری وہ بری طرح تباہ ہوئے۔مغل فرمارواں کے صدیوں کے جمع کیے ہوئے جواہرات اور نوادرات ایک ہی دن میں نادر شاہ کے ہاتھوں میں چلے گئے۔[۷۶]

بقول صابر علی خاں صورت حال یہ تھی کہ:''... ہر ایک طرف ایک سراسیمگی کا عالم تھا۔شہر اجڑے، مکانات تباہ ہوئے اور بستیاں ویرانوں میں بدل گئیں۔شرفا اور امرائے شہر دربدر خاک چھانتے پھرتے تھے۔''[۷۷]

ادھر اندرون ملک یہ حالات وواقعات تھے اور دوسری طرف ہندوستان کے ساحلوں سے یورپی اقوام داخل ہوکر اپنی قوت کو مضبوط اور سلطنت کو وسیع کرنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: ''ادھر ہندوستان کے ساحلوں کو تسخیر کرتی ہوئی یورپی اقوام کلکتے سے اندورن ملک داخل ہوکر اپنی سلطنت کو برابر وسیع کرتی جارہی تھی۔ہندوستان کی ریاستیں اتنی منقسم، منتشر اور کمزور تھیں کہ ایک بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی''۔[۷۸] برصغیر پاک وہند میں مختلف اقوام آتی رہیں اور یہاں پر قابض ہونے کے خواب دیکھتی رہیں۔برصغیر پاک وہند کی سرزمین کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔محمود الرحمٰن کے مطابق:

> برعظیم پاک وہند کا خطہ حسین وجمیل ہزاروں سال پہلے بیرونی دنیا کے لیے باعث کشش رہا ہے۔اس کا وسیع رقبہ، اس کی زرخیز زمیں اس کے سربفلک کوہسار اس کی دل کش وادیاں اس کی سبک خرام ندیاں اس کے سرسبز وشاداب میدان، اس کے ہرے بھرے

لہلہاتے کھیت، اس کے پر کیف و پرفضا باغات، اس کے معدنی وسائل، اس کے خیرہ کن زر و جواہر اور اس کے مرصع قلعہ ومحلات غیر ملکیوں کو مسلسل مدہوش کرتے رہے ہیں۔ اس جنت ارضی کے حصول کے لیے اقوام عالم ہمیشہ سے مشتاق ومضطرب رہی ہیں کوہ ہمالیہ و ہندوکش کی مضبوط وسربلند دیواروں اور بحورعرب وہند کی سفاک موجوں کے حصار کوتوڑ کر اس علاقے میں درآنے والوں کا سلسلہ خاصا دراز ہے۔ ایک فرانسیسی مورخ کے بقول ' اس ملک کی بےنظیر زرخیزی کی بدولت بہت سے موانع کے باوجود اقوام عالم نے کئی ہزار سال کے اندر اس پر بیس دفعہ دھاوا کیا۔[۷۹]

جن اقوام عالم نے برصغیر پاک وہند کی طرف رخ کیا۔ان میں یونانی بھی تھی اورترک بھی۔عرب بھی تھے اور افغان بھی۔ایرانی بھی تھے اورتاتاری بھی۔منگول بھی تھے اورمغل بھی۔یہی وہ خصوصیات تھیں جن کا ذکرظہیرالدین بابر نے تزک بابری میں کیا ہے:''ہندوستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وسیع ملک ہے۔اس میں سونا چاندی بہت ہے''۔[۸۰] سب سے پہلے آنے والی یورپی قوم پرتگیز تھی جو کالی کٹ کے ہندوؤں کی سلطنت میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔یہ یورپی اقوام دیگراقوام کے تجارتی جہاز لوٹ لیتی تھیں اور چیزوں کی قیمتیں بھی من مانی مقرر کرتے تھے اورراجاؤں کے ساتھ ان کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس بارے میں لکھتے ہیں:

بیشتر یورپی مورخ بھی جو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے ان ہم مذہب افراد سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں کہیں کہیں ان کے مظالم کا ذکر کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں کا ایک غیر انسانی اور بیانہ واقعہ کیمرج ہسٹری میں یوں مذکور ہوا ہے۔

A rich muslim pilgrim vessal on its way to India from the red - sea, was intercepted by da Gama's flect, plundered and sank these were many women and children on board, but to these no mercy was shown, and we actually read that da Gama watched horrors of the scene through a port hole, merciless and unmoved.

> ظاہر ہے یہ جہاز تجارتی نہ تھا۔ حج سے واپس آنے والے افراد کا تھا۔ جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے لیکن ان یورپی تاجروں کے ہاں سرے سے کوئی اخلاقی ضابطہ ہی موجود نہ تھا۔ ان کی درندگی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ ایسے واقعات سے لطف اندوز ہوتے تھے۔[۸۱]

پرتگالیوں کے مظالم کی وجہ سے اہل ہندوستان یورپی اقوام سے بدظن ہوئے تھے اور اردو ادب میں مغرب کی مذمت کے پہلو بھی یہی ہیں۔ اہل عرب نے اپنے اخلاق کی وجہ سے ہندوستان کے باسیوں کو رام کر لیا تھا۔ لیکن برعکس اس کے اہل یورپ نے بھرپور کوشش کی کہ اہل ہندوستان کو دبایا جائے۔ دوسری یورپی قوم جو ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے والی تھی وہ ڈچ تھی جب پرتگالیوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم جما لیے تو اسی دور میں یہ یورپی قوم بھی بطور تاجر یہاں داخل ہوئے۔

جنگ پلاسی میں جب انگریز کو کامیابی نصیب ہوئی تو ہندوستان سے ان کی تجارت بھی ختم ہوگئی اور ان کی تجارت و اقتدار انگریز نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ تیسری قوم جو ہندوستان میں حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھی وہ فرانسیسی تھے اس کے بعد انگریز اس سرزمین پر وارد ہوئے۔ جنہوں نے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچایا۔ محمود الرحمٰن نے سچ کہا ہے:

> ... اسی سرزمین پر ایک بیرونی قوم ایسی بھی آئی جس نے جنگ و جدال اور یورش و حملے کے مصدقہ قوانین کو یک لخت نظر انداز کر دیا اور پر فریب سازشوں کے جال پھیلا کر ایسے بہمانہ انداز میں شب خون مارا ہے کہ تاریخ عالم شاید اس کی نظیر نہ پیش کر سکے۔ یہ اہل فرنگ جو حقیقت میں محض تجارت کی غرض سے ہندوستان گئے تھے۔ بہتی گنگا میں اس طرح ہاتھ دھونے بیٹھ گئے کہ اس کے صاف و شفاف پانی کو خود اس کے وارثوں کے خون سے گل رنگ کر دیا۔[۸۲]

انگریز کس طرح سے برصغیر میں آئے؟ اور یہاں آ کر انہوں نے کس طرح سے سازشوں کے جال پھیلائے؟ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے؟ سلطنت مغلیہ کے زوال اور ملکی انتشار پر شروع ہی سے ان کی گہری نظر تھی۔ اٹھارویں عیسوی میں جب ہندوستان پر مغلوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو انگریزوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر کے اپنی فوجی طاقت کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ کیونکہ طوائف الملوکی کے اس دور میں انہیں تجارت سے زیادہ سیاست نفع بخش ہوئی۔ بقول کرم حیدری:

... کمپنی کے طالع آزماؤں نے دیکھا کہ ہندوستان کی مرکزیت ختم ہوچکی ہے اور مغلیہ سلطنت کے تناور درخت کے ڈال ٹوٹ ٹوٹ کر اطراف اکناف میں جڑیں پکڑنے کی فکر میں ہیں۔ انہوں نے ان ٹوٹے ہوئے ڈالوں سے پھل توڑتوڑ کر اپنی جھولیاں بھرنی شروع کردیں۔ چھوٹی چھوٹی حفاظتی فوجیں جو انہوں نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کے لیے رکھی ہوئی تھیں ان کو ان موقع شناسوں نے چھوٹے چھوٹے مقامی راجاؤں اور نوابوں کے جھگڑوں میں استعمال کرنا شروع کردیا... ۸۳

ڈاکٹر محمد اسلام انگریزوں کے قدم جمانے اور لوٹ کھسوٹ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرلی اور اس نے ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کیا''۔۸۴ انگریز کس طرح ہندوستان میں وارد ہوئے اور حصول اقتدار کی کیا کوششیں کیں اس بارے میں ارشاد حسین نقوی کہتے ہیں:

یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ فرنگیوں نے ہندوستان میں اپنے قدم ایک تاجر قوم کی حیثیت سے جمائے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ان پر خوب چوٹ کی ہے:

مصلحت کوش مری فطرت پاکیزہ نہ تھی
حکم حاکم کو کبھی حکم اپنی نہ کہا
گر یہی میری خطا ہے تو خطا وار ہوں میں
میں نے شمشیر فروشوں کو سپاہی نہ کہا

کچھ عرصہ تک یہ تاجر بہ شمشیر فروش اسلامی سلطنت کی کمزوریوں کو دیکھتے رہے۔ فرانگیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی حکومت کا آغاز بنگال سے کیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی سلطنت کی حدود کو کلکتہ سے دہلی تک وسیع کر دیا اور ہندوستان کے طاقت ور ترین حکمران بن بیٹھے اور برعظیم پاک وہند جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اسے مٹی کا کھلونا بنا کر رکھدیا ان عیار اور مکار حاکموں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے کلیے پر عمل کیا۔۸۵

اگرچہ پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے برصغیر پاک وہند پر حکمرانی کے خواب دیکھے تھے لیکن انگریزوں نے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا ان تینوں میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ ہوتی رہی اور آخرکار

انگریز فتح یاب ہوئے۔انگریزوں نے فرانسیسیوں پر غالب آنے کے بعد بنگال میں ریشہ دوانیوں کا جال بچھایا۔اگرچہ سراج الدولہ نے انگریزی قلعہ بندیوں کو مسمار کرنے کا حکم جاری کیا لیکن بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:''کمپنی نے سیاسی حکمت عملی جس میں بقول میجر با سو معاہدے، سازش، غداری، فریب دہی اور ڈپلومیسی کے الفاظ ہم معنی مفہوم رکھتے تھے۔ بالآخر غالب آ گئی اور سراج الدولہ کو شکست کے علاوہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے''۔[۸۶]

جب بنگال میں انگریزوں نے بہت زیادہ تجارتی مفادات کے حصول کی کوشش شروع کی۔اس وقت یہ مرکز سے کٹ چکا تھا۔علی خان وردی ایک خود مختار نواب تھا۔وہ انگریزوں کے خطرے کا شدید احساس رکھتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے قلعہ بندیوں کی اجازت نہ دی تھی۔اسی نے سراج الدولہ کو وصیت کی تھی کہ انگریزوں سے خبردار رہنا۔چنانچہ نواب نے انتظام سلطنت سنبھالتے ہی انگریزوں کے خلاف اقدامات کیے۔اس پر کلائیو نے جو انگریزی مقبوضات کا گورنر تھا۔اسے سازش کے ذریعے تخت سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔بقول ڈاکٹر یوسف حسین: ''۱۷۴۸ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد دکن اور کرناٹک میں اقدار کی جولڑائی ہوئی اس میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو دیسی امراء کے نجی معاملات میں دخل اندازی کا موقع ملا''۔[۸۷]

۱۷۵۷ء پلاسی کے میدان میں کلائیو اور نواب سراج الدولہ کی فوجوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔عین لڑائی کے وقت میر جعفر اپنی فوج لے کر انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔سراج الدولہ فرار ہو گیا مگر مرشد آباد میں پکڑا گیا اور میر جعفر کے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا۔اب بنگال میں کمپنی کے مفادات محفوظ ہو گئے۔جنگ پلاسی نے ہندوستان کی تاریخ پر دور رس اثرات مرتب کیے۔اس جنگ سے سیاسی وسماجی قوتوں کو ابھرنے کا موقع ملا اور بنگال کے اس وسیع اور دولت مند صوبے پر قبضے سے انگریزوں کی قوت، شہرت اور دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اس سے ان کی حرص بھی کئی گنا بڑھ گئی۔پورے صوبے میں استحصال، ظلم و جور، لوٹ مار اور بدعنوانیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:''عسکری زاویہ نظر سے پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی لیکن نتائج کے پیش نظر اس جنگ کا شمار ہندوستان کی فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ہے۔ پلاسی کی جنگ نے انگریزوں کو بنگال کا واحد حکمران بنادیا''۔[۸۸]

مختلف چھوٹی بڑی جنگوں کے بعد پورے ہندوستان پر انگریز قابض ہوئے اور ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد دستور سازی، تعلیم اور اپنے علم وفنون کی تدریس کا کام شروع کر دیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو ذہنی طور پر غلامی کے شکنجے میں جکڑا جائے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یورپ تہذیب وتمدن، رہن سہن، سائنس اور علوم وفنون کے لحاظ سے ہندوستان سے بہت آگے ہے۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ان کی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے

اپنے مقالے میں لکھتے ہیں: ''اس زمانے میں عیسائی مبلغ کثرت سے ہندوستان آ گئے۔جنہوں نے تبلیغ وتحریص سے لوگوں کوعیسائی بنانا چاہا مگر اس میں انہیں بہت کم کامیابی ہوئی''۔[۸۹]

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ۱۸۳۵ء کے بعد کمپنی نے اپنے سامراجی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے امن و امان بحال کر کے کچھ اصلاحات کیں۔ نئے مدرسے اور کالج کھولے اور لارڈ میکالے کی سفارشات پر (۱۸۳۵ء) ملک میں نئی تعلیم کی بنیاد رکھی جس نے آگے چل کر ہندوستانی معاشرے کو بہت متاثر کیا۔عیسائی مشنریوں کی سرکاری اور غیر سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔[۹۰]

ہندوؤں نے حکومت کی جاری کردہ اصلاحات اور تعلیمات کو اپنے لیے نعمت غیر مترضہ سمجھا اور اس سے مستفید ہونے کی زیادہ کوشش کی۔ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں نے ان اصطلاحات سے فائدہ نہ اٹھایا۔ہر جگہ پر مسلمان پامال ہورہے تھے ان کی سیاسی ،سماجی ،معاشی اور معاشرتی حالت بہت خراب تھی۔تاہم ان حالات کے باوجود ان کا اجتماعی شعور ناکامیوں اور نامرادیوں نے پیدا کر دیا تھا۔وہ یہ حقیقت جان چکے تھے کہ ہندوستان سے ان کا اقتدار انگریزوں نے مکمل طور پر ختم کر دیا اور معاشی طور پر وہ بھوک وافلاس کا شکار ہو چکے تھے۔ ملک کے حالات وواقعات سے عبدالحلیم شرر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔یہی تھے وہ حالات وواقعات جنہوں نے ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو ختم کیا اور دوسری طرف انگریزوں کو ہندوستان کا حکمران بنایا۔ قوموں کی زندگی میں عروج وزوال آتا رہتا ہے اور ادیب اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ان حالات وواقعات کے شرر کے ذہنی افق پر بھی اثرات مرتب ہونے لگے۔چونکہ عبدالحلیم شرر کو تاریخ سے دلچسپی تھی اور ہندوستان کے ان حالات کے تاریخی پس منظر سے آپ بخوبی آگاہ تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف افسانوی نثر لکھی اور دوسری طرف غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے مسلمانوں کو نیا راستہ دکھایا۔اسپنگلر کا یہ نظریہ ہے کہ انسانوں کی طرح تہذیبیں بھی مختلف دوروں یعنی بچپن، جوانی اور پیری سے گزر کر تباہ ہوجاتی ہیں۔اس نظریے پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر ٹوئن بی لکھتے ہیں:

> ان عام انسانوں کی انفرادی سرگرمیاں جو ایک معاشرے کے ارکان کہلاتے ہیں وہ زندہ قومیں ہیں جن کے عمل سے معاشرے کی تاریخ مرتب ہوتی ہے......دورزوال کے افراد کی اصل بیماری یہ نہیں کہ طبعی قوی پر فالج گر گیا بلکہ یہ ہے کہ ان کی مجلسی میراث درہم برہم ہو

گئی اس وجہ سے وہ اپنی سالم قوتوں کو موثر اور تخلیقی مجلسی عمل کی شکل دینے سے محروم رہ
گئے۔[۹۱]

قوموں کے عروج وزوال کی یہ داستانیں اقوام عالم کی تاریخ میں ہر جگہ موجود ہیں۔ روم و یونان کی تہذیبیں بھی اسی طرح برباد ہوئیں تھیں۔عبدالحلیم شرر اگرچہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔لیکن ان کے فن کو سمجھنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے اس سیاسی وسماجی وتہذیبی اور علمی وادبی پس منظر کا جاننا ضروری ہے جس نے شرر پر اثرات ڈالے اور انہوں نے مختلف اصناف کے ذریعے سے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔

ج۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ادب اور دیگر فنون پر اثرات

جنگ آزادی نے ہندوستانیوں کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں کو اپنے وطن سے باہر نکال دیں لیکن اس جنگ میں بھی انگریزوں کو کامیابی ہوئی۔ اگر چہ مغل بادشاہ جنرل بخت خان، مرزا مغل، نانا صاحب عظیم اللہ خاں، مولوی احمد شاہ، فیض آبادی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، فضل حق خیر آبادی جیسے لوگوں نے اسے اہم فریضہ سمجھا لیکن اس جنگ میں بھی اہل ہندوستان کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور جنگ کے اختتام پر مسلمانوں کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ کرم حیدری لکھتے ہیں: ''انتقام لینے میں انگریز سب سے آگے نکل گئے۔ ہر انگریز مقتول کے بدلے ایک سو ہندوستانیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ دیہاتی اور شہری یکساں طور پر ان کی ہوس خوں ریزی کا نشانہ بنے''۔[۹۲]

بقول پروفیسر احمد سعید:

> ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی تھی۔ انگریز ان کو ہندستان میں اپنی سلطنت کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے اسی لیے انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ہر ممکن سعی کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کے لیے آفات و مشکلات کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا... ۹۳

انگریزوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی اس جنگ آزادی کا ذکر ہر مفکر نے کیا ہے کہ انگریز جو اپنے آپ کو مہذب قوم سمجھتے تھے اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں پر ترجیح دیتے تھے کس طرح غیر مہذب قوم بن کر سامنے آئے۔ بقول اعتزاز احسن: ''تشدد کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے جاتے جو بہت زیادہ اذیت بخش اور ذلت امیز ہوتے...''[۹۴]

اس دور کے ادیبوں کے ادب پر اس جنگ کے اثرات بھی پڑے۔ جنگ آزادی کے بعد وہ طویل دورِ غلامی شروع ہوا جس نے ہندوستان کے عوام اور خصوصاً مسلمانوں کو ہر لحاظ سے پس ماندہ رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ: ''۱۸۵۷ء برصغیر کی مسلم تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ یہ ایک ایسے تاریک باب کا آغاز ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف تو ساڑھے چھ سو سالہ (۱۲۰۶۔۱۸۵۷ء) مسلم اقتدار ختم ہو گیا اور

اور دوسری طرف غلامی کا ایک طویل دور شروع ہوا''[۹۵] اس جنگ آزادی نے سلطنت مغلیہ کے تصور پر کاری ضرب لگا کر مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا آغاز کر دیا۔ اگر چہ وہ اس سے قبل بھی پس ماندہ تھے لیکن اس جنگ نے ان کو اور زیادہ پامال کر دیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین اس صورت حال کا ذکر یوں کرتے ہیں: ''جدید اسلامی ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کی دوگونہ اہمیت ہے ایک طرف ان واقعات نے سلطنت مغلیہ کے تصور کو آخری اور کاری ضرب لگائی اور دوسری طرف زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کی مہر ثبت کر دی''۔[۹۶] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقمطراز ہیں: ''جدید اردو ادب کی تاریخ وتنقید کا آغاز ۱۸۵۷ء سے کیا جاتا ہے یہ تاریخ نہ صرف اردو زبان و ادب کی زندگی میں بلکہ برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں بڑی سیاسی اور سماجی اہمیت رکھتی ہے''۔[۹۷] بریگیڈئر خواجہ طارق محمود ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''۱۸۵۷ء جنگ آزادی کے بیج گویا عین ایک سو سال پہلے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں اس وقت بوئے گئے جب بنگال میں رابرٹ کلائیو نے نواب سراج الدولہ کے خلاف کامیابی حاصل کی''۔[۹۸] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کیوں لڑی گئی؟ اس کی کیا وجوہات یا سبب تھے؟ اور اس کی کیا اہمیت تھی؟ اس نقطہ نظر کو ممتاز حسین نے یوں واضح کیا ہے:

> یہ لڑائی جو ۵۷ء میں شمال مغربی صوبے اودھ اور گوالیار کے علاقے میں خاص طور سے لڑی گئی اور جس کا جھٹکہ سارے ہندوستان میں محسوس ہوا۔ ایک ایسی آزادی کی جنگ تھی جس میں پرانا انسان ایک نئے انسان سے نبرد آزما تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ نیا انسان جو بحر و بر، برق و باد پر حکومت کر رہا تھا تمام تر خیر کی قوتوں کا مظہر نہ تھا۔[۹۹]

پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں:

> ۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک تہذیب نے پرورش پائی تھی۔ یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ زمانہ دو تہذیبوں دو تعلیمی نظاموں زندگی کے دو فلسفوں کے تبادلے کا زمانہ تھا۔ پرانے سماجی اور سیاسی نظام کی بجائے ایک نئے سماجی اور سیاسی نظام نے جگہ سنبھالی۔[۱۰۰]

یہ کشاکش کی بھی جنگ تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اقتدار کی کشاکش نہ تھی بلکہ یہ دو مختلف قوموں کی فکری و معاشرتی، تہذیبی

وثقافتی اقتدار کی کشمکش تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں پر واضح کر دیا کہ ان کی جڑیں زمین میں نہیں ہیں۔ عین الحق فرید کوٹی کا کہنا ہے: ''۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد برصغیر کے مسلمان خود کو اکھڑے ہوئے محسوس کرنے لگے تھے انہیں یوں لگتا تھا جیسے زمین میں ان کی جڑیں نہیں ہیں''۔ ۱۰۱ اس جنگ آزادی نے ہندوستان کی فضا میں انتشار اور اضطراب اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور خاص طور پر مسلمان بہت مایوس ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے اس جنگ کو غدر کا نام دے کر مسلمانوں کو عتاب کا نشانہ بنایا۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا اور اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ اس دور میں مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ سلطنت ان سے چھوٹ چکی تھی۔ تجارت بھی ان کی تباہ حال تھی۔ جدید تعلیم کی ان کے ہاں کمی تھی۔ مسلمان کوئی اچھی ملازمت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان نہ صرف اقتصادی، سیاسی بدحالی کا شکار تھے بلکہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ذہن بصیرت سے محروم ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر حسن وقار گل رقمطراز ہیں: ''۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزدی کے بعد مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا''۔ ۱۰۲ صفدر محمود کا خیال ہے: ''۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ وہ ظالمانہ سلوک روا رکھا۔ جس کے تصور سے روح لرز جاتی ہے۔'' ۱۰۳

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی وجہ سے اقتدار مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ محمود علی لکھتے ہیں کہ: ''۱۸۵۷ کے ہنگاموں کے بعد ہندوستان تاج برطانیہ کے زیر نگیں ہو گیا۔'' ۱۰۴ تصادم او رکشمکش کی فضا نے ہندوستان کی سرزمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا بقول ڈاکٹر رؤف پارکھ:

> ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے مکمل طور پر نکل گیا۔ مسلمان سیاسی، تہذیبی اور معاشی طور پر تباہ ہو گئے۔ انگریز ملک کے سیاسی اور تہذیبی افق پر چھا گئے۔ اس طرح انگریزوں اور اہل برعظیم کے مابین ایک ذہنی، سیاسی، سماجی اور معاشی تصادم شروع ہو گیا جو نوے برس تک مختلف صورتو ں میں جاری رہا۔ ۱۰۵

سردار محمد خاں عزیز کے بقول:

> ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ایک تاریخی فیصلہ کر کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا۔ اب ہندوستان میں سب کچھ انگریز حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ المیہ سیاسی موت کے مترادف تھا۔ انگریزوں کو ہندوؤں سے نہ کوئی تاریخی دشمنی تھی اور نہ ہی مذہبی اور سیاسی لیکن مسلمانوں کے ساتھ سب تھیں۔ چنانچہ جنگ آزادی کے

نتیجہ میں صرف مسلمان ہی انگریزوں کے قہر وغضب کا نشانہ بنے۔۱۰۶

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ان مٹ یادیں چھوڑ گیا۔اس کی وجہ سے خاندانوں کے خاندان ختم ہو گئے۔ ناز ونعم میں پلنے والے آج نان کے پارے کو بھی ترستے تھے۔اس ہنگامے نے شہزادوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔اقتصادی بدحالی، ذلت و رسوائی، فاقہ کشی، دہشت اور خوف و ہراس ہندوستانیوں کا مقدر بن گیا تھا۔اس فضا میں مصلحین نے آگے بڑھ کر قوم کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنی قوم کو آمادہ کیا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔اس ہنگامے کی وجہ سے انگریز اب مکمل طور پر برصغیر پاک وہند کے حکمران بن بیٹھے تھے۔

اس ہنگامے نے پرانی قدروں کو پامال کر دیا اور نئی قدریں، نئی تہذیب وثقافت نے اپنی جگہ بنالی اور سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔وہ انگریزوں کے عتاب کا نشانہ زیادہ بنے۔ڈاکٹر اسلم فرخی کے خیال کے مطابق: ''۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی اقتدار اپنے عروج پر آ گیا۔پرانی قدریں، پرانی تہذیب اور پرانے علوم وفنون داستان پارینہ بننے لگے اور ان کی جگہ نئی قدروں، نئی تہذیب اور نئے علوم وفنون کی حکمرانی ہو گی''۔۱۰۷

بقول قاضی ذوالفقار احمد:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اہل ہند اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے اندر آزادی کی تڑپ محسوس کی جانے لگی اور آزادی کے حصول کی خاطر مختلف تحریکیں مختلف صورتوں میں برصغیر میں زندہ رہیں۔سرسید احمد خان پہلے مسلمان تھے جنھوں نے برطانوی دور میں مسلمانوں کی ابتر حالت کو محسوس کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی کو ایسی بنیادوں پر استوار کیا کے یونیورسٹی کا ہر طالب علم اپنی شخصیت میں ایک تحریک تھا...۱۰۸

اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے کوئی رہنما آگے بڑھے چانچہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو خیر خواہ بن کر دکھایا اور اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا۔سرسید کی اصلاحی تحریک کا محرک یہی تھا کہ انگریز ہمیشہ یہاں رہیں گے ان کو نکالنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔محسن الملک، حالی، نذیر احمد اور علی گڑھ سے وابستہ دوسرے لوگوں نے شدت سے اس نقطہ نظر کو اپنایا اور مسلمانوں کو سرکار کی وفادار رعایا بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔مولانا الطاف حسین حالی اپنی کتاب 'حیات جاوید' میں اسی موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

سرسید نے قسم دے کر نواب سے کہا کہ میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں آپ

اس ارادے کو دل سے نکال ڈالیں ۔انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جائے گی اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عملداری نہ کر سکے گا۔[۱۰۹]

چونکہ ہندوستان میں دو بڑے مذاہب تھے اور دوقو میں تھیں مسلمان اور ہندو۔ان دونوں مذاہب میں بنیادی اختلاف بھی تھا اور انگریزوں نے ان اختلافات کو ہوا دی تا کہ یہ دونوں آپس میں الجھتی رہیں اور انگریزوں کے مفادات پر مل کر ضرب نہ لگا سکیں ۔انہوں نے نظام تعلیم میں بھی بنیادی تبدیلیاں کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ معمولی ملازمت کے دروازے ایک تو لوگوں پر کھلنے لگے اور ان سے فائدہ حاصل کرنے والے حکومت کے وفادار بن جائیں گے اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے ایک نیا ذہن تیار ہو جائے گا جو اپنی روایات اور تہذیب وثقافت سے بیگانہ ہوگا ور یہ بیگانہ ذہن اپنی روایات کی جگہ انگریزوں کی روایات کے سحر کا آسیر ہو جائے گا اپنی چیز وں کو کمتر اور یورپ کی چیز وں کو بہتر سمجھے گا اور مستقلاً وہ ذہن احساس کمتری کا شکار رہے گا۔انگریزوں نے یہ بھی پالیسی بنائی کہ مقامی طور پر اور محدود پیمانے پر ہندوستانیوں کو نمائندگی کا حق دیا جائے ۔اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ خوش ہوں گے اور انگریزوں کو فائدہ حاصل ہوگا۔ان مقاصد کے حصول کو انگریزوں نے کس طرح یقینی بنایا؟ اور کس طریقے سے اپنے یہ مقاصد حاصل کیے؟ اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اُن حالات وواقعات پر نظر ڈالیں جو جنگ کے خاتمے کے بعد پیدا ہوئے ۔

انگریزوں کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے غربت ومفلسی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔عوام بے سکون اور بے اطمینان تھی ۔ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کے بقول: ''لوگ گورنمنٹ کو 'میٹھے زہر' 'شہد کی چھری،' اور 'ٹھنڈی آنچ' سے یاد کرتے تھے وہ کچھ ایسا محسوس کرتے تھے کہ آج نہیں تو کل تباہی ضروری ہے''۔[۱۱۰] غدر کے بعد ہندوستان میں عوام مذہبی طور پر بھی بے چینی محسوس کر رہے تھے چونکہ عیسائی مذہب کا پرچار بھی تیزی سے جاری وساری تھا اور معاشرہ پر اس کے اثرات پڑ رہے تھے ۔ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: ''جس روز سے برطانوی سامراج نے ہندوستان میں قدم رکھا۔اسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے''۔[۱۱۱] معاشرتی زندگی اس وجہ سے شدید مشکلات کا سامنا کر رہی تھی ۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کی عوام کی تعلیمی پسماندگی کا یہ حال تھا کہ خود انگریز بھی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو تعلیم نہ دی جائے اور بعض دیگر انگریز تعلیم کی حمایت بھی کرتے تھے لیکن حمایت کرنے والے بھی صرف اس حد تک حمایت کرتے تھے کہ دفتری معاملات میں آسانی پیدا ہو۔شہریوں کو مساوی حقوق نہ ملتے تھے ۔

اس دور میں ہندوستانیوں کی حالت یہ تھی کہ انگریز کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے تھے۔ چونکہ جنگ آزادی سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی جو کہ تاجروں کی تھی اور اس کا مقصد واحد دولت کمانا تھا۔ اس لیے آدم سمتھ نے کہا تھا کہ: '' تاجروں کی مخصوص حکومت شاید دنیا کی بدترین حکومت ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو۔''[۱۱۲] ایسے حالات میں یہ صورت حال یقینی تھی کہ عوام میں خوف و ہراس پیدا ہوجائے اور پھر مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ہندوستانی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے چونکہ حکومت خود عیسائی مذہب کا پرچار کر رہی تھی۔ غدر سے پہلے ان وجوہات پر معاشرتی زندگی میں بے اطمینانی تھی اور پھر ہندوستانی عوام کو پس ماندہ رکھنے کی پالیسی جو غدر سے پہلے اور بعد میں انگریزوں نے اپنائی۔ ان حالات میں واجد علی شاہ نے دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن جب اس کی سیاسی سرگرمیوں کا احتساب ہوا تو وہ بھی ہمت ہار بیٹھا۔ اب عوام الناس کے سامنے کوئی مقصد اور کوئی منزل نہ تھی۔ ان کے ذہنوں پر تباہی چھائی ہوئی تھی۔ ہندوستانیوں کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے اور اس معاشرتی بیماری نے جنم لیا جس نے اہل ہند کو عیاش اور سہل پسند بنا دیا اور زندگی کی تگ و دو سے بیزاری پیدا ہونے لگی۔ مسلمان جو اپنے شاندار ماضی سے محبت کرتے تھے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کس طرح اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کریں:

بقول حالی:

حوادث نے ان کو ڈرایا ہے کچھ کچھ
مصائب نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ بتایا ہے کچھ کچھ
زمانے کے غُل نے جگایا ہے کچھ کچھ
ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے میں کچھ کلبلانے لگے ہیں [۱۱۳]

عبدالحلیم شرر کے عہد کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ عوام ماضی پرست تھے۔ وہ اپنے شاندار ماضی پر ناز کرتے تھے اور یہ ماضی پرستی ہر اس معاشرے میں نظر آتی تھی جو اچانک تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے۔ غدر سے پہلے اور بعد کی زندگی میں ایک ہیجان کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس دور میں مسلمان زیادہ عتاب کا نشانہ بنے اور مسلم معاشرت میں معاشرتی بیماریاں در آئیں۔ چونکہ مسلمان حکمران تھے اور ان سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی اس لیے انگریزوں کا عتاب ان پر زیادہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی مشین کے وہ سب سے اہم پرزے تھے۔ انقلاب کا ان ہی پر سب سے زیادہ اثر ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس انقلاب سے پہلے عیاش نہیں تھے، تھے اور ضرور

تھے لیکن اس وقت ذہن الجھنوں سے خالی تھا اور اب الجھنوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ انہوں نے اب جو کچھ بھی کیا ایک شکست خوردہ انسان کی طرح کیا۔ وہ زندگی سے بے زار تھے۔ زندگی ان سے بھاگ رہی تھی۔ اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے ان روایات کے پرستار تھے جو ان کے اسلاف کا طرہ امتیاز تھیں۔ یہ اور تباہی کا سبب تھا جو کچھ تھا وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ زندگی شراب کے جاموں سے ناپی جا رہی تھی۔ انگریزوں نے جب برصغیر پاک و ہند کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ تو عوام الناس کے سامنے دو راستے تھے ایک ان کا اپنا کلچر اور دوسرا مغربی تہذیب و ثقافت، اب یہ ان کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ کون سا راستہ منتخب کرتے ہیں۔ پہلے راستے میں ان کے لیے کشش موجود تھی اور وہ آسانی سے اس راستے کو نہیں چھوڑ سکتے تھے اور دوسرا راستہ ان کے لیے نیا تھا۔ مشرقی کھانوں کی جگہ مغربی کھانوں نے لے لی تھی۔ مکتبی تعلیم کی جگہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم تھی۔ عورتوں کی چادر اور چار دیواری کی جگہ آزدی اور مساوات کا درس تھا۔ مغربی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیں اور ابن الوقت بن جائیں یا پھر اپنی مشرقی روایات کی پاسداری کریں۔ اس عہد کے لوگوں کے سامنے ہزاروں قسم کے اس طرح کے سوالات تھے جو ان کو حل کرنے تھے۔ معاشی حالت یہ تھی کہ کمپنی ساری ہندوستانی دولت سمیٹ کر برطانیہ منتقل کر رہی تھی۔ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں سونے کی اشرفیہ ہوا کرتی تھی اور آج کاغذ کے نوٹ تھے۔ چیزوں کی قیمت میں زبردست اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس مہنگائی اور معاشی بدحالی نے مسلمانوں کے ذہنوں میں الجھنیں پیدا کر دیں تھیں اور وہ زندگی سے حد درجہ بے زار ہو گئے تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> عظیم تہذیب مرتی نہیں۔ وہ آنے والی نسل کو بحران سے عہدہ برآ ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر قوم کے قوائے ذہنیہ پر اور عمالیہ پر اس کا ردعمل صحیح ہوتا ہے تو یہی عظیم تہذیب نئی نسل کو ایک صالح اور نیا شعور بخشتی ہے۔ پرانے دیئے سے نیا دیا روشن ہوتا ہے۔ عروج یافتہ تمدن کے زوال ہی میں وہ چنگاری ہوتی ہے جو آنے والی نسل کی استعداد عمل کو فروغ دیتی ہے۔[۱۱۴]

انگریزوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو نوازا اور مسلمانوں کو پامال کرنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور تعلیمی اعتبار سے کچلنا، دینی اور نفسیاتی طور پر مفلوج بنا دینا اور ہندوؤں کو ان کا حریف اور مد مقابل بنا کر آگے بڑھانا انگریزوں کی سیاست کی اساس تھی۔

عبدالحلیم شرر کا عہد اسلامی تحریکات کا عہد ثابت ہوا۔ معاشی، معاشرتی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی غرض یہ کہ ہر ایک میدان میں اصلاح کے لیے قدم اٹھائے گئے۔ انتشار زدہ ذہن منزل مقصود سے عاری تھے اور نئی روشنی کے

لیے ناخوشگوار،تار یکی کا دورکرنا وقت کی اہم ضرورت تھی ۔ انگریزوں کی آمد وقبضہ اور ۱۸۵۷ء کے غدر نے مسلمانوں اوردیگر ہندوستانی قوموں کے ذہنوں کومنتشر کر کے رکھ دیا تھا۔عبدالحلیم شرر کادوراصلاحات کاعبوری دور تھا۔شرر کے عہد کوسمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان نمایاں تحریکات کامختصراًجائزہ لیں جواس زمانے میں شرر سے پہلے یابعد میں ہندوستان میں اصلاح کے لیے چلائی گئی تھیں ۔

د۔ عہد شرر میں مذہبی، سیاسی، علمی و ادبی اور معاشرتی تحریکوں کا آغاز

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ ہندوستان دنیا کے تمام مذاہب کی آماجگاہ ہے۔ یہاں مسلمان عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ مت، جین مت وغیرہ آباد ہیں۔ عبدالحلیم شرر کا تعلق انہیں قوموں میں سے ایک قوم 'مسلمان' سے تھا۔ ان کی پیدائش سے بہت پہلے شاہ ولی اللہ تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جس نے مسلمانوں کے جامد محدود مذہبی تصور، مشرکانہ اوہام پرستی، قبر پرستی، عرس محرم، نذر و نیاز وغیرہ کو ترک کرنے پر یوں زور دیا تھا۔ انگریزی دور حکومت میں ہندوستان کے تمام لوگوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اب سب لوگ عیسائی بنا لیے جائیں گے اس لیے ہر مذہب کے لوگوں نے مذہب کے تحفظ کے خیال سے اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ شروع کی۔ ساتھ ہی ساتھ تلقین و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا جو عرصہ تک قائم رہا۔ ادھر مسلمانوں کے مذہب کے تحفظ کے لیے مولانا محمد قاسم نے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔ جس نے مغربی علوم کو نصاب سے نکال کر صرف اسلامی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ادھر اسی زمانے میں برہمو سماج کے کام کو بابو کشیپ نے آگے بڑھایا اور یہ سلسلہ بنگال سے ہوتے ہوئے پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے دیانند سرسوتی نے ۱۸۷۵ء میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ دور از کار روایات کو خارج کر کے ویدک عہد کے سیدھے سادھے عقائد و رسوم کو باقی رکھا جائے اور نئی تہذیب انہی اصولوں پر تعمیر کی جائے۔ ڈاکٹر محمد اسلام رقمطراز ہیں:

> اس تحریک نے نہ صرف ہندو تہذیب کے غیر ویدک اثرات کی مخالفت کی بلکہ اسلامی اور عیسائی اثرات کو ختم کر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو مذہبی تبلیغ کے ذریعہ ہندو بنایا اور ہندوؤں کو قومی تعلیم کے ذریعہ منظم کر کے انگریزوں کی سیاسی اور ذہنی حکومت سے آزاد رہنا سکھایا۔[۱۱۵]

ہندوؤں میں 'برہمو سماج' اور 'آریہ سماج' تحریکیں بھی مسیحی مناظرہ بازوں کی انگیخت پر وجود میں آئیں۔ ہندوؤں کی احیائی تحریکوں کی وجہ سے انگریزوں کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط بنائیں۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں: ''انیسویں صدی کے آخری نصف دور میں ہی آریہ سماج 'انڈین نیشنل کانگریس' وجود پذیر ہوتے ہیں۔ یہ سب ذہنی بیداری کا ثبوت ہیں۔ آنندہ چل کر یہی سیاسی کش مکش جد و جہد کا سبب بنتی ہے''۔[۱۱۶]

پنجاب میں آریہ سماج کی داغ بیل دیانند سرسوتی نے ۱۸۷۵ء میں ڈالی۔ ہندو معاشرے کی اصلاح کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگوں (خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں) کو ہندو مت میں شامل کرنا اس کے مقاصد میں

شامل تھا۔ شیخ محمد اکرام کے مطابق: ''ہندو مذہب ایک مشنری مذہب نہیں۔ آریہ سماج کے آغاز سے پہلے ہندوؤں کی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ وہ غیر قوموں میں اپنا مذہب پھیلائیں''۔ ۱۷؎ تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اذیت ناک زمانہ تھا۔ مسلمان ہر طرف سے پامال کیے جا رہے تھے۔ ان ہی حالات میں اور اسی زمانے میں اس ڈگمگاتی کشتی کو سہارا دینے والے آگے بڑھے۔ جن کے بارے میں اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

> تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ہر لحاظ سے تکلیف اور اذیت کا زمانہ تھا۔ مذہبی، ذہنی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی جو لوگ مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور ابتری سے بہت زیادہ متاثر اور پریشان ہوتے۔ ان میں حضرت سید احمد شہید بریلوی، مولانا محمد اسماعیل دہلوی اور ان کے رفقائے کرام کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۸؎

بقول آغا اشرف:

> ... حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ ایسے بلند پایا مجددین اور مجتہدین ردبدعت ایسی تحریکوں کے چراغ اپنے لہو سے جلاتے رہے۔ جس کی تبلیغ و اشاعت حضرت داتا گنج بخش ہجویری، حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت معین الدین چشتی اجمیری ایسے بزرگانِ دین اسلامی اخلاق سے قرآن کی زبان میں کرتے رہے۔ ۱۹؎

آزاد کوثری کے خیال میں: ''یہ اولیائے اکرام ہی تھے جنھوں نے اسلام پھیلایا جن کی حمایت بعض سلاطینِ دہلی سے لے کر مغل شہنشاہوں تک نے کی...'' ۲۰؎ اجتماعی طور پہ یہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نکلے اور سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور منظم طریق پر انہوں نے جدوجہد کی اور لوگوں کی باقاعدہ تربیت کی۔ یہ تحریکیں انگریزوں کے لیے دردسر بنی ہوئی تھیں۔ عبدالحلیم شرر کے فن پر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ تحریک خلافت کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور ترکی مخالفت جنگی کیمپوں میں تھے اور ترکی کے سلطان کو ہندوستان کے عوام عالم اسلام کا خلیفہ سمجھتے تھے انگریز جو جنگ لڑ رہے تھے۔ اس میں بہت سے ہندوستانی فوجی بھی تھے چونکہ اس فوج میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ کے وزیراعظم لائڈ جارج نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے اعلان کیا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی اور ترکی کو اس کے یورپی علاقوں سے بھی محروم نہیں قرار دیا جائے گا۔ جنگ کے بعد ترکی کو بہت بڑے

علاقے سے محروم کر دیا گیا اور جنگ کے دوران مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی بھی ہوئی۔ اس سے ہندوستان کے مسلمان بہت مایوس ہوئے۔ حافظ تقی الدین رقمطراز ہیں:

> تحریک خلافت ایک ہمہ گیر تحریک تھی جس کی بازگشت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ مسلمان ملکوں اور یورپ میں ہی محسوس کی گئی... تحریک خلافت نے بین الاقوامی سیاست کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اگر چہ یہ تحریک بظاہر ناکام ہوئی۔ مگر اس کے اثرات بہت دور تک ہوئے۔ تحریک خلافت نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور سیاسی بیداری کی ایک ایسی لہر اٹھی جس سے ہندوستان کی سیاست میں ایسے ستارے نمودار ہوئے جن کی روشنی آج بھی نظر آتی ہے.....اس تحریک کی وجہ سے فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی ہوئی اور ہندو مسلمان قریب آئے۔[۱۲۱]

۱۸۵۷ء کے بعد ہندو اور مسلمانوں کی یہ مشترکہ تحریک تھی۔ تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد ہندو مسلم فسادات دوبارہ جنم لینے لگے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بہت زیادہ ظلم وستم روا رکھا۔ جب سے وہ ہندوستان میں قابض ہوئے تھے۔ تب سے لے کر ہندوستان کو چھوڑتے دم تک انہوں نے ظلم وستم کے تیر چلانے کی مشق کی۔ بقول ابوالہاشم ندوی:

> متحدہ ہندوستان (بشمول پاکستان) پر انگریزوں نے ان گنت مظالم کیے ہیں۔ عصمتیں لوٹیں، کھیت جلائے، مکانات ڈھائے، جائدادیں چھین کر املاک پر قبضہ کیا۔ جاگیریں نیلام کیں، کوڑے لگائے، پھانسی دی، گولی ماری، جو کچھ کر سکتے تھے سب کچھ کیا۔ بلکہ اس سے بہت زیادہ کر گزرے۔ لیکن اس طرح کی حرکتیں زیادہ تر غدر کے دوران یا غدر کے فوراً بعد کی ہیں۔[۱۲۲]

مولانا محمد علی تحریک خلافت کے علم بردار بھی تھے۔ اس کے بارے میں جواہر لال نہرو کہتے ہیں: ''انہوں نے ترکی کی حمایت میں بڑے پرجوش مضامین لکھے اور وہ بتدریج برطانیہ کے خلاف ہوتے گئے ...''[۱۲۳] انیسویں صدی صرف برصغیر پاک وہند میں ہی کشمکش کا باعث نہ تھی بلکہ پوری دنیا میں سخت آویزش نظر آتی تھی۔

یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا تو زندگی کی قدروں میں ہلچل مچ گئی۔ اس بارے میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں:

> یورپ کے صنعتی انقلاب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی فتوحات کے ذریعے زندگی کی قدروں

> میں ایک انتشار اور ہلچل پیدا کر دی تھی۔مشرق مغرب سے،مذہب سائنس سے،قدامت جدیدیت سے،شہنشاہت جمہوریت سے، جاگیرداری سرمایہ داری سے،سرمایہ محنت سے، افکار افکار سے، روحانیت مادیت سے،غرض ہر چیز ایک دوسرے سے دست وگریباں اور برسرپیکار تھی۔[۱۴۴]

انتشار و اضطراب کی اس کیفیت نے جہاں ہندوستان کی سرزمین کو اپنی لپیٹ میں لیا۔وہاں دنیا کے کئی ممالک بھی اس کی زد میں آ گئے۔یہ آویزش اور کشمکش اسلامی ممالک میں بھی شدت اختیار کرتی جاتی تھی اسلامی ممالک میں مختلف اسلامی تحریکوں نے جنم لیا۔عبدالحلیم شرر پر بھی ان اسلامی تحریکوں کے اثرات پڑے۔مسلمان اپنے اندر بھائی چارے اور اخوت کا جذبہ رکھتے تھے۔دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی مسلمان مضطرب ہوتا تو ہندوستان کے مسلمان پریشان اور اداس ہوجاتے۔امت مسلمہ کا مزاج دیگر اقوام اور مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔مسلمانوں کے اعتقادات نجی نہیں ہیں بلکہ اجتماعی حیثیت کے حامل ہیں۔دین اسلام کا سب سے بڑا مقصد اسلامی معاشرے کا قیام ہے۔اس دور میں اسلام کی تحریکیں بھی چلی جنہوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ بقول ڈاکٹر ممتاز منگلوری رقمطراز ہیں:

> شاہ ولی اللہ دہلوی(۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) نے عمرانی حالات کا نیا رخ دیکھ کر اس کے نتائج وعواقب کو محسوس کرتے ہوئے اصلاح وتجدید کی شمع روشن کی۔شاہ ولی اللہ کی تحریک نے علما کے ایک باعمل گروہ کو معاشرتی اصلاح احوال پر آمادہ کیا۔عیسائی مشنریوں کی تبلیغی مہم نے جس کی سرپرستی کمپنی کی حکومت کر رہی تھی۔علما کے اس گروہ کو مذہبی ومعاشرتی خطرے کے علاوہ سیاسی ومعاشی خطرے کا احساس بھی دلایا۔کمپنی کے انگریز حکام تاج برطانیہ کے سائے میں ہندوستان میں مسیحی استقفیہ کی حکومت وسیادت کے خواب دیکھ رہے تھے اور مسلمانوں کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر انہیں سیاسی و معاشی اعتبار سے زندگی کے ہر شعبے میں پس ماندہ بنا دینا چاہتے تھے۔مسلمان علماء نے ان جارحانہ منصوبوں کی مدافعت ومقاومت مناظروں سے بھی کی اور داخلی اصلاح وتجدید کے علاوہ سامراج کے خلاف جہاد کی تیاریوں سے بھی ......سید احمد بریلوی(۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) کی تحریک جہاد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔[۱۴۵]

غدر کے بعد ہندوستان کی فضا میں یک لخت تبدیلی آئی اور مسلمان خاص طور پر عتاب کا نشانہ بنے۔ایسے حالات میں کسی ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو ان کی ڈگمگاتی کشتی کو کنارے پر لگا دے۔سرسید نے اپنی تحریک شروع کی

جوتحریک علی گڑھ کے نام سے منسوب ومشہور ہے۔ بقول نصرت اِدریس: ''سر سید نے اپنے کام کو مسلمان قوم کی زندگی کے ایک انتہائی نازک دور میں آگے بڑھایا۔''۱۲۶

چوہدری محمد علی کا خیال ہے:

ہند میں اپنی زندگی کے اس تاریک ترین لمحہ میں مسلم قوم نے سر سید احمد خان ایسے عظیم پیکر جرات رہنما کو پیدا کیا۔ انھوں نے خداداد بصیرت سے بھانپ لیا کہ مسلمان کس قدر پستی میں گر چکے ہیں۔ اور انھیں ابھرنے کے لیے کس قدر کٹھن اور طویل راستہ طے کرنا ہے...۱۲۷

تحریک علی گڑھ کا ایک جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس تحریک کے مقاصد کیا تھے؟۔ اس تحریک کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رفقائے سر سید نے کیا خدمات سرانجام دیں؟۔ اردو ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اور عبدالحلیم شرر کے فن پر اس تحریک کے کیا اثرات پڑے؟۔ سر سید کی تحریک محض تعلیمی تحریک ہی نہ تھی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحریک بھی تھی۔ سر سید احمد خان کی تحریک کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:'' سر سید کے عزم وہمت نے انگڑائی لی اور انہوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور یہ سچ ہے کہ اس مرد بزرگ نے قوم کی ڈوبتی ناؤ کو سہارا دیا۔۱۲۸سر سید احمد خان نے جس تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس کے کئی ایک پہلو ہیں۔ ان سے پہلے جوتحریکیں شروع ہوئیں یا ان کے بعد جن تحریکوں نے جنم لیا۔ ان کے اثرات اور پہلو تحریک علی گڑھ کا مقابلہ کسی صورت نہیں کر سکتے۔ اس تحریک کے پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

سر سید نے جس تحریک کی رہنمائی کی اس کے کئی پہلو تھے۔ تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی ......ادبی نقطہ نظر سے 'علی گڑھ تحریک' کے سارے پھل میٹھے تھے۔ جدید اردو ادبیات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے مسجع اور مقفیٰ اردو نثر کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئے طرز تحریر کو رائج کیا جو اظہار مطلب کے لیے مفید اور سمجھنے میں آسان تھا، مولانا شبلی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

... سر سید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی و صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو یہ بات آج تک نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون

> کے حکمران ہیں۔لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا۔تاہم سرسید کے فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔علی گڑھ تحریک نے قوم کو جس رنگ میں رنگا وہ مذہبی نہ تھا، بلکہ فی الحقیقت یہ ایک تعلیمی، ادبی اور کلچرل تحریک تھی۔اس کا مقصد اولیٰ قوم کی دنیاوی پستی کو دور کرنا تھا۔مذہبی احیا اس کا مطمع نظر نہ تھا۔[۱۲۹]

سرسید احمد خان کی شخصیت اور سیرت کا نمایاں پہلو قومی درد تھا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے دردمند دل کے ساتھ ساتھ کام لینے والا دماغ بھی ملا تھا جس کو انہوں نے صحیح طور پر استعمال بھی کیا۔سجاد علی انصاری لکھتے ہیں:'' ایک مستقل سیرت رکھتے تھے اور سیرت کی وسعت میں ان کے پاس قومی درد تھا اور اس درد سے کام لینے والا دماغ بھی'' ۔[۱۳۰] آج کی عینک سے دیکھیئے تو سرسید کے بیانات غلامانہ ذہنیت میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔اس زمانہ کے حالات اور اس وقت کے تقاضوں کو دیکھیئے تو وہ اپنے عہد کے سب سے دردمند اور جری انسان نظر آئیں گے۔علی گڑھ تحریک نے اسلامی پہلو کو بھی مدنظر رکھا، ادب اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس تحریک نے اپنے دوررس اثرات مرتب کیے ہیں۔ڈاکٹر محمد انور الدین کے خیال کے مطابق:'' علی گڑھ تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی جس نے ادب اور زندگی کے متعدد شعبوں پر اپنے دیرپا اور دوررس اثرات چھوڑے''۔[۱۳۱]

تحریک کے مقاصد کے حصول کے لیے سرسید احمد خان نے مختلف ذرائع اور وسائل استعمال کیے۔آپ نے سکول و کالج قائم کیا، انجمن اور ادارے بھی بنائے۔اخبارات و رسائل کا اجراء کیا۔اپنے اردگرد ایک حلقہ مفکرین اکٹھا کیا۔اپنے رفقائے خاص سے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھوائیں۔خود بھی کتابیں لکھ کر اصلاح قوم میں حصہ ڈالا۔اس تحریک کے تحت جو بھی کام آپ نے کیا اصلاح قوم کے جذبے سے سرشار ہو کر ہی کیا۔علی گڑھ تحریک اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے ہندوستان کی سب تحریکوں میں اہم ترین تحریک شمار کی جاتی ہے اس تحریک میں سرسید احمد خان کی شخصیت آفتاب کی مانند تھی۔اور نظام شمسی کے مختلف سیارے بھی تھے جنہیں ہم رفقائے سرسید کہہ سکتے ہیں۔ان میں حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاءاللہ، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی جیسی ہستیاں قابل ذکر ہیں۔سرسید احمد خان کے بعد اس تحریک کو نئی نسل کے دانش وروں نے چلائے رکھا۔عبید اللہ قریشی لکھتے ہیں:

> ۱۸۵۷ء کی لائی ہوئی تباہی کے بعد مسلمان نہایت درجہ مایوس و مضطرب تھے۔مسلمانوں کی ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔سرسید نے نئے زمانے کے مزاج سے

عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک جامع پروگرام بھیجا۔ یہ پروگرام اصلاحی بھی تھا اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لیے ایک نئے طرزِ زندگی کی تشکیل وتعبیر کا آغاز بھی۔[۱۳۲]

مولوی محمد امین زبیری لکھتے ہیں: ''سرسید کی تحریک جوان کے عمل وکردار کا دوسرا نام ہے۔ان کی حیات میں ہی پھلی پھولی اور مقبول ہوئی اور اس کی مقبولیت وافادیت ان کی زندگی میں ہی مسلم ہوگئی تھی۔مگر ان کی رحلت کے بعد وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی''۔[۱۳۳] راجہ طارق محمود رقمطراز ہیں: ''۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سرسید نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ جب تک مسلمان قوم، فاتح قوم کی زبان، تہذیب وثقافت، کلچر کو اچھی طرح سمجھ نہ لے گی اور ضرورت کے مطابق اختیار نہ کرلے کامیابی کا راستہ عنقا ہے''۔[۱۳۴] ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے: ''سرسید نے صرف تعلیمی سطح پر کام نہیں کیا بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے ان تمام شعبوں میں کام کیا جن سے مسلمانوں کے فکر ونظر بدل سکیں۔ان کا یہ دائرہ کار مذہب سے لے کر علمی وادبی خدمات تک، سیاسی سرگرمیوں سے لے کر سماجی خدمات تک پھیلا ہوا ہے''۔[۱۳۵] بقول ریاض احمد: ''یہ تحریک صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے اثرات بیرون ہند کے اسلامی ممالک میں بھی کارفرما تھے''۔[۱۳۶] جوہر لال نہرو کا خیال ہے: ''سرسید احمد خان ایک پرجوش مصلح تھے اور وہ اسلام اور جدید سائنٹیفک فکر میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے''۔[۱۳۷] ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں: ''سرسید نے مذہبی اصلاح کے رجحان کو جسے سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے ایک تحریک کی شکل دے دی تھی۔بڑے اعتماد کے ساتھ اپنایا اور اسے اپنی اصلاح وتجدید کی ہمہ گیر تحریک میں اس طرح محوری حیثیت دی کہ اس میں تقلیدی مذہب کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی''۔[۱۳۸] علی گڑھ تحریک کو عام طور پر محض تعلیمی یا سیاسی تحریک خیال کیا جاتا ہے۔مگر حق یہ ہے کہ یہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔یہ ایک لحاظ سے فکری، تہذیبی، علمی وادبی تحریک بھی ہے۔سرسید نے اردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔آپ کے ساتھیوں اور آپ کی وجہ سے اردو زبان وادب نے بہت ترقی کی۔علی گڑھ تحریک جہاں سیاسی اور مذہبی پہلو رکھتی تھی وہاں اس کا ایک پہلو ادبی و لسانی بھی تھا۔اس نے ادب اور ادیب دونوں کو متاثر کیا۔شبلی نعمانی رقمطراز ہیں:

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں۔اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت سے ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئی ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔[۱۳۹]

مولانا الطاف حسین حالی نے جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کی ابتداء کی، شبلی نے تاریخ نگاری، ذکاء اللہ اور محسن الملک نے صحیفہ نگاری کو عروج بخشا اور عبدالحلیم شرر نے تاریخ کو ناول کا پیکر عطا

کیا اور مضامین بھی لکھے اور غیر افسانوی نثر بھی۔ سر سید احمد خان نے خود مقفٰی اور مسجع عبارت کو اردو سے نکال کر عقلی علوم کی زبان بنادیا۔ تحریک علی گڑھ نے اصناف نثر کو بھی فروغ دیا۔ عنایت علی قریشی کے الفاظ میں: ''سر سید کے انداز فکر اور تحریر و تقریر نے دوسرے ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ اسی وجہ سے آپ کا دور اردو ادب کا ایک نئے دور کا آغاز کہلاتا ہے''۔[۱۴۰] محمد مہدی حسین رقمطراز ہیں: ''آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر ہوئے جاتے ہیں۔ دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں''۔[۱۴۱]

عبدالحلیم شرر بھی اسی تحریک سے اثر قبول کرنے والے ادیب ہیں۔ مسلمانوں میں علی گڑھ تحریک کے علاوہ جو دوسری تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں کئی اور علاقائی انجمنیں تھیں جو زیادہ تر علی گڑھ تحریک کے زیر اثر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر رہی تھیں۔ دو ایسے مدرسہ ہائے فکر و نظر تھے جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر معاشرتی اور سیاسی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام جنگ آزادی کے بعد ہوا۔ لیکن اس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی اور قدیم درسگاہوں میں آج بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کی ترقی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی بنیاد اچھے لوگوں نے رکھی تھی۔ یہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے درس کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں منطق، صرف و نحو، فقہ اور حدیث کا درس دیا جاتا تھا۔

ندوۃ العلماء کی تعمیر و تاسیس ۱۸۹۰ء میں شبلی نعمانی کے ہاتھوں ہوئی جو سر سید کے نورتنوں میں سے ایک رتن ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اور ان کے ساتھیوں کو جدید طرز کی اس تعلیم سے اختلاف تھا جس کی حمایت سر سید احمد خان کرتے تھے۔ اگر چہ مولانا شبلی کا شمار سر سید کے رفقاء میں ہوتا ہے، ندوۃ العلماء جس کو شبلی نعمانی کے افکار ملے اس نے بھی مسلمانوں کی بیداری میں قوم کی اصلاح ترقی میں اور اردو ادب کی خدمت میں اپنا حصہ ڈالا اور اس طرح سے ندوۃ العلماء نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے علم و ادب کی خاطر خواہ خدمت کی۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کے بانی مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے مگر سید محمد علی کانپوری خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن مراد آبادی نے اس کی تکمیل کی۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ سر سید احمد خان، وقار الملک اور محسن الملک بھی اس کے حامی تھے۔ اس کے مقاصد یہ تھے:

۱۔ عربی مدارس کے لیے ایک مفید نصاب ضروریات زمانہ کا خیال رکھ کر بنایا جائے۔

۲۔ مسلمانان برصغیر پاک و ہند کے باہمی اختلافات کو دور کر دیا جائے۔

ندوۃ العلماء سے الگ ہوکر مولانا شبلی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کردیا۔ اس کا قیام ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا۔ اس ادارے نے تصنیف وتالیف کی گراں بہا خدمت سرانجام دی۔ شبلی نعمانی اور ان کے ساتھیوں اور ان کے شاگردوں نے مل کر اسلام کی اور اپنی قوم کی بیداری کے لیے کام کیا۔

ان مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی تحریکوں کے علاوہ ایک اور تحریک بھی ہے جس کا نام اودھ پنچ کی تحریک ہے۔ اس کے بانی منشی سجاد حسین ہیں۔ سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ کے ردعمل کے طور پر یہ تحریک ابھری اور 'تہذیب الاخلاق' جو سرسید احمد خان کا رسالہ تھا۔ اس کے ردعمل میں 'اودھ پنچ' نکالا گیا۔ لیکن اس تحریک سے بھی اردو ادب کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے کہا ہے:

> 'تہذیب الاخلاق' نے سیاسی اور سماجی مسائل پر سنجیدہ مضمون نگاری کو فروغ دیا اور ایک ایسے اسلوب نگارش کو رواج دیا جس میں عقل و استدلال پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اس کے برعکس اودھ پنچ نے اردو ادب میں طنز ومزاح کی ایک نئی دنیا بسادی۔[۱۴۲]

عبدالحلیم شرر نے بھی پہلے پہل اودھ پنچ کے صفحات میں لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے جو انداز اپنایا وہ انہی سے مخصوص ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ:

> اسی زمانے میں انہیں منشی احمد علی کسمنڈی مرحوم سے صحبت ہوئی جو بعض اخبارات اور خصوصاً اودھ پنچ، میں مضامین لکھا کرتے تھے اور ان کا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا ان کے شوق دلانے سے بعض اخبارات میں مضامین لکھنے لگے جن میں بجائے پالٹکس میں منہمک ہونے کے انشا پردازی کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں منشی نول کشور صاحب نے انہیں اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں لے لیا۔ یہ نوعمری کا زمانہ تھا۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ اعلیٰ خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنی آفرینی اور لٹریری مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین اس زور وشور سے لکھنا شروع کیے کہ ہر جگہ شہرت ہوئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدرآباد میں اور بعض اور چھوٹی ریاستوں میں طلب کیے گئے مگر ناپسند کیا۔ سرسید سے کوشناسائی نہ تھی مگر انہوں نے 'روح' کے سبجیکٹ پر مولانا کا ایک مضمون اس قدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا میں اس مضمون میں کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔[۱۴۳]

بقول فرحت شاہ جہاں پوری:

مولانا کو اودھ اخبار کی وابستگی سے اپنے جوہر طبع دکھانے کے لیے وسیع میدان نصیب ہوا۔ ان کے مضامین زیادہ تر علمی تحقیقی اور فلسفیانہ ہوتے تھے۔ اسلوب نگارش میں اچھوتا پن ہوتا اس لیے تھوڑی ہی مدت میں ملک میں دھوم مچ گئی۔ سرسید نے ان کے ایک مضمون 'روح' کی بہت تعریف کی تھی اور اپنی تفسیر میں اس کے چند خیالات لینے کی اجازت چاہی تھی۔[۱۴۴]

بقول عبدالحلیم شرر: ''میں نے اودھ اخبار اور رسالہ محشر میں بہت سے تاریخی خیالی اور محققانہ مضامین لکھے جو ملک میں بہت مشہور ہوئے اور پسند کیے گئے''۔[۱۴۵]

بقول محمد یحییٰ تنہاؔ:

مولانا نے اس سے پیشتر مختلف اخباروں میں مضامین لکھے تھے اور منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم کی صحبت میں اکثر مضمون نگاری کی تھی۔ انہیں کی تجویز سے شرر کا تخلص اختیار کیا تھا اور دو چار غزلیں بھی کہی تھیں گو ان سے تلمذ نہ تھا اور جو کچھ کہتے تھے، اس پر حیدرآباد بھیج کر اپنے پرانے استاد مولوی محمد علی صاحب نظمؔ طباطبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن اخبارات کی دنیا اور مضمون نگاری کی طرف ان کو منشی احمد علی کسمنڈوی ہی نے متوجہ کیا تھا۔ غرض جس وقت منشی نول کشور صاحب نے یہ مشورہ دیا ہے وہ مضمون نگاری سے ناآشنا نہ تھے جواب دیا۔ آپ کوئی سبجیکٹ بتائیں میں اس پر مضمون لکھ کر پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اودھ اخبار کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ منشی صاحب نے ایک سیاسی مضمون بتا دیا اور مولانا شرر نے دوسرے ہی دن اودھ اخبار کے لیے دو صفحوں کا ایک مضمون لکھ کر پیش کیا۔ جسے منشی صاحب نے بہت پسند کیا اور ۱۸۸۱ء میں تیس روپیہ ماہوار پر اودھ اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔[۱۴۶]

''اودھ اخبار'' نے مولانا کو اپنے فن کے اظہار کا وسیلہ مہیا کیا تو آپ نے اپنے جوہر خاص کو اس طرح سے دکھایا کہ ہر طرف آپ کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔ یہ مضامین دو سال تک ''اودھ اخبار'' سے نکلتے رہے۔ شرر کے مضامین ''اودھ اخبار'' کے فائل میں آج بھی موجود ہیں اور بتاتے ہیں کہ 'اودھ اخبار'' کو پذیرائی مولانا شرر کی وجہ سے کس قدر حاصل ہوئی اس بارے میں سیر المصنفین کے مصنف کا کہنا کس طرح قدر درست ہے کہ:

اب مولانا کو جوہر طبع دکھانے کا نیا میدان ملا تھا۔ برابر مضامین لکھنا شروع کیے لیکن ان کے

مضامین زیادہ تر علمی، خیالی اور فلسفیانہ مذاق کے ہوتے تھے۔ یہ مضامین مسلسل دو سال تک نکلتے رہے اور ملک میں ہر طرف ان کی ایسی دھوم مچ گئی کہ اسی وقت سے مولانا کے لٹریچر کا شہرہ ہوگیا اور بڑے بڑے پرانے لکھنے والے چونک پڑے، اودھ اخبار کے فائل میں آج بھی وہ مضامین موجود ہیں اور بتا رہے ہیں کہ محض ان مضمونوں کی وجہ سے اس زمانہ کا اودھ اخبار کس قدر نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔روانی طبع کی یہ حالت تھی کہ مولانا صرف چار پانچ روز میں بیٹھ کر اتنے مضمون لکھ لیتے کہ مہینہ بھر تک اودھ اخبار میں شائع ہوتے رہتے۔ ان مضمونوں کے عنوان اس قسم کے ہوتے تھے کہ وہ چاہے کتنے ہی دنوں بعد چھپتے پرانے نہ سمجھے جاتے۔[۱۴۷]

''اودھ اخبار'' اپنے زمانے کا مشہور و معروف اخبار تھا۔''اودھ اخبار'' نے خبریں، مضامین مقالے،تبصرے،تراجمے،اداریے ہر طرح کی چیزیں شائع کیں اور شہرت حاصل کی۔ جنگ آزادی کے بعد اردو صحافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ابتدا میں ان اخبارات کی توجہ سیاست سے زیادہ مغربی علوم پر تھی لب ولہجہ بھی مصالحانہ تھا۔اسی دوران ۱۸۵۹ء میں منشی نول کشور نے لکھنو سے''اودھ اخبار'' جاری کیا جو چند سال بعد ۱۸۷۷ء میں روزنامہ ہوگیا۔یہ اخبار نوے سال تک شائع ہوا، یہ ایک غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا بلکہ ظاہری طور پر مسلمانوں کا اخبار لگتا تھا۔اس اخبار سے بڑے بڑے ادیب اور انشا پرداز وابستہ رہے۔ایک زمانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس کی ادارت سنبھالی اور اس میں ان کا شہرہ آفاق ''فسانہ عجائب'' سال بھر تک قسط وار شائع ہوا۔ کچھ عرصہ مولانا عبدالحلیم شرر بھی اس کے مدیر معاون رہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک معیاری اخبار تھا اس کی خبریں، مضامین، مقالے،تبصرے،تراجمے اداریے غرض ہر چیز متاثر کن تھی۔

مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو اودھ سلطنت کی بنیاد پڑی۔اس کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ اس نے دہلی کی تہذیب وثقافت کو ایک دم سے ختم اور تباہ ہونے سے بچالیا۔سلطنت اودھ کا بانی نواب سعادت خان برہان الملک تھا جو محمد شاہ کے عہد میں اودھ کا صوبے دار تھا، جب نادر دہلی میں قیام پذیر تھا تب اس کا انتقال ہوا اور اس کا بھانجا اور داماد صفدر جنگ کو اس کا جانشین بنادیا گیا۔صفدر جنگ کے انتقال کے بعد جب شجاع الدولہ تخت نشین ہوا اس کے بعد آصف الدوالہ تخت نشین ہوا۔بقول ڈاکٹر ممتاز منگلوری:

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ (پ ۱۸۲۲ء) میں تخت نشین ہوئے۔ اس وقت سلطنت کی بد انتظامی اور معاملات سلطنت میں کمپنی کی مداخلت اپنے عروج پر تھی۔کوئی

معاملہ ریذیڈنٹ کی مرضی کے بغیر طے نہیں ہوتا تھا۔ سلطنت کی انتظامی حالت اتنی ہی خراب تھی جتنی کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں بنگال کی تھی۔ [۱۴۸]

واجد علی شاہ اور اس دور کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا علی اظہر برلاس اپنی کتاب ''اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ تاریخ کی ان بدنصیب ہستیوں میں ہیں جو باوجود انتہائی رحم دل، نیک نفس، رعایا پرور اور قابل ہونے کے سیاسی حالات کا شکار ہوئے اور اس قدر بدنام کیے گئے کہ نہ صرف اغیار بلکہ اپنوں نے بھی ذاتی مصالح کی بنا پر ان کو مطعون کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ''دانایانِ فرنگ'' نے انتہائی عیاری اور مکاری کے ساتھ نہ صرف خود بدنام کیا بلکہ واجد علی شاہ کو خود بھی ان کو ویسا ہی سمجھنے لگے جیسا کہ انگریز چاہتے تھے۔

دام یم رنگِ زمیں بود گرفتار شدیم

جس وقت واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے (۱۸۴۷ء) اس وقت تک انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور کوئی قابل وقعت دیسی طاقت ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے مقابلے پر آسکتی۔ [۱۴۹]

واجد علی شاہ کو انگریزوں نے کس طرح معزول کیا؟ اور سلطنت کا خاتمہ کیسے ہوا؟ اس کا ذکر عبدالحلیم شرر نے ''گذشتہ لکھنو'' میں کیا ہے:

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنو میں کمال بےفکری کے ساتھ رنگ رلیاں منائی جارہی تھیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کو ریذیڈنٹوں نے یہاں کے حالات سے آگاہ کیا اور وہاں کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملک اودھ قلمرو برطانیہ میں شامل کر لیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنو میں آئی اور یکا یک خلاف توقع بادشاہ کو حکم سنایا گیا کہ آپ کا ملک انگریزی ممالک محروسہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوس لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ سالانہ ماہوار جو آپ کی اور وابستگان دامن کی ضرورتوں کے لیے بخوبی کافی ہے مقرر کی گئی اور آپ کو اجازت ہے کہ شہر کے اندر آرام سے بےفکرے بن کے بیٹھئے اور رعایا کی فکروں سے آزاد ہو کے بےغل وغش رنگ رلیاں

مٹا دیئے۔ یہ احکام سنتے ہی شہر میں سناٹا ہوگیا۔خود بادشاہ نے اودھ کے بہت کچھ عُذر خواہی کی۔ بادشاہ کی ماں اور خاص محل نے حق وکالت روک لیا مگر گورنر جنرل بہادر کے حکم میں ردوبدل کرنا صاحب ریذیڈنٹ کے اقتدار سے باہر تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت ومزاحمت کے ملک اودھ پر قبضہ کرلیا اور بادشاہ مع اپنی والدہ ولی عہد خاص خاص محلات اور جانثار ورفقاء کے کلکتہ روانہ ہوئے کہ انگلستان جا کے اپیل کریں اور اپنی بے گناہی ثابت کر کے انتزاع سلطنت کے حکم کومنسوخ کرائیں ۔[۱۵۰]

واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں لکھنوی تہذیب وثقافت کواجاگر کیا تھااور ایک ایک چیز میں لکھنو کی جھلک نظر آتی تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ لکھنو اپنے تمام تر حسن وخوبصورتی اور دلکشی سے یہاں جلوہ افروز ہوگیا ہے۔لیکن جب واجد علی شاہ کاانتقال ہواتو مٹیا برج میں لکھنو کی جھلک بھی ختم ہوگی اور بقول عبدالحلیم شرر صاحب:

آہ! یہ خوبصورت اور دلفریب نقش ٹوٹنے کے قابل نہ تھا مگر ہمارے زمانے نے مٹا ہی دیا اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں ۔۱۳۱۶ محمدی (۱۸۸۷ء) میں یکا یک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔سب باتیں خواب اور خیال تھیں ۔ ایک طلسم تھا کہ یکا یک ٹوٹ گیا اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیان ملک کو دیا کرتی تھی آج ایک وحشت ستان فنا اور عبرت کدہ ہے۔ جہاں کچھ بھی نہیں ۔جس نے اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا اب وہاں کے سناٹے کو دیکھ کر سوا اسکے کہ کمال حسرت واندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہتے رہے نام اللہ کا اور کیا کرسکتا ہے۔[۱۵۱]

عبدالحلیم شرر مٹیا برج میں بھی رہے اور وہاں پر شہزادوں سے ان کی دوستی بھی تھی ۔آپ نے اپنی آنکھوں سے میٹا برج کی تباہی اور خوشحالی کا دور دیکھا تھا۔

میں نے بادشاہ جم جاہ کو،ان کے دربار کو،محلات عالیات کی رہنے کی شان ،شاہزادگان والا تبار کی دلچسپ محبتوں کو اور سواد بنگال میں لکھنو کے اجڑے ہوئے کروفر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میٹا برج مٹی میں مل گیا ۔کلکتہ کا وہ کونہ لارڈ ڈفرن کی بے صبری پر قربان ہوگیا۔ نہ اب وہ سر بفلک کوٹھیاں باقی ہیں ۔ نہ وہ مینوسواد باغ وچمن ، نہ وہ زندہ مخلوق کا عجائب

> خانہ نظر آتا ہے ...نہ شعراء ادبا کی نکھری صحبتیں ، سب خواب وخیال ہو کر دامن فنا میں پہنچ گئیں۔مگر میری آنکھوں کے سامنے آج بھی اسی طرح پھر رہی ہیں میں نے دنیا میں آنکھ کھول کر اس مشہور شہر لکھنو کو نہیں دیکھا جو تہذیب کا مرکز شائستگی کا منبع اور علمی اور ادبی برکتوں کا خزانہ بتایا جاتا ہے مگر میٹابرج کو دیکھا جو شمع اودھ کا آخری دیوان اور دراصل اس زمانے کا زندہ لکھنو تھا۔[۱۵۲]

عبدالحلیم شرر نے جب لکھنا شروع کیا۔اس وقت انگریز پوری طرح ہندوستان کی سرزمین پر قابض ہو چکے تھے۔دہلی اور لکھنو کی تہذیب وثقافت اختتام پذیر ہو چکی تھی اور میٹابرج جس میں لکھنوی تہذیب وثقافت کی کچھ رمق باقی تھی وہ بھی واجد علی شاہ کے انتقال کے ساتھ اپنی رونق ختم کر چکی تھی۔ان سب حالات سے متاثر ہونا شرر کے لیے ضروری تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھی ہمیں ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور لکھنوی تہذیب و ثقافت کی جھلک بھی ان کے فن میں موجود ہے۔

۵۔ لکھنوی تہذیب وتمدن

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد سلطنت اودھ وجود میں آئی۔اس سلطنت کی وجہ سے دہلی کے ادباء، شعراءاور دیگر ماہرین فن کوایک نئی پناہ گاہ مل گئی۔ جہاں انہوں نے اپنے فن کو پنپنے کا موقع دیا۔اس سلطنت کے قیام کی وجہ سے دہلی کی تہذیب وتمدن لکھنومنتقل ہوگئی اور یہاں نئے سانچے میں حالات کے مطابق ڈھلنے کا اسے موقع مل گیا۔مجموعی طور پرلکھنو کےلوگ مہذب، متمدن اور شائستہ تھے۔شعروشاعری کا ہرطرف چرچا تھا اوراس میں نوابی دور کی نازک خیالیاں اورتکلف بدرجہ اتم موجودتھا۔صرف شعروشاعری میں ہی نہیں بلکہ زندگی کا ہرشعبہ آداب معاشرت اورنشست وبرخاست شائستگی کے ساتھ ساتھ اس تکلف کے رنگ سے گہرے رنگے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے زندگی میں تصنع کا عنصر غالب تھا۔لکھنو کے بارے میں ڈاکٹرسلیم اختر لکھتے ہیں:

> میں نے حیرت سے دیکھا یہ وہ لکھنو ہے جوکبھی تہذیب وثقافت،شعروادب،نازک خیالی و نازک اندامی، بانکپن اوروضع داری کامظہر تھا۔نوابوں، امراء، ارباب نشاط اورطوائفوں کا لکھنو جہاں چاندسورج کا کٹورہ بجتا تھا۔جو بے سیاگ دلی کے مقابلہ میں عروس البلادتھا۔ ......وہ لکھنوکہاں گیا؟شاید فلموں میں۔[۱۵۴]

ہرعہد کا ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔عبدالحلیم شررکا تعلق چونکہ لکھنوی تہذیب وثقافت سے گہرا تھا۔لہٰذا ان کےفن پربھی اس تہذیب کے اثرات پڑنے لازمی تھے۔آل احمدسرور نے بجا کہا ہے کہ:

> ہردورکا ادب اس دور کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے۔لکھنوکواٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک شمالی ہند کی تہذیب میں ایک نمایاں درجہ حاصل ہے ......لکھنوکی نثر میں شرر اوررسوا کی بھی اہمیت ہے جس طرح لکھنوکی شاعری میں شوق قدوائی اورچکبست کی شاعری کی اہمیت ہے۔ان کے زمانے میں لکھنو کے دینی قلعے میں کچھ شگاف ہوگئے۔ جاگیردارانہ تہذیب جسے شرافت، وضع داری اورشرقیت کا خوش نما نام دے دیا گیا تھا۔اس قدر پرانی ہوگئی تھی کہ اس کی چاک دامانی نظر آنے لگی۔اس دور کےلوگوں نےبعض نئی باتوں کوقبول کرلیا۔مگر دل سے نہیں دماغ سے۔تہذیب الاخلاق اور اودھ پنچ کی وجہ سے رسالوں اوراخباروں میں اصولی اختلافات مباحثوں اورطنز کے تیروں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔یعنی لکھنے والوں کا ایک گروہ ادب کوایک طرف لے جانا چاہتا تھا۔دوسرادوسری طرف ......شرراور

رسوا بھی لکھنوی تہذیب کی مصوری کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی اس صنف میں شامل ہو چکے ہیں جو لکھنو اور دہلی کی آمریت سے ادب کو آزاد کر رہی ہے۔ سرشار بھی نئی صنف کے قریب ہیں مگر وہ اس قدر جدید ہیں جتنے شرر اور رسوا۔ شرر نے ایک صرف علی گڑھ تحریک کی ذہنی قیادت کو قبول کیا اور دوسری طرف بعض لکھنوی خصوصیات کو کلیجے سے لگائے رکھا۔[۱۵۴]

لکھنوی ادیبوں نے اپنے اپنے فن کے ذریعے سے اپنے عہد کے لکھنو کی تہذیب و ثقافت کو اپنے قارئین تک ہر لحاظ سے پہنچانے کی کامیاب کوششیں کیں ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد میں اور مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول امراء جان ادا میں لکھنو کی تہذیب و ثقافت اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ذریعے موجود ہے۔ اسی طرح شام اودھ میں بھی بقول پروفیسر ڈاکٹر نعیم نقوی: ''پنڈت رتن سرشار نے فسانہ آزاد میں اور مرزا محمد حادی رسوا کے امراء جان ادا میں لکھنو کی تہذیب کا جو نقشہ کھینچا ہے اس حوالے سے مذکورہ تصنیفات کو اردو ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے''۔[۱۵۵]

ریاست اودھ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس ریاست کا صدر مقام لکھنو ہی تھا۔ مغلیہ سلطنت کے تباہ و برباد ہونے کی وجہ سے دہلی کی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب بھی لکھنو میں پھلنے پھولنے لگا۔ بقول فیروز مکرجی: لکھنو اس ریاست کا صدر مقام تھا اور اٹھارویں صدی سے اس کی حیثیت شمالی ہندوستان میں مغل تہذیب کے مرکز کی ہوگئی تھی۔[۱۵۶] اردو ادب میں سرشار وہ ادیب ہیں کہ جنھوں نے لکھنو کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال کے ایک ایک جز کو اپنے فسانہ آزاد میں پیش کیا ہے۔ آج اگر ہم لکھنو تہذیب و ثقافت کا نظارہ کرنا چاہیے تو اس کے لیے ''افسانہ آزاد'' سے بڑھ کر کوئی کتاب ادب میں موجود نہیں ہے۔ وہ لکھنوی جس میں عبدالحلیم شرر نے اپنی آنکھ کھولی۔ اپنا بچپن گزارا اور اپنی جوانی کے ایام ادب کی نظر کیے اور اپنا بڑھاپا بھی اس تہذیب و ثقافت میں بسر کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں: ''سرشار نے ایک ایسا آئینہ پیش کیا جس میں اس کا سارے کا سارا ماحول اور زمانہ جیتا جاگتا، چلتا پھرتا اور روتا پیٹتا زمانہ اپنے پورے تناظر کے ساتھ عکس ریز ہے''۔[۱۵۷] ڈاکٹر وزیر آغا اپنے تنقیدی مضمون ''سرشار کی تہذیب'' میں لکھتے ہیں کہ: رتن ناتھ سرشار کی تصانیف کا سب سے بڑا وصف لکھنو کی تہذیب کی عکاسی ہے''۔[۱۵۸] لکھنو کی تہذیب و ثقافت وہاں کی چہل پہل، وہاں کی رونق کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر حسین سید لکھتے ہیں کہ:

لکھنو یقیناً ہماری تہذیب کا ایک ایسا جیتا جاگتا نمونہ بلکہ شاہکار تھا جو اپنی رنگا رنگی، وسعت اور دلربائی کے اعتبار سے تقسیم برصغیر تک تقریباً ڈیڑھ سو سال تہذیب و ثقافت کے میدان میں ہندوستان کی سربراہی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ سارے لکھنو میں وہ اپنی نوعیت کا واحد شہر تھا۔ جس میں صبح بنارس کی تازگی، شام اودھ کی ملامت اور شب مالوہ کی دلکشی کی

سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ جو قدیم و جدید تہذیبوں کا ایک خوبصورت سنگم تھا۔ جس میں ہندو مسلم روایات کی لطافت ہم آغوش تھی۔ گویا وہ ایک تہذیبی ہندوستان تھا۔ ایک پر رونق اور دلنشین انجمن تھا۔ ایک نشاط آور محفل کا نمونہ تھا۔ ایک نور افشاں چراغاں کا سماں تھا۔ طلوع صبح کی کیفیت اور شام وصال کی جاذبیت تھا۔ ......اس میں شک نہیں کہ مولانا عبدالحلیم شرر نے ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' لکھ کر اس چمنستان تہذیب کا ایک روائتی مرقع پیش کیا کر دیا تھا۔[۱۵۹]

لکھنو کی سرزمین وہ زمین تھی جہاں علم و فضل کے کامل موجود تھے۔ اس میں کیا کیا کمال تھے؟ اس کا ذکر گلزار سرور میں یوں ہوا ہے کہ:

یہ زمین بسی ......سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا......اس سلیقے سے آباد ہوا کہ دنیا کے ملک اس کے روبرو ویران تھے۔ جو کوچہ نظر پڑا پر بہار تھا......سب علم و فضل کا کامل، ہر فن کے استاد شامل ایک جا تھے......جو کسی کمال کا کسی طرف سے آیا جفا دیدہ روزگار ایسے برگ و بار تھا۔ بہ چشم زدن......قدر شناسی ہوئی۔ مالا مال ہو گیا......بے فکرے اس جا کے دور دور مشہور تھے۔... فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتے تھے۔ ایسی چمک دمک ہوتی کہ حد سے گزر گئے۔[۱۶۰]

اس سرزمین کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے حکیم نثار احمد علوی لکھتے ہیں:

لکھنو!! اہل کمال نے جسے جنت زیر آسمان اور اہل دانش نے شہر زو اصفہان کہا۔ وہ لکھنو! رضوان بھی جس کا گل چین تھا۔ جو روایات سلف کا امین تھا۔ جہاں کا ذرہ ذرہ جمیل و حسین تھا۔... اور کس و ناکس غرق مے انگبین تھا۔ ایک خطہ گزین و فلک جبین تھا۔... امراء و وزرائے ذیشان، سلاطین، صاحب قرآن، عز و فخر کے آسمان تھے۔ جو دو سخا جن کی لافانی، علم و فضل میں لاثانی، رشک فردوسی و ثانی اگر کسی کو بلندی اخلاق، حسین مذاق، دولت و ثروت، جاہ و حشمت، رفعت و عظمت، دبدبہ شوکت و صولت، آئین سلطنت اور سطوت و جرات دیکھنا ہو تو ان سلاطین اودھ کو دیکھے۔[۱۶۱]

ہر قوم اپنی الگ تہذیب و تمدن اور اپنا الگ تشخص رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی وجہ سے اس خطہ ارض پر تہذیب و

ثقافت کے نقش اجاگر ہوئے۔ جس طرح ہر قوم کی اپنی تہذیب وثقافت ہوتی ہے اور ایک شخصیت بھی ہوتی ہے اور اس تہذیبی شخصیت میں کچھ ایسی مشترک باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو دوسری تہذیبوں کی ہوتی ہیں اور بعض منفرد خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو ایک قوم یا ایک جگہ کی تہذیب وثقافت سے مختلف ہوتی ہیں۔ لکھنو کی بھی اپنی ایک الگ پہچان۔ ایک الگ تہذیب وثقافت ہے۔ سبط حسن کا کہنا ہے:

> ہر قوم کی ایک تہذیبی شخصیت ہوتی ہے۔ اس شخصیت کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصتیں ہوتی ہیں جو ایک قوم کی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں۔ ہر قومی تہذیب اپنی انہیں انفرادی خصوصیتوں سے پہچانی جاتی ہے۔[۱۶۲]

بقول ڈاکٹر مظفر عباس:

> تہذیب کائنات میں انسانی ذہن کے ارتقاء کی شارع اور انسان کی تخلیقی قوتوں کے اظہار کا وہ استعارہ ہوتی ہے۔ انسان نے کائنات کے ساتھ جو پہلا رابطہ قائم کیا وہ تہذیب کا نقطہ آغاز قرار پایا کہ خالق عالم نے انسان کو احسن تقویم کے طور پر تخلیق کرتے ہوئے مسجود ملائیک قرار دیا تھا۔
>
> وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ٥ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ٥ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ٥ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥
>
> (قسم انجیر اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس شہر امن والے کی ہم نے بنایا آدمی خوب سے اندازے پر)[۱۶۳]

سلطنت مغلیہ کے زوال کی وجہ سے دہلی کی رونقیں اور علمی وادبی سرمایہ وہاں کی تہذیب وثقافت آہستہ آہستہ لکھنو میں منتقل ہوتی گئی اور لکھنوی تہذیب وثقافت روز بروز ترقی کی منازل طے کرتی گئی۔ انگریز مسلمانوں کی ہر چیز میں سے نقص نکال لیتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ عبدالحلیم شرر کا لکھنو سے گہرا تعلق تھا۔ وہاں کی علمی وادبی فضا میں ان کے فن نے ترقی کے مدارج طے کیے۔ اپنی آنکھوں سے آپ نے مسلمانوں کے دورِ انحطاط کو دیکھا اور انگریزی سامراج کے ظلم وستم کا مشاہدہ کیا۔ آپ کے فن کے محرک یہ حالات وواقعات بھی تھے اور تحریکیں بھی لکھنوی ادب بھی آپ کے نظریہ فن کا محرک ثابت

ہوا۔ یہ تھے وہ حالات و واقعات جنہوں نے عبدالحلیم شرر کا ذہن تیار ہونے میں مدد دی۔ عبدالحلیم شرر تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ قوموں کے عروج و زوال پر انہوں نے غور و فکر کیا۔ اسی لیے ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں تاریخی پہلو نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ انھیں اپنے مذہب سے بھی خاص شغف تھا۔ آخری عمر میں شرر پر صوفیانہ رنگ غالب تھا۔ انہی خوبیوں کی بنا پر انہوں نے اپنے عہد سے بھی اسی قسم کے رجحانات چنے۔

عبدالحلیم شرر چونکہ ادیب تھے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کو دیکھا اور انگریزوں کے ظلم و ستم کو بھی دیکھا اور محسوس کیا۔ وہ اس بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے کہ اگر ملتِ اسلامیہ اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش نہ کی تو یورپی اقوام ان کو تباہ و برباد کر دیں گی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ شرر اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کی حکمت عملی اور طاقت کا بھی آپ کو پورا پورا یقین تھا۔ سرسید احمد خان نے تحریک علی گڑھ شروع کی اور ان کے رفقائے کار نے اس تحریک کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی زندگیاں اور اپنا فن وقف کر دیا۔ عبدالحلیم شرر پر بھی چونکہ تحریک علی گڑھ کے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ اس دور میں آپ بھی ادب کے میدان میں آئے اور سرسید احمد خان کے مشن کو لے کر آگے بڑھے۔ آپ نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے ذریعے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف آپ نے افسانوی نثر لکھی اور ناولوں میں تاریخ کے پہلو کو پیش کیا تو دوسری طرف معاشرتی ناول بھی لکھے۔ ساتھ ہی ڈرامے کی صنف میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ان کی افسانوی نثر چاہیے وہ تاریخی ناول ہوں یا معاشرتی ناول یا ڈرامہ مقصد ایک ہی تھا کہ لوگوں کو ایک تو ان کے ماضی کی یاد دلائی جائے دوسرا موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس پر آمادہ کیا جائے کہ ان کے آبا اجداد کیا تھے؟ اور آج وہ کیا ہیں؟ غیر افسانوی نثر چاہیے وہ سیرت نگاری ہو یا سوانح عمریاں، خطوط ہوں یا تاریخ، صحافت ہو یا مضمون نگاری۔ آپ نے انشائیوں کے ذریعے سے اپنی قوم کی خدمات سرانجام دیں اور ملت اسلامیہ اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنے اور بامِ عروج تک پہنچانے کی کوشش میں ہمہ وقت سرگرداں رہے۔

پچھلے اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد صرف تاریخی، سیاسی، سماجی و مذہبی حالات و واقعات اور تحریکوں کو بحث میں لانا نہیں بلکہ وہ پس منظر اجاگر کرنا ہے جس میں عبدالحلیم شرر کی صحیح شخصیت پوری طرح واضح ہو جائے اور ان کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں آسانی ہو اور ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر جس مقصد کے تحت لکھی گئی یا ان کا نظریہ فن کیا تھے؟ اس کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

و۔شرر کی نثر نگاری کا پس منظر،محرکات ،نظریہ فن ،مختلف حیثیات ،ان کا سوانحی و ادبی تعارف اور تحقیق کے پیمانے

عبدالحلیم شرر نے اسی سیاسی و سماجی ماحول میں آنکھ کھولی تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ نے برصغیر پاک و ہند کی زندگی میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی ۔ بہت ساری روایات کو اس عظیم انقلاب نے متاثر کیا۔ یہ صدی کشمکش کی صدی تھی ۔ایک طرف تہذیبوں کے درمیان کشمکش تھی تو دوسری طرف اسلام اور عیسائیت بھی ایک دوسرے کے سامنے صف آراء تھے ۔ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> الغرض شرر نے جو زمانہ دیکھا وہ درحقیقت مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی زوال کا زمانہ تھا اور قوم کے تمام اہل فکر و نظر مختلف طریقوں سے قوم کو اس کی گرتی ہوئی حالت کا احساس دلا رہے تھے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر کہیں شبلی تاریخ کے آئینے میں قوم کو اس کی مٹی ہوئی عظمت کی جھلک دکھا رہے تھے کہیں حالی اس کی حالت زار پر نوحہ کناں تھے اور کہیں ڈپٹی نذیر احمد سماجی اور تہذیبی اصلاح کے لیے کوشاں ۔ان تمام تحریکات کے نتیجے کے طور پر خواب غفلت میں مدہوش قوم کچھ کچھ بیدار ہو چلی تھی ۔لیکن غنودگی کی کیفیت ابھی باقی تھی ۔ جسے مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے ابھی رجز خوانی کی ضرورت تھی۔ ایسی رجز خوانی جس سے قوم کے دل میں پھر سے اپنے ماضی ، اپنے اسلاف، اپنی تہذیب، اپنی روایات و اقدار اور عظمت عہد رفتہ سے ایک انس پیدا ہو جائے جس کے دوبارہ حصول کے لیے وہ نئے جوش، ولولے اور عزم لے کر اٹھے۔[۱۶۴]

عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے ۔ان کی پیدائش کے وقت ۱۸۵۷ء کے اثرات واضح ہو چکے تھے ۔انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ جما لیا تھا۔شرر جب اپنے والد کے ساتھ لکھنو سے کلکتہ آئے اور وہاں انہوں نے واجد علی شاہ کی زندگی کے آخری دنوں کو اپنی نگاہوں سے دیکھا اور اسی ماحول میں ان کی پرورش و تربیت بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ بچپن سے انہیں اپنی قوم کے دکھ اور زوال کا احساس ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف وہ تعلیم جو انہوں نے نظم طباطبائی اور ہدایت اللہ شیرازی سے معقولات کی صورت میں حاصل کی تھی، اس تعلیم نے ان کے ذہن کو عقل پسندی کی ان راہوں پر گامزن کیا جس کے ڈانڈے سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ سے ملتے ہیں۔محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے ایک طرف شرر متاثر ہوئے تو دوسری طرف تحریک علی گڑھ سے ۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کا کہنا ہے کہ:

یہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ شرر کا ذہن شروع ہی سے زندگی کے جمود اور تعطل کے خلاف تھا اور اس میں ایک نئی ہلچل پیدا کرنے کا آرزومند تھا۔ شرر کی ان ذہنی کیفات کو سرسید، شبلی اور محسن الملک کے قرب نے اور بھی جلا بخش دی۔ اس حساس اور فعال طبیعت اور دردمند دل پر ان مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کا...... جو شدید ردعمل ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے پھر یورپ کی سیاست اور بالخصوص سسلی اور اندلس کی اس سرزمین پر اپنے اسلاف کی یادگاریں اور آثار الصنادید دیکھ کر اسلامی عہد کی سطوت کے نقوش اس طرح ذہن پر ابھرے کہ حرزِ جاں بن گئے۔[۱۶۵]

شرر مسلمانوں کو ان کے آثار سلف کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ معمولی قاعدہ ہے کہ زمانہ ہمیشہ آثار سلف کو مٹاتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے بہادروں کی بہادریاں، کیسے کیسے حوصلہ مندوں کی فیاضیاں، اعلیٰ اعلیٰ زبانوں کی جادو بھری تاثریں، کتنے کتنے بڑے بادشاہوں کی سلطنتیں، کہاں کہاں کے مسافروں کے سفرنامے،... کس کس شان کی اونچی اونچی عمارتیں،... سب پر قدامت کے پردے پڑ گئے۔ وہ حسن و عشق کے اگلے لخراش تذکرے، وہ اگلی جوانمردیوں کے پرجوش واقعے، وہ اگلی ثابت قدمیاں.. بہت تو مٹ چکیں اور جو باقی ہیں مٹتی جاتی ہیں۔[۱۶۶]

علی عباس حسینی شرر کی نثر نگاری کے محرکات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

تاریخ سے آپ کو خاص ذوق تھا۔ آپ نے انگلستان اور ممالک یورپ کی سیاحت بھی کی تھی۔ اس سفر کے سلسلے میں آپ نے وہ آثار الصنادید بھی دیکھے تھے جن سے ان ایام گزشتہ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ جب عرب کا پرچم صقلیہ و اندلس میں لہراتا تھا۔ آپ نے اس دوران میں سر والٹر سکاٹ کے وہ نام نہاد تاریخی ناول بھی دیکھے جن میں اسلام کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور عیسائیت کا فروغ دکھایا گیا ہے۔ غرض مؤرخانہ ذوق، قبولیتِ عام کی خواہش، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیاء کا خیال، تاریخی ناول لکھنے کا محرک بنا۔[۱۶۷]

بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

جب وہ انگلستان اور ممالک یورپ کی سیاحت کر رہے تھے تو ان کے ہاتھ سکاٹ کی تاریخی ناول ٹیلسمان لگی، سکاٹ نے کچھ سطحی نقوش عرب کی اسلامی زندگی کے نمایاں کیے ہیں۔

مولانا کو یہ کتاب پڑھ کر محسوس ہوا کہ اس میں اسلام کا مذاق اڑایا گیا ہے۔مذہبی جوش میں آ کر انہوں نے اس ناول کی رد میں ایسی ناولیں لکھنے کی ٹھان لی جن میں اسلامی تاریخ کو زندہ کیا جائے اور عیسائیت کی برائیاں دکھائی جائیں چنانچہ یہ جذبہ مذہبی ان کے ناول نگار ہونے کا محرک ہوا۔[۱۶۸]

ان سب محرکات کے زیر اثر شرر نے محسوس کیا کہ قوم کی اصلاح کے لیے اس میں دینی حمیت اور اپنی تاریخ سے والہانہ لگاؤ پیدا کرنا ناگزیر ہے چنانچہ انہوں نے اپنی فکر ونظر کے مطابق اسلامی تاریخ کے اس درخشاں عہد کو موضوع بنایا جسے ان کے دور کا مسلمان فراموش کر چکا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے سنہرے اوراق دفتر نسیاں سے نکال کر قوم کے سامنے پیش کیے اور اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر اپنے تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرانا چاہا۔ ظاہر ہے اس اصلاح کے جذبے کے تحت شرر ایک واضح مقصد لے کر اٹھے تھے اور ایک خاص خیال کے داعی تھے۔مولانا صلاح الدین احمد کا خیال ہے:

شرر نے اپنے موضوع کے انتخاب میں بڑی زمانہ شناسی اور دور بینی سے کام لیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے زوالِ سیاست کے ذہنی ردِعمل سے پورا فائدہ اٹھایا... ستاون کے ناکام ہنگامہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں کسی سیاسی تفوق کے تخیل سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں غیر یقینی اور مایوس کن تھے۔اس لیے فطری طور پر ان کی روحانی نظریں بار بار اپنے شاندار ماضی کی طرف اُٹھتی تھیں۔شرر کی دانش وری نے یہ نکتہ پالیا تھا اور اسے پاتے ہی انہوں نے اسے اپنے فنی اور معاشی محور کا مرکز قرار دیا۔[۱۶۹]

شرر کی غیر افسانوی نثر کا محرک مسدس حالی و سرسید احمد خان کی تحریک اور ان کے خیالات ونظریات بھی تھے۔شرر نے بھی اپنی افسانوی وغیر افسانوی نثر کے ذریعے سے آثار سلف کو ترقی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

واقعی آثارِ سلف سے ہم اپنی ترقی کے متعلق بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے حوصلے انہیں چیزوں سے بڑھتے ہیں جن سے اگلوں کی عالی ہمتیاں یاد آ جاتی ہوں۔موجودہ زمانے کے وہی اسپیکر دلوں پر خوب فتح پا سکتے ہیں جو اپنے موثر الفاظ میں اگلوں کے حالات خوش اسلوبی سے بیان کرتے رہتے ہیں۔قومی امیدوں کے تازہ ہو جانے سے کچھ امید ہے تو اسی طرح کہ موجودہ زمانے والے اگلوں سے نیک نامی کا سبق لیں۔[۱۷۰]

شرر نے اپنے مضامین کے ذریعے سے اگلوں سے نیک نامی کا سبق حاصل کرنے کا درس دیا۔ مقصدیت اور افادیت کے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان رقمطراز ہیں:

> سرسید احمد خان، حالی، شبلی اور آزاد کی مضمون نگاری عبدالحلیم شرر کا ادبی ورثہ تھی۔ اس نے انہیں دو باتوں کا شعور عطا کیا۔ دبستان سرسید سے انہوں نے مقصدیت اور افادی ادب کی قدر و قیمت کا شعور عطا پایا اور محمد حسین آزاد سے وہ اسلوب بیان پایا جو اس صنف سخن کی تاثراتی قوت اور ترغیبی صلاحیت کی بنیادی رمز تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے امتزاج سے اپنی ادبی کاوشوں میں کچھ ایسے نقش تخلیق کیے جنہوں نے رومانی ادب کی تحریک کو زبردست قوت اور توانائی عطا کی۔[۱۷۱]

ان محرکات کے سبب شرر نے محسوس کیا کہ قوم کی اصلاح کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان میں دینی حمیت پیدا کی جائے۔ تاریخ سے والہانہ لگاؤ پیدا کیا جائے۔ اسلاف کی زندگیوں کو اور ان کے کارناموں کو ان کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ درخشاں عہد کی یاد ان کے دلوں میں تازہ ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے اسلامی تاریخ اور نمایاں شخصیات کے درخشاں عہد اور زندگیوں کو موضوعِ اظہار بنایا۔ جسے اس دور کا مسلمان فراموش کر چکا تھا۔ آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر انہیں بیدار کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلمان اپنے تنزل کے اسباب پر غور و فکر کر سکیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک طرف عبدالحلیم شرر نے غیر افسانوی نثر لکھی اور دوسری طرف افسانوی نثر جس میں ڈراما اور ناول شامل ہیں۔ بقول ممتاز منگلوری:

> اس اصلاح کے جذبے کے تحت شرر ایک واضح مقصد لے کر اٹھے۔ وہ ایک خاص خیال کے داعی تھے۔ لیکن وہ کسی سیاسی لیڈر کے روپ میں، سٹیج کی بلندیوں پر سے پکارنے کی بجائے ایک ایک کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اور گدگدا کر اس غنودگی کی کیفیت سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ناول کی صنف ان دنوں نئی نئی مغرب سے آئی تھی اور لوگ اس کے فن کو نہ سمجھنے کے باوجود اس میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ شرر نے اپنے مورخانہ ذوق افتادِ طبع اور تقاضائے حالات کے تحت احیائے قوم کے لیے اسے ایک مناسب ذریعہ تصور کرتے ہوئے اپنایا اور اس طرح اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی صنف کی بنا پڑی۔[۱۷۲]

اسی اصلاحی نقطہ نظر کے تحت اور سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ کے مقاصد کے پیش نظر شرر نے جہاں

افسانوی نثر میں بے بہا اضافہ کیا اور تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے وہاں غیر افسانوی نثر میں میں بھی سیرت و سوانح، تاریخ، مضمون، انشائیہ، صحافت اور دیگر اصناف ادب میں اپنے نظریات کو پیش کیا ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

نذیر احمد کے برعکس شرر نے ناول کا لفظ سب سے پہلے اپنے قصوں کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے پرچہ ''دلگداز'' میں ناول اور ''دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء'' کے عنوان سے جو تنقیدی مضامین لکھے ان کی اب اہمیت محض تاریخی ہے لیکن وہ اس لحاظ سے ضرور دقیع ہیں کہ ان میں انہوں نے ناول کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ کم از کم ان کی ناول نویسی اور مقاصد و حرکات سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔

چند اقتباسات درج ہیں۔

''ناول کالٹریچر وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں "Light Literature" ''ادب لطیف'' کہتے ہیں اور یہ بے کاری کے وقت میں تفریح کے لیے پڑھا جاتا ہے''

''اصل یہ ہے کہ ناول سے زیادہ کوئی موثر پیرایہ کسی مسئلہ یا کسی تہذیب کے ذہن نشین کرانے اور لوگوں کو پابند بنا دینے کا ہوسکتا ہی نہیں، ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑوی دوا کے خوشگوار بنانے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔''

''کسی عشق یا جنگ کے واقعہ کو گھٹا بڑھا کر اسی رنگین عبارت میں لکھا جانا کہ قصے سے زیادہ تاریخ میں لطف آئے۔''

''تاریخ کا مذاق ملک میں صرف ناولوں نے پھیلایا۔''

چنانچہ ''دلگداز'' میں جب ''ملک العزیز ورجنا'' کی اقساط تکمیل پا گئیں تو انہوں نے ناول کے تتمہ پر لکھا:

غالباً اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور مردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کر سکتے ہیں۔ اس کا ہر ہر جملہ رگ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا تھا اور یقین ہے کہ وہ حضرات جنہوں نے غور سے اور شوق سے اس ناول کو اول سے آخر تک ملاحظہ

فرمایا ہوگا ان کے دلوں میں قومی خون جوش مار رہا ہوگا اور وہ ترقی پر تلے بیٹھے ہوں گے۔[۱۷۳]

ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شرر اپنے دور کے مسلمانوں کو ترقی کی شاہراہ پر لگانا چاہتے تھے۔ان کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ پژمردہ حوصلوں کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔رگِ حمیت اسلامی کو جوش میں لانا چاہتے تھے، یہ تمام چیزیں ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی محرک ثابت ہوئی ہیں۔شرر کا عہد مسلمانانِ برصغیر کے لیے سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی زوال کا عہد تھا۔اس زوال کو روکنے کے لیے رہنمائے قوم اپنے اپنے طریق سے مصروفِ عمل تھے۔اصلاحی تحریکوں نے قوم کو سنبھالا دیا۔سرسید کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر مولانا شبلی نعمانی مسلمانوں کو تاریخ کے آئینے میں کھوئی ہوئی عظمت کی تصویر دکھا رہے تھے اور الطاف حسین حالی اپنی اصلاحی شاعری کے ذریعے سے مسلمانوں کو بیدار کر رہے تھے۔ان اصلاحی تحریکوں کے پیشِ نظر مسلمانوں کے اندر بیداری کی ایک لہر نے جنم لیا۔مگر غفلت کی نیند کا خمار ابھی تک قائم و دائم تھا۔اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ان کے تابناک ماضی کی لازوال تہذیب و اقدار اور عظمت رفتہ کی طرف متوجہ کیا جائے۔ تا کہ ان میں جوش و جذبہ اور ولولہ بیدار ہو اور وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔شرر انہی جذبوں کو لے کر جوان ہوئے اور اس فضا اور عہد میں ان کی پرورش ہوئی۔انہوں نے قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں میں دینی حمیت و شہرت پیدا کی جائے انہوں نے اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے افسانوی اور غیر افسانوی نثر لکھی تا کہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام دوبارہ مل سکے۔مسلمانوں کے احیا کا خیال جہاں ان کی افسانوی نثر کا محرک ثابت ہوا وہاں ان کی غیر افسانوی نثر کا محرک بھی یہی ہے۔صاحبزادہ حمید اللہ لکھتے ہیں:

> اردو میں سب سے پہلے ناول نگار عبدالحلیم شرر ہیں جن کے افسانے بالکل انگریزی ناول کے نمونے پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں وہ احساس جاری و ساری معلوم ہوتا ہے جو عام انگریزی ناولوں کا خاتمہ ہے۔اس لیے ان کے افسانے ان کے پیشرووٴں کے مقابلے میں ناول کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔اس لحاظ سے شرر اردو کے اسکاٹ ہیں۔شرر کی ناول نگاری کا محرک اسکاٹ ہی ہوا۔[۱۷۴]

ایامِ جاہلیت اور آغازِ اسلام سے لے کر افریقہ، اسپین، جزیرہ صقلیہ اور ہندوستان تک مسلمانوں کے پھیلنے اور اسلامی حکومت کے عروج و زوال کے نہایت عمدہ نقوش پیش کیے ہیں۔شرر اپنی نثر نگاری کے محرکات پر ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

مجھے زیادہ فائدہ عربی کتابوں کے مطالعہ سے پہنچا اور انہیں سے میں محظوظ بھی ہوتا رہا مگر اردو میں سرسید کی تصانیف اور مولانا آزاد کی کتاب آب حیات اور نیرنگ خیال نے مجھ پر بہت اثر ڈالا... بلکہ بہت زیادہ مسدس حالی نے۔ انہیں کتابوں نے مجھے کچھ لکھنے کی جانب مائل کیا۔ لیکن زیادہ محرک یہ بات ہوئی کہ مجھے انگریزی لٹریچر کی شان اور عربی مصنفین کے فراہم کیے ہوئے مواد نے اس جانب مائل کیا کہ عربی سے حاصل کیے ہوئے خیالات اور واقعات کو انگریزی مذاق کا لباس پہناؤں۔ دراصل میرے لیے محرک یہی خیال تھا۔[۱۷۵]

شرر کا نظریہ فن

عبدالحلیم شرر کا تخلیق کیا ہوا ادب چاہیے وہ افسانوی ہے یا غیر افسانوی انسانی اقدار کے جانے پہچانے رشتے کو پیش کرتا ہے۔ شرر نیکی کی قدر کو تاریخی کہانیوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ بقول جیلانی کامران:

......نیکی کی قدر شرر کی تاریخی کہانیوں میں کیسے ظاہر ہوتی ہے؟ شرر کی کہانیوں میں مسلمان نمازی کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے چلن اور خیالات کی سمت نمائی اسلامی قدروں پر قائم ہے۔ اس کا عمل اپنے محدود دائرے میں جتنے بھی چناؤ کرتا ہے وہ برائی کی طاقتوں کی نفی کر کے انسان کو انسان کے قریب تر لانے کی خواہش کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ دکھ سے کہیں زیادہ سکھ اور اطمینان کی خوش خبری دیتا ہے۔ زبردستوں کی حمایت میں اپنا خون بہانے سے گریز نہیں کرتا۔ بوڑھوں اور عورتوں پر ظلم نہیں کرتا اور انسان کو اس کی فراست کے مطابق اپنے خالق کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ ان سب باتوں سے اس کے سوا کوئی اور مطلب نہیں کہ شرر کا مرکزی کردار زمین پر بسنے والے انسانوں کو امن اور سلامتی کا ماحول واپس لوٹانے کی ذمہ داری پر مامور ہے اور اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ زمین پر نیکی کا قیام خیر مطلق کی بشارت کا باعث بنے۔[۱۷۶]

بقول ڈاکٹر رشید خان: ''کانٹ (Kant) کی رائے میں ہر فن پہلے سے چند قاعدے فرض کر لیتا ہے یا گھڑ لیتا ہے ...... ہے جو تخلیق کو ممکن اور فن کہلائے جانے کے قابل بناتے ہیں''۔[۱۷۷] ''دلگداز'' مشہور زمانہ رسالہ کے اجراء کے مقاصد سے شرر کا نظریہ فن ابھرتا ہے۔ لکھتے ہیں: ''... بے شک زمانہ چاہیے ہمارے ساتھ کچھ کرے مگر ہم اس کا ساتھ دیتے جائیں گے اور اے اہل قوم ہماری طرح تم سے بھی یہی امید ہے کہ زمانے کا ساتھ

دینے میں پوری مستعدی دکھاؤ گے اس لیے کہ اسی میں تمہاری بھی فلاح ہے۔خوب یاد رکھو کہ جب تک زمانے کا ساتھ نہ دو گے کامیاب نہ ہو گئے''۔ [۱۷۸] اس رسالے کے ذریعے سے شرر نے اگلی پر اثر داستانیں۔قومی کارنامے، پر مذاق باتیں اور لطف سخن سے قوم کو بیدار کیا۔اس رسالے نے اردو لٹریچر پر بھی احسانات کیے اور اردو زبان میں نئی روح پھونکی۔عبدالحلیم شرر قمطراز ہیں:

دلگداز اردو رنگ سخن میں ایک نئی روح پھونکنے اور نئی طرح کی قوت مقناطیسی پیدا کرنے کے لیے جاری ہوا۔اس میں شک نہیں کہ دلگداز اپنے رنگ میں اکیلا ہے اور جس رنگ میں جاری ہے وہ بہت طبقوں کے نزدیک غیر مانوس ہے۔ ہماری آواز بتیوں کانوں کو گراں گذرتی ہوگی اور اکثر لوگ سمجھتے بھی نہ ہوں گے ...... دلگداز کا ایک ایک لفظ ان کے دل پر نشتر کا کام کرتا ہے اور ایک ایک مضمون کا اثر مہینوں ان کے دل پر پڑا رہتا ہے۔تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان پر ظلم کر کے بعض نہ بجھنے والے نکتہ چینوں کی وجہ سے اپنا رنگ بدل دیں۔دلگداز برا ہو یا بھلا بڑی کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ [۱۷۹]

رسائل کے بارے میں شرر کا نظریہ کیا تھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔انہوں نے تاریخ پر بہت زیادہ زور دیا اور ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں اس کا پہلو بھی ملتا ہے دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے بارے میں شرر کا کیا نظریہ تھا اور انہوں نے کیوں تاریخی واقعات کو اپنے فن کی زینت بنایا؟''محض واقعات دریافت کرنے کے لیے ہمیں کسی زندہ انسان کی ضرورت نہیں۔تاریخیں ہمارے ہاتھ میں ہیں جن کے صفحات گذشتہ تمام صدیوں کے مرقع بنے ہوئے ہیں۔......'' [۱۸۰]

ہائے کون سے واقعات تھے ... ہم نے توضیح کے ساتھ بیان کیا؟ کون سا حال ہے جو باقی رہ گیا؟ اس موسم کا سماں کس نے نہیں دیکھا؟ جب باغ اسلام پر بہار آئی ہوئی تھی؟ جب بغداد کے جھنڈے کا سایہ گنگا تک ادھر ٹیکس تک پڑتا تھا۔ جب اسلامی یونیورسٹیاں کھلی ہوئی تھیں اور عربی مدارس مرجع عالم تھے جب یورپ والوں کے یہ خیالات تھے کہ''علم مسلمانوں کے پاس ہے اور شیطان علم کا پھل کھلا کے مار ڈالتا ہے''جب اسلام کے تجارتی جہاز سمندروں کی سیر کرتے پھرتے تھے اور جب ان کی فتحیں سمندر کی لہروں کے ساتھ جاتی تھیں جب ان کی صناعیوں کا چرچا تھا اور ان کی عمارتیں دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی تھیں جب ہر فن کو رونق دے رہے تھے اور اپنے بعد والوں سے علم وفن کا بہت بڑا ذخیرہ

جمع کر رہے تھے۔ جب انہی کی پیروی کا نام تہذیب تھا اور ہر کمال کا تسلیم کیا جانا ان کی زبان اور ان کے قلم کے اختیار میں تھا یہ سماں سینکڑوں دفعہ دکھایا گیا اور حالات ہزاروں بار ایک حسرت کے ساتھ دوہرائے گئے مگر اثر خاک نہ ہوا۔[۱۸۱]

شرر نے تاریخ نگاری بہت زیادہ کی ہے اور اس کی اصل وجہ بقول ان کے یہ تھی کہ:

آج کل پبلک کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر طرف سے لوگ تاریخوں کو مانگ رہے ہیں۔... مگر افسوس کہ مورخ اپنا فرض منصبی بالکل نہیں ادا کر سکے اس لیے وہ پیاس ان کے بجھائے نہ بجھ سکی... ہاں اگر تاریخ لکھنے والے اپنے فن کو اچھے سلیقے سے ترتیب دے سکیں گے اور لوگوں کی خواہش کے مطابق تاریخی تصانیف مرتب کر سکیں گے تو بے شک یہ ہو سکے گا۔[۱۸۲]

شرر نے سوانح عمریاں بھی لکھی جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

اسلام کا زمانہ عروج ان لوگوں سے معمور ہے جو دین کی خدمت میں اپنا مثل اور نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ لوگ جن کے حالات دریافت کرنے کے لیے آج ہم تاریخ کے صدہا ورق الٹ ڈالتے ہیں اور آج کل کے خیر خواہان قوم جن کے حالات ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ وہی ہمارے دین کے مجدد تھے۔ طبقات علما اور ہر صدی کے فضلا کی سوانحمری دیکھیے تو معلوم ہو کہ وہ کس رتبے کے لوگ تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس میں کوئی ان کی شرکت کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے یا نہیں۔ مشاہیر علما جس کے نام اور جن کی عظمت دریافت کرنے کے لیے تو اریخ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں اور جن کا حال اسلامی دنیا کے ہر بچے کو معلوم ہے۔ اُن کا شمار بھی تو صدیاں... اُن برسوں کے برابر ہوگا جو ظہور اسلام سے لے کے ہمارے عہد تک گزرے۔[۱۸۳]

اپنے ایک اور مضمون میں عبدالحلیم شرر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

واقعی ہمارے لٹریچر کا یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ ہم اُن لوگوں کے حالات سے بہت ہی کم واقف ہیں جن کے نام بار بار ہماری زبانوں پر آتے ہیں۔ ہمارے قلموں سے نکلتے ہیں اور جو ہماری انشا پردازی کا زیور بنے ہوتے ہیں دلگداز نے اس بات کی کوشش شروع کر دی ہے کہ ایسے تمام لوگوں کے حالات سے پبلک کو واقف کر دے چنانچہ ہم بہت سے

لوگوں کے حالات اسی رسالے کے صفحوں پر شائع کر چکے ہیں۔[۱۸۴]

شرر کی افسانوی وغیر افسانوی نثر میں اسلام اور رسول پاکؐ سے محبت وعقیدت اور تعلیمات کے متعلق بھی خیالات ملتے ہیں:

> اسلام کی اصل غرض توحید تھی جو اوّل سے آخر تک قرآنِ پاک کی ہر آیت سے چمکتی نظر آتی ہے جب تک مجاہد صرف اس غرض کو پورا کر رہے تھے اور توحید کے سوا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ جما تھا۔ اُس وقت تک خدا نے اُن کی ایسی مدد کی جو دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گی لیکن مسلمانوں نے ادھر اس غرض کو چھوڑا اور ادھر خدا نے اپنا برکت اور اعانت کا ہاتھ ان کی جماعت پر سے اٹھالیا۔[۱۸۵]

اپنے ایک مضمون میں رسول پاکؐ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ......جناب حضرت محمدﷺ صرف خدا کی اس غرض کو پورا کرنے کے لیے دُنیا میں تشریف لائے تھے کہ یہود ونصاریٰ نے توحید میں جو خرابیاں پیدا کر دی ہیں اور موسیٰؑ عیسیٰؑ کی بتائی ہوئی توحید کو غارت کر دیا ہے۔ وہ انسانی لغزشوں سے پاک وصاف کر کے پھر اپنی اُسی قدیم خالص حالت پر پہنچا کے تمام عالم میں پھیلا دی جائے اور چونکہ آنحضرتؐ سچ پر تھے لہٰذا آپ کو کامیابی ہوئی اور جو اس سچے خدا کے بھیجے ہوئے مشنری کے مخالف ہوا خود خراب اور تباہ ہو گیا۔[۱۸۶]

عبدالحلیم شرر نے کئی رسائل وجرائد جاری کیے تھے، وہ ایک صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ صحافت کو بنایا اور ملک وقوم اور علم وادب کی بہت خدمت کی۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے فن کے ذریعے سے اسلامی تہذیب وتمدن کے نقوش مسلمانوں کے سامنے پیش کیے ہیں اور اُنھیں خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون ''زوالِ عجم'' میں لکھتے ہیں:

> تمام موجودہ رول اسلام اور عرب وافریقہ وروم کی مسلمان قوموں کو مجموعی طور پر دنیائے مسیحیت کو الٹی میٹم دے دینا چاہیے کہ بے شک ہم خوابِ غفلت میں تھے مگر اب ہوشیار ہیں اور اس ناگوار روست برد کو جو ظالمانہ وناصبانہ ہے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے تمدن کی موت ہی کا زمانہ آ گیا ہے تو اسے گوارا کر لیں گے مگر یہ کہہ کے کہ
>
> ع: ''فطرتر زاں مرا تا نہ لرزد زمین''

بے شک اُن ممالک کے مسلمانوں کو چاہیے کسی جگہ کے ہوں جوش وخروش سے اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے اور فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہم زندہ رہیں گے تو اپنی وقعت وعزت کے ساتھ ورنہ ہم بھی نہ ہوں گے۔ ابھی تک ہم انتظار کرتے رہے کہ تہذیب یورپ والوں کو انصاف و انسانیت کے اصول سکھائے گی لیکن اب انتظار کرنے کا وقت نہیں رہا اور آیندہ حالت نہیں دیکھی جا سکتی کہ اسلام کی تمام آزاد سلطنتیں ایک ایک کر کے فنا کر دی جائیں۔[۱۸۷]

عبدالحلیم شرر نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار جابجا کیا ہے جس سے ان کے نظریہ فن کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اِن نظریات کے تاثر سے ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے اصول بخوبی مدون کیے جا سکتے ہیں۔ شرر بنیادی طور پر مصلحِ قوم تھے وہ اپنی قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے اپنے فن کے ذریعے سے یہ فرض پورا کیا۔ شرر کے فن کا یہ بنیادی وصف ہے کہ وہ تاریخ اور افسانے کے مابین چلتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد قاری کو ذہنی تسکین اور حظ آفرینی فراہم کرنا ہے۔

شرر کے نظریہ فن کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''مولانا کو تاریخ اسلام سے بڑی دلچسپی تھی اور مذہبیات میں بھی کافی دخل تھا۔ اس لیے وہ مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کو یاد دلا کر موجودہ زوال کے اسباب پر غور کرنے کی دعوت دیتے رہے''۔[۱۸۸] شرر عظمت ماضی کی داستانیں دہرا کر مسلمانوں کے دل میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو افسروہ دلوں کی رہنمائی کر کے انھیں عمل کے راستے پر گامزن کر سکے اور اس طرح ان کے لیے روشن مستقبل کی راہیں استوار کر سکے۔ مولانا شرر کو تاریخی واقعات کی جستجو کا ذوق و شوق تھا اس لیے اِن کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں تاریخ کا پہلو کارفرما ہے۔ بقول پریم چند: تہذیب اور متانت اتنی تھی کہ تمام مسلمان سوسائٹی میں ان کا طرزِ تحریر مقبولِ عام ہوا اور تمام مہذب لوگوں نے اسے اپنے کتب خانہ میں جگہ دی'۔[۱۸۹]

اگرچہ مولانا کی شہرت اُن کی تاریخی ناول نگاری کی وجہ سے ہے لیکن انھوں نے غیر افسانوی نثر بھی لکھی ہے۔ اُن کی نثر چاہے افسانوی ہو یا غیر افسانوی ہر ایک میں تاریخ کا عنصر شامل ہے۔ تاریخ سے اُن کو خاص لگاؤ تھا اور یہ لگاؤ اُن کے فن میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ انھوں نے قدیم اسلامی حالات کو گمنامی کے پردے سے نکال کر روشنی میں لانے اور اسلاف کے کارناموں کو مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ جیسے خشک موضوع کو اپنی دلکش تحریر سے دلچسپ بنا کر لوگوں کے سامنے اپنے فن کی صورت میں پیش کیا۔ اشرف حسینی لکھتے ہیں: ''امت مسلمہ کے افکار و اذہان میں فکر اور سوچ بچار پیدا کر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تخلیق کی راہ ہموار کی''۔[۱۹۰]

شرر نے اپنے فن کے ذریعے سے مسلمانوں کے افکار واذہان میں فکر و سوچ پیدا کی۔ یہ کام انھوں نے کس طرح سے کیا اس ضمن میں قیوم نظر لکھتے ہیں:

... انھوں نے مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی تھی اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے بعض نقوش کو بچشم خود دیکھا تھا۔ تاریخِ اسلام سے بھی انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ پھر اُن کی نظر سے انگریزی کے ایسے ناول بھی گزرے تھے جن میں اسلام کا زوال اور عیسائیت کا فروغ دکھایا گیا تھا۔ اس کا ردِ عمل بھی ان پر خاصا شدید تھا۔ ہندوستان میں یہ زمانہ اگر ایک طرف مغربی اثرات کو مفید گرداننے کا تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کو اُن کی کھوئی ہوئی شوکت کا احساس دلانے کا بھی تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر شرر کو بے حد متاثر کیا اور انھوں نے اظہار کے اس نئے پیرائے کی ہمہ گیر مقبولیت کا سہارا لیتے ہوئے تاریخِ اسلام سے ایسے ورق پیش کرنا شروع کر دیئے جن سے ان کے ہم مذہبوں کے جوش اور غیرت کو ہوا دی جا سکتی تھی۔[۱۹۱]

مولانا صلاح الدین احمد، شرر کے نظریہ فن کے متعلق لکھتے ہیں:

نشر راور سرشار جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے پیشہ ور مصنفین تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی تخلیقات میں عام دل چسپی کے عنصر کو سب سے زیادہ ملحوظ رکھا۔ وہ یا تو ہمارے سامنے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا شوخ اور مچلتے ہوئے مناظر رکھ کر ہمیں اپنے آپ کو بھول جانے اور غمِ فردا کو عشرتِ امروز سے ہم کنار کر دینے میں ہماری مدد کرتے ہیں یا ہماری نا آسودہ تمناؤں اور مٹتی ہوئی یادوں کو سہارا دے کر ہمیں ایک خیالی کامرانی سے ہم آغوش کر دیتے ہیں اور یہی ان کے فن کا منشائے مقصود اور انکی مساعی کا منتہائے آخر ہے۔ اس سے آگے وہ ایک قدم نہیں بڑھاتے۔[۱۹۲]

ڈاکٹر سید اعجاز حسین رقم طراز ہیں:

شرر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی...... اسلامی تاریخ عربی اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بھولی جاتی تھی۔ شرر نے از سرِ نو...... پھر دنیا کے سامنے زندہ کر کے پیش کیا جس کی وجہ سے اسلاف کے کارنامے نظروں کے سامنے آ گئے۔ دلوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا...۔[۱۹۳]

شرر نے تاریخِ اسلام کے کئی ایسے گم گشتہ ابواب کو کھوج نکالا جن میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا تھا چنانچہ جب اسلاف کے کارنامے مسلمانوں کے سامنے آئے تو ان میں جوش اور ولولہ پیدا ہوا، یہ ایک عظیم قومی خدمت تھی۔ شرر نے جس دور میں آنکھ کھولی تھی اُس دور، اُس عہد کے حالات و واقعات اور تحریکوں نے آپ کے فن پر بہت اثرات مرتب کیے۔ عبادت بریلوی رقمطراز ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ شرر نے جس دور میں زندگی بسر کی وہ مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا اور آزمائش کے اس دور میں احیاء کی جو تحریکیں شروع ہوئیں، ان میں زیادہ دوررس اور مؤثر سرسید کی تحریک تھی جس کا دائرہ فکر و عمل سیاست، معاشرت، تعلیم، اخلاق اور دین سب پر محیط تھا۔ سرسید کے دور کے سب اہم لکھنے والے کسی نہ کسی انداز میں ان کے پروگرام کے کافی مؤید تھے جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی اساس تھے۔ شرر ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو سرسید کے مشن کے سب پہلوؤں میں ان کے حامی اور متبع تھے اور انھیں مسلمانوں کا ہادی و رہبر تسلیم کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دو ممالک متحدہ پنجاب ہی نہیں، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک شخص نے تباہی سے بچا لیا اور وہ شخص سرسید تھا...... مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں کی طرف بھی شرر نے ''دلگداز'' کے مضامین اور اداریوں میں واضح اشارے کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی خواہش ظاہر کی ہے۔[۱۹۴]

ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جدید اردو ادب کی ترقی و بنیاد میں عبدالحلیم شرر کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اِن کا فن جدید خیالات و احساسات کا آئینہ ہے۔ اس سے انھوں نے اس وقت کام لیا جبکہ اُردو نثر عہد قدیم سے نکل کر عہدِ جدید میں داخل ہو رہی تھی اور اس کو اس طرح سے بنایا اور برتا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ایک طرف سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے عزت و وقار کو بحال کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف عبدالحلیم شرر نے اپنے فن کے ذریعے مسلمانوں میں جذبۂ حریت کو بیدار کرنے کی کاوش کی۔ عبدالحلیم شرر کا تعلق ایک عبوری دور سے تھا۔ وہ ایک ایسے طبقے کی نمائندگی کرتے تھے جس کی جڑیں ماضی میں پیوست تھیں مگر وہ ماضی کے بل بوتے پر حال میں اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ یوں وہ قدیم و جدید کے درمیان شدید ترین کشمکش کا شکار تھا۔ شرر کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ اُردو کا یہ انقلاب پسند نیا ذہن جس طرح افسانوی نثر کا بے تاج بادشاہ ہے اس طرح غیر افسانوی نثر میں بھی اپنے وقت کا

تنہا کردار ہے۔عبدالحلیم شرر کی علمی، تنقیدی، تاریخی، فکری اور فنی بصیرت کے سارے جوہر ان کی غیر افسانوی نثر میں موجود ہیں۔شرر کی نثر نگاری بتاتی ہے کہ انتہائی نامساعد حالات کے خلاف بھی جدوجہد کی جا سکتی ہے اور اس جہدوکشاکش میں بھی زندگی کی تازی اور توانائی جلا پاتی ہے۔شرر کی غیر افسانوی نثر میں انشا پردازی، تنقید، سوانح نگاری، مقالہ نویسی، تاریخ نویسی اور دوسری نثری اصناف کے اسالیب بھرپور عیاں ہوجاتے ہیں۔

شرر نے علم و ادب اور حیات و کائنات کے سارے موضوعات پر قلم اٹھایا اور مقدار کے اعتبار سے ہر موضوع پر لکھ کر اردو نثر میں اضافہ کر دیا۔اس طرح اردو زبان ہر اعتبار سے بلند تر ہوگئی اور یہ خیال باطل ہوگیا کہ اردو کوئی غیر اہم زبان ہے۔شرر نے اس حقیقت کو ثابت کیا کہ اردو زبان میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک عالمی زبان میں ہونی چاہئیں اور اردو علوم و سائنس کے حقائق کے اظہار پر پوری قدرت رکھتی ہے۔انھوں نے بعد کے ادیبوں کو راستے بتلائے چنانچہ ان کے دور کے ادیبوں نے اردو میں ادبی و علمی اصناف پر مستقل اور دائمی نوعیت کی کتابیں لکھیں۔اردو میں مختلف اصناف کے باقاعدہ شعبے قائم ہو گئے۔اردو میں صحافت نے ان کی بدولت ترقی کی۔ادبِ لطیف شرر کے ذہن کی پیداوار ہے۔

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک کا زمانہ عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کی داستان عظیم کا ابتدائیہ ہے۔یہ دور اپنی ادبی شخصیتوں کی وجہ سے تمدنی تاریخ میں قابلِ ذکر دور ہے۔سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا شبلیؔ نعمانی، محمد حسین آزادؔ، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، ذکاءاللہ اور عبدالحلیم شرر اس عہد کی وہ جلیل القدر شخصیتیں ہیں جن پر کوئی قوم بھی فخر کر سکتی ہے۔اصلاح کے اس دور میں اردو ادب نے نیا قالب اختیار کیا۔ نئے نئے علوم وفنون سے اردو زبان و ادب کو روشناس کرایا گیا۔شعر و ادب کا مذاق تبدیل ہوا۔بعض پرانی اصنافِ سخن ختم ہوگئیں۔نظم کے آفتاب نے طلوع ہوکر محفل شاعری کو روشن کیا۔ادب نے قومی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اسی دور میں اکبر الہ آبادی نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعے سے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا فریضہ سرانجام دیا اور اس عہد میں علامہ اقبال نے اپنے فن کے چراغ سے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کا حق ادا کیا۔اسی زمانے میں سرسید کے رفقاء نے شعر و ادب کی ہر صنف کو متعارف بھی کرایا اور اپنی نگارشات بھی پیش کیں۔عبدالحلیم شرر بھی اس عہد کی پیداوار ہیں اور انھوں نے بھی اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اُن کا شاندار ماضی دکھایا اور انھیں بیدار کیا اور ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ کس شمع کے پروانے تھے اور آج اُن کی حالتِ زار ایسی کیوں ہے؟ انھیں اِس بات پر شرر نے اپنے فن کے ذریعے سے آمادہ کیا کہ وہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال کرسکیں۔

شرر کی حیثیات

عبدالحلیم نے اپنی افسانوی و غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے اپنی قوم کو بیدار اور کھوئی ہوئی سند دلوانے کی بھرپور کوشش کی۔ شرر کو مختلف علوم پر عبور تھا بقول پریم چند:

> حضرت شرر عربی کے فاضل علامہ، فارسی کے عالم اجل اور ہمہ دانی میں یگانہ روزگار ہیں۔ ... ڈکشنری کی مدد سے ترجمے کر سکتے ہیں اور اردو نثر میں تو ایک نئے رنگ کے موجد اور موجودہ لٹریچر کے بانی ہیں۔[195]

عبدالحلیم شرر اُردو ادب میں مختلف حیثیتیں رکھتے تھے۔ فرحت شاہ جہاں پوری نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> وہ شاعر بھی تھے۔ نظم جدید کے موجد بھی تھے۔ اعلیٰ پایہ کے افسانہ نگار بھی تھے، عمدہ ڈراما نویس بھی تھے۔ صاحب طرز ادیب بھی تھے، بلند مرتبہ صحافی بھی تھے۔ اونچے درجے کے ناول نگار بھی تھے اور ایک وسیع النظر مؤرخ بھی تھے۔ غرض تاریخ و صحافت، شعر و ادب اور ڈراما و انشا کے ہر موڑ پر اُن کی جلوہ گری ہے۔ وہ میر امن دہلوی اور مرزا رجب علی بیگ سرور کے درمیان ایک اہم کڑی ایک نمایاں ہستی اور ایک خاص کردار ہیں۔ وہ اردو ادب کی دنیا کے ایک چابک دست مصور اور جذباتِ انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ ہیں۔ وہ نثر اردو کے نئے مجددین میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے ان مجددین ادب یعنی سرسید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار سے علیحدہ ایک رنگ اختیار کیا۔ وہ ایک خاص رنگ کے بانی بنے اور انھوں نے اپنے کمالِ فن سے انگریزی انشاءپردازی کی خوبصورت بندشوں کو ادبیاتِ اردو میں داخل کیا اور تشبیہات و استعارات وہی ایشیائی رکھے۔ اُنھوں نے تخلیقی مضامین میں بالکل انگریزی ادب کے فنکاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجیب خوبصورتی کے ساتھ انھیں اردو میں سمو دیا اور یہ رنگ قارئین کا محبوب بن گیا۔ شرر نے جدید اردو کی داغ بیل ڈالی اور یہ وہ زبان ہے جو ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے اور یہ رنگ جتنا نکھرے گا، چمکے گا، اُبھرے گا، اسی قدر شرر کا سکہ نمایاں طور پر چلتا رہے گا۔[196]

مولانا بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے مذہب اور مذہبی مسائل سے خاصی دلچسپی تھی۔ پرستارانِ اسلام کا

خاص احترام تھا، ان کے کارناموں کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اسلامی روایات واقدار سے عشق تھا۔ انھوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی۔ بقول پریم چند:

مولانا علمی خدمت کے اس قدر حریص تھے کہ ان کا مدِ مقابل آج ایک متنفس بھی نظر نہیں آتا۔ ستر برس کی عمر ہوئی، بچپن برس تک زبان اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ اودھ اخبار، روزانہ اخبار، صحیفہ نامی، ہمدرد میں کام کیا۔ محشتر، مہذب، دل گداز، اتحاد، پردۂ عصمت، العرفان ان سب رسالوں میں مضمون لکھے۔ ان میں ۴۶ برس تک دل گداز کو جاری رکھا۔ اس کے بعد ان کی تصانیف کی طرف غور کیجیے تو اس کی تعداد کم وبیش ایک سو کتب سے زائد ہے۔ دل گداز کے مختلف مضامین اور تاریخ کے بعض ابواب، ناول کے بعض حصے صیغہ تعلیم کے کورس میں داخل ہوئے۔ مولانا کے بعض ناولوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں کیے گئے۔[۱۹۷]

شرر کی حیثیات کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

شرر کثیر التصانیف صاحبِ قلم ہیں۔ انھوں نے تواریخ اور سوانح عمریاں بہت لکھی ہیں۔ ناول نگاری میں تو وہ مشہور زمانہ تھے... ان کے مضامین اور ناولوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شرر فلسفیانہ خیالات، گہرے جذبات، مکالمے اور مناظر فطرت سب کو بیان کرنے میں یکساں طور پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی انشا پردازی مکمل ہے۔[۱۹۸]

شرر نے اپنی عمر کا ایک خاص حصہ علم وادب کی خدمت میں بسر کیا۔ شرر نے افسانوی اور غیر افسانوی ہر دو طرح کی اصنافِ ادب کی خدمت کی۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ غیر افسانوی نثر لکھنے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ شرر کو قدرت کی طرف سے ہر دو طرح کی نثر لکھنے کا ملکہ تھا۔ فلسفیانہ خیالات، گہرے جذبات اور مناظرِ فطرت سب کو بیان کرنے پر قادر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی شرر کے متعلق لکھتے ہیں:

ناول نویسی کے علاوہ شرر مرحوم کا مرتبہ مضمون نگار اور انشا پرداز کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں۔ ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے عنوان سے جو مسلسل مضامین ان کے قلم سے لکھنو کے تہذیب وتمدن پر نکلے، وہ عجب نہیں کہ مدتوں زندہ رہیں اور آئندہ مؤرخین و اہلِ تحقیق برابر ان سے خوشہ چینی کرتے رہیں۔[۱۹۹]

علی عباس حسینی نے بجا کہا ہے: ''......اس میں شک نہیں کہ مولانا کے کام کی مقدار بہت ہے اور بقول

پروفیسر فراق گورکھپوری وہ ''رائی کا پہاڑ'' ہیں لیکن آپ کو اسے ٹھٹک کر دیکھنا ضرور پڑے گا''۔[۲۰۰] شرر نے مسلمانوں کے ابتر دور کو نزم گوشہ سے دیکھا اور محسوس کیا۔ اگر چہ سر سید اور اُن کے رفقا اس عہد میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی و تعلیمی بیداری کی خاطر اپنا ادب تخلیق کر رہے تھے لیکن ابھی تک مسلمانوں کی کامل بیداری کے لیے مزید کسی نظری کوشش کی ضرورت باقی تھی۔ اِس ضرورت کو شرر نے اپنی افسانوی و غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے بخوبی پورا کیا۔ ''شہ پارے'' میں عبدالحلیم شرر کی حیثیات پر روشنی کچھ اس طرح سے ڈالی گئی ہے:

> آپ اردو کے مشہور انشا پرداز، ناول نویس اور مؤرخ تھے۔ آپ کے مضامین اور تصانیف کثرت سے ہیں ۔ ملک العزیز ورجنا، فردوس بریں، ایام عرب اور تاریخ سندھ وغیرہ ان کی کئی مشہور کتابیں ہیں۔ مضامین آٹھ جلدوں میں الگ شائع ہوئے۔ مولانا نے اردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔[۲۰۱]

عبدالحلیم شرر شاعر بھی تھے اور بقول محمد عبدالرزاق کانپوری: امیر مینائی نے طبیعت کا رنگ دیکھ کر شرر تخلص رکھا چنانچہ کسی شاعر کا یہ شعر ان کے حسب حال ہے

> ادھر چمکی، اُدھر سلگی، یہاں پھونکا وہاں پھونکا ۔[۲۰۲]

عبدالحلیم شرر وہ ادیب ہیں جنھوں نے اپنی عزت و شہرت اپنے قلم سے اِس قدر حاصل کی کہ اُس دور کے دوسرے ادباء کے حصے میں یہ کم ہی آئی۔ انھوں نے نہ صرف اردو ادب کی خدمت ہی بجا لائی بلکہ ان کے طفیل اردو ادب میں کئی انشا پرداز پیدا ہوئے۔ تاریخ کا ذوق آپ نے اپنی افسانوی و غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے پیدا کیا۔ وہ جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے۔ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

> مولانا ہمارے انشا پردازوں میں سب سے پرانے انشا پرداز تھے ...... مرحوم نے اپنی عزت اور شہرت تنہا خود اپنے قلم سے حاصل کی تھی۔ وہ اپنی شہرت کے لیے کسی نامور ہستی سے انتساب کے ممنون نہ تھے۔ انھوں نے اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ اپنی زبان کی خدمت کی فرصت پائی۔ ہمارے خیال میں ۱۸۸۲ء سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا جو اخیر زمانہ وفات دسمبر ۱۹۲۶ء تک قائم رہا...... اُن کی ادبی اور علمی خدمات کی گوناں گوں اور کثرت بھی اُن کا خاص امتیاز ہے اور یہ کہنا بھی سچ ہے کہ انھی کی تصنیفات نے اردو میں سینکڑوں انشا پرداز پیدا کیے اور ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا کیا اور سنجیدہ تصنیفات کے لیے حسن قبول کا راستہ صاف کیا ...... بظاہر وہ صرف ایک ناولسٹ یا فسانہ نگار تھے اور اسی

حیثیت سے لوگ ان کو زیادہ تر جانتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ عربی علم وادب ... تاریخ
کے بھی ماہر تھے۔[۲۰۳]

عبدالحلیم شرر کوفنِ صحافت میں بھی کمال حاصل تھا۔طبیعت ایسی ہمہ گیر تھی کہ مختلف موضوعات پر آپ نے زورِطبع دکھلایا لیکن اندازِ بیان اور آپ کے زورِ قلم میں ذرا بھر فرق نہ آیا۔ وہ زود نویس تھے۔اُن سے زود تر لکھنے والا اردو ادب کی دنیا میں کوئی انشا پرداز نہیں ہے۔اُن کی تحریر شگفتہ اور رواں دواں ہے۔شرر اپنے استاد نذیر حسینؒ کی طرح کثیر التصانیف تھے۔شرر نے ۱۵ تاریخیں، ۲۱ سوانح عمریاں، ۶ منظومات وڈرامے، ۱۸ متفرق کتب، ۱۵ خیالی ناول اور ۲۸ تاریخی ناول سپردِقلم کیے ہیں۔شرر اُس گروہ کے سرخیل کی سی حیثیت رکھتے ہیں جس نے بیسویں صدی کی ابتداء سے ذرا پہلے اپنے تاریخی اور معاشرتی ناولوں سے ایک ادبی ہنگامہ برپا کررکھا تھا۔اگرچہ اس میدان میں شرر نے ٹھوکریں بھی کھائی ہیں جس سے اُن پر حرف گیری بھی ہونے لگتی ہے لیکن اپنی اِس کوشش میں انھوں نے اُردو نثر کو ایک ایسا رنگ عطا کیا جس نے اُسے جدید نثر کے قریب تر کردیا۔مولانا نے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں جو مختلف مجموعوں کی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ان کے پڑھنے سے شرر کی معلومات کی قدر ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ آج کے زمانے میں ایسے ادیب کیوں پیدا نہیں ہوتے۔مختلف اخباروں میں بھی کام کیا۔یورپ کی سیر بھی کی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے اخبار ''ہمدرد'' میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔آپ نے خود بھی کئی اخبار اور رسائل جاری کیے اور مختلف اصناف ادب میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔شرر ایک مقصدی ادیب ہیں۔شرر نے اپنے فن کے ذریعے سے مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور معاشرتی اصلاح کی۔ز بیرام جوہر لکھتے ہیں:

> ناول نویس شرر کے پردے میں ایک عظیم انشا پرداز بھی چھپا ہوا ہے جس کے قلم میں ناول نویسی، کلام کی شیرینی اور مضامین کی معنی آفرینی کے ساتھ انشائیے کا آزاد اسلوب بھی موجود ہے۔ جدید اردو انشائیہ آج جس حالت میں ہے وہ دراصل نقشِ ثانی ہے۔نقشِ اوّل تو وہ انشائیے ہیں جو عہدِ سرسید میں لکھے گئے اور جن میں شرر کے انشائیے اہم بھی ہیں اور ممتاز بھی۔[۲۰۴]

ادب کے مورخین نے شرر کی طبیعت کی بے چینی اور جرأت مندی کو ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت قرار دیتے ہوئے ادبی زندگی میں ان کی ہمہ گیری اور کثیر جہتی کو ان کا امتیاز قرار دیا ہے۔عبدالقادر کا خیال ہے:

> "Popularity of Dilqudas was due to the fact that the editor had grasped firmly the inclination of the modern

> taste as to style as well as subject matter interesting and readable essays on historical, social and normal subjects.[۲۰۵]

مختصراً یہ کہ شررؔ اُردو کے مشہور انشا پرداز، ناول نویس اور مؤرخ تھے۔ آپ کی افسانوی وغیر افسانوی نثر سے اُردو دان طبقے میں تاریخ بینی کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ شرر نے اپنے اندازِ بیان اور موضوعات کی رنگا رنگی سے اردو ادب کی جو خدمت کی وہ نا قابلِ فراموش ہے۔ بقول ڈاکٹر علی احمد فاطمی:

> اس میں شک نہیں کہ شرر نے اس دور میں لکھنا شروع کیا جب اردو نثر اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ جس کو سرسید، حالی اور شبلی، نذیر احمد اور سرشار نے ابھی ابھی سجا کر ادب وقوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ شرر بھی اپنے پیش روؤں کی صف میں کھڑے ہو گئے اور نثر کے اس پودے کو جس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، اپنے خون اور پسینے سے سینچنے لگے۔[۲۰۶]

شرر کا سوانحی اور ادبی تعارف

عبدالحلیم نام شررؔ تخلص تھا۔ مولانا شہر لکھنو کے محلّہ جھنوائی ٹولہ میں حکیم تفضّل حسین کے ہاں بروز جمعہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا نسبتاً شیخ ہاشمی وعباسی ہیں، اوران کا سلسلہ امین الرشید سے ملتا ہے۔ دولت عباسیہ کے عہد میں ان کا خاندان عرب سے عراق میں آ کر آباد ہوا۔ پھر عراق کو چھوڑ کر ہرات اور بعد میں سلطان محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آ کر یہ خاندان آباد ہوگیا۔ بقول مولوی محمد یحیٰ تنہاؔ:

> ...ان کا خاندان دولت عباسیہ کے عہد میں عرب سے عراق میں آباد ہوا۔ پھر ارض عراق کو چھوڑ کر ہرات میں آیا۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اور سلطنت مغلیہ کے دور میں جب نئے نئے ایرانی امراء کا دربار شاہی میں رسوخ ہوا تو یہ خاندان وادی گنگا میں آ کر سکونت پذیر ہوگیا۔[۲۰۷]

مشائخ اور علماء کی شان وشوکت سے یہ خاندان اضلاع جونپور اعظم گڑھ میں اقامت گزیں ہوگیا۔ وہاں انھیں ایک جاگیر بھی ملی تھی۔ اس خاندان کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ مولانا معزالدین تھے۔ علمیت ومذہبیت سے لبریز صاحبِ علم اور مقتدائے طریقت تھے۔ ان کے ہاں کئی اولادیں ہوئیں۔ ان کے بڑے لڑکے کا نام نظام الدین تھا۔ یہ شرر کے پردادا تھے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی رقمطراز ہیں:

مولوی نظام الدین حصول علم میں اپنے اجداد سے آگے نکل گئے ۔وطن کو خیر آباد کہا اور دہلی کی راہ لی ۔ ان دنوں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ کی بڑی دھوم تھی ۔مولوی نظام الدین انہی کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے ۔ایسی تعلیم حاصل کی کہ مثال قائم کردی... ۲۰۸

مولانا کے پر دادا مولوی نظام الدین صاحب نے قصبہ کرسی کے خطیب کی بیٹی سے عقد کر کے کرسی کی سکونت اختیار کر لی ۔خطیب صاحب کی اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب مولانا کے پر دادا ہی خطابت کے وارث ہوئے ،اپنے سسر کی وفات کے بعد مولوی نظام الدین لکھنو چلے آئے ۔لکھنو میں مسٹر مارٹن کی تعلیم کا بار مولوی نظام الدین کے کاندھوں پر آپڑا ان دنوں مسٹر مارٹن لکھنو میں بڑی شہرت رکھتے تھے ۔وہ عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔اسی خاطر ان کو اپنا استاد بنالیا ۔مسٹر مارٹن اپنے استاد کا بہت احترام کرتے تھے ۔مارٹن کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر مولوی نظام الدین اپنے اہل وعیال کے ساتھ لکھنو آگئے ۔ان کے ساتھ ان کی بیوی اور دو بیٹے محمد اور احمد تھے۔ اسی جگہ پر ان کے بڑے بیٹے محمد کی ایک اولاد ہوئی جو کہ مولوی عبدالحلیم شرر کے والد تھے۔ ان کا نام عبدالرحیم رکھا گیا ۔لیکن یہ تفضل حسین کے نام سے پکارے جاتے تھے ۔اور اسی نام سے ان کی شہرت ہوئی ۔

مارٹن کے انتقال کے بعد شرر کے پردادا کا سلسلہ ملازمت ٹوٹ گیا تو یہ خاندان دوبارہ لکھنو سے منتقل ہوکر واپس کرسی آگیا ۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

اسی درمیان کرسی میں زبردست ہیضہ کی بیماری پھیلی کہ موت کے بادل منڈلانے لگے ،صدہا آدمی موت کی وادی میں پہنچ گئے اس تباہی میں مولوی نظام الدین کا خاندان بھی تباہ ہوگیا ۔مولوی نظام الدین کا انتقال ہوا ۔بڑے بیٹے مولوی محمد کا انتقال ہوا۔ اور دوسرے اعزا بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہونے لگے اس وقت تک مولوی محمد کے تین بچے ہو چکے تھے ۔چنانچہ ان کے چھوٹے بھائی مولوی احمد نے اپنی بھاوج اور بچوں کو سمیٹ کر لکھنو میں آکر پناہ لی ... مولوی محمد کی بیوی اور بچے رشتے کے ایک ماموں محمد رضا کے ہاں پناہ گزین ہوئے ۔تین بچوں میں جلد ہی دو بچے داغ مفارقت دے گئے ۔صرف ایک بچہ رہ گیا ۔جو اپنے خاندان کی حیثیت سے اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ یہ بچہ بڑا ہوتے ہی اپنے چچا کے ساتھ تجارت میں لگ گیا ۔۲۰۹

یہ بچہ تفضل حسین تھا۔ چچا نے ان کو تجارت کے آداب سکھائے ۔عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم دی۔شرر کے والد چونکہ خاندانی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد ہی انھوں نے کئی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔ تجارت کے سلسلے میں آپ پنجاب بھی جاتے تھے۔جس کی وجہ سے پنجابی بولنے کی مہارت آ گئی، خداداد صلاحیتوں کی بناپر ان کا رشتہ منشی قمر الدین کی صاحبزادی سے طے ہوا۔ان کا شمار قصبہ کرسی کے روساء اور شرفاء میں ہوتا تھا۔ یہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے دور میں ایک معزز خدمت پر معمور تھے۔جس کی وجہ سے دربار شاہی میں بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

شرر کے والد حکیم تفضل حسین قابل اور فاضل لوگوں میں سے تھے ۔عربی کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔اور فارسی میں بھی یگانہ عصر تھے آپ نے طب لکھنو کے مشہور طبیب حکیم محمد ابراہیم صاحب سے پڑھی تھی ۔غدر کے بعد وہ بھی کلکتہ آ گئے ۔واجد علی شاہ کی ملازمت اپنے سسر منشی قمر الدین کے تعلقات کے وجہ سے اختیار کی ۔شرر نے پانچ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔اپنے نانا کے بھائی مولوی محمد حفیظ الدین صاحب سے جو کڑہ بزن بیگ خان میں رہائش پذیر تھے، فارسی اور عربی میں مہارت رکھتے تھے۔ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی ان کا شمار اچھے اساتذہ میں ہوتا تھا۔تین سال گزرنے کے بعد بھی تعلیم کی رفتار سست ہی رہی ۔یہی وجہ ہے کہ انھیں کلکتہ بلالیا گیا۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:''مکتب میں تین سال گزر گئے ایک سپارہ سے آگے نہ پڑھ سکے۔ان کے والد حکیم تفضل حسین نے ان کو کلکتہ مٹیا برج بلالیا... ''۲۱۰

لکھنو اور کلکتہ کی دنیا میں زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں کے ماحول کی خوبیاں الگ الگ ضرور تھیں ۔جو ماحول واجد علی شاہ نے لکھنو میں قائم کیا تھا۔وہ یہاں بھی پنپ رہا تھا۔فرق صرف یہ تھا کہ لکھنو میں شرر محلے،گلی،کوچے اور وہاں کے لڑکوں کی صحبت میں پل رہے تھے۔ یہاں انھیں درباری ماحول ملا۔نو برس کی عمر میں جب شرر مٹیا برج پہنچے تو اس وقت ان کے نانا اور والد دونوں کو واجد علی شاہ سے قربت حاصل تھی ۔نوعمری میں شرر کو شہزادوں کی صحبت ملی ۔خوبصورت ماحول ملا جہاں ہر طرف تکلف وتصنع کی دنیا نظر آتی تھی ۔عیش وعشرت کا ساماں تھا۔آرام طلبی اور بےفکری کی فضا تھی ۔جن رنگینیوں میں رہنے کی وجہ سے شرر کو یہاں بلالیا تھا۔وہ یہاں پر دگنی صورت میں موجود تھیں ۔اس ماحول اور اس صحبت کے اثرات ان کی زندگی پر ایسے اثر انداز ہوئے جن کے نقوش ہم ان کی عمر کے آخری دور میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ قیام مٹیا برج نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔اسی ماحول میں شرر کی تعلیم کی ابتدا ہوئی ۔عربی و فارسی کی تعلیم انہیں دی جانے لگی ۔اب شرر کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اتنے کند ذہن نہیں ہیں، جتنا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں ۔رفتہ رفتہ ان کا ذہن پڑھائی کی

طرف متوجہ ہونے لگا۔بہترین تعلیم وتربیت نے ان کے ذہنی دریچے وا کیے مٹیا برج کے ماحول سے انھوں نے نقصان کم اور فائدہ زیادہ حاصل کیا۔پریم چند لکھتے ہیں:

وہیں ان کی تعلیم ہونے لگی ۔ پہلے حافظ الٰہی بخش سے سال بھر میں قرآن ختم کیا۔ ... گلستان، بوستان تک استعداد حاصل کی ملا باقر سے ہدایۃ النحو ،کافیہ، ملا جامی ختم کی۔ منشی عبداللطیف سے شرح وقایہ اور خوش نویسی سیکھی ۔مولانا طبا طبائی سے کچھ عربی کی کتابیں نکالیں ۔حکیم مسیح سے طب حاصل کی اور پندرہ برس کی عمر میں شاہی منشیوں میں اپنے والد کی جگہ پر ملازم ہوگئے ۔۲۱۱

کلکتہ میں ان کو شہزادوں کی صحبت میسر تھی اور بعض شہزادوں سے اس قدر گہرے تعلقات ہوگئے تھے کہ زنان خانے میں بھی ان کی آمدورفت تھی ۔مولانا کے لیے زبان دانی کا پہلا مدرسہ یہی شہزادوں کی صحبت قرار پائی۔ مولانا کے والد نے جب تاثیر صحبت دیکھا تو انھیں لکھنو بلا لیا۔ یہاں آکر شرر نے مولوی عبدالباری شاگرد مولانا عبدالحی سے معقول کی کتابیں پڑھیں ۔آپ لکھنو سے جب دہلی آئے تو مولانا نذیر حسین صاحب سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔

لکھنوآکر مولانا عبدالحی سے تمام کتب درسیہ پڑھیں ۔اور بعض کتابیں جو پہلے دیکھ چکے تھے ان کا دوبارہ مطالعہ کیا ۔مفتی میر عباس صاحب سے دیوانِ حماسہ اور مقامات حریری ذوق وشوق سے پڑھا۔اثنائے تعلیم ہی شرر کی شادی ان کے ماموں حکیم سعیدالدین احمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی ۔یہ واقعہ ۱۸۷۸ء کا ہے۔شادی کے بعد بھی ذوق علم میں فرق نہ آیا ۔مولانا کو تاریخی واقعات کی جستجو کا فطری ذوق وشوق تھا۔مولوی حامد حسین کا معمول تھا۔کہ تاریخ وسیر اور حدیث اہل سنت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان میں سے جو عبارتیں اپنے اغراضِ مناظرہ کے لیے مفید نظر آتیں ان پر نشان لگا دیتے تھے ۔کئی کاتب مقرر تھے جو ان عبارتوں کو کتاب اور صفحات کے حوالے سے الگ الگ کرتے تھے ۔مولانا شرر اگرچہ سنی المذہب تھے اور مولوی حامد حسین کی اس کوشش کو نہ سراہتے تھے ۔مگر علم شوق کی طلب انھیں وہاں لے گئی، محض نایاب اور بےنظیر کتب احادیث کے مطالعے کے شوق میں مولوی صاحب نے ملازمت اختیار کی اور تقریباً ڈیڑھ برس تک مولانا کاتبوں کی لکھی ہوئی عبارتوں کی تصحیح کرتے رہے۔

حدیث کی تعلیم کے شوق میں کسی کو خبر کیے بغیر ۱۸۷۹ء میں دہلی چلے گئے ۔سرسید احمد خان سے ملاقات

کے شوق میں دہلی جاتے وقت علی گڑھ سٹیشن پر اترے، سید صاحب سے ملاقات کی، ان کی باتوں نے مولانا کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ یہی وہ ملاقات تھی جس نے شرر کے دل میں سرسید احمد خان سے اُنس پیدا کیا۔ قیام دہلی کے دوران مسدس حالی کا مطالعہ بھی کیا۔ جس کے بعد سید صاحب سے بجائے اُنس کے گرویدگی پیدا ہوگئی۔ دہلی میں آپ نے مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث سے حدیث شروع کی اور ڈیڑھ برس میں صحاح ستہ، موطا امام مالک اور تفسیر جلالین ختم کی اور لکھنو واپس چلے گئے۔ مولانا نذیر حسین صاحب کی شاگردی شرر کی زندگی کا ایک بے حد اہم موڑ ثابت ہوئی، جنھوں نے ان کی زندگی، ان کے ذہن اور ان کے رجحان کو روشن اور مضبوط کیا۔

قیام دہلی کے دوران شرر نے محمد ابن عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا ترجمہ کیا اور یہ شرر کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کے بعد مولانا شرر اودھ اخبار کے عملہ ادارات میں شامل ہو گئے اور علمی، خیالی فلسفیانہ مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ بعد میں آپ نے ایک رسالہ محشر جاری کیا۔ اس رسالے کا اسلوب شاعرانہ ہوتا تھا۔ شرر پر اعتراض ہوا کہ یہ اسلوب صرف عاشقانہ مضامین لکھنے کے لیے مناسب ہے لیکن عبدالحلیم شرر نے اسی اسلوب میں دیگر مضامین لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اِس اسلوب میں ہر طرز کے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

منشی نول کشور نے آپ کو نامہ نگار بنا کر حیدرآباد دکن بھیجا۔ نواب محسن الملک نے آپ کی سرپرستی فرمائی اور آپ کو مشورہ دیا کہ آپ ریاست کی ملازمت قبول کر لیں مگر عبدالحلیم شرر نے اِس کو قبول نہ کیا۔ ''اخبار ہزار داستان'' کے مالک نے آپ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ آپ ''اودھ اخبار'' سے قطع تعلق کر لیں اور اخبار ہزار داستان کی ارادت اپنے ہاتھ میں لے لیں لیکن جب شرر لکھنؤ پہنچے تو پتہ چلا کہ ''ہزار داستان'' بند ہوگی ہے۔ آپ نے اودھ اخبار کو چھوڑ دیا اور انگریزی میں استعداد پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسی زمانے میں آپ نے اپنی پہلی تصنیف ناول کی صورت میں لکھی جس کا نام دلچسپ رکھا۔ بعد میں درگیش نندنی کا ترجمہ بھی کیا۔

اسی زمانے میں مولوی بشرالدین کے مشورے سے دلگداز جاری کرنے کا ارادہ کیا اور ۱۸۸۷ء میں پہلا پرچہ نکالا۔ اِس رسالے میں شرر نے اپنے ناول لکھے۔ پہلا ملک العزیز ورجنا تھا اور اِس کے بعد دلکش معاشرتی ناول آپ نے لکھا، پھر حسن انجلینا اور منصور موہنا شائع ہوئے۔ اس سال آپ نے شہید وفا نامی ڈراما بھی لکھا۔ ۱۸۹۰ء میں آپ نے ایک ہفتہ وار ''اخبار مہذب'' بھی نکالا۔ اِس اخبار میں علمائے سلف کی سوانح عمریاں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۸۹۱ء میں آپ نے یوسف و نجمہ ناول لکھا۔

مالی مشکلات کے تحت تلاش معاش کی غرض سے جب آپ نے حیدرآباد کا سفر کیا تو وقار الاحرار بہادر نے

اپنے فرزند نواب ولی الدین خان کا اتالیق بنا کر آپ کو انگلستان بھیجنا چاہا۔ شرر اِس پر آمادہ ہو گئے اور ۱۸۹۳ء میں آپ انگلستان تشریف لے گئے۔ انگلستان کے قیام کے دوران شرر نے فرانسیسی پڑھی۔ انگلستان سے واپس آ کر آپ نے فلورافلورنڈا ناول شائع کیا۔ ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے دلگداز دوبارہ جاری ہوا اور اس میں ایام عرب اور حضرت سکینہ کی سوانح عمری لکھی۔ ۱۸۹۹ء میں لکھنو سے سکینہ بنت حسین کو مکمل کیا اور فردوسِ بریں شائع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں ایام عرب کی دوسری جلد آپ نے مکمل کی۔ بعد میں مقدس نازنیں، تاریخ حرب صلیبیہ اور ڈاکو کی دلہن شائع ہوئے۔ اِسی زمانے میں آپ نے پردہ عصمت ایک رسالہ جاری کیا اور بدرالنساء کی مصیبت، ناول اور میوہ تلخ ڈراما تصنیف کیے ہیں۔ جون ۱۹۰۱ء میں آپ دوبارہ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ ملازمت کے ختم ہونے پر ایک رسالہ اتحاد نامی جاری کیا جو پندرہ روزہ تھا۔ یہ رسالہ ڈیڑھ سال کے بعد بند ہوگیا۔ اگست ۱۹۰۵ء میں حروب صلیبیہ کے ختم ہونے پر تاریخ سندھ شائع کی۔ تصوف پر مبنی ایک رسالہ العرفان بھی جاری کیا۔ بعد میں سلسلہ مشاہیر اسلام شروع کیا اور حضرت جنید بغدادی اور ان کے مرید خاص شبلی کی سوانح عمری لکھ کر شائع کی۔ اس زمانے میں آپ نے آغا صادق کی شادی اور فتح اندلس نامی ناول لکھے۔

۱۹۰۶ء میں آغا علی خان کی سوانح عمری شائع کی اور جنوری ۱۹۰۷ء میں قیس ولبنیٰ لکھنا شروع کیا اور دسمبر ۱۹۰۸ء میں یہ مکمل ہوگا۔ ۱۹۱۳ء میں عبدالحلیم شرر محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' میں شریک ہوئے۔ یہ اخبار ابھی جاری نہ ہوا تھا کہ شرر نے لکھنو جا کر حسن کا ڈاکو اور دربار حرام پور دو ناول شائع کیے۔ شرر کا سلسلہ تصانیف جاری و ساری تھا کہ اجل کے فرشے نے پیغام رحلت سنایا اور اردو ادب کا یہ نامی وگرامی ادیب اپنی ادبی خدمات کا سلسلہ منقطع کر کے دسمبر ۱۹۲۶ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوگیا۔

تحقیق کے پیمانے

۱۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطالعے کو پیش نظر رکھا گیا۔

۲۔ مختلف غیر افسانوی نثر کو جانچنے کے لیے ان اصناف کی فنی، ہیتی اور اسلوبیاتی طے شدہ معیارات کو سامنے رکھا گیا۔

۳۔ ان اصناف میں لکھنے والے معاصر تخلیق کاروں کی تحریروں کے ساتھ تقابلی مطالعہ اور جائزہ لیا گیا۔

۴۔ کتب

تحقیقی مقالے

تاریخ ادب سے مدد لی گئی ہے۔

اب تک کیے گئے تمام مباحث میں تحقیق کے پیمانے ،عبدالحلیم شرر کی افسانوی اور غیر افسانوی تحریروں کے محرکات، اُن کی ادبی حیثیات اور نظریۂ فن، سیاسی وسماجی پس منظر، افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی تعریف وفرق پر روشنی ڈالی گی ہے۔شرر نے ایک طرف افسانوی نثر بالخصوص ناول نگاری میں کمالِ شہرت حاصل کی اور دوسری جانب غیر افسانوی نثر میں بھی اپنا ملکہ منوایا۔شرر کی غیر افسانوی نثر کا اجمالی جائزہ لیں تو انھوں نے سیرت نگاری بھی کی اور سوانح نگاری بھی۔مضمون بھی لکھے اور انشائیہ بھی۔تاریخ پر بھی قلم اٹھایا اور مکتوب نگاری بھی کی۔صحافت بھی اُن کا من پسند شعبہ رہا۔اسی بنا پر انھوں نے کئی رسائل و جرائد کا اجراء کیا۔شرر کی ان تمام اصناف پر اُن کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ اگلے ابواب میں مفصل انداز میں پیش کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ The New Book of Knowledge, Danury, International Edition, Hrolier Incorporated, 1983, P. 109

۲۔ مولوی نورالحسن، نیئر، نوراللغات، جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، پاکستان، ۱۹۵۷ء، ص ۲۵۱

۳۔ سیداحمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اوّل، مکتبہ حسن سہیل، لاہور، س ن، ص ۱۸۶

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۴۳۸

۵۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات، جلد اوّل، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹۱

۶۔ اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی (مرتبین) فرہنگ اصطلاحات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۷

۷۔ راجہ رام کمار پریس وارث، لغات کشوری، منشی نول کشور لکھنو، س ن، ص ۳۴

۸۔ جامع اللغات فارسی اردو، اورنٹیل بک سوسائٹی، لاہور، س ن، ص ۵۵

۹۔ سیداحمد دہلوی، لغات النساء، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۹

۱۰۔ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی، اردو عربی المعجم، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۶۸

۱۱۔ مولانا محمد رفیع صاحب فاضل، مولانا محمد وکیل صاحب صدیقی (مولفین)، جامع اللغات اردو دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸

۱۲۔ ارشاد احمد، پنجابی (مولف)، اردو پنجابی لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۴

۱۳۔ سید انوار الحق، اردو پشتو لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۲

۱۴۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۵

۱۵۔ جدید اردو لغات، اورنٹیل بک سوسائٹی، لاہور، س ن، ص ۱۴

۱۶۔ عبداللہ خان، ڈاکٹر، لغات نظامی اردو گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۵

۱۷۔ نسیم امروہوی، فرہنگ اقبال، اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲

۱۸۔ مرزا مقبول بیگ، اردو لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۳۶

۱۹۔ شمس بریلوی، لغات سعدی (اضافہ و تصحیح)، ایم سعید کمپنی ادب منزل، کراچی، س ن، ص ۵۷

۲۰۔ حامد لطیف چشتی، سید، قائد اللغات، حامد اینڈ کمپنی مدینہ منزل، لاہور، س ن، ص ۸۵

۲۱۔ چھٹا خاں مری عطا شاد، اردو بلوچی لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵۰

۲۲۔ The New Oxford Encyclopedia Dictionary, J Coulson, Sy ney, Oxford

University, Press and Buy Books, PTV, Ltd, 1983,V.lll, p.617

۲۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف جنرل نالج، فیروز سنز، س۔ن، ص۱۵۲

۲۴۔ New Websters Dictionary of the English Language Deluxe Encyclopedic Harry E. Clarke, Lucinda R. Summers, the Delair Publishing Company, Inc 1984, P.362

۲۵۔ The New Book of Knowledge, Danury, international Edition, hrolier incoporated, 1983, vol-6-P.109

۲۶۔ Encyclopedia Americana, Danury, international Edition, hrolier incoporated, 1986, v-11-P-159.

۲۷۔ WEBSTERS NEW WORLD DICTIONARY, David, B- Curalnik, Oxford University Press P-279.

۲۸۔ English to English and Urdu Dictionary. Ferozsons Limited Lahore. P-309

۲۹۔ A Dictionary of Literary Terms no- Editer, Kitab Mahal Lahore Pakistan P-134.

۳۰۔ "The Concise English-Persian Dictionary" Abbas Aryanpur Kashan and Manaouchehr Aryanpur Kashani, Amir Kabir Publishing Corp Tehran Iran, April 1981, P-372.

۳۱۔ Cassell's New French-English English-French Dictionary Denis Wrard, Cassell & Co. Ltd., 1964, Fifth Edition 1964, P-345.

۳۲۔ "Webster's new world Dictionary of the American Language, David B-Guralnik, Modern Desk Edition,William Collins & World Publishing Co. Inc. 1979, P.181.

۳۳۔ The Oxford Illustrated Dictionary Helen Mary Petter,Second Edition Oxford University press, 1975, P-307

۳۴۔ The American Heritage Dictionary, Second College Editions, Houghton Mifflin Company Boston. 1982, P-500.

۳۵۔ "The Concise Heritage Dictionary, Houghton Mifflin Company Boston, 1976 P-265.

Dr. Mulvi Abdlul Haq, The Student Standard English- Urdu Dictionary, Anjuman Taraqqi-E-Urdu Karachi, Pakistan 1971, P-422. ۳۶۔

The Pengunm Dictionary of Literary Terms and Literature, J.A Cuddon (Third Ealition) England by Clays Litd, St ues Plc, 1992, P.383. ۳۷۔

"The Chambers Dicitonary" Catherine Schwarz,Chambers Harrap Publishers Ltd., (Cambers Hurrup bublished in Great Britain by chambers Harrap Publishers Ltd) 1993, P-1148. ۳۸۔

"Collins English Dictionary, Patrick, Hanks, William Collins sons & Co Ltd Glasgow 1981, P-539. ۳۹۔

"The oxford Reference Dictionary, Joycem Hawkins, The oxford University Press, 1989, P. 572. ۴۰۔

"Funk & Wachalls Standard Dictionary" by Lippincott & Crowell Publishers 1980, P-536. ۴۱۔

Chambers English Students Dictionary Sandra Anderson Kay Culler, W&R Chembers Ltd Edinburgh, 1996, P-323. ۴۲۔

"Chambers Everyday paper back Dictionary" A.M Macdonald and E.M Kirkpatrick (Revised Edition) W&R Chambers Ltd Edinburgh 1984 P-487 ۴۳۔

"Chambers Twentieth Century Dictionary, A.M Macdonald OBE BA, W&R Chambers Ltd, 1979, P-896. ۴۴۔

The Concise Oxford Dicitonary of Current English, R.E Allen, Oxford University Press 1990, P. 806 ۴۵۔

A Dictionary of Literary Terms , Kitab Mahal Lahore Pakistan No, eyer P-240. ۴۶۔

"The Oxford Illustrated Dictionary" J. Coulson, C.T Cass, Oxford Universtiy Press, (Second Edition) 1978, P-574. ۴۷۔

"The American Heritage Dicitonary, No- Editer, Houghton Mifflin Company Boston (Second College Edition) 1982, P. 846 ۴۸۔

"The Concise Heritagy Dictionary, Houghton Mifflin company Boston, ۴۹۔

1976, P-480.

۵۰۔ "New Websters Dictionary of the English Language, (Deluxe Encyclopedic Edition) by Harry E. Clarke, The Delair Publishing company, 1984, P-646.

۵۱۔ "Reader's Digest Great Illustrated Dictionary Dr Robert I Ison by the Reader's Digest Acsociation Limited London, New york 1918, P-1158.

۵۲۔ Chambers Concise Usage Dictionary M.A Sention, W&R Chembers Ltd, Edinburgh 1992, P-345.

۵۳۔ Chambers Concise 20th Century Dictionary G.W Daviad M.A Sention, Allied Publishers Limited. New Delhi Bombay, 1991, P-666.

۵۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ص ۱۳۲۱

۵۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتب: نجیب جمال، ڈاکٹر، اظہار سنز، لاہور، س۔ن، ص ۱۳۴

۵۶۔ ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، اردو فکشن کی تنقید م۔ن، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱

۵۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، ص ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶

۵۸۔ ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، اردو فکشن کی تنقید، ص ۲۱

۵۹۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، پروگریسو، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۴۵

۶۰۔ عنوان چشتی، ڈاکٹر، بحوالہ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، پروگریسو، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۴۵.

۶۱۔ پریم چند، مضامین پریم چند، مرتب عتیق احمد، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۱ء، ۲۳۷۔۲۳۸

۶۲۔ آغا محمد باقر، تاریخ نظم و نثر اردو، مکتبہ آزاد، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۳۲۵

۶۳۔ آل احمد سرور، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، مرتب، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۵۸۳

۶۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی نثر کی اصناف، مشمولہ نقوش، شمارہ ۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۹۲

۶۵۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۸

۶۶۔ منصف خان سحاب، نگارستان، دار التذکیر، س۔ن، ص ۳۳۹

۶۷۔ بشیر حامی، جنگل کی آگ، حامی اکادمی، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۲

۶۸۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، پیش لفظ، غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۲

۶۹۔ محمد اسلام، ڈاکٹر، جگر مراد آبادی حیات اور شاعری، دبستان جگر، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۵۰

۷۰۔ محمد اسماعیل ذبیح، برصغیر میں مسلمانوں کے عروج وزوال کا آئینہ، علوی پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۰

۷۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱

۷۲۔ کرم حیدری، مسلمانان برصغیر کی جد وجہد آزادی میں مسلم لیگ کا کردار، نیشنل پریس ٹرسٹ، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰

۷۳۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، ص ۲

۷۴۔ ایضاً، ص ۳

۷۵۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹

۷۶۔ صاحبزادہ عبدالرسول، تاریخ پاک وہند، ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۶۔۱۷۷

۷۷۔ صابر علی خان، ڈاکٹر، سعادت یار خاں رنگین، انجمن ترقی اردو، کراچی پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص ۳۲

۷۸۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۵۳

۷۹۔ محمود الرحمٰن، جنگ آزادی کے اردو شعرا، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱

۸۰۔ ظہیر الدین بابر، تزک بابری، مترجم، نصیر الدین حیدر، انجمن ترقی اردو، کراچی پاکستان، ۱۹۶۲ء، ص ۲۱۹

۸۱۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص ۵۴۔۵۵

۸۲۔ محمود الرحمٰن، جنگ آزادی کے اردو شعرا، ص ۱۴

۸۳۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۹

۸۴۔ محمد اسلام، ڈاکٹر، جگر مراد آبادی حیات اور شاعری، دبستان جگر، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۱

۸۵۔ ارشاد حسین نقوی، اکبر الہ آبادی کا سیاسی شعور، الحمرا اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۲

۸۶۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۸۴

۸۷۔ یوسف حسن، ڈاکٹر، بحوالہ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہورن ۱۹۹۸ء، ص ۸۴

۸۸۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر، ص ۸۵

۸۹۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص ۶۵

۹۰۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۱۰

۹۱۔ ٹون بی، پروفیسر، مطالعہ تاریخ، مترجم، غلام رسول، مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص ۴۵۰، ۴۵۱

۹۲۔ کرم حیدری، مسلمانان برصغیر کی جد وجہد آزادی میں مسلم لیگ کا کردار، ص ۳۸

۹۳۔ احمد سعید، پروفیسر، حصول پاکستان، نیو کریسنٹ پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۹

۹۴۔ اعتزاز احسن، سندھ ساگر اور قیام پاکستان، مترجم، مستنصر جاوید، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد ۱۹۹۹ء، ص ۳۰۷

۹۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، طیب اقبال پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۹

۹۶۔ Ishtiaq Hussain Qureshi,Dr. The Struggle for Pakistan Chap.II, Karachi, 1965,p.18

۹۷۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۵

۹۸۔ خواجہ طارق محمود، بریگیڈیئر، منتشر مضامین، بزم علم و فن پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۷

۹۹۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۱

۱۰۰۔ احمد سعید، پروفیسر، حصول پاکستان، ص ۱۰

۱۰۱۔ عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، اورینٹ ریسرچ سنٹر، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹

۱۰۲۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، م۔ن، س۔ن، ص ۴۰۔۴۱

۱۰۳۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، مسلم لیگ کا دورِ حکومت، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۱۲

۱۰۴۔ محمود علی، پاکستان کی بنیادیں، مترجم، سید اشتیاق حسین، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱

۱۰۵۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۶۷

۱۰۶۔ سردار محمد خان عزیز، سرگزشت پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۲۵

۱۰۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد، انجمن ترقی اردو، کراچی پاکستان، ۱۹۶۰ء، ص ۴۵

۱۰۸۔ قاضی ذوالفقار احمد، عوامی دورِ حکومت کا پہلا سال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵

۱۰۹۔ الطاف حسین حالی، مولانا، حیات جاوید، المقبول پبلشرز، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۸۲

۱۱۰۔ لطیف حسین ادیب، سید، ڈاکٹر، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۶۱ء، ص ۲۲

۱۱۱۔ ابو اعلیٰ مودودی، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۴۷

۱۱۲۔ آدم سمتھ، دی ڈسکوری آف انڈیا، بحوالہ سید لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۴

۱۱۳۔ الطاف حسین حالی، مولانا، مسدس حالی، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۸۰

۱۱۴۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر، بحوالہ سید لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، کل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۶

۱۱۵۔ محمد اسلام، ڈاکٹر، جگر مراد آبادی حیات اور شاعری، ص ۴۶

۱۱۶۔ لطیف حسین ادیب، سید، ڈاکٹر، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۴

۱۱۷۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۲۵

۱۱۸۔ محمد اسحاق بھٹی، فقہائے پاک و ہند، جلد اوّل، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۵

۱۱۹۔ آغا اشرف، روداد پاکستان، مقبول اکیڈمی، لاہور، س۔ن، ص ۳۹

۱۲۰۔ آزاد کوثری، پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں، ری پبلکن بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۹۱

۱۲۱۔ حافظ تقی الدین، پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں، فکشن ہاؤس مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۸۵۔۸۶

۱۲۲۔ ابو الہاشم ندوی، جلیانوالہ باغ ایک ناقابل فراموش المیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص ۱۴

۱۲۳۔ جواہر لال نہرو، تلاش ہند، تخلیقات لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۴۴

۱۲۴۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۲

۱۲۵۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۲۶۔ نصرت ادریس، پاکستان میں شورائی نظام حکومت مسائل و امکانات، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۶

۱۲۷۔ چوہدری محمد علی، ظہور پاکستان، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۸

۱۲۸۔ اسلم فرخی، محمد حسین آزاد اور تصانیف، انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان، ۱۹۶۵ء، ص ۴۵

۱۲۹۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۱۳۰۔ سجاد علی انصاری، محشر خیال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۰

۱۳۱۔ محمد انوار الدین، ڈاکٹر، اردو ادب میں تحریکات و رجحانات، مشمولہ، اردو اصناف (نظم ونثر) کی تدریس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، س۔ن، ص ۲۶۱

۱۳۲۔ عبید اللہ قریشی، آزادی کی تحریکیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۱

۱۳۳۔ محمد امین زبیری، مولوی، تذکرہ سرسید، یونائیٹڈ پبلشرز، لاہور، سن۔ن، ص ۳۹۲

۱۳۴۔ رابعہ طارق محمود، سرسید احمد خان، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۶

۱۳۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۱

۱۳۶۔ ریاض احمد، ریاضتیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۹

۱۳۷۔ جواہر لال نہرو، تلاش ہند، ص ۴۴

۱۳۸۔ ضیاء الحسن فاروقی، مولانا ابوالکلام آزاد، فکر ونظر کی چند جہتیں، مکتبہ اخوت، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۸۲

۱۳۹۔ شبلی نعمانی، انتخاب مقالات شبلی، ص ۶۱

۱۴۰۔ عنایت علی قریشی، محسوسات، کتاب نگر ملتان، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹

۱۴۱۔ محمد مہدی حسین، افادیت مہدی، مرتب، مہدی بیگم، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۵۔۲۰۶

۱۴۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۱۴۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۲۹ء، ص ۴۰

۱۴۴۔ فرحت جہاں پوری، مولانا شرر لکھنوی، مشمولہ صحیفہ، تیئیسواں شمارہ ۔۲۳، اکتوبر ۱۹۶۵ء، مجلس ترقی ادب، لاہور ص ۶۵

۱۴۵۔ محمد طفیل، نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، س ۔ن، ص ۵۶۵

۱۴۶۔ محمد یحییٰ تنہا، مولوی، سیر المصنفین، ص ۵۸۶۔۵۸۷

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۵۸۷

۱۴۸۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۶، ۱۷

۱۴۹۔ اظہر برلاس، مرزا، اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ، اودھ ادبی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱

۱۵۰۔ عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنو، ص ۹۸۔۹۹

۱۵۱۔ عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنو، ص ۱۱۰

۱۵۲۔ جعفر رضا، عبدالحلیم شرر (سوانح حیات) مشمولہ گزشتہ لکھنو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۸

۱۵۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مقدمہ گزشتہ لکھنو از عبدالحلیم شرر بعنوان میرا انیس کا گمشدہ مصرع، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹

۱۵۴۔ آل احمد سرور، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، مرتب، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۰، ۱۶۱، ۱۶۲

۱۵۵۔ نعیم نقوی، ڈاکٹر، تنقید و آگہی، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۱

۱۵۶۔ فیروز مکرجی، لکھنو اور سرشار کی دنیا، مترجم، مسعود الحق، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷

۱۵۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور مجلسی تنقید، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۷۶ء، ص ۴۰

۱۵۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین ایک انتخاب، مرتب، سجاد نقوی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۹۷

۱۵۹۔ سید صفدر حسین، ڈاکٹر، لکھنو کی تہذیبی میراث، بارگاہ ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۵۔۱۶

۱۶۰۔ رجب علی بیگ سرور، گلزار سرور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۵۹

۱۶۱۔ حکیم نثار احمد علوی، شب چراغ، کاکوری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۶

۱۶۲۔ سبط حسن، تہذیب کیا ہے، مشمولہ پاکستانی ثقافت، مرتب، رشید امجد ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۳۵

۱۶۳۔ مظفر عباس، ڈاکٹر، اسلامی تہذیب اور اردو شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۸

۱۶۴۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۴۴

۱۶۵۔ ایضاً ص ۴۵

۱۶۶۔ عبدالحلیم شرر، دل گداز (ترتیب و تدوین) فاروق عثمان، ڈاکٹر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۴

۱۶۷۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، ص ۳۰۴

۱۶۸۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۲ء، ص ۲۸

۱۶۹۔ صلاح الدین احمد، صریر خامہ، جلد دوم، المقبول پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۲

۱۷۰۔ عبدالحلیم شرر، دل گداز، ص ۵۶

۱۷۱۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، مقدمہ دل گداز، عبدالحلیم شرر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۰

۱۷۲۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۴۴

۱۷۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳۰۔۵۳۱۔۵۳۲

۱۷۴۔ صاحبزادہ حمید اللہ (تالیف) فن اور تکنیک، ص ۲۱۷

۱۷۵۔ محمد طفیل، آپ بیتی نمبر، شمارہ ۱۰۰، س۔ن، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۵۶۴۔۵۶۵

۱۷۶۔ جیلانی کامران، تنقید کا نیا پس منظر، الفائن پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۵۳۔۵۴

۱۷۷۔ رشید خان، ڈاکٹر، افکار عالیہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۹

۱۷۸۔ عبدالحلیم شرر، دل گداز، ص ۳۶۲۔۳۶۳

۱۷۹۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر آغاز و اختتام سال، جلد اول، حصہ سوم، ص ۲۔۳

۱۸۰۔ عبدالحلیم شرر، دل گداز، ص ۳۹۰

۱۸۱۔ ایضاً ص ۱۱۲

۱۸۲۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، جلد چہارم، عبدالرشید اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۲۳۲

۱۸۳۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، جلد ہفتم، عبدالرشید اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۱۱۵

۱۸۴۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، اصلاح قوم و ملت، ص ۱۱۵

۱۸۵۔ ایضاً مضمون دین و اسلام، ص ۱۱

۱۸۶۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، اصلاح قوم و ملت، ص ۱۸

۱۸۷۔ ایضاً، زوال غم، ص ۷۰

۱۸۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶۷

۱۸۹۔ پریم چند، مضامین پریم چند، مرتب عتیق احمد، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۱ء، ص ۳۲۶

۱۹۰۔ اشرف حسینی، پیش لفظ، فلورا فلورا ائنڈا، از عبدالحلیم شرر، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱

۱۹۱۔ قیوم نظر، اردو نثر انیسویں صدی میں، یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور، س ۔ ن، ص ۱۶۹ تا ۱۷۰

۱۹۲۔ صلاح الدین احمد، صریر خامہ، ص ۲۶۳۔۲۶۴

۱۹۳۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی، ۱۹۳۴ء، ص ۳۲۱۔۳۲۲

۱۹۴۔ عبدالحلیم شرر، سرسید احمد خان کی دینی برکتیں، دکن ریویو مئی ۱۹۰۸ء، بحوالہ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۶

۱۹۵۔ پریم چند، مضامین پریم چند، ص ۲۳۶۔۲۳۷

۱۹۶۔ فرحت جہاں پوری، مولانا شرر لکھنوی، ص ۴۰

۱۹۷۔ پریم چند، مضامین پریم چند، ص ۳۲۸

۱۹۸۔ آل احمد سرور، ہمارا ادب، ص ۹۵

۱۹۹۔ عبدالماجد دریا آبادی، معاصرین، ص ۱۱۸

۲۰۰۔ علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگاری، ص ۱۴۱

۲۰۱۔ شہ پارے، اردو کے مایہ ناز ادیبوں کے مضامین کا انتخاب اور ان کا تنقیدی تعارف، فیروز سنز پاکستان، ۱۹۵۶ء، ص ۳۵۵

۲۰۲۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یاد ایام، عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۷

۲۰۳۔ سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں، ص ۷۴۔۷۵

۲۰۴۔ تربھے رام جوہر، بحوالہ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۴۵۰۷

۲۰۵۔ Abdul Qadir, New School of Urdu Literature, third edition, Lahore, p71

۲۰۶۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار، نصرت پبلشرز امین آباد، لکھنو، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۵

۲۰۷۔ محمد یحییٰ تنہا، مولوی، سیر المصنفین، ص ۵۷۹

۲۰۸۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر، عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار، ص ۱۳۱

۲۰۹۔ ایضاً، ص ۱۳۲۔۱۳۳

۲۱۰۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۳۲۰

۲۱۱۔ پریم چند، مضامین پریم چند، ص ۳۲۴

باب دوم

عبدالحلیم شرر بحیثیت سیرت وسوانح نگار

الف ۔ فن سیرت نگاری، ایک مطالعہ

نبی کریم ﷺ کی سوانح سیرت نگاری کہلاتی ہے ۔ یہ ایک الگ فن ہے ۔ آپؐ کی آمد سے قبل ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ آپ کی تبلیغ سے یہ تاریکی ختم ہوئی ۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچایا ۔ محمد امین الرحمٰن انیس لکھتے ہیں: ''خاتم المرسلین ﷺ کی نبوت سے پہلے ساری دنیا تاریکی میں مبتلا تھی ۔ تمام قومیں ابراہیمی، موسوی، بدھوی، ہندی، زرتشتی اور عیسوی گمراہی کے راستہ پر چل رہیں تھیں''۔[۱] حضور نبی کریم ﷺ کی آمد سے قبل کے حالات و واقعات کو اردو جامع انسائیکلوپیڈیا میں یوں بیان کیا گیا ہے ۔

> (۲۲ اپریل ۵۷۱ بروز پیر ۴۳۲ ء) ہادی اعظم، سید المرسلین خاتم النبین، شفیع المذنبین رحمت اللعالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے تو دنیا میں جہالت کا دور دورہ تھا ۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ کی دی ہوئی تعلیم کا شیرازہ بکھر چکا تھا ۔ اور اس کی جگہ لوگ غلط عقائد اور قبیح رسومات میں مبتلا تھے ... انسانی معاشرہ کی بنیادیں جبر و استبداد، حرص وہوس اور انسانی استحصال پر قائم ہو رہیں تھیں ... اخلاقی قدریں پامال تھیں اور انسانیت روبہ زوال تھی ۔ ان تاریکیوں میں مکہ مکرمہ میں نور کی کرن روشن ہوئی جس نے کروڑوں انسانوں کے ماحول کو منور کر دیا ۔[۲]

مفتی غلام سرور لاہوری، رسول پاک ﷺ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حضور شاہِ رسالت خاتم النبوت علیہ السلام والصلوٰۃ والتحیۃ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مخلوق میں سب سے برتر ہیں ۔ اور ساری موجودات کا وجود آپؐ کے وجود کی برکت سے قائم ہے ۔ جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد پاک ہے ۔
>
> اوّل ماخلق اللہ نوری وکل خلائق من نوری ۔ اللہ نے سب سے اول میرے نور کو پیدا فرمایا اور میرے نور سے پھر ساری مخلوق کا ظہور ہوا''۔

اسی طرح آپ کا یہ برحق کلام بھی حدیث قدسی کا ایک حصہ ہے۔

لولاک لما خلقنا الافلاک۔ اگر آپ کا وجود نہ ہوتا تو میں عالم ایجاد کی نیرنگیاں پیدا نہ کرتا۔

اس حقیقت پر ایک قوی دلیل ہے......[۳]

دنیا کی ہر ایک زبان میں سیرت رسول ﷺ پر گراں بہا کام ہو رہا ہے۔ اردو زبان میں بھی سیرت رسول ﷺ پر بے شمار کام ہوا ہے۔ ہر ایک مصنف نے آپ کی ذات اقدس پر اپنی بساط کے مطابق کام کیا ہے۔ حضور ﷺ کا اسوہ حسنہ مسلمانوں کے لیے مینارہ نور ہے اور اس نور سے روشنی حاصل کرنے کیلئے سیرت پاک کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ سیرت نگاری کا ایک بڑا سرمایہ مسلمانوں کے پاس ہے۔ اور دنیا کی ہر زبان اس سے اکتساب کیلئے ہمہ وقت تیار ہے۔ اردو زبان کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس میں سیرت پاک کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ عبدالحلیم شرر نے بھی آنحضور ﷺ کی سیرت پاک پر قلم اٹھایا ہے۔ اس باب میں شرر کی سیرت نگاری کا جائزہ لیا جائے گا۔

لفظ سیرت دراصل سار، سیر، سیرا و مسیرا سے نکلا ہے۔ اس کے معنی جانا، روانہ ہونا، طریقہ و مذہب، سنت ہیئت، حالت، کردار، کہانی، پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان خصوصیت سے آنحضرت ﷺ کے مغازی کا بیان۔ آنحضرت ﷺ کے طریقے کا بیان جو غیر مسلموں کے ساتھ جنگ اور صلح میں آپ نے روا رکھا تھا۔[۴]

اردو انسائیکلو پیڈیا میں سیرت کے بارے میں لکھا ہے:

> لغت میں انفرادی کیریکٹر یا کردار۔ کسی کی سوانح عمری اور حالات زندگی۔ اصطلاح میں آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری اور حالات زندگی، اخلاق اور عادات کا بیان مراد ہے۔ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے ابن ھشام کی مشہور کتاب "سیرۃ ابن ھشیام" سے ہوا۔ اور بعض نے طبقات ابن مسعد۔ کو سیرۃ کی پہلی کتاب کہا ہے۔ اس فن کو اس لیے ترقی ہوئی کہ جمیع اہل اسلام افعال آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی خصوصاً آپ کے اقوال و افعال سے واقف ہو کر اسی راستہ پر چلیں۔ اس فن سے فن حدیث کو بھی تقویت پہنچی۔ پہلی صدی ہجری کے اندر ہی یہ فن بہت ترقی کر گیا۔ شروع شروع میں عرب کے پرانے دستور کے مطابق ان کو "مغازی" آنحضرت ﷺ کہا جاتا تھا۔ اور اس سلسلہ میں فتوحات اور

معرکوں کا ذکر ہوتا تھا۔لیکن پھر خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ان اقوال و افعال پر توجہ کی جن کا تعلق شریعت سے تھا۔بنو امیہ کے زمانے میں "مغازی" پر کتابیں لکھی گئیں۔حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ۔نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا اور جامع دمشق میں اس کا درس شروع کر دیا گیا۔اور فن عام ہو گیا۔[۵]

عربی میں لفظ سیرۃ لکھا جاتا ہے جب کہ اردو اور فارسی زبان میں یہ لفظ سیرت (لمبی ت) کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔یہ لفظ عربی زبان کے جس مادے اور فعل سے بنا ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں، عمل پیرا ہونا۔روانہ ہونا۔چل پڑنا۔رویہ یا طریقہ اختیار کرنا۔راستہ لینا۔یوں سیرت کے معنی روش، عادت، سوانح عمری، خصلت، گن، وصف۔سوانح حیات، تذکرہ نویسی۔سلیقہ۔اخلاق، کردار مذہب، سرشت، طرز زندگی لوگوں کے ساتھ برتاؤ کی کیفیت، حالات، کردار، صفت۔ہیت، کہانی پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان۔بائیوگرافی کے ہیں۔صورت کے ساتھ مل کر یہ لفظ باطن کی صورت یا حقیقت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔مثلاً صورت و سیرت، یوں اردو میں تعمیر سیرت، سیرت سازی، پختگی سیرت، نیک سیرت۔بد سیرت، اور حسن سیرت وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔قرآن مجید میں یہ لفظ "سیرۃ" صرف ایک جگہ آیا ہے یعنی سورۃ طٰهٰ کی آیت نمبر ۲۱ میں

ترجمہ۔ ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا (لاٹھی) کا سانپ بن جانے کے بعد اس کا دوبارہ اپنی حالت میں آجانے کی طرف اشارہ ہے۔اس آیت میں لفظ "سیرت" حالت اور کیفیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔لفظ "سیرت" واحد کے طور پر اور بعض اوقات جمع "سیر" کے ساتھ اہم تاریخی واقعات اور اہم شخصیتوں کے سوانح حیات کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔مثلاً "المتاخرین" سیرت عائشہ (یہ کتابوں کے نام ہیں) فقہ کی کتب میں "السیر" جنگ اور قتال سے متعلق احکام کیلئے استعمال ہوتا ہے۔چونکہ نبی کریم ﷺ کی سیرت کے بیان میں غزوات خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ابتدائی دور میں کتب سیرت کو عموماً "مغازی و سیر" کی کتابیں کہا جاتا تھا۔لفظ مغازی بھی "مغزیٰ" کی جمع ہے۔جس کے معنی جنگ کی جگہ یا وقت کے ہیں۔بعد میں یہ لفظ سیرت رسول ﷺ کیلئے بطور ترکیب استعمال ہونے لگا۔سیرت کا لغوی مفہوم اگر چہ نیک سرشت انسان کا انفرادی کردار، مزاج، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اور اس کی سوانح عمری ہے۔لیکن اصطلاح میں اس سے مراد آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اور اخلاق و عادات کا بیان ہے۔[۶] اس لفظ کا اطلاق حضور ﷺ کی حیات مبارکہ پر پہلے بھی ہوتا رہا اور اب بھی اس کا اصطلاحی

مفہوم یہی ہے۔......سیرۃ کے اولین اصطلاحی معنی آنحضرت ﷺ کے مغازی اور سوانح حیات ہیں۔[۷]

اس کے اصطلاحی مفہوم کشاف اصطلاحات الفنون میں یہ ہیں:

اصل میں سیر بمعنی چلنا اور جانا تھا... اس کے مخصوص معنی آنحضرت ﷺ کا مغازی ہیں لیکن اس کے عام معنی طریقہ فاہ الامور اور صفت فی المعاملات بھی ہیں۔مثلاً کہا جاتا تھا۔ سار ابوبکر رضی اللہ عنہٗ بسیرۃ رسول اللہ ﷺ (حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ کے طریقے پر چلے) مغازی کو سیر اسی لئے کہتے ہیں کہ اول امور ھا السیر لی المقدر (میدان جنگ کی طرف چل کر جانے سے جہاد و مغازی کی ابتداء ہوئی ہے) کتاب السیر ۃ سے مراد سیر الامام، معاملات مع الغزواۃ الضار الکفار (کتاب السیر سے مراد ہے غازیوں، مدداروں اور کافروں سے مسلمان حاکم وقت کا سلوک اور معاملات وتعلقات۔[۸]

نقوش رسول نمبر میں اس کے اصطلاحی مفہوم کو اسطرح واضح کیا گیا ہے: ''جو کچھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اکرام اور آل عظام کے مبارک وجود کے ساتھ متعلق ہو اور آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے وفات کے واقعات پر مشتمل ہو اسے سیرت کہتے ہیں۔''[۹]

مسرت شوکت چیمہ کے الفاظ میں:

Word seerah is used in Arabic to connote the life times of the prophet Muhammad Sallalla-o- Alaihi Wassalam[10]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نزدیک: ''وہ حدیثیں جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود صحابہ کرامؓ اور آپ ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے حالات پر مشتمل ہیں۔وہ 'سیر' کے نام سے موسوم ہیں''۔[۱۱]

اب اس لفظ سے مراد صرف اور صرف رسول خدا ﷺ کی حیات مبارکہ کا بیان مراد لیا جاتا ہے۔کسی اور شخصیت کے حالات زندگی کیلئے لفظ سیرت اب متروک ہو چکا ہے۔اب سیرت کے ساتھ لفظ 'نبی' 'مصطفیٰ' اور پیغمبر استعمال نہ بھی کیے جائیں تو اس سے مراد سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔بعض اوقات تو لفظ 'سیرت'

کا کتاب کے مصنف کی طرف مضاف کر کے بھی یہی اصطلاحی معنی مراد لئے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر " سیرت ابن ہشام " یہاں اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ابن ہشام کی سیرت ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حالات جو ابن ہشام مصنف کتاب نے جمع کیے ہیں۔آج کے دور میں جلسہ سیرت، سیرت کانفرنس، اخبارات و رسائل کے سیرت نمبر، مقالات سیرت، وغیرہ الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔ان تمام تراکیب میں "سیرت "لفظ کے معنی ہمیشہ سیرت نبی ﷺ ہی ہوتے ہیں۔احترام کے اظہار کیلئے اس لفظ کے ساتھ بعض اوقات " سیرت طیبہ "اور سیرت پاک کے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

سوانح عمری biography کو سیرت کا مترادف کہا جاتا ہے۔ان دونوں اصطلاحوں میں فرق ہے۔سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہوتا ہے۔حقائق کے ساتھ کردار اور ذہن کی نشونما کا فرق اور انسان کی شخصیت کی تصویر اور اس کے خارجی ردعمل اور داخلی احساسات کی کہانی ہے۔سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے۔تاریخ کے برعکس سوانح عمری کا موضوع فرد ہے۔حضور ﷺ انسانی اوصاف کی معراج ہیں۔اگرچہ نبی کریم ﷺ کی سوانح حیات انسانی فطرت کے گونا گوں پہلوؤں کا یہی عکس ہے، لیکن یہ عکس ہر اعتبار سے دل افروز اور برتر ہے۔حقیقت یہ ہے سیرت بائیوگرافی تو ہے لیکن ایک مخصوص اور ارفع قسم کی۔حضور نبی اکرم ﷺ کی سوانح عمری کیلئے سیرت کا لفظ سب سے پہلے ابن ہشام نے استعمال کیا تھا۔ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

> انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لیڈن کا مقالہ نگار جی لیون ڈیلا ویڈا (G.Levi Della Vida) کی تحقیق کے مطابق حضور اکرم ﷺ کی سوانح عمری کیلئے لفظ سیرت سب سے پہلے ابن ہشام نے استعمال کیا۔اس نے ابن اسحاق کی کتاب المغازی میں گراں قدر اضافہ کر کے اپنی مرتبہ کتاب کو" سیرۃ" کا نام دیا ہے۔[۱۲]

بقول عبدالقدوس ہاشمی: ''جب ہم سیرۃ النبی ﷺ کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہم حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے احوال وواقعات کو مقصود قرار دے رہے ہیں۔''[۱۳]

فن حدیث کی طرح فن سیرت بھی درایت اور روایت کے اصول کا پابند ہے۔ان اصولوں کی بنیاد خود قرآن پاک نے قائم کی ہے۔اور حکم دیا ہے کہ روایت کی چھان بین کرلیا کرو۔

"اے مسلمانوں اگر تمھارے پاس کوئی منافق خبر لائے تو اس کی چھان بین کرلیا کرو (سورۃ الحجرات ۴۹۔۵۰)۔[۱۴]

فن سیرت فن حدیث کا مرحون منت ہے۔ سیرت میں ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی جاتی ہے ۔اسلامی علوم میں فن سیرت فن حدیث اور فن تاریخ کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔مسلمانوں نے تاریخ نویسی کا فن سیرت نگاری ہی کی بدولت حاصل کیا ہے۔اسلامی علوم میں سیرت رسول ﷺ کو ایک نیم تاریخی ، نیم سوانح صنف قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا فن تاریخ فن سیرت نگاری سے متاثر ہوا۔بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''مسلمانوں کے بہت سے تاریخی اصول اور سوانحی نظریئے سیرت نگاری سے ہی پیدا ہوکر ترقی پزیر ہوتے ہیں۔''۱۵

سیرت نگاری ایک بہت ہی حساس اور مشکل فن ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کو ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سیرت نگار کو ہر قدم پھونک کر پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے ۔من کذب علیٰ متعمداً فقد کفر (جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی اس نے کفر کیا)اس سے ثابت ہوا کہ سیرت نگاری میں ذرا سی غفلت ایمان کو ضائع کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سیرت نگار کوشش کرتا ہے۔ کہ قلم سے کوئی ایسا لفظ نہ لکھوں جس میں ذرا سا بھی شائبہ پایا جاتا ہو۔ سیرت نگار کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو دلائل کے ساتھ ثابت کرے تا کہ اقوام عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر اپنی دنیا اور عاقبت سنوار سکیں۔ بقول خواجہ عابد نظامی:'' اس مادی دور میں معاشرے کو سدھارنے کیلئے صرف اور صرف تاجدار انبیاء ﷺ کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔''۱٦

قرآن پاک میں بھی رسول پاک ﷺ کی زندگی کو مثالی اور قابل تقلید قرار دیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ (الاحزاب ۲۱) تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی نمونہ ہے۔اگر غور کیا جائے تو رسول پاک ﷺ کی زندگی اپنوں ہی کے لیے نہیں بلکہ غیروں کیلئے بھی ایک نمونہ ہے۔ رسول پاک ﷺ کی ساری زندگی امانت، دیانت، صداقت، شرافت و شجاعت سے عبارت ہے۔ آپ نے رنگ و نسل، ذات پات اور اونچ نیچ کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری رقمطراز ہیں:''آنحضور ﷺ کو زندگی کے نازک ترین مراحل سے گزرنا پڑا، لیکن ہر موقع پر اس نصب العین کو پیش نظر رکھا ہے کہ انسانیت کا سر بلند رہے۔''۱۷ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک پہلو لوگوں کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:''یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کے اوراق میں کسی شخصیت کے حالات اور اقوال اس اہتمام اور تفصیل سے محفوظ نہیں کیے گئے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے ہیں۔''۱۸

اردو سیرت نگاری کی ابتداء سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے ہوئی ہے۔ جب نظموں ، مولود

ناموں، معراج ناموں۔ وفات ناموں اور دیگر معلومات سے اس کا آغاز کیا گیا۔ ان میں رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ اس وقت ان کا مقصد محفل و مجلس میں ایک روحانی فضا پیدا کرنا تھا۔ ان مجالس میں لوگ بڑھ چڑھ کر ثوب کی نیت سے شامل ہوتے تھے۔

نثری سیرت کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ملتا ہے۔ تحقیق کے ذریعے سے اب تک جن کتابوں کا پتہ چلا ہے ان میں سیرت کی مکمل اور قدیم ترین کتاب محمد باقر کی "ریاض السرۃ" ہے جو ۱۷۹۵ سے قبل تصنیف ہوئی تھی۔ اس سے قبل فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اگر چہ وہ واقعات کربلا پر مشتمل ہیں۔ لیکن اس میں آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری ایام کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس لحاظ سے ریاض السیر ۃ پہلی مکمل تصنیف کہی جاسکتی ہے۔ اس میں رسول پاک ﷺ کی ولادت سے وفات تک کے حالات درج ہیں۔ میلادنامے جو پہلے منظوم صورت میں تھے اب نثر میں تصنیف ہونے لگے۔ جو چیز پہلے نظم کے پیرائے میں لکھی جاتی تھے۔ سترھویں صدی عیسوی کے اختتام اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں نثر میں لکھی جانے لگی۔

اردو نثر میں سیرت نگاری کا باقاعدہ آغاز مناظرانہ کتب سیرت سے ہوا۔ جب پادری عمادالدین نے عیسائیت قبول کی تو اس نے اسلام اور آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں تحقیق الایمان، ہدایت المسلمین اور تاریخ محمدی وغیرہ کتابیں لکھیں جن میں اسلام کی تردید کی گئی اور رسول اکرم ﷺ کی ذات پر نعوذ باللہ الزامات لگائے گئے۔ انہی کتب کے جواب میں حالی نے تریاق المسموم، تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے اور چراغ علی نے تعلیقات جیسے مناظرانہ رسائل لکھے۔ پادری عمادالدین کی حمایت میں دیگر پادریوں نے اسلام اور بانی اسلام کی مخالفت اور مسیحیت و مسیح کی حمایت میں کتابیں لکھیں۔ جب دیگر پادریوں نے اسلام اور بانی اسلام کی مخالفت میں کتب لکھ کر شائع کروائیں تو مسلمانوں نے جواب میں اسلام اور بانی اسلام کے دفاع میں ایک طرف مغربی مصنفین کی کتب کے تراجم کیے۔ اور ہر ایک کتاب کا جواب بھی لکھا۔ اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی کتاب کی تردید میں کئی کئی مصنفین نے قلم اٹھایا۔ پادری عمادالدین کی کتابوں کی رد میں حالی، مولوی چراغ علی، فیروز الدین ڈسکوی، محمد علی کان پوری، اکرام اللہ اکبرآبادی اور سید محمد بھرت پوری نے کتابیں لکھیں۔ مولوی رحمت اللہ۔ ڈاکٹر فروز خان، مولوی سید ناصر الدین، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی منصور علی دہلوی، مولانا رحم علی منگوری وغیرہ نے اسلام اور بانی اسلام کے دفاع کے لیے عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔

اگر اس پورے سیاسی منظرنامے اور اس عہد کے حالات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت جو کتب سیرت لکھی گئی وہ مکمل اور جامع نہ تھیں۔ بلکہ معترضین کے جوابات تھے۔ یا پھر ان میں اسلام کا عیسائیت کے ساتھ

موازنہ کیا گیا تھا۔ اس دور کے آخر میں سر سید احمد خان کی کتاب خطبات احمدیہ ملتی ہے۔ جو ۱۸۷۰ء میں تصنیف ہوئی۔ سر سید نے یہ کتاب ولیم مور کی کتاب لائف آف محمد کے جواب میں لکھی تھی۔ اس کو اردو سیرت نگاری کی سب سے عالمانہ کتاب کہا جا سکتا ہے۔ سر سید نے بڑی محنت اور جوش وجذبے سے یہ کتاب لکھی تھی۔

اس کے بعد اردو نثر میں سیرت نگاری کا عہد زریں شروع ہوا۔ نثری میلاد ناموں اور نثری مناظرانہ کتب سے ہٹ کر سیرت پر مبنی با قاعدہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔

ب۔ شرر کی سیرت نگاری کے محرکات

شرر کے عہد میں ہندوستان میں بعض ایسی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں جو بالواسطہ سیرت رسول ﷺ سے متعلق تھیں۔ یہ ایک طرح کی مناظرانہ کتب تھیں۔ جو مخالفین اسلام کی تحریروں کے رد میں لکھی گئیں۔ اسلام اور بانی اسلام پر رقیق حملے کرنے والوں میں عیسائی پادری پیش پیش تھے، جو اپنے مذہب کی برتری اور حقانیت ثابت کرنے کیلئے ضروری سمجھتے تھے۔ کہ اسلام اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کیا جائے۔ ان عیسائی پادریوں اور مشنریوں کو انگریزی حکومت کی حمایت اور پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ جو چاہتی تھی کہ برصغیر پاک وہند پر نہ صرف سیاسی تسلط قائم رکھا جائے، بلکہ یہاں کے لوگوں کو عیسائی بنا کر مذہبی اعانت بھی حاصل کی جائے۔ تاکہ ایک مضبوط مستحکم اور پائیدار نظام حکومت کی بنیاد رکھی جاسکے۔

انگریزوں نے جب برصغیر پاک وہند پر اپنا قبضہ جمالیا تو اس کے بعد اسلام اور بانی اسلام پر تین اطراف سے حملے ہونے لگے۔ پہلا حملہ عیسائی مشنریوں نے کیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اور دوسرا حملہ ہندوؤں کی آریہ سماج تحریک کی جانب سے ہوا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ماتحت سات سوسال تک غلامی کی زندگی بسر کی اور اس کا بدلہ چکانے کیلئے انہوں نے بھی دین اسلام اور آنحضرت ﷺ کو اپنا نشانہ بنانا شروع کیا۔ تیسرا حملہ اس دور میں یورپی علوم ذہنوں کی شکل میں ہوا۔ جس نے مسلمانوں کی نظریں خیرہ کی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ حضرت محمد ﷺ اور اسلام کے مقدس ناموروں کی سوانح عمریاں لکھ کر اسلام کی حقانیت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ عیسائیوں تک محدود نہ تھا۔ اس میں کبھی کبھی ہندو مورخ بھی شریک ہوجاتے تھے۔ اس زمانے میں عیسائی اور ہندو تاریخ نگاری کی اصل روح بھی ہیں۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کی جوابی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ سرسید احمد خان کی کتاب "خطبات احمدیہ" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سرسید کے زمانے کے اکثر مورخ اور سوانح نگاران کے اثرات سے متاثر ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی ان اثرات کو قبول کیا اور حضور ﷺ کی سیرت پاک کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ وہ اولاً ایک مسلمان تھے اور بعد میں مصنف تھے۔ چنانچہ محبت اسلام کی چھاپ ان پر لگی ہوئی ہے۔ خصوصاً سیرت نگاری اور تاریخ نویسی میں ان کا یہ رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ عبدالحلیم شرر کی مختلف تصانیف ہیں لیکن سیرت نبوی ﷺ کو تاریخ کے انداز میں کتاب کی صورت میں لکھ کر شرر

سیرت نگاری کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔عبد الحلیم شرر نے قیام دہلی کے دوران بقول پروفیسر جعفر رضا: ''بخاری شریف ،صحیح مسلم ،ابو داؤد ،سنن نسائی ،موطا امام مالک کے علاوہ تفسیر جلالین کا مطالعہ کیا۔''[۱۹] سیرت نگاری کے سلسلے میں آپ نے اپنے اس علم کو بھی استعمال کیا اور احادیث کا علم آپ کی سیرت نگاری کا سب سے بڑا محرک تھا۔

کسی تاریخی شخصیت کے بارے میں معلومات کا اہم ترین مآخذ وہ کتابیں ہوں گی جو کہ اس کی زندگی میں لکھی گئی ہوں یا اس کے بعد قریب ترین زمانے میں لکھی گئی ہوں۔اور جن میں زیادہ سے زیادہ مواد علمی تگ ودو اور تحقیقی چھان بین سے جمع کیا گیا ہو۔سیرت طیبہ کے اہم بنیادی مآخذ ومصادر حسب ذیل ہیں۔قرآن پاک ،تاریخ عالم یا تاریخ اسلام پر لکھی ہوئی اہم کتب ،کتب حدیث ،تواریخ حرمین ،مشاہیر اسلام کے طبقات (مشہور شخصیتوں کے حالات کسی درجہ بندی کے لحاظ سے)،خاص سیرت پر لکھی ہوئی اہم اور ابتدائی کتب ہیں۔

قرآن پاک ،کتب احادیث ،تواریخ حرمین ،تاریخ عالم اسلام اور مشاہیر اسلام کے طبقات یہ وہ ہیں کہ ان میں براہ راست موضوع سیرت نگاری ہی ہیں۔ان کا بنیادی مقصد نبی کریم ﷺ کے حیات طیبہ کے جملہ واقعات و حالات کو مفصل بیان کرنا ہے۔ بلکہ ان میں سیرت طیبہ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضمناً بیان کیا گیا ہے۔لیکن جو بھی حصہ ان بنیادی مآخذ و مصادر میں بیان ہوا ہے ان کی صحت پر یقین کیا جا سکتا ہے اور ان ہی سے حاصل ہونے والی معلومات کے ذریعے سے سیرت کی کوئی جامع کتاب تیار ہو سکتی ہے۔اور یہی کام مآخذ کی چھٹی قسم خاص سیرت پر لکھی ہوئی اہم کتب میں کیا گیا ہے۔سیرت نگاری کے بھی چند اصول وضوابط ہیں بقول ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی:

> سیرت نگاری ایک ایسی صنف ہے کہ یہاں صرف زبان و بیان پر قدرت اسلوب کی دل آویزی، سلیقہ ترتیب کے سہارے سفر ممکن نہیں ۔سیرت نگاری کی شرط اولین حب رسول ﷺ ہے ۔سیرت نگار کی افتاد طبع اور مزاج ایسا ہو کہ وہ ذات محمدی ﷺ کی دنیا کا شہری بن سکے۔اس محبت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں سلامت روی کے ساتھ ذوق تحقیق ہو۔یوں ہر سیرت نگار کے زاویہ نظر اور موضوع سے نئے نتائج سامنے آتے ہیں ۔ سیرت نگار کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مطبوعہ مواد اور بالخصوص اولین مصادر وضائع کا امکان بھر مطالعہ کرے ۔اولین کتب سیرت کے بڑے حصے کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اسی لئے ان تک رسائی ان سیرت نگاروں کیلئے ممکن ہو گئی ہے ۔جو عربی زبان پر دسترس نہیں رکھتے ۔

پھر سیرت نگار کا اسلوب تحریر ایسا ہو جو عامی اور عالم دونوں کے ذوق کی تسکین کر سکے۔ یہ بات کلام اللہ اور احادیث نبوی ﷺ کے مطالعے سے پیدا ہو سکتی ہے ......[۲۰]

سیرت نگاری کے اصولوں پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

شبلی نے سیرت نگاری میں احتیاط کیلئے محدثین کے مسلّم فن روایت کی بنیاد پر درج ذیل گیارہ اصول مرتب کیے جن کا ہر سیرت نگار کو خیال رکھنا چاہیے۔ (۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احدیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے۔ اگر نہ ملے تو روایت سیرت کی طرف توجہ کی جائے (۲) کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں۔ اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔ (۳) یا سیرت کی روائتیں با عتبار پایہ صحت احادیث کی روایتوں سے فروتر ہوں۔ (۴) روایات احادیث میں اختلاف ہونے کی صورت میں ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دی جائے گی۔ سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔ (۵) نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے (۶) یہ دیکھنا چاہیے کہ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جز شامل ہے۔ (۷) یہ بھی مدنظر رہے کہ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے۔ (۸) جو روایت عام وجود عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرآن کے خلاف ہو گی۔ لائق صحبت نہ ہوگی۔ (۹) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تحقیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی کے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔ (۱۰) روایات و احادیث (وہ محدثین جنہیں روایات کے ہر مرحلے میں صرف ایک راوی نے نقل کیا ہو) کو موضوع کی اہمیت اور قرآئن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔[۲۱]

یہ تھے سیرت نگاری کے اصول و ضوابط جن کی پابندی کرنا ہر سیرت نگار پر فرض ہے۔ عبد الحلیم شرر کو بحیثیت سیرت نگار جاننے کیلئے دیکھا جائے گا۔ کہ انہوں نے اصول سیرت نگاری کو اپنے فن میں کس حد تک جگہ دی ہے؟

ج۔ شرر کی کتب سیرت کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ

اردو میں تاریخ اسلام پر مبنی کتب کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ جو اس بات کی شہادت ہیں کہ ان تاریخی کتب کی ابتداء عموماً عہد رسالت سے ہوتی ہے۔ مختصر کتب تاریخ میں ایک آدھ باب اس موضوع سے متعلق ہوتا ہے۔ جبکہ ضخیم کتب تاریخ اسلام میں ایک یا دو جلدیں عہد رسالت کے واقعات کے بیان کیلئے وقف ہوتی ہیں۔۱۹۰۱ء سے ہماری زبان میں ایسی تاریخی کتب شامل ہوئیں۔ جو کہ ان واقعات سے متعلق ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور محمود خالد:

> ان میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی کتابیں ہیں بڑی کتابیں پڑھے لکھے لوگوں کے لیے اور چھوٹی کتابیں بچوں اور طالب علموں کی درسی ضروریات پوری کرنے کیلئے لکھی جاتی ہیں۔ ان میں طبع زاد تصانیف بھی ہیں اور تراجم بھی۔ ان میں شمس التواریخ (حصہ اول، دوم) از مولوی وارث علی اکبر آبادی (۱۹۰۱ء) عروج اسلام ترجمہ الکامل ابن اثیر، جلد اوّل (۱۹۰۱ء) ''نوائح الاخران ملقب بہ'' ''مظہر المصائب''، از سید محمد صدی (۱۹۰۲ء) رسالہ آغاز اسلام، از عبد اللہ انصاری (۱۹۰۴ء) انحراف التواریخ، از مولانا محمد البردانا پوری (۱۹۱۰ء) تاریخ اسلام، از احسان اللہ عباس (۱۹۱۵ء) ''تاریخ ابوالفد'' اجلد دوم ترجمہ از کریم الدین پانی پتی (۱۹۱۵ء) ''تاریخ خلفائے اسلام''، از محمد شاہ خاں آفریدی (۱۹۲۴ء)، تاریخ اسلام، جلد اول از عبدالحلیم شرر (۱۹۲۵ء)، ''تاریخ اسلام''، از اکبر شاہ خان نجیب آبادی (۱۹۲۶ء) سبل السلام (تاریخ دول العرب والاسلام) از محمد یوسف بن سید محی الدین (۱۹۲۶ء) کے نام بطور مثل لئے جاسکتے ہیں۔[۲۲]

مولانا شرر کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ ذوق وشوق کا یہ عنصر ان کی سیرت نگاری میں نمایاں طور پر ابھرتا ہے۔ بقول رام بابو سکسنہ: ''انھوں نے تاریخ کو اور خصوصی اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اہدی کیا ہے۔ اسلامی دور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے کہ لوگ اسے بار بار پڑھتے ہیں اور جی نہیں بھرتا''۔[۲۳]

شرر نے اپنی کتاب ''تاریخ اسلام'' ۱۹۲۵ء میں مکمل کر کے شائع کی۔ یہ کتاب بنیادی طور پر اسلامی تاریخ کی کتاب ہے۔ لیکن اس کتاب کی پہلی جلد از عہد رسالت تا بہ عہد فاروقی'' پر مشتمل ہے۔ اس کی بنا پر یہ سیرت نگاری کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تاریخ اسلام کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ سیرت رسول ﷺ

پر مشتمل کتب کی روشنی میں پہلی جلد لکھی گئی ہے۔مصنف نے اس جلد کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے اور ہر باب کو فصول پر منقسم کیا ہے۔

عبد الحلیم شرر کی تاریخ اسلام جلد اول ۵۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس جلد کا وہ حصہ جو خاص طور پر سیرت طیبہ ﷺ پر لکھا گیا ہے۔اہمیت کا حامل ہے۔اس جلد کے مطالعے سے شرر کے اسلوب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اور ان کے موضوعات کا بھی علم ہوتا ہے۔کہ شرر نے کن کن موضوعات کو اپنایا۔اس کتاب کو لکھتے وقت مصنف نے سیرۃ ابن ہشام، سیرہ النبی ﷺ، تمدن عرب، خطبات احمدیہ، ارض القرآن، کتاب عہد قدیم، ابن اثیر جلد اول، قرآن مجید کتب احادیث، ابن خلدون، جلد ثانی، صحیح بخاری، تورۃ، رائز اینڈ پراگرس آف محمد ازم" (ترقی وعروج اسلام) مصنفہ ڈاکٹر ہنری اسٹوب، انحطاط وزوال وروم مصنف گبن، تاریخ خلفاء سیوطی، یروشلم دی سٹی آف ہروڈ اینڈ سلادین (اصلاح الدین) از والٹر بزنٹ پامر۔ارلی ٹریولس ان پیلس، ٹائن مرتبہ ٹامس رائیٹ، اخبار الطّول مصنف ابو حنیفہ دینوری وغیرہ کتابیں اپنے پیش نظر رکھیں، جس کی شہادت اس جلد کے مطالعہ سے ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ کی بعض کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے سوانحی حالات، حکایات کی شکل میں بیان کئے گئے ہیں۔بعض میں خلفائے راشدین والا حصہ عہد نبوی ﷺ کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔بعض کتابیں حضرت آدمؑ کے تذکرے سے شروع ہوئی ہیں، اور آنحضرت ﷺ کے عہد کا احاطہ کرتے ہوتے ہوئے آنحضرت ﷺ سے لے کر بارہ ۱۰ اماموں تک کے حالات درج ہوتے ہیں۔بہر حال اسلامی تاریخ کی کوئی بھی کتاب آنحضرت ﷺ کے ذکر مبارکہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔یہ کتابیں بھی سیرت رسول ﷺ کا ایک حصہ ہیں۔سیرت کی دیگر کتابوں کی طرح ان میں واقعات کی صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا۔

تاریخ اسلام کی ابتداء ملک عرب اس کی وضع حالت اور تاریخ جہالت سے ہوتی ہے۔پھر فصل بہ فصل فضائل نبوی ﷺ، حسب ونسب، ولادت با سعادت، طفولیت، شباب، نکاح، کفار کی مخالفت، معراج، ہجرت، حبشہ، مکی زندگی کے حالات وواقعات، ہجرت مدینہ، غزوات، مدنی زندگی کے حالات وواقعات، وفود کی آمد، آپ کے مقرر کردہ احکام اور اہل کار، سلاطین، ملوک کو فرامین کی ترسیل، آپ ﷺ کے شمائل واخلاق وعادات، معجزات، نبوت کی کامیابیاں، حجۃ الوداع، اہل وعیال، حشم وخدم، آپ ﷺ کی زندگی وتعلیم پر ایک نظر۔حضرت عمر فاروقؓ، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عہد خلافت وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔

شرر نے اپنے مخصوص انداز سے سیرت طیبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کی عقیدت کا اظہار اس حصے کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ آپ نے عام فہم انداز اپنایا۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> اب آپ ﷺ کا سن اتنا تھا کہ آپ ﷺ کے اخلاق و عادات پر لوگوں کی نظر پڑنے لگی۔ دیکھنے والوں نے حیرت سے دیکھا کہ بچپن ہی سے آپ کو شرک و بت پرستی سے نفرت تھی۔ گناہوں سے بچتے، شراب کو ہاتھ نہ لگاتے۔ برہنگی کے متحمل نہ ہو سکے جوان دنوں بڑوں بڑوں میں معیوب نہ تھی۔ اور ایسے سچے اور راست باز تھے کہ قریش میں آپ ﷺ کا لقب امین مشہور ہو گیا۔[۲۴]

اس کتاب کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مصنف نے جہاں پر بھی رسول پاک ﷺ کا ذکر کیا ہے آپ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور آپ کے لفظ پر نہ تو (ؐ) لکھا گیا ہے اور نہ ہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

> اب آپ کو مبعوث ہوئے آٹھ برس ہو گئے تھے۔ اور قریش کی دشمنیاں بدستور قائم تھیں کہ حضرت ابو طالب اور آپ کی بیوی حضرت خدیجہ نے وفات پائی۔ آپ کیلئے ابو طالب کے اٹھ جانے سے امن و امان اور جناب خدیجہ کے رخصت ہو جانے سے تسلی و تسکین دنیا سے اٹھ گئی۔ اور سخت ترین تر ادوار پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اب تک ابو طالب آپ کے دشمنوں کے نرغے سے بچاتے رہے تھے۔ ان کے بعد اندیشہ تھا کہ دشمن جان پر نہ حملہ کر بیٹھیں، غرض ضرورت تھی کہ کسی کے دامن میں پناہ لے کر آپ سلسلہ تبلیغ جاری رکھیں۔[۲۵]

شرر نے سیرت کو اس انداز سے لکھا کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو رسول پاک ﷺ کے عہد میں محسوس کرتا ہے۔ دین اسلام اور اپنے پیارے حبیب سے محبت کا جذبہ قاری میں پروان چڑھتا ہے۔ مصنف نے رسول کریم ﷺ کے عہد کے ہر واقعہ کو عقیدت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے ابن اثیر، ابن خلدون، سیرۃ النبی تاریخ الخمیس، سنن ابی داؤد، صحیح بخاری، سیرۃ ابن ہشام، تورہ کتاب استثنا، وغیرہ کتب کو سامنے رکھ کر ہر فصل لکھی ہے۔ پہلی فصل میں شرر نے حضور نبی پاک ﷺ کی زندگی کے حالات وواقعات کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر واقعہ مختصراً بیان کیا ہے۔ مصنف نے مختصر مگر جامع انداز میں مدنی زندگی کو اس فصل میں بیان کیا ہے۔ اس سے قبل پہلی

فصل کا موضوع مکی زندگی تھا۔ جس کو مصنف نے اس طریق سے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی مکہ میں جس طرح سے بسر ہوئی اس کی مکمل ترین تصویر قاری کے سامنے رکھ دی ہے۔ تیسری فصل میں غزوات کا ذکر ہے۔ صلح حدیبیہ، بیت رضوان جیسے واقعات پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ فصل بھی ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ چوتھی فصل کا موضوع ہے ''صلح حدیبیہ کے بعد سے سریہ موتہ تک'' یہ فصل ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان تمام خطوط کی فہرست مصنف نے دی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دوسرے بادشاہوں کے نام لکھوائے تھے۔ اس میں بھی مصنف نے قابل فہم انداز میں رسول پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کا اجمالی نقشہ قاری کے سامنے بیان کیا ہے۔ پانچویں فصل بھی ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے خاص انداز میں سیرت پاک پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، لیکن عقیدت کے پہلوؤں کو مصنف نے نہیں چھوڑا۔ اس فصل میں بھی تمام اہم واقعات کو مصنف نے مختصراً بیان کیا ہے۔ چھٹی فصل ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے ساتویں فصل ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فصل کا عنوان حجۃ الوداع اور وفات ہے۔ اس فصل کے ذیلی عنوانات جن پر شرر نے لکھا ہے یہ ہیں۔

> تکمیل تبلیغ، حجۃ الوداع، حج اور عمرے والوں میں امتیاز، حضرت علیؓ کا یمن سے آنا، آپ کا خطبہ، عورتوں کے حقوق، کتاب اللہ اور سنت رسول، واپسی مدینہ، اسامہ کو روانگی شام کا حکم، اسود عنسی، اس کا غلبہ، سارے یمن پر اس کا قبضہ۔ عمر بن معدی کرب کا ارتداد، آپ کے والیان یمن کی حالت، اسود کے زوال کا سامان، اس کا قتل، پھر یمن پر اسلام کا قبضہ۔ آغاز مرض، ترقی مرض، عائشہ صدیقہ کے پاس قیام، بغاوت اور ارتداد کی خبریں۔ آپ کا خواب اور اس کی تعبیر۔ بیماری میں بھی فرائض رسالت کا انجام دینا، حضرت عائشہ سے مذاق، شدت مذاق، لوگوں کے حقوق ادا کرنا۔ آپ اپنی وفات کی خبر دیتے ہیں۔ ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم۔ پیغمبر کا امت سے رخصت ہونا، آپکی وصیتیں۔ آپ کا دوات اور کاغذ مانگنا، جانشینی کے بارے میں کسی نے کچھ نہ پوچھا، آپکا مسجد میں برآمد ہونا، عالم نزع، مسواک کرنا۔ وفات، تاریخ وفات، صحابہ کا اضطراب، تجہیز وتکفین میں تاخیر، مدفن میں اختلاف، غسل دینے والے۔ کفن، نماز جنازہ، قبر میں اتارنے والے، دفن، عمر شریف۔[۲۶]

یہ فصل شرر نے کیوں لکھی ہے۔ انہی کی زبانی سنئے ہیں۔

> حضور سرور عالم ﷺ کی مبارک اور پیغمبرانہ زندگی کا مختصر خاکہ ہم نے گزشتہ فصلوں میں

دکھایا اور ولادت سے وفات تک آپ کے حالات ناظرین کومعلوم ہو گئے ۔مگر ابھی یہ دیکھناباقی ہے کہ آپ کی تعلیم اور آپ کے اثر سے ملک عرب کیا سے کیا ہو گیا اور ساری دنیا کیسی بن گئی ۔[۴۷]

یہ فصل ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔اس تاریخ کو لکھنے کا اصل مقصد بقول عبد الحلیم شرر:

اسلام کی انہی برکتوں کا دکھانا ہماری اس تاریخ کا مقصود اصلی ہے ۔لہٰذا آئندہ ابواب میں یہ تفصیل بتائیں گے کہ آغوش نبوت میں پرورش پائی ہوئی قوم عرب نے کس طرح دنیا کو فتح کیا ۔اسلامی دنیا پر اپنا کیا اثر ڈالا۔ فاتح اور دولت مند بننے کے بعد پھر ان میں تبلیغ حق کا جوش،خود پرستی اور دنیوی عیش سے کیونکر مبدل ہو گیا ۔[۴۸]

اگلے ابواب میں حضرت صدیق اکبرؓ،حضرت عمر فاروقؓ ،حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی سیرت کے کارناموں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس انداز سے انہوں نے حکومت کی،اور کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے؟ حضورﷺ کی تعلیمات کو کس طرح سے پھیلایا؟ اسلام کی ترقی کن کن اصولوں کو اپنا کر ہوئی؟ ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی کس طرح ہوئی؟ ان میں کیا خوبیاں تھیں؟ کون کون سی فتوحات ان کے ہاتھوں ہوئیں؟ وہ عرب قوم جو جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ وہی قوم جب دولت اسلام سے فیضیاب ہوتی ہے تو پھر پوری دنیا پر چھا جاتی ہے ۔تاریخ اسلام میں سیرت طیبہ کے جن پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے وہ مصنف کے دینی شعور اور اپنے مذہب سے محبت اور اسوہ حسنہ سے عقیدت ومحبت کا مظہر ہے ۔

تاریخ وسیرت نگاری کا بنیادی اصول یہی ہے کہ موضوع سے متعلق جس قدر کتابیں دستیاب ہوں ان کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے ۔اور ان میں سے وہ واقعات اخذ کیے جائیں جو تحقیق کے معیار پر پورے اترتے ہوں ۔تاریخ اسلام کی تالیف کے وقت عبد الحلیم شرر صاحب نے بھی انہیں اصولوں کو مدنظر رکھا اور جن کتب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان کو سامنے رکھا ہے ۔انہوں نے ایک طرف عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس لگنے سے بچایا اور دوسری طرف حقائق کو بھی مسخ نہ ہونے دیا۔آپ نے نبی پاکﷺ کے ساتھ اپنی محبت وعقیدت کو برقرار رکھتے ہوئے کتب تاریخ وسیرہ میں سے وہ واقعات لئے جو ہر لحاظ سے مستند ہیں ۔ پیچھے درج کی گئی کتب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر نے کس طرح سے ان کتب سے استفادہ کیا؟ سیرۃ ابن ہشام اور ابن خلدون کے حوالے کتاب میں

زیادہ موجود ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ شرر نے ان دو کتب کا مطالعہ اچھی طرح سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی جن کتب کا ذکر حاشیے میں موجود ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد یہ کتاب تالیف کی ہے اس کتاب کا اسلوب ایسا ہے کہ عام قاری بھی مفہوم تک پہنچ سکتا۔

تاریخ اسلام کو پڑھتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اسلامی تاریخ کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ تاریخ اسلام کے اس حصے کو جو کہ سیرت طیبہ سے متعلق ہے۔ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے تحقیق وترتیب سے واقعات کو لکھا ہے۔ اور سادہ الفاظ میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور واقعات کو انتہا سے زیادہ دلکش بنادیا ہے۔ زمانہ جاہلیت اور عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین کو ایسی عمدگی اور خوبصورتی سے دکھایا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس عہد میں محسوس کرتا ہے۔ اسلامی دور کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا کہ لوگ بار بار پڑھتے ہیں اور ان کا جی نہیں بھرتا۔

ان کی بسیارنویسی بھی ان کے لیے کچھ کم بلائے جان ثابت نہ ہوئی'' اس کے باعث ان کے یہاں بھی بہت سی خامیاں باقی رہ گئیں لیکن جہاں تک سیرت نگاری کا تعلق ہے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا اسلوب اور انداز بیان شگفتہ اور رواں ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کتاب کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے عہد نبوی کی زندہ تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ شرر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی تھی۔ اور اس فن کو اردو ادب میں ترقی دینے کی کامیاب کوشش بھی کی۔ انھوں نے اس فن میں متانت اور سنجیدگی قائم کی۔ ان سے پہلے اسلامی تاریخ عربی اور فارسی زبان میں تھی اور مسلمانوں کو بھولی ہوئی بھی تھی۔ شرر کا کارنامہ یہ ہے۔ کہ انھوں نے تاریخ اسلام کی تین جلدیں لکھ کر عہد نبوی اور خلفائے راشدین و مابعد کے مسلمانوں کے دور کو پھر دنیا کے سامنے زندہ کر کے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے دلوں میں جوش پیدا ہوگیا۔ شرر نے جوش عقیدت کے ساتھ سیرت نبوی ﷺ کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ دلچسپی اور دلکشی کا عنصر ان کی ان جلدوں میں موجود ہے۔ انداز بیاں اس قدر دلکش ہے کہ شروع سے آخر تک ختم کیے کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کتاب کو پڑھنے سے شرر کی معلومات کی قدر ہوتی ہے۔ اور سوچنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے ادیب موجودہ دور میں کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ شرر بھی ایک مقصدی ادیب تھے۔ سرسید احمد خان کی مقصدیت کے زیراثر اپنا فن تخلیق کررہے تھے۔ اس مقصدیت کے زیراثر شرر نے سیرت طیبہ پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کے پیش نظر مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور معاشرتی اصلاح کا فریضہ تھا۔ شرر کا مدعا مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ کی داستان سنا

کر ان کے دلوں میں ولولہ و جوش پیدا کرنا تھا۔اس کتاب میں جوش بیاں کی مکمل جھلک دکھائی دیتی ہے۔شرر اپنی بات کو خلوص دل سے کہتے ہیں اور اپنے پر جوش انداز بیاں کی وجہ سے قاری کے دل و دماغ کو تسخیر کر لیتے ہیں۔سیرت طیبہ کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں، کہ سارا منظر نگاہوں میں گھوم جاتا ہے، اور قاری اپنے آپ کو عہد نبوی میں لے جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں منفرد اسلوب ہے۔اس میں دبستان سرسید احمد خان کی مقصدیت استدلال اور جوش خطابت شبلی کی طرح اور آزاد کی طرح تخیل کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔پر تکلف منظر نگاری۔جزیات نگاری، لکھنو کی زبان ان کی طرز تحریر کی وہ نمایاں خوبیاں ہیں جوان کو ان کے عہد کے سیرت نگاروں اور ادیبوں سے منفرد اور ممتاز بناتی ہیں۔اشرف حسینی نے سچ کہا ہے۔''مولانا کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔تاریخ کے علاوہ وہ جغرافیہ میں بھی پوری مہارت رکھتے ہیں۔''[۲۹]

شرر نے تاریخ کے سے خشک موضوع کو اپنی دلکش تحریر سے دلچسپ بنا دیا تھا۔جہاں تک سیرت نگاری کا تعلق ہے۔وہ تو موضوع ہی ایسا ہے۔کہ ہر مسلمان دلچسپی اور عقیدت سے ان کا مطالعہ کرتا ہے۔عبد الحلیم شرر عربی اور فارسی زبان کے عالم بھی تھے۔تاریخ سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا۔مورخانہ ذوق، قبولیت عام کی خواہش، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیاء کا خیال، سیرت نگاری کا محرک بنا تھا۔بقول علی عباس حسینی:۔''آپ نے مسلمانوں کو ان کے قدیم کارنامے یاد دلا کر موجودہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرنا چاہا ہے۔''[۳۰]

سیرت طیبہ پر قلم اٹھاتے وقت شرر کا عہد سب سے بڑا محرک ثابت ہوا۔تاریخ اسلام میں تاریخ کی روح مجروح نہیں ہوتی، اور شرر تاریخ کو مسخ کرنے یا اس میں تحریف کرنے کے مجرم نہ بنے۔ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں:۔''فطرت نے ان کو قوت بیان اور طرز ادا کا سلیقہ دیا تھا''[۳۱] شرر اردو ادب کے مشہور انشاء پرداز اور ناول نگار تو ہیں ہی، لیکن وہ سیرت نگار بھی اعلیٰ پائے کے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کا بڑی گہری نظر سے ایک ہوشیار طالب علم کے شوق کے ساتھ مطالعہ کیا۔گزرے ہوئے زمانوں اور عہد رفتہ کی تہذیب اور معاشرت کا انھوں نے عمیق جائزہ لیا اور ان کے بارے میں وافر معلومات حاصل کیں۔

مسلمانوں کو بیدار کرنے کیلئے اور ترقی کی شاہراہ پر لگانے کیلئے عبد الحلیم شرر نے سیرت نگاری پر قلم اٹھایا اس طرح انھوں نے فن سیرت نگاری میں بھی اپنا مقام و مرتبہ متعین کر لیا۔شرر نے سیرت کی اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے

اس کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔شرر نے جو کچھ لکھا وہ حقیقت پر مبنی ہے۔نمونے کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

آپ اگر چہ معزز و شریف ترین خاندان عرب میں پیدا ہوئے،مگر ابتدائی زندگی مصیبتوں اور پریشانیوں کا عبرتناک نمونہ تھی۔ماں کے پیٹ میں تھے کہ پدر بزرگوار نے سفر آخرت کیا۔چھ برس کے تھے کہ ماں کے آغوش شفقت سے محروم ہو گئے۔اور جد امجد نے سر پر ہاتھ رکھا۔آٹھ برس کے تھے کہ وہ دست شفقت بھی سر سے اٹھ گیا اور دادا کی وصیت کے مطابق سگے چچا ابو طالب نے اپنے کنار عاطفت میں لیا۔مگر وہ بچارے فکر معیشت سے پریشان تھے۔[۳۲]

منظر کشی میں شرر کو کمال حاصل ہے۔ان کے مناظر رنگین، تازہ اور جاندار ہوتے ہیں۔تاریخ اسلام میں بھی شرر نے منظر کشی کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔وحی کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

۱۷ تاریخ دوشنبہ کے روز صبح تڑکے پو پھٹنے کے وقت آپکو یکا یک معلوم ہوا کہ ایک فرشتہ آیا۔وحی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں ہے،جس پر کچھ لکھا ہے اور اس کو دکھا کر وہ کہہ رہا ہے ''وہ پڑھو'' آپ نے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا، اس نے سینے سے لپٹا کر خوب بھینچا اور چھوڑ کر کہا ''پڑھو'' آپ نے پھر وہی جواب دیا۔کہ میں بے پڑھا ہوں۔غرض اس نے تین بار سینے سے لپٹا کر دبایا اور پڑھنے کی تاکید کی۔تیسری بار آپ نے بجائے معزوری ظاہر کرنے کے پوچھا ''کیا پڑھوں'' اس نے سورۃ اقراء کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں اور چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد آپ اٹھے تو وہ سورۃ دل پر نقش تھی۔گھبرا کر غار سے باہر نکلے اور پہاڑوں کی کھلی فضاء میں جا کھڑے ہوئے۔یکا یک کان میں آواز آئی اے محمد ﷺ تم خدا کے رسول اور میں جبرائیل ہوں۔نظر اٹھا کے دیکھا تو انسانی ہیت میں جبرائیل کی شکل کا ایک خاکہ نظر انور کے سامنے تھا۔نظر پڑتے ہی یہ صورت آنکھوں میں ایسی جم گئی کہ کسی طرح نہیں ہٹتی۔جدھر نگاہ پھیرتے ہیں وہ صورت دکھائی دیتی ہے۔اور وحی کے الفاظ اس کی زبان پر ہیں۔[۳۳]

واقعات کو بیان کرنے کا سلیقہ شرر کو خوب آتا ہے۔

آپ کو بذریعہ وحی اطلاع ہوگئی۔فوراً حضرت علیؓ کو اپنے بچھونے پر لٹایا۔پھر کفار کی

آنکھوں میں خاک جھونک کر اور انھیں کے درمیان میں سے ہو کے نکلے۔ ابوبکر صدیقؓ کے گھر میں جا کے انھیں ساتھ لیا۔ اور ان کے مکان کے پچھواڑے کی کھڑکی سے نکل کر آبادی کے باہر ہوئے اور کوہ ثور کے ایک غار میں چھپ رہے۔ کفار نے جب صبح کو آپ کی جگہ حضرت علیؓ کو پایا تو انھیں کچھ مارا پیٹا۔ پھر ابوبکرؓ کے گھر جا کر ان کی صاحبزادی اسماءکو مارا۔ مگر کسی سے پتہ نہ چلا کہ آپ کہاں ہیں۔ اب شہر کے اندر، باہر ہر جگہ آپ کی تلاش ہونے لگی اور اشتہار دے دیا گیا کہ جو کوئی دونوں کو پکڑ کر لائے گا، اسے ایک سو اونٹ انعام ملیں گے۔[۳۴]

اس کتاب کی زبان بھی عام فہم ہے۔ اقتباس بطور نمونہ:۔

ان دنوں مکہ میں قحط تھا۔ آپ نے کچھ سرمایہ اور سونا غربا میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجا۔ اس کا معاوضہ اہل مکہ سے یہ ملا کہ مدینے کے نکلے ہوئے بنی نضیر کی سازش سے قریش بہت سے اور قبائل کو اپنے ساتھ لے کر مدینے پر چڑھ آئے۔ تین ہزار نبرد آزما قریش کا دل بادل تین سو سواروں کے اور ان کے ساتھ ابوسفیان کی سرداری میں مکہ سے چلا... اور آگے قدم بڑھایا تو اور بہت سے قبائل آ ملے۔ پھر یہود کا لشکر شریک ہوا غرض مدینے پہنچنے پر کفر کے جھنڈے تلے چوبیس ہزار کا لشکر تھا۔ یہ لوگ عہد کر کے آئے تھے کہ مدینے کا محاصرہ کر کے ایک فیصلہ کن لڑائی لڑیں گے۔[۳۵]

بعض لوگ عبد الحلیم شرر کی زبان پر تنقید کرتے ہوئے، اسے پھیکا قرار دیتے ہیں۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام: ''بعض صاحبان کو شرر کی زبان اس لئے پھیکی نظر آتی ہے۔ کہ اب تک ہمارے ذہنوں پر تکلف اور تصنع کی حکمرانی قائم ہے۔''[۳۶]

آنحضورﷺ کی زندگی کے ہر پہلو کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اگر چہ یہ تاریخ کی کتاب ہے۔ اس کو شرر نے تاریخی انداز میں لکھا ہے، لیکن سیرت نگاری کے فن پر بھی یہ کتاب پوری اترتی ہے۔ شرر نے اس جلد میں واقعات کو تاریخی تسلسل کے طور پر پیش کیا ہے۔ نبی کریمﷺ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے واقعات کو شرر نے تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اگر چہ بعض واقعات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور بعض کا مختصر جائزہ

پیش کرتے ہیں۔لیکن یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ہر واقعہ کے بیان میں تسلسل ہے۔انداز بیاں،طریقہ اظہار، طریقہ تحریر تاریخی کتب کا ساہے اس جلد میں شرر کا انداز بیان ناولوں سے مختلف ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر کی سیرت پر مبنی یہ کتاب ایک طرف تو رسول پاک ﷺ کی شخصیت کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کا سبب ہے۔تو دوسری طرف اس خاص عہد کی سیاسی، معاشرتی اور اس سے بھی بڑھ کر مجلسی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ بنی ہے۔ایک ایسا آئینہ جس میں موضوع اور بیان دونوں کے مکمل امتزاج نے چمک پیدا کی ہے۔حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ پر ان کی زندگی کے نشیب وفراز پر اشاعت دین میں مصائب جھیلنے پر ہجرت و غزوات اور اسلامی معاشرے کی تنظیم پر مسلمان عالموں نے صدیوں تک تحقیق وجستجو کی ہے۔اسی طرح حضور ﷺ کے تاریخ ساز،افعال واعمال ہمیشہ سے مسلمان مورخوں کے قلم کی جولانگاہ رہے ہیں۔عبدالحلیم شرر نے سیرت طیبہ ﷺ پر لکھ کر کسی نئے موضوع کو متعارف نہیں کروایا ہے۔بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے رسول پاک ﷺ کی شخصیت وسیرت کو اسطرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ذات اقدس کے خدوخال اچھی طرح ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔شوکت زیدی رقمطراز ہیں:

> ایک مورخ کے سامنے رسول مقبول ﷺ کی کئی حیثیتیں ہیں۔وہ بحیثیت پیغمبر رب، داعی دین اسلام ہیں۔بحیثیت رہبر مسلمیں، امیر ریاست اسلام بھی ہیں۔وہ نگران فوج بھی ہیں۔اور قوانین نظام ریاست کے مآخذ کنندہ بھی قانون ساز بھی ہیں۔اور عدلیہ نواز بھی۔ گویا وہ ایک ایسی شخصیت ہیں۔جس میں تہ در تہ بہت سی شخصیتیں چھپی ہوئی ہیں۔[۳۷]

شرر نے ایک کامیاب اور سچے مورخ کی طرح اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایسی جامع صفات کی تصویر کشی یوں کی جائے کہ وہ ہر سمت سے دیکھنے والوں کے سامنے آجائے۔سیرت طیبہ ﷺ کو تاریخ کی صورت میں لکھتے وقت شرر کا جوش عقیدت قدم قدم پر دکھائی دیتا ہے۔سیرت طیبہ کو لکھتے وقت شرر ایک غیر جانبدار مورخ کی بجائے ایک پرستار اور عاشق دکھائی دیتے ہیں۔ان کا یہ انداز صرف تاریخ اسلام ہی میں نہیں ، جویائے حق اور خاتم المرسلین میں بھی پایا جاتا ہے۔

جویائے حق

جویائے حق کا موضوع آنحضرتﷺ کی سیرت پاک ہے۔اس میں قبل از اسلام عرب کی تاریخ، تہذیب وثقافت کا بیان بھی ہے،اور آنحضرتﷺ کے عہد کے تمام حالات وواقعات کا تذکرہ بھی، سیرت پاکﷺ جو کہ عبدالحلیم شرر نے ناول کی صورت میں لکھی ہے۔اس میں ماہ جو قبول اسلام کے بعد حضرت سلمانؓ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں ان کے خطوط جو وہ استفانوس کو لکھتے تھے ان کے ذریعے سے سیرت پاکﷺ کے ہر ہر پہلو کا تفصیلاً اور اجمالاً بیان کیا ہے۔آنحضرتﷺ کے شب وروز کے ہر واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔سیرت رسولﷺ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو حضرت سلمانؓ نے خطوط کے ذریعے سے استفانوس کے سامنے پیش نہ کیا ہو۔

عبدالحلیم شرر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سیرت پاکؐ کو ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔اس ناول کو لکھنے کا ایک مقصد تو مسلمانوں کے سامنے اپنے پیارے نبی حضرتؐ کی سیرت پاک کے ہر پہلو کو بیان کرنا تھا۔دوسرے اس دور میں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ انہیں خواب غفلت سے بیدار کیا جائے اور انہیں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے پر ابھارا جائے اس مقصد کے تحت عبدالحلیم شرر نے سیرت پاک پر تفصیل سے لکھا۔''جویائے حق'' ۶۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں حضرت سلمان فارسیؓ کے خطوط کے ذریعے سے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے بھی جہاں سوانح خاتم المرسلین تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں رسول اللہﷺ کے حالات قلم بند کیے۔وہاں انہوں نے ناول کے پیرائے میں بھی سیرت نگاری کی جو کہ ان کا کامیاب ترین تجربہ ہے۔عبدالحلیم شرر نے تین مختلف کتابیں سیرت پر لکھ کر اپنا نام سیرت نگاروں میں شامل کیا۔

جویائے حق (تین حصے) مولانا شرر کا چھ سو صفحات پر مشتمل ایک تاریخی ناول ہے اور موضوع کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔اس کا پہلا حصہ ۱۹۱۷ء میں، دوسرا ۱۹۱۹ء میں اور تیسرا ۱۹۲۱ء میں ماہنامہ ''دل افروز'' میں قسط وار شائع ہوا۔اس کتاب میں مصنف نے حضرت سلمان فارسیؓ کے تلاش حق کی روحانی واردات قلم بند کی ہے۔ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کہتے ہیں:

مولوی عبدالحلیم شرر نے جامعہ عثمانیہ کے لیے تاریخ اسلام لکھی جس کی پہلی جلد کا ابتدائی

> حصہ سیرت رسول پاک ﷺ سے متعلق ہے۔شرر اختصار کے ساتھ حضور ﷺ کی زندگی، اخلاق وشمائل اور کارناموں کو پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں، لیکن سیرت کے میدان میں شرر نے جہاں اپنے فن میں ناول نگاری کا سہارا لیا ہے، وہ کامیاب تر ہیں۔ سیرت رسول ﷺ کا موضوع اتنا نازک ہے کہ مورخ کے پر بھی اس وادی میں جل اٹھتے ہیں۔ نہ کہ اسے کہانی کے پیرائے میں بیان کرنا، شرر کے فنی شعور نے اس وادی بے راہ میں ان کی رہنمائی کی اور انھوں نے ''جویائے حق'' کا ہیرو ایک ایسے راہب کو بنایا جسے اس کے دور کی عیسائیت کچھ نہ دے سکی تھی۔ اس کے روحانی اور مادی سفر میں بڑا کرب ہے۔ عیسائیوں کے معتقدات ان کی خانقاہوں کے مرقع اور بعض افراد کی تلاش حق اور اس حقیقت تک پہنچنے کی کہانی بڑی دل آویز ہے۔ ۳۸

مولانا حسن مثنیٰ ندوی رقمطراز ہیں: ''اس میں انھوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی اس انداز میں پیش کی ہے۔ کہ ان کی زبان سے سیرت نبوی ﷺ نہایت ہی موثر انداز میں (بطرز ناول) بیان ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا اسے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑتا''۳۹ ''جویائے حق'' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے تاریخی صداقتوں سے کہیں انحراف نہیں کیا۔ موضوع کے اعتبار سے جویائے حق کو جو انفرادیت حاصل ہے وہ مسلم ہے۔ اسی بنا پر یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ اس کتاب میں اگر چہ شرر نے حضرت سلمانؓ کے تلاش حق کی روحانی واردات کو قلم بند کیا ہے لیکن حضرت سلمانؓ کی زندگی کے حالات وواقعات شرر نے اس کمال فن سے پیش کئے ہیں کہ سیرت رسول پاک ﷺ کا ہر پہلو قاری کے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور اس انداز سے بیان کیا ہے کہ جب تک کتاب ختم نہیں ہوتی قاری کا ذوق وشوق بھی ماند نہیں پڑتا۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے تاریخی صداقتوں سے انحراف نہیں کیا۔ جس دور میں شرر نے یہ کتاب لکھی اس دور میں سیرت پر اس جیسی کتابیں ابھی زیادہ مقدار میں منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ شرر پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ انہوں نے اس موضوع پر نہ صرف کتاب لکھی بلکہ ایک منفرد انداز بھی اپنایا۔ محمد علی قریشی کے خیال میں:

> یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس دور میں مولانا شرر نے اپنا ناول ''جویائے حق''، قلم بند کیا اس دور میں ابھی اردو زبان میں نبی کریم ﷺ کے سوانح حیات پر بھی زیادہ کتب شائع نہیں ہوئی تھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مولانا شرر پر اپنا خصوصی فضل و کرم ہے کہ اس نے

مولانا موصوف کو یہ توفیق بخشی اور اس فخر و شرف کا مستحق ٹھہرایا کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابیوںؓ کے زمانہ کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ ''جویائے حق'' کو اس لحاظ سے بھی اسلامی تاریخی ناولوں میں اولیت حاصل ہے کہ اس میں حضورﷺ کی حیات طیبہ کے ہر پہلو کی مستند اور صحیح روایات کو پیش کیا گیا ہے۔ مولانا شرر نے واقعات و کوائف کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھ کر ناول کی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔ جہاں تک اس ناول کے واقعات و کوائف کا تعلق ہے وہ اتنے ثابت، اتنے ظاہر، اتنے روشن اور اتنے جامع اور مفصل ہیں کہ نوع انسانی کے کسی فردِ بشر کی زندگی کے حالات ان کا عشر عشیر بھی صحت اور اسناد کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے نہ کیے جائیں گے، اور نہ کئے جا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو حضورﷺ کے عہد مقدس کے مستند حالات پڑھنے کے شائق ہیں انہیں ''جویائے حق'' کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس ناول کا مطالعہ ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق کرے گا۔[۴۰]

''جویائے حق'' کے شروع میں موجود یہ الفاظ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ ناول کی صورت میں سیرت پاک ﷺ ہے۔ ''خیر البشر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات ناول کے دلچسپ و دل نشین انداز میں''[۴۱]

قمر تسکین ''جویائے حق'' میں شامل ضمیمہ بعنوان پہلی بات میں لکھتے ہیں:

حضور نبی کریمﷺ کی سوانح حیات گزشتہ چودہ سو سال سے مسلسل سنی سنائی اور لکھی لکھائی جا رہی ہیں۔ ہزاروں قلمکار عقیدت مندوں نے حضور نبی کریمﷺ کی خدمت مبارکہ میں گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔ گزشتہ چودہ صد برس سے حضورﷺ کے وجود مبارک کی خوشبو سے فضا چہک رہی ہے۔ اور تا قیامت چہکتی رہے گی۔ دنیا جب تک قائم ہے حتیٰ کہ روز قیامت تک عقیدت مند حضورﷺ کے سوانح حیات لکھتے رہیں گے اور دنیا انہیں ذوق وشوق سے پڑھتی پڑھاتی رہے گی۔ حضور نبی کریمﷺ کے سوانح حیات اردو کے ساتھ ساتھ دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں قلم بند کئے گئے ہیں۔ مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی نے بھی ساٹھ ستر برس قبل حضورﷺ کے سوانح حیات اپنی ایک تالیف بعنوان ''جویائے حق'' نامی میں لکھے تھے۔ مولانا شرر کے ان گلہائے عقیدت کو اس لحاظ سے اولیت اور منفرد مقام حاصل ہے۔ کہ یہ حضور نبی کریمﷺ کی ایسی سوانح حیات ہے جو دنیا کی ہر زبان میں سب

> سے پہلے ناول کے انداز میں قلم بند کی گئی ہے۔"جو یائے حق" اول تا آخر انتہائی دل چسپ انداز میں قلم بند کی گئی ہے اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے گھر کا ہر فرد بلا امتیاز مرد و زن ذوق وشوق سے پڑھے گا۔[۴۱]

جو یائے حق اپنی تکنیک اور زمانی پھیلاؤ کے اعتبار سے نہ صرف شرر کے ناولوں میں بلکہ اردو ناول نگاری میں ایک انفرادیت رکھتا ہے۔شرر نے ایک بہت وسیع کینوس کا انتخاب کیا ہے۔موضوع کے اعتبار سے اس میں تنوع ہے۔اسے حضرت سلمان فارسیؓ کی سوانح بھی کہا جا سکتا ہے، خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ کی سیرت بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور قبل طلوع اسلام سے لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے آغاز تک کی اسلامی تاریخ اور عربوں کی معاشرت کا مرقع بھی کہا جا سکتا ہے۔عبدالحلیم شرر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بڑی ہنر مندی سے ان سب پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔

اسلام سے قبل عرب میں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔عربوں کی خوبی یہ تھی کہ وہ حد درجہ شجاع اور دلیر تھے۔اور مہمان نواز بھی بہت تھے۔عرب کے لوگ قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ اپنے شیوخ کا احترام اور فرماں برداری کرتا تھا۔ قبیلے کے افراد کا باہمی اتفاق و اتحاد مثالی تھا۔اور قبیلوں کی خوبی یہ تھی کہ حلیف قبائل ایک دوسرے کا ہر مرحلہ پر ساتھ دیتے تھے۔عرب کے لوگ اپنے آپ کو اسماعیل بن ابراہیم کی نسل سے منسوب کرتے تھے۔اور اس بات پر بہت فخر کرتے تھے۔یہ انساب کے حافظ اور ماہر بھی تھے۔مذہبی لحاظ سے عربی بت پرست تھے حالانکہ یہ خود کو حضرت ابراہیمؑ کے دین کے پیرو مانتے تھے، اور وہ یہ جانتے تھے کہ وہ جن کی اولاد ہیں وہ بت پرست نہیں تھے بلکہ توحید پرست تھے۔مولانا عبدالحلیم شرر"جو یائے حق" کے پہلے خط میں حضرت سلمانؓ کی زبان سے عرب کی حالت کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

> مرشدی ومولائی! حضرت سے رخصت ہوتے ہی میں نے صحرائے عرب میں قدم رکھا اور جوں جوں قدم آگے بڑھاتا جاتا ہوں ایک نئی غیر متمدن دنیا میری نظر کے سامنے آتی جاتی ہے زمین کی پیداوار کم ہے اور اسی نسبت سے یہاں آبادی بھی کم ہے۔لوٹ مار یہاں کے لوگوں کا شریف پیشہ مگر اس کے ساتھ ہی ایک بے کس اور درویش کے لیے ان سے اچھا مہمان نواز بھی کہیں نہ ملے گا۔مہمان نوازی وفیاضی اور شجاعت و دلیری کے سوا خدا نے ان لوگوں کو اور کئی صفتوں سے بھی آراستہ کیا ہے۔یہ لوگ وفادار ہیں صاف باطن ہیں۔

اپنے شیوخ کے حکم کو بے عذر بجالاتے ہیں۔شیوخ بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ جفاکشی نے انہیں عیش پرستی سے بالکل محفوظ رکھا ہے اور ہر قبیلہ کے ادنیٰ و اعلیٰ سب میں ایک عجیب اتحاد اور ربط و ضبط نظر آتا ہے۔اگر چہ یہ قبائل اکثر باہم لڑتے رہتے ہیں۔[۶۴]

مذہبی لحاظ سے یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ان لوگوں نے مختلف بزرگوں کی یاد میں بت بنا لئے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔یہ بتوں کے لیے سر منڈاتے ،بتوں کے نام پر اونٹوں کو سانڈ کر کے چھوڑ دیتے ،سفر میں ہوتے تو دو چار گول پتھر ساتھ رکھ لیتے اور انھیں بتوں کا نمائندہ تصور کر کے سفر میں ان کی پرستش کرتے۔ سلمان منصور پوری اپنی کتاب رحمتہ اللعالمین میں عربوں کے بارے میں لکھتے ہیں:'' ان میں حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ جوا کھیلتے شرب پیتے اور آزادی سے لوٹ مار کرتے۔''[۶۹] عبدالحلیم شرر نے بھی '' جویائے حق'' میں اسی طرح کے حالات لکھے ہیں۔ وہ چار مہینے جن میں لوگ حج کے لیے آتے تھے۔قتل و غارت گری اور لڑائی جھگڑے کیلئے حرام تصور کیے جاتے تھے۔بعض قبائل باہمی یک جہتی کی بنا پر لڑائیوں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ یوں طاقتور قبیلے کمزور قبیلوں پر اپنا دباؤ برقرار رکھتے ۔عربی عورتیں قبل اسلام بہت بہادر تھیں اور میدان جنگ میں وہ مردوں کو غیرت دلاتیں تھیں۔عبدالحلیم شرر نے اپنے اس ناول میں حج کے طریقے پر بھی روشنی ڈالی ہے حج کا جو طریقہ رائج تھا اس کے تحت ان سلے کپڑے پہن کر خانہ کعبہ کا طواف کیا جاتا ، اس کے علاوہ حاجی سر منڈاتے ،طواف بھی کرتے اور صفاء و مروہ کے درمیان اچھلتے پھرتے ۔منیٰ اور مزدلفہ پر بھی بعض ارکان حج ادا کیے جاتے ۔لیکن مکہ کی سر زمیں سے باہر کے جو لوگ حج کے لیے آتے تھے۔ ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قریش کے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر طواف کعبہ کریں ۔لیکن یہ کپڑے اتنے قیمتی ہوتے کہ اکثر لوگ اس کی قیمت ادا نہ کر سکتے ۔ایسے لوگ جو قریش سے قیمتاً کپڑے حاصل نہ کر سکتے وہ پھر برہنہ طواف کرتے ۔اس حج کے طریقہ کار کو شرر نے اپنے ناول '' جویائے حق'' کے صفحہ ۱۱۵ میں اس طرح لکھا ہے۔

ذی الحجہ کے مہینے میں ہمارے یہاں حج ہوتا ہے اور یہ طریقہ ہمارے دادا ابراہیمؑ کے زمانے سے ہوتا چلا آتا ہے۔اس موقع پر تمام قبائل عرب جو یہودی اور نصرانی نہیں ہیں۔دور دور سے اور کل اطراف عرب سے آ کے جمع ہوتے ہیں۔ جو اپنا معمولی لباس اتار کے اور خاص قسم کے کپڑے پہن کر حرم کعبہ کی حدود میں داخل ہوتے ہیں۔کعبہ کے گرد بیٹھ کر سر منڈاتے ہیں۔پھر طواف کرتے ہیں اس کے بعد صفا مروہ نامی پہاڑوں کے درمیان اچھلتے ہوئے دوڑ لگاتے ہیں۔پھر

چند میل کی مسافت پر منا اور مزدلفہ نامی مقامات میں جا کے بعض ارکان پورے کرتے ہیں۔ اور ان مورتوں کو پوجتے ہیں۔ جو وہاں نصب ہیں۔ اور وہاں سے واپس آ کر حج سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ قریش کے سوا باہر کے دیگر قبائل کے حاجیوں کیلئے عام لباس سے ہٹ کر یا پھر یہ بھی شرط ہے کہ وہی کپڑے پہن کے طواف اور حج کریں۔ جو قریش والوں سے ملے ہوں۔[۴۵]

اس میں عبدالحلیم شرر نے عرب کے متعلق متفرق نوعیت کی باتیں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً بعض قبائل کا باہمی حریف ہونا اور ان کی دشمنیاں وغیرہ۔

سیرت رسول مقبول ﷺ سے متعلق بیان کردہ واقعات میں پہلا واقعہ آپ ﷺ کا حضرت ابو طالب کے ہمراہ لڑکپن میں تجارتی قافلے کے ساتھ جانا۔ بصریٰ میں بحیرا کی خانقاہ کے قریب قافلے کا پڑاؤ۔ بحیرا کا آپ ﷺ میں نبوت کی نشانیوں کو پہچاننا۔ آپ کی گفتگو شامل ہے۔ بحیرا نے حضرت ابو طالب سے کہا کہ آپ ﷺ کی کوئی ایسی شان جلد ہی ظہور میں آنے والی ہے کہ اگر یہودیوں نے آپ کو ابھی سے دیکھ کر پہچان لیا تو شائد نقصان پہنچانے کی کوشش کریں اس لیے آپ کی حفاظت کا خاص خیال رکھا جائے۔ یہ باتیں بحیرا نے الہامی کتب کی معلومات پر کہی تھیں۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت پر اس واقعے کو درست قرار دیا ہے۔ محمد سلمان (منصور پوری) نے اس واقعے پر تنقید کی ہے۔ لیکن ایسی تنقیدی بحث کے سلسلے میں حاشیے میں تقریباً یہ تسلیم کیا ہے کہ بحیرا نصرانی سے آپ ﷺ کی لڑکپن میں ملاقات ہوئی۔ البتہ اس پر عیسائیوں نے جو حاشیہ آرائی کی ہے اس سے نہ صرف قاضی سلیمان منصور پوری بلکہ ہر صاحب عقل کیلئے مذہبی اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ ''جویائے حق'' سیرت رسول مقبول ﷺ اور تاریخ اسلام سے متعلق تمام واقعات کو عبدالحلیم شرر نے بیان کیا ہے۔

رسول پاک ﷺ مکہ مکرمہ کے ایک شریف ترین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حضور ﷺ اپنی شرافت، تہذیب و شائستگی، صداقت و امانت داری کی وجہ سے اہل مکہ کے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ کعبہ کے متولی حضرت عبدالمطلب کے پوتے تھے۔ رسول پاک ﷺ کی پیدائش سے پہلے آپ ﷺ کے والد صاحب اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ بچپن ہی سے اہل قریش کیلئے آپ محترم اور قابل احترام ہستی تھے۔ آپ راست باز تھے۔ آپ کو شروع ہی سے بتوں سے شدید نفرت تھی۔ اس دور میں کعبہ میں سینکڑوں بت پڑے تھے۔ عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں۔

اس میں سینکروں بت رکھے ہوئے ہیں اور سب سے بڑا بت ہبل ہے۔ جو اہل مکہ کا قوی

دیوتا ہے۔ ان نئے پیغمبر کو ان بتوں سے سخت نفرت ہے ان کو ابتدا ہی سے بتوں سے اُنس نہ تھا۔ ان کے عزیز و اقارب کعبے میں جا جا کے بت پرستی کرتے۔ مگر وہ الگ ہی الگ رہتے۔ ان کے اس طریقے کو ابتداً ان کی قوم والے خاموشی سے برداشت کرتے۔ گو کہ سب ان کے اس فعل کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر ان میں ایسی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی خوبیاں اور نیک نفسی کی باتیں تھیں کہ کسی کو ان سے قطعی عداوت نہ تھی۔ بلکہ ان کی عزت و قدر کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے ہاتھ سے بڑے بڑے کام انجام پا چکے تھے۔ اور قوم میں کم ہی ایسے لوگ تھے۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے ان کے زیر بار احسان نہ ہوں۔[۴۶]

عبدالحلیم شرر نے سیرت پاک ﷺ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ ﷺ امی تھے۔ جب آپ ﷺ کی عمر چالیس برس ہوئی تو آپ ﷺ کو خدا تعالیٰ نے نبوت کے اعزاز سے نوازا، خدا کے احکامات کی تبلیغ شروع کی آپ ﷺ کے چند ساتھی آپ ﷺ کے خدا پر ایمان لے آئے۔ وہ اہل قریش جو پہلے پہل آپ ﷺ کو راست باز کہتے تھے۔ اب آپ ﷺ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور مکار کہنا شروع کر دیا۔ عبدالحلیم شرر نے ''کوہ صفا'' کے واقعے کو بیان کیا ہے۔ اس واقعے کے بعد اہل مکہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کے جانی دشمن بن گئے۔ اور ہر طرح سے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو ستانا شروع کر دیا۔ صفا کے واقعے کے بعد آنحضرت ﷺ نے اعلانیہ تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ عبدلحلیم شرر نے ''جویائے حق'' میں ہجرت حبشہ کا واقعہ بھی بیان کیا۔ کن حالات میں اور کسطرح سے اور کس کی قیادت میں مسلمانوں نے ہجرت کی تھی؟ نجاشی بادشاہ نے کس طرح سے مسلمانوں کی مدد کی تھی؟ ابوجہل جو کہ رسول پاک ﷺ کا چچا تھا۔ سب سے بڑا دشمن واقع ہوا۔ عبدالحلیم شرر نے حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ کہ کس طرح بہن کے گھر میں کلام الٰہی سن کر حضرت عمر فاروقؓ کے دل پر توحید نے اثر کیا اور وہ فوراً مسلمان ہو گئے۔ شرر ''جویائے حق'' میں اس واقعے کے متعلق لکھتے ہیں۔

......ہاں ہم صاف کہتے ہیں کہ ہم دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور کلمہ پڑھ کے کہا لو سنو اور جو ظلم ہو سکے کرو۔ زخمی بہن کی زبان سے یہ کلمات سن کر عمر کو سناٹا آ گیا بہنوئی کے سینے سے اترے اور بہن سے کہا ''اچھا جو تم پڑھ رہیں تھیں مجھے بھی سناؤ'' انہوں نے وہ صحیفہ جس میں وحی کی عبارت لکھی تھی۔ سامنے رکھ دیا اور عمر نے ہاتھ میں لے کے پڑھنا شروع کیا۔ چند ہی سطریں پڑھی تھیں کہ شان توحید دل پر اثر کر گئی اور بے اختیار کلمہ اسلام زبان پر

جاری ہوگیا۔ یہ سنتے ہیں بہن کے استاد جو چھپے بیٹھے تھے۔ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے باہر نکل آئے اور کہا کہ عمر تمہیں مبارک ہو کہ رسول اللہ نے درگاہ الٰہی میں دعا مانگی تھی کہ خدایا اسلام کو عمر یا ابوجہل کی ذات سے قوت دے معلوم ہوتا خدا نے اس برکت و نعمت کے لیے تمھیں کو منتخب کیا ہے۔[۴۷]

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور ڈاکٹر ممتاز منگلوی صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس واقعے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۔۔۔حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے اسلام کو بہت تقویت پہنچی انھیں کے مشورے پر سب مسلمان خانہ کعبہ میں نماز ادا کرنے کے لیے اس شان سے گئے کہ آگے حضرت عمرؓ و حضرت حمزہؓ تلواریں علم کیے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر و حضرت علیؓ آپ کے دائیں، بائیں تھے۔ مشرکوں کو حضرت عمرؓ نے کعبے سے نکال باہر کیا اور علانیہ سب نے نماز ادا کی۔ اسی دن سے حضرت عمر کو آپ ﷺ نے فاروق کا لقب دیا۔[۴۸]

اب مسلمانوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ غلام جو آپ پر ایمان لاتے ان پر ان کے مالک بہت ظلم وستم ڈھاتے، لیکن وہ اسلام سے منہ موڑنے والے نہ تھے۔ حبشہ میں مقیم مسلمانوں کو غلط خبر ملی کہ اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان صلح ہوگئی ہے اور وہ مسلمان حبشہ سے مکہ آگئے، لیکن یہاں آکر ان کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ رسول پاک ﷺ کے حکم سے مسلمانوں نے دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اس کے بعد شرر نے حضرت سلمانؓ کی زبان سے شعیب ابی طالب کے واقعے کو بیان کیا ہے۔

۱۰ نبوی میں رسول پاک ﷺ کو دو صدمے برداشت کرنے پڑے ایک حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات اور دوسرا حضرت ابو طالب کی وفات کا۔ اشاعت دین کا فریضہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے جاری رکھا۔ اس کے بعد طائف کا واقعہ پیش آیا جس کو عبدالحلیم شرر نے بیان کیا ہے۔ اہل طائف نے آپ ﷺ کو بہت ایزا پہنچائی لیکن اس حالت میں بھی رسول پاک ﷺ نے اہل طائف کے حق میں دعا ہی کی۔

مکہ میں آکر آپ ﷺ دعوت دین دیتے رہے۔ اہل مکہ لوگوں کو گمراہ کرتے رہے۔ ہر طرح سے ایذا رسانی کرتے۔ ہجرت مدینہ سے قبل تین سال بعد یثرب سے چھ آدمی آئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ دوسرے برس

حج کے موقع پر بارہ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ خزرج قبیلے کے لوگ تھے۔تیسرے برس ۷۵ آدمیوں نے آپ ﷺ پر ایمان لایا۔اور آپ کو یثرب آنے کی دعوت دی۔اہل مکہ کو جب معلوم ہوتو انہوں نے ان کا پیچھا کیا۔لیکن ایک سردار کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے۔جسے بعد میں چھوڑ دیا گیا۔جب کفار مکہ کے مظالم حد سے بڑھنے لگےتو رسول پاک ﷺ نے مسلمانوں کو یثرب کی طرف ہجرت کرنے کے لیے کہا۔ابن ہشام اپنی سیرت میں رقمطراز ہیں:

اب چونکہ کفار مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے۔آپ ﷺ نے مسلمانوں کو یثرب کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔کفار نہیں چاہتے تھے۔کہ مسلمان کسی امن کی جگہ میں جمع ہوکر قوت پکڑیں اور ان کیلئے خطرہ بن جائیں اس لئے ہجرت کرنے والوں کے مزاحم ہونے لگے۔جس کے نتیجے میں مسلمان ایک ایک دو دو کر کے یثرب چلے گئے۔اور مکہ میں آپ ﷺ کے چند مخصوص ساتھیوں کے سوا کوئی نہ رہا اور یہ لوگ بھی چونکہ آپ ﷺ کو تنہا نہ چھوڑنا چاہتے تھے اس لئے رکے رہے۔[۴۹]

اب کفار مکہ نے آحضور ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔رسول پاک ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا اور خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مکہ سے نکل آئے۔اس کے بعد شرر نے غار ثور کا واقعہ بیان کیا ہے۔سراقہ نامی ایک شخص نے آپ ﷺ تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن اس کے گھوڑے کے قدم زمین میں دھنس گئے۔اس کے بعد ایک اور شخص نے آپ ﷺ تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن وہ رسول پاک ﷺ کی باتوں سے متاثر ہوکر اسلام لے آیا۔آپ نے سفر جاری رکھا اور قبا کے مقام پر قیام کیا۔یثرب کے لوگ وہاں حاضر ہوئے۔رسول پاک ﷺ نے قبا میں ایک مسجد تعمیر کروائی۔پھر شرر نے یثرب میں رسول پاک ﷺ کی آمد پر اہل یثرب کے جذبات پر روشنی ڈالی ہے۔حضرت ایوبؓ کو شرف مہمانی حاصل ہوا۔رسول پاک ﷺ کی وجہ سے یثرب کا نام مدینہ پڑ گیا۔یثرب پہنچ کر رسول پاک ﷺ نے اوس وخزرج کے جھگڑے ختم کروائے۔مہاجرین و انصار کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔مدینہ میں ایک معاہدہ ہوا۔یہود نے بھی اس معائدے پر دستخط کئے۔لیکن ان کی بدنیتی اس طرح برقرار رہی۔عبداللہ بن اسلام نامی ایک عالم تھا۔اس کے قبول اسلام کا واقعہ شرر نے بیان کیا ہے عبدالحلیم شرر نے رسول پاک ﷺ کی مکی زندگی اور مدنی زندگی پر **مفصل** روشنی ڈالی ہے۔اس معاہدے کے بارے میں شرر ''جویائے حق'' میں لکھتے ہیں۔

یہ معاہدہ ہے جسے ان پیغمبر صاحب نے بحیثیت حاکم یثرب کے مرتب کیا۔کل اہل یثرب

نے عام اس سے کہ کسی قوم وملت کے ہوں اس کو پسند کیا۔اور آخر میں یہود بنی قریضہ اور بنی قینقاع بھی دستخط کر کے اس میں شریک ہو گئے اس معائدے کے ذریعے سے ان پیغمبر صاحب نے یہاں ایک عجیب قومیت قائم کر دی ہے جس میں ہر مذہب اور ہر خیال کے لوگ جو یہاں رہتے ہیں شریک ہیں۔مگر یہیں کے یہود کی حالت کا جہاں تک اندازہ کیا مطمئن نہیں ہیں ۔فقط پیغمبر کے پیرؤوں کی قوت و کثرت کے خوف سے شریک ہو گئے ۔ دل میں یہی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔[۵۰]

شرر نے ہر چھوٹا اور بڑا واقعہ مختصراً بیان کیا ہے۔انہوں نے ابوجہل اور ابوسفیانؓ کا واقعہ اور بدر کے غزوہ پر روشنی ڈالی ہے۔غزوہ بدر کے حالات وواقعات اور اسباب پر شرر روشنی ڈالتے ہیں۔اور غزوہ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کو بھی شرر نے بیان کیا۔غزوہ احد اور دیگر غزوات کے اسباب وواقعات اور نتائج پر شرر نے روشنی ڈالی ہے۔غزوہ احد میں کفار مکہ کو کس وجہ سے کامیابی ملی تھی؟ پوری تاریخ اسلام اس کتاب میں شرر نے بیان کی اور سیرت پاک ﷺ کے ہر پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔غزوہ خندق میں کامیابی کے منظر کو عبدالحلیم شرر نے ''جویائے حق'' میں بیان کیا ہے۔چھوٹی بڑی مہمیں جو رسول پاک ﷺ نے کفار اور مشرکین کے خلاف جاری کیں ان کا ذکر بھی ''جویائے حق'' میں موجود ہے۔شرر لکھتے ہیں۔

اسی طرح کے اور کئی غزوے اور مہمیں پیش آئیں جن میں اسلام کو روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اب چونکہ سلطنت نبوت میں ضم ہوگئی ہے۔اس لئے آپ ﷺ عجیب اصول اور بہترین قوانیں سے حکومت کرتے ہیں۔اور گو کہ بجائے انتقام لینے، توحید کی تبلیغ کرنے کے سوا یہاں اور کوئی کاروائی نہیں کی جاتی۔مگر قبائل عرب نے خود ہی چھیڑ چھاڑ کے آنحضرت ﷺ کے لیے فتنوں کا موقع پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ان کامیابیوں نے سارے کفرستان عرب میں ایک دھاک بٹھا دی ہے۔ روز بروز لوگ توحید و رسالت پر ایمان لانے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اور دین اسلام میں داخل ہونے کے بعد سمجھتے ہیں کہ ہم کسی جہالت وذلالت میں پڑے ہوئے تھے۔[۵۱]

چھوٹی بڑی مہموں کے بعد خانہ کعبہ کی زیارت اور حج کی ادائیگی کے لیے آپ ﷺ کس طرح اپنے صحابہ اکرامؓ کے ہمراہ مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے ہیں؟بغیر حج کئے ہی واپس کیوں آجاتے ہیں؟ شرر نے مختصراً اس

سارے واقعہ کو ''جویائے حق'' میں بیان کیا ہے۔ رحمتہ اللعالمین جلد اول ص ۲۸۹ تا ۲۸۵ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس پورے واقعہ کو شرر نے بھی ''جویائے حق'' میں لکھا ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول پاک ﷺ نے مدینہ منورہ آکر دعوت اسلام کو پوری دنیا تک پہنچانے کی خاطر مختلف بادشاہوں کے نام خطوط لکھے۔ اور لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں شریک ہونے لگے۔

اس کے بعد عبدالحلیم شرر نے اس میں ان خطوط کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے غزوہ خیبر کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد رسول پاک ﷺ نے کئی چھوٹی چھوٹی ٹیمیں روانہ فرمائیں۔ اور پھر ذی الحجہ کا مہینہ آتے ہی صحابیوں کو ساتھ لیا اور خانہ کعبہ میں حج کی ادائیگی کیلئے روانہ ہوئے۔ شرر نے اس واقعہ کو بھی مختصراً اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''......آپ مہاجرین و انصار کے ساتھ خوشی خوشی اندر داخل ہوئے اور حج خانہ کعبہ ادا فرمایا۔ کفار پہاڑ پر سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ آپ ﷺ حسب معائدہ حج کر کے تین روز بعد واپس چلے گئے۔''۵۲

آپ ﷺ کے لطف و کرم سے اہل مکہ اس قدر متاثر ہوئے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ واپس آئے تو بہت سے اہل مکہ نے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ان واقعات کے بعد غزوہ موتہ اور فتح مکہ کے حالات و واقعات کو مصنف نے بیان کیا ہے۔ شرر ''حضرت سلمانؓ کا پندرھواں خط'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> ......غزوہ موتہ کا واقعہ ہجرت نبوی کے آٹھویں برس ماہ جمادی الاول میں پیش آیا تھا۔ اور اب اسی سال کا ماہ ذیقعدہ تھا۔ ان چھ سات مہینوں کے اندر مکہ معظمہ فتح ہو گیا۔ جس کے ساتھ ہی قریش مکہ کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے۔ اور ان کے مسلمان ہوتے ہی سارے قبائل عرب کو یقین ہو گیا کہ اسلام بے شک دین حق ہے۔ جس کی ترقی کو کوئی کوشش اور کوئی مزاحمت نہیں روک سکتی۔ ۵۳

عبدالحلیم شرر نے سیرت پاک ﷺ کی اس کتاب میں مکے کی فتح اور خالد بن ولید کے سریے کے بعد کے حالات و واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ طائف کے سرکش قبائل کو کسطرح سے شکست ہوئی اور اسلام کی شمع کیسے سارے عالم میں روشن ہوئی۔ اس کے بعد شرر نے لکھا ہے کہ آپ نے کسطرح سے دین اسلام کو پورے عالم میں پھیلایا اور پھر حجۃالوداع کا ذکر کیا ہے۔ ''جویائے حق'' کے حصہ سوم میں حجۃالوداع کا ذکر شرر نے کیا ہے کہ حجۃالوداع سے پہلے والے حج میں حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ صحابہ کرام نے حج کیا۔ اس واقعے کو بھی شرر

نے مختصراً بیان کیا ہے۔

......اب آپ ﷺ کو مدینے تشریف لائے نو برس پورے ہونے کو ہیں۔سال کا پہلا خطبہ حج کیلئے مخصوص اور مقرر ہے۔اگر چہ مکہ فتح ہو چکا ہے۔اور وہاں اسلام کی حکومت ہے۔مگر آپ کو اس سال بنفس نفیس حج کیلئے جانا مناسب نہیں۔معلوم ہوا چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے پرانے رفیق حضرت ابو بکر صدیقؓ کو امیر حج یعنی تمام حاجیوں کا سردار مقرر فرما کے روانہ کیا اور جتنے لوگ مدینے سے حج کو جانے والے تھے ان کے ساتھ گئے۔[۵۴]

اس کے بعد شرر نے ہجرت کے نویں سال کے واقعات لکھے ہیں شرر حضرت سلمانؓ کا سترحواں خط کے عنوان سے لکھتے ہیں: ''......اب جناب رسول اکرم ﷺ کو مدینے میں تشریف لائے دسواں سال ہے۔مخالفتوں کی قوت ٹوٹ گئی۔دشمن دوست ہو گئے اور کل تک جو پرائے تھے آج اپنے ہیں۔اور سب اشاعت توحید و تبلیغ دین میں مصروف و مگن ہیں۔''[۵۵]

شرر نے جویائے حق کے تیسرے حصے میں ہجرت کے دسویں سال کے واقعات کو بھی مختصراً بیان کیا ہے۔سیرت کی دیگر کتب میں بھی یہ حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں۔عبدالحلیم شرر نے حجۃ الوداع کے خطبہ کو تفصیل سے ''جویائے حق'' میں جگہ دی ہے۔سیرت کی اس کتاب میں رحلت رسول پاک ﷺ کے بعد کی صورتحال کو بھی شرر نے بیان کیا ہے۔کہ خلافت کے نازک معاملے کو کسطرح سے سلجھایا گیا؟ مرتدوں سے کیسے مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے حالات و واقعات کو شرر نے سیرت کی اس کتاب میں مختصراً بیان کیا ہے۔

شرر نے سیرت کی اس کتاب میں اسود غنی کے قتل اور جیش اسامہ کی روانگی کے حالات بھی قلم بند کیے ہیں۔''جویائے حق'' میں شرر نے خلافت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حالات و واقعات مختصراً بیان کیے ہیں اور ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو اس کتاب کے حصہ سوم میں جگہ دی ہے۔شرر نے حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی وفات اور حضرت علی کی بیعت کا ذکر بھی سیرت کی اس کتاب میں کیا ہے۔شرر نے ''جویائے حق'' حصہ سوم میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔اور ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو بیان کیا ہے۔شرر نے فتح خیبر کا تفصیل سے حال لکھا ہے۔اور پھر عراق کی فتح کا حال شرر نے ''جناب سلمان فارسیؓ کا اٹھائیسواں خط'' میں بیان کیا ہے۔شرر نے جویائے حق کے آخری حصے میں ''جناب سلمان فارسیؓ کا تیسواں خط'' کے عنوان سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات اور حضرت

عمر فاروقؓ کی خلافت پر روشنی ڈالی ہے۔شرر نے حضرت خالد بن ولید کے دیگر کارناموں کا ذکر بھی اس خط میں کیا ہے اور فتح یرموک کا ذکر بھی اس کتاب میں موجود ہے۔شرر نے جویائے حق کے حصہ سوم میں فتوحات فلسطین وشام اور فتح بصریٰ کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔اور جویائے حق کے صفحہ ۶۴۴ پر حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ پر بیعت کے واقعات کو بیان کیا ہے۔سیرت کی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> سیرت رسول مقبولﷺ پر لکھی گئی تمام مسند کتب اورطبری، ابن الاثیر، ابن خلدون اور قدیم اسلامی کتب تواریخ سے ان جملہ واقعات کی تصدیق ہوئی ہے۔شرر نے اس ناول میں انتہائی مستند واقعات کو شامل کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔[۵۶]

تمام واقعات تسلسل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ۔کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے ۔قاری کو کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے ہر ایک واقعہ کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن اس انداز میں پیش کیا ہے کہ پورا واقعہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔آنحضورﷺ نے یثرب میں کسطرح کی قومیت کا تصور پیش کیا اس بارے میں عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:''یثرب میں پہنچتے ہی انھوں نے تمام مخالفتوں، عداوتوں اور باہمی تنازعوں کو دور کر کے یثرب اور اس کے اطراف میں ایک ایسی نئی اچھوتی اور مہذب قومیت قائم کی جس کی نظیر اس وقت تک دنیا میں کہیں نہیں دیکھی گئی تھی۔''[۵۷] ''جویائے حق''سیرت رسول پاکﷺ کے اعتبار سے اپنے دور کے ناولوں میں ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ڈاکٹر ممتاز منگلوری رقمطراز ہیں:

> شرر نے مختلف النوع موضوعات اور کم وبیش بچاس ساٹھ برس کی اسلامی تاریخ عرب کی معاشرت، سیاسی حالات اور آنحضرتﷺ کی سیرت کو چابکدستی سے اس ناول میں سمودیا ہے۔مختلف النوع موضوعات اور خصوصاً ہزاروں مربع میل پر بکھرے ہوئے مختلف قبائل کی برسوں کی تاریخ کو ایک لڑی میں پرودینا اور وہ بھی اس رنگ میں کہ ناول کی فنی تکنیک کے علاوہ پلاٹ کا ارتقاء اور قاری کی دلچسپی برقرار رہے انتہائی مشکل اور آزمائش کا کام ہے۔شرر ان ذمہ داریوں سے ایک فن کار اور مورخ کی حیثیت سے کما حقہ عہدہ برا ہوئے ہیں۔[۵۸]

''جویائے حق'' میں شرر نے عام فہم انداز بیان اپنایا ہے، اور چھوٹے چھوٹے جملے لکھے ہیں۔موقع محل کے مطابق آپ نے واقعات کو تفصیلاً اور مختصراً بیان کیا ہے۔''جویائے حق'' کی خوبی یہ ہے کہ یہ خطوط کے انداز میں

لکھا گیا ہے۔جس میں حضرت سلمانؓ کی زبان سے سیرت رسول پاک ﷺ کو بیان کیا گیا ہے۔اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شرر نے اسلامی تاریخ کو مکمل طور پر بیان کر دیا ہے۔سیرت کی اس کتاب میں کردار جاندار ہیں،خصوصاً حضرت سلمانؓ فارسیؓ کا کردار نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔رسول پاک ﷺ کی شخصیت اور سیرت و کردار کے ایک ایک نقش کو شرر نے ''جویائے حق'' میں بیان کیا ہے۔''جویائے حق'' میں کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے شرر نے پیش کیے ہیں۔

اس ناول میں رسول پاک ﷺ اور حضرت سلمان فارسیؓ کے علاوہ دیگر تاریخی شخصیتوں حضرت ابو بکر صدیقؓ،حضرت عمر فاروقؓ،حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ حضرت خالد بن ولید اور دیگر سپہ سالارِ اسلام کے بارے میں بھی تفصیلات شرر نے مہیا کیں ہیں۔جویائے حق کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں مرقع کشی عروج پر دکھائی دیتی ہے۔چونکہ اس میں کثیر حصہ جنگوں اور عربوں کی معاشرت اور رسول پاک ﷺ کی دعوت اسلام سے متعلق ہے۔اس لیے مرقع کشی کے مواقع اس میں بکثرت موجود ہیں۔بقول ڈاکٹر ممتاز منگلوری:''بحیرا کی خانقاہ کا محل وقوع اور منظر بصریٰ کی گہما گہمی بحیرا کی خانقاہ پر سالانہ مذہبی میلہ،صحراؤں میں کاروانوں کا سفر،میدان کارزار میں معرکہ آرائیاں غزوات وغیرہ ہر جگہ ان موقعوں میں حقیقت رنگینی اور تابناکی موجود ہے۔''[۵۹] مکالموں سے ہر شخصیت کا کردار نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

جویائے حق'' میں منظر نگاری کے بھی بڑے اعلیٰ نمونے ہیں۔زبان و بیان سادہ اور سلیس ہے۔''جویائے حق'' میں با مقصد زبان اور برمحل مکالمے استعمال ہوتے ہیں۔سیرت پاک ﷺ کو چونکہ شرر نے ناول کے انداز میں لکھا ہے اس لئے اس کا اسلوب تاریخی اسلوب سے منفرد ہے۔مرقع کشی اور منظر نگاری کے مواقع جہاں بھی مولانا کو ملے ہیں۔انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مرقع کشی اور منظر نگاری کی ہے۔اس میں زبان و بیان اور انداز بیان ایسا اپنایا گیا ہے جو سیرت پاک ﷺ کے شایان شان ہے۔''جویائے حق'' میں شرر نے خوبصورت تشبیہات،استعارے اور تراکیب بھی استعمال کیے ہیں۔سیرت کی اس کتاب میں منظر نگاری ادبیانہ اور شاعرانہ ہے۔''جویائے حق'' حصہ اول کی یہ عبارت ادبیانہ اور شاعرانہ منظر نگاری کا عمدہ نمونہ ہے:''اس وقت دوپہر کا وقت ہے آفتاب سمتِ الراس پر ہے اور دھوپ کی تپش سے کوہ وصحرا میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔جس کی لپک یہاں تک پہنچتے پہنچتے تروتازہ درختوں کی ٹھنڈک سے بہت کچھ دھیمی ہو جاتی ہے۔''[۶۰] آنکھ لگتے ہی زیتون کا درخت اپنی ٹہنیوں اور پتیوں سے پنکھا جھلنے لگا۔گرد کی جھاڑیاں حسن کی مٹھاس بن گئیں جن میں چھن کے وہی ہوا جس کے جھکوڑے باغ کے

باہر فتح جنم تھے۔ یہاں اس کے حق میں نسیم سحر کے مہمان نواز جھونکے بن گئے۔"[۶۱] "چاندنی رات تھی اور عالم بہار پر تھا۔ نماز کے بعد استفانوس چاندنی کی بہار دیکھتا ہوا اپنی خانقاہ کے باغ کے پھاٹک پر گیا اور ریگزار عرب کے چٹیل میدان پر چاروں طرف نظر دوڑانے لگا کہ کوئی ادھر سے آتا تو نہیں ہے۔ اتنے میں جرس کارواں کی آواز کان میں آئی"......[۶۲]

عبدالحلیم شرر نے "جویائے حق" میں عربی زبان بھی استعمال کی ہے۔ "جویائے حق" میں شرر نے عربی اشعار بھی کچھ لکھے ہیں۔

مختصراً یہ کہ سیرت کی اس کتاب میں واقعات کے بیان میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔ خطوط کے ذریعے سیرت رسول پاک ﷺ کو بیان گیا گیا ہے۔ جو کہ منفرد انداز ہے جو صرف شرر ہی کے حصے میں آیا ہے۔ مکالمہ نگاری، منظر کشی اور مرقع نگاری نہایت عمدہ ہے۔ تاریخ اسلام کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ واقعات مختصراً اور تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ سیرت کی اس کتاب میں شرر کبھی کبھی ادیب سے زیادہ خطیب و واعظ بن جاتے ہیں۔ اگر چہ تشبیہات حسین ہیں لیکن موضوع سیرت پاک ہے۔ "جویائے حق" کے مکالمے موقع محل سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ مکالمے بھی کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہیں۔ سیرت نگاری کے اعتبار سے "جویائے حق" شرر کے مقبول ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں شرر نے ایک الگ اور منفرد اندار اپنایا ہے جو انہی کا خاصا ہے۔

ختم المرسلین

مولانا عبدالحلیم شرر کی یہ کتاب سیرت پر مبنی ہے۔ "جویائے حق" مین سیرت رسول پاک ﷺ کو ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ تاریخ اسلام میں بھی آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک پر مولانا عبدالحلیم شرر نے خاص انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ چونکہ ایک مذہبی انسان تھے، اور حب رسول ﷺ آپ کے دل میں موجود تھی۔ لہذا آپ نے نبی آخر الزماں ﷺ کے بارے میں اپنی محبت کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر جعفر رضا کا خیال ہے:

> مرسل اعظم کی حیات طیبہ کے بیان میں موضوع کی عظمت کے پیش نظر قاری بجا طور پر شرر سے زیادہ محتاط تحریر کی توقع کر سکتا ہے۔ جسے انھوں نے کسی حد تک محفوظ رکھا ہے۔ مرسل اعظم کی بلند ترین شخصیت اقوام عالم کے لیے متعدد اعتبار سے مینارۂ نور ہے۔ جسے روشناس

کرانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً پیغام امن و آشتی، عدل و انصاف، دفاعی جنگ کا نظریہ۔ رنگ و نسل اور مال و دولت سے بالاتر رشتے سماجی زندگی میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق کے بغیر مساوی جدوجہد، عورتوں کے حقوق واختیارات وغیرہ۔ لیکن شرر اس کے اہم مباحث پر توجہ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر فرقوں کے درمیان اختلافی مسائل کو مناظرہ کا رنگ دے کر قاری کے ذہن میں الجھن پیدا کرتے ہیں۔[۶۳]

پروفیسر ڈاکٹر سلطان الطاف علی نے لکھا ہے کہ:

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شاعر اور ادیب جب اپنی فکر کی پختگی پر پہنچتے ہیں تو ان کے کلام میں عشق رسول ﷺ سے لبریز خیالات ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ سیرت نبی ﷺ اور اخلاق نبوی ﷺ کی پیروی میں عالم انسانیت کی نجات دیکھنے کی حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔[۶۴]

عبدالحلیم شرر نے بھی اپنی زندگی کے آخری حصے میں ختم المرسلین ﷺ کتاب لکھی ہے۔ ان کے عہد کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ ہندوستان کے مسلمان دین اسلام جو کہ مکمل ضابطہ حیات ہے کے مطابق اور نبی آخرالزماں ﷺ جو کہ ہادی کامل و اکمل ہیں، کے اتباع میں زندگی بسر کریں تاکہ پستی سے نکل کر عروج حاصل کر سکیں۔ زیر نظر کتاب میں عبدالحلیم شرر نے حضور ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مخصوص انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل یہ ایسے عنوانات ہیں جن پر سینکڑوں مورخ، شاعر، صوفی، فلسفی، ادیب اور عشاق بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور بہت کچھ لکھتے رہیں گے۔ یہ حقیقت سب تسلیم کرتے ہیں کہ سیرت نبی ﷺ اور مقام رسول ﷺ کو سب سے زیادہ جاننے کا خالق دو جہاں شانہ کے بغیر کوئی حق ادا نہیں کر سکتا۔ عبدالحلیم شرر سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو جہاں پیش کرتے ہیں وہاں وہ بڑے تعمیری انداز میں مباحث بھی پیش کرتے ہیں شرر فلسفیانہ انداز میں خیر و شر کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے اتباع رسول ﷺ کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور نبی آخرالزماں کے کردار عمل اور پیکر عرب و عجم اور اسلام کی علامت قرار دیتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر چونکہ ایک مورخ بھی تھے اور اچھے سوانح نگار اور سیرت نگار بھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سیرت طیبہ ﷺ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ پیر مونس زبیری نبی کریم ﷺ کے بارے میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے، ننانوے اپنے پاس رکھے۔ اور صرف ایک زمین پر

اتارا۔ جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ جب دنیا ضلالت وگمراہی میں ڈوب گئی، بے حیائی اور بت پرستی عام ہوگئی۔ بالخصوص عرب کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ہادی برحق مصلح اعظم، آقائے کائنات، فخر موجودات رحمۃ العالمین خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اس طرح یہ حجت پوری ہوگئی۔ کہ اگر لوگ گمراہ ہو گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بھی کسی کو انہیں راہ راست دکھانے کیلئے بھیجا۔ حضور ﷺ کے علاوہ جتنے انبیاء بھی مبعوث کئے گئے وہ صرف اپنی اپنی قوم کیلئے تھے۔ مگر حضور ﷺ کو کل عالمین کیلئے مبعوث فرمایا گیا۔[۶۵]

نبوت کا سلسلہ نبی کریم ﷺ پر آکر ختم ہوگیا۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد کوئی آسمانی کتاب نازل نہیں ہو گی۔ جناب پروفیسر غلام ربانی عزیز کا کہنا ہے: ''اس لحاظ سے ہمارے مقدس پیغمبر تمام پیغمبروں سے جدا اور سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی شان ہیں۔ اور آپ ﷺ کا دین (یعنی اسلام) آخری دین ہونے کی وجہ سے تمام دینوں سے برتر و بہتر ہے۔''[۶۶] حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر ہر زبان اور ہر ملک میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حضور ﷺ کی حیات طیبہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اور ہر مسلہ ءزندگی کیلئے مشعل راہ ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کامل نمونہ ہے، اور فلاح دارین بھی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی کا دور عظیم انسان کا دور تھا۔ ''سرکار دو عالم کا بچپن ایک عظیم ترین انسان کا بچپن تھا۔ دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں وقت ضائع کرنا یا اس قسم کی شرارتیں کرنا جو عام طور پر بچوں کی فطرت میں ہوتی ہیں۔ آپ ﷺ میں کبھی نظر نہ آتی تھیں۔ آپ ﷺ کا یہ عالم تھا کہ کم سنی میں بھی حاجت مندوں کی حاجت روائی اور خدمت طلب بزرگوں کی خدمت آپ ﷺ کا شعار تھا۔''[۶۷] مشکلات سے نجات حاصل کرنے کیلئے عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کے سامنے اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی سیرت پاک کو پیش کیا تا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار اور غیرت وناموس دوبارہ حاصل کرسکیں۔

عبدالحلیم شرر نے مولد شریف کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ یہ ابو الفرح ابن جوزی رحمۃ اللہ کا لکھا ہوا ہے اصل عبارت عربی میں تھی شرر نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ شرر سے پہلے بھی اس مولود شریف کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت شرر کے اس بیان سے ملتا ہے۔

اس سے پیشتر حضرت مولانا محترم ممدوح کے اشارے سے ایک اور فاضل بزرگ نے اس

کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کو حضرت مولانا نے اس ترتیب سے چھپوادیا تھا کہ صفحہ کے ایک کالم میں اصل عربی مولد لکھا تھا۔ اور اس کے مقابل دوسرے کالم میں ترجمہ مگر وہ ترجمہ باوجود صحیح ہونے کے ایسی زبان میں تھا کہ نہ اس کے سننے میں عام لوگوں کا لطف آتا اور نہ پوری طرح سمجھ میں آتا۔ میں نے اس ترجمے سے الگ اصل عربی سے دوسرا ترجمہ کیا۔ اور اس ترتیب کے ساتھ کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں۔[۲۸]

اس مولد شریف میں بھی رسول پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کے کئی گوشے نمایاں ہوئے ہیں۔ شرر نے جس انداز سے اس کا ترجمہ کیا ہے اس سے اصل عبارت کا حسن اور مقصد دونوں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایک اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے:

ولادت باسعادت کی رات عرش مارے خوشی کے جھومنے لگا اور بندوں پر خدا کا جلوہ آشکار رہوا۔ جو دل شکستہ تھے۔ انکے شیشہ دل رحمت الٰہی سے جڑ گئے۔ جو محتاج تھے خدا کی مہربانی سے غنی و مالدار ہو گئے۔ کتب آسمانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کو آپ کے صفات حسنہ اور برکتوں سے عزت و حرمت حاصل ہوگئی۔[۲۹]

یہ مولد ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مولد شریف کے مطالعے کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ شرر ایک اچھے مترجم بھی تھے۔ ترجمہ کر کے شرر نے اس مولد شریف کی اہمیت وافادیت جہاں بڑھائی وہاں سیرت رسول پاک ﷺ کے کئی گوشے بھی نمایاں کئے۔

د۔ بحیثیت سیرت نگار شرر کا مقام و مرتبہ

عبدالحلیم شرر نے سیرت پاک پر جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان رسول پاک ﷺ کے نقش قدم پر چل سکیں۔ شان الحق حقی نے لکھا ہے:۔

> سیرت پاک ہمیشہ سے اہل نظر کا محبوب موضوع رہا ہے۔ نہ اس کا اہتمام ہو سکا ہے اور نہ اس سے دل سیر ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا حق جسقدر تحریر و تقریر میں ادا ہو سکا ہے اس سے کہیں کم اس کی پیروی میں ادا ہوا ہے۔ خدا نے اپنے رسول ﷺ کو ہمارے لیے صرف موضوع سخن بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ کے اسوہ کاملہ کو ہمارے لئے ایک نمونہ قرار دیا تھا۔[۷۰]

عبدالحلیم شرر نے اپنی سیرت کی کتابوں میں رسول پاک ﷺ کی حیات مبارکہ کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک ارکان اسلام کی ادائیگی کا پہلو اور دوسرا انسانوں کے حقوق کا۔ بقول ثاقبہ رحیم الدین: ''رسول کریم ﷺ کی حیات مبارکہ سے دو منور نقطے سامنے آتے ہیں ایک بنیادی ارکان اسلام کی ادائیگی اور دوسرا انسانوں کے حقوق کا پورا کرنا۔''[۷۱]

عبدالحلیم شرر ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنھوں نے سیرت پاک ﷺ پر قلم اٹھایا۔ کسی لکھنے والے کی اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ اسے رسول خدا حضرت محمد ﷺ کی سیرت پاک پر قلم اٹھانے، حضور ﷺ کی حیات کے کسی پہلو کا ذکر سپرد قلم کرنے یا آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کے بیان کرنے کی سعادت نصیب ہو۔ خوش نصیب ہوئے وہ اہل قلم اور مبارک ہیں وہ اہل بیان جنھیں نبی رحمت اللعالمین کی توصیف کی توفیق نصیب ہوئی۔ پورے عالم اسلام میں سیرت پر مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے کتابوں اور مقالات کی تصنیف کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ پر جتنا لکھا گیا ہے اس کا شمار ممکن نہیں اردو زبان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں سیرت رسول ﷺ پر اچھی خاصی تعداد میں معیاری کتابیں دستیاب ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے سیرت پر مبنی جتنی بھی کتب لکھیں ہین ان میں آنحضرت ﷺ کی زندگی کے تمام اہم واقعات اور سیرت و کردار کے نمایاں پہلو سمٹ آئے ہیں۔ شرر نے سیرت مبارکہ کے تمام اہم مآخذ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ سیرت رسول پاک ﷺ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو

انسان کے اخلاق واطوار سے تعلق رکھتے ہیں، جن پر انسان کی سیرت مکمل ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی شخصیت بنی نوع انسان کے لیے کردار کا اعلیٰ و ارفع نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نہ صرف دین اسلام لے کر آئے بلکہ آپ ﷺ کی سیرت زندہ اسلام کا ایک عملی مرقع ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کی جو شخص جتنی تقلید کرے گا اتنا ہی انسانیت کی معراج تک پہنچے گا۔ شرر نے جتنا بھی سیرت پر لکھا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے، اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ پر ایمان لانے والے، اچھی سیرت بنانے اور کردار کی خوبیاں حاصل کرنے کیلئے رسول خدا کے طرز عمل کو مینارہ نور بنائیں۔ اس سے ہدایت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں جان سکیں کہ کون سی عادت اچھی اور کون سی خصلت بری ہے۔ سیرت پر مبنی یہ کتب عبدالحلیم شرر کی علمی کاوش اور سیرت کے فن میں ان کے بلند مقام کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مولانا نے سیرت نگاری کے تمام تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انتہائی دلکش اور سادہ زبان میں ان کو تحریر کیا ہے۔ تا کہ ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والا شخص بھرپور فائدہ اٹھا سکے۔

مولانا کی ان کتب کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ کی زندگی کے تقریباً تمام اہم واقعات ایسی خوب صورتی اور جامعیت کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ قاری کسی مرحلے پر بھی تشنگی محسوس نہیں کرتا۔ کبھی بات کو اعجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو کبھی مفصل، لیکن اس انداز سے کہ مضمون پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔ یہ ایسا ملکہ ہے جو کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کی کتب سیرت کے مطالعے کے وقت کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا کہ مصنف نے کوئی اہم بات چھوڑی ہو یا اس کا مفہوم ادھورا رہ گیا ہو۔ کتب میں عمدہ ترتیب اور تسلسل موجود ہے۔ سیرت نگار کا انداز بیان اس قدر موثر ہے کہ قاری پر اس کا فوری اثر مرتب ہوتا ہے۔ پڑھنے والا خواہ عالم ہو یا عوام الناس میں سے ایک عام آدمی سب کے دلوں پر برابر اثر پڑتا ہے، اور قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ میری دل پسند تحریر ہے۔ اگر چہ تحریر کا مدلل ہونا بڑی خوبی ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی خوبی تحریر کو اس انداز میں ڈھالنا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی جائے اور اصل واقعہ سے دوری بھی نہ ہو۔ شرر کی کتب میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ قاری کے کردار کی تعمیر میں یہ کتب سیرت نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ مصنف کی تالیف کا انداز بیان اس قدر دلکش اور انوکھا ہے کہ قاری کے دل میں مذید پڑھنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔

سیرت نگار کی ایک اور بڑی خوبی واقعات کا صحت اور دیانت کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ اس خوبی میں بھی شرر ممتاز نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہر بات تحقیق کے بعد لکھی ہے۔ سیرت نگاری کی ایک صفت انصاف اور اعتدال پر قائم رہنا بھی ہے۔ فرقوں میں بٹ جانے کی وجہ سے ہمارے یہاں یہ بات عام ہے کہ ہر فرقہ اپنے مسلک کو

درست ثابت کرنے کیلئے واقعات کی من پسند تاویلیں پیش کرتا ہے، اور بظاہر جائز نظر آنے والی اس لغزش سے حقیقت کا روپ مسخ ہوجاتا ہے، مگر مولانا شرر کا قلم اعتدال پر قائم رہا ہے۔ ان خوبیوں کی بنا پر شرر نے سیرت نگاری میں بہت اونچا مقام حاصل کیا ہے۔ سیرت پر جتنی بھی کتب لکھی جاتی ہیں۔ بعض تو نام ہی سے ظاہر ہوجاتی ہیں کہ ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے کسی ایک گوشے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بعض عامانہ انداز میں لکھی جاتی ہیں۔ ان کتب کے مقابلے میں مولانا شرر کی کتب سیرت کو دیکھیں تو ہمیں فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ شرر کی کتب سیرت النبی کے کسی ایک گوشے سے متعلق نہیں بلکہ یہ پوری حیات طیبہ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یوں اگر دیکھا جائے تو شرر کے ہم عصر سیرت نگاروں میں ان کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی کتب سیرت اپنی انفرادی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں۔

شرر کی یہ کتب جہاں سیرت کے لغوی و اصطلاحی معنوں کے مطابق ہیں وہاں سیرت نگاری کے اصول اور مقصدیت و افادیت کی حامل بھی ہیں۔ سیرت کے لغوی معنی طریق کار کے ہیں۔ اور جب ہم اسے اصطلاحی معنوں میں دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب وہ طریق کار نکلتا ہے۔ جس پر آ حضورﷺ نے عمل پیرا ہوکر دوسروں کو بھی اسی طریقے پر چلنے کا حکم دیا۔ ان اصطلاحی معنوں میں سوانح حیات کا داخل ہوجانا ایک لازمی امر تھا۔ جس کے بغیر صاحب سیرت کے کردار کا تذکرہ ناممکن ہے۔ سیرت نگاری کا اصل مفہوم آنحضورﷺ کی حیات طیبہ اور ان کا اخلاق و کردار ہے۔ اگر ہم اس مفہوم کو پیش نظر رکھ کر شرر کی کتب سیرت کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ انہوں نے اس مفہوم کی روح کو سمجھتے ہوئے کتب لکھیں۔ ان کتب میں سوانح حیات و اسوہ حسنہﷺ موجود ہے۔ گویا مفہوم کے اعتبار سے ان کی سیرت نگاری مکمل ہے۔

سیرت کے اصولوں میں یہ بات خاص ہے کہ مبالغہ آمیزی سے بچا جائے۔ رسول پاکﷺ کے ضمن میں وہ بات کی جائے جو ہر لحاظ سے مستند ہو، کسی بھی لفظ قرآنی سے نہ ٹکرائے، تاریخی روایات میں بھی اس کا خاص اہتمام کیا جائے کہ کسی بھی واقعہ کو روایت کی اسناد حاصل ہو۔ اس میں افسانوی و تخیلاتی واقعات شامل نہ ہوں۔ شرر

سے قبل اور بعد میں کئی کتب سیرت تصنیف ہوئیں جن کے مآخذ و مصادر عربی تصانیف تھیں۔شرر نے بھی انہیں واقعات کو تالیف کیا ہے۔سیرت کی کسی بھی کتاب کی تصنیف کا مقصد سوائے سیرت نبویﷺ سے روشناس کرانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ہر کتاب کسی نہ کسی اعتبار سے یہی مقصد لئے ہوئے ہوتی ہے۔شرر کی کتب کا مقصد بھی یہی ہے تا کہ قاری بغیر مشکل کے رسول اللہﷺ کی حیات طیبہ اور ان کے اخلاق وشمائل سے آگاہ ہو سکے جو ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔کسی کتاب کی افادیت دو باتوں سے واضع ہو جاتی ہے۔یہ کہ کتاب معاشرے کے کس طبقے کے لیے تحریر کی گئی ہے؟ اور معاشرے میں اس طبقے کی حالت ونوعیت کیا ہے؟ اور دوسری یہ کہ اس کتاب سے کتنے لوگ مستفید ہو رہے ہیں؟ یہ کتب سیرت ہر طبقے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔

۵۔ عبدالحلیم شرر، بطور سوانح نگار اور ان کی سوانح عمریوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے دوسروں کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی سرگزشت بڑی ہی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ چاہے انسان کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو لیکن دوسروں کے بارے میں کچھ جاننے کا جذبہ ہمیشہ اس کے دل میں رہتا ہے، انسان کو جتنی زیادہ دلچسپی اپنی ذات سے ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ دوسروں کے بارے میں جاننے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی زندگیوں کے سربستہ رازوں کو کُریدتا ہے اور ان کی روشنی میں اپنی راہوں کا تعین کرتا ہے۔ دوسروں کی کمزوریاں اور خامیاں دریافت کر کے ایک گونہ تسکین ملتی ہے اور ہم ان کے کارناموں کو سراہتے ہوئے انہیں اپنے لیے مشعل راہ بناتے ہیں۔ بے دھڑک ان راستوں پر چلنا شروع کر دیتے ہیں جن پر چل کر انہوں نے کامیابی و کامرانی حاصل کی۔ ان کی ناکامیوں اور لغزشوں سے سبق سیکھتے ہیں۔ انسانی فطرت کی بناء پر اسے ازل سے یادرفتگاں کا ذوق وشوق رہا، انسان نے اپنے بزرگوں اور اسلاف کے کارنامے جمع کرنے اور یاد رکھنے کا سامان پیدا کیا۔ یہ عمل آج سے نہیں بلکہ قدیم دور سے چلا آ رہا ہے۔ جب انسان پڑھنے لکھنے سے ناآشنا تھا تب بھی اس نے سینہ بہ سینہ اپنے اسلاف اور بزرگوں اور اگلوں کے کارناموں اور ان کی لغزشوں کو محفوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے اپنے خاندان اور قبیلے کے قابلِ ذکر کارناموں کو لوک گیتوں اور قصوں کہانیوں کی شکل میں نسل در نسل منتقل کیا۔ مرثیہ، قصیدہ، رجزیہ اشعار، لوک گیت اور قصہ گوئی اس سلسلے کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ لوک گیتوں اور قصہ گوئی کے بعد تحریر کی صورت میں سوانح عمریاں منظر عام پر آئیں۔ جب انسان نے تحریر کو ذریعہ اظہار بنایا تو اس نے اپنے قابل ذکر مشاہر کے خاص خاص کارناموں کو پتھر اور مٹی کی سیلوں اور دیگر اشیاء پر لکھا۔ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی افراد کے حالات و واقعات اور ان کے کارنامے ہیں۔ سوانح عمری کیا ہے؟ اس بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> سوانح عمری کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں مثلاً سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے متعلق ہے۔ یا یہ کہ سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش سے موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہے۔ یعنی حقائق کے ساتھ کردار اور ذہن کی نشو ونما کا مرقع ہے۔ انسان کی شخصیت کی تصویر ہے۔ اس کے خارجی ردعمل اور داخلی احساسات کی کہانی ہے وغیرہ۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یہ ہے کہ سوانح عمری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں تین لوازم

> تاریخ ،فرد اور ادب بتائے گئے ہیں ۔ چنانچہ سوانح عمری کی ان تعریفوں میں کوئی خاص تضاد نہیں پایا جاتا ۔ بلکہ بعض تعریفیں تو اتنی آسان اور جامع ہیں کہ سہل ممتنع معلوم ہوتی ہیں ۔مثلاً کارلائل کہتا ہے کہ ''سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے''!اس میں ایک اور تعریف یہ ہے کہ ''سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے ۔[۴۲]

سوانح عمری بھی تاریخ کی ایک شکل ہے لیکن اس کا تعلق فرد واحد سے ہوتا ہے ۔اردو جامع انسائیکلو پیڈیا میں سوانح عمری کی تعریف یوں کی گئی ہے ۔

> سوانح عمری تاریخ کی وہ شکل ہے جو انسانی نسلوں اور گروہوں سے نہیں بلکہ افراد سے تعلق رکھتی ہے ۔قدیم زمانے میں سوانح عمری کا اصل مقصد کسی شخص کے حالات لکھ کر اس کے کارناموں یا اس کی خوبیوں کو نمایاں کرنا تھا۔اس زمانے میں سوانح عمری کا موضوع صرف بڑے لوگ ہوتے تھے ۔مگر اب یہ روایت بدل چکی ہے ۔اب سوانح نگار کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سوانح عمری کے موضوع کے متعلق صحیح صحیح حالات اس طرح پیش کرے کہ وہ قاری کے سامنے ایک زندہ شخصیت کے روپ میں آ جائے ۔[۴۳]

ڈاکٹر گیان چند سوانح عمری کی تعریف کے ضمن میں رقمطراز ہیں: ''اس میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے ۔یہ ایک مختصر مضمون بھی ہوسکتا ہے، پوری کتاب بھی''۔[۴۴]

مندرجہ بالا اشاروں کو اگر ترتیب دیا جائے تو اس بات کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ سوانح نگار پہلے ایک شخصیت کا انتخاب کرتا ہے بعد میں اس شخصیت کو اول سے آخر تک درجہ بدرجہ نمایاں کرتا جاتا ہے ۔اور اس شخصیت کی زندگی کے بھی واقعات کا انتخاب کرتا ہے ۔جو شخصیت کی زندگی کو سمجھنے اور نکھارنے میں معاون ہو سکتے ہیں ۔ان واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دیا جاتا ہے ۔اور ایک خاص اسلوب بیان اختیار کرتا ہے اور نتائج مرتب کرنے اور شخصیت کے تجزیہ میں اس کا طرز عمل منصفانہ ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے چار باتوں کو سوانح عمری کے لیے لازمی جزو بتایا ہے ۔وہ لکھتے ہیں:

> سوانح حیات کو ہم چار نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں ۔ اول تو سوانح حیات کی ایک تاریخی

حیثیت ہوتی ہے ۔اس لحاظ سے سوانح حیات میں سچے واقعات کا ذکر ہونا چاہیے ۔ دوسرے سوانح حیات کو انفرادی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اس لحاظ سے ہیرو کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور نمایاں ہونا چاہیے ۔تاکہ دوسروں کے سامنے وہ مثال بن سکے ۔اس کے علاوہ سوانح حیات کو ہم ادبی نقطہ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں ۔اس صورت میں سوانح حیات میں وہ تمام خوبیاں ہونی چاہیے جن سے کسی زبان کا ادب ایک اعلیٰ اور بلند مقام حاصل کرتا ہے۔آخر میں سوانح نگاری کو ہم سائنسی نقطہ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف کے بیان میں سائنسی عدیت اور قطعیت ہونا چاہیے۔[۷۵]

بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

ایڈمنڈ گوس نے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں بائیوگرافی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

Biography is a faithful portrait of a soul in its adventures through Life.

اس تعریف کا تجزیہ کرنے سے سوانح عمری کے بنیادی اصول خود بخود سامنے آ جاتے ہیں ۔اول یہ کہ حیات میں موضوع کی ہو بہو تصویر آنی چاہیے جو حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو ۔دوم موضوع کی زندگی کی مکمل تصویر ہو اور سوم سوانح عمری نفس انسانی (Soul) کے ان تمام افکار و حوادث اور ہنگاموں کا مرقع ہونا چاہیے ۔جن سے سوانح عمری کے ہیرو کو گزرنا پڑا ۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''حیات'' میں مظاہر کی نقاشی کے ساتھ ساتھ موضوع کی داخلی شخصیت کو بھی تمام و کمال پیش کرنا چاہیے ۔تاکہ ''حیات '' کسی شخص کی مکمل حقیقی اور پُرمعنی سرگزشت بن سکے''۔ [۷۶]

سوانح نگاری میں جہاں تک صداقت اور سچائی کا تعلق ہے۔اس سے انحراف ممکن نہیں ۔سوانح نگاری کو اگر تاریخ کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ سوانح نگار بھی ایک مورخ کی طرح حالات وواقعات کو بیان کرتا اور کسی شخص کی زندگی کے حقائق کی ہو بہو تصویر کشی کرتا ہے ۔تاریخ نویسی میں جس طرح واقعات کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ایک سوانح نگار کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس شخصیت کی زندگی کو جس کی سوانح عمری لکھی جا

رہی ہے ۔ یوں پیش کرے جیسے کہ اس نے زندگی گزاری ہے ۔سوانح نگاری اگر چہ تاریخ نویسی ہے لیکن عبارت کا فصیح اور دلچسپ ہونا بھی بہت ضروری ہے ۔اس لیے کہ یہی درحقیقت سوانح عمری کا ادبی پہلو ہوتا ہے ۔اس کے بغیر کوئی بھی سوانح عمری فن کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی ۔ واقعات کو دلچسپ بنانے کے لیے سوانح نگار حقیقت کو نہیں چھپا سکتا۔ بلکہ اس سلسلے میں قطعی جانبداری اور منصفانہ طرزِ عمل کی ضرورت ہے ۔عبارت کی خوبصورتی سوانح نگار کی فنکارانہ عظمت کی دلیل ہے ،کہ وہ حالات و واقعات کا حقیقی مرقع کس طرح تخلیق کرتا ہے ۔سوانح نگار جب سوانح عمری لکھتا ہے تو وہ فرد کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتا ہے اور اس کے لیے اسے غیر جانبدار، حقیقت پسندانہ اور منصفانہ طرزِ عمل اختیار کرنا پڑتا ہے ۔رام نرائن گپتا نے پرکاش کی لکھی ہوئی مہاراجہ اشوک کی سوانح عمری کے دیباچہ میں سوانح عمری کے متعلق لکھا ہے ۔''یہ انسان کو انسانی فطرت کی تعلیم دیتی ہے ۔''۷۷

سوانح عمری کا مقصد انسانوں کو انسانی فطرت سے آگاہ کرنا ہے ۔اس لیے بڑے اور عظیم لوگوں کی سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں ۔اس لیے کہ دوسروں کے مقابلے میں انسانیت کی صفات ان میں زیادہ ہوتی ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ سوانح نگار پر یہ پابندی عائد کی جاتی ہے کہ وہ صاحب سوانح کی زندگی کے نفسیاتی محرکات کو بیان کرے تاکہ انسانی فطرت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔شرر نے سوانح عمریاں کس لیے لکھیں ؟اس کے متعلق ان کا نقطہ نظر یہ تھا : ''ہم التزام سے کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ اسے تمام ناموران عالم کے سوانح عمری سے اپنے ملک کے لوگوں کو بخوبی آگاہ کر دیں تاکہ جن کا نام بار بار لیا کرتے ہیں ۔انہیں پہچان بھی جائیں کہ کون تھے، کیا تھے اور کیسے تھے؟۷۸

شرر نے سوانح عمریاں اسی مقصد کے تحت تحریر کیں تاکہ لوگ ناموران عالم کے حالات وواقعات سے آگاہ ہوں ۔اورانہیں پتہ چلے کہ یہ کون لوگ تھے اور کس قسم کے خیالات کے مالک تھے؟ سوانح نگاری کے باقاعدہ اصول و ضوابط نہیں بنائے گئے ہیں جن کی بناء پر سوانح عمری کو جانچا جائے ۔سید احتشام حسین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> یہ موضوع جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر سیماب صفت بھی ۔افسانوں کے اصول بنائے گئے ۔ڈراما لکھنے کے قاعدے مقرر ہوئے ۔نظموں میں اصناف کے علیحدہ علیحدہ قاعدے مرتب کیے گئے ۔تاریخ کے لیے چند چیزوں کی موجودگی ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر تاریخ نہ رہے گی ۔لیکن سوانح عمری کے لیے اب تک کوئی باقاعدہ ایسا اصول نہیں بنایا جا سکا جسے سامنے رکھ کر ہم سوانح عمریوں کی جانچ کریں ۔تنقید لکھتے وقت جن سے مدد لیں بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوانح عمری اچھی لکھی گئی ہے وہ اچھی سوانح عمری ہے ۔۷۹

عبدالحلیم شرر نے انہی شخصیات پر قلم اٹھایا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں ۔یا جنھیں وہ اپنی زندگی میں ایک معیاری انسان تصور کرتے ہیں ۔سوانح نگار کے لیےضروری ہے کہ وہ اپنی ذہنی وابستگی کی بناء پر ہیرو کے واقعات بیان کرنے میں کسی جانبداری سے کام نہ لےاس کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرتا چلا جائے ۔ کیونکہ وہ بھی ایک انسان ہے، اوراس میں انسانی خوبیوں اور خامیوں کا ہونا بالکل فطری امر ہے ۔جس میں کسی خوف کی ضرورت نہیں ۔اوصاف میں مبالغہ آ رائی اور خامیوں کو چھپانا سوانح نگاری کےفن کے خلاف ہے ۔یہ کام بہت مشکل ہےاورحالی جیسا مصنف بھی ایک سوانح نگار کی حیثیت سے سرسید کی تعریف وتوصیف میں پیش پیش مبالغہ آ رائی سے کام لے گئے ۔شرر کی سوانح عمریوں میں بھی کہیں کہیں یہ پہلونظر آ تا ہے۔سوانح نگار کے لیےضروری ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے سوانح لکھتا ہے ۔اسے اجاگر کرتے ہوئے اپنے ہیرو کے دور کی عصری تحریکوں کی بھرپور وضاحت کرے ۔لوگوں کےفکری اور ذہنی رجحانات کوکھول کر بیان کرے تا کہ اس کے ہیرو کے علمی اور فکری کارناموں کا مقام متعین کرنے میں قاری کووقت پیش نہ آئے ۔سوانح کودلچسپ انداز میں لکھنا چاہیے ۔لیکن یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ واقعات کی اس تصویر کومسخ نہیں کرنا چاہیے۔حالات وواقعات اور ہیرو کی خوبیوں اور خامیوں کوایک توازن کے ساتھ پیش کیا جائے تا کہ توازن کی بناء پر اندازبیان دلچسپ اورمؤثر بنےاوروہ افسانہ نہ بنے ۔سوانح نگاری کےابتدائی نمونے بھوج پتر اوراہرام مصر ہیں ۔اس لیے کہ مصراورمشرق وسطیٰ کے بادشاہوں کی قبروں اورتابوتوں سے ایسی سلیں برآمد ہوئیں جن پر ان کےحالات زندگی لکھے ہوئے ہیں ۔اہرام مصر کی دیواروں پر جوعبارات کنندہ ہیں ۔ اسے بھی ابتدائی نمونے کہے جاتے ہیں ۔ باضابطہ سوانح عمریوں کے لکھنے کا رواج یہودیوں اور پھراہل روما میں ملتا ہے جبکہ جدید تحقیق کے مطابق دوسری صدی عیسوی میں پلوٹارک کی لکھی ہوئی سوانح عمری پہلی سوانح عمری ہے ۔

عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں ان کے مذہبی رہنماؤں ،شہیدوں اور بزرگوں کے حالات ملتے ہیں ۔ شروع میں مذہبی سوانح عمریاں دیو مالاؤں اورآسمانی کتابوں سے متاثر ہوئی ۔قرآن پاک میں بھی دیگرآسمانی کتابوں کےشخصی حالات اور کردار وشخصیت واضح اور روشن طور پر بیان ہوئی ۔مثال کےطور پرحضرت یوسفؑ کا قصہ ۔آہستہ آہستہ اس کوفن کی شکل مل گئی ۔سوانح نگاری کی ضرورت ہر ملک وقوم نے ہر دور میں محسوس کی ۔ موجودہ دور میں ہر ملک وقوم میں اس کا عام تصور متعین ہوگیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اسے تاریخ سے جدا صنف ادب قرار دیا گیا ہے ،اور وہی سوانح نگار کامیاب ہے جس کی تصنیف ہرمزاج اور ہر زمانے کےلوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنے۔اردوادب میں سوانح نگاری ایک پرانی صنف ہے ۔اردوادب کے قدیم نثری سرمایہ کا بڑا

حصہ کسی نہ کسی لحاظ سے سوانحی ہے۔ جو تذکروں، ملفوظات، منقولات اور سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ اردو کی ابتدائی سوانح نگاری پر فارسی ادبیات کا زیادہ اثر ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی دور میں تذکرہ نویسی کو بہت فروغ ہوا جس کا تعلق سوانح نگاری سے بھی ہے۔ لیکن انہیں سوانح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ باوجود اس کے ان تذکروں اور ملفوظات کی اپنی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں: ''قدیم سوانح عمری جدید طرز سے کئی حیثیتوں سے الگ اور مختلف ہے مگر تنوع اور رنگا رنگی کے لحاظ سے بہت بڑی حد تک قابل توجہ ہے''۔[۸۰]

جدید اردو سوانح نگاری کی ابتداء مولانا حالی نے ڈالی۔ انہوں نے مغربی سوانح نگاری کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اردو میں بھی ویسے ہی نمونے پیش کیے۔ اس لحاظ سے مولانا الطاف حسین حالی کا یہ کارنامہ اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مولانا حالی کے بعد مولانا شبلی اردو کے بہترین سوانح نگار تھے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں: ''یہ دو مصنف اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی یہ تصانیف اردو ادب کا ایک دقیع حصہ اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو کی سربلندی کا باعث ہیں''۔[۸۱]

عبدالحلیم شرر نے بھی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ شرر کی سوانح عمریاں اگرچہ حالی و شبلی کی سوانح عمریوں کے درجے تک نہ پہنچ سکیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان سوانح عمریوں کو بھی ہم اردو ادب کا بہترین سرمایہ قرار دے سکتے ہیں۔ شرر نے جو سوانح عمریاں تحریر کیں وہ درج ذیل ہیں۔

''ثانی اثنین''، ''ذی النورین''، ''ابوالحسین''، ''ابوبکر شبلی''، ''سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی''، ''امام شافعی کا سفرنامہ''، ''جنید بغدادی''، ''سکینہ بنت حسین''، ''قرۃ العین''، ''حسن بن صباح''، ''اسلامی سوانح عمریاں (اس کتاب میں سولہ اشخاص کی سوانح عمریاں شامل ہیں)'' صد پارہ دل /شاہکار شرر''، ''نامورانِ عالم/ گروہ مشاہیر''، ''مخدرات''، ''ملکہ زنوبیہ''، ''جانِ عالم''، ''مانی کی سوانح عمری''، ''من آنم کہ من دانم (آپ بیتی) وغیرہ وغیرہ۔

ثانی اثنین

''ثانی اثنین'' کے عنوان سے ایک سوانح عمری شرر نے لکھی ہے۔ جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی پر ایک محققانہ لیکچر ہے، جو شرر نے ایک مجمع عام میں پڑھا تھا جناب خلیفہ اول کے صحیح اور مستند حالات مسلمانوں کے لیے اس لیکچر میں پیش کیے گئے تھے۔ تمام حاضرین نے محظوظ ہو کر اور دلچسپی سے یہ لیکچر سنا تھا

بعد میں حاضرین کے ایماء پر سوانح عمری کی صورت میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔اس کتاب کی ضخامت اٹھاون صفحات ہیں ۔اس کا اسلوب سادہ ہے اور واضح عبارت میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں شرر نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ۔تحقیق کے بعد لکھا ہے ۔ یہ کتاب بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے جس اصول پر ان کی دیگر سوانح عمریاں اور خاص طور پر خلفائے راشدین کی سوانح عمریاں لکھی گئیں ۔اس کتاب میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو شرر کی سوانح نگاری سے منسوب ہیں ۔ یہ بھی شرر کی نامی گرامی سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہے ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات و واقعات پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک قلم بند کیے ہیں ۔ حالات قبل از اسلام، حالات بعد از اسلام، حالات قبل از ہجرت ، حالات بعد از ہجرت ،غزوات میں شمولیت ، غزوہ بدر،غزوہ احد اور غزوہ خندق و خیبر کا ذکر،متفرق واقعات کا بیان ،حضرت صدیق ؓ کی خلافت کا بیان ،خلافت صدیقی کے بابرکت کارناموں کا ذکر،قتال مرتدین ، اہل بغاوت کے سلسلہ کے واقعات کی قلم بندی ،فتوح عراق و شام کا ذکر،حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ،حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے کلمات طیبات کا ذکر،اور آپ کی وفات کا ذکرغرض کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو شرر نے بیان کرنے سے گریز کیا ہو۔شرر کی اس سوانح عمری میں ان کی ذات کی عکاسی ان کے جذبات و احساسات کی عکاسی بھی ہوتی ہے ۔اسلوب کی وہی خوبیاں اس میں بھی موجود ہیں جو دیگر سوانح عمریوں میں پائی جاتی ہیں ۔اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> آج کی تاریخ ایک حیثیت سے غم کا دن ہے ۔اور ایک حیثیت سے خوشی کا دن ۔غم کا دن اس لیے کہ اسی دن اور آج ہی کی تاریخ رات کے وقت مغرب وعشاء کے درمیان اولین جانشین مسند رسالت و بہترین زینت بخش سریر خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ساری دنیائے اسلام کو مبتلائے غم و حرماں چھوڑ کے دنیا سے سدھارے اور فردوس بریں کی راہ لی اور یہی خوشی کا دن اس لیے ہے کہ یار غار رسول ابرار رسالت کی خدمت اور نبوت کی خلافت کے تمام حقوق بوجہ احسن ادا فرما کے ساری دنیا میں کلمہ لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کرا کے اور اپنی سراپا خیر و برکت زندگی کو ہر قسم کے دینی و دنیوی فضائل سے آراستہ و مکمل فرما کے خوش خوش اسی جوار رسالت میں پہنچ گئے ۔جس کے شوق میں زمانہ خلافت بھر بیتاب و بیقرار رہے تھے ۔۸۲

شرر نے یہ سوانح عمری جس مقصد کے تحت لکھی وہ یہ ہے:

> اصل حقیقت یہ ہے کہ اسے مبارک روز کو بجائے غم و الم کے حسرت و شادمانی ہی کا دن سمجھنا چاہیے۔ مرنا برحق ہے۔ جو دنیا میں آئے۔ نبی ہو یا صدیق اسے ایک دن جانا ضروری ہے۔ اسی خیال سے میں چاہتا ہوں کہ یہ مبارک دن جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ اسی طرح میں اسے آپ کی یاد اور آپ کے فضائل و مناقب کے بیان سے تازہ اور زندہ کردوں۔ اور اپنے احباب کے سامنے ایک ایسی مبارک اور سراپا برکت زندگی کو پیش کروں جو ہر مسلمان کے لیے فلاح دارین اور دینی قومی خدمت کا مکمل ترین نمونہ ہے۔[۸۳]

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ شرر نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے یوم وفات کے موقع پر یہ سوانح عمری لکھی تھی۔ یہ اگرچہ ایک لیکچر ہی تھا لیکن اس لیکچر نے اردو ادب میں بھی بہت اضافہ کیا ہے۔

ذی النورین

یہ بھی سوانح عمری ہے۔ اس کتاب میں جو مواد شرر نے پیش کیا ہے وہی ہے جو انہوں نے لیکچر کے لیے تیار کیا تھا، اور یہ لیکچر ایک عام اجتماع میں دیا تھا۔ اس میں حضرت خلیفہ ثالث اور داماد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے معتبر اور صحیح واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس سوانح عمری میں جناب حضرت عثمان کی شہادت کے اسباب و حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عثمان کی شہادت کے اسباب و حالات نے اکثر مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈال رکھے تھے۔ جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ شہادت عثمانی کے صحیح واقعات سے کم لوگ آگاہ تھے۔ مولانا نے اپنا یہ لیکچر خاص جستجو اور کوشش سے مرتب کیا تھا اور جتنے لوگوں نے بھی اس کو سنا تھا متاثر ہوئے تھے۔ آج بھی ان کی یہ کتاب اتنا ہی اثر رکھتی ہے جتنا اثر ان کے اس وقت کے لیکچر میں تھا۔ شرر نے خلفائے راشدین پر جتنی سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں سے طویل ترین سوانح عمری یہی ہے۔

ذوالنورین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب تھا۔ اور یہ لقب اس سبب سے ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دونو نظر یعنی حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم آپ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عثمان کے سوا دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے نکاح میں کسی نبی کی دو بیٹیاں آئی ہوں۔ اسی لقب کو شرر نے بطور عنوان استعمال کیا ہے۔

اوراس سوانح عمری کا نام ذوالنورین رکھا۔نام مبارک آپ کا عثمان اور لقب ذوالنورین نسب آپ کا پانچویں پشت میں رسول خدا ﷺ سے ملتا ہے۔عبد مناف کے دوفرزندوں میں سے ایک کی اولاد میں رسول خدا ﷺ ہیں اور ایک کی اولاد میں حضرت عثمان ،اور آپ کی والدہ رسول خدا ﷺ کی پھوپھی مسلم بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں ۔یہ ام حکیم ہی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے والد حضرت عبداللہ کے ساتھ پیدا ہوئی تھیں ۔غرض یہ کہ ماں باپ کی طرف سے بہت قریب کی قربت رسول اللہ سے حضرت عثمان کی تھی ۔آپ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی رہنمائی میں اسلام قبول کیا۔اس سوانح عمری میں شرر نے حضرت عثمان کی زندگی کے حالات وواقعات قلم بند کرتے ہوئے ۔حالات قبل از اسلام ،حالات بعد از اسلام ،حضرت ذوالنورین کی خلافت،آپ کے عہد خلافت کی فتوحات،شہادت حضرت عثمان،حضرت عثمانؓ کے متعلق مختلف صحابہ کرام کے اقوال ،حضرت عثمانؓ کے حالات وکرامات وکلمات کا بیان،آپ کے فضائل وکمالات کا ذکر،احادیث کے ترجمے ۔وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے ۔

شرر کی معلومات جہاں تک تھیں اور جتنا علم ان کے پاس تھا وہ سب اس کتاب میں موجود ہے ۔اس کتاب کے مطالعے سے ایک مسلمان کا ایمان جہاں تازہ ہوتا ہے وہاں اس کی معلومات اور علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے ۔اس کتاب میں شرر نے انہی اصولوں کو اپنایا ہے ۔جو اس دور میں مروج تھے ۔شرر کا مخصوص اسلوب اس کتاب میں بھی موجود ہے ۔اس کتاب میں بھی مؤرخانہ انداز بیان ،افسانوی رنگ اور انشاپردازی کے جوہر پوشیدہ ہیں ۔اس کتاب کے مطالعے سے اس دور کی تاریخ اسلام کے روشن باب سے قاری آگاہ ہوتا ہے ۔

ابوالحسنین ۱۹۲۵

شرر سے قبل اور بعد بھی کئی ایک سوانح نگار ابھرے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لکھا ۔بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین کا تذکرہ اور ان کے اوصاف وکمالات کا بیان حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کے ذکر مبارک کا حصہ ہے ۔عبدالحلیم شرر نے بھی حضرت علیؓ پر قلم اٹھایا ۔حضرت علیؓ جامع الحیثیات اور اعلیٰ صحابہ کرام میں شمار ہوتے تھے ۔ان کی زندگی بڑے بڑے ہنگاموں اور مہمات کا مرکز ومنبع تھی ۔شرر کو یہ خیال کیوں آیا کہ خلفائے راشدین پر بھی لکھا جائے ؟ اور اس کا محرک کیا تھا؟ وہ خود اس سوانح عمری کے آغاز میں لکھتے ہیں :

میری کوشش ہے کہ حضرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی وفات کی تاریخوں کو ان کے ذکر اور ان کی یاد سے زندہ کیا کروں ۔ چنانچہ ۲۱ جمادی الاخریٰ کو حضرت صدیق اکبرؓ کے حالات اور آپ کے عہد ... کے واقعات آپ کے سامنے پیش کیے تھے ۔ حضرت فاروق اعظم اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعے ذی الحجہ کے مہینے میں پیش آئے ۔ لہٰذا وہ اس مہینے میں آپ کو سنائے جائیں گے ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت رمضان مبارک کے عشرہ آخر کے آغاز میں ہوئی ۔ مگر ان دنوں روزے کی وجہ سے مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ مسلمانوں کو تکلیف دوں ۔ میں اگر تکلیف دیتا بھی تو اکثر حضرات آنے میں تامل فرماتے ۔ اور آتے بھی تو پریشان رہتے ۔ اس خیال سے میں نے اس کارِ خیر کو رمضان میں ملتوی رکھا ۔ اور اب آپ کو زحمت دیتا ہوں کہ حضرت علیؓ کے جو کچھ حالات میں نے قلم بند کیے ہیں پیش کروں ۔[۸۴]

یہ سوانح عمری ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں شرر نے حضرت علیؓ کی پیدائش سے وفات تک کے حالات و واقعات قلم بند کیے ۔ اس کتاب میں عنوانات نہیں دیئے گئے ۔ شرر نے خلفائے راشدین کی جتنی بھی سوانح عمریاں لکھیں ، اگر چہ یہ ان کے لیکچر تھے جو اجتماع میں انہوں نے پیش کیے تھے ۔ لیکن بعد میں عوام الناس کے اصرار پر انہیں کتابی صورت میں پیش کیا گیا ۔ شرر نے حضرت علیؓ کی سوانح عمری بڑی ذمہ داری سے مرتب کی ۔ شرر اس حقیقت کو سمجھتے تھے اپنے مذہب اور دین سے محبت کا جذبہ ہی تھا جس نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خلفائے راشدین پر قلم اٹھائیں ۔ سوانح نگار ہی انسانیت کا جویا ہوتا ہے ، وہ ایک شفیق دوست اور قدر دان ہوتا ہے ، اگر اس میں یہ باتیں نہ ہوں تو وہ سوانح نگار نہیں بن سکتا ۔ شرر ایک حقیقی سوانحی نگار کی تمام صفات سے متصف تھے ۔ قدرت کی طرف سے انہیں وہ دل ملا تھا جس میں شریفانہ جذبات ، جوہر شناسی ، سلامت مزاجی اور انس و محبت کے احساسات تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جن ہستیوں کو موضوع بنایا ان پر اس انداز سے لکھا کہ ان ہستیوں کی مکمل تصویر قاری کے ذہن پر ابھری ، اور ساتھ ہی اس نے کچھ نہ کچھ اثر بھی ضرور قبول کیا ۔

سوانح نگار کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہیرو کی حیات کی ہو بہو مصوری کرے ۔ ہو بہو مصوری سے مراد یہ ہے کہ جہاں ہو سکے ہیرو کے اعمال و افعال کو اس انداز سے بیان کرے کہ کوئی عمل اور فعل نظر انداز نہ ہو ۔ شرر نے اس سوانح نگاری میں ہر ممکن کوشش کی ہے کہ حضرت علیؓ کے اعمال و افعال کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو قاری

کے سامنے پیش کریں ۔اس سوانح عمری کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا کہ شرر ایک اچھے مصور تھے ۔تصویر کشی میں انہیں کمال حاصل تھا ۔حضرت علیؓ کی شخصیت و سیرت و کردار کا ہر پہلو قاری کے سامنے اجاگر کرنے میں وہ کامیاب رہے ۔اگر چہ انہوں نے یہ لیکچر دیئے تھے اور اس وقت شاید ان کے پیش نظر یہ نہ ہو کہ اسے کتابی صورت میں بطور سوانح عمری کے پیش کیا جائے گا ۔اگر یہ نقطہ نظر ہوتا تو شرر اس سوانح عمری کو اور زیادہ معتبر انداز سے تحریر کرتے ۔اب بھی اس میں اگر چہ ان کی باقی سوانح عمریوں کے مقابلے میں تفصیلات زیادہ ہیں لیکن تب صورت حال اس کے برعکس ہوتی ۔

سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ اس کے ہیرو کے متعلق اسے جو کچھ معلوم ہو یا اس کے متعلق جو دیانتدارانہ خیال ہو، اس کو بلا شبہ ظاہر کرے ۔شرر ایسا کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں ۔شرر کی اس سوانح عمری کے مطالعے کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے حضرت علیؓ کی زندگی کا کوئی اہم پہلو نظر انداز نہیں کیا ۔چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی بیان کر دیا ہے ۔ہر اچھی سوانح عمری کتاب المناقب ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سوانح عمری کی بنیاد ہی ہمدردی اور شفقت پر قائم ہوتی ہے ۔اس سوانح عمری میں شرر کا اپنے مذہب سے لگاؤ، خلفائے راشدین کے بارے میں وسیع مطالعہ و معلومات کا پتہ چلتا ہے ۔تاریخ سے دلچسپی تاریخی واقعات کے بیان سے ہوتی ہے ۔اس کتاب کے مطالعے سے تاریخ اسلام کے روشن باب سامنے آتے ہیں ۔شرر نے ''ابوالحسین'' میں حضرت علیؓ کی پیدائش، نام ۔حضرت علیؓ کا رسول پاک کی فرزندی میں آنا ۔حضرت علیؓ کا اپنی ذمہ داری کا نبھانا ۔حضرت فاطمہؓ سے نکاح ۔ابوالحسن اور ابوالتراب کی کنیت ۔عشرہ مبشرہ میں شمار وغیرہ کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ کڑی سے کڑی ملی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔پوری کتاب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے درج ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔

حالات وواقعات زیست، بعد از اسلام ،حضرت علی کے فضائل و مناقب پر روشنی ڈالی ہے ،حضرت علی المرتضیٰ کی خلافت، جنگ جمل، جنگ صفین ،حضرت علیؓ کے اوصاف حمیدہ و فضائل کا بیان ،حضرت علیؓ کی غزوات میں شمولیت اور شجاعت و بہادری کا ذکر ،حضرت ابوبکر صدیقؓ ،حضرت عمرؓ ،حضرت عثمانؓ کی خلافت کا مختصراً ذکر وغیرہ ۔شرر نے حضرت علیؓ کی شخصیت و کردار کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے صداقت کا پہلو نہیں چھوڑا ۔جو کچھ لکھا ہے مکمل تحقیق کے بعد لکھا ہے، دلائل سے ہر بات ثابت کی ہے ۔حضرت ابوبکر صدیقؓ ،حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کے خلیفہ منتخب ہونے کا ذکر کر کے شرر نے یہ بات واضح کر دی ہے ۔''ان تمام واقعات پر نظر

ڈالنے سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ اگر چہ آپ اپنے تئیں خلافت کا حقدار خیال فرماتے تھے مگر جو فیصلہ ہو جاتا تھا اس کو کمال نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ قبول فرما لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک بڑا با اثر گروہ ہر زمانے میں آپ کے ساتھ تھا۔ انصار بھی اپنے دعوے سے دستبردار ہو جانے کے بعد زیادہ تر آپ کی رفاقت پر آمادہ تھے۔ مگر آپ نے کبھی جھگڑے، فساد، ہنگامہ آرائی اور لڑائی کو پسند نہیں فرمایا۔''۸۵

شرر نے اس دور کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے، کہ اس زمانے کے تاریخی حالات وواقعات صحیح طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ حضرت علیؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو اس کے بعد کی صورتحال آپ کا اندازِ خلافت اور بطور خلیفہ آپ کے امور کی انجام دہی ان سب پہلوؤں کو شرر نے مؤثر انداز سے بیان کیا ہے۔ اس سوانح عمری میں حضرت امام حسینؓ اور حضرت عائشہؓ کے بیان بھی شرر نے قلم بند کیے ہیں۔ اور حضرت عائشہؓ کی تقریر کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ وہ تقریر ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر حرم میں کی گئی تھی، اور اس تقریر نے بہت اثر کیا تھا۔ شرر نے اس تقریر کے جملے یوں بیان کیے ہیں کہ قاری پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ قاری بھی اسی عہد میں پہنچ جاتا ہے جس زمانے میں یہ الفاظ حضرت عائشہؓ کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ شرر نے اس لڑائی کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ ''جنگ جمل'' کہلاتی ہے۔ یہ حضرت عائشہؓ کی اونٹنی کی وجہ سے ''جنگ جمل'' کہلاتی تھی۔ جنگ صفین جو حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کا تذکرہ اس سوانح عمری میں موجود ہے۔ اس سوانح عمری میں شرر نے حضرت علیؓ کے سیاسی واقعات اجمالاً بیان کیے ہیں وہ لکھتے ہیں: ''حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سیاسی واقعات اجمالاً عرض کر دیئے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ہم آپ کے فضائل وکمالات کو بھی بیان کر دیں۔''۸۶

پہلے دس صفحات میں حضرت علیؓ کی نجی زندگی اور مقام ومرتبہ کا بیان ہے۔ صفحہ نمبر ۱۱ سے ۱۴۱ تک حضرت علیؓ کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور باقی صفحات میں آپؓ کے فضائل کمالات کو شرر نے مؤثر انداز سے بیان کیا ہے۔ آپؓ کا حلیہ مبارک اور آپؓ کی شہادت، حضرت حسنؓ کے الفاظ جو منبر پر کھڑے ہو کر ادا فرمائے تھے وہ لکھے ہیں۔ اس سوانح عمری کا طویل ترین حصہ وہ ہے جو کہ آپؓ کی سیاسی زندگی کے اصول وواقعات پر مشتمل ہے۔ شرر نے اس سوانح عمری میں دلچسپی کا پورا سامان پیدا کیا ہے۔ حضرت علی کے فضائل وکمالات کے ضمن میں کئی ایک واقعات مختصر مگر جامع ہیں۔ اس سوانح عمری میں شرر نے شیعوں کے عقائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس سوانح عمری میں تمام معلومات، تمام روایات، متعلقہ احادیث اور اقوال وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ایک طرف شرر کے وسیع علم کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف وہ قاری جو ان باتوں کو پہلے نہیں جانتا

تھا، اس کے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کی سیرت و کردار اور شخصیت کے ہر پہلو کو شرر نے بیان کیا۔ لکھتے ہیں:

> مناسب ہوگا کہ ہم آپ کی خوبصورت تصویر بھی اپنے دوستوں کو دکھا دیں۔ رنگت گندم گوں تھی۔ کسی قدر سانولا پن ہے۔ چندیا بالوں سے صاف تھی۔ ڈاڑھی نہایت سفید نورانی اور لمبی چوڑی تھی۔ جو دونوں شانوں تک پھیلی رہتی، سینے اور سارے پنڈے پر بالوں کی کثرت تھی۔ کلائیاں چوڑی چکلی اور پنڈلیوں کے پٹھے اور عضلات خوب گداز تھے۔ کمر چوڑی اور تو ندنکلی ہوئی۔ قد پستہ تامتی کے قریب۔ اور ان خصوصیتوں کے ساتھ نہایت ہی خوبرو و خوش جمال تھے۔ بڑھاپے میں بھی حسن برقرار تھا۔ اور خندہ جبینی کی یہ حالت تھی کہ جب دیکھیے معلوم ہوتا ہے ہنس رہے ہیں۔ ۸۷

یہ اقتباس پڑھ کر جہاں حضرت علی کی مکمل تصویر قاری کے ذہن میں ابھرتی ہیں۔ وہاں شرر کے انداز بیان اور اسلوب کی خصوصیات بھی نکھرتی ہیں۔

جنید بغدادی۔۱۹۲۳

شرر نے جس مقصد کے تحت نامورانِ اسلام اور مشہور و معروف شخصیات کے حالات پر قلم اٹھایا اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> میں نے ایک زمانے تک غور و فکر میں مصروف رہنے کے بعد اس تجویز پر کار بند ہونے کا ارادہ کیا، کہ جو مشہور اور نامی گرامی بزرگان سلف ہماری ایشیائی شاعری کے عنصر بنے ہوئے ہیں۔ عام اس سے کہ کسی طبقہ اور کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں ان کے حالات امکانی جستجو و تلاش اور تحقیق و تدقیق کے بعد شائع کیے جائیں اور ہر بزرگ کے حالات میں ایک مستقل رسالہ تیار کردیا جائے۔ حصول برکت کے لیے میں نے سب سے پہلے مشائخ صوفیہ کو منتخب کیا ہے جن میں سے حضرت جنید بغدادی۔ ابوبکر شبلی۔ بایزید بسطامی۔ ابراہم ادھم اور حسین ابن منصور حلاج وغیرہ کے نام ہماری نظم و نثر میں بار بار آتے ہیں۔ مگر جن کی زبان پر یہ نام آتے ہیں انھیں میں سے اکثر ان کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ مشائخ صوفیہ کے

بعد دیگر لوگوں کا مرتبہ ہے ۔ جیسے حاتم طائی سخاوت کا ہیرو ہے ۔ مجنوں لیلیٰ ، فرہاد و شیریں عشق کے ہیرو ہیں ۔ اسی طرح کے اور بھی بہت نام ہیں ۔ جو کسی خاص ہنر یا جوہر سے تعلق رکھتے ہیں ۔ کیا اچھا ہوا اگر ان سب کے حالات میں ایک ایک رسالہ اردو زبان میں موجود ہو جائے جو تحقیق و تفتیش کے بعد مرتب اور عمدہ عبارت میں تصنیف کیا گیا ہو ۔ ۸۸

درج بالا اقتباس میں شرر نے اپنے مقصد کو بیان کیا ہے جس کے پیش نظر انہوں نے سوانح عمریاں لکھنے کا ارادہ کیا تھا ۔ شرر نے امکانی جستجو و تلاش اور تحقیق کے بعد ان کے حالات شائع کیے ہیں ۔ شرر نے سب سے پہلے مشائخ صوفیہ کو منتخب کیا اور اس سلسلے میں انہوں نے جنید بغدادی ، ابوبکر شبلی بایزید بسطامی ، ابراہم ادوھم اور حسین ابن منصور حلاج کے حالات لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ حاتم طائی ، لیلیٰ مجنوں ، شیریں فرہاد وغیرہ پر انہوں نے سوانحی مضامین لکھے اور ان کو ''سیر نسواں اور سیر رجال'' میں جگہ دی ۔ شرر نے ان افراد پر لکھنے کے لیے نواب ابونصر علی حسن خان بہادر کے کتب خانے سے استفادہ کیا ۔ شرر نے '' جنید بغدادی'' کتاب کو نواب سلطان الملک بہادر کے نام سے معنون کیا ہے ۔

عالی جناب نواب سلطان الملک بہادر دام اللہ مکارم اخلاقہ جیسی عنایت اس فقیر کے حال پر فرماتے رہے ہیں ۔ اور جو محبت انھیں اپنے اس ادنیٰ خادم کے ساتھ ہے اس کی یادگار میں اس کتاب کو میں انھیں کے مبارک نام سے معنون کرتا ہوں ۔ ۸۹

سلسلہ مشاہیر اسلام کے تحت ''حضرت جنید بغدادی'' کی سوانح ، تعلیمات ، ان کا تصوف اور قرآن و تلامذہ کا ذکر کیا ہے ۔ یہ سوانح عمری ۱۹۲۳ء میں حکیم محمد سراج الحق ، منیجر ، پرنٹر و پبلشر دلگداز نے چھپوا کر شائع کی تھی ۔ یہ کتاب ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں شرر نے بڑی خوب صورت اور دلکش تمہید باندھی ہے اور جنید بغدادی کے عہد کی برکات اور مسلمانوں کے عروج کے زمانے کو سراہا ہے ۔ حضرت جنید بغدادی ولی اللہ تھے ۔ شرر نے ان کی شخصیت و سیرت اور کردار کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :

...... یہ ایک بڑے اعلیٰ پائے کے ولی کامل تھے ۔ اور وہ شخص تھے جن کا نام حقیقت و عرفان کے عالم میں ہمیشہ آفتاب عالمتاب کی طرح چمکتا رہے گا ۔ ......جن کے نام کا ساری دنیا ادب کرتی ہے ۔ جنہوں نے ریاضت و نفس کشی اور صفائے باطن کے اعتبار سے اسلام میں

امامت کا مرتبہ حاصل کیا ہے ۔جنھیں مشائخ باطن اپنا پیشرو تسلیم کر کے ''سید الطائفہ'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔۹۰

شرر نے حضرت جنید بغدادی کے حالات بیان کرنے سے قبل تصوف کے عنوان سے تصوف کی اصلیت اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی ہے ۔شرر نے حضرت جنید بغدادی کے اصلی مرشد سری سقطی کے علم وفضل ۔زہد وتقویٰ اور ان کی زندگی کے شب و روز کے بارے میں بتایا ہے ۔ شرر نے اس مرشد کے بارے میں چند واقعات بھی بیان کیے ہیں ۔اگر ناجائز لقمہ ان کے ہاتھ میں آ تا تو انگلیوں کی ایک مخصوص رگ پھڑ کنے لگتی تھی ۔جس سے وہ پہچان لیتے تھے کہ یہ لقمہ حلال نہیں ہے ۔اور دوسرا یہ کہ اگر وہ لقمہ ناجائز ہوتا تو مرشد کے حلق سے نیچے نہیں جاتا تھا ۔حارث کی وفات کے بعد حضرت جنید بغدادی کی تعلیم وتربیت ان کے ماموں نے کی ۔شرر نے سری سقطی کے حالات پہلے بالحاظ مراتب اور دنیوی تعلقات کے طور پر اس سوانح عمری میں بیان کیے تھے ۔لیکن بعد میں ان کے حالات مختصراً بیان کیے ہیں ۔اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح سے آپ نے دنیاوی امور کو خیر باد کہا اور ولی کامل کے درجے تک پہنچے لکھتے ہیں ۔

......ان کا پورا نام ابوالحسن سری بن مفلس سقطی ہے ۔ابتداً تجارت کرتے تھے ۔مگر ایک دن اپنی دکان میں بیٹھے تھے کہ شیخ وقت مصروفؔ کرخی ایک یتیم بچے کو ساتھ لیے ہوئے آئے اور کہا ''اسے کپڑے پہنا دو'' انھوں نے بے تامل اس کو کپڑے پہنا دیئے ۔جس پر خوش ہو کر مصروفؔ نے دعا دی کہ ''اللہ تمھارے دل میں دنیا کی طرف سے بغض پیدا کرے اور جس حالت میں ہو اس سے تمھیں نجات دے ۔'' بس اسی وقت سے یہ حالت ہوئی کہ تمام مال و اسباب سے ہاتھ اٹھایا ۔دنیا چھوڑی اور مصروفؔ کرخی کے ہاتھ پر توبہ کر کے انھیں کے نقش قدم پر چلنے لگے ۔۹۱

جنید بغدادی کی ذات وصفات اور ان کے درجے کمال باطنی وظاہری کو شرر نے اس کتاب میں بیان کیا ہے ۔شرر نے طبقات الکبریٰ ، تذکرۃ الاولیاء اور دفیات الایمان لابن خلکان میں سے آپ کے بارے میں معلومات کا وسیع ذخیرہ لیا ۔:

جنید نے ابوحفص عمر خداد، محمد بن علی القصابؔ اور محمد بن سردق طوسی وغیرہ بزرگوں سے فیض حاصل کیا ۔

شرر نے یہ بھی بتایا کہ ان اساتذہ کے علاوہ شیخ یعقوب زیاتؔ سے بھی فیض حاصل کیا۔علامہ ابن جوزی کی تحریر کا حوالہ انھوں نے دیا ہے ۔ان کے اساتذہ کے بارے میں مصنف نے بتایا ہے ۔

> اگر چہ حضرت جنید بغدادی کے دوسو اساتذہ اورشیوخ بتائے گئے ہیں ۔مگر ان میں سے صرف انھیں چند حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں ۔کیونکہ یہی وہ بزرگ ہیں جن کی تعلیم اور جن کے فیض محبت نے جنید کو سید الطائفہ اور مشائخ صوفیہ کا سرگروہ بنایا ۔۹۲

''تعلیم اور طرز تعلیم'' کے عنوان سے مصنف نے حضرت جنید بغدادی کے طرزِ تعلیم پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ بھوکے پیاسے رہ کر، دُنیا کو ترک کر کے اور جن چیزوں کو دل چاہتا تھا ان سے علیحدگی اختیار کر کے انھوں نے علم تصوف حاصل کیا تھا اور اسی قسم کا درس اور ایسی ہی تعلیم وہ اپنے مریدوں کو دیا کرتے تھے ۔سری سقطی کی طرح آپ بھی اخلاقی صحبتوں اور باتوں باتوں میں تعلیم دیا کرتے تھے۔اس موضوع کے تحت شرر نے مختلف واقعات بیان کیے ہیں مثلاً:

> کسی نے پوچھا ''عارف کون ہے؟'' فرمایا جو تیرا راز بتادے اور خاموش بیٹھا رہے ۔''
> اسی طرح ایک اور مرتبہ کسی نے پوچھا ''عارف کی کیا شان ہے؟'' فرمایا ''پانی اسی وضع میں نظر آتا ہے جو وضع کہ اس کے ظرف کی ہو''۔

> ......لوگوں نے پوچھا ''خالص توحید کیا ہے؟'' فرمایا ''یہ کہ بندہ کی آخری حالت ابتدائی حالت کی طرف رجوع کر جائے اور ویسا ہی ہو جائے جیسا کہ عالمِ وجود میں آنے سے پہلے تھا'' ...... یہ بھی فرماتے تھے کہ حکمت باطنی کے عہدوں میں سے جس کی سب سے پہلے ضرورت ہے یہ ہے کہ مفسوع اپنے صانع کو پہچانے اور پیدا ہونے والا یہ معلوم کرے کہ وہ کیونکر پیدا ہوا ۔خلاصہ یہ کہ خالق کی صفت مخلوق سے اور قدیم کی صفت حادث سے علیحدہ کرے اور پہچانے ۔اس کی دعوت (رسالت) کے آگے عاجزی سے سر جھکائے ۔ اس لیے کہ جو اپنے مالک کو نہیں پہچانتا وہ یہ بھی نہیں جان سکتا کہ کس کی حکومت اس پر واجبی ہے'' فرمایا کرتے تھے ''گوشہ خلوت کی مشقت میل جول کی دلچسپیوں سے زیادہ آسان ہے ......''۹۳

اسی طرح کے کئی اور سوالات و جوابات بھی شرر نے اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ ''فیاض یا یان صحبت اقران و تلامذہ'' کے تحت سوانح نگار نے جنید بغدادی کے روحانی فیض کا ذکر کیا ہے، کہ ان کا روحانی فیض دنیائے اسلام میں آج تک جاری و ساری ہے۔ آپ نے جو شمع معرفت روشن کی تھی اس نے کئی ایک سینوں کو منور کیا ہے۔ ''وفات'' عنوان کے تحت سوانح نگار نے حضرت جنید بغدادی کے انتقال، حالت انتقال، وصیت اور دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے۔

> مشائخ صوفیہ کی محبت کا مرجع و مرکز آپ کی ذات تھی۔ آپ کی وفات کے ساتھ ہی بغداد کے اہل ذوق کا وہ مجمع ٹوٹ گیا اور گو بڑے بڑے اہل دل ولی اللہ پیدا ہوئے۔ مگر جنید کے زمانے کی سی پاک وصاف صحبت اولیا پھر آنکھوں کو دیکھنا نہ نصیب ہوئی۔[۹۴]

جمعہ کے مبارک روز آپ نے انتقال فرمایا۔ حالت نزع میں بھی آپ نے پورا قرآن پاک ختم کیا اور دوسری بار پڑھ رہے تھے۔ سورۃ البقرۃ کی ستر آیتوں کے پڑھنے کے بعد آپ کی روح پرواز کر گئی۔ شرر نے تجہیز و تکفین کی صورتحال بیان کرتے ہوئے آپ کی زندگی کی سرگزشت کو ختم کیا ہے۔

''معرضین کمال'' کے تحت شرر نے حضرت جنید بغدادی کے کمالات کا ذکر کیا ہے جن کو ان کے معاصرین نے پسند فرمایا اور معترف بھی ہوئے۔ ''حکم'' کے تحت سوانح نگار نے ۲۱ نصیحتیں اور کلمات حکمت آپ کے نقل کیے ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے یہ سوانح عمری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں شرر نے حضرت جنید بغدادی کی زندگی کی تصویر کشی اپنے خاص انداز میں کی ہے۔ آپ کی تعلیمات، آپ کی کرامات اور آپ کے فیض عام کو بیان کیا ہے۔

امام شافعی کا سفر نامہ

شرر نے جہاں بزرگان دین کی سوانح عمریاں لکھی ہیں وہاں ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے ''امام شافعیؒ کا سفر نامہ'' کے عنوان سے بھی ایک مختصر کتابچہ تحریر شائع کیا ہے جو کہ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

> ہمارے ناظرین نے ابن جبیر اندلسی اور ابن بطوطہ کے سفر نامے پڑھے ہوں گے۔ اور آج

> کل کے سیاحوں کے سفرنامے بھی کثرت سے دیکھے ہوں گے۔لیکن شاید یہ لطف کسی میں نہ آیا ہوگا جو قرونِ اُولیٰ کے ایک امام اجل اور فاضل بے بدل کے اس سفرنامے میں آئے گا۔ یہ امام محمد بن اویس شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ ہے۔جس کو انہوں نے خود اپنی زبان سے ارشاد فرمایا۔[۹۵]

اس کتابچے کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو شرر کا یہ دعویٰ واقعی سچا ثابت ہوتا ہے۔شرر نے جس طرح سلسلہ مشاہیر اسلام میں مختلف بزرگوں کی پیدائش سے ان کی وفات تک کے حالات وواقعات بیان کیے ہیں اسی طرح اس کتاب میں انہوں نے وہ واقعات ، وہ حالات قلم بند کیے ہیں جو امام شافعی کو راستے میں پیش آتے رہے۔جن جن اشخاص و بزرگوں سے ان کی دورانِ سفر ملاقاتیں ہوتی رہیں ، اس کا ذکر اس میں موجود ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تمام واقعات وحالات اور سب باتیں حضرت امام شافعی کی زبانی ناظرین تک شرر نے پہنچائی ہیں اور اپنی شخصیت و ذات کی عکاسی نہیں کی۔اس کے مطالعہ سے قاری کے علم اور معلومات میں بہت حد تک اضافہ ہوتا ہے۔بعض اچھے اقوال اور اچھی باتیں جو بزرگوں ، اولیاء اور صحابہ کرام ومحدثین نے ان سے بیان کی ہیں ان سب کا ذکر اس میں موجود ہے۔سب سے پہلی ملاقات امام مالک سے ان کی ہوئی۔اس کا تذکرہ شرر نے عام فہم انداز میں کیا ہے۔حضرت امام شافعی وامام مالک کی گفتگو سے کئی سبق آموز باتیں قاری تک پہنچی ہیں ، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ ومکہ مکرمہ میں کس قسم کی محبتیں رہا کرتی تھیں۔اہل قریش اور اہل مکہ کی وضع قطع ہی ان کی پہچان کا سبب سمجھی جاتی تھی۔اس سفرنامے میں شرر نے حضرت امام شافعی کے ذوقِ علم کا منظر پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علم کے کیا فائدے ہیں اور علم کے حصول کے لیے کتنی لگن اور جستجو اور مشکلات وسفر اختیار کرنے پڑتے ہیں؟

دوسرا پہلو اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جہاں طالب علم کی طلب معنی رکھتی ہے وہاں اگر اس کو اچھے اساتذہ بھی مل جائیں تو پھر وہ کامل انسان بن سکتا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے حصول کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:۔

> میں بغیر اپنی بوڑھی ماں سے اجازت لیے علم کے شوق میں گھر سے چلا آیا تھا۔اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ والدہ کے پاس واپس جاؤں یا طلب علم میں اور سفر کروں؟'' فرمایا علم ایسی چیز ہے جس سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔کیا تمہیں نہیں خبر کہ طالب علم کے شوق پر خوش ہو کے فرشتے اس کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں۔[۹۶]

علم کی تلاش اور جستجو میں امام شافعی نے کوفہ کا سفر کیا۔ اس کا مختصراً ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی نے موطا اوسط دو کتابیں ازبر کر لیں تھیں۔ اور ایک خاص بات اس کے مطالعے سے یہ سامنے آتی ہے کہ جس کے پاس علم ہوتا ہے اس کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً جب اس کتاب میں اس پیراگراف پر نظر پڑتی ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''علم کی شان یہ ہے کہ لوگ خود اس کی طرف آئیں'' یہ الفاظ امام شافعی کے ہیں جس کی تہہ میں بہت بڑا فلسفہ چھپا ہوا ہے۔ جب امام شافعی کوفہ میں پہنچ کر مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں اور وہاں پر ایک شخص کو نماز پڑھتے ہو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ اس نے ارکان نماز اچھی طرح ادا نہیں کیے تو اسے تنبیہ کرتے ہیں اور وہ جواب دیتا ہے کہ امام محمد بن حسن اور امام ابو یوسف کے سامنے وہ اس طرح نماز ادا کرتا ہے اور انہوں نے کبھی نہیں ٹوکا۔ اتنے میں یہ دونوں بزرگ مسجد میں تشریف لاتے ہیں وہ شخص ان کو یہ بات بتاتا ہے اور پھر وہ مسجد میں آ کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

> ......اور اس نوجوان سے کہا'' جا کے ان سے کہوں کہ ہم دونوں انہیں بلاتے ہیں۔ چلیے''
> جب اس نے مجھے آ کے یہ پیغام دیا تو میں نے دل میں خیال کیا کہ کوئی علمی بات ہی مجھ سے پوچھیں گے۔ لہذا اس سے کہا'' جا کے کہو علم کی شان یہ ہے کہ لوگ خود اس کی طرف آئیں اور مجھے ان سے کوئی کام بھی نہیں ہے'' یہ جواب سنتے ہی دونوں صاحب اٹھ کے میرے پاس آئے۔[۹۷]

اس ایک فقرے میں ''علم کی شان یہ ہے کہ لوگ خود اس کی طرف آئیں'' بڑی فلسفیانہ حقیقت پوشیدہ ہے۔

شرر نے اس سفرنامے کو بھی اسی لیے قارئین تک پہنچایا ہے تا کہ ان میں بھی علم کے حصول کی لگن اور تڑپ پیدا ہو اور وہ بھی اس مقصد کو سب مقاصد پر ترجیح دیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس لیے کہ اس دور کے مسلمانوں کے لیے علم کا حصول سب سے ضروری امر تھا۔ شرر نے اپنی افسانوی اور غیرافسانوی نثر میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا کہ اسلاف کے کارناموں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے تا کہ ان کے تنِ مردہ میں زندگی کی امنگ ابھرے، اور وہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکیں۔ اس کتاب میں شرر نے حضرت امام شافعی کی زندگی کے اس رخ کو پیش کیا ہے جو کہ ایک طالب علم اور اہل علم کی تھی۔ اس مختصر سی کتاب میں بڑا گہرا فلسفہ موجود ہے۔ امام شافعی نے حصول علم کے لیے اپنی والدہ کو چھوڑا اور علم میں کامل درجہ پانے کے بعد وہ مکہ واپس آئے۔ آج بھی مسلمان اس نقش قدم پر چل کر علم کے میدان میں وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر وہ ذوق وشوق وجستجو

پیدا کر لیں جو کہ امام شافعی کے دل میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پیدا ہوئی تھی ۔ اس کتاب کا اسلوب اور انداز بیان عام فہم ہے ۔ انداز بیانیہ ہے ۔ ہر جملے ، ہر لفظ اور عبارت و پیراگراف میں دلچسپی و دلکشی ہے ۔ کئی ایک واقعات کو شرر نے موثر انداز سے لکھا ہے ۔

ابو بکر شبلی

''ابو بکر شبلی'' کو شرر نے مشاہیر اسلام نمبر ۲ میں جگہ دی ہے اور اس کتاب کا نام ''ابو بکر شبلی'' رکھا ۔ اس میں شرر نے حضرت شیخ ابو بکر رحمۃ اللہ کی سوانح عمری ، آپ کا تصوف ، آپ کے اخلاق و عادات ، جذبات ، تعلیمات اور اقران و تلامذہ پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہ کتاب ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب کو یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ شرر نے جتنی بھی چھوٹی بڑی مختصر و جامع سوانح عمریاں لکھی تھیں ۔ ان میں یہ کتاب ضخیم ہے ۔ حکیم محمد سراج الحق منیجر و پرنٹر و پبلشرز ''رسالہ دلگداز'' دلگداز پریس نے ۱۹۲۶ء میں دلگداز پریس کڑہ بزن بیگخان لکھنو سے اسے شائع کیا ۔ ''ڈیڈیکیشن'' عنوان کے تحت شرر لکھتے ہیں :

یوں تو دولت آصفیہ حیدرآباد دکن سے ہر فن اور ہر مفید کوشش کو مدد ملتی ہے مگر عالیجناب یمین السلطنت سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاؔد پیشکار و مدار المہام سرکار عالی دام اقبالہ کو جو خاص دلچسپی فن تصوف سے اور جیسی عقیدت بزرگان صوفیہ سے ہے ۔ اس کے لحاظ سے میں اپنا فرض تصور کر کے اس کتاب کو بہ کمال ادب جناب معظم الیہ کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں ۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکسار ۔ محمد عبد الحلیم شرر [98]

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ شرر کے عہد میں اسلوب کا کیا رنگ تھا؟ شرر نے اگر چہ لکھنو میں مروج اسلوب سے ہٹ کر انداز بیان اپنایا لیکن ان کی تصانیف میں کہیں کہیں لکھنوی انداز بیان بھی نظر آتا ہے ۔ تحقیق کے بعد انہوں نے یہ کتاب لکھی ۔ اس سوانح عمری کو مرتب کرتے وقت مصنف نے جو ورق گردانی اور دماغ سوزی کی ۔ اس کا ثبوت ان کا یہ بیان ہے لکھتے ہیں : ''اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ لائف کے مرتب کرنے میں کس قدر ورق گردانی اور دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے ۔''[99] اس سوانح عمری کو مرتب کرتے وقت شرر کو جن اشخاص کا تعاون حاصل رہا وہ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشکلات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنی محنت اور تگ و دو کے بعد یہ کتاب لکھی ہے :

> اگر چہ ہمیں ناشکری نہ کرنی چاہیے۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، نواب سید علی حسن خان صاحب بہادر اور مولانا محمد عبدالباری صاحب فرنگی محل نے کتابوں کے مرحمت فرمانے میں نہایت فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن پورا فائدہ اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب کتاب اپنے کتب خانے میں ہو اور جب ہمیشہ فرصت کے وقت فراغت واطمینان سے اُس پر نظر ڈالی جا سکے......[۱۰۰]

اس سوانح عمری میں شرر کے تنقیدی نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ ان کا نظریہ فن بھی اجاگر ہوتا ہے۔ اس سوانح عمری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سوانح نگار نے مآخذ پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے اور ہر صفحہ کے نیچے امدادی کتب کے نام لکھے ہیں۔ یہ واحد سوانح عمری ہے جس میں بڑے اہتمام سے مصنف نے ماخذ کو بیان کیا ہے، ورنہ ان کی دیگر سوانح عمریوں میں مآخذ کے بارے میں اتنی تفصیلات موجود نہیں ہے ۔ مآخذ کو پڑھ کر قاری کو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے یہ سوانح عمری بڑی محنت اور تحقیق کے بعد مرتب کی ہے ۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی جس کا اعتراف خود سوانح نگار کو بھی ہے وہ یہ ہے کہ:

> اس کتاب میں جن کتب سے مضامین لیے گئے ہیں ان کے صفحات بھی بتا دیئے گئے ہیں۔ اس لیے اس بات کے بتا دینے کی بھی ضرورت ہے کہ وہ کتابیں کیسی کس زمانے کی اور کس کی تصنیف ہیں آور کس مطبع کی چھپی ہوئی ہیں ......[۱۰۱]

تمہید میں شرر نے وہ محرک بیان کیا ہے جس کی بناء پر حضرت شیخ ابو بکر شبلی نے دنیاوی دولت وحشمت اور چند روزہ جاہ وجلال سے کنارہ کشی اختیار کی ۔ واقعہ یہ تھا کہ عباسی خلیفہ امیر المومنین المقصد باللہ کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ تمام والیان ملک شاہی جشن میں شریک ہوئے ۔ ایک بدنصیب انسان کو چھینک آئی اور اس کے ناک سے رطوبت نکلی اس نے خلعت سے جو ابھی ابھی خلیفہ وقت کی طرف سے عنایت ہوئی تھی ۔ ناک صاف کر لی ۔ اس پر خلیفہ ناراض ہوا اور گراں بہا خلعت ہی چھین لی بلکہ اس شخص کو گورنری کی خدمت سے بھی معزول کر دیا ۔ یہ واقعہ ابو بکر شبلی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہی وہ گھڑی تھی جس نے ان کی دنیا ہی پلٹ دی ۔ اُن کے ذہن میں جو خیال آیا وہ یہ تھا:

> ''ایک دنیوی بادشاہ کے خلعت کی بے وقعتی کرنے کی تو یہ سزا ہے لیکن وہ شخص جو سارے

عالم کے خالق (اللہ جل شانہ) کے خلعت (یعنی خلعت زندگی) کی بے وقعتی کرے اور اسے ناپاک کردے اس کی کیا سزا ہوگی؟'' یہ خیال آنا تھا کہ دل دنیاوی دولت وحشمت اور اس چندروزہ جاہ وجلال کی طرف سے کھٹا ہوگیا۔ فوراً استعفیٰ لکھ کے بارگاہ خلافت میں پیش کر دیا... ملازمت سے آزادی حاصل کر لی اور کسی ''ایسے پاک باطن شیخ زمانہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا جس کے ہاتھ پرتوبہ کرے اور جس کی تعلیم وتلقین سے یقین وعرفان کی بارگاہ ازلی میں رسوخ حاصل کرے۔[۱۰۲]

تمہید کے بعد شرر نے آپ کی ولادت، خاندان اور تعلیم، سن رشد، ملازمت و دنیوی اوج وعروج، درس گاہ معرفت، پیر اور مرید، مزاج، خصائل، اخلاق و عادات، محویت و ذوق وشوق، الہامات، صفائی باطن، ذوق سخن، آپ کے سفر، سماع ومحبت حال وقال، تعلیم اور طرز تعلیم، آپ کی مخالفت، فیض یا بانی محبت، معاصر ومرید اور آپ کی وفات پر یکے بعد دیگرے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں جو مواد شرر نے پیش کیا ہے وہ مکمل تحقیق کے بعد لکھا ہے۔ مواد کی ترتیب میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ شرر نے ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ عقیدت مندی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور قاری کی دلچسپی بھی بڑھتی ہے۔ کڑی سے کڑی ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے شرر کہیں کہیں اپنا نقطہ نظر بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اسلوب کی وہی خوبیاں ہیں جو کہ شرر سے وابستہ ہیں۔ دیگر سوانح عمریوں کے انداز پر یہ سوانح عمری بھی لکھی گئی ہے۔ شرر کی اس سوانح عمری میں دلکشی، جاذبیت، لطف زبان، حسن بیان، آمد اور بے ساختگی کا اظہار، تکلف، تصنع اور آوردہ سے گریز۔ ثقیل اور ادق الفاظ کا کم استعمال نظر آتا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس سوانح عمری کو مرتب کرتے وقت حضرت ابوبکر شبلی کی شخصیت، سیرت وکردار کو دلکش اور دیدہ زیب انداز سے بیان کیا ہے۔

شرر کی اس سوانح عمری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرر سوانح نگاری کے اصول ومقاصد سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور انہوں نے ان حالات وواقعات کو قاری کے سامنے پیش کیا جن سے وہ خود متاثر تھے، تاکہ پڑھنے والے بھی متاثر ہوں۔ شرر نے حضرت ابوبکر شبلی کی شخصیت وسیرت کے پرمعنی عناصر کو ابھارا ہے۔ شرر نے یہ سوانح عمری اس لیے لکھی تاکہ مادیت پرستی اور سائنسی ترقی کے دور میں نوجوانانِ اسلام روحانیت کے دربار میں بھی باریاب ہوں۔ انھیں احساس تھا کہ فلسفہ جدید کی مدد سے چاہیں کتنی ترقی کیوں نہ کرلیں، اصل ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے اسلاف کے کمالات سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

> طبیعات یعنی مادیات کے فنون میں یورپ نے فی الحال جوترقیاں کی ہیں وہ عالم پر چھائی جاتی ہیں ۔ بظاہر حقیقت شناسی ومعرفت کا مذاق روز بروز تنزل اختیار کرتا جاتا ہے ۔ اورنظر آ رہا ہے ... کہ علمائے باطن کے مزاروں کی شمعیں اس سائنس کے طوفان عظیم کے جھونکوں سے گل ہوا چاہتی ہیں ۔ یورپ نے ہی یونان و روم کے فلاسفہ اشرافی اور اپنے مذہبی عابد ومرتاض مقتداؤں کی سردبازاری نہیں کی ۔ بلکہ اُس کی تقلید میں نئی تعلیم پانے والے نوجوانان اسلام بھی اپنے علمائے باطن اور روحانیات و اخلاق کے باکمالان سلف سے بدعقیدت ہوتے جاتے ہیں ۔لیکن یہ یادرکھنا چاہیے کہ فلسفہ جدید کی مدد سے انسان چاہے آسمان سے تارے توڑلائے مگر انسان کامل نہیں بن سکتا۔ وہ ریل بنا کے ایک مہینہ کا راستہ ایک گھنٹہ میں طے کرسکتا ہے ۔ اڑنے والا جہاز بنا کے ہوا میں اڑسکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ روحانیت کے محترم دربار میں باریاب ہو۔[۱۰۳]

شرر نے جس عہد میں سوانح عمری لکھی ،اس دور میں مسلمانوں کی حالت ابترتھی ۔ان کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کریں ۔سوانح عمریوں کے ذریعے سے اسلاف کی شخصیت وکردار کو پیش کیا۔ان کا خیال تھا کہ جوانوں کو چاہیے کہ مغرب سے متاثر ہونے کی بجائے اپنے اسلاف سے متاثر ہوں۔اسی لیے وہ لکھتے ہیں:

> اس وقت ہمارے نوجوان بھی جو ان کی تقلید کو سرمایہ ناز خیال کرتے ہیں ۔ چمنستان باطن کی سیر کرتے ہوئے اپنے قدیم باغ معرفت میں آئیں گے ۔ اورنظر آئے گا کہ ہمارے اسلاف میں بھی ابوبکر شبلی کا ایسا عالی پایہ جویائے حقیقت گزرا ہے ۔جس کے سینے کی شمع معرفت سارے عالم کے علمائے روح کی شمعوں کو اسی طرح بے نور کیے دیتی ہے ۔جس طرح آفتاب کی روشنی میں تاروں کا نور غائب ہوجاتا ہے اوروہی زمانہ ہوگا جبکہ شبلی کا سچا مرتبہ معلوم ہوگا ۔[۱۰۴]

اس سوانح عمری کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری متاثر ضرور ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ شرر نے جس طرح حضرت ابوبکر شبلی کی شخصیت وکردار کو پیش کیا ہے وہ مثالی ہے ۔

خواجہ معین الدین چشتی

خواجہ معین الدین چشتی کی شخصیت ایک عالمگیر شخصیت کا درجہ رکھتی ہے ۔ یہ شخصیت اہل ہند کی ایک مانوس شخصیت تھی ۔ خاص طور پر مسلمانوں کے دلوں میں ان کا درجہ ، مقام اور مرتبہ بہت بلند ہے ۔ ان کی شخصیت کا عرصہ دراز سے احترام چلا آتا ہے ۔ خواجہ صاحب کے تاریخی حالات آپ کے سفر اور آپ کے مبارک ہاتھ سے ارض ہند میں اسلام کی شمع روشن ہونے اور نورعرفان کا چمکنا شرر کے لیے باعث کشش بنا۔ انہوں نے ان کو بیان کرنا قوم کے حق میں چنداں مفید سمجھا۔ دین و دنیا کی فلاح و بہبود انھیں خواجہ صاحب کی زندگی میں نظر آئی ، عرفان و نیکی کی معراج کا عکس خواجہ کی شخصیت میں دکھائی دیا ۔ انہی جذبات نے شرر کے دل میں جوش وولولہ پیدا کیا ، اور انہوں نے رسالہ ''العرفان'' میں وعدہ بھی کیا تھا۔ ''......مشائخ طریقت اور بزرگان دین کی سوانح عمریاں برابر سلسلہ وار شائع ہوا کریں گی۔''[۱۰۵] اس وعدہ کی پاسداری کرتے ہوئے شرر نے یہ سوانح عمری لکھی تھی ۔ شرر کی اس سوانح عمری میں عقیدت مندی کا اظہار جابجا نظر آتا ہے ۔ شرر کا یہ جذبہ بھی اس سوانح عمری کی تخلیق میں کارفرما ہے کہ آپ کو دین کے ابلتے ہوئے چشمے کے خشک ہونے کا افسوس ہے اور مسلمانوں کی دنیوی امارت کے لٹ جانے کا بھی غم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں احساس قومیت ، دین سے محبت ، کامیاب و کامران زندگی بسر کرنے کے جذبے کو ابھارنے کے لیے انہوں نے مشائخ کی سیرت نگاری کی تاکہ مسلمانوں کو اندازہ ہو سکے کہ دین کے اصول و ضوابط پر کاربند رہ کر انسان ولی اللہ بن جاتا ہے اور پھر پوری دنیا اس ولی کامل کی مطیع وفرمانبردار دکھائی دیتی ہے ۔ مسلمان جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس میں بہت سے کامل ولی گزرے ہیں جو نہ صرف پوری دنیا بلکہ اہل ہند کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہیں ۔ شرر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی یہ سوانح جس انداز سے لکھی ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں :

> حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ شرح مورخانہ اصول پر اختصار کے ساتھ اور نہایت سادگی سے لکھی گئی ہے ۔ نہ اس میں زیادہ کرامتیں مذکور ہیں ، نہ آپ کی تعلیموں اور آپ کی بارگاہ فیض سے فیض یاب ہونے والوں کا تذکرہ ہے ۔ صرف آپ کے صحیح صحیح حالات وواقعات مجمل طور پر بیان کردیئے گئے ہیں ۔[۱۰۶]

اس اقتباس سے ثابت ہوا کہ شرر نے یہ سوانح عمری مورخانہ اصول پر لکھی ہے ۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ مختصر اور جامع ہے ۔ اس میں سادگی کا عنصر پایا جاتا ہے ۔ شرر نے اس میں خواجہ معین الدین چشتی کی کرامات ، تعلیم اور فیوض و برکات کا ذکر بہت کم کیا ہے ۔ اس کتاب کے مطالعے سے خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات وواقعات

کا پتہ چلتا ہے۔یہ کتاب چالیس (۴۰) صفحات پر مشتمل ہے۔مختصر ہوتے ہوئے بھی اس میں جامعیت کا عنصر موجود ہے۔اس کتاب میں عنوانات موجود نہیں ہیں۔اس تصنیف کے لیے شرر نے تحقیق و جستجو سے کام نہیں لیا۔وہ خود اس کو معمولی تحریر سمجھتے ہیں۔اس لیے کہ یہ تصنیف انہوں نے اپنے رسالہ ''العرفان'' میں اشاعت کی غرض سے لکھی تھی۔بقول شرر:

> میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ایک عمدہ تصنیف کے لیے جیسی جستجو اور تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے اس رسالہ کی تصنیف میں نہیں کی گئی۔بلکہ یہ ایک بہت ہی معمولی تحریر ہے۔جو کہ ایک ماہوار رسالہ میں شائع کرنے کے لیے سرسری طور پر لکھی گئی ہے۔[۱۰۷]

اگر چہ شرر نے یہ تصنیف سرسری طور پر تیار کر کے شائع کی تھی۔لیکن پبلک میں ان کی یہ تحریر بہت ہی مقبول ہوئی۔پہلی بار اس کی ۴۰۰ جلدیں ضرورت و اشاعت سے زیادہ چھاپی گئی۔لیکن ساری جلدیں بہت جلد پبلک نے ہاتھوں ہاتھ لیں۔شرر نے اپنی زندگی ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن قدر دانوں کے ہاتھوں میں دیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس تصنیف کی طلب کے لیے خطوط شرر کو ملتے تھے۔جس کی بناء پر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا لیکن اس نئے ایڈیشن میں بقول شرر: ''کسی قسم کا تغیر و تبدل اور ردو بدل نہیں کیا گیا بلکہ یہ بعینہ اسی پہلے ایڈیشن کی نقل ہے۔''[۱۰۸]
ابتداء میں شرر اس کتاب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔اگر چہ ان ولی اللہ کے حالات متعدد رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان حالات میں اور ان حالات میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ:

> حضرت خواجہ کے حالات متعدد رسالوں کی حیثیت میں شائع ہو گئے ہیں۔اور گو نہایت مختصر اور بہت مجمل ہیں۔مگر جوش عقیدت انھیں بازار میں پھیلائے ہوئے ہے۔اسی لیے ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ولی ہند کے یہ حالات جو العرفان کے صفحوں کو برکت و عزت بخشتے ہیں زیادہ لطف و دلچسپی سے دیکھے جائیں گے۔اگر حالات میں نہیں تو طرز عبارت اور طرز بیان میں بہت کچھ جدت ہے۔اور وہ پر شوق آنکھوں کے متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔[۱۰۹]

اس تصنیف کے مطالعے سے شرر کا یہ دعویٰ پورا ہوتا نظر آتا ہے کہ جس طرز عبارت اور طرز بیان اور مؤرخانہ اصول کے تحت یہ حالات لکھے ہیں وہ دلچسپ اور متوجہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے شرر کا

تاریخی شعور بھی اجاگر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے یقین ہے کہ مشائخ اور کشف و کرامات کے جویا اس لائف کو زیادہ پسند نہ کریں گے مگر وہ لوگ جو اگلی دنیا کی ہر چیز کو مورخانہ نظر سے ملاحظہ فرماتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ رسالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔''[۱۱۰] اس کتاب میں کشف و کرامات پر بہت کم مواد موجود ہے، لیکن شرر نے جو چیز اس کتاب میں پیش کی ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ: ''غالباً آپ کی تمام سوانح عمریوں کے خلاف اس کتاب میں ان تمام ملکوں اور شہروں کی کیفیت اور تمدنی حالت وضاحت کے ساتھ نظر آئے گی۔ جن میں آپ کا گزر ہوا تھا۔''[۱۱۱] شرر نے چھٹی صدی ہجری کے درمیانی زمانہ، ہندوستان اور ساری دنیائے اسلام پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس دور کے حالات و واقعات مختصراً بیان کیے ہیں۔ شرر نے غزنویہ کے خاتمہ، خاندان غوریہ کی بنیاد کا ذکر کیا ہے کہ اس دور میں ارض ہند میں انقلاب برپا تھا۔ ایک طرف غزنویوں کا استقبال ہو رہا تھا اور دوسری طرف غوری ارض ہند کے ان علاقوں کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں پہلے کسی غیر حملہ آور قوم کی رسائی نہ ہوتی تھی۔ ہند کے برعکس ایستان اور خراسان کی حالت بہت خراب تھی۔ یہاں کسی قسم کا نظم و نسق نہ تھا۔ ایک طرف تو ملاحدہ اور باطنین تھے اور دوسری طرف پولیٹیکل جھگڑے تھے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں سلطان سنجر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

> خواجہ صاحب چھٹی صدی ہجری کے درمیانی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مختلف ممالک میں اسلام ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ جگہ جگہ خانہ جنگیاں برپا تھیں۔ وسط ایشیا تاتاریوں کی لوٹ مار اور فتنہ فساد کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان میں دولت غزنویہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس آفت خیز زمانہ میں آپ کا وطن بھی زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ تھا۔ اس علاقہ میں بھی وحشی لیڈروں کا زور تھا۔ اور ملک ان کے رحم پر تھا۔ عام تباہی اور بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہر شہر میں ملاحدہ اور فرقہ باطنیہ کی بدعات کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔[۱۱۲]

خواجہ صاحب کی پیدائش کے وقت ہندوستان اور خراسان کی کیا حالت زار تھی؟ اس کا نقشہ شرر نے صحیح طور پر کھینچا ہے۔ شرر نے خواجہ صاحب کی زندگی کے ابتدائی دور پر کم لکھا ہے لیکن اس دور کے سیاسی وسماجی صورتحال پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ شرر نے عربی تاریخوں سے مواد اخذ کیا ہے۔ ان کے عہد کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں: ''اس کی ترتیب کے وقت عربی تاریخوں میں اس عہد کے حالات پر سب کچھ غور کیا گیا ہے۔ اور اس زمانے کی سچی تصویر دکھائی دی گئی ہے۔ جن میں آپ تھے۔''[۱۱۳] شرر نے مختلف واقعات بیان کیے ہیں لیکن اس سوانح عمری میں سفر کے حالات و واقعات تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ شرر نے زیادہ زور اس پہلو پر دیا ہے کہ آپ نے کن کن علاقوں کا

سفر کیا؟ دوران سفر کون کون سے علوم حاصل کیے؟ خواجہ نے سمرقند اور بخارا اور پھر ارض مغرب کی طرف سفر کیا۔ موضع ہارون میں گئے۔ ان سفروں کے دوران آپ نے قرآن پاک حفظ کیا اور دیگر علوم ظاہری حاصل کیے۔ تفسیر وحدیث، فقہ اور دیگر فنون شریعہ و دینیہ حاصل کیے۔ آپ نے موضع ہارون شیخ عثمان یارونی سے فیض حاصل کیا اور بقول شرر: ''استدعا کی کہ آپ مجھے اپنے عقیدت کیش فیض پانے والوں اور اپنے پیروں اور مریدوں میں شامل فرمائیں۔''۱۱۴ سوانح عمری میں بعض جگہ دعائیہ انداز بھی دکھائی دیتا ہے مثلاً ایک مقام پر وہ خدا تعالیٰ سے مخاطب ہوکر لکھتے ہیں: ''خداوند ان مقدس بزرگان معرفت اور ان عالی مرتبہ جادہ پیمان حقیقت کے طفیل میں ہمارے گناہوں سے درگزر اور ہمیں ان کے انوار قدس سے فیض پہونچا، آمین۔''۱۱۵

شرر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے کمالات اور آپ کے مدارج و معارج حقیقت میں بلند مقام تک پہنچنے کی صورت حال کو موثر انداز سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''آپ نے اس زمانے میں جس قسم کی عبادتیں کیں اور جیسے جیسے مجاہدے فرمائے۔ ہمارے ہی لیے نہیں بڑے بڑے اہل اللہ اور فرشناسان حقیقت کی نظر میں بھی قابل حیرت ہیں۔''۱۱۶

خواجہ صاحب نے بغداد کا بھی سفر کیا۔ شرر نے شہر بغداد کو علم وفضل کا مرکز ومنبع قرار دیا ہے۔ شرر نے مختلف روایات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور اس روایت کو غلط ثابت کیا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے جو لکھا ہے۔ آپ سے حضرت غوث الاعظم و شیخ عبدالقادر جیلانی کی بھی ملاقات ہوئی تھی۔ شرر نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب خواجہ صاحب بغداد تشریف لے گئے تھے تو اس سے قبل ہی شیخ عبدالقادر جیلانی کا وصال ہو چکا تھا۔ شرر نے بغداد کی صورت حال اور خلافت عباسیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

خواجہ صاحب نے جہاں جہاں کا سفر کیا شرر جب ان کے سفروں پر روشنی ڈالتے ہیں تو ان جگہوں کی تاریخی صورتحال کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جس کے مطالعے سے اس دور کی سیاسی صورتحال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شرر نے خواجہ صاحب کے مختلف اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ معرفت کے راستے کی بھی کئی ایک منازل ہیں۔ شرر نے ان پر روشنی ڈالتے ہوئے پہلی منزل سلوک بتاتی ہے۔ جس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے سرزمین ہندوستان میں قدم رکھا اس وقت کی صورت حال پر شرر نے مؤرخانہ نظر ڈالی ہے۔ اور خاص طور پر ہندوستانی بت پرستی کا تذکرہ چھیڑا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں آکر حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے قیام کیا۔ ہندوستان کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ محمد اکرم رقمطراز ہیں۔

......آپ کے آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں کفرو بت پرستی کا رواج تھا۔ اور ہند کا ہر ایک سرکش ''انا ربکم الاعلیٰ'' کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتا تھا اور وہ سب پتھر، ڈھیلے، درخت، چوپائیوں اور گائے اور ان کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے۔ اور کفر کی تاریکی سے ان کے دلوں کے تالے اور بھی مضبوط ہو رہے تھے۔۱۸"

ان کے قیام کے محرکات پر شرر نے روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان کے سوا اور کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں کے لوگ زیادہ گمراہ کن زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے یہ صورت حال دیکھی ہوگی تو ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟۔ یہی سب سے بڑا محرک تھا۔ جس نے خواجہ صاحب کو یہاں قیام پر اکسایا۔ شرر نے اس محرک کو اپنے انداز سے یوں بیان کیا ہے۔

......ایک حقیقت شناس صاحب معرفت اور دریا وحدت میں ڈوبے ہوئے ولی اللہ کے دل پر یہ حالت دیکھ کے کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسے یقیناً نظر آیا ہوگا۔ کہ اس سے زیادہ کوئی ملک ہدایت کا محتاج نہیں اور حق پرست کا پہلا فرض یہی ہے کہ ان بندگان خدا کی ہدایت و دستگیری کرے اور انھیں عذاب آخرت کے اندیشوں سے چھڑا کے نجات کا امیدوار بنائے۔ چنانچہ یہ خیال دل میں آتے ہی حضرت خواجہ کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اور وہ ولی اللہ جس کی اتنی زندگی ادھر اُدھر جانے شہروں شہروں پھرنے اور دشت و در کی خاک چھاننے میں بسر ہوئی تھی اور جس کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ کسی جگہ ایک مہینے کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اس کی یہ حالت ہوگئی کہ بلا تامل ہندوستان میں ٹھہر نے ایک جگہ جم کے بیٹھے اور خدا کے بندوں کو اس کی راہ راست کی طرف متوجہ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔۱۹"

شرر نے اس سوانح عمری میں خواجہ صاحب کے قیام کے بارے میں لکھا ہے چاہے وہ قیام زیادہ دیر کے لیے تھا یا مختصر عرصے کے لیے سب جگہوں کے بارے میں بھی تھوڑا بہت لکھا ہے۔ مختلف شہروں، مختلف ملکوں جہاں جہاں سے خواجہ کا گزر رہا اس کی تاریخ ان جگہوں کی سیاسی وتمدنی صورت حال پر سوانح نگار نے روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان میں تین جگہوں سے خواجہ کا گزر رہا۔ لاہور، دہلی اور اجمیر ان تینوں کے بارے میں شرر نے اپنے خاص انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ شرر نے ان اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ لاہور کی جگہ دہلی اور پھر دہلی کی جگہ اجمیر خواجہ کا مسکن ٹھہرا۔ شرر نے ہندوستان کی حالت زار کا ذکر دل سوز انداز میں کیا ہے۔ دہلی میں خواجہ صاحب کے طرز تبلیغ پر بھی روشنی

ڈالی ہے۔اس عہد میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعصب کی فضا برقرار تھی۔اس کا اندازہ بھی اس سوانح عمری سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔پوری کتاب کے مطالعے سے صرف ایک ہی مآخذ کا پتہ چلتا ہے۔تاریخ فرشتہ کے علاوہ کسی کتاب کا ذکر نہیں ہوا ہے۔آپ کے سفروں اور قیام اجمیر کے متعلق شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> بغداد، ہرات، تبریز، بلخ سے ہوتے ہوئے حضرت خواجہ غزنی کے رستے ہندوستان آئے اور پہلے لاہور پہنچے۔مشہور ہے کہ یہاں آپ نے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی۔لاہور سے (بقول بعض تذکرہ نگاران) آپ ملتان تشریف چلے گئے۔جہاں آپ نے طویل قیام کر کے ہندوستانی زبان میں مہارت کاملہ حاصل کی۔اس کے بعد آپ دہلی آئے۔اور تھوڑا عرصہ یہاں قیام کر کے اجمیر کا رخ کیا۔جو ابتداء میں اجمیر و دہلی کے راجہ کا دارالخلافہ اور دہلی سے بھی زیادہ اہم مقام تھا۔[۱۴۰]

سوانح عمری میں آپ کی کرامتوں، آپ کی تعلیم اور بارگاہ فیض پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔زیادہ تر آپ کے سفر و سیاحت کا ذکر ہے۔ان شہروں کے بیان میں وہاں کے حاکموں، وہاں کی سیاسی صورت حال اور تہذیب وتمدن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔زیادہ جستجو اور تحقیق وتنقید کا پہلو یہاں نظر نہیں آتا۔شرر نے ان کے سفر کے حالات وواقعات بیان کیے۔لیکن آپ کے صاحب دیوان ہونے پر روشنی نہیں ڈالی۔ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی تھا، جس سے اکثر لوگ ناواقف تھے۔آپ شاعر بھی تھے، آپ کے اشعار کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے۔فارسی شعراء کے مشہور تذکرہ ''آتش کدہ'' میں آپ کی دو رباعیات موجود ہیں۔سید الیاس رضوی لکھتے ہیں:

> حضرت خواجہ اجمیری کی متعدد سوانح عمریاں وقتاً فوقتاً مختلف مصنفین نے لکھی ہیں۔اور وہ اپنے اپنے رنگ میں غنیمت ہیں۔لیکن اس جدید معیار پر وہ پوری نہیں اتر سکیں۔وہ صرف حضرت خواجہ بزرگ کی زندگی کے واقعات سے پر ہیں لیکن ان سے خواجہ بزرگ کی زندگی کے مقصد اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ان سے بعض ایسے واقعات بھی مفقود ہیں جو موجودہ زمانہ میں ایک لائف کے لیے ضروری ہے۔ایک ایسے بزرگ رہنما کی لائف جو ہندوستان میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا آفتاب ہوا ہے۔ان واقعات سے بالکل خالی ہو جو اس کی زندگی کا نصب العین تھے اور جس کے لیے اس نے اپنی عمر گرانمایہ صرف کی۔[۱۴۱]

حضرت خواجہ اجمیر علیہ الرحمۃ کے اسلامی کارنامے آج بھی مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت اور دعوت عمل کا ثبوت دے رہے ہیں۔

حسن بن صباح

زندگی کا سب سے عمدہ سبق نیکیوں کا قبول کرنا اور برائیوں کے نتائج سے خبردار ہونا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ برائیاں ہر انسان کی زندگی کے واقعات میں موجود ہے۔ایک کی زندگی دوسرے کے لیے عبرت کا تازیانہ بن سکتی ہے۔یہی سبب ہے کہ مہذب قوموں میں ہر طبقہ، ہر پیشہ اور ہر جنس کے لوگوں کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے۔ اور کوئی لائف ایسی نہیں ہوتی جس سے سبق نہ ملتا ہو۔اور وہ گرد و پیش کے انسانوں کے برے بھلے افعال سے متاثر بھی ہوتا ہے۔اس کی نیکیوں اور برائیوں کا موازنہ و تقابلہ کرتا ہے اور ان کے نتائج پر غور کرنے کے بعد وہ اس بات پر آمادہ ہوجاتا ہے کہ جن افعال کے مفید نتائج ہیں ان کی تقلید کرے اور برے نتائج سے احتراز کرے۔اسی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی قوم اور کسی بھی فرد کے لیے ہدایت اور عبرت کے کافی نمونے سوانح عمریوں میں پائے جاتے ہیں۔انہی سے زندگی کی ہر منزل اور ہر حالت کی رہبری و رہنمائی ملتی ہے۔اسی سبب سے کہا جاتا ہے کہ سوانح نگار کو اپنے ہیرو کی خوبیوں اور نیکیوں کے ساتھ ساتھ اس کے عیبوں اور برائیوں کو بھی پیش کرنا چاہیے۔تاکہ پڑھنے والے جہاں اس کی خوبیوں اور بھلائیوں سے متاثر ہوں وہاں اس کے عیبوں اور بدیوں سے بھی متنفر ہوں۔

شرر نے ''حسن بن صباح'' کی شخصیت، سیرت، کردار اور اس کی زندگی کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔یہ کتاب ۶۴ صفحوں پر مشتمل ہے، اور نہایت صفائی اور لطافت و خوبی اور نفاست سے چھاپی گئی ہے۔یہ کتاب حافظ محمد الدین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے چھاپ کر شائع کی۔شرر نے اس کتاب میں حسن بن صباح کی زندگی، مذہب باطنیہ اور اس کے اصول اور اسماعیلیوں کے عقائد کا ایک واضح اور مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔

شرر نے ایک ناول ''فردوس بریں'' بھی فرقہ باطنیہ کی مختصر تاریخ۔ان کے عقائد۔ان کی سازشوں کے احوال و طریقہ کار اور ان کی تباہی کے واقعات کے بیان میں لکھا ہے۔شرر کا یہ ناول فرقہ باطنیہ کے زمانہ عروج کے احوال پر مبنی ہے۔جس کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں: ''فردوس بریں ......جس میں اس فرقہ زنادقہ باطنیہ کی پوری سرگزشت آ گئی ہو۔''[۱۲۲] ''فردوس بریں'' انیسویں صدی کے ان چند یادگار ناولوں میں سے ایک ہے جنھوں نے اردو نثر کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔شرر کے اس ناول میں ایران کے فرقہ باطنیہ کی تباہ

کاریوں کی لرزہ خیز داستان قلم بند کی گئی ہے اوران کی سیہ کاریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔یہی وہ ناول ہے جس کی بناء پر انھیں ممتاز مقام ومرتبہ نصیب ہوا۔فرقہ باطنیہ کیا تھا؟اس کے متعلق مختلف مؤرخین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔شرر نے ''فردوس بریں'' میں اس فرقہ باطنیہ اوراسماعیلیوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات فراہم نہیں کی ہیں۔لیکن ''حسین بن صباح'' کی سوانح عمری کے مطالعے سے شرر کا یہ دعویٰ زیادہ تر پورا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

حسن بن صباح کی لائف مذہب باطنیہ کے اصول اور اسماعیلیہ کے عقائد کا ایک نہایت واضح اور مختصر خاکہ امید ہے کہ ان گذشتہ بیانات سے ہمارے ناظرین کے ذہن میں پیدا ہو گیا ہوگا اور وہ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ ان تیرہ سو برس کے اندر اسلام کو کیسے کیسے انقلابات کی مصیبت اٹھانا پڑی۔اور کس کس طرح سے فرقوں کی بنیاد ڈالی گئی۔[۱۲۳]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سوانح عمری کو شرر نے کس مقصد کے تحت لکھا اوراس میں انہوں نے کیا کیا موضوعات بیان کیے ہیں؟حسن بن صباح کی زندگی اوراس کی شخصیت وکردار کا مرقع، مذہب باطنیہ کے اصول،اسماعیلیوں کے عقائد کا بیان۔شرر یہ بات باور کروانا چاہتے ہیں کہ اسلام کو کیسے کیسے انقلابات کا سامنا کرنا پڑا؟کن کن فرقوں نے اس دین میں جنم لیا؟ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام کی حیثیت ومرتبہ ومقام کس طرح متاثر ہوا؟مولانا شرر بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھے۔دین اسلام اوراس کے مسائل سے انھیں خاص رغبت تھی، پرستاران اسلام کا وہ خاص احترام کرتے تھے۔اوران کے کارناموں کا بھی کلمہ پڑھتے تھے۔اس لیے کہ انھیں اسلامی روایات واقدار سے عشق تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سوانح عمریوں میں اسلامی تاریخ کے واقعات، بزرگان دین، سرفروشان اسلام کی جرأت وبہادری، رحم وانصاف، ایثار ومحبت اوران کی اعلیٰ خدمات کو پیش کیا ہے۔جہاں انھوں نے اسلام کی سربلندی اوراس کی ترقی کے واقعات قلم بند کیے ہیں وہاں انھوں نے ان واقعات پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے،جن کی وجہ سے اسلام پر حرف آیا۔اس سوانح عمری میں انہوں نے فرقوں اور خاص طور پر فرقہ باطنیہ کی ابتداء اوراس کے عروج وانتہا کی داستان قلم بند کی ہے۔

حسن بن صباح کی ساری کارگزاریوں کو شرر نے مخصوص انداز سے اس سوانح عمری میں پیش کیا ہے اور اس انداز سے پیش کیا ہے کہ کتاب کے مطالعے کے بعد قاری فرقہ باطنیہ اوراس کی کارگزاریوں سے جہاں آگاہ ہوتا ہے وہاں حسن بن صباح کی ذات وشخصیت کے اچھے اور برے پہلوؤں سے بھی آشنا ہوتا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے اس دور کی تاریخ،اس دور کے بادشاہوں اوران کے حالات وواقعات کا بھی پتہ چلتا ہے۔حسن بن

صباح ۳۵ سال تک قلعہ الموت پر قابض رہا۔ مرنے سے پہلے اس نے قلعہ دارالموت کے بزرگ امید کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ شرر نے اس کتاب میں باطنیوں کے سربراہوں کے بارے میں بھی مختصراً لکھا ہے۔ حسن بن صباح کے بعد بزرگ امید، اس کے بعد محمد بن گیابزرگ، پھر حسن بن محمد، باطنیوں کے سربراہ رہے۔ اس کے بعد محمد ثانی تخت نشین ہوا، جس کو اس کے بیٹے جلال الدین حسن ثالث نے زہر دے کر مار ڈالا اور خود تخت پر قابض ہو گیا۔ حسن ثالث کے بعد محمد ثالث علاؤالدین تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے باپ کو زہر پلا کر یہ تخت حاصل کیا۔ اس سوانح عمری کے مطالعے کے بعد چند نکات واضح ہوتے ہیں۔

۱۔ حسن بن صباح کی ابتدائی زندگی، تعلیم، ماحول، خاندان وغیرہ کے متعلق معلومات۔

۲۔ حسن بن صباح کے پیرو کاروں کا گروہ فرقہ باطنیہ کہلاتا تھا۔

۳۔ یہ فرقہ اسماعیلیہ کی ایک شاخ تھا۔

۴۔ اس فرقے کے عقائد اسلامی عقائد سے مختلف تھے۔

۵۔ اس فرقے کے عقائد کی تبلیغ خفیہ طور پر کی جاتی تھی۔

۶۔ یہ فرقہ باطنیہ اس لیے کہلاتا تھا کہ اس کے ماننے والوں کا یہ بنیادی عقیدہ تھا کہ ہر حکم ظاہری کا ایک باطن ہوتا ہے۔

۷۔ یہ فرقہ داعی، رفیق اور فدائی تین مختلف درجات کے حامل اراکین پر مشتمل تھا۔

۸۔ فدائیوں کے ہاتھوں ڈیڑھ سو سال تک مشاہیر اسلام کو نقصان پہنچا۔

اس سوانح عمری کے متعلق شرر لکھتے ہیں:

> ......جس کی ہم اس وقت لائف لکھنا چاہتے ہیں اور جس کو مسلمان وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھیں مگر سچ یہ ہے کہ اس کا نمبر دونوں ہم سبقوں سے بڑھا ہوا تھا۔ خود نظام الملک حسن بن صباح کی طبیعت سے واقف تھا اور کہا کرتا تھا کہ عنقریب یہ شخص ضعیف الاعتقادوں اور عوام کے لوگوں کو بہکا کے بہت خراب کرے گا۔[۱۴۴]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی لائف اور اس کے کارناموں کو مسلمان حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے سادہ لوح لوگوں کو ایک تو بہکایا تھا اور دوسرا دین اسلام کو نقصان پہنچایا تھا،

فرقہ بندی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔اس سوانح عمری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مختلف مؤرخوں اور تاریخ کے حوالے یہاں موجود ہیں اور مذاہب کے بارے میں بھی وسیع مطالعہ کا ثبوت اس کتاب سے ملتا ہے۔حسن بن صباح کی سیرت و کردار اور اس کی شخصیت کی مکمل اور جامع تصویر قاری کے سامنے ابھرتی ہے۔اس کی تمام سرگرمیوں کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔شرر کی تاریخ سے دلچسپی یہاں بھی موجود ہے۔جس طرح تاریخی ناولوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو تاریخ عالم اسلام سے آگاہ کیا ہے وہی نقطہ نظر یہاں بھی کارفرما ہے۔صلاح الدین کی کارروائیوں کا تذکرہ شرر نے یہاں چھیڑا ہے تا کہ وہ یہ بات اپنے قاری کو باور کرا سکیں کہ اس شخص نے بھی بالآخر ان سے ہار مان لی تھی۔صلیبی جنگوں کا ذکر بھی اس سوانح عمری میں ملتا ہے۔اور یہ ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ شرر کی تاریخ سے رغبت اور دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔آخر کار تاتاریوں کے ہاتھوں اس فرقہ باطنیہ کا قلع قمع ہوا۔ہلاکو خان کی سربراہی میں لشکر کی روانگی کا ذکر شرر کی تاریخ سے دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں مختلف مورخین کا ذکر بھی شامل ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر نے مختلف تاریخی کتب سے استفادہ کیا ہے۔اسماعیلیہ مذہب اور فرقہ باطنیہ کے خاتمے کو شرر نے موثر انداز سے بیان کیا ہے۔"حسن بن صباح" کی سوانح عمری میں جہاں باطنیوں اور اسماعیلیوں کی طاقت اور اثر و رسوخ شام، عراق اور ایران میں شرر نے دکھایا ہے۔وہاں انہوں نے یہ بھی اپنے ناظرین کو بتایا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں یہ مذہب کیسے پھیلا اور کس دور میں یہ مذہب یہاں آیا؟

اسلامی سوانح عمریاں

عبدالحلیم شرر کی سوانح عمریوں کی ایک کتاب جس کا نام اسلامی سوانح عمریاں ہے وہ بھی ان کے فن سوانح نگاری کا بین ثبوت ہے۔یہ کتاب وحید بک سینٹر لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔کتاب ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کو "اسلامی سوانح عمریاں" کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں شرر نے مسلمانوں کے نامی گرامی اسلاف کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ان کی دیگر کتب اور اس میں بنیادی امتیاز یہ ہے کہ باقی کتابوں میں ہر مذہب وملت کے افراد کے حالات و واقعات شرر نے لکھے ہیں۔لیکن اس کتاب میں جتنے بھی اشخاص شامل ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔اس کتاب میں ۱۶ (سولہ) اشخاص کی سوانح عمریاں شامل ہیں۔جن اشخاص کو اس کتاب میں جگہ دی گئی ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ابواسحاق شیرازی ،۲۔قاضی ابو یوسف ،۳۔ابن صائغ اندلسی ،۴۔ابو علی فارسی ،۵۔ابو حیان غرناطی ،۶۔ابن سمعون ،۷۔ابوبکر خطیب بغدادی ،۸۔ابوالفرج بن جوزی ،۹۔ابراہیم حربی ،۱۰۔ابوالعیناء ،۱۱۔قاضی ابن ابی لیلی ،۱۲۔ابوعثمان خالدی ،۱۳۔ابوحاتم سجتانی ،۱۴۔ابراہیم موصلی ،۱۵۔عبداللہ ابن مبارک ،۱۶۔ابوعلی ابن مسکویہ

بقول سید الیاس رضوی: ''اکابرین ملت کی سوانح عمریاں لکھنے اور پڑھنے کا خاص مقصد یہی ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو اور ہم ان کی اس سنت کو زندہ رکھیں جس کے لیے اس قدر ایثار و قربانیاں دیں۔''[۱۲۵]

یوں لگتا ہے کہ عبدالحلیم شرر نے بھی یہ سوانح عمریاں اسی خاطر لکھی ہیں ۔کہ ان کی زندگیاں ہمارے لیے سبق آموز ہوں اور ہم ان کے نقش قدم پر چل کر ترقی کریں ۔شرر کے عہد میں مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ ناگفتہ بہ تھی وقت کا تقاضا تھا کہ انھیں اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کیا جائے تا کہ وہ یہ جان سکیں کہ ان کے آباؤاجداد میں کیا کیا خوبیاں تھیں؟ وہ کون سے کمالات تھے؟ جن کی وجہ سے انہوں نے دنیا میں اپنا نام روشن کیا تھا۔

شرر نے ان حالات وواقعات کو معتبر اور مستند مورخین کی کتب اور دیگر مصنفوں کی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد پیش کیا ۔انہوں نے کتاب مستظری ۔موفق حنفی محب الدین بن بخار کی کتاب تاریخ بغداد کا ذکر اس سوانح عمری میں کیا ہے اور جب وہ یہ جملہ لکھتے ہیں کہ ''وہ تمام کتابیں جن کے مصنفوں کو دنیا نے اعتبار و اسناد کے خلعت دیئے سب ان کے تذکرے کمالات اور علوم سے بھری پڑی ہیں''۔[۱۲۶] تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شرر ان کے بارے میں وسیع مطالعہ رکھتے تھے ۔مختلف کتب کے مطالعے کے بعد انہوں نے یہ سوانح عمری لکھی ہے ۔شرر نے ابواسحاق شیرازی کی علمی حالت ، ان کی شہرت و ناموری ، ان کے اساتذہ ، حصول علم کی خاطر دور دراز کے سفر ، بغداد میں ان کی قیام پذیری پر روشنی ڈالی ہے ۔شرر نے جو مواد اس سوانح عمری میں پیش کیا ہے وہ مختلف تاریخی کتب سے اخذ کر کے پیش کیا ہے ۔اس سوانح عمری میں یافعی کی تاریخ ،مراۃ الجہان ، ابن اثیر اور دیگر مورخین کے بیانات ۔ابن جوزی کی تاریخ منتظم وغیرہ کا حوالہ بھی موجود ہے ۔شرر نے ان کی مختلف حیثیات کو بیان کیا ہے ۔یہ مدرسہ نظامیہ کے مدرس اعلیٰ تھے ۔جس طرح شرر نے بطور استاد ان کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے ۔اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں ، کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں اساتذہ میں کیا کیا خوبیاں تھیں اور کیسے کیسے عالم و فاضل ہستیاں مسلمانوں میں گزر چکی ہیں ۔آج بھی مسلمان ان کے نقش قدم پر چل کر بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں ۔

قاضی ابو یوسف یہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے اور اعلیٰ پائے کے عالم تھے ۔شرر نے ان کے ابتدائی

حالات ، ایام طالب علمی کی تکلیفیں ،علم کی لگن اورتڑپ ، رشید کے دربار میں رسائی ، بطور قاضی ان کی خدمات کا بیان اوران کی تصانیف پر روشنی ڈالی ہے ۔اس مختصر سی سوانح عمری میں شرر نے اس انداز سے ہر پہلو کو بیان کیا ہے کہ ان کی شخصیت وکردار کا ایک واضح تصور قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے ۔شرر نے جس انداز سے یہ سوانح عمری لکھی ہے وہ ایک بہترین نمونہ قرار دی جاسکتی ہے ۔عام فہم الفاظ اوردلکش انداز میں انہوں نے تاریخی کتابوں سے مواد اخذ کر کے پیش کیا ہے ۔انہوں نے بعض ایسے جملے اور ایسے پیراگراف اس سوانح عمری میں لکھے ہیں جن سے ان کی حیثیات پر موثر طریق سے روشنی پڑتی ہے ۔ان کے مقام ومرتبہ کا پتہ چلتا ہے ۔لکھتے ہیں:

> امام ابو یوسف آخر عمر تک بغداد کے قاضی القضاۃ چیف جسٹس رہے ۔اسلامی دنیا میں یوں تو بہت بڑے بڑے صاحب ثروت وحکومت علماء ہوئے ہیں مگر امام ابو یوسف میں یہ ایک ایسی بات ہے کہ اور علماء میں کم نظر آئے گی یعنی باعتبار دولت وہ اپنے عصر کے تمام علماء سے زیادہ صاحب ثروت تھے ۔اور باعتبار حکومت خیال کیجئے تو ساری دنیائے اسلام ان کے قبضہ میں تھی ......خلاصہ یہ کہ وہ ایک عالم تھے ۔جن کو خدا نے ہر طرف کامیاب کیا اور واقعی امام اعظم علیہ الرحمۃ کے ایسے امام کے لیے ایسے ہی شاگرد کی ضرورت تھی ۔[۱۲۷]

ابن صائغ اندلسی ان کا ذکر بھی تاریخوں اور تذکروں میں موجود ہے ۔ یہ ایک عالم تھے ۔شرر نے ان کی سوانح عمری میں اس نقطہ نظر کو بیان کیا ہے ۔

> ابتداءتو فلاکت زدگی نے اسے بام ناموری کے اسٹیج پر نہ آنے دیا ۔لیکن آخر میں جب اس نے اپنی علمی رفعت کا سکہ ہر دل پر بٹھا دیا تو ایسی نیک نامی حاصل ہوئی کہ آج تک تمام تاریخیں اور سب تذکرے اس کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں ۔[۱۲۸]

ان کا نام ابوبکر محمد بن صائغ تھا ۔شرر نے ان کی سوانح عمری بھی اس طرز پر لکھی ہے ۔جس طرز پر دیگر سوانح عمریاں لکھی ہیں ۔تاریخی کتب کے مطالعے کے بعد انہوں نے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہ گیارہ صفحات پر مشتمل حالات وواقعات ہیں جن کو شرر نے خوبصورت اسلوب کا جامہ پہنایا ہے ۔

''ابوعلی فارسی'' ابو حیان غرناطی وغیرہ کی سوانح عمریاں بھی شرر نے عربی تاریخوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہیں ۔''ابن سمعون'' کی سوانح عمری میں شرر نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ:

جب ابن سمعون آیات و احادیث کا وعظ کیا کرتے اور عذاب الٰہی کا نمونہ دکھانے لگتے تھے ۔ اس وقت لوگوں کی رقت قلب کا یہ عالم ہوتا تھا کہ وہ شخص جس کا دل سخت سے سخت ہوتا تھا وہ بھی زار و قطار روتا تھا اور تمام دنیاوی دلچسپیاں اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتی تھیں ۔[۱۶۹]

شرر نے ان کی زندگی کے اس پہلو پر نمایاں طور پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے حالات وواقعات کو بھی عربی کتب تاریخ سے اخذ کر کے لکھا ہے ۔ ''ابوالفرج بن جوزی'' ''ابراہیم حربی'' ''ابوالعینا'' ''قاضی ابن ابی لیلیٰ'' ''ابوعثمان خامدی'' ''ابو حاتم سجتانی'' ''ابراہم موصلی'' ''عبداللہ ابن مبارک'' ''ابوعلی ابن مسکویہ'' یہ تمام اشخاص جن کی سوانح عمریاں شرر نے لکھی ہیں ۔ یہ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے علم وفضل اور کمالات وفضائل سے ایک پوری دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا ۔شرر نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ۔ بلکہ تمام حالات وواقعات عربی کی تاریخی کتب سے اخذ کیے ہیں لیکن اس انداز سے لکھے ہیں کہ اس عہد کی یاد تازہ ہوجاتی ہے ۔اس دور کے سیاسی وسماجی ثقافتی حالات و واقعات کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ان نامی گرامی ہستیوں کی سیرت وکردار کے تمام پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ان سوانح عمریوں کو پڑھ کر قاری جہاں محظوظ ہوتا ہے وہاں تھوڑی دیر کے لیے وہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے ۔کہ آج کے دور میں ایسی باکمال ہستیاں مسلمانوں میں کیوں جنم نہیں لے رہی ہیں ۔انسان کا ذہن اس طرف بھی رُخ کرتا ہے کہ آج بھی اگر مسلمان نوجوان اپنے اندر ان علماء وفضلا اور باکمال ہستیوں جیسی صفات وکمالات پیدا کرلیں تو پھر عہد قدیم کی یاد تازہ ہوسکتی ہے ۔سوانح نگار کے لیے جن خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے ۔اس کتاب کے مطالعے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شرر میں بھی یہ ساری خوبیاں موجود تھیں ۔ یہ کتاب نہ صرف ان کے دور میں بلکہ آج کے دور میں بھی ویسی ہی مقبول ہے ۔آج بھی یہ کتاب ہمیں دعوت غور وفکر دے رہی ہے ۔

صد پارۂ دل رشاہکار شرر

یہ کتاب دو ناموں سے مشہور ہے ۔''صد پارۂ دل'' اور ''شاہکار شرر'' اس کتاب کے دو مختلف نام ہیں ۔ بعض لوگوں نے ان کو دو الگ الگ کتب قرار دیا ہے ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں ۔اس کتاب کے مؤلف بھی عبدالحلیم شرر ہیں ۔اس کو الحاج سید ظہور الحسن صاحب نے اپنے قومی کتاب خانہ اردو بازار

جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔ اس پر سن موجود نہیں یہ کتاب ۲۴۳ صفحات پر مشتمل ہے ۔فہرست مضامین کتاب درج ذیل ہے ۔ ابوالاسود دُولی، ابن القرا قر شلمغانی، الحکم المستنصر ،محمد ابو عبداللہ ازقیر،عمرو بن معدی کرب زبیدی، منذر بن مغیرہ ، احمد بن طولون ، نابغہ زیبانی ،حجاج ،ابوالضحاک ،سمسون ، دمشقی مہوس،سکندر اعظم ،سکندر کا تابوت،مسجد یاصوفیہ،غیر مسلم سیاحان بیت المقدس،مسجد اقصیٰ

شرر نے ۱۳ (تیرہ)اشخاص کے حالات وواقعات بھی قلم بند کیے ہیں ۔ان کا جائزہ ہم باب سوانح نگاری کے ضمن میں لے سکتے ہیں ۔شرر نے جو کچھ لکھا ہے تحقیق کے بعد لکھا ہے ۔تاریخی کتب کے مطالعے کے بعد انہوں نے وہ مواد قاری کے سامنے پیش کیا ہے جس سے وہ خود متاثر ہوئے ہیں ۔ابوالاسود دُولی عربی نحو وصرف کے موجد اور بانی تھے ۔شرر نے بڑی محنت اور لگن وجستجو کے بعد ان کے حالات و واقعات قلم بند کیے ہیں ۔شرر نے ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان کی خوبیوں اور خامیوں سے ناظرین کو آگاہ کیا ہے لکھتے ہیں ۔

> ابوالاسود مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ میں شمار کیے جاتے تھے ۔ اور تمام باتوں میں اقران و معاصرین سے ممتاز وافضل تھے ۔وہ تابعی تھے ،فقیر تھے ،محدث تھے ،شہسوار تھے ۔معزز درجہ کے امیر اور دولت مند تھے ۔علم نحو میں ، دانائی میں ، حاضر جوابی میں اور حضرت علی کی طرف داری میں مشہور تھے ۔مگر ان صفات کے ساتھ ان کے چند عیوب بھی لوگوں میں بہت شہرت رکھتے تھے ۔ایک تو ان کا بخل ، دوسرے ان کے منہ سے بوکا آنا اور تیسرے ان کا گنجا ہونا ۔لوگوں میں ضرب المثل ہو گیا تھا۔[۱۳۰]

شرر نے ان کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ اس کے مطالعے سے قاری میں بیداری کی لہر دوڑتی ہے ۔خوبصورت اور دلکش اسلوب میں شرر نے یہ سوانح عمری لکھی ہے ۔حسن بن صباح ،عبداللہ بن تومرت ملیدی المغربی اور دیگر بہت سے لوگ تاریخ میں گزر چکے ہیں جنھوں نے نئے نئے مذہب اور عقائد وشریعت کی بنیاد ڈالی ۔انہی میں سے ایک شخص ابن القراقر شلمغانی بھی تھا جس کو شرر نے اس کتاب میں جگہ دی ہے تا کہ اس کے حالات وواقعات ،اس کے مذہب وعقائد اور اس کی شریعت کی تفصیلات پڑھ کر انسان عبرت حاصل کرے ۔ شرر لکھتے ہیں :

> شلمغانی کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق جنت دوزخ کوئی چیز نہ تھے ۔صرف ان

کے مذہب حقہ کے ماننے اور اس کی معرفت کا نام جنت تھا۔ اور اس کے مذہب سے انکار کرنے اور اس کے اصول سے جاہل رہنے کا نام دوزخ ہے۔ ملائکہ سے ان کے عقائد میں ہر وہ شخص مراد تھا جو عارف حق اور اپنے نفس کا مالک ہو۔[۱۴۱]

الحکم المستنصر کے بیان میں شرر نے اس خلیفہ کے علمی ذوق وشوق کی داستان قلم بند کی ہے۔ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ:

ابتدائے عمر سے اسے علم کا بڑا شوق تھا۔ دنیا کے تمام عیش در کنار اسے حکمرانی و فتح مندی میں اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ کتابوں کے جمع کرنے اور ان کے مطالعہ میں تھی۔ اس بات کی دھن تھی کہ دنیا بھر کی عربی کتابیں اس کے کتب خانے میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ اس کو مسلسل کوششوں سے شاعری، ادب، دینیات و اخلاق، تاریخ وجغرافیہ اور تمام علوم وفنون کی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جو دنیا کے کسی شہر میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس کے نائب اور ایجنٹ کتابوں کو تلاش کرتے ہوئے ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اور اسی مضمون کے نامہ و پیام لے کے اس کے سفیر افریقہ، مصر، شام، عراق اور فارس وعرب اسلامی درباروں میں پہونچے اور انہیں عام اجازت حاصل تھی کہ جتنا روپیہ درکار ہو خرچ کریں مگر کسی قیمتی کتاب کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔[۱۴۲]

شرر نے اس خلیفہ کی علم دوستی کو اس لیے واضح کیا ہے تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کے بادشاہوں میں بھی ایسا بادشاہ گزر چکا ہے جو علم دوست بھی تھا اور عربی ادب وشاعری کا قدردان بھی۔ وہ خود بھی بہت بڑا عالم و ادیب تھا۔ تصنیف وتالیف میں اور کتب بینی میں جتنا انہاک اس کو تھا شاید دنیا میں کسی اور بادشاہ کے حصے میں نہیں آیا۔ آج کے دور میں بھی اگر مسلم بادشاہوں کی سوچ ایسی ہو جائے تو مسلم دنیا کی کایا ہی پلٹ جائے۔

محمد ابوعبداللہ الزقیر یہ غرناطہ کا شاہ تھا۔ اس کے ضمن میں شرر نے وہ حالات لکھے ہیں جس کی وجہ سے شاہ کٹیل غرناطہ کی سرزمین کا مالک بن گیا۔ عمر بن معدی کرب زبیدی۔ یہ نامی گرامی شجاع اور نامی شہسوار تھے۔ زمانہ جاہلیت اور اسلام کے عہد زریں میں بھی انہوں نے شجاعت و بہادری کے نمونے دکھائے۔ ''احمد بن ''طولون'' کے ضمن میں شرر نے دکھایا ہے کہ خلافت عباسیہ جب کمزور پڑ چکی تھی تو اس وقت اس شخص کے رعب و دبدبے نے

ایک حکومت قائم کی تھی ۔ ''احمد بن طولون'' کے عہد کی یاد شرر نے تازہ کر دی ۔ اس کے حالات و واقعات بھی شرر نے تاریخی کتب سے اخذ کر کے لکھے ہیں ۔ بعض مورخین کے حوالے بھی دیے ہیں ۔ ''نابغہ زیبانی'' جو کہ عرب کا مشہور و معروف شاعر تھا ۔ اس کے حالات و واقعات بھی شرر نے اس کتاب میں لکھے ہیں ۔ ''حجاج'' ''ابوالضحاک'' سمسون ۔ بنی اسرائیل کا پہلوان) اور دیگر اشخاص کے مکمل حالات و واقعات شرر نے بیان نہیں کیے ہیں ۔ بلکہ ان کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے ۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے اپنی مورخانہ دلچسپی کا ثبوت جا بجا دیا ہے ۔ اس کتاب کا اسلوب بھی ویسا ہی جیسا کہ دیگر کتب میں ہے ۔ اس لیے کہ

ایک ہی شخص نے یہ ساری کتابیں لکھی ہیں ۔

گروہ مشاہیر / نام وارانِ عالم

اس کتاب کے دو نام ہیں ۔ ''نام وران عالم'' اور ''گروہ مشاہیر'' اس کتاب کے مولف بھی مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم ہیں ۔ اس کتاب میں ۱۴ ناموران عالم کی زندگی کے پورے حالات بیان کیے گئے ہیں ۔ اس کتاب کو مرتب کرنے والے سید ظہور الحسن قومی پریس دہلی ہیں اور اس کو شائع کرنے والے سید ظہور الحسن و حافظ ابوالحسن قومی پریس چھتہ لال میاں دہلی ہیں ۔ اس میں سن اشاعت نہیں لکھا ہوا ہے ۔ جس کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کب شائع ہوئی ۔ یہ کتاب ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں جن لوگوں کے حالات واقعات شرر نے بیان کیے ہیں ۔ وہ درج ذیل ہیں ۔ افلاطون الٰہی، جے ٹی بال ،چیلڈیا ، ہرقل، الپ ارسلان ،میر علی شیر،محمود و ایاز،محمود غزنوی کی حرص و طمع،علی بیگ،فقیروں کا بادشاہ،عوج بن عنق ،سوانح عمری ابو القاہیہ، ابن المعتز ،حسان بن ثابت ،ابو الصلت امیہ بن عبدالعزیز

اس کتاب میں موجود اشخاص پر شرر نے اپنے مخصوص انداز سے روشنی ڈالی ہے ۔ اور ہر ایک کے سیرت و کردار کو قاری کے سامنے بیان کیا ہے ۔ اس میں موجود اشخاص کا تعلق ہر قوم و ملت سے ہے ۔ شرر نے بغیر تعصب کے ہر ایک کے حالات بیان کیے ہیں ۔ ان اشخاص کے مطالعے کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے مکمل تحقیق کے بعد حالات قلم بند کیے ہیں ، جتنی معلومات انھیں حاصل ہو سکیں سب کی سب انھوں نے قاری کے سامنے پیش کیں ۔ شرر نے جہاں مکمل سوانح عمریاں لکھی ہیں وہاں سوانحی مضامین اور خاکے بھی پیش کیے ہیں ۔ کچھ کے حالات مختصراً بیان ہوئے ہیں ۔ ایک نظر ان اشخاص پر ڈالتے ہیں جن کو شرر نے اس کتاب میں جگہ دی ہے ۔

شرر نے اس کتاب میں جن اشخاص کے بارے میں لکھا ہے وہ اسے سوانح عمری سے تعبیر کرتے ہیں لکھتے ہیں: ''......ہم التزام سے کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ ایسے تمام ناموران عالم کے سوانح عمری سے اپنے ملک کے لوگوں کو بخوبی آگاہ کریں تا کہ جن کا نام بار بار لیا کرتے ہیں۔انھیں پہچان بھی جائیں کہ کون تھے، کیا تھے اور کیسے تھے۔'' ۱۳۴

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حالات وواقعات کو مصنف سوانح عمری کے ضمن میں شامل کرتا ہے۔

جانِ عالم

واجد علی شاہ کی سوانح عمری جس کا نام جانِ عالم ہے، اسے عبدالحلیم شرر نے لکھا اور ادارۂ فروغ اردو لاہور نے اس کو شائع کیا۔ اس کتاب پر سن نہیں لکھا ہوا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کب شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا شرر واجد علی شاہ سے بہت متاثر تھے اس لیے کہ سوانح عمری اس وقت لکھی جاتی ہے جب سوانح نگار کسی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے۔ شرر نے یہ سارے حالات وواقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اس لیے کہ شرر نے نشو ونما اسی فضا اور اسی ماحول میں پائی تھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ واجد علی شاہ کی شخصیت کو زیب داستان بنانے کے لیے شرر نے افسانوی رنگ اختیار کیا ہے۔ واجد علی شاہ کی شخصیت میں عیوب بھی تھے۔ لیکن شرر نے واضح طور پر ان عیوب کی نشاندہی نہیں کی۔ اگر وہ ان عیوب کا اقرار کر لیتے تو سوانح عمری اور بہترین ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ یہ بھی ایک انسان ہی تھا۔ فرشتہ تو نہیں تھا کہ اس میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ عام انسانوں کی طرح اس کی ذات میں بھی عیب موجود تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں مصنف نے ان کو کھل کر بیان نہیں کیا۔ حالانکہ اچھا سوانح نگار وہی ہوتا ہے جو کہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کو بھی بیان کرے۔ اسی لیے محمد طفیل اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ آخر انساں ہی تھا، فرشتہ نہ تھا اور پھر انسان بھی ایسا جس کے پاس اپنی مسرتوں اور شادمانیوں کے حصول کے لیے سبھی کچھ تھا۔ ایسے ''حوصلہ افزا'' حالات میں اور شاعرانہ رو کی بہتی ہوئی موجوں سے اپنا دامن صاف بچالینا کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔ ویسے ہم لفظی رعایتوں اور منطقی انداز میں واجد علی شاہ کی حمایت میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ:
>
> تمام بادشاہان اسلام کی نسبت آپ سنتے ہیں کہ ان کے محل میں چند بیویوں کے ساتھ

ہزاروں کنیزیں بھری ہوتی تھیں ۔ بنی اُمیہ، بنی عباس اور بنی فاطمہ کے حریم خلافت کا یہی حال تھا۔سلاطین آل عثمان کی یہی حالت تھی ۔[۱۴۴]

مولانا شرر واجد علی شاہ سے بہت متاثر نظر آتے ہیں ۔اس لیے کہ سوانح عمری اس وقت لکھی جاتی ہے جب سوانح نگار کسی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے ۔شرر نے تو یہ سارے حالات وواقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے ۔مورخوں نے اس کے سر وہ وہ الزامات لگائے جو حقیقت پر مبنی نہ تھے ۔یہ تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ مورخوں نے زیادتی کی ہے ۔اس بادشاہ کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے ۔اگر ان الزامات کو غور سے دیکھا جائے تو اس میں بھی انگریزوں ہی کا ہاتھ تھا ۔اس لیے کہ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ کس عیاری اور چالاکی سے انگریز اس سر زمین پر آئے اور پھر آہستہ آہستہ ایسی ایسی حکمت عملیاں اختیار کیں کہ یہاں قابض ہو گئے ۔اپنے اسی مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے اس بادشاہ کو اتنا رسوا کیا کہ عالم میں یہ مشہور ہو گیا اور وہ اپنے اس مقصد میں یہاں تک کامیاب ہوئے کہ آج لوگ واجد علی شاہ کی شخصیت وسیرت کے روشن پہلوؤں سے ناآشنا ہیں ۔اس بادشاہ کو عیاش، لچر اور خرچیلے شہنشاہ کی حیثیت سے جانتے ہیں ۔اس کی شخصیت کے روشن پہلوان کے سامنے اجاگر نہیں ہوتے ۔اس کتاب کا نام شرر مرحوم نے ''سلطان عالم واجد علی شاہ'' رکھا تھا ۔یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں شرر نے واجد علی شاہ کے کچھ مستند حالات ،اس کی عادات اور زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے ۔اور اشارتاً انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ دیکھو اسے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔دوسرے حصے میں واجد علی شاہ کی خودنوشت مثنوی ''حزنِ اختر'' مع مقدمہ مولانا شرر مرحوم درج ہے ۔اور اس کا مطالعہ واجد علی شاہ کو مزید سمجھنے میں مدد دیتا ہے ۔تیسرے حصے میں واجد علی شاہ کے انتقال پر مولانا شرر مرحوم کا تاثر اور ان کے بیٹے مولانا صدیق حسن کی کچھ یادداشتیں ہیں۔مولانا شرر کو قدرت نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ خود اس کتاب کو شائع کرتے ۔یہ ایک نادر چیز ہے ۔جس کی قدر وہی کر سکتے ہیں جو شرر کے فن کی قدر کرنے والے ہیں ۔نام تبدیل کرنے کی دلیل بھی شرر نے دی ہے ۔اس کتاب کا نام جو کچھ بھی ہو۔ یہ سچ ہے کہ یہ نادر نسخہ ہے اور ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں واجد علی شاہ کی شخصیت وسیرت اور اس کے عہد کی یاد دلاتی ہے ۔اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ شرر نے ''گذشتہ لکھنو'' میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سے بہت سے موضوعات اور بہت سا مواد اس کتاب میں موجود ہے ۔اس لیے کہ ''گذشتہ لکھنو'' لکھنو کی تاریخ وثقافت و تہذیب کے متعلق تھی ۔ واجد علی شاہ ہی نے اس تاریخ وثقافت وتہذیب کو پنپنے میں بہت حد تک مدد دی تھی ۔اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شرر نے جو کچھ بھی لکھا اردو ادب کا غیر فانی سرمایہ ہے ۔
شرر نے یہ حالات وواقعات کیوں قلم بند کیے اور اس کا کیا محرک تھا؟ وہ خود کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں :

> اودھ کے محروم القسمت آخری تاجدار کے حالات روز بروز پردہ اخفا میں آتے جاتے ہیں اور ان کو بدنام کرنے اور ہر بد اخلاقی کو ان کے سر تھوپ دینے کی جو کوششیں کی گئیں وہ روز بروز زیادہ کامیاب ہوتی جاتی ہیں۔ خصوصاً ہمارے موجودہ مصنفین تاریخ جو مسلمان حکمران ہند کے عہد کو ہر طرح برا دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کے تخجر کے لیے واجد علی شاہ سے زیادہ آسان کوئی قربانی نہیں مل سکی۔ واجد علی شاہ کے دیکھنے والے اب بھی دنیا میں موجود ہیں۔ میں نے خود ان کے مٹیابرج کے واقعات کو دس بارہ سال تک اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کا مختصر ''تذکرہ'' ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کے سلسلہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مگر بہت سی اور باتیں باقی ہیں جن کا زمانے کے اوراق پر ثبت ہو جانا ضروری ہے۔[۱۳۵]

شرر لکھتے ہیں:

> ان کی ابتدائی اور آغاز حکمرانی کی زندگی کے متعلق میں بہت کم لکھوں گا۔ اس لیے کہ میں صرف ان کے مٹیابرج حالات سے واقف ہوں۔ پہلے حالات میں صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ لکھنو کے چوتھے تاجدار امجد علی شاہ کے فرزند تھے۔ ملکہ کشور کے بطن سے ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۷ء میں جبکہ ۲۶ سال کی عمر تھی۔ تخت نشین ہوئے اور ۱۸۵۶ء کے آغاز میں ہنوز ۳۵ سال کی عمر تھی کہ تخت و تاج سے محروم کر دیئے گئے۔[۱۳۶]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ شرر نے وہ واقعات لکھے ہیں جن کو وہ جانتے تھے۔ اس سوانح عمری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ شرر کے مشاہدات وتصوارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شرر نے زیادہ تر باتیں وہ بیان کی ہیں جن کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔ ان کی دیگر تمام سوانح عمریوں کے مقابلے میں یہ سوانح عمری منفرد ہے۔ اس لیے کہ باقی لوگوں کے بارے میں انہوں نے جو مواد پیش کیا ہے وہ تاریخی کتب اور دیگر ذرائع سے اخذ شدہ ہے لیکن اس سوانح عمری میں جو کچھ لکھا ہے وہ مشاہدے پر مبنی ہے۔

مانی کی سوانح عمری

عبدالحلیم شرر نے مانی کی سوانح عمری بھی لکھی ہے جو کہ لفظی مصوری و نقاشی کا کامل نمونہ اور باکمال شخص تھا۔ شرر نے یہ سوانح عمری کیوں لکھی اور اس کے لکھنے کا مقصد کیا تھا؟ وہ لکھتے ہیں: ''افسوس کہ سارے ہندوستان میں شاید شاذ و نادر ہی کوئی جانتا ہوگا کہ مانی کون شخص تھا۔ کس زمانے میں تھا؟ کیا کرتا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ اور کیونکر اور کہاں مرا؟''[۱۴۷] اس سوانح عمری میں شرر نے انہی سوالات کے جوابات فراہم کیے ہیں اور اس مختصر سی سوانح عمری کے مطالعے سے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ مانی کی اصلیت کیا تھی؟ یہ کس زمانے کا باشندہ تھا، اور کیا کچھ کرتا تھا؟ کہاں رہتا تھا اور کس طرح اس کا خاتمہ ہوا؟ ان تمام امور پر شرر نے خاص انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور یہ سوانح مضمون مضامین شرر جلد ہفتم میں شامل ہے۔ شرر اس کو خود سوانح عمری کا نام دیتے ہیں۔ اسی لیے اس کا جائزہ باب سوانح عمری میں لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے یہ سوانح عمری کیوں لکھی اور اس کا محرک کیا تھا۔ بقول شرر:

> واقعی ہمارے لٹریچر کا یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ ہم ان لوگوں کے حالات سے بہت ہی کم واقف ہیں جن کے نام بار بار ہماری زبانوں پر آتے ہیں ہمارے قلموں سے نکلتے ہیں۔ اور جو ہماری انشا پردازی کا زیور بنے ہوئے ہیں۔ دلگداز نے اس بات کی کوشش شروع کی ہے کہ ایسے تمام لوگوں کے حالات سے پبلک کو واقف کر دے۔ چنانچہ ہم بہت سے لوگوں کے حالات اسی رسالہ کے صفحوں پر شائع کر چکے ہیں۔ اور اب اس مشہور و معروف نقاش عجم کے سوانح عمری کی طرف توجہ کرتے ہیں۔[۱۴۸]

شرر نے اس سوانح عمری میں مانی کی حیثیات گنوائی ہیں جس سے قاری کو پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف مصور ہی نہیں تھا بلکہ فلسفی اور نجومی بھی تھا۔ شرر نے اس دور کے حالات بھی مختصراً قلم بند کیے ہیں۔ جس زمانے سے اس شخص کا تعلق تھا۔ چونکہ شرر کو تاریخ سے دلچسپی تھی۔ اس لیے تاریخی شعور مصنف کا یہاں بھی کارفرما ہے۔ اس کے مطالعے سے مانی کے نظریات وافکار، اس دور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ مانی کے سفروں کا مختصراً ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اس نے کس مقصد کے تحت سفر کیے تھے؟ اس سوانح عمری میں مانی کے دعوی نبوت، اس کے مذاہب، اس کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے ماننے والوں کا تذکرہ زیادہ ہے۔ لگتا ہے کہ سوانح نگار نے مانی کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے یہ سوانح عمری لکھی ہے۔ اس میں دیگر کتب سے واقعات بھی بیان لیے گئے ہیں جو کہ مصنف کے وسعت مطالعہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ''غیاث

اللغات‘‘، ’’سکندر نامے‘‘ وغیرہ کا ذکر ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ان کتب کے مطالعے کے بعد یہ حالات وواقعات قلم بند کیے ہیں۔ تاریخی کتب کے مطالعے کا ثبوت بھی ملتا ہے مثلاً جب شرر یہ لکھتے ہیں:

> فارسی واردو شاعری و انشا پردازی میں مانی محض ایک مشہور مصور ہے غیاث اللغات کے مصنف نے خدا نہ جانے کس بنیاد پر اسے ایک روحی نژاد مصور بتایا ہے جو بالکل بے اصل ہے۔ اس کے حالات میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے کمال مصوری ہی کو اپنا معجزہ قرار دے کر دعوی نبوت کیا۔ اس کے اس کمال کی نسبت مولانا نظامی نے سکندر نامے میں چند ایسے واقعات لکھے ہیں جو غالباً ان دنوں ایرانیوں میں مشہور تھے۔ کیونکہ قدیم تاریخوں میں ان باتوں کا کہیں پتہ نہیں چلتا ...... یہ واقعات اس قسم کے ہیں کہ ان کی ایک کہانی سے زیادہ وقعت نہیں معلوم ہوتی۔[۱۳۹]

مانی کے تبلیغ مذہب پر شرر نے مفصل روشنی ڈالی ہے جس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کون سا مذہب کس بنیاد پر بنایا؟ کس طرح اور کیونکر اس کی تبلیغ و اشاعت کی؟ اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شرر نے کس وجہ سے یہ حالات قلم بند کیے ہیں۔ شرر نے اس سوانح عمری میں مانی کی حیثیات گنوائی ہیں۔ جس سے قاری کو پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف مصور ہی نہیں تھا بلکہ فلسفی اور نجومی بھی تھا۔ شرر نے اس دور کے حالات بھی مختصراً قلم بند کیے ہیں۔

قرۃ العین

عبدالحلیم شرر کی ایک مشہور سوانح عمری ’’قرۃ العین‘‘ ہے۔ اس سوانح عمری کو جس انداز میں شرر نے لکھا ہے۔ قارئین وناظرین نے اسے بہت پسند کیا۔ اس عورت پر بہت سے ادباء، شعراء، محققین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن جو مزا اور لطف شرر کی تحریر میں موجود ہے وہ دیگر لوگوں کے ہاں کم ملتا ہے۔ یہ کتاب ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان سولہ صفحات میں شرر نے اس عورت کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی ہے۔ یہ ایران کی ایک مجتہد زادی تھی جس کے حالات شرر نے دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔ اس کتاب کو خاکسار حکیم محمد سراج الحق منیجر و پبلشرز ’’رسالہ دلگداز‘‘ نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا۔ دلگداز پریس لکھنو سے شائع ہونے والی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ نہ صرف اس دور میں بلکہ آج کے دور میں بھی اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کتاب نے اردو ادب میں گراں بہا اضافہ کیا۔

اس سوانح عمری کے مطالعے سے اس کی شخصیت و کردار کے نمایاں پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ عالمہ و فاضلہ تھی۔ حدیث تفسیر، اصول فقہ کے علاوہ الٰہیات فلسفہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتی تھی۔ زریں تاج جتنی بڑی عالمہ تھی۔ اس سے بڑھ کر انقلابی بھی تھی۔ وہ سماج اور معاشرے کی کایا پلٹنا چاہتی تھی۔ اس عورت کے مختلف لقب تھے۔ لیکن اس کا جو لقب سب سے زیادہ مشہور رہا۔ ''قرۃ العین'' تھا۔ شرر نے اسی لقب کو بطور عنوان منتخب کیا ہے۔ اس کے اس لقب پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

> بانی فرقہ بابیہ مرزا علی محمد باب کی زندگی میں ہی اس کے جن چند معتقدوں اور پیروں نے ہنگائے پیدا کر دیئے اور سلطنت عجم کو بڑے خوفناک خطروں میں ڈال دیا ان میں سب سے زیادہ خطرناک ہنگامہ ایک پری جمال مجتہد زادی کا تھا جو ''قرۃ العین'' کے لقب سے مشہور تھی۔ اس حسینہ و جمیلہ خاتون کا اصلی نام تو زریں تاج تھا مگر دنیا میں زیادہ تر قرۃ العین کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے کہ علی محمد باب وفور محبت سے اسے اپنے خطوں میں ''قرۃ العین'' ہی کے لقب سے یاد کیا کرتا تھا۔ پھر بابیوں نے اسے تعظیماً و تکریماً بدر الدجیٰ اور شمس الضحیٰ کے خطابوں سے یاد کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جب بہار کا زمانہ آیا تو اس نے اس محشر زا عورت کو صدیقہ طاہرہ کے الفاظ سے یاد کرنا شروع کیا۔ مگر یہ سب القاب مع اس کے اصل نام ''زرین تاج'' کے مختلف زمانوں اور صحبتوں ہی تک محدود ہے لیکن ''قرۃ العین کے لقب کو اس قدر شہرت ہوئی کہ آج تک ہر جگہ تذکروں اور تاریخوں میں اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔[۱۴۰]

اس اقتباس سے یہ واضح ہوا کہ شرر نے اس سوانح عمری کا عنوان ''قرۃ العین'' کیوں دیا۔ آج تک ہر جگہ تذکروں اور تاریخوں میں اس نام سے یاد کی جاتی ہے۔ شرر نے اس کی پیدائش سے وفات تک کے حالات واقعات قلمبند کیے ہیں۔ شرر نے سوانح نگاری کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر اس کے حالات لکھے ہیں۔ شرر نے انصاف اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔ اس کو انسان بنا کر پیش کیا ہے، فرشتہ نہیں۔ شرر نے اس کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے اور خامیوں پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ اس کی زندگی کے واقعات میں سے وہ حالات و واقعات منتخب کیے ہیں جو اس کی زندگی کی تصویر کو مکمل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سوانح نگار میں قوت انتخاب و فیصلہ موجود تھی۔ اس کی ترتیب میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ شرر نے اپنی شخصیت کو

جہاں تک ممکن تھا۔ سوانح عمری سے دور رکھا۔شرر نے اس سوانح عمری میں قرۃ العین کے خیالات میں تبدیلی اور اپنے معاشرے کی حالت بدلنے کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

......اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا علی محمد باب کی تحریری تعلیموں سے اس کے ذہن میں پرانے خوارج (جمہوریت پرستون) کا یہ خیال جم گیا تھا کہ مال و دولت کسی کی ملکیت نہیں ہیں اور ان پر ہر شخص کو تصرف کرنے کا یکساں حق حاصل ہے جو خیال کہ آج بھی یورپ میں رہ رہ کر ابھرتا اور عصر جدید کی زبردست قانونی سلطنتوں کے دبائے نہیں دبتا۔ اس خیال میں وہ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ساسانی دولت کے عہد کے زبردست خارجی مزدک کی ہم آہنگ ہو کے کہتی تھی کہ عورتوں کے لیے بھی جائز نہیں کہ کسی ایک ہی کی پابند کر دی جائیں اور دوسرے لوگ ان کے حسن و جمال کی لذت سے محروم کر دیے جائیں۔[۱۴۱]

قرۃ العین کے خیالات میں تبدیلی دو وجوہات کی بنا پر آئی ایک تو مرزا علی محمد باب کی تحریری تعلیموں سے اور دوسری اعلیٰ تعلیم اور علم و فضل سے۔ یہی وہ عورت ہے جس نے آزادی نسواں کا سب سے پہلے نعرہ لگایا تھا۔ اس کا محرک کیا تھا؟ شرر نے اس پر بہت خوب صورت انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

اسے نظر آ گیا کہ جتنی آزادی اسلام نے عورتوں کو دے رکھی ہے۔شرافت کے آداب و قوانین اور اسلامی سوسائٹی کے مروجہ اصول نے اس کو بھی چھین لیا ہے اور قوم کے ساتھ علمائے امت کا رجحان بھی اس جانب ہے کہ عورتیں اپنے دینی حقوق سے بھی محروم رکھی جائیں۔ یہ خیال اس کے دل میں پیدا ہوتے ہی ترقی کرتا اور تبحر و تحقیق کے ساتھ بڑھتا گیا۔[۱۴۲]

قرۃ العین طاہرہ صرف چھتیں سال زندہ رہی۔ لیکن ان سالوں میں اس نے تحصیل علم، خانہ داری، مسافرت، درس و تدریس، تاریکیوں کے خلاف جہاد، علماء کے ساتھ مباحثوں، ظلم کے خلاف نبرد آزمائی اور قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں۔ حقوق نسواں کے لیے اس عورت نے سب سے پہلے آواز بلند کی تھی۔ شرر نے مختصر سوانح عمری میں اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔عبدالحلیم شرر نے ''جون آف آرک'' پر بھی مضمون لکھا تھا۔ فرانس کی جون آف آرک کچھ اس قسم کی شخصیت تھی۔ ایک غیبی آواز اس کی رہنمائی کرتی تھی۔ اسے عمل پر اکساتی تھی۔ برطانوی کلیسا نے اس دوشیزہ پر یہ الزام عائد کیا کہ اس سے شیطانی روح حلول کر گئی

ہے۔اسے زندہ جلا دیا گیا مگر کئی سال بعد اسے اس الزام سے بری کر کے عیسائیت کے نفوس قدسیہ میں شامل کر لیا گیا۔قرۃ العین وہ حسین اور ذہین شاعرہ ہے جو آسمان ادب پر ایک ٹوٹنے والے تارے کی مانند چکاچوند پیدا کر کے آن کی آن میں غائب ہوئی۔

انیسویں صدی میں عورت کس قدر پیچھے تھی۔مغرب میں بھی اس نے اپنے حقوق کی جدوجہد کا شعور بعد میں پایا۔دنیائے مشرق میں طاہرہ پہلی عورت ہے جو عورت کی آزادی کا پرچم اٹھا کر اپنے خوب صورت چہرے کو سورج کے روبرو لے آتی ہے۔روشن خیالی کے ساتھ ساتھ طاہرہ کے چہرے کی آب و تاب بھی ہے۔مرد معاشرے کو یہ قبول نہیں کہ عورت علم حاصل کرے۔اپنے علم کا فیضان جاری کرے۔عورت بحث و دلیل کے ذریعے یا تحقیق وتدبر کے ساتھ سچائیوں کو تلاش کرے۔عورت اپنے نظریے اور عقیدے کا اسی طرح دفاع کے جیسے مرد کرتے ہیں یا اپنے علم و دانشوری کے ساتھ قوت استدلال میں کسی مرد کو کمتر ثابت کردے۔اسے روکنے کے لیے کئی حربے کام میں لائے جاتے یں۔لعنت و ملامت،طعن و تشنیع،قید و بند،شدت وتشدد،سنگ زنی اور قتل طاہرہ نے یہ سب کچھ دیکھا اور برداشت کیا۔عبدالحلیم شرر نے اس کے انجام پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> جب ہم زریں تاج کے حالات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں نہایت ہی افسوس ہوتا ہے کہ کیسی قابل اور یکتائے روزگار عورت غلطی میں مبتلا ہو کے حوادث روزگار کا نشانہ بنی۔ایران اس کی ذات سے بڑے بڑے فائدے اٹھا سکتا تھا مگر ملک کی نا اہلی نے بجائے فائدے کے اس سے سخت ضرور اٹھایا۔اس کے ذمہ دار صرف علمائے امت اور خصوصاً اس کے گھرانے کے مقتدایاں وطن اس کے باپ سسر اور شوہر تھے۔تعلیم نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔اس میں آزادی کا جوش پیدا کیا تھا۔اسے اپنے شرعی قانونی اور اخلاقی حقوق بتا دیے تھے......زریں تاج کے واقعہ سے فی الحال ہندوستان کو نہایت ہی ضروری سبق مل رہا ہے۔یہاں تعلیم نسواں پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔اور ادھر دو چار سال سے گورنمنٹ کی خاص توجہ نے عورتوں کی تعلیم کا معیار بڑھانا شروع کر دیا ہے۔لیکن اس کے جوش اور جذبات و خیالات کی طرف سے عموماً بے پروائی کی جا رہی ہے۔اور یہی چیز انتہا درجہ کی خطرناک ہے۔خوب یاد رکھو کہ یا تو عورتوں کو بالکل جاہل رکھو اور ہرگز نہ پڑھاؤ۔اگر پڑھاتے ہو تو ان کو مانگنے سے پہلے ہی ان کے حقوق ان کو دے دو۔[۱۴۳]

یہ سوانح عمری پڑھ کر امید سی پیدا ہوتی ہے کہ وہ وقت آئے گا جب عورت انسان تسلیم کی جائے گی۔ یہ دنیا تسلیم کرے گی کہ عورت زیادہ ذمہ داری اٹھانے کے لائق، عظیم امور سرانجام دینے کے لیے بھی تخلیق ہوئی۔ وہ زمانہ اس زمین پر اعلیٰ تہذیب کا زمانہ ہوگا۔ وہی زمانہ جس کا خواب خاتون عجم نے دیکھا تھا۔ وہ خواب فقط حقوق کی برابری کا نہیں، بلکہ بنت حوا کی ذہنی اور سماجی برتری کے لیے ہے۔ اس لیے کہ قرۃ العین نے محسوس کیا تھا کہ وہ خود اپنے وقت کے تمام مردوں سے زیادہ ذہین اور صاحب علم ہے۔ قرۃ العین کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ کل کی دنیا مساوات مرد و زن اور امن و آشتی کی دنیا ہوگی۔ یہ بات نیلگوں آسمان کی پیشانی پر زریں حروف میں تحریر ہے۔

محذرات۔۱۹۳۲

عبدالحلیم شرر کی ایک کتاب ''محذرات'' ہے۔ جس میں چند نامور و ممتاز خاتونانِ ارض کے مفصل حالات زندگی درج ہیں۔ اس کتاب میں جن خواتین کا ذکر ہے وہ دو قسم کی ہیں۔ کچھ اسلام سے بیشتر کی خواتین اور کچھ بعد از اسلام کی۔ یہ کتاب ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ شرر نے اس کتاب میں ۳۰ مشہور و معروف خواتین کو شامل کر کے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے مکمل تحقیق و تفتیش کے بعد یہ کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں شرر نے جو کچھ پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شرر کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شرر نے باقی سوانح عمریوں کے مقابلے میں اگر چہ مختصر سوانحی خاکے لکھے ہیں۔ ان کے حالات کو پڑھ کر ایک مکمل تصویر ان خواتین کی جہاں قاری کے ذہن میں ابھرتی ہے وہاں قاری کے علم میں بھی بہت اضافہ ہوتا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اردو دان طبقہ کو خاتونانِ عالم کی سرگذشت اور ان کی زندگی کے نمایاں حالات و واقعات کے متعلق عام واقفیت حاصل ہو جائے۔ اس کتاب کی تالیف کے لیے۔ انہوں نے بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کیا۔ شرر کے انتخاب کردہ تاریخی حالات مستند کتابوں کے مطالعے کے بعد پیش کیے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ شرر نے قارئین کی دلچسپی کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت آسان اور سہل زبان استعمال کی ہے تا کہ قاری صحیح طور پر ان واقعات و حالات سے آگاہی حاصل کرے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ امر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ عبدالحلیم شرر نے سوانح نگاری کے مسلمہ اصول و ضوابط کے پیش نظر یہ کتاب تالیف کی ہے۔ یہ ایک معلوماتی کتاب ہے۔ جو عام قاری کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس کتاب میں جن خاتونانِ عالم کے سوانحی حالات شرر نے لکھے ہیں۔

ان میں اگر چہ سوانح عمریوں کے برعکس حالات وواقعات کی تفصیل درج نہیں ہے۔لیکن ان سوانحی مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں تہذیب وتمدن کے عروج وزوال اور مختلف زمانے کے لوگوں کے رہن سہن اوران کے حالات و واقعات کی داستان موجود ہے۔ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی نامور خواتین گذر چکی ہیں۔اس کتاب میں پہلے نمبر پر جس خاتون کا ذکر ہے وہ ''زبیدہ خاتون'' ہیں۔شرر نے اس سوانحی مضمون میں بڑی خوبصورتی سے اوردلکش انداز میں اپنی معلومات اوراخذ شدہ مواد قاری تک پہنچایا ہے۔پہلے پیراگراف میں ہی اس خاتون کی دلکش تصویر قاری کے سامنے موثر انداز سے پیش کی ہے۔جس کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس خاتون کے کیا کیا کارنامے تھے؟ لکھتے ہیں:

> اُم جعفر اُمتہ العزیز زبیدہ بنت جعفر بن ابی جعفر منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس عم رسول اللہ ﷺ۔یہ خاتون عرب کی ان پاک نہاد خاتونوں میں ہے جنھوں نے شرافت و عزت ،صورت وسیرت ،دولت وحشمت اور عصمت وعفت ،غرض تمام صفتوں اورنعمتوں کو اپنی ذات میں جمع کرلیا تھا۔بنی عباس کا زمانہ شباب گویا اسی خاتون کی اقبالمندی کا نمونہ تھا اور ہارون رشید کی فتح مندیوں اوراس کی ہیبت وجبروت کا تاج اسی ملکہ کے خوبصورت سر پر تھا۔عم رسول اللہﷺ حضرت عباس کی اولاد سے تھی۔دوسرے خلیفہ بنی عباس المنصور کی پوتی۔ہارون رشید اعظم کی والا مرتبت ملکہ۔اورمظلوم ونوعمر خلیفہ امین کی ماں تھی۔[۱۴۴]

زبیدہ خاتون کے ضمن میں شرر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر چہ مختصر ہے لیکن اس میں جامعیت کا عنصر موجود ہے۔اس کے مطالعے سے یہ بات بھی قاری کومعلوم ہوتی ہے کہ زبیدہ خاتون کے بارے میں الف لیلہ کی کہانیوں میں جومجہول زمانے میں مرتب کی گئی ہیں۔اس کے چال چلن کے بارے میں غلط باتیں، بے بنیاد اوراختراپردازیوں پرمبنی ہیں۔

''ام الخیر رابعہ بصریہ'' کے متعلق جوکچھ شرر نے لکھا ہے۔وہ بھی مکمل تحقیق کے بعد لکھا ہے۔اس ضمن میں جومواد سوانح نگار نے پیش کیا ہے وہ بھی تاثیر سے بھرا ہوا ہے۔شرر نے اس مضمون میں ان کی متصوفانہ زندگی کی جھلک دکھائی ہے۔یہ مضمون اگر چہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔اس کو ہم سوانحی مضمون اورسوانحی خاکہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔یہ مکمل سوانح عمری تو نہیں ہے لیکن سوانحی خاکہ ضرور ہے۔جس کو پڑھ کر رابعہ بصریہ کے حالات و واقعات پر سے پردہ اٹھتا ہے۔قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔شرر نے رابعہ بصریہ کے حالات وواقعات میں

سے چند ایک بیان کیے ہیں۔ بصرہ کے حالات و واقعات پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ رابعہ بصریہ کے زمانے پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ عاشقانِ الٰہی کے ساتھ رابعہ کے روابط کو بیان کیا ہے۔ ان کے سفرِ حج پر کم روشنی ڈالی۔ عشقِ الٰہی کو بھی بیان کیا ہے۔ اس مختصر سے سوانحی خاکے میں شرر نے رابعہ بصری کی چیدہ چیدہ خصوصیات اور حالات و واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

> زہد و عبادت بے نفسی و نفس کشی کی کوئی حد نہ تھی۔ اہلِ تصوف کا سا ذوق و جذب آپ کے دل میں تھا۔ لہٰذا اللہ جل شانہ سے دعا بھی کرتیں تو اسی وضع اور اسی طریقے سے جو صوفیوں اور فلسفہ الٰہی کے رمز شناسوں کے ساتھ مخصوص تھا...... [۱۴۵]

رابعہ بصری کی فضیلت کے بارے میں سیدہ وداد السکالینی لکھتی ہیں:

> ......رابعہ کی فضیلت کے لیے یہ کیا کم ہے کہ اس نے صلحاو مخلصین کے لیے ایک بلند مثال قائم کرنے میں سبقت کی۔ وہ بصیرت، معرفت اور ایمان پر زندگی بسر کر کے عورتوں کے لیے عزت و حرمت کا ایک ایسا باب کشادہ کر گئی جو کبھی بند نہ کیا جا سکے گا۔ آخر وہ بھی ایک عورت ہی تھی جو فقیہوں کی صفوں میں سب سے پیش پیش اور عبادت و ریاضت میں عورتوں کے لیے واضح دلیل ہے۔ [۱۴۶]

رابعہ بصریہ کو ام الخیر کے نام سے کیوں یاد کیا جاتا ہے اس کے متعلق بھی سیدہ وداد السکالینی لکھتی ہیں۔ ''چونکہ اس کی زندگی مجاہدات اور خیر و تقویٰ سے بھرپور تھی۔ اس لیے ''ام الخیر'' کہلاتیں۔ [۱۴۷] عبدالحلیم شرر نے ان کے اسی نام اور لقب کو بطور عنوان کے پیش کیا ہے۔ آپ بصرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسی لیے آپ کو ام الخیر رابعہ بصریہ کہا جاتا ہے۔

ملکہ زنوبیہ یہ سوانح عمری بھی اسی کتاب میں شامل ہے۔ شرر نے اپنے مخصوص انداز میں اس عورت کی سوانح عمری مختصراً لکھی ہے۔ شرر نے یہ سوانح عمری اس مقصد کے لیے لکھی کہ ایک تو وہ یہ باور کرا سکیں کہ زمانہ قدیم میں ایشیا کی عورتیں انسانی کمالات کے اعتبار سے یورپ کی عورتوں سے زیادہ فوقیت رکھتی تھی، دوسرا مقصد ان کا یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کی عورتوں میں لیاقت و شائستگی پیدا کریں۔ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ یہ قدیمی ورثہ ہی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی خواتین کو سبقت حاصل ہے۔ وہ لوگ جو عورتوں کو کم عقل تصور کرتے ہیں۔ ان کو معلوم

ہو جائے کہ عورت ہر دور میں اعلیٰ کمالات کی حامل رہی ہے۔ بقول شرر:

اگر چہ موجودہ زمانہ میں یورپ کو اپنی عورتوں کی لیاقت و دانائی پر بہت کچھ فخر اور ناز کرنے کا موقع حاصل ہے لیکن قدیم زمانہ میں جس طرح ایشیا اور عموماً ممالک مشرق کو تمام حیثیتوں سے یورپ پر ترجیح حاصل تھی اسی طرح ایشیا کی عورتیں بھی انسانی کمالات کے اعتبار سے یکتائے زمانہ تھیں ۔ اور یورپ کی عورتوں پر بدرجہا زیادہ فوقیت رکھتی تھیں۔ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم بعض گذشتہ خاتونانِ ایشیا کے دلچسپ کارنامے اپنی ملکی خاتونوں کے گوش گزار کریں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ جو لیاقت اور شائستگی ہم ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ان کے لیے نئی چیز نہیں بلکہ ان کا قدیمی ورثہ ہے۔جس کے حاصل کرنے کی وہ یورپین عورتوں سے زیادہ مستحق ہیں ۔[۱۴۸]

اس اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے عورتوں کی سوانح عمریاں کسی مقصد کے لیے لکھی تھیں؟ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جن خواتین کے بارے میں لکھا ہے ان کے نمایاں کارناموں اور حالات وواقعات پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمریاں ان کے ہم عصر سوانح نگاروں کی سوانح عمریوں سے مختلف ہیں ۔شرر کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جس شخصیت پر بھی لکھا ہے ۔مکمل تحقیق وتفتیش کے بعد لکھا ہے اور تاریخی کتب اور دیگر کتب سے مواد اخذ کیا ہے۔شرر نے خوب صورت انداز بیان اختیار کیا ہے ۔

اس سوانح عمری کے واقعات میں تسلسل پایا جاتا ہے ۔خوبصورت اسلوب نے اس سوانح عمری کو اور جلا بخشی ہے ۔اس میں بھی شرر کا مخصوص اندازِ بیاں نظر آتا ہے اور اسلوب کی تمام خوبیاں اس میں بھی موجود ہیں ۔ شرر نے اس مختصر سی سوانح عمری میں ملکہ زنوبیہ کے کارناموں کو موثر انداز سے بیان کیا ہے ۔جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ان کے پاس معلومات کا خزانہ کس قدر تھا۔موضوع کی مناسبت سے انہوں نے مواد بھی پیش کیا ہے اور اسلوب بھی ۔

مضغہ ۔تحمہ ۔ زبدہ: یہ تین بہنیں تھیں ۔زہد وعبادت اور تقویٰ وطہارت میں یہ تینوں بہنیں برابر تھیں ۔ان نیک نہاد اور پاکدامن خواتین کے زہد واتقوای کی تعریف شرر نے کی ہے۔رابعہ شامیہ کے عنوان سے جو کچھ شرر نے لکھا ہے وہ بھی تاریخی کتب سے لیا گیا ہے ۔شرر نے جس مقصد کے تحت ان کے یہ سوانحی حالات لکھے ہیں وہ یہ ہیں: ''تاکہ

لوگ دیکھیں کہ عورتوں میں کیسی کیسی خداشناس۔ دیندار اور صاحب علم وفضل بیبیاں گزری ہیں''۔[۱۴۹] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نظریئے کے تحت شرر نے یہ حالات وواقعات لکھے ہیں ۔وہ یہ ہے کہ قارئین کو معلوم ہوجائے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی نامور خواتین گزری ہیں ۔ان تمام نامور خواتینِ عالم کے بارے میں سوانح نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ کی کتب سے اخذ کیا ہے ۔کوئی بات قیاس پر مبنی نہیں لکھی گئی ہے ۔اس کتاب میں بھی اسلوب کی تمام خوبیاں وہی ہیں جو کہ ان سے منسوب ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مصنف نے تعصب کے بغیر ہر مذہب وملت کی نامور خواتین کو جگہ دی ہے، اس میں بعض کے حالات زیادہ اور بعض کے کم لکھے ہیں ۔لیکن ہر ایک کے بارے میں جو کچھ مصنف نے لکھا ہے وہ اس انداز سے لکھا ہے کہ قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے ۔اس کتاب میں مختلف موضوعات ملتے ہیں ۔مواد کی ترتیب میں تسلسل وتوازن پایا جاتا ہے اور اسلوب بھی سادہ ودلکش ہے۔

سکینہ بنت حسین:

شرر نے یہ سوانح عمری قیام حیدرآباد کے دوران لکھنی شروع کی تھی ۔۱۸۹۸ء میں شرر نے حیدرآباد سے جب ''دلگداز'' شروع کیا تو اس میں انھوں نے یہ لائف لکھنی شروع کی ۔اگر چہ اس پر بہت زیادہ اعتراضات بھی ہوئے اور انھیں اس سلسلہ کو روکنا بھی پڑا۔ اس سوانح عمری کی وجہ سے انھیں حیدرآباد کو بھی چھوڑنا پڑا۔ لیکن لکھنو آ کر انھوں نے اس لائف کا بقیہ حصہ مکمل کر کے شائع کر دیا۔ اس سوانح عمری کی وجہ سے جن مشکلات کا سامنا انھیں کرنا پڑا اور جن اعتراضات کو سہنا پڑا پھر بھی اپنے کام کو انھوں نے کس مستعدی سے مکمل کیا؟ اس کے متعلق آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> ۱۸۹۸ء میں انھوں نے حیدرآباد سے دلگداز جاری کیا اور اس میں سکینہ بنت حسین کے حالات لکھنے شروع کیے ۔اس سے مسلمانوں میں جوش بیدار ہوگیا ۔نظام گورنمنٹ نے ان کو ہدایت کی کہ اس سلسلہ کو بند کردیں ۔اس مضمون کے ساتھ انھوں نے رسالہ بھی بند کر دیا ۔۱۹۰۰ء میں لکھنو آ کر انھوں نے پھر دلگداز جاری کیا۔ سکینہ بنت حسین کا بقیہ حصہ پورا کیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ شرر نے اس کتاب کے لکھنے سے بڑی دریدہ دہنی سے کام لیا ہے۔ ایک مسلمان کے قلم سے نبی زادی کی شان میں اس قسم کی گستاخیاں غضب ہیں۔[۱۵۰]

رام بابو سکینہ نے بھی سکینہ بنت حسین کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ۱۸۹۸ء میں آپ نے حیدرآباد سے دلگداز کو از سرِنو جاری کیا مگر گیارہ مہینے تک جاری رکھ کے خود ہی بند کر دیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی جناب سکینہ کی لائف آپ نے شائع کرنا شروع کی تھی۔ اس میں چونکہ تاریخی تحقیقات کر کے اصلی واقعات لکھے تھے۔ وہ عام مسلمانوں میں اور خاصتہً شیعہ لوگوں کے خلاف ہوئے۔ اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی۔ بعض عہدہ داران گورنمنٹ نظام نے پرائیویٹ طور پر آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ روک دیں... جس میں سب سے پہلے اسی سکینہ بنت حسین کی لائف کا بقیہ تھا۔[۱۵۱]

یہ سوانح عمری پہلے مضمون کی صورت میں ''دلگداز'' کے صفحات پر شائع ہوئی اور بعد میں اسے کتابی صورت میں مرتب کیا گیا۔ یہ کتاب ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو شرر نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد مرتب کیا۔ چونکہ شرر نے یہ سلسلہ جو سوانحی مضامین و سوانح نگاری کا شروع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے جہاں خلفائے راشدین، اولیاء و بزرگان دین اور سلف کی سوانح عمریاں تحریر کیں۔ وہاں تاریخ اسلام کی اہم ترین خواتین کو بھی اپنے سوانحی مضامین و سوانح نگاری کا موضوع بنایا۔ اس کتاب پر اگرچہ بہت زیادہ اعتراضات ہوئے۔ اور شرر نے مسلمانوں کے جذبات پر بھی کاری ضرب لگائی۔ لیکن وہ اپنے ارادے اور مقصد میں آخر کار کامیاب ہوئے اور انہوں نے اس سوانح عمری کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔ نہ صرف اس عہد میں بلکہ آج کے دور میں بھی ان حالات و واقعات کو پڑھ کر بہت سے لوگوں کے اعتقادات پر کاری ضرب لگتی ہے۔ لیکن یہ مسلم حقیقت ہے کہ شرر نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ جو کچھ تحقیق کے بعد انھیں معلوم ہوا اسے پوری صداقت و دیانت داری سے انھوں نے قلم بند کر دیا۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شرر کی معلومات اور ان کا علم کس قدر وسیع تھا؟ تحقیق و جستجو کی کتنی لگن تھی؟ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے، اس میں بے پناہ معلومات قاری تک پہنچاتے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے خلاف توقع حالات و واقعات لکھے ہیں۔ پس یہی وجہ ہے کہ انھیں اس سلسلے کو بند کرنا پڑا تھا۔ شرر کی یہ واحد سوانح عمری ہے جس پر اعتراضات بہت ہوئے۔ اس کے متعلق حکیم برہم لکھتے ہیں:

.....مولانا حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت سکینہ کی سوانح عمری لکھنا شروع کی ۔عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جناب سکینہ بچپن ہی میں واقعہ کربلا کے بعد قید خانے میں اہل شام کے جور سے شہید ہوئیں مگر اس مضمون میں اس کے خلاف آپ کی امیرانہ زندگی ۔آپ کے شاعرانہ مذاق اور آپ کی متعدد شادیوں کی کیفیت دکھائی گئی تھی ۔لہذا حضرات شیعہ جو پہلے ہی ''خاندان رسالت'' والا مضمون دیکھ کر مولانا سے بدظن ہو گئے تھے ۔چونک پڑے ۔اور ہر طرف ایک ہنگامہ سا مچ گیا ۔سنی بھی اس جوش میں ان کے ساتھ تھے ۔اور گوماّ خذ بتا دیئے گئے تھے اور ثابت کر دیا گیا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے بے اصل نہیں ۔مگر جوش مخالفت بڑھتا ہی گیا ۔حیدرآباد میں بھی اس کا جوش ہوا۔ اور مضمون سکینہ بنت حسین کے دو ہی نمبر شائع ہونے پائے تھے کہ وہاں کے کوتوال نواب اکبر جنگ بہادر نے مولانا سے مل کر کہا کہ ''اگر چہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے ۔صحیح ہے مگر بہتر یہ ہوگا کہ دلگداز میں اس لائف کا سلسلہ روک دیا جائے'' ۔مولانا کی طبیعت میں ہمیشہ سے آزادی اور ضد رہی ہے ۔انھوں نے کہا کہ ''یہ مضمون نہ نکلا تو دلگداز بھی نہ نکلے گا'' شیعوں میں اس کے خلاف جوش بڑھتا ہی رہا۔ایک صاحب نے صوبہ بہار سے ''جواب شرر'' کے نام سے ایک بڑا رسالہ بھی شائع کیا۔مگر مولانا نے نہ کبھی اس کی طرف توجہ کی اور نہ جواب دیا ۔[۱۵۲]

اس اقتباس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس سوانح عمری پر اعتراضات کس بناء پر ہوئے؟ سب سے زیادہ ناراض شیعہ حضرات ہوئے تھے۔اس لیے کہ وہ ''حضرت سکینہ'' کے متعلق جو رائے رکھتے تھے ۔شرر نے اس کے خلاف باتیں بیان کیں ۔شیعوں کے ساتھ ساتھ سُنی حضرات بھی معترض ہوئے ۔لیکن شرر کی طبیعت میں جو آزادی اور ضد تھی اس نے انھیں اس امر پر ابھارا کہ وہ یہ حالات مکمل منظر عام پر لائیں گے اور پھر طبیعت کی اس روش ہی نے ان سے یہ کام کروایا۔ان اعتراضات سے قطع نظر اگر اس کتاب کو پڑھیں تو اس میں بہت سی معلومات اور بہت سے نئے خیالات ،نئی صداقتیں قاری کو معلوم ہوتی ہیں ۔شرر چونکہ مؤرخانہ ذہن رکھتے تھے ۔اس کتاب میں شرر نے حضرت سکینہؓ کے نانا امراؤالقیس کے ایمان لانے کا واقعہ ایک خاص انداز میں لکھا ہے ۔ اور حضرت عمر فاروق ؓ کے عہد خلافت اور بطور خلیفہ انکی شخصیت کی عکاسی کی ہے ۔حضرت عمر فاروق دربار کے بارے میں شرر نے بتایا ہے:

اس وقت خلافت راشدہ کے اس پاک دارالخلافت میں پہونچے اور حضرت فاروق کے درِ
دولت پر حاضر ہوئے ۔ اس وقت حضرت عمر کا سادہ دربار گرم تھا ۔ بہت سے لوگ اور
معززین صحابہ بیٹھے ہوئے تھے ۔[۱۵۳]

اس میں جس دربار کا ذکر شرر نے کیا ہے۔ اگر آج کے دور میں ہم مسلمانوں کے بادشاہوں کے درباروں کو دیکھیں تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ مسلمانوں کے خلیفہ کے انداز خلافت اور عام مسلمان بادشاہوں کے انداز بادشاہت وحکمرانی سمجھ میں آئے گا ۔ اس دربار کی یہ شان تھی کہ امراؤ القیس کو کلمہ پڑھتے ہی شام میں مسلمانوں کے قبیلہ قضاعہ کا سردار بنادیا گیا۔

امراؤالقیس کی بیٹی کا عقد حضرت امام حسین سے ہوااور انہی کے بطن سے جناب حضرت سکینہ پیدا ہوئی ۔شرر نے حضرت سکینہ اور حضرت رباب کی محبت میں ان اشعار کا حوالہ دیا ہے جو کہ حضرت امام حسین کی زبان سے ادا ہوئے تھے ۔ یہ اشعار بھی تحقیق کے بعد شرر نے لکھے ہیں ۔تیسرا شعر طبری میں درج ہے اور باقی اشعار دیگر کتب میں بھی درج ہیں ۔ یہ اشعار عربی زبان کے ہیں قاری کی سہولت کی خاطر انھوں نے ان اشعار کا ترجمہ اردو میں کیا ہے ۔

شرر جذبات کی عکاسی میں مہارت رکھتے تھے ، یہی وجہ ہے کہ اس سوانح عمری میں جذبات کا اظہار انہوں نے موثر انداز سے کیا ہے ۔شرر نے اس سوانح عمری میں جو حقائق بیان کیے ہیں ۔ وہ ابن اثیر ،طبری اور دیگر کتب سے لیے ہیں ۔ اس کتاب میں تسلسل پایا جاتا ہے ۔کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے ۔کہیں تفصیلات درج ہیں تو کہیں سوانح نگار نے اختصار سے کام لیا ہے ۔ اس کتاب میں حضرت سکینہ کی زندگی کا وہ رخ دکھایا گیا ہے جو کہ واقعہ کربلا کے بعد کا ہے اور ان کی والدہ رباب کی زندگی کے بارے میں بھی شرر نے بتایا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد ان کے شب وروز کیسے بسر ہوئے اور مورخین و روایات کے بیان سے ہر بات لکھی ہے ۔ مثلاً جب وہ یہ جملہ لکھتے ہیں :

بعض مورخین کا بیان ہے کہ بعد واقعہ کربلا رباب نے مدینے میں واپس آ کے ساری زندگی رنج
والم ہی میں صرف کی اور کسی صحبت عشرت میں شریک ہونا تو درکنار جب تک حیات مستعار
باقی تھی کبھی کسی چھت کے سائے میں نہیں بیٹھیں ۔ بلکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ
مدینے سے کربلا کو واپس گئیں اور چھ مہینے تک قبر حسین پر بیٹھیں رہیں ۔جس کے بعد پھر مدینے
میں واپس تشریف لائیں مگر جب تک زندہ رہیں ۔ مبتلائے حسرت واندوہ رہیں ۔[۱۵۴]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ شرر نے اثیر اور بعض روائتوں کے ذریعے سے اصل حقائق قاری تک پہنچائے ہیں۔ یہی سوانح نگار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اصل حقائق کو منظر عام پر لائے۔ شرر میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کتاب میں جو حقائق سوانح نگار کو تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے وہ مصنف نے قیاسی طور پر بیان کیے ہیں۔ مثلاً جب وہ حضرت سکینہ کی تعلیم وتربیت کے بارے میں دیگر کتب تاریخ میں بہت کم معلومات دیکھتے ہیں تو لکھتے ہیں:

......اور اسی وجہ سے ہم کو بالکل نہیں معلوم کہ جناب سکینہ کا بچپن کیونکر گزرا اور آپ کی تعلیم کس طریقہ سے دی گئی۔ لیکن اگر ہم ذرا بھی قیاس سے کام لیں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ آپ کو نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیم دلائی گئی۔ اور وہ بھی صرف دینیات کے ساتھ مختص نہ تھی۔ بلکہ لٹریچر اور ادب اور اخلاقی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت آزادانہ تعلیم تھی۔ اس لیے جس عہد میں آپ کا نام عرب کے باذاق سوسائٹیوں میں چمکا ہے۔ اس وقت آپ خاندان نبوت کی ایک واجب التعظیم اور شائستہ خاتون ہی نہیں نظر آتی ہیں بلکہ بذلہ سنج، لطیفہ گو اور فیشن کی موجد اور لیڈر رہونے کے علاوہ بہت بڑی اور اس پائے کی شاعرہ بھی ثابت ہوئی ہیں کہ مشہور شعرائے عرب جن کا مثل آج تک عربی نظم کو نہیں نصیب ہوا۔ اپنی باہمی لٹریری نزاعوں کا فیصلہ کرانے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے...... ۱۵۵

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے کس طرح سے نتائج اخذ کیے ہی۔ اور یہ سوانح نگار کی باریک بینی ہی ہے جو ہر بات کی تہہ میں چھپی ہوئی صداقتوں کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ شرر نے جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے وہ تحقیق کے بعد لکھا ہے۔ مثلاً جب وہ وضاحت میں یہ لکھتے ہیں تو اس بات کا ثبوت مل جاتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا ہے:

مرثیہ گویوں اور دیگر ذاکرین مصائب سید الشہداء علیہ السلام نے عموماً لوگوں کے ذہن نشین کردیا ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت جناب سکینہ بالکل بھولی اور ناسمجھ بچہ تھیں۔ مگر ذرا بھی تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امر بالکل بے بنیاد ہے۔ بچہ ہونا درکنار آپ جس وقت کربلا تشریف لے گئی ہیں بالغ ہی نہیں بلکہ بیاہی ہوئی تھیں۔ عبداللہ بن حسن جن کی کنیت ابوبکر تھی آپ کے شوہر تھے اور اپنے چچا اور خسر کے ساتھ اہل کوفہ کے ہاتھ سے

> شہید ہوئے ۔آپ کی شادی کا حال آغانی کی روایت سے پوری طرح ثابت ہے اور ابوبکر عبداللہ بن حسن کا میدان کربلا میں شہید ہونا تمام کتب تواریخ میں موجود ہے ۔[۱۵۶]

شرر نے حضرت سکینہ کے اوصاف حمیدہ کو بھی موثر انداز سے بیان کیا ہے اور اس بیان کے ذکر میں وہ ذیلی واقعات و حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کوئی واقعہ علیحدہ معلوم نہیں ہوتا ۔ اس کتاب کے مطالعے سے قاری پر واضح ہوتا ہے کہ شرر کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا؟ اور ان کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ جس کو وہ وقتاً فوقتاً قاری تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں ۔اس کتاب کے مطالعے سے اس عہد کی تعلیم وتربیت کا پتہ چلتا ہے ۔اس عہد کی تاریخ وثقافت کا اندازہ ہوتا ہے ۔شرر کہیں کہیں خطیبانہ وناصحانہ انداز بھی اختیار کرتے ہیں ۔شرر نے اس سوانح عمری میں حضرت سکینہ کی وضع قطع اور آپ کی شخصیت وکردار پر روشنی ڈالی ہے ۔لکھتے ہیں

> الغرض آپ جیسی پاکدامن پارسا اور نیک بی بی تھیں ویسی ہی زندہ دل اور بذلہ سنج بھی تھیں ۔معززین قریش آپ کی صحبت کو اپنا فخر سمجھتے تھے ۔اورمشہور شعرائے عرب آپ کی محفل میں جمع ہوتے تھے۔خود بھی ایسی طبع رسا رکھتی تھیں کہ اپنے عہد کی سب سے بڑی شاعرہ تسلیم کی گئی ہیں ۔قطع نظر اس کے عرب کے فیشن اور وضع پر آپ کا سب سے زیادہ اثر پڑتا تھا۔آپ ایسا خوبصورت اور بانکا جوڑا باندھتی تھیں جس سے اچھا جوڑا باندھنا کسی خاتون عرب کو نہ آتا تھا۔قطع نظر اس بانکپن اور وضع داری کے حسن و جمال میں بھی آپ اپنا نظیر نہ رکھتی تھیں ۔[۱۵۷]

شرر نے اس کتاب میں حضرت سکینہ کے عقد کی تفصیلات قاری تک پہنچائی ہیں اور دلائل سے ہر بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔اگر چہ غیر جانبدار رہیں ہیں لیکن کہیں کہیں سوانح نگار نے اپنا نقطہ نظر بھی واضح کیا ہے ۔شرر نے حضرت سکینہ کے شاعرانہ ذوق پر بھی روشنی ڈالی ہے

من آنم کہ من دانم (۱۹۶۴)

یہ عبدالحلیم شرر کی خودنوشت سوانح عمری ہے ۔اسے ہم آپ بیتی کے زمرے میں شمار کر سکتے ہیں ۔ جہاں تک آپ بیتی کا فن ہے ۔ یہ ایک مشکل فن ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ ’’آپ بیتی لکھی ہی

نہیں جا سکتی''۔[۱۵۸] اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ ''آپ بیتی میں صرف اپنی ذات کے تجربات ہی مندرج نہیں ہوتے بلکہ اس کے پس منظر میں خاندان کے کئی صدیوں کے تجربات بھی کارفرما ہوتے ہیں''۔[۱۵۹]

آپ بیتی لکھنا اس لیے بھی ممکن نہیں کہ کسی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے مکمل حالات زندگی قلم بند کر سکتا ہو کیونکہ بچپن کے حالات بیان کرنا جبکہ خود نوشت سوانح نگار کو خود کا شعور بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود خود نوشت سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے کہ لکھنے والا اپنی زندگی کے خاص خاص واقعات قلم بند کرتا ہے اور انہی کے ذریعے اپنی زندگی کی روداد بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے میں مشکل ترین مقام دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت کا جذبہ ہے۔ کوئی بھی آپ بیتی لکھنے والا اپنے آپ سے محبت کی بناء پر اپنے عیب بیان نہیں کرتا اور لکھتے وقت اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ تو وہ ہر بات سوچ سمجھ کر لکھتا ہے اور پردہ پوشی کرتا چلا جاتا ہے۔ جو اس کے مقام و مرتبہ کے خلاف ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان خود پسند ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ اگر چہ اس کی ذات میں کوئی صفت ہی موجود نہ ہو۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> آپ بیتی میں اگر کو یم زبان سوزد کی عفونت ہر ہر گام پر زنجیر پا بن جاتی ہے۔ سچ کہنا یوں بھی مشکل ہے۔ مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حالات کی خارجی روداد اپنے متعلق اور چشم دید تفصیل دوسروں کے متعلق بیان ہو سکتی ہے۔[۱۶۰]

عبدالحلیم شرر کی خود نوشت سوانح عمری میں اپنے متعلق کی گئی باتوں میں اخفا اور مبالغے کا امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے متعلق حالات کی خارجی روداد اور چشم دید واقعات کی تفصیل درست ہو سکتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا اپنی ساری خامیاں بیان کر دے گا یہ ممکن نہیں۔ آپ بیتی کے سلسلے میں یہ دعویٰ بالکل نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ شخصیت اور کردار کی ہو بہو نقل ہوگا۔ تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شرر نے آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنے فکر و فن، اپنے کارناموں، واقعات، اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی عکاسی مستند انداز میں کی ہے۔ جو ادب اور تاریخ کے لیے بیش بہا مآخذ ثابت ہوئی۔

شرر کی آپ بیتی کے مطالعے سے بہت سی مفید باتیں قاری کو مل جاتی ہیں۔ وہ باتیں جو تاریخ کی کتابوں میں ہمیں نہیں ملتیں وہ اس میں ملتی ہیں۔ شرر کے دور کی جھلک اور مخصوص تہذیب اس آپ بیتی میں دکھائی دیتی

ہے۔اس کی مدد سے ہم ایک قوم ،ایک ملت ،ایک ملک کی تہذیب کی ابتداء اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ جو تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری اور بڑی اہم ہے ۔ ثمر کی خودنوشت سوانح عمری میں سادگی اور بے ساختگی ،جذبات واحساسات کی ترجمانی ،واقعات ،ومناظر کی سادہ تصویر کشی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کہیں کہیں اظہار،آورد سے زیادہ آمد،ہدایت و حکایت کے عناصر ،موجود نہیں ۔ بقول ڈاکٹر ممتاز فاخرہ:

> اردو ادب میں ابتدا ہی سے خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد سوانح عمریوں کی بہ نسبت کم رہی ۔ یہاں اپنے نفس کا محاسبہ ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ جب کہ دوسروں کی زندگی کی تفصیلات جزئیات کو پیش کرنے کا رجحان زیادہ رہا ہے ۔دوسرا سبب یہ ہے کہ بڑا مشکل کام ہے جبکہ آپ بیتی کے لیے سچائی، بے باکی اور خلوص ازحد ضروری ہے ۔ اچھے سوانح نگار سے اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ وہ اعمال و افعال جو اس سے سرزد ہوتے ہیں انھیں دیانت داری و بے باکی سے بیان کردے گا۔......[۱۶]

و۔ بطور سوانح نگار شرر کا مقام و مرتبہ

حالی اور شبلی کی پیروی میں سوانح نگاری کی تحریک ابھری۔ حالی کی پیروی میں ادبی اور فنی سوانح نگاری کے رجحان نے ترقی کی۔ سوانح نگاری کے فن کی ترقی میں تحریک علی گڑھ نے اور ندوۃ العلماء تحریک کے حامیوں نے فعال کردار ادا کیا۔ ان ہی کی تصانیف نے دیگر سوانح نگاروں کی رہنمائی کی۔ علی گڑھ اور ندوۃ العلماء نے سوانح نگاری کو تحریک کی صورت بخشی تھی۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے متعلق اہل علم نے شبلی نعمانی کے نقش قدم پر چل کر ہر لحاظ سے جامع و مفصل سوانح عمریاں پیش کیں۔ ان کی سوانح عمریوں کے مقاصد وہی تھے جو شبلی نے متعین کیے تھے۔ انھوں نے اکابرین اسلام کے مذہبی، علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کو نمونے کے طور پر پیش کیا۔ تا کہ نئے عہد کے مسلمان متاثر ہو کر دین و دنیا کو سنوار سکیں۔ ان سوانح نگاروں نے صاحب سوانح کے حالات وواقعات میں کارناموں پر زیادہ زور دیا اور شخصیت و نجی زندگی پر کم، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی اور حالی کے زیر اثر ہی سوانح نگاری عام ہوئی اور شرر نے بھی انہی سے متاثر ہو کر سوانح عمریاں لکھیں۔ ڈاکٹر حسن وقار گل نے بجا لکھا ہے کہ: ''عبدالحلیم شرر بھی سوانح نگاری کے رجحانات سے متاثر ہوئے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی تصانیف مثلاً جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، سکینہ بنت حسین، خواجہ معین الدین چشتی، قرۃ العین اس کی مثالیں ہیں۔''[۱۶۴]

شرر کی سوانح عمریاں اگرچہ مختصر ہیں لیکن معروف و محترم اشخاص پر انہوں نے لکھا ہے۔ ان میں سے اکثر شخصیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور لکھا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی بعض پہلو تشنہ اور تفصیل طلب ہیں جو مزید تحقیق کی گنجائش رکھتے ہیں اور سوانح نگاروں کو دعوت فکر و عمل دے رہے ہیں۔ شرر کی سوانح عمریوں کی وجہ سے بھی اردو علم و ادب کو فائدہ پہنچا۔ اگرچہ مشاہیر ملک و ملت پر بہت اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی اور لکھی جارہی ہیں۔ شرر نے بھی ان کے حالات پر زیادہ لکھا ہے۔ جو بلحاظ تقدس و دیگر کارہائے نمایاں سے پہلے ہی ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی سوانح قدیم عربی کتب اور دیگر کتب میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق مستقل کتب بھی موجود ہیں۔ ان کی عزت و وقعت صدہا سال سے لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ شرر نے جن بزرگوں پر لکھا ہے وہ آج کے دور میں بھی کارآمد اور مفید ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق:

> ایسے بزرگوں کے تذکرے، جنھوں نے اپنے تن من دھن کو تحصیل علم، تزکیہ نفس یا رضا جوئی باری تعالیٰ میں وقف کر دیا تھا۔ اس زمانے کے لیے بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے ۔ پند و نصائح اور اخلاقی کتب اس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر ان لوگوں کے تذکرے جو

خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے۔......[۱۶۳]

شرر نے جن بزرگوں اور جن اشخاص کی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ان میں کوئی نئی اور انوکھی بات بیان نہیں کی۔لیکن شرر کی سوانح عمریاں مواد کے لحاظ سے منفرد ہیں۔شرر نے صاحب سوانح کی ملکی و ملی خدمات کا ذکر اور ان کے نتائج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔شرر نے علمائے سلف کی سوانح عمریاں لکھ کر اپنے اخبار مہذب میں شائع کیں۔جس کے متعلق محمد یحییٰ تنہا نے لکھا ہے کہ:''۱۸۹۰ء مولانا نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کر دیا جس کا نام مہذب تھا۔ہر پرچے میں علمائے سلف میں سے کسی کی سوانح عمری بھی لازمی طور پر شائع ہوتی تھی''۔[۱۶۴]

اس سے معلوم ہوا کہ شرر کی سوانح عمریاں ''مہذب'' میں چھپا کرتی تھی۔اور دوسری بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۹۰ء میں آپ نے علمائے سلف کی سوانح عمریوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔شرر نے جتنی بھی سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں جن کو شہرت نصیب ہوئی وہ بقول سید سلمان ندوی:''......سوانح عمریوں میں خاتم المرسلین، ابوبکر شبلی اور جنید بغدادی ان کی مشہور تالیفات ہیں''[۱۶۵] شرر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یک رخی تصویر دکھاتے ہیں، اگر ان کی سوانح عمری کا بغور مطالعہ کیا جاتا تو یہاں یہ صورت حال کم دکھائی دیتی ہے۔بقول فیض احمد فیض:

> ......وہ ہر کردار کا صرف ایک ہی رخ پیش کرتے ہیں۔اگر کوئی شخص بہادری کے لیے مشہور ہے تو ہمیں صرف اس کی شجاعت کے قصے سنائے جاتے ہیں۔اگر کسی کی سخاوت کا شہرہ ہے تو ہمیں صرف اس کی سخاوت کے واقعات دکھائے جاتے ہیں۔اگر کوئی چالباز بدنیت ہے تو ہمیں اس کی فطرت کا یہی کونہ دکھائی پڑتا ہے۔[۱۶۶]

شرر کی سوانح عمریوں میں ایک خاص قسم کا وفور، جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے کتاب میں دلچسپی شروع سے آخر تک قائم و دائم رہتی ہے۔شرر کی سوانح عمریوں میں کئی واقعات محض خوبصورتی اور دلچسپی اور ناظرین کی معلومات کے لیے شامل کیے جاتے ہیں۔ان کی سوانح عمریوں کو پڑھ کر ناظرین میں خود داری کا احساس جنم لیتا ہے۔گذشتہ تاریخ اسلام کے تذکروں سے یہ احساس بڑھتا ہے۔جذباتی تسکین بھی ہوتی ہے۔کہ ہم نہ سہی ہمارے آباؤاجداد تو بہادر تھے ان میں تو کئی کئی خوبیاں تھیں۔دوسری قوموں اور دوسرے افراد کی برائیاں بیان کر کے ذہنی طور پر اپنی موجودہ شکست کا انتقام لیا جاتا تھا۔شرر نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں جن

شخصیات کو اس فن کے لیے منتخب کیا ان کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> شبلی کی طرح شرر نے بھی اسلاف میں سے برگزیدہ اشخاص کو منتخب کر کے ان کی سیرتوں کو مشعلِ راہ بنانے کی اپیل کی ہے۔شبلی نے جہاں پر معمولی ہستیوں کی مکمل زندگیوں کو پیش کیا ہے وہاں شرر نے محض دلچسپ (گو تاہلِ توجہ) شخصیتوں کی ہمہ رنگ سیرتوں کے صرف چند پہلوؤں کے خاکے پیش کیے ہیں۔مگر اس غرض سے کہ قوم کو ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔غرض قومی ترقی و اصلاح ان سب کے پیش نظر رہی۔ اور یہ نصب العین تھا جو سرسید کا دیا ہوا تھا۔سرسید نے اردو سوانح نگاری کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو انہوں نے یہ انداز نظر عام کر دیا ہے۔ اس کے سبب اردو سوانح نگاری ادب کی دوسری شاخوں کی طرح قوم اور اجتماع کی خادم بنی رہی۔[۱۶۷]

شرر نے جب سوانح عمریاں لکھنی شروع کیں اس وقت اردو میں سوانح نگاری کے لیے بالواسطہ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ یہ بجا ہے کہ شرر اور صاحب سوانح میں روحانی وجذباتی قربت موجود تھی۔مگر جسمانی قربت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔شرر کی توجہ ہیرو کے حالات زندگی سے زیادہ شخصیت اور اس کے کارنامے اور واقعات نمایاں کرنے پر رہتی ہے۔یہ رجحان ان کی سب سوانح عمریوں میں پایا جاتا ہے۔شرر کی سوانح عمریوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ شرر کا مقصد اپنے ہیرو کی عظمت نمایاں کرنا تھی۔جس میں وہ یقیناً کامیاب بھی ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنی سوانح عمریوں کے ذریعے سے وہ علم جو خواص تک محدود تھا۔عوام الناس تک پہنچانے کی بھرپور سعی کی۔شرر نے ہر سوانح عمری میں صاحب سوانح کی زندگی اس کی خدمات کے بارے میں لکھا ہے۔ اور اس کی ولادت سے وفات تک کے حالات کسی میں تفصیلاً اور کسی میں مختصراً بیان کئے ہیں۔ہیرو کی ملکی وقومی اور مذہبی خدمات کو پیش کیا ہے۔

شرر کی سوانح عمریوں میں اسلوب بیان کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شرر سے منسوب ہیں۔فقرے سادہ اور عام فہم ہیں۔تحریر سے صداقت، خلوص اور ہمدردی عیاں ہوتی ہے۔شرر کی تحریر میں کہیں کہیں افسانوی رنگ بھی نظر آتا ہے۔جس کا سبب یہ ہے کہ شرر ایک ناول نگار تھے۔اور افسانوی انداز بیان کو شعوری یا لاشعوری طور پر وہ برتتے ہیں۔اور ان کے جملوں اور ان کی تحریروں میں جابجا ہمیں یہ رنگ نظر آتا ہے۔شرر کے دور میں حالی وشبلی اور سرسید نے اچھی سوانح عمریاں لکھیں۔اس کے برعکس ڈپٹی نذیر احمد اور شرر نے مختصر سوانح عمریاں لکھیں

۔ان کے متعلق ڈاکٹر حسن وقار گل لکھتے ہیں: ’’اسی دور کے سوانح نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد اور عبد الحلیم شرر کے نام بھی شامل کیے جاسکتے ہیں ۔جن کے قلم سے مختصر سوانح عمریاں وجود میں آئیں‘‘ ۔[۱۶۸]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر کی تمام تر سوانح عمریاں اس دور کے دیگر سوانح نگاروں کے مقابلے میں مختصر ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی یہ سوانح عمریاں اردو ادب میں ایک خاص مقام کی حامل ہیں ۔مختصر ہوتے ہوئے بھی ان کی سوانح عمریاں پڑھنے کے قابل اور دلچسپ ہیں ۔ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں ۔ان کو پڑھ کر قاری حظ اٹھاتا ہے ۔ان سے درس بھی ملتا ہے ۔شرر نے اسلامی، مذہبی اور تصوف کے راستے پر چلنے والی حیثیتوں کو یہاں بطور موضوع منتخب کیا وہاں انہوں نے دیگر اشخاص کی سوانح عمریاں بھی قلم بند کیں ۔مشہور و معروف عورتوں پر بھی لکھا ۔یہ تمام سوانح عمریاں شرر نے قومی ترقی کی غرض سے لکھی تھیں ۔شبلی کی طرح انہوں نے بھی اسلاف میں سے برگزیدہ اشخاص کو منتخب کر کے ان کی سیرتوں کے صرف نمایاں پہلوؤں کے خاکے پیش کیے ۔تاکہ قوم کچھ سیکھے اور ان کے اندر ایک بار پھر شکوہ سلطنت اسلامی جاگزیں ہو ۔شرر اپنے اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ۔ان سوانح عمریوں میں تسلسل موجود ہے ۔قاری متاثر ہوتا ہے ۔دنیا و عاقبت کے متعلق نظریات قاری کے سامنے اجاگر ہوتے ہیں ۔

شرر کی تحریروں میں جوش وجذبہ کی فراوانی پائی جاتی ہے ۔ان سوانح عمریوں میں بھی یہ عنصر موجود ہے ۔ان کا انداز بیانیہ ہے ۔سوانح عمریوں کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری اسی فضا اور ماحول میں ہے اور ہر منظر، ہر واقعہ اپنی نگاہوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہا ہے ۔ان سوانح عمریوں میں شرر کا تاریخی شعور اور افسانوی انداز کہیں کہیں جھلکتا ہے ۔ان میں مقصدیت بھی پائی جاتی ہے اور سوانح نگار کا تبلیغی اور ترغیبی انداز بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے ۔ان سوانح عمریوں میں شرر کے اسلوب کی ساری خوبیاں موجود ہیں ۔منظر کشی، تشبیہات واستعارات کا استعمال، سادہ اور طویل جملے، صداقت، خلوص، ہمدردی، روانی وتسلسل پایا جاتا ہے ۔شرر اس انداز سے عبارت لکھتے ہیں کہ عام قاری بھی ان کے خیال کو سمجھ سکتا ہے ۔شرر کی تحریر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جوئے شیر ہے جو چلتی جارہی ہے ۔اگر چہ ان سوانح عمریوں میں خامیاں بھی موجود ہیں ۔لیکن ان خامیوں سے درگزر کیا جاسکتا ہے ۔اگر اس دور کے حالات وواقعات کو ہم سامنے رکھیں ۔شرر چونکہ زود نویس بھی تھے ۔وہ جو کچھ تحریر کرتے تھے اس پر نظر ثانی بہت کم کرتے تھے ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمریوں میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں ۔

ان سوانح عمریوں میں صحابہ اکرام اور خلفائے راشدین کے اقوال بھی ملتے ہیں اور رسول پاک ﷺ کے ارشادات بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں ۔مختلف احادیث بھی نقل کرتے ہیں ۔شرر کا علم اور مطالعہ وسیع تھا جس کا اندازہ ان سوانح عمریوں کے مطالعے سے ہوتا ہے ۔منظر کشی کے اعلیٰ نمونے ان سوانح عمریوں میں موجود ہیں ۔منظر نگاری میں شرر کی قوت بیاں، زور قلم اور شاعرانہ مزاج نظر آتا ہے ۔اور بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔دلچسپی کے عناصر بھی ان سوانح

عمریوں میں موجود ہیں ۔واقعات کے بیان میں تسلسل پایا جاتا ہے ۔ اگر کوئی ذیلی واقعہ سوانح نگار پیش کرتا ہے تو اس انداز سے کہ تسلسل میں کمی نہیں آتی ۔کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے ۔ یہ انداز بھی ان کے اسلوب کو خوبصورت اور دلکش بنا دیتا ہے ۔مختلف تاریخی واقعات ،تاریخی شخصیات ،بادشاہوں اور جنگوں کے تذکرے بھی ان سوانح عمریوں میں موجود ہیں ۔ جو قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں ۔ان سوانح عمریوں کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ سوانح نگار کے فرائض کو اچھی طرح سمجھتے تھے ۔وہ اپنے ہیرو سے مکمل واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں ۔اس کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں ،انہوں نے جن شخصیات کو منتخب کیا ہے ان سے محبت و ہمدردی رکھتے تھے ۔جس کا ثبوت ان سوانح عمریوں کے مطالعے کے بعد ہوتا ہے ۔واقعات کے بیان میں طرف داری سے کام نہیں لیا۔سیاسی اور مذہبی طرف داری سے بالاتر ہو کر انہوں نے سوانح عمریاں لکھی ہیں ۔سوانح نگار نے ہیرو کے حسب ونسب کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے ۔انہوں نے کوشش کی ہے کہ صاحب سوانح کو مبلغ اور ناصح کے رنگ میں پیش کرنے سے گریز کیا جائے ۔ ان کی سوانح عمریاں مختصر ہیں ۔ بے جا طوالت ان میں نہیں پائی جاتی ۔

سوانح نگار کو ایک اچھا ادیب ہونا چاہیے ۔اس کو اپنی تحریر میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرنی چاہیے ۔اس کی زبان میں سلاست اور روانی ہونی چاہیے ۔اس کا انداز بیان کافی سلجھا ہوا ہونا چاہیے ۔سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے بیان میں فکر وفن کی آمیزش کرے ۔ ان کی سوانح عمریوں کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اگر شرر کچھ اور نہ لکھتے اور ساری توجہ اور سارا زورِ قلم اس صنف ادب کے لیے وقف کرتے تو وہ بڑے پائے کے سوانح نگار ہوتے ۔ اور آج ان کا نام بھی حالی وشبلی کے ساتھ لیا جاتا ،ان سوانح عمریوں کے مطالعے کے بعد ان کی اس ادبی حیثیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک اچھے سوانح نگار تھے ۔اوران کی سوانح عمریاں بھی ادب میں اضافے کا سبب بننے کے قابل ہیں ۔شرر نے سوانح نگاری کے لیے ایک مخصوص زبان بنائی ۔ان کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے ۔ثقیل الفاظ بہت کم ہیں ۔ اگر چہ ان سوانح عمریوں میں مبالغہ کی آمیزش ہے مگر اس قدر کہ وہ حقیقت کی سرحد سے ملا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ اپنے بیانات کو پُر زور اور دلکش بنانا چاہتے تھے ۔شرر کی سوانح عمریاں قاری کو اس بات پر اکساتی ہیں کہ وہ چند لمحوں کے لیے زمانہ حال اور اپنے ماحول کو فراموش کر کے دنیا کے افکار سے آزاد ہو کر ماضی کی طرف لوٹ جائے ۔اس عہد قدیم کو اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھے اور درس عبرت کے ساتھ ساتھ اسلام کی شان وشوکت کے نقوش اپنے ذہن پر ثبت کرے

حوالہ جات

۱۔ محمد انیس الرحمٰن، انیس سخن، علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۵۲

۲۔ مولانا حامد علی خان، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد اوّل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۸۴۴

۳۔ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، مکتبہ جدید المعارف، لاہور، ۱۳۹۲ھ، ص۵۵

۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص۵۵

۶۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص۹۴۴

۶۔ احمد ندیم قاسمی، اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۶۲۲

۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، جلد ۱۱، ۱۹۷۵ء، ص۵۰۶

۸۔ محمد علی الفاروقی تھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، س۔ن، ص۲۶۳

۹۔ محمد طفیل، نقوش، رسول نمبر، جلد ۱، دسمبر ۱۹۸۲ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص۲۱۷

۱۰۔ مسرت شوکت چیمہ، اسلامک ایجوکیشن اینڈ کلچر، اسلامک ایجوکیشن ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۱۴۴

۱۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، فوائد جامعہ بر مجالہ نافعہ شرح مولانا عبدالحلیم چشتی، مکتبہ ندا رد، س۔ن، ص۴۸

۱۲۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، اردو میں سیرت رسولؐ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۶

۱۳۔ عبدالقدوس ہاشمی، سیرت انبیا کمال انسانیت، ماہنامہ فکر و نظر، اپریل ۱۹۷۵ء، ص۵۷۶

۱۴۔ سورۃ الحجرات، آیت نمبر ۴۹۔۵۰

۱۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۱۳۸

۱۶۔ خواجہ عابد نظامی، میاں دو کریم، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۲۴

۱۷۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری، پیغمبر انسانیت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۸۔ سید سلیمان ندوی، خطبات مدارس، المکتبہ الاثریہ سانگلہ، شیخوپورہ، ۱۹۲۶ء، ص۴۳

۱۹۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۲۹

۲۰۔ مصباح الدین شکیل، سیرت احمد مجتبیٰ، پیش لفظ، محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص۲۹۔۳۰

۲۱۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، اردو نثر میں سیرت رسولؐ، ص۴۴

۲۲۔ ایضاً، ص۶۱۹

۲۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۲۹ء، ص ۵۴۹۔۵۰۵

۲۴۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، جلد اوّل، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۰

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۲۹۔ عبدالحلیم شرر، فلورا فلورنڈا، پیش لفظ، اشرف حسینی، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۸

۳۰۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، انڈین بک ڈپو لکھنو، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۱

۳۱۔ محمد احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادارہ فروغ اردو لکھنو، ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۶

۳۲۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، ص ۳۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۶۔۳۷

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۴

۳۵۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، جلد اوّل، ص ۶۱

۳۶۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں،، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۸۷

۳۷۔ شوکت زیدی، طاق نیساں، ویلکم بک پورٹ پرائیویٹ لمٹیڈ، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۲

۳۸۔ نثار احمد (مرتبہ)، نقش سیرت، ص ۱۷، بحوالہ ڈاکٹر انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسولؐ ص ۶۶۷

۳۹۔ شاہ محمد جعفر پھلواری، پیغمبر انسانیت، مقدمہ، مولانا حسن مثنی ندوی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ک

۴۰۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، فلیپ محمد علی قریشی باقر، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۸۶ء

۴۱۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳

۴۲۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ضمیمہ قہر تسکین، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲

۴۳۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ص ۶۴

۴۴۔ سلیمان منصور پوری، رحمۃ اللعالمین، ص ۶۲

۴۵۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ص ۱۱۵

۴۶۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ص ۹۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۴۸۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۳۲۷

۴۹۔ ابن ہشام، سیرت النبی کامل، جلد اوّل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۴۹۰

۵۰۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ص ۲۵۳

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۲۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۸۵۔۳۸۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۹۲

۵۴۔ ایضاً، ص ۴۴۹

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۶۲

۵۶۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۳۴۵

۵۷۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ص ۲۵۸

۵۸۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ص ۴۷۹، ۴۸۰

۵۹۔ ایضاً، ص ۴۸۱

۶۰۔ مولانا عبدالحلیم شرر، جویائے حق، ص ۲۲

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۵

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۶۳۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۰۱، ۱۰۲

۶۴۔ انعام الحق کوثر، سیرت پاک کی خوشبو، پیش لفظ، سلطان الطاف علی، پروفیسر، ڈاکٹر،، سیرت اکادمی بلوچستان، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

۶۵۔ پیر مونس زبیری، یار غار، میسکو بلیو ایریا، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۱

۶۶۔ غلام ربانی، پروفیسر، حیات قدسیہ، مکتبہ بحر العلوم، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۹

۶۷۔ مولانا امین مصطفےٰ، قرآنی شخصیات، علامہ راشد الخیری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۴۵

۶۸۔ عبدالحلیم شرر، مولود شریف، دلگداز پریس لکھنو، س۔ن، ص ا

۶۹۔ ایضاً، ص ۷

۷۰۔ شان الحق حقی، پیش لفظ، ماہ نو، سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم، ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۶

۷۱۔ ثاقبہ رحیم الدین، محفل تنہائی، پکچوریل پرنٹرز لمٹیڈ، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۱

۷۲۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، ص ۹

۷۳۔ مولانا حامد علی خان، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۹۱۷

۷۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی نثر کی اصناف، مشمولہ نقوش، شمارہ۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص۸۹

۷۵۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادبی اشارے، نسیم بک ڈپو لکھنو، س۔ن، ص۱۴۶

۷۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، ص۱۲۳

۷۷۔ رام نرائن گپتا (دیباچہ)، مہاراجہ اشوک، پرکاش دیو، جارج سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۷ء، ص ا

۷۸۔ عبدالحلیم شرر، سیر رجال، الیس عبدالرشید اینڈ برادارز، لاہور، س۔ن، ص۴۸۔۴۹

۷۹۔ سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، احباب پبلشرز لکھنو، ۱۹۶۳ء، ص۱۴۰

۸۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء، ص۸۵

۸۱۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، حالی اور شبلی سوانح نگاری کی حیثیت سے، مشمولہ نگار پاکستان، ۱۹۶۶ء، ص۲۰۵

۸۲۔ عبدالحلیم شرر، ثانی اثنین، دلگداز پریس لکھنو، س۔ن، ص ا

۸۳۔ ایضاً، ص ا۔۲

۸۴۔ عبدالحلیم شرر، ابوالحسنین، دلگداز پریس لکھنو، ۱۹۲۵ء، ص ا

۸۵۔ ایضاً، ص۱۰

۸۶۔ ایضاً، ص۶۱

۸۷۔ ایضاً، ص۷۰

۸۸۔ عبدالحلیم شرر، جنید بغدادی، دلگداز پریس لکھنو، ۱۹۲۳ء، ص۳

۸۹۔ ایضاً، ص ا

۹۰۔ ایضاً، ص۸

۹۱۔ ایضاً، ص۳۲

۹۲۔ ایضاً، ص۴۵

۹۳۔ ایضاً، ص۸۵،۸۶

۹۴۔ ایضاً، ص۱۱۴

۹۵۔ عبدالحلیم شرر، سفرنامہ امام شافعی، دلگداز پریس لکھنو، ۱۹۲۴ء، ص ا

۹۶۔ ایضاً، ص۶

۹۷۔ ایضاً، ص۸

۹۸۔ عبدالحلیم شرر، ابوبکر شبلی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۶ء، ص۲

۹۹۔ ایضاً، ص۳

۱۰۰۔ ایضاً، ص۳

۱۰۱۔ ایضاً، ص۵

۱۰۲۔ ایضاً، ص۲

۱۰۳۔ ایضاً، ص۱۵۱

۱۰۴۔ ایضاً، ص۱۵۲

۱۰۵۔ عبدالحلیم شرر، خواجہ معین الدین چشتی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۷ء، ص۱

۱۰۶۔ ایضاً، ص۲

۱۰۷۔ ایضاً، ص۲

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۲

۱۰۹۔ ایضاً، ص۳

۱۱۰۔ ایضاً، ص۱

۱۱۱۔ ایضاً، ص۱

۱۱۲۔ سید الیاس رضوی، سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص۱۱

۱۱۳۔ عبدالحلیم شرر، خواجہ معین الدین چشتی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۷ء، ص۱

۱۱۴۔ ایضاً، ص۱۰

۱۱۵۔ ایضاً، ص۱۲

۱۱۶۔ ایضاً، ص۱۴

۱۱۷۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، فیروز سنز، راولپنڈی، ۱۹۵۸ء، ص۲۲۷

۱۱۸۔ ایضاً

۱۱۹۔ عبدالحلیم شرر، خواجہ معین الدین چشتی، ص۲۸، ۲۹

۱۲۰۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص۲۲۵

۱۲۱۔ سید الیاس رضوی، سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی، ص ۷

۱۲۲۔ عبدالماجد دریا آبادی، معاصرین مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن، ص ۱۱۷

۱۲۳۔ عبدالحلیم شرر، حسن بن صباح، حافظ محمد الدین اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ٦۴

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۲

۱۲۵۔ سید الیاس رضوی، سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی، ص ط

۱۲۶۔ ایضاً، ص ٦

۱۲۷۔ عبدالحلیم شرر، قاضی ابو یوسف، اسلامی سوانح عمریاں، وحید بک سینٹر، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۳۸، ۳۹

۱۲۸۔ عبدالحلیم شرر، ابن صائغ اندلسی، اسلامی سوانح عمریاں، ص ۴۰

۱۲۹۔ عبدالحلیم شرر، ابن سمعون، اسلامی سوانح عمریاں، ص ۴۳

۱۳۰۔ عبدالحلیم شرر، ابوالاسود دوئلی، صد پارہ دل/شاہکار شرر، قومی کتب خانہ، دہلی، س۔ن، ص ۴۔۵

۱۳۱۔ عبدالحلیم شرر، ابن القراقر سمغانی، صد پارہ دل/شاہکار شرر، ص ۴۸

۱۳۲۔ عبدالحلیم شرر، صد پارہ دل/شاہکار شرر، ص ۵۵

۱۳۳۔ عبدالحلیم شرر، نام وران عالم (مرتب) سید ظہور الحسن، قومی پریس، دہلی، س۔ن، ص ا

۱۳۴۔ عبدالحلیم شرر، جان عالم، محمد طفیل، حرف ناشر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۹

۱۳۵۔ عبدالحلیم شرر، جان عالم، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۱۳، ۴۰

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۷۔ عبدالحلیم شرر، مانی، مضامین شرر، جلد ہفتم، نظم و ڈراما، س۔ن، ص ۱۱۵

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹

۱۴۰۔ عبدالحلیم شرر، قرۃ العین، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۳ء، ص ا

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۴

۱۴۲۔ ایضاً، ص ۴

۱۴۳۔ ایضاً، ص ٦

۱۴۴۔ عبدالحلیم شرر، زبیدہ خاتون، مشمولہ مخذرات، مہتاب پریس، دہلی، ۱۹۲۳ء، ص ا

۱۴۵۔ عبدالحلیم شرر، ام الخیر رابعہ بصری، مخذرات مہتاب پریس، دہلی، ۱۹۲ء، ص ٦

۱۴٦۔ سیدہ صدادا اسکا کینی، مترجم عبدالصمد صارم الازہری، رابعہ بصری، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹٦۰ء، ص ۱۳۴

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۱۴۸۔ عبدالحلیم شرر، ملکہ زنوبیہ، مجذ رات، ص ۵۷، ۵۸

۱۴۹۔ عبدالحلیم شرر، رابعہ شامیہ، مجذ رات ۱۹۲۳ء، ص ۱۳

۱۵۰۔ آغا محمد باقر، تاریخ نظم ونثر اردو، شیخ مبارک علی تاجران کتب، لاہور، ۱۹۴۵ء، ص ۲۳۳، ۲۳۴

۱۵۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص ۵۴۶

۱۵۲۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مشمولہ، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت، مملوکہ خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۱۰ء، ص ۸۱

۱۵۳۔ عبدالحلیم شرر، سکینہ بنت حسین، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۴ء، ص ۲

۱۵۴۔ ایضاً، ص ۵

۱۵۵۔ ایضاً، ص ۶

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۷

۱۵۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۵۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، آپ بیتی، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۶۷

۱۵۹۔ ایضاً، ص ۶۷

۱۶۰۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۶۱۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، خودنوشت سوانح عمریاں، مشمولہ، سہ ماہی اردو، شمارہ۔۱، ۱۹۸۵ء، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ص ۸۲

۱۶۲۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۴۹

۱۶۳۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، افکار عبدالحق، مرتب: آمنہ صدیقی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۲۰۰

۱۶۴۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین، ص ۵۹۱

۱۶۵۔ سید سلیمان ندوی، یادرفتگان، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۵۷

۱۶۶۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۶

۱۶۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید کا اثر ادبیات اردو پر، مشمولہ بہترین ادب، مرتب: مرزا ادیب، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۳۱

۱۶۸۔ حسن وقار گل، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، ص ۴۸

باب سوم

عبدالحلیم شرر بحیثیت مضمون و مقالہ نگار اور انشائیہ نگار

الف۔ مضمون نگاری......آغاز و ارتقاء

وہ معلوماتی تحریر جس کا تعلق زندگی کے حقائق اور مسائل سے ہو، موضوع خشک اور واعظانہ نہ ہو اور ادبی انداز میں نہایت شگفتگی کے ساتھ لکھی جائے، مضمون کہلاتی ہے۔ مضمون یا Essay ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو جدید دور کی پیداوار ہے۔ یہ صنفِ ادب انگریزی سے اردو میں آئی ہے۔ اس میں ہر قسم کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ وہ مسائل چاہے سماجی ہوں یا تہذیبی، ثقافتی ہوں یا تنقیدی و اقتصادی مگر شرط یہ ہے کہ جو بات کی جائے اختصار کے ساتھ کی جائے، ورنہ مضمون مقالے کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ مضمون میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث تفصیل کے ساتھ نہیں کی جاتی بلکہ کسی ایک بات یا کسی ایک نکتہ کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ مضمون نگار کسی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے شگفتگی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور تھوڑی بہت خیال آرائی بھی کرتا ہے۔ مضمون نگار کی ذات کی جھلک بھی کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ قومی انگریزی اردو لغت میں اس کے معنی یہ ہیں:

> ''کاہش، کاوش؛ کوشش، جہد، جواب مضمون، انشا، مضمون، تگ و تاز، تگ و دو، جانفشانی، محنت، کوئی کام انجام دینے کے لیے کی گئی کوشش، آزمائش، سعی، امتحان یا تجربہ، مختصر ادب پارہ جس کا مقصد کسی خاص نکتے کے اثبات یا موضوع کی توضیح و تعبیر ہو۔[1]

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مضمون کی تعریف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> اُردو مضمون کی طرح انگریزی کا لفظ Essay بھی کثیر المفہوم ہے۔ جس طرح عام علمی تحریروں کے اُردو میں مقالہ کے علاوہ جلدوں کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح انگریزی میں مختلف علمی موضوعات پر لکھی گئی تحریروں کے لیے دوسرے الفاظ (پیپر، آرٹیکل) کے علاوہ Essay کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے بلکہ انگریزی میں تو یہ لفظ نثر کے علاوہ بعض منظومات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں Essay کے

معنی ایک ادبی اصطلاح کے طور پر بیان کیے گئے ہیں:

A composition of moderate lengthon any particular subject, or branch of a subject, originally implying want of finish, an irregular, indigested piece (J), but now said of a composition more less elaborate in style, though limited in range.

جانسن جس کا حوالہ مذکورہ بالا بیان میں دیا گیا ہے خود بھی ایک صاحب طرزِ مضمون نگار تھا، **Essay** کے بارے میں اس کا خیال یہ ہے:

a losse sally of the mind, an irregular, indigested picce not a regular and orderly performance.

مضمون کی ماہیئت کے بارے میں یہ بیانات کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں ......انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، کی تعریف اس سے کسی قدر واضح ہے، اگر چہ مکمل وہ بھی نہیں۔

As a from of literature, the essay is a composition of moderate length usually in prose, which deals in an easy, cursory way with the external condition of a subject, and, in strictness, with that subject only as it affects the writer.

[Encyclopaedia Britannica, Eleventh Edition]

اس تعریف کے مطابق ایک ادبی فنون میں چار باتیں ضروری ہوئیں۔ اوّل: مضمون درمیانی طوالت کا حامل ہو، دوم: نثر میں ہو، سوم: آسان اور سرسری انداز میں موضوع کے

خارجی حالات بیان کرے، چہارم :موضوع سے صرف اس حد تک عہدہ برآ ہو جس حد تک لکھنے والے کی ذات اس سے متاثر ہوتی تھی، اس میں شخصی زاویہ نظر پایا جائے۔[۲]

مضمون، انشائیے اور مقالے میں بہت فرق ہے۔مضمون سنجیدہ تحریر کی حیثیت رکھتا ہے۔مضمون کا مقصد کسی مسئلے کی وضاحت کرنا یا پھر کسی بھی موضوع سے متعلق باتوں کو قارئین تک پہچانا ہے۔مضمون لکھنے والے کا لب ولہجہ سنجیدہ ہوتا ہے۔سنجیدگی کے ساتھ وہ اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔مضمون لکھنے والا اپنی علمیت اور اپنی سوچ سمجھی رائے کا اظہار کرتا ہے۔مضمون میں موضوع کو اولیت دی جاتی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر مضمون کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:''مضمون کے ہر موضوع کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے جس سے اس کا دائرۂ کار متعین ہوتا ہے......''۔[۳]

مضمون کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:''مضمون ایک وسیع لفظ ہے۔مضمون میں ہم زندگی کے ہر شعبہ کو پیش کر سکتے ہیں لیکن خاص طور سے علمی، معلوماتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات کو مضمون میں پیش کیا جا سکتا ہے......''۔[۴]

ڈاکٹر سیّد شاہ علی کے خیال میں:

> دورِ جدید میں مضمون نگاری کو انگریزی نثر کی ایک مشہور صنف کی حیثیت حاصل ہے۔اس کا تعلق معلوماتی ادب سے نہیں بلکہ اقتداری ادب سے ہے۔معلوماتی ادب قاری کو وہ چیزیں ودیعت کرتا ہے جن سے وہ نابلد ہے لیکن مضمون نگاری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بھی افادیت کی حامل ہے۔وہ آرٹ کی ایک شکل ہے۔مضمون کا پہلا کام ایک اچھی تصویر کی طرح مسرت زائی ہے لہٰذا مضمون کی پہلی خصوصیت ایک آرٹ اور ادب کی شکل کی حیثیت سے نہیں بھلائی جانی چاہیے۔[۵]

ڈاکٹر بشیر سیفی مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ......مضمون کی اصطلاح ہر قسم کے مضامین ومقالات کے لیے بے تکلّف استعمال کی جاتی ہے چنانچہ علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، سوانحی، فلسفیانہ اور اصلاحی موضوعات پر مختصر تحریریں مضمون ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔[۶]

ڈاکٹر سید محمد حسنین مضمون کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ہر وہ بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، عام زبان میں مضمون سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ یہ مضمون بڑا گول سا لفظ ہے۔ اس میں ویسا ہی ابہام ہے جو لفظ کہانی میں ہے..... لفظ کہانی کی طرح یہ بھی ایک گول سا لفظ ہے۔ اس کے دائرے میں بہت سی باتوں کے سما جانے کی خاصی گنجائش ہے۔[۷]

اردو ادب میں مضمون اور مقالہ دو ایسی نثری اصناف ہیں جن میں خطِ امتیاز کھینچنا بہت مشکل ہے۔ مضمون اور مقالہ کو عموماً متبادل معانی میں استعمال کیے جانے کا رواج ہے۔ مضمون اور مقالہ سے عموماً یہ تصوّر لیا جاتا ہے کہ ان میں مذہبی، معاشرتی، ادبی یا کسی علمی موضوع کو سنجیدگی اور مدلل طریقے سے تحریر کیا جاتا ہے۔ اردو نثر کے ابتدائی دور میں مضمون اور مکالمہ کی ابتدائی شکل رسالہ تھی۔ رسالہ سے مراد کسی ایک موضوع پر مربوط اور مسلسل خیال آرائی کا ایک کتابچہ ہے جو نہ تو مضمون کے اختصار کا حامل ہوتا ہے اور نہ وہ کتاب کی حدود میں شامل ہوتا ہے۔ رسالہ میں طوالت و اختصار کا انحصار موضوع پر ہوتا ہے۔ رسالے کو مقالہ اور مضمون نگاری کی صنف کا نقشِ اوّلین تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

اردو میں نثر نگاری کا آغاز دکن سے آٹھویں صدی ہجری میں ہوا۔ اردو قدیم نثر کے نمونے متفرق طور پر صوفیانہ اور مذہبی مسائل پر مشتمل ہیں جو عربی و فارسی سے ترجمہ شدہ ہیں۔ قدیم اردو میں نثر کا سرمایہ زیادہ تر تراجم پر مشتمل ہے۔ ان کی نثری ہیئت رسالوں کی ہے جو نہ تو ضخامت میں کتاب کا حجم رکھتے ہیں اور نہ مضمون یا مقالے کے اختصار کے حامل ہیں۔ اردو میں مقالہ نویسی کا آغاز سر سید تحریک سے ہوا۔ شمالی ہندوستان میں اردو نثر فورٹ ولیم کالج کی ترجمہ شدہ داستانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد مکاتیبِ غالب کا نمبر ہے۔ یہ مکاتیب اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی کے نمونے ہیں لیکن انھیں مقالہ نویسی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ان کی حیثیت شخصی و ذاتی ہے۔ البتہ جہاں جہاں غالب نے اپنے عہد کے شعری اور لسانی مسائل کی بحث چھیڑی ہے ان کے تنقیدی رنگ سے ان پر مقالہ نگاری کا شائبہ ہوتا ہے۔ اردو نثر میں مضمون نویسی و مقالہ نگاری کو مذہبی تحریکوں نے بڑی تقویت بخشی۔ اس ضمن میں سید احمد شہید، عبد القادر کی تحریروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان بزرگوں نے مذہب اسلام کے فروغ اور دینی تعلیمات کی تشہیر کی خاطر مختلف کتب و رسائل آسان اردو میں تحریر کیے۔ سید احمد شہید کی تحریک سے جو تصانیف معرضِ وجود میں آئیں، ان کی ہیئت کتابوں اور رسالوں کی ہے۔

مقالہ نگاری کے جدید تصوّر کا آغاز سر سید احمد خاں کی تحریک سے ہوا۔ مقالہ اور مضمون میں بنیادی فرق یہ

ہے کہ مقالہ موضوعاتی اعتبار سے مضمون سے زیادہ سنجیدہ اور طویل ہوتا ہے۔اس میں استدلال اور منطق کو مدِنظر رکھا جاتا ہے کیونکہ مقالہ نگار کسی ایک دعویٰ یا مفروضہ کو لے کر اسے ثابت کرتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔برعکس اس کے کہ مضمون موضوعاتی اعتبار سے لطافت کا حامل ہوتا ہے،اختصار اور تاثریت اس کے لازمی جزو ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں مضمون کی مختلف صورتیں یعنی مزاحیہ،طنزیہ،انشائے لطیف وغیرہ کی اقسام ملتی ہیں۔اصل میں مقالہ کی اصناف میں اتنا کم امتیازی فاصلہ ہے کہ عموماً مضمون اور مقالہ کو متبادل معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس کے آغاز و ارتقاء کے ضمن میں لکھتے ہیں:''مضمون نگاری کے آغاز و ارتقاء میں طباعت کی سہولتوں اور صحافت (رسائل و جرائد) کے اجراء کو خاص اہمیت حاصل ہے.....''[۸] ڈاکٹر سیّد شاہ علی اس کے آغاز و ارتقاء اور ترقی میں مطابع کی اہمیت اور موجودگی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> مضمون نگاری کی ابتداء اور ترقی کے لیے (خواہ یہ کسی زبان میں ہو) مطابع کی موجودگی ضروری ہے۔انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اس کی ابتداء سے پہلے چھاپے خانے کی ایجاد ظہور میں آ چکی تھی۔ اس کے بغیر ادارت و اشاعت کے فرائض عمل میں آنے مشکل تھے.....۔[۹]

اردو میں جدید مضمون اور مقالہ نگاری کا آغاز سر سیّد سے ہوتا ہے۔وہ اس صنف ادب کے بانی تھے۔وہ ایڈیسن سٹیل کے مضامین کو اردو میں رائج کرنا چاہتے تھے۔انھوں نے انگریزی مضمون نویسی کی تقلید کے ساتھ ساتھ ان کے تراجم بھی کیے۔سر سیّد کے مضامین مضمون اور مقالہ کے بین بین چلتے ہیں۔سر سیّد کی مقبولیت، سنجیدگی اور تبلیغ کی خواہش کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ سر سیّد مضمون نگار ہونے سے زیادہ مقالہ نویس تھے۔ان کے مقالہ نویس ہونے کی وجوہات معاشرتی و سیاسی تھیں۔سر سیّد نے اُردو مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کو مدلل طرزِ تحریر عطا کیا کہ ہر طرح کے فلسفیانہ، منطقی اور مذہبی مسائل کو سادہ اور عام فہم زبان میں بطریقِ احسن ادا کیا جا سکے۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اردو میں مضمون نگاری کے ارتقاء کے بارے میں لکھتے ہیں:''اُردو ادبیات میں ''مضمون نگاری'' انگریزی ادبیات کے زیرِ اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سر سیّد احمد خان اردو میں اس صنفِ ادب کے باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے''۔[۱۰]

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> سر سید کے مضامین کا دائرہ بحث سب سے وسیع ہے۔ انھوں نے عام اخلاقی مضامین (مثلاً تعصب، ہمدردی، خوشامد، بحث و تکرار، اپنی مدد آپ، کاہلی، رسم و رواج وغیرہ)

کے علاوہ خالص دینی بحث و استدلال اور دیگر قومی و تعلیمی مسائل کے متعلق متعدد موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ان کے مضامین کا مرکزی خیال یہ ہے کہ قومی ترقی کے لیے تہذیب ضروری ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب کے معنی ''وہ اندرونی تبدیلی ہے جو برے کو اچھا کردیتی ہے۔''[۱۱]

ڈاکٹر سیدہ جعفر اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ سرسید احمد خان اردو کے اوّلین مضمون نگار ہیں۔وہ رقمطراز ہیں:

مضمون نگاری کے ارتقاء میں سرسیّد کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی''۔[۱۲] ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بھی ماسٹر رام چندر کو اوّلین مضمون نگار تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی اولیت اور قدامت مسلم ہے کہ انھوں نے علمی، تاریخی، معاشرتی اور سائنسی موضوعات پر مختصر مقالات (Essays) لکھے۔......''[۱۳] خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:''......رام چندر نے سرسید سے پہلے مضمون نگاری اور صحافت، ذکاء اللہ سے پہلے تراجم و تاریخ اور حالی سے پہلے سیرت نگاری اور تنقید شروع کی اور اس طرح ان کی حیثیت چراغ راہ کی سی تھی''۔[۱۴] بقول ڈاکٹر انور سدید:''......جس نوع کی مضمون نگاری کو سرسیّد نے شعوری طور پر رائج کرنے کی کاوش کی تھی، اس کی تقدیم کا سہرا ماسٹر رام چندر کے سر سجتا ہے''۔[۱۵] سید ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں:''ماسٹر رام چندر نے فوائد الناظرین اور محب ہند ایسے دور رسالے بھی نکالے۔ان میں علمی، ادبی بحثیں اور مقالے چھپتے تھے......''[۱۶]

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماسٹر رام چندر اردو کے اوّلین مضمون نگار ہیں جنھوں نے انگریزی ادب کے زیرِ اثر مختلف موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مضامین لکھنے کا آغاز کیا اور بعض انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔اگر چہ زمانی اعتبار سے ماسٹر رام چندر کو سرسید احمد خان پر تقدیم حاصل ہے لیکن صحیح معنوں میں جدید اردو نثر اور مضمون نگاری کے بانی کہلانے کے مستحق سرسید ہیں۔مضمون نگاری کو باقاعدہ صنف ادب کا رتبہ سرسید احمد خان ہی نے عطا کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

......سرسید اردو کے اوّلین مضمون نگار ہیں۔اوّلین اس معنی میں کہ انھوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا Essay کی صنف کو اختیار کیا اور براہِ راست انگریزی زبان کے مضمون نگاروں سے اثر قبول کیا اور آنے والے مضمون نگاروں کے لیے شاہراہیں متعین کیں۔[۱۷]

سرسید احمد خان نے ہی اصل میں اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کی تحریک شروع کی تھی۔سرسید سے قبل

فورٹ ولیم کالج، میر امن کی باغ و بہار اور غالب کے خطوط کی وجہ سے اردو نثر میں ترقی ہوئی لیکن سرسید احمد خان کے ''تہذیب الاخلاق'' کی وجہ سے اردو نثر نے ترقی کی منازل طے کیں۔صالحہ عابدہ حسین لکھتی ہیں:

> سرسید نے ۱۸۷۲ء میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کا مقصد مسلمانوں کے ذہنوں کو ایک طرف جدید تعلیم کے لیے تیار کرنا اور علومِ جدید کے مدرسہ کے لیے زمین تیار کرنا تھا اور دوسری طرف ان کی سماجی زندگی میں اصلاح کرنا، اس میں زیادہ تر مضامین سرسید کے ہوتے تھے۔[۱۸]

سید احتشام حسین لکھتے ہیں: ''اس رسالہ کے مضامین نے ادب میں بھی انقلاب پیدا کیا اور خیالوں میں بھی''۔[۱۹] سرسید کے رفقائے کار میں حالی، شبلی، نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ وغیرہ نے بھی اردو مقالہ نگاری کو فروغ دیا۔ان کے مقالے موضوعات اور طریق کار کے اعتبار سے سرسید کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ان میں شبلی نے خصوصاً مقالہ نگاری میں عقلیت اور استدلال کے ساتھ ساتھ جذباتی اور شخصی رنگ آمیزی بھی کی۔سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اردو مقالہ نگاری کو مذہبی، معاشرتی اور ادبی اصلاح کے لیے استعمال کر کے اردو نثر میں اظہار و بیان کی تصوریت کے امکان روشن کیے۔نثر کے عہد کے ہر مضمون نگار کا اپنا اپنا خاص اندازِ مضمون نگاری تھا اور ہر ایک اپنے اپنے انداز کا تنہا مالک تھا۔اپنے مضامین کی وجہ سے ہر ایک کا مقام و مرتبہ الگ الگ تھا۔محمد حسین آزاد کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> یوں تو ہر شخص کے منہ میں زبان ہے اور ہر شخص بات کرتا ہے مگر بات سے بات پیدا کرنا صرف آزاد ہی کا کام ہے۔یہی باتیں دوسرے انشا پرداز سادہ انداز میں کہہ جاتے ہیں مگر جب مضامین کی مادہ خام آزاد کے شیشہ بیان میں اترتی ہے تو یا وہ پختہ بن جاتی ہے اور ایک گلنار پری کا رنگ روپ لے کر شیشہ کے اندر سے جھلکتی رہتی ہے۔آزاد کی انشا پردازی کا رنگ آبِ حیات سے زیادہ نیرنگِ خیال میں جھلکتا ہے......[۲۰]

محمد حسین آزاد عہد نثر کے وہ مضمون نگار ہیں جو اپنے مخصوص اسلوب اور اندازِ بیان کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے وہ اسلوبِ بیان اختیار کیا جو انہی پر ختم ہوگیا۔بقول مہدی افادی: ''جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا، اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں......''[۲۱] ان کے مضامین خوش بیانی کے مرقعے اور لفظی مصوری کے پُر کیف اور نادر نمونے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی نے بھی مذہبی، اسلامی، تاریخی، سوانحی، سرسید کے متعلق اور متفرق مضامین لکھ کر

اُردو ادب کی اس صنف میں اضافہ کیا۔مولانا شبلی نعمانی نے بھی مضامین لکھے جو اپنے اسلوب و بیان کی وجہ سے نہ صرف ان کے عہد میں بلکہ آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔شعرالعجم ، مقالات شبلی ،اور باقیات شبلی میں شبلی کے مضامین موجود ہیں:

> ۱۹۰۶ء میں بمبئی سے ایک ادبی علمی ماہنامہ غنچہ جاوید، سید کاظم حسین ہدف لکھنوی کی زیر ارادت نکلا کرتا تھا......اس رسالہ میں سے مولانا شبلی کا ایک مضمون غصا دتی رازی تبرکاً پیش کیا جاتا ہے۔یہ مضمون شعرالعجم مقالات شبلی اور باقیات شبلی میں شامل نہیں۔[۲۲]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شبلی نعمانی بھی ایک قادرالکلام مضمون نگار تھے اور ان کے مضامین بھی مقالات شبلی کے نام سے شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔مفتون احمد لکھتے ہیں:''......شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا۔انھیں اپنی چیزوں کی قدر کرنا سکھائی...... ان میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی......''[۲۳]

سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کی مضمون نگاری کے ساتھ ہی ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں نے بھی اس صنف ادب میں اپنا نام روشن کیا اور اس صنف کی روایت کو آگے بڑھایا۔مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خان، محسن الملک، وقارالملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ، مولانا حالی، نذیر احمد دہلوی، مولانا شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھنے والوں میں غالب، منشی سجاد حسین، نواب سید محمد آزاد، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربعون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق اور پنڈت رتن ناتھ سرشار شامل تھے۔میر ناصر، شرر، مخزن کے قلم کار، سر عبدالقادر، آغا شاعر قزلباش، شیخ محمد اکرام، عبدالرشید چشتی، مولوی عزیز مرزا، سر ذوالفقار علی خان، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، سجاد انصاری، میاں بشیر احمد، فلک پیا، خلیق دہلوی، اختر شیرانی وغیرہ نے بھی اس صنف میں نام کمایا۔عبوری دور میں سید محفوظ علی، خواجہ حسن نظامی، ملا رموزی، عبدالماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان نے مضامین لکھ کر اس صنف کو ترقی دی اور شرر کے بعد بھی اس صنف میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے اور بہت سارے مضمون نگاروں نے اِس صنف میں اپنے آپ کو شامل کر لیا ہے۔

اردو مضمون نویسی اور مقالہ نگاری میں اردو صحافت نے بھی برابر کی شرکت کی۔اخبار اردو، سید الاخبار، اودھ پنچ، کانپور اور ''دلگداز'' نے اردو میں مقالہ نگاری اور مضمون نویسی کے فن کو فروغ دیا۔اردو مقالات کی تاریخ میں دلگداز کے مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔شرر نے دلگداز کا اجراء ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ کیا۔اس میں

انھوں نے نہ صرف اپنے ناولوں کو بالا قساط شائع کیا بلکہ مضمون اور مقالہ نویسی کا آغاز بھی کیا۔شرر ایک طرف تاریخی مذاق کے مالک تھے۔ دوسری طرف اردو شاعری اور ادب میں نئے رجحانات کو پنپتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ مقالہ نویسی میں خالص تنقید کا آغاز بھی انہی مضامین سے ہوتا ہے۔انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں چکبست کے مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں خصوصاً معرکہ شرر چکبست مشہور ہیں جن میں شرر اور چکبست کے مضامین، دیا شنکر نسیم اور میر حسن کی مثنوی نویسی پر معلومات افزا مباحث ملتے ہیں۔

مضمون خواہ کسی موضوع پر مشتمل ہو، اس کا اسلوب و پیرایہ خواہ کیسا ہی ہو۔مضمون لکھنے کی تحریک کچھ بھی ہو، فنی لحاظ سے ہر مضمون تین بنیادی حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ا۔تمہید ۲۔نفسِ مضمون ۳۔ خاتمہ

مضمون نویسی کی صلاحیت اور استعداد قدرتی ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی میں یہ صلاحیت زیادہ اور کسی میں کم ہوتی ہے۔مضمون نگاری کے رہنما اصولوں میں مشاہدہ کائنات و مشاہدہ فطرت بہت اہمیت کے حامل ہیں۔اگر مضمون نگار اپنے گرد و پیش کی دنیا مناظر فطرت، انسانی فطرت اور مظاہر قدرت کو مکمل آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہو تو اس کی سوچ اور فکر و تخیل میں وسعت و گہرائی پیدا ہوسکتی ہے۔اس کے موضوعات میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے اور نتیجہ کے طور پر موضوعات میں رنگا رنگی پیدا ہوگئی۔مضمون نگار کو اپنے حاصل کردہ علم اور مطالعے پر کبھی اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔علم و مطالعہ کی کوئی حدود نہیں جو شخص اپنے علم کو کافی اور معلومات کو حتمی سمجھ لے وہ اچھا مضمون نگار نہیں بن سکتا۔رسائل اور اخبارات کے مطالعے سے مضمون نگار موضوعات میں اضافہ کرسکتا ہے، اسے لکھنے کے لیے نئے اسالیب بھی ملتے ہیں جو اس کی تحریر کو زیادہ خوبصورت و جاندار بنانے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ انسانی نفسیات سے آگاہی بھی مضمون نگار کے لیے بہت ضروری ہے۔وہی مضمون نگار کامیاب ہوسکتا ہے جو قارئین کے ذوق و شوق اور ان کی انفرادی و اجتماعی نفسیات کو مدِنظر رکھ کر مضمون لکھتا ہے۔

ب۔ شرر کی مضمون نگاری کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

شرر نے جس دور میں مضمون نگاری شروع کی تھی اس عہد میں اور بھی کئی مضمون نگار تھے جن کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ بقول بشریٰ راٹھور:

> سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد کے علاوہ اس دور میں شرر نے اپنے مضامین میں زندگی کو کھویا ہوا بازیچہ تصور کیا، جنت گم گشتہ کی تلاش کرنے کی سعی میں حقیقت سے ناطہ کمزور ہو گیا ہے۔[۲۴]

عبدالحلیم شرر سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے اور ان کے اسلوب اور ان کے فن پر بھی سرسید تحریک کے اثرات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ عنایت علی قریشی لکھتے ہیں: ''......آپ کے اندازِ فکر اور تحریر و تقریر نے دوسرے ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ اسی وجہ سے آپ کا دور اُردو ادب کا ایک نئے دور کا آغاز کہلاتا ہے''۔[۲۵] اپنے دور کے مضامین نگاروں میں شرر کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اپنے طرزِ خاص میں وہ بے مثل ہیں۔ ان کے تمام مجموعوں میں ''مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ'' میں لکھنو کے حالات اور وہاں کی سوسائٹی کے مرقعے نہایت پرلطف اور دلچسپ انداز میں کھینچے گئے۔ مضامین نگاری میں اُن کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اس کے سامنے دوسرے کمالات ماند پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے جس عہد میں مضمون نگاری شروع کی اس کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> یہ دور اختراع کا دور ہے۔ اس دور میں پہلی بار مذہبی، اصلاحی، تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کاوش سے لکھے گئے۔ اس سے پہلے اس قسم کی سنجیدہ نثر کا وجود اردو ادب میں نہ تھا اور اگر سچ پوچھیے تو اس سے پہلے اردو نثر ایک بھکارن تھی جس کے پاس چند پھٹے پرانے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔[۲۶]

رام بابو سکسینہ کے بقول:

> اپنا زورِ طبع دکھانے کے لیے انھوں نے ایسے ایسے سبجیکٹ لیے جن پر ان سے پیشتر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا مثلاً غریب کا چراغ ''صحبت برہم''، ''نہیں''، ''ہاں''، ''لالہ خودرو''، ''یادِ رفتگاں''، ''دیہات کی زندگی''، ''خواب دوشین'' وغیرہ ایسے مضامین کو اردو میں پہلے پہل انھوں نے انٹروڈیوس کیا اور سچ یہ ہے کہ آج تک ان سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکا۔[۲۷]

تاریخی ناول نگاری کی وجہ سے اگر چہ وہ بہت مشہور ہوئے اور آج اردو ادب میں وہ اس حوالے سے خاص مقام رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بہت بڑے مضمون نگار بھی تھے۔فیض احمد فیض کا کہنا بجا ہے:

......سات ضخیم جلدیں ہیں اور ہر نوعیت کے مضامین ہیں۔مثلاً حُسن کی کرشمہ سازیاں، یہ رومانی کہانیاں ہیں جنھیں خوشگوار اور شگفتہ طریق سے پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں مشرقی تمدّن کا نمونہ ہے۔ایک طویل مضمون ہے جس میں لکھنؤ کی معاشرت اور رسوم و رواج پہ نہایت بامقصد اور مفصل بحث کی گئی ہے۔عوج بن عنق، حسن بن ثابت اور کئی ایک تاریخی مضامین ہیں۔ پردہ، نکاح وشادی ... اور بہت سے اصلاحی مضامین ہیں جن میں سماج کی بری رسوم پہ نہایت دلیری اور صاف گوئی سے بحث کی گئی ہے......[۲۸]

مولانا شرر کو اردو کی تاریخ میں دو باتوں کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ایک تو یہ کہ آپ کی وجہ سے اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز ہوا اور دوسری یہ کہ آپ نے مختلف موضوعات جن میں مناظرِ فطرت بھی شامل ہیں، مضامین لکھے جو دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دل کش بھی ہیں۔''اودھ پنچ'' اور دوسرے اخبارات میں مضامین لکھے اور فلسفیانہ خیال آفرینی اور انشا پردازی پر زور دیا۔شرر کے اس خاص رنگ اور مضامین کی شہرت دور دور پہنچی''۔[۲۹]

کہا جاتا ہے کہ شرر نے سرسید احمد خان اور انگریزی مضمون نگاروں سے متاثر ہو کر مضامین لکھنے شروع کیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرر نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جو سیاسی وسماجی حالات دیکھے۔قوم جس حالتِ زار کا شکار تھی۔اگر سرسید اور انگریزی مضمون نگاروں کو نہ پڑھتے اور ملتے تب بھی آپ ایک اعلیٰ پائے کے مضمون نگار ہوتے۔اس لیے کہ قدرت نے اس فن کا جوہر آپ کی ذات میں رکھ دیا تھا۔شرر نے جب ہوش سنبھالا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کے اثرات معاشرے پر پڑ رہے تھے۔سلطنت اودھ کے انتزاع کا زخم بھی ابھی تازہ تھا۔مسلمان صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ذلیل ورسوا ہو رہے تھے بقول ڈاکٹر ممتاز منگلوری:

''سارے عالم کو تقریباً ایک جیسے حالات درپیش تھے لیکن یہ حالت ایسی بھی نہیں تھی کہ کہا جا سکے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بدحالی اور تباہی کا احساس گہرا تھا اور جتنا یہ شعور گہرا تھا۔اتنا ہی درد وکرب زیادہ اس لیے

> اس بدحالی سے نجات حاصل کرنے کی شعوری کوششیں اپنی جھلک دکھانے لگی تھیں......شرر نے اسی سیاسی و سماجی ماحول میں آنکھ کھولی جس میں ۱۸۵۷ء کے معرکہ قتال نے ہندوستان کے جمود میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی اور بہت سی روایات میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو چلا تھا......[۳۰]

شرر نے جس دور کو دیکھا اور جس میں مضمون نگاری شروع کی وہ دور اصل میں مسلمانوں کے تہذیبی، علمی و سماجی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زوال کا دور تھا۔قوم کے تمام اہلِ فکر ونظر کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کو بیدار کیا جائے جس میں سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد اور سرسید کے دیگر رفقا اور خود شرر کی بھی یہی کوشش تھی کہ خوابِ غفلت میں مدہوش قوم کو جگایا جائے۔ان میں اپنے اسلاف، تاریخ، تہذیب وتمدن، روایات واقدار اور عظمت رفتہ سے ایک اُنس کا جذبہ پیدا کیا جائے تا کہ نئے جوش وولولے اور عزم و استقلال کو اپنا کر وہ دنیا میں سرخرو ہوسکیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے شرر نے بھی مضمون نگاری شروع کی۔مقصدیت کا یہی پہلو اُن کی دیگر نگارشات کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری میں بھی پایا جاتا ہے۔آرزو چوہدری لکھتے ہیں:''وقت کی طلب اور عصری تقاضوں کے تحت اپنے اپنے شہہ پاروں کو تخلیق کر کے ماحول کو پرانے دھندلکوں سے یکسر پاکیزہ کر دیا''۔[۳۱] پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> ناولوں کے علاوہ شرر نے کثرت سے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں......ان کے دیکھنے سے شرر کی معلومات کی قدر ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ ایسے ادیب اس زمانے میں کیوں نہیں پیدا ہوتے۔[۳۲]

آپ نے وہ مضامین لکھے جو اردو لٹریچر میں اضافے کا باعث بنے اور جن کی بدولت شرر کو اُردو ادب میں شہرت نصیب ہوئی۔محمد یحییٰ تنہا اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ......اُن کے مضامین زیادہ تر علمی، خیالی اور فلسفیانہ مذاق کے ہوتے تھے۔یہ مضامین مسلسل دو سال تک نکلتے رہے اور پھر ہر طرف اُن کی ایسی دھوم مچ گئی کہ اسی وقت سے مولانا کے لٹریچر کا شہرہ ہو گیا اور بڑے بڑے پرانے لکھنے والے چونک پڑے۔اودھ اخبار کے فائل میں آج بھی وہ مضامین موجود ہیں اور بتا رہے کہ محض اُن مضمونوں کی وجہ سے اِس زمانہ کا اودھ اخبار کس قدر نمایاں امتیاز رکھتا تھا۔روانیِ طبع کی یہ حالت تھی کہ مولانا صرف چار پانچ روز میں بیٹھ کے اتنے مضمون لکھ دیتے کہ مہینہ بھر تک اودھ اخبار میں شائع ہوتے

رہتے۔[۳۳]

پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں:

شرر مضمون نگار کی حیثیت سے اُردو ادب کی تاریخ میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔انھوں نے مختلف ومتنوع موضوعات پر لاتعداد مضامین لکھے۔شرر کے مضامین سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔[۳۴]

آل احمد سرورشرر کی مضمون نگاری کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:''شرر نے مختلف رسائل اور اخبارات میں جو مضامین لکھے تھے وہ''مضامین شرر'' کی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔یہ مضامین مختلف عنوانات پر ہیں اور شرر کی انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے ہیں''۔[۳۵] سید احتشام حسین شرر کی مضمون نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:''ان کے مضامین کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ہر طرح کے ادبی مضامین شامل ہیں.....''[۳۶]

شرر کی مضمون نگاری کا آغاز

شرر نے مضامین کب لکھنے شروع کیے؟ اس بارے میں مختلف لوگوں کی آراء یہ ہیں۔محمد عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں:''منشی نول کشور نے صاحب زادہ کو ہونہار دیکھ کر اودھ اخبار کے اسٹاف میں داخل کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے مضامین کا تمام ہندوستان میں شہرہ ہوگیا.....''[۳۷] شرر نے مضمون نگاری کب شروع کی اور کس قدر قبول عام حاصل کیا؟ اس بارے میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں:''منشی احمد علی کسمنڈوی کی ترغیب پر اخبارات میں ادبی مضامین لکھنے لگے اور جلد ہی مقبول خاص و عام ہو گئے.....''[۳۸]

بقول ایس ایم معین قریشی:

۱۸۸۰ء میں لکھنو لوٹے، یہاں ان کی ملاقات منشی احمد علی کسمنڈی سے ہوئی جو بعض اخبارات میں مضامین لکھتے تھے۔ان کے شوق دلانے سے شرر بھی اخبارات کے لیے علمی وادبی موضوعات پر مضامین لکھنے لگے۔[۳۹]

مولانا دہلی سے لکھنو آئے اور مولوی عبدالحی نے صیغۂ تصحیح کے لیے ان کی سفارش منشی نولکشور سے کی۔منشی نولکشور بڑے مردم شناس تھے۔انھوں نے مولانا سے چند سوالات کیے اور ان کے جوابات سن کر فرمایا: تصحیح آپ کے لیے مناسب نہیں۔اس میں رہ کر آپ کسی قسم کی ترقی نہ کرسکیں گے۔اگر ممکن ہوتو آپ اودھ اخبار میں مضامین

لکھا کریں۔مولوی محمد یحیٰ تنہا لکھتے ہیں:

> دہلی سے واپس آ کر مولانا کو فکر معاش ہوتی ،مولوی عبدالحیٔ صاحب کی سفارش سے آپ منشی نولکشور کے یہاں گئے وہ بڑے مردم شناس تھے۔انھوں نے مولانا سے چند سوالات کیے اور اس کے بعد کہا''صیغہ تصیح آپ کے لیے مناسب نہیں (جس کی سفارش مولوی عبدالحیٔ صاحب نے کی تھی)اُس میں رہ کر آپ کسی قسم کی ترقی نہ کرسکیں گے۔اگر ممکن ہوتو آپ اودھ اخبار میں مضامین لکھا کیجیے۔[۴۰]

اودھ اخبار میں ملازمت کا زمانہ گو شرر کی نوعمری کا زمانہ تھا لیکن چونکہ طبیعت زوروں پر تھی۔ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ اعلیٰ خیال اورفلسفیانہ معنی آفرینی کا ملکہ قدرت نے وافر ودیعت کیا ہوا تھا۔مختصر عرصے میں انھوں نے بے شمار ایسے مضامین لکھے جن کے زورِ بیان، بلند تخیل اور معنی آفرینی کی بھرپور داد ملی۔شرر کے مضامین کے رنگ، انشا پردازی کے ڈھنگ اور ذوق وشوق سے متاثر ہوکر اودھ اخبار کے مالک منشی نولکشور نے آپ کو اپنے اخبار کے ادارۂ تحریر میں جگہ دے دی۔ مولانا کے قلم سے جو مضامین اس اخبار کے لیے نکلے وہ بہت مشہور ہوئے۔مولانا کی عزت افزائی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔روانیٔ طبع کا یہ عالم ہوتا کہ چار پانچ روز میں آپ اتنے مضامین لکھ دیتے کہ مہینہ بھر اخبار میں یہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔یہی سے آپ نے''روح'' کے عنوان پر مضمون لکھا تھا اور اودھ اخبار سے ہی یہ چھپا تھا جس کو سرسید احمد خاں نے بہت پسند کیا تھا اور اس کے چند خیالات اپنی تفسیر کے لیے لینے کی اجازت مانگی تھی۔بقول حکیم برہم:

> ان مضامین کی خوبی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مولانا نے''روح'' کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا تھا۔اس کو پڑھ کے سرسید احمد خان بہادر نے منشی نولکشور کو اس مضمون کا ایک خط بھیجا کہ''اودھ اخبار میں روح پر جو مضمون چھپا ہے، بہت اعلیٰ درجہ کا ہے، میں اُس سے چند خیالات کو اپنی تفسیر میں لینا چاہتا ہوں۔لہٰذا اُن صاحب سے جن کا وہ مضمون ہے مجھے اخذ کرنے کی اجازت دلوا دیجیے۔منشی نولکشور نے مولانا سے دریافت کر کے سید صاحب کو ان کی خواہش کے مطابق اجازت دے دی۔[۴۱]

فرحت شاہ جہاں پوری نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے:''سرسید نے ان کے ایک مضمون''روح'' کی بہت تعریف کی تھی اور اپنی تفسیر میں اس کے چند خیالات لینے کی اجازت چاہی تھی''۔[۴۲]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر کس پائے کے مضمون نگار تھے؟ اور کس انداز کے مضامین وہ لکھا کرتے تھے؟ کہ

سرسید احمد خان جیسے بڑے اور نامی گرامی مضمون نگار کو بھی اس نوجوان مضمون نگار کا اندازِ بیان اور موضوع اور طرزِ تحریر اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے بھی شرر کے مضمون ''روح'' کو سراہا بلکہ اس سے اخذ کی اجازت بھی طلب کی۔ اس سے بڑھ کر شرر کی مضمون نگاری کے مقام و مرتبہ کے بیان میں کیا کہا جائے کہ اوّل عمر اور مضمون نگاری کے آغاز سے ہی وہ ایک منجھے ہوئے اور مضمون نگاری کے اصول و ضوابط کو سمجھنے اور برتنے والے مضمون نگار تھے۔

مضامینِ شرر کے موضوعات اور ان کی مضمون نگاری پر تنقیدی نظر

مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے تاریخی، تحقیقی، تنقیدی، نفسیاتی، عمرانی اور سائنسی ہوسکتا ہے۔ تعلیمی اور سیاسی مضامین بھی ہوتے ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ اور تاثراتی مضامین بھی لکھے جاتے ہیں۔ مضامین کی تمام اقسام اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ یہ صنفِ ادب کس قدر وسعت اظہار رکھتی ہے کہ زندگی کا ہر ایک مسئلہ، ہر ایک انداز، ہر ایک موضوع اس میں سما سکتا ہے۔ شرر نے بھی ہر طرز کے مضامین لکھے اور ان کے مضامین میں کم و بیش ہر ایک قسم مل جاتی ہے۔ آپ کے مضامین تاریخی وجغرافیائی بھی ہیں، تہذیب و تمدن کی جھلک بھی دکھاتے ہیں۔ شاعرانہ و عاشقانہ موضوعات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ماہنامہ دلگداز کے ایڈیٹوریل پر بھی مبنی ہیں۔ مختلف ممالک، قوموں کے حالات اور تذکروں سے بھی پُر ہیں۔ سوانحی مضامین بھی شرر نے لکھے ہیں۔ ادبی بھی، اصلاحی اور تاریخی بھی، تہذیب و تمدّن کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں اور تاریخ کے واقعات کو بھی دہراتے ہیں۔ ملک و قوم کی فلاح و بہبود پر اُبھارتے بھی ہیں اور قومی درد کو اُجاگر بھی کرتے ہیں۔ شرر کے مضامین کی جلدیں اُن کے مقام و مرتبہ، شاعری وڈرامہ نگاری پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کے مضامین جو مختلف جلدوں میں موجود ہیں، اُن کی تفصیل یوں ہے:

جلد اوّل: حصہ اوّل شاعرانہ اور عاشقانہ مضامین، حصہ دوم شاعرانہ و عاشقانہ مضامین، حصہ سوم آغاز و اختتام سال کے مضامین

جلد دوم: حصہ اوّل تاریخی وجغرافیائی مضامین، حصہ دوم مختلف ممالک، شہروں اور قوموں کے حالات اور تذکرے، حصہ سوم ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

جلد سوم: حصہ اوّل سیر نسواں (دنیا کے مختلف ممالک کی مشہور عورتوں کے تذکرے)

حصہ دوم سیر نسواں (دنیا کے مختلف ممالک کی مشہور عورتوں کا تذکرہ)

حصہ سوم سیر رجال (دنیا کے مشہور مردوں کے حالات)

جلد چہارم: ادبی و تحقیقی مضامین

جلد پنجم: اصلاحی مضامین

جلد ششم: تاریخی واقعات پر خیال آرائی

جلد ہفتم: نظم وڈرامہ

جلد ہشتم: مقالاتِ شرر

پروفیسر جعفر رضا شرر کے مضامین کی ان جلدوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> جلد ہفتم کے علاوہ باقی سات جلدوں میں شرر کے مختلف النواع مضامین یکجا کیے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود وثوق سے کہنا دشوار ہے کہ ان میں شرر کے تمام مضامین، انشائیے، رپورتاژ وغیرہ یکجا ہو گئے ہیں کیوں کہ تلاش و جستجو میں مزید تخلیقات دستیاب ہو جاتی ہیں۔[۴۳]

شرر نے شاعرانہ و عاشقانہ موضوعات کو بھی اپنے مضامین میں پیش کیا ہے اور تاریخی وجغرافیائی حالات وواقعات کو بھی۔ دنیا کے مشہور مردوں اور عورتوں کے متعلق مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کو ہم سوانحی مضامین بھی کہہ سکتے ہیں اور خاکے بھی۔ آپ نے ادبی و تحقیقی اور اصلاحی مضامین لکھ کر اُردو ادب کی اس صنف کا دامن مختلف قسم کے عنوانات و موضوعات سے بھر دیا ہے۔ آپ کا یہ کارنامہ اتنا ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ تاریخی ناول نگاری۔ اِن دونوں میدانوں میں شرر نے کمال فن کے جوہر دکھائے۔ اردو ادب میں اپنی پہچان کے نمونے چھوڑے ہیں۔

شرر بلند مقام کے حامل مضمون نگار ہیں جن لوگوں نے انھیں دیکھا یا ان کے مضامین کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ کس پائے کے مضمون نگار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک قدآور مضمون نگار تھے۔ زیر نظر مجموعہ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ان کی مضمون نگاری کی تکنیک نکھر کر سامنے آتی ہے۔ شرر کے مضامین میں معنی آفرینی، نکتہ سنجی، بصیرت افروزی، علمیت، بقراطیت کے پہلو کس قدر پائے جاتے ہیں، اس کا اندازہ اس پہلے مجموعے کے مضامین کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر نظیر صدیقی: ''یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ اچھا نثر نگار کسے کہتے ہیں۔ اس کے بہت سے معیار ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اسے جملہ لکھنا آتا ہو''۔[۴۴] عبدالحلیم شرر جملہ لکھنے کا فن جانتے تھے۔ انھیں مضمون شروع کرنے اور ختم کرنے کا گر آتا تھا۔ ان کے بیشتر مضامین کا آغاز

اور اختتام فنی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ان کے مضامین میں طوالت و اختصار پایا جاتا ہے۔ ان کے مضامین دلچسپ اور دلکش ہونے کی وجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ شرر کا اندازِ فکر مثبت ہے ان کے ہاں انسان اور کائنات ہر طرح کے موضوعات شامل ہیں۔ اگر چہ شرر سے پہلے بھی مضامین لکھے جاتے رہیں ہیں لیکن شرر کا کمال یہ ہے کہ ان کے مضامین ہم انگلیوں پر نہیں گن سکتے۔ یہ تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور موضوعات کا تنوع بھی ان میں پایا جاتا ہے۔

شرر نے مختلف موضوعات پر فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے تاثرات کو بیان کیا ہے۔ شرر کے مضامین میں کوئی نہ کوئی علمی و ادبی نظریہ شامل ہوتا ہے۔ ان کے مضامین سے کوئی نہ کوئی اخلاقی درس بھی ملتا ہے۔ اندازِ بیان کے لحاظ سے بے ساختہ پن ان کا خاص وصف ہے۔ شرر کے تمام مضامین مفہوم و مدعا کے لحاظ سے بڑے مربوط ہیں۔

شاعرانہ اور عاشقانہ مضامین کے حصہ اوّل میں کل ۸۴ مضامین شامل ہیں جن کے عنوانات سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر ہر ایک موضوع پر اچھا مضمون لکھنے کے فن سے آگاہ تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی نگاہ میں وسعت تھی اور مشاہدہ تیز تھا۔ چاندنی رات، آثارسلف، زمانے کا تھیٹر، سوداوطن، اندھیری رات کا خواب، دیہات کی زندگی، غریب کا چراغ، جھلملاتا ہوا تارا، بےخودی، تیرِ نظر، عمر رفتہ، افسردہ دلی، سفر کامیابی کی کنجی ہے، پھول، سفرنامہ ہستی، آدھی رات، انجام، دنیا، عمر دوروزہ، شمع سحر، برسات، رنج والم، غریب کا جھونپڑا، اندھیری رات، رخصت بہار، بادسحر، شعروسخن، شادی وغم، ہم وغیرہ جیسے عنوانات پر مضامین لکھ کر شرر نے اُردو ادب کا دامن ہر طرح کے عنوانات اور موضوعات سے مالا مال کر دیا۔ شرر کے اس پہلے حصہ میں بعض مضامین کے عنوانات شعر اور مصرعہ پر رکھے گئے ہیں مثلاً:

کہاں ہے جاتا یار خیال او ے
ہم ہیں تے بہلا سے تجھ دل گھڑی دو

ع: خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

.......…

کچھ مضامین کے عنوانات عربی میں پائے جاتے ہیں مثلاً:

۱۔ ان من البیان سحراً ۲۔ والنجم اذا ھوائے ۳۔ واذا النجوم انکدرت

اس جلد کا پہلا مضمون دلگداز ہے۔اس میں شرر نے اپنے مقصدی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور عالم اسلام کی حالت زار کو یوں بیان کیا ہے:

اسی ذیل میں اُس مفلوک الحال قوم کو بھی ایک نظر دیکھ لیجیے جو کسی زمانے میں بڑی ترقی یافتہ سمجھی جاتی تھی اور جو اہلِ اسلام کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے اس قوم کے گذشتہ حالات کو یاد کیجیے کہ تمام دنیا پر حکومت تھی۔علم و دولت اسی کے حصے میں تھے۔ تمام قوموں کو اس کی شاگردی پر فخر اور ناز تھا۔ عام ترقی کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں تھیں۔ ہر امر میں یہ ساری دنیا کی مرجع تھی۔اسلام کا جو ہر اس تاج میں لگا ہوا تھا جو تمام دنیا کا سر تاج تھا۔فنون و دستکاری اور تجارت میں جدھر دیکھیے اسی قوم کا نام سنا جاتا تھا۔اس کے بعد اب اس قوم کی موجودہ حالت کو دیکھیے کہ یہ کس ذلت کے نشیب میں پڑی ہوئی ہے جہالت ہر فردِ بشر کے سر پر سوار ہے۔تھوڑا بہت علم ہے بھی تو آپس میں لڑنے کے لیے، ادبار کی بھیانک صورتیں ہر طرف سے نظر آ رہی ہیں۔ نشۂ غفلت ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، ابھی تک پاؤں ہی ڈگمگا رہے تھے......[۴۵]

''چاندنی رات'' بھی اس مجموعہ کا ایک بے مثل مضمون ہے خوبصورت الفاظ کے استعمال نے اس مضمون کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ایک اقتباس بطور نمونہ درج ہے:

پیاری چاندنی رات تیرا دلربا سماں ہمارے بیان سے باہر ہے۔وہ گورا شفاف چہرہ جس کی تو روشنی ہے اس پر باغ نیچر کی تیز روشنی والے لیمپ ''آفتاب'' کا ایسا عکس پڑتا ہے کہ ہماری تاریک راتیں روشن ہو جاتی ہیں، تیری نکھری ہوئی روشنی اور تیری خوش نورانیت سے ہماری خوشی کی راتوں کا لطف بدرجہا بڑھ جاتا ہے۔آسمان کے جگمگاتے تارے تیری آنکھوں میں کبھی جاتی ہوئی روشنی کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں۔غم کی ہوشربا راتوں میں تیری خوبصورتی سے اپنا دل بہلا لیتے ہیں......[۴۶]

''آ ثار سلف'' ایک مقصدی اور اصلاحی مضمون ہے جس میں شرر نے یہ نقطہ بیان کیا ہے کہ: ''واقعی آ ثارِ سلف سے ہم اپنی ترقی کے متعلق بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے حوصلے انھیں چیزوں سے بڑھتے ہیں جن سے اگلوں کی حالی ہمیتاں یاد آ جاتی ہیں''۔[۴۷]

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا'' شرر نے مورخین کی اُن خدمات کو سراہا ہے جن کے قلم سے اگلے زمانے کے حالات وواقعات انسان تک پہنچتے ہیں۔ شرر لکھتے ہیں:

> اے دائی زندگی کی شہ نشین پر بیٹھنے والے مؤرخین وہ عجیب دلربا سمان تھا جس کو تمھارے جادو نگار قلم دکھا گئے ہیں۔ ہائے اُس دلفریب داستان میں قیامت کا اثر بھرا ہے جو ہم نے تمھاری زبانی سُنی ہے جس وقت تمھارے لکھے ہوئے دفاترِ پارینہ ہماری نظر سے گزر جاتے ہیں۔ اس وقت کیا بتائیں کہ کیا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔[۴۸]

''زمانے کا تھیٹر'' ایک علامتی اور تمثیلی مضمون ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ انسان نے کس طرح سے ترقی کی منازل طے کیں اور مختلف تہذیبوں نے کس طرح عروج وزوال حاصل کیا؟ اس مضمون کی زبان شاعرانہ و عاشقانہ ہے۔ اندازِ بیان منفرد ہے۔ شرر نے اس مضمون میں ہندوستان، ایران، مصر و یونان کی تہذیبوں پر روشنی ڈالی ہے۔ بنی اسرائیل کے عروج وزوال کی داستان رقم طراز کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''یکا یک عراق کے کونوں سے ایک لشکر عظیم آیا اور بنی اسرائیل کے باغ اقبال کو پامال کرنا شروع کیا.....''۔[۴۹] ''سوداوطن'' مضمون میں شرر نے لکھنو کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جو غدر کی تباہی کی وجہ سے ہوئی، لکھتے ہیں: ''غدر کی تباہی میں لکھنو کی جو حالت ہوئی تھی وہ اس مضمون میں عجیب مؤثر و دلخراش الفاظ میں دکھائی ہے''۔[۵۰] ''جوش'' اور کامیابی بھی عمدہ مضامین ہیں۔ شرر نے ''کامیابی'' میں یہ حقیقتیں بیان کی ہیں کہ ہمت بھی اُنھیں لوگوں کے کام آتی ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں''۔

''اندھیری رات کا خواب''، ''دم واپسیں''، ''آخر ہم اب کیا کریں''۔ بھی اچھے مضامین ہیں۔ ''دم واپسیں'' میں شرر نے زندگی کی بے ثباتی اور وقت مرگ کی حالت کا ذکر دل خراش انداز میں کیا ہے۔ ''آخر ہم اب کیا کریں''۔ مضمون کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میں شرر نے وہی باتیں اور حقیقتیں بیان کی ہیں جو مولانا حالی نے ''مسدس مدوجزر اسلام'' کے ذریعے قوم کے گوش گزار کی ہیں۔ شرر کی بھی دلی خواہش ہے کہ قوم کے اندر وہ جذبہ، ولولہ اور جوش وجنوں پیدا ہو جائے جو ہمارے اسلاف میں تھا جس کی وجہ سے انھوں نے دنیا میں اپنا نام روشن کیا ہے لیکن شرر کی یہ حسرت پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ اس لیے کہ قوم غفلت کا شکار

ہے۔مضمون نگار نے اس مجموعے میں کچھ ایسے عنوانات پر مضامین لکھے جن کا شمار ’’انشائیہ‘‘ میں ہوتا ہے۔ حصہ اوّل و دوم کے مضامین جو کہ شاعرانہ و عاشقانہ خیالات پر مبنی ہیں، ان دو جلدوں میں زیادہ تر مضامین ایسے ہیں جو انشائیہ کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔ اس جلد کے انشائیوں میں شرر نے بڑے انوکھے اور اچھوتے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان میں تازگی اور شگفتگی کا بھی بھرپور احساس ملتا ہے۔ ان کے مطالعے سے قاری زندگی کے انوکھے رویوں سے متعارف ہوتا ہے۔ شرر ان انشائیوں میں جہاں موضوع کے انوکھے اور حسین و جمیل گوشوں پر سے پردے اٹھاتے ہیں، وہاں ان میں روحِ عصر کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ شرر نے ڈرامائی تکنیک کے بھرپور انداز کو استعمال کر کے قاری کے جذبۂ تحیّر کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ ’’شہر کی رات‘‘ ایک ترجمہ شدہ مضمون ہے۔ یہ گولڈ سمتھ نے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ شرر نے اپنے مخصوص انداز سے کیا ہے۔ مضمون کے شروع میں یہ عبارت اس بات کی عکاسی کرتی ہے:

> یہ گولڈ اسمتھ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ گولڈ اسمتھ کے نام سے ہندوستان بخوبی واقف ہے۔ کچھ ضرورت نہیں کہ اس مقام پر اس کی جادو بیانیوں کی تعریف کی جائے مگر دیکھنا اس بات کا ہے کہ اردو میں اگر ایسے مضامین ترجمہ کر کے نکالے جائیں تو لوگ پسند کریں گے یا نہیں۔[51]

حصہ اوّل کے مضامین کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> حصہ اوّل کے تقریباً تمام مضامین لفاظی ہیں۔ ان مجموعوں میں بعض ایسے تراجم بھی ہیں جیسے کالی داس کی موسوں کی بہار اور گولڈ سمتھ اور ایڈیسن کے انشائیوں کے ترجمے یا چربے جن سے شرر کے انشائیوں کا مقابلہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا۔ اوّل الذکر کے یہاں ایک طرف شادابِ تخیل اور لازوال حسن کی کارفرمائی ہے تو دوسری طرف حکیمانہ نکات اور اخلاق آموزی لیکن شرر کے یہاں یہ سب عنقا ہیں‘‘۔[52]

’’انتظار‘‘، ’’سادگی‘‘، ’’دیہات کی زندگی‘‘، ’’آہ‘‘، ’’غریب کا چراغ‘‘، ’’جھلملاتا ہوا تارا‘‘ بھی اپنے موضوع اور اسلوب کی بنا پر منفرد ہیں۔ شرر کے ہر مضمون اور انشائیے کے اختتام میں قومی ہمدردی کا جذبہ اور قوم کو بیدار کرنے کا درس ملتا ہے۔ ’’جھلملاتا ہوا تارا‘‘ کے آخر میں لکھتے ہیں جو اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔

> مسلمانو! تمھیں شکایت ہے کہ کوئی اگلی داستان سنا کے بے چین کرنے والا نہیں اور اگر تمھیں شکایت نہیں ہے تو نہ ہو ضرورت ہے کہ تمھارے لیے کوئی اس قسم کا سامان بہم

پہنچائے۔تم اپنے تئیں بھولے ہوئے ہو،کوئی کچھ کہتا بھی ہے تو تمھارے دل پر اثر نہیں
پڑتا۔تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ داستان غم کسی حسرت کی تصویر نظر کے سامنے پھر جائے
تمھیں تمھارا موجودہ اقبال آنکھوں سے دکھا دینے والا ہی تارہ ہے جسے ہم جھلملاتا ہوا تارہ
کہہ چکے ہیں۔روزِ صبح کو اسے دیکھو،اپنے اقبال کو یاد کرو،اپنی حالت کا اندازہ کرو اور
روؤ''۔۵۳

''بےخودی''،''لالہ خودرو''،''تیر نظر''،''بوئے وفا''،''دشتِ وحشت''،''عمر رفتہ''،''افسردہ دلی''،''سفر کامیابی کی کنجی ہے''،''پھول''،''سفرنامہ ہستی'' بھی شرر کے شاہکار مضامین وانشائیے ہیں۔شرر جس موضوع پر بھی لکھتے تھے کمال کا لکھتے تھے۔ان کے مضامین کے مطالعے سے یہ بات صادق آتی ہے اگر وہ مضامین کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے،تب بھی دنیائے ادب میں اُن کا مقام بلند ہوتا۔شرر نے ''نعمت است بعد زوال''،''آدھی رات''، ''صبح چمن''،''دنیا''،''بادِ سحر''،''شعر وسخن''،''ناکامی''،''آہ! اور واہ''،''زمانہ باتو سازد تو با زمانہ بساز''،''خود پسندی وخود پرستی''،''گوشہ عافیت'' جیسے عنوانات وموضوعات میں علمیت اور وسیع مطالعے کا ثبوت فراہم کر دیا۔

مضامین شرر جلد اوّل ودوم کل ۷۸۷ صفحات پر مشتمل ہیں جن میں طرح طرح کے موضوعات،عنوانات اور اندازِ بیان پر مبنی مضامین ہیں۔ان دونوں حصوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر کس پائے کے مضامین نگار تھے۔آپ نے جس موضوع کو بھی اپنے قلم کی زینت بنایا،خوب صورت الفاظ،تراکیب،مرکبات،تشبیہات واستعارات کی مدد سے حسن بخشا ہے۔شرر کا تخیل کس سطح پر پرواز کر سکتا ہے۔اس کا صحیح ادراک ان مضامین کے مطالعے سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔موضوعات،تکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے ان حصوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔

شرر کے مضامین کا آغاز اور اختتام متاثر کن ہے۔موضوع کی مناسبت سے الفاظ کے استعمال کا گر شرر جانتے تھے۔جیسا موضوع ہوتا ہے ویسا ہی انداز بیان بھی اپناتے ہیں۔مضامین شرر جلد اوّل کے حصہ دوم کا پہلا مضمون ''موسموں کی بہاریں'' ہیں۔''آنے والی گھڑی'' ایک منفرد اور اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ مضمون ہے جس میں شرر نے آنے والی گھڑی کو مخاطب کر کے اپنی دلی تمنا کا اظہار یوں کیا ہے:

کیا اچھا ہوتا اگر اے ''آنے والی گھڑی'' تو ہمیشہ آنیوالی ہی رہتی،کبھی آنہ چکتی۔یہ
عمر رواں کی گاڑی کسی ایک ہی جگہ پر کھڑی رہ جاتی اور ہم موجودہ حالت سے قطع نظر کر
کے جس میں تکلیفوں اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں۔آنے والی آرزوں اور امیدوں کا
خواب ہی دیکھا کرتے۔کیا خوب کہا ہے،جذبات فطرت سمجھنے والے دہلوی شاعر نے:

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے'' ۵۴

''شمع حرم'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دلکش مضمون ہے۔ ''شمع حرم'' میں شرر نے جس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے وہ یہ ہے:

دنیا میں ہزاروں شمعیں روشن ہیں اور لاکھوں صحبتوں کی مختلف کیفیتیں اس شمع کی روشنی میں نظر آیا کرتی ہیں ......مگر شمع حرم سے سچے مبلغ توحید کی صدائے ''یا اُمتی! یا اُمتی'' آج تک سنی جاتی ہے اور جو سنتا ہے جامِ توحید کا مست اور شمع عرفاں کا دلدادہ بن کے گھر بار اور زن و فرزند کو چھوڑ اس طرح بے اختیار دوڑتا اور اس شمع حرم کی طرف لپکتا ہے کہ اُسے سر و پا کا مطلق ہوش نہیں رہتا۔ ۵۵

''یادِ وطن'' میں شرر نے جذبہ حُب الوطنی کو انوکھے انداز سے پیش کیا ہے اور وطن کی یاد کے موضوع کو مختلف مثالوں سے سجایا ہے جس میں حضرت یوسفؑ، سکندر ذوالقرنین، تاجدار عجم، حضرت محمد ﷺ، حضرت بلالؓ وغیرہ کے واقعات بیان کیے ہیں۔ ''وہ'' کے عنوان پر جیسا مضمون شرر نے لکھا ہے یہ انھی کا کمال ہے۔ اس عنوان کے تحت شرر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے کسی اور مضمون نگار کے لیے ایسا لکھنا محال تھا، لکھتے ہیں:

''ہم'' اور ''تم'' کی داستان ہم ناظرین دلگداز کو سنا چکے ہیں۔ اب ''وہ'' کی باری ہے۔ لوگ کہتے ہیں اور نحو میں بھی جو زبان کے رموز و نکات کے شناسا ہیں دعویٰ کر رہے ہیں کہ تین پرسن (اشخاص) ہیں ہم، تم اور وہ۔ لیکن غور سے دیکھو تو ''ہم''، ''تم'' سب مٹ جانے والے ہیں۔ ایک باقی رہنے والا ''وہ'' ہے۔ لہٰذا ''وہ'' ہی اصل ہے اور جو کچھ ہے ''وہ'' ہی ہے...... ۵۶

ذکر عیش بہ از عیش'' میں شرر نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ:

عیش ایک غیر مستقل اور فانی چیز ہے اور ذکرِ عیش نہایت ہی پائیدار ہے اور کیونکر نہ ہو، عیش کے سامان تمھارے اختیار میں ہیں۔ تم اُن سے اُسی وقت لطف اٹھا سکتے ہو جب تک وہ تمھارے بس میں ہیں۔ ۵۷

اتفاق و اختلاف کا مناظرہ مضمون کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں:

> اتفاق و اختلاف کا مناظرہ' محمد حسین آزاد کی تقلید میں ہے۔شرر کے پاس محمد حسین آزاد کا زندہ جاوید اسلوبِ بیان نہیں ہے۔تخیل کی اعلیٰ و ارفع بلند آفرینی بھی نہیں ہے۔بذلہ سنجی اور نکتہ چینی کا جوہر بھی نہیں ہے۔اس لیے شرر کی تمثیلوں میں آزاد کی تمثیلوں کی طرح سبد جام کی فضا بھی نہیں ہے جس سے شام جام معطر ہو جائے۔شرر نے مزید ستم یہ ڈھایا کہ تمثیل کو غیر ضروری تمہید سے بوجھل کر دیا ہے حالانکہ قاری تمثیل شروع کرتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور سر آغا خاں کے اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابتدائی کلمات کے بعد مصنف عالمِ خیال میں پہنچ جاتا ہے۔آسمان سے ایک نورانی تخت برآمد ہوتا ہے جس پر ایک پری جمال جلوہ فگن ہے۔یہی اتفاق کی ملکہ ہے۔شرر نے اس کا خوب صورت سراپا پیش کیا ہے پھر بادِ مخالف کے گرم جھونکے تیز ہوتے ہیں جن میں مکان ڈھ جاتے ہیں۔لوگ آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں، ایک آتشی تخت نمودار ہوتا ہے جس پر سانولی سلونی نمکیں رخساروں والی حسینہ بیٹھی ہے جو اختلاف کی ملکہ ہے۔[۵۸]

''فرشتوں کی دلبری'' بھی ایک طویل مضمون ہے۔مکالماتی انداز سے شرر نے اس مضمون کو تحریر کیا ہے۔۲۵صفحات پر مشتمل یہ مضمون شرر کے تخیل کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''شاعری کی بے باکیاں'' شرر نے اپنے مخصوص اسلوب اور اندازِ بیاں سے اس موضوع کو خوب صورت بنایا ہے۔ہم اچھے ہیں یا ہمارا دلگداز''مضمون میں شرر نے دلگداز اور اپنے تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔دلگداز وہ رسالہ ہے جس نے علم و ادب کی خدمت کا حق ادا کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر کا کمال یہ ہے کہ آپ نے ہر موضوع پر مضمون لکھا ہے۔ایک مضمون ''کبوتر، بلبل، پپیہا'' کے عنوان پر بھی لکھا ہوا ہے۔یہ ایک مختصر مگر جامع مضمون ہے۔یہ چار صفحات پر مشتمل ہے اور مضمون نگار کے گہرے مشاہدے اور وسعتِ مطالعہ کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ایک اقتباس بطور نمونہ درج ہے:

> کبوتر ہو یا بلبل ہو یا پپیہا تینوں نے جذباتِ عشق کو ہیجان میں لا کے سارے عالم میں جوش وخروش پیدا کر دیا ہے۔اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان میں سے کس کا نام پر اثر ہے یا کس کی دردبھری آواز میں زیادہ تاثیر پائی جاتی ہے۔اپنی اپنی جگہ پر تینوں کا نغمہ زیادہ پُرسوز و گداز نظر آتا ہے۔[۵۹]

اس مضمون میں شرر نے مختلف قوموں اور ممالک کا ذکر کیا ہے۔عرب، ایران، ہندوستان کے ادب میں

ان طیور کی اہمیت کا ذکر کیا ہے اور مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں: ''اگر غور سے دیکھیے تو ان طائروں سے ہر قوم کے ذاتی خصائص معلوم ہو جاتے ہیں اور پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ اپنے جوش وخروش کو کس عنوان سے ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور ان کا اصلی مقصد کیا ہے؟''۔[۶۰] ''خودنمائی'' کے عنوان سے جو مضمون شرر نے لکھا ہے۔ وہ دراصل ایڈیسن کے ایک مضمون سے ماخوذ شدہ ہے۔ اس مضمون کے شروع کا جملہ اس کے مآخذ کا پتہ دیتا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے جس عہد میں مضمون نگاری شروع کی، اس دور میں تمثیلی رنگ میں مضامین لکھنے کا بھی ایک عام رجحان پایا جاتا تھا۔ شرر کے دور کے مضامین نگاروں میں یہ رجحان خاصی حد تک پایا جاتا تھا۔ محسن الملک، سرسیّد احمد خان اور محمد حسین آزاد میں یہ رجحان خاصا زیادہ تھا۔ شرر بھی اپنے دور کے نمائندہ مضامین نگاروں کی طرح اس رجحان سے متاثر ہوئے اور آپ نے بھی اس رجحان کے زیرِ اثر مضامین لکھے۔ تمثیل کی ذیل میں اُن کے دو مضامین خاصے مشہور بھی ہوئے۔ ایک اتفاق واختلاف اور دوسری تمثیل عقل ونقل کا جھگڑا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> تمثیل کی طرف رجحان اس زمانے کا ایک خاص رجحان معلوم ہوتا ہے۔ مجرد صفات کو مجسم اور ذی روح بنا کر پیش کرنے کے اس رجحان کی عمدہ مثالیں محسن الملک کے یہاں بھی ملتی ہیں اور سرسیّد کے یہاں بھی حتیٰ کہ یہ مثالیں آزاد کے یہاں بھی ملتی ہیں جن کا تہذیب الاخلاق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھوں نے بھی نیرنگِ خیال میں انگریزی ادب کے زیرِ اثر تمثیل نگاری کی۔[۶۱]

''عقل ونقل کا جھگڑا'' بھی اس رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔ پندرہ صفحات پر مشتمل یہ تمثیل اپنے موضوع اور اپنے اسلوبِ بیان کی وجہ سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس تمثیل کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں:

> شرر کی دوسری تمثیل ''عقل ونقل کا جھگڑا'' ہے۔ اس کی ابتداء میں بھی ایک تمہیدی بحث ہے۔ عقل ونقل کی باہمی بحث خاصی علمی ومنطقی ہے۔ دونوں میں کوئی کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔

ملکہ عقل کہتی ہے:

> اب تو لڑنے پر ہی آمادہ ہے تو کیسے مان لوں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کو جو کچھ فضیلت ہے علم سے ہے اور علم مجھ سے ہے۔

ملکہ نقل نے جواب دیا:

علم نام واقفیت اور جاننے کا ہے اور یہ چیز جہاں اور جس قدر ہے مجھ سے ہے۔ دنیا میں کسی کو کوئی چیز معلوم ہوتی ہے محض نقل و روایت سے معلوم ہوتی ہے تم ان سے فائدہ اٹھا کے کوئی قیاس لگا لو یہ اور بات ہے۔

اسی طویل بحث میں ایک بزرگ نصیحت کے لیے، نمودار ہیں، یہ بزرگ روشن ضمیر کاشن ہیں جو اپنا نفس مطمئنہ بتاتے ہیں۔ ان میں تمثیل کی فضا نہیں ہے۔ مکالمے، تقریر و خطابات کے ڈھنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ تمثیلی کردار بھی کمزور و بے جان ہے۔ ۶۲

شرر کے اِن دو مجموعوں کے مضامین کے بارے میں ڈاکٹر سیّد علی شاہ نے بجا کہا ہے:

شرر کے خیالات ابتدا میں بہترین سعی لگتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے ان میں پختگی آتی گئی، خیالات میں نسبتاً سنجیدگی پیدا ہوتی گئی اور طرز بیان نکھرتا رہا...... انگریزی الفاظ کا بھی بکثرت اور غیر ضروری استعمال پایا جاتا ہے مثلاً ہسٹری، نیچر، اَسپیکلشن، ایمفی تھیٹر، پنکچوئٹی، ماٹو، پرسن، سپیچیں، آرتھاڈاکس، سپریم، پریچو، کمیشن، مارل کریکٹر، رپورٹر، ارینجمنٹ وغیرہ بعض اوقات الفاظ کی تکرار بھی حد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے، لبھا لبھا کے، پڑے پڑے، دیکھ دیکھ کر، کس کس انداز سے، نگاہ اٹھا اٹھا کے، جھنکا جھنکا کے، بڑھ بڑھ کر...... لفظ پیارے کا استعمال بھی بے حد ہوتا ہے اور کہیں کہیں رومانویت اور عریانی کا رنگ غالب ہے۔ مثلاً بوسہ کی طلب اور گلے سے لپٹے رہنے کا لطف، بھیج بھیج کے گلے لگانے اور لپٹنے کا سماں، اُبھرے ہوئے سینہ کا ذکر، سینہ مست، اٹھتے جوبن اور مسکی ہوئی چولیوں کا ذکر۔ ۶۳

مختصراً یہ کہ ان دونوں حصّوں کے مضامین دلچسپ اور دلکش ہیں۔ ان مجموعوں کے مضامین کے موضوعات اچھوتا پن لیے ہوئے ہیں۔ مضامین شرر جلد اوّل کا حصّہ سوم ''آغاز و اختتام سال کے مضامین'' پر مشتمل ہے۔ اس حصّہ میں شرر نے ۱۸۸۷ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کے ہر سال کا آغاز اور اختتام بتاتا ہے۔ ہر ایک سال میں ہونے والے واقعات و حادثات کا بھی ذکر کیا ہے، ہر سال کا انھوں نے استقبال بھی کیا ہے اور اسے اپنی نگاہوں سے رخصت بھی کیا ہے۔ اس حصّہ میں کل ۳۹ مضامین ہیں۔ یہ حصّہ ۱۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون ۱۸۸۷ء اور ہم''

ہے۔شرر نے اس مضمون میں دلگداز کے اجراء، اس کے مقاصد، اس کی تاثیر اور دلگداز پر اعتراضات کا بھی ذکر کیا ہے۔عبدالحلیم شرر نے اس مضامین میں دلگداز کی کارکردگی کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ اس سال کے آغاز سے اختتام تک کیسا رہا؟ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا یا نہیں ہوا؟ ''دلگداز'' کے بارے میں اِن خیالات کا جائزہ باب صحافت میں تفصیلاً پیش کیا جائے گا۔مضامین کے سلسلے میں ان کے دیگر موضوعات پیش کیے جا رہے ہیں۔شرر کے اِن مضامین سے اُس دور کی سیاسی صورت حال کا بھی پتہ چلتا ہے۔۱۸۸۸ء میں ملکی حالات کیسے تھے اور کانگریس کا ہنگامہ کیسا رنگ لایا تھا؟ لکھتے ہیں:

> الغرض ہندوستان کی ملکی حالت اور مسلمانوں کی قومی صورت نے کوئی ایسا پہلو نہیں بدلا کہ ہم اپنے دل کو کچھ تسلی دے سکیں ایک کانگریس کا ہنگامہ گرم رہا جس کے اعتبار سے طرفداران کانگریس کے حوصلے البتہ کسی قدر بڑھ گئے ہوں گے۔مگر قطع نظر اس کے کہ ہم موافق ہیں یا مخالف اتنا ضرور کہیں گے کہ ہندوستان کی بدنصیبی سے اس کانگریس نے ہندو مسلمان میں سخت مخالفت اور عداوت پیدا کر دی ہے۔گو یہ مخالفت بیشتر سے تھی مگر ۱۹۸۸ء نے زیادہ اشتعال دلا دیا۔[۶۴]

''دلگداز اور انیسویں صدی'' بھی ایک نمایاں مضمون ہے جس میں شرر نے پوری صدی کا جائزہ پیش کیا ہے دنیاوی ترقی کے زینے کیسے طے ہوئے؟ ان گوشوں کو اُجاگر کیا ہے اور ساتھ ہی دلگداز کی اشاعت و ترقی اور اس کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس صدی کو ہر لحاظ سے بہتر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر چہ اس صدی میں بھی انقلابات اور خون ریزی ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ترقی بھی جتنی اس صدی میں ہوئی ہے باقی کسی صدی میں نہ ہوئی ہوگی۔

''یکے بہی او دو دیگرے بہی آید'' یہ مضمون ۱۹۰۴ء کے رخصت ہونے اور ۱۹۰۵ء کو خوش آمد کہنے کے لیے لکھا گیا ہے۔شرر نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ خوشی اور غم ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور جانے والا سال ہماری زندگی کا ایک قیمتی سال ہم سے چھین لیتا ہے اور یہ حقیقت بھی بتاتی ہے کہ آنے والے سال کی خوشی بچوں کو ہوتی ہے اور غم بوڑھوں کو ہوتا ہے۔

''لب گور ۱۹۰۵ء''مضمون میں بھی شرر نے حقائق کو بیان کیا ہے اور ان صداقتوں کو بیان کیا ہے کہ انسان ''موجودہ صحبتوں اور اس وقت کے ساتھ رہنے والے رفیقوں کی قدر نہیں کرتا'' اور اُن صحبتوں اور دوستوں کو حسرت و تأسف سے یاد کرتا ہے جو ساتھ چھوڑ کر چلے گئے''۔اِسی طرح یہ سال جو گزر گیا ہے وہ بھی ہمیں یاد آئے گا

بے ثباتی کائنات اور فانی زندگی کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> انسان اور قریب قریب ساری مخلوق کی یہ حالت ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کا چراغ کب گل ہوگا اور کس دن فرشتہ اجل ہمیں آزمائش گاہ دنیا سے باہر نکالے۔ اس قطعی لاعلمی کی وجہ سے انسان کو سخت شکایت ہے …… یہ لاعلمی ہی ہمیں غفلت میں رکھتی ہے جس کی گھبراہٹ میں نہ یہاں کا کام کرتے بنتی ہے اور نہ وہاں کا کام ……۔[۶۵]

شرر نے ''آغاز و اختتام سال'' کے نام سے جو مضامین لکھے ہیں۔ اُن کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک تو شرر کی ذاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسرے اُس عہد کے خارجی حالات و واقعات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور تیسرے دلگداز کی کارکردگی کا بیان بھی ان میں موجود ہے۔ شرر نے ''۱۹۱۳ء کا آغاز'' اور ''۱۹۱۳ء کا خاتمہ'' کے عنوان سے دو مضمون لکھے ہیں۔ ان مضامین میں بھی گذشتہ سالوں کی طرح شرر نے داخلی و خارجی حالات وواقعات کا ذکر کیا ہے۔ ''نیا سال اور نیا خیال'' کے عنوان سے شرر نے جو مضمون لکھا ہے، اس کا انداز بھی خطابیہ ہے۔ شروع میں لکھتے ہیں: ''دوستو! اب ہم ۱۹۱۴ء میں ہیں اور ۱۹۱۳ء اسی عدم آباد میں پہنچ گیا جہاں اُس کے سے ہزارہا سنین مافیہ جا چکے ہیں''۔[۶۶] ''۱۹۱۶ء کا کوچ'' کے نام سے جو مضمون لکھا ہے۔ یہ بھی اُس دور کے حالات وواقعات کا آئینہ دار ہے اور شرر کے دردمندانہ دل کا عکاس بھی۔

> او ظالم جانے والے! ارسال بھر تک جام خونیں پینے پلانے والے!! اس قدر ہنگامے مچا کے۔ ایسی عظیم الشان خونریزی کرا کے لاکھوں نوجوانوں کو آغوش مرگ بن سلا کے، لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں بچوں کو یتیم کرا کے اور لاکھوں میل زمین کو انسانی خون سے سیراب کر کے تو یوں چپ چپائے چلا جاتا ہے کہ گویا تو نے کچھ کیا ہی نہیں؟ ……[۶۷]

''سال انیس سو انیس مبارک باشد'' مضمون میں شرر نے اُس بڑے انقلاب کی بات کی ہے اور ساتھ ہی تخلیق سے آج تک کی تاریخ حکمرانی و جہاں بانی'' پر بھی تفصیلی بحث کی ہے اور دنیا کے آغاز سے لے کر ۱۹۱۹ء تک کے جہاں بانی امور کو بیان کیا ہے۔ بتایا کہ پہلے سردار بنے پھر بادشاہ اور اُس کے بعد شہنشاہ ہوئے۔ نشہ حکومت میں غرق حکمرانوں کی حالت یہ تھی کہ انھیں اپنے سوا کچھ ہستی نظر میں نہ آتی تھی۔ اس طرز حکومت کی وجہ سے نمرود، فرعون، شلما نصیر، بخت نصر جیسے حکمران دنیا کے سامنے آئے۔ بنی اسرائیل، یونان، روم کے بعد مسیحیت کی حکمرانی اور رومیوں کے بعد عربوں کا دور شروع ہوا اور:

> حضرت رسول آخر الزمان نے اُس سرزمین سے ظہور فرما کے سارے عرب کی عناں فرمان

> روائی اپنے ہاتھ میں لی۔ ایک قانونِ الٰہی جاری کیا جس کی پابندی امیر وغریب، اعلیٰ و ادنیٰ راجا اور پرجا سب کے لیے یکساں طور پر واجب تھی''۔[۶۸]

اس کے بعد خلفائے راشدین کا دور اور پھر انگلستان وفرانس کی حکومتوں کا ذکر موجود ہے اور آخر میں جمہوری طرزِ حکومت کے بارے میں شرر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شرر کے اِن مضامین کی خوبی یہ کہ ہر سال کے آغاز سے اختتام تک کے تمام خارجی، داخلی حالات و واقعات جامع انداز میں مختصراً بیان کیے ہیں۔ جتنے بھی مضامین ''آغاز واختتام سال'' کے نام سے لکھے ہیں۔ اُن میں ہر سال کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اندازِ بیان عام فہم ہے اور اسلوب بھی وہی ہے جو کہ اُن کا مخصوص اسلوبِ بیان ہے۔ اِن مضامین کی وجہ سے ہم شرر کی ذاتی زندگی، اُن کے تجربات اور ان کے حادثات واوقعات کا ایک وافر ذخیرہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ان مضامین میں عالم اسلام اور پوری دنیا کی مختصر تاریخ موجود ہے۔ یہ مضامین اپنے تاریخی پہلو کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اِن مضامین کی وجہ سے دلگداز کی کارکردگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور شرر کے ادبی کاموں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ غرض ہر پہلو سے یہ مضامین اہمیت وافادیت کے حامل ہیں۔

عظیم الحق جنیدی لکھتے ہیں: ''شرر نے علمی اور تاریخی موضوعات سے متعلق بعض مضامین بھی لکھے چنانچہ مضامین شرر اور گزشتہ لکھنؤ وغیرہ اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں''۔[۶۹] شرر کو تاریخ سے خاصی دلچسپی تھی۔ آپ جب سفر یورپ سے واپس آئے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کے ماضی کی یادگاروں کے متعلق لکھا اور خاص طور پر آپ کا مضمون اسپین کے بارے میں جو لکھا گیا ہے وہ اسی تاریخ نگاری سے دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> واپسی میں جب وہ جبرالٹر (جبلِ طارق) سے گزرے ہیں تو مسلمان مؤرخ کی آنکھوں کے سامنے اندلس (اسپین) کی تصویر کھنچ گئی۔ وطن پہنچ کر سب سے پہلے اس کی یاد میں آنسو گرائے اور اسپین پر ایک پُر درد مضمون لکھا جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوا تھا۔[۷۰]

عبدالحلیم شرر کے مضامین کی دوسری جلد تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ تاریخی وجغرافیائی مضامین پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف ممالک شہروں اور قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور تیسرا حصہ اُن مضامین پر مشتمل ہے جو لکھنؤ سے متعلق ہیں، اس حصے کا نام ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ہے۔

اس حصے کا پہلا مضمون ''دمشق'' اور آخری ''کو ہِ وے سووی اکس'' ہے۔اس حصے میں کچھ مضامین طویل ہیں اور چند ایک مختصر بھی۔اس حصے کے طویل مضامین یہ ہیں۔ دمشق، اسپین اور اہلِ عرب، دار الخلافت قرطبہ (۳ نمبر)، مذہب دون مہ، (۴ نمبر)، قومِ کرد (۴ نمبر)، ترکان آل عثمان (۳ نمبر)، بزرگ بن شہریار ناخدا کا ہندوستان (۳ نمبر)، طرابلس الغرب، قدیم غیر مسلم سیامانِ بیت المقدس (۴ نمبر)۔مختصر مضامین کی ذیل میں یہ مضامین بیان کیے جا سکتے ہیں۔سوئٹزر لینڈ، جاپانیوں کی قومی کہانیاں۔قدامت مصر کے جدید ثبوت، سائدین یا اہلِ خطا، خونی بچے، مامون رشید اور مساجد کرۂ ارض، غوازی، جزیرہ کریٹ میں مسلمانوں کی پہلی آبادی، ایک اگلا بے گناہ ملزم، مراکش کا زوال، مراکو کا ایک قدیم مدرسہ، بناء بغداد، ایک عرب دربارِ عجم میں، قدیم ہندو راجہ کی عدالت گستری وغیرہ یہ حصہ ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اِس حصے کا ایک مضمون ''اسپین اور اہلِ عرب'' ہے جس میں شرر لکھتے ہیں کہ:

> مسلمانوں نے جس وقت اسپین کو لیا تھا، اس وقت تمام اسپین کا دار الخلافت قرطبہ قرار پایا تھا مگر جس وقت یہ ملک ان کے قبضے سے نکلا تھا۔اس وقت باہمی مخالفتوں اور عداوتوں کی وجہ سے دو حکومتیں الگ الگ قائم تھیں اور ان کے قبضے میں بھی بہت تھوڑی زمین تھی ......۔[۷۱]

اپنے اس مضمون میں شرر نے اسپین اہل عرب کی حکومت اور ان کی ترقی وزوال کا حال لکھا ہے۔شرر نے ایک مضمون بعنوان ''دار الخلافت قرطبہ'' لکھا اور ''مدینۃ الزہرا اور اس کا قصر'' کے حوالے سے لکھا ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے:

> دار الخلافہ قرطبہ میں صرف جامعہ قرطبہ کا ذکر شامل ہے۔مدینۃ الزہرا اور قصرِ زُہرا میں زیادہ تر قصرِ زُہرا کی تعمیر کا تفصیلی ذکر کانڈی سے لیا گیا ہے اور اسے اسلامی دنیا میں بے نظیر قرار دیا ہے۔بنائے بغداد میں صرف اس کے مشرقی حصے کے آباد کیے جانے کا بیان ہے۔[۷۲]

شرر نے ایک مضمون گزشتہ مسلمان عورتیں کے عنوان سے لکھا ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ مسلمان عورتیں'' مسلمان عورتوں کی گزشتہ مذہبی تعلیم پر ایک ہندو اہلِ قلم کے اعتراض کا جواب ہے۔اس میں تفسیر کبیر کو فلسفے میں بے بدل، علم الکلام کی ایک کتاب پڑھنے والے کو ایک فلسفے کے ایم اے سے زیادہ قابل اور ایک محدّث کو بے مثل تاریخ داں لکھا ہے اور اس سے یہ دلیل اخذ کی ہے کہ مسلمان عورتوں کی مذہبی تعلیم میں سائنس، فقہ، منطق، تاریخ سب شامل ہیں۔اس کا

مضمون کچھ دل آزاری کے پیرائے میں لکھا گیا ہے اور طنز و تشنیع سے بھرا ہوا ہے جس سے دوسری قوموں کے افراد کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں۔ ۷۳

''گزشتہ مسلمان عورتیں''، مضمون میں شرر نے اسلام کی پہلی صدی کی ایک مشہور عورت کا تذکرہ کیا ہے۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی صاحبزادی اسماء کا ذکر بھی موجود ہے۔ ''دارالخلافت قرطبہ'' ایک طویل مضمون ہے اور اس مضمون کو لکھنے کا مقصد شرریوں بیان کرتے ہیں:

اس سال چونکہ ہم اپنے ناول کے ذریعے سے ناظرین کو ملک ہسپانیہ اور خاصتہً وہاں کے معروف و مشہور شہر قرطبہ کی سیر کرائیں گے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مستقل طور پر قرطبہ کے تمام تاریخی اور سچے حالات بتادیں تاکہ لوگوں کو اس باعظمت وجلال شہر کا بخوبی علم ہو جائے اور ہم وطنوں کی نظر سے اس کی ایک تصویر گزر جائے جس کے بعد وہ ناول کے ہر مضمون سے پورا لطف اٹھا سکیں اور خلافت اسپین کے متعلق ان کی واقفیت وسیع ہو جائے۔ ۷۴

اپنے اس مضمون میں شرر نے قرطبہ کی مشہور و معروف مسجد کا ذکر بھی کیا ہے اور زیادہ تر ذکر اس مسجد کی بنیاد اور اس کی سجاوٹ و آرائش ہے۔ ہر عہد میں ہر مسلمان حکمران نے جو کوشش اس مسجد کو بنانے اور سنوارنے کے لیے کی اس کا بیان ہے۔ لکھتے ہیں: ''ہم بیان کر چکے ہیں کہ نسل بنی آمیہ کے ہر خلیفہ نے اس مسجد کی اصلاح اور ترقی میں برابر کوشش کی ......''۔ ۷۵ یہ وہی مسجد ہے جس پر ایک طویل نظم علامہ اقبال نے بھی لکھی ہے جس کا نام انھوں نے مسجدِ قرطبہ رکھا ہے۔ شرر کا مضمون ''ملک یمن ساری دنیا کی تہذیب وتمدن کا سرچشمہ ہے'' عربی اور دراوڑی قومو ں اور فرقوں کے بیان میں ہے۔ اس مضمون میں شرر لکھتے ہیں:

ان تمام گذشتہ واقعات سے پوری طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ یمن کا تمدن مصر اور تمام دنیا کے تمدن سے سابق ہے اور تہذیب کی دنیا میں اولیت و ایجاد کا تاج پہننے کی اگر کوئی قوم مستحق ہے تو وہ عرب ہیں ......۔ ۷۶

اس حصہ میں جو تاریخی و جغرافیائی مضامین لکھے گئے ہیں۔ وہ مختصراً بیان کیے گئے ہیں اور کسی بھی ملک، شہر اور قوم کے بارے میں چیدہ چیدہ واقعات کو شرر نے بیان کیا ہے۔ ''مذہب دون مہ'' میں یہودیوں کے منافق فرقوں کے سلطنتِ عثمانیہ میں، آباد ہونے اور ان کے بانی سباتائی سوی کا حال شامل ہے۔ لکھا ہے کہ ان فرقوں میں مذہبی اختلافات کے باوجود دنیوی اتحاد پایا جاتا ہے جو شیعہ سنیوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ قوم کرد کو جس سے صلاح الدین کا تعلق ہے۔ شرر نے کلائیوں کی نسل سے بتایا ہے۔ طرزِ بیان اچھا ہے مگر مآخذ کی وضاحت

نہیں کی۔ ہندوستانی شاعری پرطنز غالباً مسٹر ملنجن اور مسٹر رمیش وغیرہ کے بیانات کا ترجمہ ہے۔شرر میں ترجمہ کرنے کی اچھی صلاحیت تھی جس سے وہ مزید فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔شرر مسلمان علماء کے کفر کےفتوؤں کے مسیحوں پر اثر کے مدنظر ان کی مذمت کرتے ہیں عمارتوں میں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کا ذکر شامل ہے۔ دیومالا کے سلسلے میں جاپانیو ں کی قومی کہانیوں اوران کے روائتی انسانوں اورمقتدات کا بیان چیلڈیا والوں کا دین کے تحت ان کے مقتدات کا حال شامل ہے جوتخلیقِ کائنات اورذات باری سے متعلق ہیں فتح طرابلس کا بیان تفصیلی ہے جس میں عقبہ بن ناصع اورکابینہ کا ذکر دہرایا گیا ہے۔جزیرہ کریٹ میں مسلمانوں کی پہلی آبادی کےاسباب اورطریق کا بیان ہے۔صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں ایک مسلمان کے ایک فرنگن کے سامنے کا ذکر ہے۔مراکش کے زوال کے سلسلے میں مراکش کی اہمیت عقبہ بن نافع کی قیادت میں مسلمانوں کی فتح مراکش جوموسیٰ ابن نصیر کے غلام طارق کی سرکردگی میں مارکشیوں کے ہاتھوں اسپین کی فتح اورمراکش کےلشکر جرار وغیرہ کا بیان ہے سوئٹزرلینڈ کے حالات میں وہاں کی زمین دوز اور پہاڑیوں پرگزرنے والی ریلوں کا بیان ضرورت سے زیادہ مفصل ہے۔''بزرگ بن شہریار نا خدا کا ہندوستان'' کتاب عجائب الہند سے عجیب وغریب باتیں نقل کی ہیں مثلاً اس میں ایک ہزار سال پہلے کےقرآن کے ترجمے اور ہندوستانی زبانوں میں مسلمانوں کی شعرگوئی کا بیان بھی ملتا ہےاورایک عراقی النسل ہندی نژاد کے سندھی میں قصیدہ کا ذکربھی ہے۔قدیم سیاحان بیت المقدس میں مسلمانوں کی رواداری اورزیادہ تر ایک یہودی کی زبانی اس کے ساتھی یہودیوں کا بیان ہے۔ شرر نے اس حصے میں جہاں شہروں اورملکوں کے حالات قلم بند کیے ہیں وہاں قوموں اورفرقوں پربھی خامہ فرسائی کی ہے۔اُن کا ایک مضمون ''خوارج'' بھی ہے جس کوشرر نے اپنے انداز سےلکھا ہے۔اس حصے کےطویل مضامین میں سے ایک مضمون ''بزرگ بن شہریار نا خدا کا ہندوستان'' بھی ہے۔اس مضمون میں شرر نے تیسری صدی ہجری کےایک مسلمان جہاز ران کی کتاب ''عجائب الہند'' سے وہ واقعات بیان کیے ہیں جو کہ ہندوستان سے متعلق تھے۔ان مضامین کے متعلق ڈاکٹرسید شاہ علی لکھتے ہیں کہ:

> شرر ایک بات کوبار بار دہراتے ہیں مثلاً عقبہ بن نافع کا ذکر جس سے پڑھنے والا اکتا جائے، فتح بیت المقدس اورحضرت عمرؓ کی آمد کا بیان سیدھا سادہ لیکن اچھا ہے۔مراکو کے ایک قدیم مدرسہ کا حال لکھا ہے جسے عبدالمومن نے قائم کیا تھا جس میں اورعلوم وفنون کے علاوہ فنونِ حرب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ فتح طرابلس اورطرابلس الغرب دونوں میں عبداللہ اورزبیر بن عوام اورفلپانہ کا واقعہ دہرایا گیا ہے...... انگریزی الفاظ مثلاً پک نک ،ٹپ کیشن،کورٹ شپ وغیرہ حسبِ دستوراس میں بھی مستعمل ہیں۔ ۷۷

اِس حصے میں شرر نے عربی، فارسی اورانگریزی زبان کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اورقرآن پاک کی آیات کے

حوالے بھی دیئے ہیں۔تاریخی واقعات کو بیان کرنے کے گُر سے شرر بخوبی آگاہ تھے۔اُن کے فن کا یہ جوہر اس حصے کے مضامین سے بھی عیاں ہوتا ہے۔شرر چونکہ شاعر تھے اور شاعرانہ مذاق رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے مختلف مضامین میں اشعار کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

شرر نے عام فہم انداز بیان اپنایا ہے۔سادہ اور سلیس نثر لکھی ہے۔اُن کا قاری اُن کی نثر کی تاثیر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اُن کے مضامین میں دلچسپی اور دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔شرر نے حالات وواقعات کی مناسبت سے اندازِ بیان اپنایا ہے۔اس حصّے کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ شرر کو تاریخ اور تاریخی واقعات سے زیادہ دلچسپی تھی جس کا منہ بولتا ثبوت یہ مضامین ہیں۔

حصہ دوم میں بھی طویل اور مختصر مضامین شامل ہیں۔اس حصّہ کے مضامین کے موضوعات اور مواد میں وسعت اور تنوّع پایا جاتا ہے۔بقول ڈاکٹر سیّد شاہ علی:

> موضوعات اور مواد میں تنوّع اور وسعت موجود ہے۔شرر نے ہندو مسلمانوں کے حالات، مسلمان اور عیسائی بادشاہوں کے حالات، گرجوں، خانقاہوں اور مساجد کی تفصیلات حبشیوں کے بارے میں معلومات، ہندوستان اور یورپ کے بانکوں کی تفصیلات، گیلڈ پیٹرس (شرر کے الفاظ میں خونی پٹھے) عبرت ناک تاریخی واقعات وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے یہاں اسلامی برتری کا نقطۂ نظر ہر جگہ موجود ہے چنانچہ نفطہ یا گریک فائر کو مسلمانوں کی ایجاد ثابت کیا ہے اور مختلف تاویلات کے ذریعہ محمود غزنوی کے حریص و طامع ہونے کی تردید کی ہے۔مقیاس نیل میں مسلمانوں کے کارنامے کا بیان مقصود ہے۔[۷۸]

اس حصّہ کا پہلا مضمون ''مسیحیت کے متعدد فرقے'' ہے۔یہ ایک طویل مضمون ہے۔اس مضمون کے مطالعے سے شرر کی وسعتِ نظر اور وسیع مطالعہ کا ادراک ہوتا ہے اور اُن کے تاریخی ذوق وشوق کے عناصر بھی اس مضمون میں شامل ہیں۔''نفطہ یا گریک فائر'' میں شرر نے آتش بازی کی ایجاد اور مختلف ادوار میں اور مسلمانوں کے عہد میں اس کے استعمال پر روشنی ڈالی ہے،مسلمانوں میں اس کے موجدوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔لکھتے ہیں:''مسلمانوں میں اس کا موجد ابن حاجس بتایا جاتا ہے جس نے اسے خود ایجاد کر کے، اس کا نام ''نفطہ'' قرار دیا''۔[۷۹]

''ایک ہندو دربار میں مسلمان ایلچی'' مسٹر ایلیٹ کی ''تاریخ ہند'' سے یہ مضمون شرر نے اخذ کیا ہے۔اس مضمون میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ دلکشی بھی ہے اور شرر کے تاریخی ذوق کی عکاسی بھی اس مضمون سے ہوتی ہے

۔ ’’دریائے نیل کا منبع‘‘ بھی ایک دلچسپ مضمون ہے۔ اس میں شرر نے بتایا ہے کہ دریائے نیل کہاں سے نکلا ہے اور پہلے پہل لاعلمی کی وجہ سے لوگوں میں کیا کیا باتیں مشہور تھیں؟ اس مضمون میں شرر نے خوبصورت الفاظ اور تشبیہہ واستعارہ کو بھی استعمال کیا ’’محمود غزنوی کی حرص وطمع‘‘ میں شرر نے چند واقعات اُس کی حرص وطمع کے بیان کیے ہیں۔ لیکن ہر ایک واقعے کے بعد شرر نے اُس کی وجہ بھی بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ محمود غزنوی میں حرص وطمع نہ تھی بلکہ ان واقعات کے پیچھے حقیقت کچھ اور تھی۔ ’’مسجد ابا صوفیہ‘‘ بھی ایک طویل مضمون ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی شرر کے مضامین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> چند واقعات اسلامی تاریخ سے ماخوذ ہیں مثلاً مسلمانوں کی اسپین کی فتح اور اس سے دست برداری اور ہندوستان کے قدیم معاشرتی حالات سیاحوں کی زبانی بیان کیے ہیں۔ مسٹر ایلیٹ کی عربی فارسی تاریخوں کے تراجم سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اسلامی روایات سے بھی مدد لی ہے مثلاً نیل کا منبع انہی پر مبنی ہے۔ ہرنام سنگھ کی تاریخ ’’سعادت جاوید‘‘ کے ترجمہ ایلیٹ (Eliot) سے کھتر انی کا ذکر لیا ہے جس سے ہندو مسلم تعلقات ... پر روشنی پڑتی ہے۔ مسجد ابا صوفیہ کا بیان ابن بطوطہ سے لیا ہے۔[۸۰]

’’ہندوستان کے بانکے‘‘ بھی ایک خوبصورت اور دلکش مضمون ہے جس میں شرر نے ہندوستانی بانکوں کی وضع قطع کا ذکر کیا ہے اور اُن کا حلیہ بیان کیا ہے۔ اس مضمون کا اسلوب جاندار ہے اور موقع محل کی مناسبت سے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ شرر کا مضمون ’’کوریا‘‘ بھی ایک خوبصورت مضمون ہے جو کوریا کے محلِ وقوع وہاں کے بادشاہ، انتظام سلطنت، عدالتی نظام، کوریا کی زبان، وہاں کے نظامِ تعلیم، وہاں کے مذہب، لوگوں کے اعتقادات، عورتوں کی اس ملک میں حیثیت اور وہاں کے آداب معاشرت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ’’دو عبرتناک واقعے‘‘ مختصر ترین مضمون ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں: ’’معاویہ سے قوم جرہم کے ایک معمر شخص کی ملاقات اور ان کے سامنے دنیا کی ناپائیداری کا بیان قلم بند کیا ہے..... شرر حسب دلخواہ موضوعات کو تاریخی فہرست میں داخل کر لیتے ہیں‘‘۔[۸۱]

’’قدیم سیاحان ہندوستان‘‘ ایک طویل مضمون ہے جس میں ہندستان کے قدیم حالات۔ وہاں کے قدیم بادشاہ، نظامِ سلطنت، طرزِ بودوباش کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہاں کے رسم و رواج، بادشاہ کے دربار، آدابِ معاشرت، رہن سہن وغیرہ کا تذکرہ موجود ہے۔ ’’قبطی زبان‘‘ بھی دو صفحات پر مشتمل ایک مختصر مضمون ہے جس میں قبطی زبان کے بارے میں شرر نے مختصراً لکھا ہے۔ ’’دارالخلافت اسلام‘‘ میں شرر نے جس مقصد کو اپنایا ہے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

چونکہ خلافتِ اسلام کا مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا چاہتا ہے لہٰذا خلافت کی تاریخ کے ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دارالخلافت اسلام کے تغیرات و انقلابات سے بھی ہم مسلمانوں کو آگاہ کریں۔[۸۲]

اس مضمون میں شرر نے بتایا ہے کہ اسلام کا پہلا دارالخلافت مدینہ طیبہ تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانہ میں کوفہ مرکز اسلام قرار پایا۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں دمشق اسلام کا دارالخلافت قرار پایا تھا۔ بنی امیہ کے دور میں بھی دارالخلافت اسلام دمشق ہی رہا۔ بنو عباس کے عہد میں پہلے انبار اور پھر بغداد کو دارالخلافت قرار دیا گیا۔ اس کے بعد شہر سُرمَن رائے، یا رونیہ، جعفریہ میں دارالخلافت رہنے کے بعد پھر واپس بغداد کا اور بعد میں قاہرہ اور قسطنطینہ کو دارالخلافت اسلام بنایا گیا۔ ''ایک اگلے عابد و زاہد کی نصیحت'' بھی مختصر ترین مضمون ہے۔ ''سکندر اعظم اور ہندوستان کا ایک علمی دربار''، ''مدینہ منورہ''، ''اسپین اور اہلِ عرب'' بھی اعلیٰ پائے کے مضامین ہیں۔ مضامین شرر کے اس حصے کے ضمن میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

مسعودی کی کتاب ''مروّج الذہب'' سے سکندر اور ہندوستان کے ایک علمی دربار کا ذکر لیا گیا ہے جو غالباً انگریزی میں نہیں ملتا۔ رومی تاریخ و معاشرت کا ذکر بھی برا نہیں ہے۔ مدینے کے حالات ایک انگریزی تصنیف سے پیش کرتے ہوئے افسوس کیا ہے کہ ہزاروں زائر ایشیا، یورپ بلکہ دنیا بھر سے مدینے جاتے ہیں لیکن کسی کو اپنا سفر نامہ لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ کانڈی کی اسپین کی تاریخ سے جو تین جلدوں میں ہے اور جس کا ترجمہ منشی امراؤ علی مصنف البرٹ بل نے کیا ہے۔ اسپین اور اہلِ عرب کے حالات پیش کیے ہیں اور مصنف کی بے تعصبی کی تعریف کی ہے۔ پیرایۂ بیان دردناک ہے۔ مختلف اسلامی دارالخلافوں کے متعلق تاریخی معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ حبشیوں کے حالات بھی قلم بند کیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرر کی زود نویسی اور بسیار نویسی، خیالات اور جملوں کی تکرار ادبیت کی کمی کا باعث ہے۔ اس میں مضامین کی کثرت کے علاوہ ان کے موضوعات کے تنوع کو بھی دخل ہو اور وہ بیان اور طرزِ ادا پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے ہوں۔[۸۳]

اس حصے میں جغرافیائی مضامین بھی شامل ہیں۔ کوریا، ہندوستانِ قدیم، شہر واسط، مدینہ منورہ، دریائے نیل کا منبع، مسجد ابا صوفیہ، مقیاس نیل وغیرہ جغرافیائی مضامین کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس حصے کا آخری مضمون ''ہمارے شعرا کا معشوق'' ہے۔ اس حصہ میں جو مضامین شامل ہیں وہ تاریخ سے متعلق بھی ہیں اور ملکوں اور شہروں سے متعلق بھی۔ بعض معاشرتی مضامین بھی ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں کہ:

سفر پالن پور میں ایک ہندوستانی ریاست کی رواداری اور روایات کھانے پینے وغیرہ میں ہندو اثرات، ہندورانیوں سے بیاہ وغیرہ کا بیان ہے۔ بحث خلافت کے دوران اہلِ عرب کی موجودہ حالت اور معاشرت کا جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں اب حکمرانی اور آتائی کی صلاحیت نہیں رہی۔ آل عثمان میں پہلی سلطانہ صبیحہ میں ازدواجی مسئلہ کی بحث سے ان کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ مسیحیت کے مبتدعہ فرقوں کی ابتداء، ارتقاء اور انتہا سے بحث یا عیسائیوں کے تبرک کانٹوں کے تاج اور مختلف متبرک چیزوں اور اسلام میں ان کی مماثل اشیا کا ذکر...... قبطی زبان کی اصل، ارتقاء اور موجودہ حالت کا جائزہ بھی اس میں شامل ہے اور ہمارے شعراء کے معشوق کی تاریخ بھی جسے مزاحیہ انداز میں سپردِ قلم کیا ہے، زیادہ تر قیاسی ہے۔ چنانچہ عربوں کا بنت عم سے عشق، لڑکیوں کی حاضر جوابی، دوسری صدی میں نصرانی لڑکوں سے عشق (مدرک وغیرہ کا) پھر ایرانیوں کا کشت پیر مغاں سے شراب کا تعلق، چین کے بُت خانوں، عشق، ہندوستانیوں کے ہاں ہندو بت خانوں اور بغیر سوچے سمجھے دیوتاؤں کی تصاویر سے محبت کو وہ قیاوی کا نمونہ ہی کیوں نہ ہوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور افسوس کیا ہے کہ کاش معشوق کے انتخاب میں یہ لوگ کم از کم ہندی شاعری کا نمونہ ہی مدِنظر رکھتے۔[۸۴]

''گذشتہ لکھنو'' کے عنوان سے شرر نے مختلف مضامین لکھے تھے اس پوری جلد میں شرر نے لکھنو کے بارے میں لکھا ہے جس کے بارے میں رشید حسن خان کا کہنا ہے:

آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کے زمانے کا لکھنو! تصوّر کے ساتھ ہی رنگ ونور کی بے شمار پرچھائیاں آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں اور یہ عالم اس وقت ہے جب کہ نفاست وتہذیب اور عیش وعشرت کی اس طلسماتی دنیا کا حال ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے لیکن جن لوگوں نے اس عالم رنگ ونور اور اس فردوس تہذیب وتمدّن کی آخری بہاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس دنیا کے آداب کو سمجھا اور برتا ہو اور پھر اس بہار پر خزاں آتے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو۔ ان کے اثرات کیا ہوں گے۔ مولانا شرر کی کتاب ''گذشتہ لکھنو'' انہی تاثرات کی کہانی ہے۔[۸۵]

جس طرح ہر شخص کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اسی طرح بڑے بڑے شہروں کے بھی اپنے مزاج ہوتے ہیں اور اس مزاج کی تشکیل میں صدیوں پر محیط تاریخی، سماجی اور ثقافتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ کچھ مخصوص خوبیاں ہوتی ہیں

جن کی وجہ سے اس شہروں کی ایک پہچان بنتی ہے۔انسانی زندگی کی طرح ان شہروں کو بھی عروج وزوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگر چہ وہ اس دنیا سے مٹ جاتے ہیں لیکن اپنی نشانیاں، پہچان اور شناخت چھوڑ جاتے ہیں۔ایسے ہی شہروں میں سے ایک شہر لکھنو بھی تھا۔محمد اکرم چغتائی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> اشخاص کی طرح بڑے شہروں کے بھی مخصوص مزاج ہوتے ہیں جن کی تشکیل میں صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخی، ثقافتی اور سماجی عوامل الگ الگ اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔بالآخر بعض امتیازی خصائص ہی ان شہروں کی شناخت کا باعث بنتے ہیں اور پھر یہی مختلف تہذیبی مظاہر میں منعکس ہوتے ہیں۔حیاتِ انسانی کے مختلف مراحل کی طرح یہ شہر بھی عروج وزوال کی کئی منزلوں سے گزرتے ہیں لیکن اس کے باوجود صفحہ ہستی پر اپنی پہچان کے دیرپا اور انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔بلاشبہ ان کا شمار ''بلادِ گزشتہ'' میں کیا جاتا ہے لیکن تہذیبی ارتقاء کے تیز دھارے کی روانی میں ان کی سعی پیہم کو آسانی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔برصغیر کے ایسے شہروں میں ایک شہر لکھنؤ بھی تھا۔[۸۶]

عبدالحلیم شرر کا تعلق بھی لکھنو سے تھا۔انھوں نے اس شہر کے عروج و زوال کو اپنی نگاہوں سے دیکھا، تہذیب وتمدن کا خود مشاہدہ کیا اور پھر اس مشاہدے کے نتائج بھی اخذ کیے۔لکھنو وہ شہر ہے جس کو شرر جیسا نثر نگار ملا جس نے ادب کی دنیا میں لکھنو کے ماضی کو شاندار طریقے سے روشن کر دیا۔اگر چہ وہ ناول نگار تھے اور وہ بھی تاریخی ناول نگار لیکن ان کا کمالِ فن یہ بھی ہے کہ گزشتہ لکھنو کے عنوان سے ایسی کتاب لکھ دی جس نے ان کے دور میں بھی شرفِ قبولیت حاصل کیا اور آج کے دور میں بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔اس میں معلومات کا خزانہ بھی ہے اور دیدہ عبرت کا سامان بھی۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> یہ جذباتی شخص عبدالحلیم شرر تھا جس نے تاریخی ناول لکھتے لکھتے گذشتہ لکھنو پر ایسی کتاب لکھ دی جس کا بوجوہ آج بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔معلومات وکوائف کے لیے بھی اور دیدۂ عبرت وا کرنے کے لیے بھی! کتاب کا مکمل نام یوں ہے۔''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنو''۔رشید حسن خان کی مرتّبہ کتاب کے سرورق پر یہی تحریر ہے (دہلی مکتبہ جامعہ ۲۰۰۰ء) جبکہ شمیم انہونوی کی مرتّبہ کتاب کے سرورق پر عبارت الٹ ہے۔''گذشتہ لکھنو یا مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ''۔(لکھنو نسیم بک ڈپو ۱۹۶۵ء)
>
> ......ہندوستان کے تمام شہروں کے مقابلہ میں لکھنو کے بارے میں سب سے زیادہ

لکھا گیا۔ چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ قدیم لکھنو کی آخری بہار از مرزا جعفر حسین

۲۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب، اپنے تہذیبی پس منظر میں از مرزا جعفر حسین

۳۔ لکھنو کی تہذیبی میراث از ڈاکٹر سید صفدر حسین

۴۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۵۔ فرخ بخش از نجم الغنی رام پوری

۶۔ لکھنو کا شعر و ادب از ڈاکٹر سید عبد الباری

۸۔ لکھنو کی لسانی خدمات از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

۹۔ لکھنویات ادیب از مسعود حسن خان رضوی ادیب (مرتبہ طاہر تونسوی)

۱۰۔ دبستان لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقاء از ڈاکٹر آغا سہیل

۱۱۔ لکھنو کی اردو شاعری از سید بشیر الحسن (غیر مطبوعہ)

یہ تو سامنے کی چند کتابیں ہیں۔ یقیناً مزید ایسی کتب بھی طبع ہوں گی جن سے میں لاعلم ہوں اور پھر ان پر مستزاد متعدد ایسی کتابیں جن میں بالواسطہ طور پر......پس منظر یا تناظر کی صورت میں......لکھنؤ کا تذکرہ مل سکتا ہے۔[۸۷]

لکھنؤ وہ شہر ہے جس کے نام سے منسوب بہت سی کتب تحریر کی گئیں۔ کچھ کتابوں نے شہرت و مقبولیت بھی حاصل کی۔ ان کتب میں لکھنو کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں موجود ہیں۔ عبد الحلیم شرر نے بھی گذشتہ لکھنو لکھ کر اپنا نام اس صف میں شامل کر لیا اور اردو ادب کو وہ تحفہ دیا جس میں لکھنو کی مکمل تاریخ، تہذیب و ثقافت اور تمدن کی جھلک موجود ہے۔ شرر کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادر ہے گا اور علم و ادب کی دنیا میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ بقول فیض احمد فیض: ''ہندوستان میں مشرقی تمدّن کا نمونہ یہ ایک طویل مضمون ہے جس میں لکھنو کی معاشرت اور رسوم و رواج پر نہایت مفید اور مفصّل بحث کی گئی ہے''۔[۸۸]

گذشتہ لکھنو کا موضوع لکھنوی معاشرت اور رسوم و رواج ہیں اور اس موضوع پر جس طرح سے شرر نے لکھا ہے وہ صرف اور صرف انہی کا کمال ہے کوئی اور شرر کے ساتھ کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
انھوں نے سادہ موضوعات بھی دیے جوان کی انشا پردازی کا پہلا نصاب بھی ثابت ہوئے۔اشرف حسینی اس سلسلے میں لکھتے ہیں: ''نواب واجد علی شاہ کی محلات مالیات و بیگمات شرر کی انشا پردازی کا پہلا نصاب ثابت ہوئے''۔[۸۹]
''گذشتہ لکھنو'' کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> مولانا کے مضامین جو دلگداز میں چھپے ہیں...... یہ کتابیں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں مگر علی الخصوص وہ جلد جس میں قدیم لکھنؤ کے حالات جو ہندوستان میں مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ'' کے نام سے دلگداز میں چھپتے رہے، دیکھنے کے لائق ہیں اور اُن لوگوں کے لیے جو لکھنو کی پرانی تاریخ اور دلچسپیوں کے جویا ہیں، نہایت مفید اور پُر اثر معلومات ہیں۔[۹۰]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے عنوان سے جو مسلسل مضامین ان کے قلم سے لکھنو کے تہذیب وتمدن پر نکلے، وہ عجب نہیں کہ مدتوں زندہ رہیں اور آئندہ مؤرخین و اہلِ تحقیق برابر ان سے خوشہ چینی کرتے رہیں۔[۹۱]

سرور اور سرشار نے بھی اپنی نگارشات میں لکھنوی تہذیب وثقافت، کلچر، تاریخ غرض ہر پہلو کو اپنے انداز سے برتا ہے لیکن دونوں ہی لکھنو کی مکمل اور جامع تصویر دکھانے میں ناکام رہے۔شرر کو یہ انفرادیت اور امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے لکھنو کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔سرور، سرشار اور شرر کا جب موازنہ وتقابل کیا جائے تو شرر کا مقام بلند ہی رہتا ہے۔اس لیے کہ انھوں نے اپنے دلگداز کے اُن مضامین میں جو کہ لکھنو سے متعلق لکھے ہیں اس میں لکھنوی تہذیب کی عکاسی، جس انداز سے کی ہے وہ انہی کا کام تھا، کوئی دوسرا ادیب ایسی عکاسی نہیں کر سکتا تھا۔بقول

ڈاکٹر سلیم اختر:

> لکھنوی کلچر میں سمندر جیسی گہرائی نہ تھی اس لیے اس کلچر سے موتی اگلنے والے سیپ نہ مل سکتے تھے۔یہ بند معاشرہ کے جوہڑ جیسا کلچر تھا۔سطح پر کنول کے دل لبھا لینے والے پھول، کنارے پر خوش رنگ اور نازک بیلیں مگر سطح کے نیچے گدلا بلکہ گندا پانی۔یہ انحطاط کا کلچر تھا،

انحطاط کا کلچر ہمیشہ خوش رنگ ہوتا ہے مگر روح پرور مہک سے عاری ہوتا ہے۔ وہی بات

خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

سو لکھنو میں زوال کا کلچر کاغذی پھول دامن میں لیے تھا بہت اچھے، خوبصورت، دل کو لبھانے والے مگر محض کاغذ جو زمانہ کی مٹھی میں پُرمُر ہو جائیں اور مٹھی کھولو تو لے جاتے پون اڑا!۔[۹۲]

لکھنوی تہذیب و تمدّن کے ضمن میں ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

مجلسی زندگی کے اس رکھ رکھاؤ اور لاکھوں رکھ رکھاؤ کے باوجود اس تمدّن کے کھوکھلے پن اور سطحیت پر پردہ نہ پڑ سکا۔ اقدار حیات سے بے نیازی اور منزل سفر کے شعور کے فقدان کے سبب معاشرے کے سارے مشاغل اور مختلف ثقافتی محاذوں پر تگ و تاز بے معنی و بے مقصد ہو کر رہ گئی ہے۔[۹۳]

مضامین شرر، جلد سوم ''سیر نسواں'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں بھی شرر نے رنگا رنگ موضوعات قلم بند کیے ہیں۔ ''سیر نسوان'' میں جن مشہور و معروف عورتوں کا ذکر شرر نے کیا ہے۔ اس قدر عورتوں سے متعلق مضامین کسی اور مضمون نگار نے کم ہی لکھے ہوں گے۔ یہ سوانحی مضامین ہیں جو کہ خاکے کی ذیل میں بھی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ شرر نے جہاں تاریخی، شاعرانہ و عاشقانہ، اصلاح قوم ملت سے متعلق مضامین لکھے وہاں انھوں نے یہ مضامین لکھ کر سوانحی مضامین لکھنے کی روایت کو پروان چڑھایا۔

اس حصہ میں حسن کی کرشمہ سازیوں کے تحت جو (۳۱) مضامین شامل ہیں وہ دلگداز میں شائع ہوئے تھے اور دوسرے موضوعات و مضامین کی طرح یہ مضامین اور ان کے موضوعات کو بھی ناظرین ''دلگداز'' نے بہت پسند کیا تھا۔ ان مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر کا علم کس قدر وسیع تھا اور ان کے وسعتِ مطالعہ اور تاریخ سے دلچسپی نے اِن مضامین کے حسن کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ یہ مضامین قاری کے علم میں اضافے کا سبب بھی ہیں اور شرر کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ سیر نسواں کا یہ حصہ ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ مضامین طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ شرر کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ ہر مضمون پڑھنے کے لیے قاری کا دل بےقرار ہو جاتا ہے۔ جلد سوم کے اس حصے کا پہلا مضمون ''لیلد ے اخیلیہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ ایک نازک خیال شاعرہ تھی۔ لیلیٰ کے بارے میں شرر نے لکھا ہے کہ:

مذکورہ لیلیٰ کے اجداد میں مغویہ نام ایک شخص گزرے تھے جو گھوڑوں کے ایسے شوقین اور اس پالے کے سوار تھے کہ ''اخیل'' (بڑے گھوڑے باز) مشہور ہو گئے۔ اُن کا یہ لقب اُن کی نسل میں چلا اور آخر لیلیٰ اُس کی وارث ہوئی۔ ''اور لیلائے اَخیلیہ'' کہلانے لگی۔[۹۴]

لیلیٰ مشہور و معروف عرب شاعر توبہ بن حمیر کی معشوقہ تھی اور یہ جب اس کی معشوقہ بنی تو اس کی شاعری بھی مشہور ہوئی۔ اس مضمون میں شرر نے بتایا ہے کہ جب لیلیٰ اس کی معشوقہ بنی اُس سے قبل وہ شاعری کرتی تھی یا نہیں۔ اس میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ اُس کے عشق کی ابتدا کے متعلق بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس کی نشو و نما جناب معاویہؓ کے دور میں ہوئی۔ اُس زمانے میں یہ رسم تھی کہ جو کوئی لڑکا کسی لڑکی پر عاشق ہوتا تھا، اُن کی شادی نہیں ہونے دی جاتی تھی۔

اس رواج کی بدولت جب توبہ نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو لیلائے اخیلیہ کے باپ نے اس کی شادی قبیلہ اولع کے ایک نوجوان سے کر دی۔ وہ نوجوان بہت ہی بدگمان تھا۔ لیلیٰ شادی کے بعد بھی اپنے عاشق توبہ سے ملا کرتی تھی۔ آخر یہ معاملہ معاویہ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور فیصلہ دیا گیا کہ آئندہ لیلیٰ توبہ سے نہیں ملے گی۔ اس حکم کا ذکر شرر یوں کرتے ہیں: یہاں سے حکم دیا گیا کہ ''توبہ اب کبھی لیلیٰ سے نہ ملے اور اگر اس حکم کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو لیلیٰ کے قبیلے والوں کو اختیار ہے کہ جب موقع ہاتھ آئے اور اسے جہاں پائیں قتل کر ڈالیں۔[۹۵]

اس حکم کے بعد لیلیٰ اور توبہ کا ملنا جلنا ختم ہو گیا توبہ بہادری اور شجاعت میں بھی مشہور تھا۔ وہ اچھا شہسوار بھی تھا۔ شرر نے اپنے اس مضمون میں اس کی بہادری کے واقعات بھی بیان کیے ہیں اور آخر کار بہادر اور قوی دشمنوں کے نرغے میں گھر کے اس نے اپنی جان دے دی۔

شرر نے چونکہ یہ مضامین ''حسن کی کرشمہ سازیاں'' کے عنوان کے تحت لکھے تھے اس لیے اس مضمون میں شرر نے لیلیٰ اور توبہ کے عشق کی داستان قلم بند کی ہے۔ لیکن اس انداز سے کہ اس کی زندگی اور اس کے عشق کی صداقت اور ان کی پاکدامنی کے پہلو نمایاں طور پر اجاگر ہوتے ہیں اس مضمون میں شرر نے لیلیٰ اور توبہ کے کچھ اشعار بھی بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ شرر نے لیلیٰ کی زندگی کے آغاز سے اختتام تک کے حالات و واقعات کو نہایت ہی جامع اور موثر انداز سے بیان کیا ہے۔ مضمون کا اسلوب اور انداز بیاں ایسا ہے کہ عام پڑھا لکھا آدمی بھی اس کے مرکزی نقطے تک پہنچ سکتا ہے اور اس سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

''زبا ملکہ عرب'' بھی ایک سوانحی مضمون ہے۔ یہ مضمون تقریباً گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں زباء کی بہادری۔ ہوشیاری کی داستان رقم کی گئی ہے۔ اس سے قبل اردو ادب میں اس کا ذکر اس طرح نہیں ملتا۔ شرر نے ہی اس ملکہ کو اردو ادب میں جگہ دی۔ اس کے بارے میں شرر لکھتے ہیں۔

> زبا نام ایک بڑی مشہور و معروف اور لائق و ہوشیار ملکہ گزری ہے جس کے حالات زندگی میں گو ملکہ کلیوپیٹرا کی ایسی ناز آفرینیوں کی چاشنی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ بہت کچھ دلچسپ ہیں۔ زباء کو اگر چہ اردو لٹریچر میں جگہ نہیں ملی مگر عربی لٹریچر میں اس کا نام بہت مشہور ہے۔ اس کو شہرت ہی نہیں ہوئی بلکہ اس کی زبان کے بہت سے جملے اس وقت تک ضرب المثل بنے ہوئے ہیں۔[۹۶]

اس اقتباس سے ملکہ زباء کی سیرت کے چیدہ چیدہ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مضمون میں بھی شرر نے اپنی تاریخی دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے اور ان کے وسعت مطالعہ کا ثبوت بھی اس سوانحی مضمون کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ اس مضمون میں شرر نے اس ملکہ کی زندگی کے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں اور اس کی بہادری کی داستان رقم کی ہے کہ کس طرح اس نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لیا تھا؟

زمانہ جاہلیت میں عرب مقتول کا بدلہ لینا زندگی کا اولین مقصد سمجھتے تھے۔ زباء کے پاس چونکہ فوج نہ تھی اس لیے وہ میدان جنگ میں اس بادشاہ سے اپنے باپ کا بدلہ نہیں لے سکتی تھی اس نے ایک ترکیب سوچی اور بادشاہ جزیمہ کو اپنے مکر وفریب کے جال میں پھسانے کی کوشش کی اور آخر کار اسے شادی کا پیغام بھجوایا۔ بادشاہ اس کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ وزارئے دولت کو جمع کر کے اس سے مشورہ کیا۔ سب وزیروں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن قیصر بن سعد نام شخص نے بادشاہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ عشق اور حسن نے جذیمہ کی عقل پر پردہ ڈال دیا اور آخر کار وہ اس حسین ملکہ کے جال میں پھنس گیا۔ اور اس نے اسے مار ڈالا۔

یہ سوانحی مضمون بہت دلچسپ ہے۔ اس میں اس ملکہ زباء کی زندگی کا خاص واقعہ ہی شرر نے بیان کیا ہے۔ لیکن اس انداز سے کہ قاری کی دلچسپی میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ الفاظ و انداز بیان اور رنگ عبارت اس طرح کا ہے کہ قاری کو بخوبی اس مضمون کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور اس کے مرکزی خیال تک قاری کا ذہن فوراً پہنچ جاتا

ہے۔مضمون کا ابتدائیہ اور اختتامیہ دلچسپ اور سبق اموز ہے۔اس مضمون میں شرر نے ملکہ زباء کی ہوشیاری، بہادری، اس کی لیاقت اور فہم وفراست کو جس انداز سے پیش کیا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت بھی مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

عبدالحلیم شرر نے یہ مضامین کس نقطہ نظر کے تحت لکھے؟ ان کا مقصد تحریر کیا تھا؟ ''حسن کی کرشمہ سازیاں'' کے عنوان سے جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے ان سوانحی مضامین کے محرکات پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> غالباً دنیا کا کوئی حصہ اور کوئی ملک نہ ہوگا جہاں عورت اور مرد کے تعلقات نئے نئے کرشمے نہ دکھائے ہوں ۔ بیشک دنیا کی تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے کہ زبردست تاجداروں اور نامور پہلوانوں نے اپنے زور بازو اور اپنی شمشیر خارا شگاف سے بڑی بڑی سرکش قوموں کو مغلوب ومقہور کر دیا۔مگر انہیں کے سلسلے میں بہت سے ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں ۔جن میں عورتوں نے اپنے حسن عالمگیر کی قوت اور اپنے دلربائی کے اسلحہ اپنی نظر کے تیروں اور گیسوؤں کی کمندوں سے ان مشہور ومعروف ناموروں کو بھی مغلوب ومقہور کر دیا جو بڑی سخت اور سرکش قوموں کو اپنا غلام اور تابع فرمان بنا چکے تھے۔ دلگداز میں ہم اس قسم کی حسین عورتوں کے حالات کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہیں جس سے ناظرین پر روشن ہوگا کہ دنیا میں حسن زاہد فریب نے کیسے کیسے کرشمے دکھائے ہیں اور کیسی کیسی فتحیں حاصل کی ہیں ۔[۹۷]

اس سے ثابت ہوا کہ شرر نے سوانحی مضامین کیوں لکھے؟ وہ بتانا چاہتے تھے کہ دنیا کی تاریخ، ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کی کامیابی ناکامی کے پیچھے حسین عورتوں کا ہاتھ ہے، شرر نے عورتوں کے متعلق مضامین لکھ کر اردو ادب کو ان کے تذکروں سے مالا مال کر دیا۔شرر سے قبل اور بعد میں بھی کسی سے یہ کام نہ ہوسکا۔ یہ تنہا شرر ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے دنیا کی مختلف عورتوں کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ جمع کیا اور اپنے دلگداز میں اس کو نمایاں جگہ بھی دی۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شرر عورتوں کو بھی معاشرے میں ایک اہم مقام دینے کے حق میں ہیں ۔وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی صلاحتیں رکھتی ہیں۔

ان کے اندر بھی وہ خوبیاں موجود ہیں جو مردوں کو عطا ہوئی ہیں ۔وہ بھی مردوں کی طرح بہادری وشجاعت کے کارنامے دکھا سکتی ہیں ۔سوانحی مضامین میں شرر نے عرب عورتوں کے حالات بیان کیے ہیں ۔ بیرونی ممالک کی خواتین کا ذکر بھی یہاں موجود ہے جو اکثر ملکائیں کہلاتی تھیں ۔ان مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پر تین قسم کی عورتوں کو شرر نے نمایاں جگہ دی ہے ۔ ۱۔ عرب عورتیں ۲۔ ملکائیں ۳۔ مذہبی صحیفوں میں مذکور خواتین

زیادہ تر عرب عورتوں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں جن میں سے اکثر عشق میں مبتلا تھیں ۔بیرونی ملکوں کی خواتین میں اکثر ملکائیں شامل ہیں ۔جن میں مشہور تاریخی ہستیاں بھی ہیں اور مذہبی صحیفوں میں مذکور شخصیتیں بھی جن کا ذکر روایتوں اور دیومالا کی مدد سے رنگین اور دلچسپ بنایا گیا ہے ۔ چنانچہ موخر الذکر میں زلیخا، بلقیس (جن کے متعلق قرآن میں اشارات ہیں) اور اسیتر ااسرائیلیہ (توراۃ) ہیں ۔تاریخی حیثیت سے کلوپیٹرا، جون آف آرک ۔کیتھرائن ملکہ روس، میڈم ڈی اسٹیل وغیرہ نمایاں ہیں ان میں جونسبتاً کم مشہور اور تاریخی نقطہ نظر سے پس منظر میں معلوم ہوتی ہیں وہ ہیں وہبائے کاہنہ، بوادلقیا، قارطس ، مانڈوا ۔اسباسیا یونانیہ، اولغا ۔ (ملکہ روس)، ہلینا (قسطنطین کی ماں) زبا ملکہ عرب، سیمی رامیس (ملکہ بابل) قیصرہ تھیوڈورا وغیرہ ۔عرب کی ساری خواتین اپنے ذوق سخن، حسن ، عفت و عصمت اور ناکامی کے لحاظ سے مشہور معلوم ہوتی ہیں مثلاً لیلائے اخیلیہ کا عشق توبہ حمیر سے نوار زوجہ فرزدق ام جعفر، شبینہ محبوبہ جمیل، عمارہ بنی عباس کی ایک کنیز، عتبہ، حمیدہ بنت لقمان بن شبیر وغیرہ بعض مسلمان خواتین مثلاً ست الملک وغیرہ

سیر نسواں حصہ اول کے مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر چونکہ ایک ناول نگار بھی تھے ایک تو وہ واقعات اور مناظر کو دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں ۔دوسرے جب وہ عشق و محبت کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا انداز بیان زیادہ شگفتہ ہو جاتا ہے ۔قاری کے دل و دماغ پر ان کی تحریر کا موثر اثر پڑتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ لیلائے اخیلیہ ۔قلوپطرہ ، نوار زوجہ فرزدق اور شبینہ محبوبہ جمیل کی داستان انہوں نے بہت ہی دلسوز انداز سے رقم کی ہے ۔ اس حصہ کے موضوعات میں بھی تنوع موجود ہے ۔جن ملکوں کی خواتین کو شرر نے اس حصہ میں جگہ دی ہے ان میں مصر، عرب ۔روس، ایشیائے کوچک ، انگلستان اور یونان کی خواتین شامل ہیں ۔بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:

مذہب کے اعتبار سے یہودی مسلمان، عیسائی ،بت پرست اور مرتبے کے لحاظ سے ملکائیں۔ مدعیان نبوت لونڈیاں وغیرہ شامل ہیں۔بعض کا عروج نہایت تعجب خیز بتایا گیا ہے۔تھیوڈورا، استیر ،کیتھرائن،ہلینا... وغیرہ جو زندگی کی پست ترین سطح سے اس کے بلند ترین زینہ پر پہنچیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان خواتین کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی ہے چنانچہ ان کے مضبوط کردار، اوصاف حمیدہ، آزادی اور بے باکی کا بیان نہایت قابل تعریف ہے۔

۹۸

شرر کو اگر چہ تاریخ نگاری کا شوق تھا اور ان کا مطالعہ بھی اس باب میں وسیع ہے۔لیکن سیرنسواں جلد اول کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کے معاملے میں بے احتیاطی برتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ روایت و درایت تحقیق و تنقیح کے اصولوں کو انہوں نے پس پشت ڈالا اور بیانات کے قبول ورد کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ جون آف آرک کے حالات میں جو تاریخی لحاظ سے قدیم نہیں ہیں اور جس کی شخصیت اپنے تقدس کے ہالے کے باوجود یورپ میں تاریخی مواد کی فراوانی کی بدولت اچھی طرح نکھر سکتی ہے۔انھوں نے ہر قسم کے واقعات کو من وعن شامل کرلیا ہے جو بادی النظر میں بعید از قیاس ہونے کے علاوہ تاریخی واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کی اہمیت گھٹاتے اور قاری کے دل میں اعتماد کی جگہ شک پیدا کرتے ہیں اس کے برعکس میڈم ڈی اسٹیل کا حال مستند کہا جا سکتا ہے۔اور اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے ان خواتین کے متعلق مواد کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ واقعات و جزئیات اور موضوعات کے انتخاب میں شرر نے اپنی حسن پرست طبیعت سے کام لیا ہے اس لیے کہ وہ کسی بھی رومانوی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے نہ صرف انھوں نے حسین عورتوں کو ہی سیرنسواں کی زینت بنایا بلکہ غیر حسین عورتیں بھی سیرنسواں میں موجود ہیں۔اگر چہ یہ خواتین حسن تو نہیں رکھتیں ہیں لیکن قابل اور بہادر خواتین میں ضرور شامل ہونے کے قابل ہیں۔مثال کے طور پر ست الملک، سجاح (مدعیہ نبوت)وغیرہ۔

صنفِ نازک کے متعلق ان مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض جملے شرر نے عورتوں کی حمایت میں لکھے ہیں اور یہ جملے بے اختیار ان کے قلم سے لکھے گئے ہیں ۔ عتبہ کے بارے میں لکھتے وقت وہ عورتوں کی ہمدردیاں، مروت اور رحمدلی کا ذکر کرتے ہیں۔شرر نے بعض اوقات خالصتاً ہندوستانی الفاظ عرب خواتین کی زبان سے ادا کروائے ہیں مثلاً سلمہ زوجہ سفاح کے منہ سے نگوڑی کا لفظ ،مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض

اوقات شرر روزمرہ اورمحاورے کا استعمال بھی کرتے ہیں۔انہوں نے کیتھرائن تھیوڈوراوغیرہ کونور جہاں سے بلقیس کوشکنتلا سے تشبیہہ بھی دی ہے خواتین کے متعلق بعض مضامین میں عورتوں کے حالات و واقعات کم بیان کیے ہیں اور باقی چیزوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔مثال کے طور پر جب وہ سیمی رامیس کا ذکر کرتے ہیں۔تو شہر بابل کی تفصیلات فراہم کرتے ہیں اور نوار کے ذکر میں فرزوق اور اس طرح شینہ کے ذکر میں جمیل کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

ان کے نسوانی مضامین میں اگرچہ خامیاں بھی موجود ہیں لیکن ان خامیوں کے باوجود ان کے یہ مضامین اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔شرر نے اگرچہ نامور خواتین کو اس میں جگہ دی ہے۔لیکن بعض بھرتی کی خواتین کا ذکر بھی یہاں ملتا ہے۔مثلاً بنتِ لقمان۔وہبائے کاہنہ وغیرہ۔شرر کو اپنی اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ تھا اس کا اندازہ بھی ان مضامین کے مطالعہ سے لگایا جاتا ہے۔وہ ہر جگہ اپنی معلومات کا جا و بے جا اعادہ بھی کرتے رہتے ہیں چنانچہ الجزائر یا سوئیومیا کے جغرافیہ اور عقبہ بن نافع کے واقعے کو یہاں بھی شامل کرلیا ہے۔لیکن کہیں کہیں زبان وبیاں کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً وہ شوہر کو خطرے میں نہ لاتی'' عصمت وحرمت کے کمال میں بےنظیر'' بدل رحمت الٰہی'' غلطیاں سن سن کر زمین میں گڑھے جاتے وغیرہ وغیرہ۔بعض تاریخی واقعات کا بیان بھی مشکوک ہے مثلاً سیزر کا کلیوپٹرا کے پاس قیام دوسال بتاتے ہیں جو شاید دس مہینے ہے شینہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ احادیث سے عورتوں کا عیدوں پر عید گاہوں میں بناؤسنگھار کر کے جانا اور دوست احباب سے ملنا ثابت ہے۔(جوان کے محبوب موضوع پردے کی مخالفت) سے مطابقت رکھتا ہے۔شرر اپنے ماخذ کی وضاحت نہیں کرتے بعض اوقات مبہم اور مختلف اشارات ماخذ سے متعلق کرتے جاتے ہیں۔بعض جگہ اہم باتیں کمال صفائی کے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔چنانچہ قدیم الایام کی ایک فلک زادشہزادی بنت لقمان کا نام ہی غائب ہے۔اورلطیفہ حدانیہ کے وطن کا کہیں ذکرنہیں اس سے قطع نظر شعانین کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ متوکل کپڑے پھاڑ کر نکل جانے کے قریب تھا۔(ایک خلیفہ اور بااختیار حکمران کے بارے میں) اسی طرح عربوں کی معاشرت خانہ بدوش اور ان کے اظہار عشق کو عیب گردانتے کا ذکر بار بار ہوا ہے۔

شرر نے اردو ادب میں ایسی متنوع اوصاف وکارناموں کی مالک خواتین کو شامل کر کے اردو ادب میں لچک پیدا کرنے کی روایت ڈالی اور اسے گوناگوں موضوعات سے آراستہ کرنے کے لیے شعوری کوشش کی۔انہوں

نے حسن کا بیان جہاں بھی کیا ہے ۔ وہاں اشعار اور مصرعوں کا استعمال کر کے اس کی اچھی ترجمانی کی ہے۔ جو اگر چہ ان کے ناولوں کی خصوصیت ہے۔لیکن چونکہ شرر ناول نگار تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کے بیان میں اور حسن کے بیان میں وہ افسانوی رنگ بھر دینے میں مہارت رکھتے تھے۔ان مضامین میں بھی افسانے کا سا رنگ اور تسلسل موجود ہے۔

جو مضمون ''حسن کی کرشمہ سازیوں'' کے تحت انہوں نے لکھا ہے۔اس میں انھوں نے حضرت آدم اور حضرت حوا کا جنت سے نکالا جانا ۔ ہابیل اور قابیل کے واقعہ کا بیان، مہا بھارت کی جنگ، رام اور سیتا کی کہانی۔ ہیلن اور یونانیوں کی جنگ ،مسلمانوں اور مسیحیوں کا حوروں سے عشق اور ان کی آرزو میں اپنی جان تک دے دینا۔ وغیرہ موضوعات پر خوب لکھا ہے۔اس ایک مختصر سے مضمون میں انہوں نے بہت سی تاریخی باتیں اور بہت سارے واقعات کا بیان کیا ہے۔اگر چہ ان کے مضامین میں کچھ خامیاں بھی ہیں لیکن ان خامیوں کے باوجود ان میں بہت خوبیاں بھی ہیں۔بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:۔

> ......باوجود بعض خامیوں کے شرر نے کئی مشہور اور نامور خواتین کے تذکروں سے اردو ادب کو مالا مال اور اردو ان پبلک کی معلومات میں اضافہ کیا۔ان میں کئی مغربی خواتین ایسی ہیں جس سے انگریزی دانوں کے سوا دوسرے لوگ بہت ہی کم واقف تھے اور بہت سی مسلمان خواتین ایسی ہیں جن سے بیشتر انگریزی دان ناواقف محض تھے۔خصوصاً طبقہ نسواں پر ان کا بڑا احسان ہے کہ شرر نے ان کے بعض عمدہ مرقعے قلم بند کئے ہیں مثلاً قلوپطرہ، جون آف آرک، میڈم ڈی اسٹیل وغیرہ کا ذکر خوب ہے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ ان کے ہاں رومانوی رنگ اور شخصیتوں کی کثرت ہے تو اس میں وہ اپنے اور اپنے قارئین کے مذاق سے مجبور تھے۔[۹۹]

اگر چہ لوگوں نے ان کے رومانوی رنگ اور شخصیتوں پر بہت اعتراض کیا ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شرر نے اردو ادب کو اپنے عالمی اور اسلامی تاریخ کے مطالعے کے مشاہدات سے روشناس کرایا اور اس کا فائدہ قارئین اور اردو ادب کو یہ ہوا کہ وہ لوگ جنھیں باقاعدہ تاریخ کے مطالعہ کا موقع نہیں ملتا تھا یا ان کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ

وسیع مطالعہ تاریخ کر سکیں۔ ان کی معلومات میں اضافے کا باعث یہی مضامین ہیں۔ جن میں روم، یونان، شام، مصر، عرب اور ایران کی تاریخ کو شرر نے اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے نہ صرف قاری کو تاریخ سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ شرر نے عشقیہ شاعری کے جو چند ایک نمونے مضامین میں بیان کیے ہیں ان سے عرب کی شاعری کے بارے میں بھی قاری آگاہ ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان مضامین نے اردو ادب کو کئی ایک چیزوں سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ شرر کے یہ مضامین اردو ادب کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث بھی بنے۔

حصہ دوم میں کل تیس (۳۰) مضامین شامل ہیں۔ یہ حصہ ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں کچھ مضامین مختصر ہیں اور کچھ طویل لیکن ہر ایک مضمون شرر کے تاریخی شعور اور وسعت مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں بھی دنیا کی نامور خواتین کا ذکر موجود ہے۔ شرر نے ان خواتین کی شخصیت اور ان کے سیرت و کردار کے چند نمایاں پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر شخصیت نگاری کے فن سے آشنا تھے۔ اگر چہ یہ فن بھی مغربی ادب ہی سے ہمارے ادب میں داخل ہوا ہے۔ لیکن اس فن میں سب سے بڑا نام شرر ہی نے پیدا کیا ہے۔ جنہوں نے اپنے مضامین میں سیر نسواں اور سیر الرجال کے عنوانات کے تحت دنیا کے نامور مردوں اور عورتوں کے تذکرے کو شامل کیا۔ یوسف جمال انصاری کا کہنا بجا ہے کہ:

> شخصیت نگاری کا فن بھی ہم نے مغرب ہی سے سیکھا ہے ناول سے پہلے مغربی ادب میں انشائیہ اور شخصیت نگاری موجود تھے۔ بلکہ شخصیت نگاری تو انشائیہ سے بھی بہت پہلے سے ہوتی آئی ہے۔ شخصیت نگاری نہ ہوتی تو افسانوی ادب میں کردار نگاری کا ارتقاء بھر پور طریقے سے نہ پورا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ شخصیت نگاری دراصل ایک طرح کی کردار نگاری ہی ہے۔ انداز تحریر عموماً ڈرامائی ہوتا ہے۔ کردار کے خدوخال یوں ابھارے جاتے ہیں کہ ذہن کے پردے پر کردار کی تصویر جیتی جاگتی سامنے آجاتی ہے اور قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ کردار سے اس کی ملاقات ہو رہی ہے۔ ایک اور طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیرائیہ اظہار ڈرامائی نہ ہو بلکہ بیانیہ ہو۔ اس صورت میں تاثر ذرا الفاظ کو پھیلا کر بیان کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے زمانے کی بات یہاں کی جاتی ہے......
> بہر حال انداز تحریر کوئی بھی کیوں نہ ہو مقصد ایک ہی پیش نظر رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کردار

کے حالات قاری تک پہنچائے جائیں۔[۱۰۰]

سیر نسواں جلد دوم کے مضامین کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شرر نے بھی اپنے مخصوص انداز سے دنیا کے مختلف ممالک، مختلف شہروں اور مختلف مذاہب کی عورتوں کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو موثر انداز سے بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے ان سوانحی مضامین میں دونوں رنگ نمایاں ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قاری کی ان سے ملاقات ہو رہی ہے۔ قاری اپنے آپ کو اسی فضا اسی ماحول میں لے جاتا ہے۔ ''سیر نسواں'' کے تحت شرر نے جو مضامین تحریر کیے ہیں۔ انھیں ہم شخصی خاکے بھی کہہ سکتے ہیں۔ شرر نے دنیا کی مختلف خواتین کی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔ اگرچہ آج کے دور میں شخصی خاکوں نے ایک الگ صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ لیکن اس دور میں جب کہ یہ صنف اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ شرر نے بھی اپنے مضامین کے تین حصوں پر مشتمل شخصی خاکے پیش کر کے ادب کی اس صنف کی روایت کو مستحکم کیا۔

شخصی مرقع اور شخصی خاکے میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔ شخصی مرقعے تو کسی شخصیت کی مکمل تصویر ہوتے ہے۔ جبکہ شخصی خاکہ میں کسی شخصیت کی صرف جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں۔ شخصیت نگاری مضمون کی شکل میں ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کے بارے میں لکھتے وقت مضمون نگار زیر بحث شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات اور تجربات کو بھی پیش کر رہا ہوتا ہے۔ شرر کے یہ مضامین جن میں مختلف شخصیتوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ سوانحی حالات و واقعات اور ماحول کی عکاسی تو کی ہے، لیکن ان مضامین کو انہوں نے سوانح عمری نہیں بننے دیا۔

سیر نسواں حصہ دوم کا پہلا مضمون ''راخیل'' ہے جیسا کہ ان کے عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی شخصیت کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح شرر نے سیر نسواں جلد سوم حصہ اول اور دوم کے تمام تر مضامین کسی نہ کسی شخصیت کے نام سے لکھے ہیں۔ ''راخیل'' کے حالات شرر نے دلگداز میں پیش کیے تھے۔ راخیل ایک یہودن تھی اس کا تعلق ایک ذلیل و فلاکت زدہ خاندان سے تھا اس کا باپ ایک بساطی تھا جو جرمنی اور سوئزر لینڈ میں شہروں شہروں اپنا تھوڑا سا مال لے کر پھرتا اور بیچتا تھا۔ سوئزر لینڈ کے ایک شہر میں راخیل پیدا ہوئی۔ اس کا باپ شہر لیون میں بھی کچھ عرصہ مقیم رہا۔ آخر وہاں سے فرانس کے شہر پیرس میں مقیم ہو گیا۔ راخیل کی بڑی بہن سارہ نے اب یہ پیشہ اپنایا کہ وہ پیرس کے قہوہ خانوں میں جاتی اور وہاں ایک پرانا چکارہ بجا بجا کر گاتی اور انعام پاتی۔ راخیل جو بھی

کمسن بچی تھی ۔ اپنی بڑی بہن کے ساتھ ان قہوہ خانوں میں جاتی ۔ بڑی بہن گاتی اور چھوٹی بہن حاضرین و سامعین کے پاس جاجا کے پیسے وصول کرتی یہ دونوں بہنیں اسی طرح زندگی بسر کرتیں تھیں ۔

> اتفاقاً کسی قہوہ خانے میں سیوسورون نام ایک نامور بزرگ رونق افروز تھے ۔ جنہوں نے اپنی کوششوں سے موسیقی کی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا ۔ جو عبادت اور گرجے سے مخصوص ہے ۔ انکی نظر انتخاب ان دونوں لڑکیوں پر پڑ گئی خصوصاً چھوٹی بہن راخیل کو انھوں نے ایک بے بہا الماس خیال کیا جو کوڑے میں پڑا ملجائے ۔ فوراً دونوں کو اپنے ساتھ لائے اور ان کی تعلیم تربیت کو اپنے ذمے لے لیا ۔[۱۰]

سیوسورون جب ان دونوں بہنوں کو اپنے مدرسے میں لائے تو انہوں نے دیکھا کہ چھوٹی بہن میں ایکٹ اور ناٹک کرنے کا فن موجود ہے تو انہوں نے راخیل کو ناٹک کی تعلیم دینے والے استاد کے حوالے کر دیا ۔ وہاں راخیل نے ۴ چار سال تک تعلیم حاصل کی وہاں سے راخیل کنزتوار (پیرس کے ایک مستند مدرسہ) میں آ گئی اور یہاں سے گانے کی تربیت لی ۔ اب اس لڑکی کی محنت رنگ لائی اور اس نے ۱۸۳۷ء میں جمنا پیرس کے کرتب دکھانے کے تھیٹر میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ۔

اب دن بدن اس کی شہرت و ناموری میں اضافہ ہوتا گیا ۔ پہلے پہل راخیل پرانے تاریخی کریکٹروں کو پیش کرتی تھی ۔ اب اس نے جدید اور نئے مذاق کے ڈراموں کے کریکٹروں پر بھی توجہ دینی شروع کر دی ۔ اس طرح اسے بہت کامیابی نصیب ہوئی ۔ جب اس کی شہرت و ناموری میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تو انگلستان کے لوگ بھی اسے پسند کرنے لگے اور اب یہی پسندیدگی اس کو لندن کے سینٹ جمیس تھیٹر میں لے آئی یہاں پر اس کو جو پذیرائی ملی اس کی بنا پر اس کے حوصلے بلند ہوئے اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ امریکہ جا کے اپنے فن کے جوہر دکھائے ۔ وہ وہاں بھی گئی لیکن وہاں اس کی توقعات کے مطابق اسے کامیابی نہ مل سکی ۔ وہاں سے وہ فرانس میں واپس آئی ۔ وہ اس قدر محنت کرتی تھی کہ جوانی ہی میں اپنی صحت گنوا بیٹھی اور آخر کار ۱۸۵۸ء میں اس نے اس دنیا کو خیر آباد کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا فن بھی دفن ہو گیا ۔ اگر چہ اس کے دوسرے بہن بھائی بھی تھیٹروں کے ایکٹر تھے لیکن جو مقام و مرتبہ راحیل کو نصیب ہوا تھا وہ ان کو نہ مل سکا ۔

شرر کے اس مضمون کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان کو اگر کوئی فن شناس اور رہبر مل جائے اور اس کی خداداد صلاحیتوں کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت بھی ہو تو پھر وہی انسان جو پہلے گمنامی کی زندگی بسر کرتا ہے۔آخر کار اپنی محنت اور علم کی لگن کی وجہ سے مشہور ہو جاتا ہے۔سیر نسواں حصہ دوم کا آخری مضمون ''پوپ جان'' ہے جو (۳) تین نمبروں پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم میں زیادہ تر یہودی، مسلمان ،فرانسیسی، ہندوستانی ،عربی عورتوں کا ذکر موجود ہے۔ اس حصہ میں زیادہ تر ان خواتین کا ذکر ہے جن کا تعلق سرزمین عرب سے تھا اور مسلمان عورتیں زیادہ ہیں۔جن کے بارے میں شرر نے اپنے خاص انداز سے لکھا ہے۔ حصہ دوم میں مختلف شہروں اور ملکوں کا ذکر بھی آیا ہے۔مثلاً جرمنی ،سوئزر لینڈ ،لیون ، پیرس ،عراق ، شام ،عرب ،امریکہ ، انگلستان، ہندوستان اور روم وغیرہ۔شرر نے دورِ خلافت کی مشہور خواتین کے بارے میں زیادہ لکھا ہے۔ان عورتوں کے کارناموں ،ان کی سیرت و کردار اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اہم واقعات بھی قلم بند کیے ہیں۔شرر نے سرزمین عرب کے نامور عشاق اور معشوقوں کا ذکر بھی کیا ہے اور انہوں نے بتایا ہے کہ اس سرزمین کو یہ فضلیت بھی حاصل ہے کہ اس زمین سے نامی گرامی عشاق ابھرے جن کو عربی زبان و ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ساتھ ہی شرر نے یہ بھی بتایا ہے کہ عربوں کی رسم خاص یہ تھی کہ جن عاشقوں کا پتہ چلتا تھا۔ان سے ان کی معشوقہ کی شادی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس حصہ کے بعض مضامین طویل ہیں اور بعض مختصر لیکن سب میں جاذبیت پائی جاتی ہے اور ہر ایک مضمون چاہے وہ طویل ہے یا مختصر ایک تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہے۔

ان مضامین میں افسانوی رنگ بھی موجود ہے۔ رومانیت کے عناصر بھی یہاں موجود ہیں۔زبان عام فہم اور آسان و سلیس ہے۔منظر نگاری و کردار نگاری کے جوہر بھی یہاں نظر آتے ہیں۔شرر نے بعض مضامین میں مکالماتی انداز بھی اپنایا ہے۔مثلاً ام جعفر بنت عبداللہ بن غرناطہ، ریا بنت الفطار یق السلمی ،دارمیہ مجونیہ وغیرہ وغیرہ ۔شرر نے شعرائے ہند اور شعرائے عرب کا تقابل اور موازنہ بھی اپنے بعض مضامین میں پیش کیا ہے۔مختلف شعراء کا ذکر ان کے بعض مضامین میں موجود ہے جیسے حوص، وہب، امراؤ القیس ،عرتمیر تی وغیرہ اور اسلامی عہد کی مشہور مغنیہ عزۃ المیلا کو بھی انہوں نے اپنے مضامین میں جگہ دی ہے۔حصہ اول میں دنیا بھر کی خواتین کا ذکر ملتا ہے جبکہ سیر نسواں حصہ دوم میں زیادہ تر ان خواتین پر شرر نے لکھا ہے جو کہ اسلامی عہد سے یا سرزمین عرب سے تعلق رکھنے والی تھیں۔ان مضامین میں ہمیں شرر کا خاص اسلوب ملتا ہے۔شرر نے بعض عربی اشعار بھی اپنے مضامین میں لکھے

ہیں اور بعض عربی اشعار کے ترجمے انھوں نے پیش کیے ہیں چونکہ شرر خود بھی شاعر تھے اور عربی زبان و ادب میں بھی کمال رکھتے ہیں اس کے علاوہ تاریخ سے دلچسپی کے عناصر بھی یہاں نظر آتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ یہ مضامین اردو ادب میں بہت اہمیت کے حامل ہیں شرر نے پہلی بار اردو ادب میں دنیا بھر کی نامور خواتین کے تذکرے بیان کیے ہیں، ان خواتین کی سیرت و کردار کے نمونے پڑھ کر قاری نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ اس پر ان کے کردار و شخصیت کے نمایاں نقوش بھی پڑتے ہیں۔

''سیر رجال'' میں شرر نے سیر نسواں کی طرح بعض مشہور و معروف ہستیوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ یہ مضامین لکھ کر شرر نے اردو ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ شرر نے جن شخصیتوں کو اپنے مضامین میں جگہ دی ہے ان کے متعلق ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے:

> انھوں نے اکثر سیرتوں کے انتخاب میں بیشتر علم و ادب سے ان کے تعلق کو مد نظر رکھا ہے۔ چنانچہ مجنوں عامری، حاتم طائی، سقراط، افلاطون، ارسطو، سکندر، لقمان، جالینوس، عمر و عیار، ایاز، رستم وغیرہ ناموں سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ علاوہ ازیں فیثا غورث، امیر عبد القادر مغربی، نادر شاہ، محمد علی پاشا، سمسون Samson، ہرقل، ابو مسلم خراسانی، ہے نی بال (Hannibal) الپ ارسلان اور عوج بن عنق وغیرہ سے متعلق معلومات بھی اس میں شامل ہیں۔[۱۰۲]

شرر نے سیر نسواں کی طرح ''سیر رجال'' میں بھی دنیا بھر کے مشہور مردوں کے حالات قلم بند کیے ہیں اور انھوں نے مشہور و معروف ہستیوں کے بارے میں لکھ کر جہاں اپنے وسیع مطالعہ و معلومات کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہاں اردو ادب کا دامن بھی مختلف تذکروں سے بھر دیا ہے، جن لوگوں کو ان شخصیتوں کے بارے میں پڑھنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ شرر نے اپنے مضامین کے ذریعے سے ان حضرات کے علم میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ اس حصہ مضامین میں بھی بعض مضامین طویل ہیں اور بعض مختصر۔ لیکن ہر ایک مضمون میں دلچسپی کا عنصر ضرور موجود ہے۔ مضامین شرر جلد سوم کا یہ حصہ ۵۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حصہ کا پہلا مضمون ''مجنوں عامری'' ہے۔ اس مضمون میں شرر نے مجنوں جس کا اصل نام قیس تھا۔ اس کے وہ حالات بیان کیے ہیں جو انھیں مستند مورخین کے ذریعے سے

معلوم ہوئے ہیں۔ سیر رجال میں شرر نے جن شخصیتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ان میں چیدہ چیدہ اشخاص کو شرر نے نمایاں جگہ دی ہے۔ ۔اس کے علاوہ شرر نے ان مشہور ہستیوں کا تذکرہ بھی چھیڑا ہے جن کا تعلق اردو انشاپردازی سے ہے۔ تہتمن پہلوانان سلف کا ذکر بھی کیا ہے اور نیکی کے بدلے بدی کے تحت آپ نے تین بانیان سلطنت کا ذکر کیا ہے جن کی موت انہی کے زیر بار احسان اشخاص کے ہاتھوں ہوئی۔

سیر رجال کا پہلا مضمون ''مجنوں عامری'' ہے۔شرر نے اپنے خاص انداز سے اس مضمون کو لکھا ہے اور اس میں دلچسپی کا عنصر بھی موجود ہے۔اس مضمون میں خاص تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ مضمون ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔مضمون کا آغاز شرر نے مخصوص انداز سے کیا ہے تمہیدی پیراگراف میں عشق کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور مخصوص عشاق کا ذکر کیا ہے جن کے تذکرے مختلف زبانوں کے ادب میں ملتے ہیں۔مثلاً نل دومن، شیریں فرہاد ،لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔شرر نے اپنے اس مضمون میں اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ:

> ......عربی زبان نے چونکہ دنیا کی بہت سی زبانوں کو فتح کرلیا اور اس کامیابی سے فتح کیا ہے کہ اس کے تمام محاورات اور خیالات ان مفتوحہ زبانوں کے رگ رگ میں سرایت کر گئے حتی کہ عربی کی اکثر ضرب المثلیں بھی پوری پوری ان میں مروج ہوگئیں۔لہذا عربی لٹریچر کے عاشقانہ ہیرو مجنوں عامری کا نام فارسی اور اردو کی نظم ونثر کا بھی ایک زبردست عنصر بن گیا۔لیکن یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ مجنوں کے نام کو عربی۔فارسی، اردو اور دیگر اسی قسم کی زبانوں نے مشہور تو اس حد تک کیا کہ اسلامی دنیا کا کوئی بچہ بھی شاید اس سے ناآشنا نہ نکلے گا مگر اس کے واقعات اور اس کی زندگی کے حالات صحت واعتبار کے ساتھ کبھی فارسی میں بیان کیے گے اور نہ کبھی اردو میں ہے۔[۱۰۳]

شرر نے اپنے اس مضمون میں مجنوں عامری کے حالات بیان کیے ہیں۔اور انہوں نے یہ حالات مستند مورخین کے حوالے سے پیش کیے ہیں خود لکھتے ہیں کہ: ''لہذا ہم چاہتے ہیں کہ مجنوں عامری کے وہ حالات جو مستند مورخین کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں ان کو بیان کریں''[۱۰۴]

شرر نے اپنے اس مضمون میں مجنوں کی زندگی اور اس کی سیرت وکردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری

اپنے آپ کو اسی فضا میں لے جاتا ہے۔ جہاں مجنوں زندگی کی سانسیں لیتا تھا۔ اس مضمون کے متعلق ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

پہلے سلسلے میں مجنوں عامری کو سنسکرت کے نل و من اور فارسی کے شیریں فرہاد کا جواب ٹھہرا کر اس کی حقیقی شخصیت سے غفلت پر اظہار افسوس کیا ہے اور اس کے معتبر کلام اور مستند روایات کی مدد سے اس کی شخصیت کی تعمیر کی کوشش کی ہے۔ قیس بن مریم کو قیس عامری سے ممیّز کرنے کے لیے اس کے بھی مختصر حالات شامل کیے ہیں۔ شرر نے اس میں قیس کے مروجہ قصے سے اختلاف کیا ہے اور قیس کے بعض اشعار کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔[۱۰۵]

شرر کا یہ مضمون برسوں شامل نصاب بھی رہا ہے اس مضمون میں جو کچھ شرر نے لکھا ہے اس میں اضافہ کر کے انھوں نے قیس کی زندگی کے بارے میں ایک کتابچہ بھی لکھ کر شائع کیا تھا۔ اسی حصہ مضامین میں ایک اور مشہور و معروف مضمون 'حاتم طائی' بھی شامل ہے۔ یہ بھی برسوں شامل نصاب رہا۔ موضوع اظہار کچھ بھی ہوتا، شرر کمال کا لکھتے تھے اور اس انداز سے لکھتے تھے کہ پڑھنے والا اکتاتا نہیں تھا، بلکہ اس کی دلچسپی بڑھتی ہی رہتی تھی۔ یہ دلچسپ مضمون تقریباً آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کا آغاز بڑا دلکش اور دلنشین ہے۔ شرر نے اس مضمون کے آغاز میں بتایا ہے کہ:

ہر قوم کی سوسائٹی اور ہر زبان کے عام محاورات میں چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کا نام کسی خاص صفت کے موقع پر ہر خاص و عام کی زبان سے سنا جاتا ہے اور ہر بچہ بھی ان ناموں کو ان اوصاف کا ہیرو خیال کرتا ہے جن کے اظہار کے لیے وہ نام بار بار لیے جاتے ہیں دیکھو جب عشق کا تذکرہ ہوگا مجنوں عامری کا نام کسی نہ کسی پہلو سے یاد ہی آ جائے گا۔ حسن کی تعریف کی جاتی ہوگی تو ممکن نہیں کہ یوسفؑ صدیق کا معجز نما حسن نہ پیش کر دیا جائے اور اسی طرح جب سخاوت کا تذکرہ چھڑے گا تو حاتم کا نام خواہ مخواہ کسی نہ کسی زبان سے نکل ہی جائے گا۔[۱۰۶]

اس مضمون میں شرر نے تین نامی گرامی شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ مجنوں عامری، حضرت یوسف اور حاتم

طائی۔شرر کے اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ادوار میں ان صفات کے حامل افراد کولوگ دیوتا سمجھ کران کی پوجا کیا کرتے تھے۔شرر لکھتے ہیں۔''اگر ہمارا مذاق توحید نے بدل نہ دیا ہوتا تو اس قسم کے ان لوگوں کو جو ہماری سوسائٹی میں کسی خاص صفت کے ساتھ ہیں ہم بھی دیوتا ہی مانتے''[۱۰۷] شرر نے اپنے اس مضمون میں بتایا ہے کہ اس طرح کے نامی گرامی اشخاص جن کا ذکرتو ہرزبان پر ہوتا ہے۔ان کے حالات زندگی کوکوئی نہیں جانتا۔

شرر نے اپنے اس مضمون میں دعوی کیا ہے کہ وہ حاتم طائی کے وہ حالات بیان کررہے ہیں جو واقعی ہیں اورجن سے لوگ لاعلم ہیں۔شرر نے اپنے اس مضمون میں چار اشخاص کا ذکر کیا ہے جوسخاوت وفیاضی میں ضرب المثل تھے، لکھتے ہیں:''چار آدمی جاہلیت میں ایسے تھے جن سے زیادہ فیاضی کا اظہار اور کسی شخص سے نہیں ہوا۔حاتم بن عبداللہ طائی ہرمن بن سنان، خالد بن عبداللہ اورکعب بن مامتہ الایادی ہے۔''[۱۰۸]

ساتھ ہی شرر نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان چار اشخاص میں جوشہرت جو مقام ومرتبہ حاتم طائی کو ملا وہ کسی اور کو نہ مل سکا۔ یہ شخص آنحضرت کی بعثت سے پہلے ہی مر چکا تھا۔سیر رجال کے مضامین کے ضمن میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

......حالات قلم بند کرتے وقت شرر کے دل میں ایشیا اور یورپ کی باہمی رقابت کا احساس بھی تھا۔چنانچہ فیثا غورث کووہ ایشائی بتاتے ہیں اورنا درشاہ کو نپولین پرفوقیت دیتے ہیں۔ یونانی اور پارسی فلسفے کے زیر اثر مسلمانوں میں جومختلف فرقوں اور فلسفوں کے بانی ہوئے (بعض نے نظریہ تناسخ وغیرہ کی بھی تبلیغ کی) ان کا ذکر بھی پایا جاتا ہے اور ان کے حالات سے اس زمانے کی جنسی قوت یا ان کی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔مثلاً ابن قصنع ، نابغہ زبیانی، حسان بن ثابت وغیرہ کے حالات سے یہ واضح ہے۔[۱۰۹]

عبدالحلیم شرر کے اس حصہ کے مضامین میں بعض شاعروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے مثلاً ابوالاسود دولی۔ابن المعتز ، غزال شاعر اندلس، ابو دلامہ اور ابوالقائیہ وغیرہ اورسعید بن سجع مغنی اور ابراہیم موصلی (مشہور مغنی) کا ذکر بھی شرر نے کیا ہے اور یہ ذکر ابوالعقاتیہ کے بیان میں موجود ہے۔شرر نے بعض عاشقوں کا ذکر بھی اپنے ان مضامین میں کیا ہے۔مثال کے طور پر عروہ بن خرام۔محمود (محمود ایاز کی بہن سے عشق) اورعبداللہ بن ابوبکر صدیق کے حالات بھی شرر نے بیان کیے ہیں۔شرر نے اپنے ان مضامین میں شبلی نعمانی اور حاجی ریاض الدین کا بھی ذکر کیا ہے جس سے

شرر کی رواداری، انصاف پسندی اور فراخ دلی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔شرر نے علی بیگ ،میر علی شیر، اخفش مصر کے جامعہ طولون کے بانی کے بارے میں بھی اپنے ان مضامین میں لکھا ہے۔عبدالحلیم شرر کا شمار ان ادبا میں ہوتا ہے جنھوں نے منتخب اشخاص کے ذکر مکرر سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے احیاء کی کوشش کی۔

عبدالحلیم شرر کے کچھ مضامین ادب و تحقیق عنوان سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ان کی تعداد ۴۸ ہے یہ وہ مضامین ہیں جومختلف رسائل میں چھپتے رہے۔مجموعے کی صورت میں یکجا کر کے شرر نے مضمون کی ایک جامع اور معتبر تصویر بنادی ہے۔

جلد چہارم کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مضامین نگاری کے میدان میں شرر کا مقام ومرتبہ ان کے عہد کے دیگر مضامین نگاروں سے کسی درجہ بھی کم نہیں ہے۔شرر ہر موضوع اور ہر عنوان پر لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔شرر کا کمال یہ ہے کہ وہ مضمون کی ابتداء کرتے ہیں اس کے بعد ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے،نقوش ابھرتے ہیں،تصویریں ذہن میں بنتی جاتی ہیں اور مضمون پڑھنے والا ان تصویروں کو دلچسپی سے دیکھتا ہے۔اس کا دل مضمون کی تہوں میں الجھتا چلا جاتا ہے،مضمون نگار کی بات قاری کے دل میں بیٹھتی جاتی ہے،مجموعی تاثر پرمسرت ہوتا ہے۔شرر کے مضامین میں یہ خوبی بعض جگہوں پر اپنا کمال دکھاتی ہے۔عبدالحلیم شرر اگر اور کچھ نہ بھی لکھتے اور صرف مضامین ہی لکھتے تو تب بھی اردو ادب میں ان کا نام شہرت کی بلندیوں کو چھوتا۔مضامین شرر جلد چہارم کل ۲۶۸ صفحات پر **مشتمل** ہے جو کہ شرر کے وسعت علم ،وسیع مطالعہ،وسعت نظر،مشاہدہ کی گہرائی کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔اس مجموعہ مضامین میں ادبی اور تحقیقی دو طرح کے مضامین موجود ہیں۔پہلا مضمون ''فلسفہ تصوف اور اسلام'' کے عنوان سے شامل ہے۔اس مضمون میں شرر نے فلسفہ تصوف اور اسلام' پر روشنی ڈالتے ہوئے۔اس بات کو واضح کیا ہے:

> متقدمین سے متاخرین تک اہل فلسفہ کے دو گروہ رہے۔ایک وہ لوگ جو نظام عالم کو معقولی استدلالت کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں دوسرے وہ جو نتائج عقلی کو چھوڑ کے صرف روحانیات کی طرف جھکتے ہیں۔پہلوں کو عربی فلسفے کی اصطلاح میں شائین کا خطاب دیا گیا ہے اور پچھلے اشراقیین کہلاتے ہیں یا یوں کیا جائے کہ فلسفہ مادی اور تصوف اور اس

نے اسلام میں آ کے دو اصول دین پیدا کر دیے یا شریعت اور طریقت ۔"۱۰

شرر نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ پہلا یونانی فلسفہ تھا جس کا کل حصہ عربی میں موجود ہے اور دوسرا جدید مغربی فلسفہ ہے جس کے اصول لا ڈبیکن نے قائم کیے تھے ۔ اس مضمون میں شرر نے اس سوال کا جواب بھی دیا ہے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اور یہ بتایا ہے کہ اہل مذہب کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ وہ تصوف کے روحانی مسائل کو سنبھالیں اور مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ اگر چہ دین اسلام کی حفاظت خدا تعالیٰ نے اپنے ذمے لی ہوئی ہے ۔ لیکن عیسائیوں کی کوششوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے ۔ جو وہ دین اسلام کو مٹانے کے لیے کر رہے ہیں اور مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

> لہذا ہم تمام مذہبوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اب وہ تمام باہمی نزاعوں کو چھوڑیں اور ان نوجوانوں کی طرف متوجہ ہوں جو دہریت کا وعظ کہتے ہوئے پھرتے ہیں ۔"۱۱

شرر کا یہ مضمون اگست ۱۸۹۳ء کا لکھا ہوا ہے ۔ اسی جلد کا اگلا مضمون سکہ اسلام میں'' کے عنوان سے ہے'' ''عربی سے فارسی و اردو کے تعلقات'' ستمبر ۱۸۹۳ء کا مضمون ہے ۔ اس مضمون میں شرر نے اردو اور فارسی زبان پر عربی کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے بتایا ہے کہ انگریزی زبان میں بے انتہا لاطینی الفاظ ہیں اور یہ رومیوں کی غلامی کے داغ ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فارسی اور اردو زبان میں موجود الفاظ یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ:''فارسی اور اردو میں جو عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں ۔ وہ بھی اس امر کا ثبوت دیتے ہیں اور ہمیشہ دیں گے کہ ایران وہندوستان کو کسی زمانے میں اسلام کی غلامی نصیب ہوئی تھی ۔''۱۲

اس مضمون میں شرر نے فردوسی کے شاہنامہ کی بھی مثال دی ہے ۔ کہ اس میں عربی الفاظ سے بچنے کی بھر پور کوشش کی گئی ہے ۔ لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس میں عربی کے الفاظ کم ہیں ۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بالکل بھی عربی زبان کے الفاظ موجود نہیں ہیں ۔ شرر نے اس مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ عربی زبان خارجی اثرات کو قبول کرنے والی زبان نہیں ہے ۔ عربی زبان کے خزانے میں کثرت سے الفاظ موجود ہیں ۔ یہی وہ زبان ہے جو تمام علوم چاہے وہ فلسفہ ہوں کے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔

"اسلام اور تھیٹر" کے عنوان سے شامل مضمون ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ مضمون ۲ نمبروں کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں جس بحث کو شرر نے چھیڑا ہے، وہ یہ ہے کہ فی الحال یہ بحث پیش ہے کہ اسلام کو تھیٹر سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ اور برگزیدگان کا بہروپ بھر کے ایکٹروں کا ناٹک کے اسٹیج پر آنا اسلامی پبلک کی نظر میں کیسا ہے۔

اس مضمون میں شرر نے درج ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ تھیٹر کیا چیز ہے؟، ڈراما کی ابتدا کس وقت اور کیونکر ہوئی؟، اہل ایتھنز نے ڈراما کو ڈوریا والوں سے لیا تھا، دو اقسام ٹریجڈی اور کامڈی تھیں، رومیوں کے دور میں ڈرامے نے ترقی کی، رومیوں اور یونانیوں کی طرح ہندوؤں کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اپنے زمانہ عروج میں اسے ترقی دی۔ شرر لکھتے ہیں:

> رومیوں نے بھی ڈراما کو یونانیوں سے سیکھ کے اپنے بت پرستی رسوم میں شامل کر لیا تھا۔ اور ایطالیہ میں بھی حضرت مسیح سے پہلے یہ ڈراما بتوں کی عبادت کا کام دیتے تھے بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈراما کی ایجاد جہاں سے ہوئی ہو خواہ یورپ میں یا ایشیاء میں لیکن اس کے بانی بت پرست قومیں اور اس کی غرض بت پرستی تھی۔[۱۱۳]

شیکسپیئر نے ڈراما کو انگلستان میں ترقی دلائی۔ اسلام کی نظر میں ڈراما کیا معنی رکھتا ہے؟ اس پہلو پر شرر نے لکھا ہے۔ دوسرے نمبر کے تحت لکھے گئے حصہ مضمون میں شرر نے دو تین فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں سنی، شیعہ وہابی شامل ہیں۔ اس جلد میں "عنقا اور ریش مقدس" جیسے مضامین بھی شامل ہیں۔ ریش مقدس" عنوان کے تحت جو مضمون شرر نے لکھا ہے اس میں انہوں نے داڑھی کے بارے میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر دور ہر عہد میں اور ہر قوم میں داڑھی کا رواج کسی نہ کسی صورت رہا ہے لکھتے ہیں: "یونانیوں اور رومیوں میں بھی ابتداء سب کے منہ پر داڑھی ہوتی تھی"۔[۱۱۴]

اسی مضمون میں شرر نے بتایا کہ جب اسلام کا ابتدائی دور تھا تو ریش داڑھی کو مرد کا زیور کہا جاتا تھا پھر آہستہ آہستہ دوسری اقوام کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اس زیور کو خیرآباد کہنا شروع کیا۔ اس مضمون میں شرر نے داڑھی کی ابتداء، اس کے ارتقاء اور مسلمانوں میں اس کے رواج پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے مخصوص انداز بیان سے انہوں نے اس مضمون کو دلچسپ بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ قاری اس مضمون کو دلچسپی سے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''ختنہ'' مسلمانوں اور عیسائیوں میں امتیاز لباس'' ''اسار بحر'' بھی دلچسپ اور معلوماتی مضامین ہیں یہ مضامین مضمون نگار کے وسیع علم اور معلومات کے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اس جلد کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مضمون نگار نے تحقیقی پہلو کو مدنظر رکھا ہے جس عنوان پر بھی لکھا ہے اس کی تاریخ وارتقاء پر خصوصی توجہ دی ہے۔ آغاز سے زمانہ عروج اور پھر اختتام تک کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ ''رقص'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا مضمون تحقیقی ہے اس مضمون میں بھی شرر نے ''رقص'' کی تاریخ وارتقاء پر اپنے مخصوص انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے بتایا ہے کہ پرانی تمدنی قوموں میں ناچنا عبادت میں شامل تھا۔ مصری، بابلی میں رقص عبادت میں شامل تھا اہل بابل اور قبطی بھی اس کو عبادت سمجھتے تھے۔ یونانیوں نے اس کو ایسا فن قرار دیا جس کے ذریعے سے جذبات کے اظہار کو تقویت ملے۔ ''سچا عاشق کون ہے؟ مرد یا عورت'' بھی ایک اچھا مضمون ہے۔ ''زبان اردو کی شامت'' مضمون میں شرر نے اپنے عہد کے مرجہ اردو نصاب تعلیم پر تنقید کی ہے۔ اس جلد کے مضامین میں بھی متنوع موضوعات پر شرر نے لکھا ہے۔ اس جلد کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ہر مضمون میں شرر نے موضوع کی مناسبت سے معلومات کا وافر ذخیرہ قاری تک پہنچایا ہے۔ دلچسپی کا بھی خیال رکھا ہے آسان زبان اور عام فہم الفاظ استعمال کیے ہیں۔

ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع اور جس عنوان پر بھی لکھا ہے اس کا تقابل اور موازنہ ہندوستان سے بھی کیا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی تہذیب وثقافت میں ان کے آغاز وارتقاء پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ رقص موریق'' مضمون میں انہوں نے یہ بات بتائی ہے۔ کہ یورپ والے گھنگرو باندھ کر ناچنے کو مسلمانوں کی ایجاد بتاتے ہیں لیکن اس کا آغاز ہندوستان کے قدیم فن رقص سے شروع ہوا ہے۔ اس لیے کہ ہندوؤں کے مذہب میں دیوتاؤں کی پرستش سے یہ رقص شروع ہوا تھا۔ یہ ایک مختصر سا مضمون ہے۔ لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی اس کے اندر جامعیت پائی جاتی ہے۔ اس جلد میں دو مضامین بعنوان ''دنیا میں ناول نویسی کی ابتدا''، ''دہلی اور لکھنو کی اردو'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء'' تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں شرر نے یہ بتایا ہے کہ ناول نویسی کو اگر چہ ہم نے یورپ سے لیا ہے۔ لیکن اگر ہم تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ہماری ہی قدیم امانت ہے جس کو آج ہم نے واپس لے لیا ہے لکھتے ہیں:

ناولوں اور ناول نویسی کو فی الحال ہم نے اہل یورپ سے لیا ہے۔مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ہماری قدیم امانت ہے جس کو ہم ان امانت داران مغرب سے واپس لے رہے ہیں۔ ناول کا آغاز خیالی اور طبع زاد قصوں سے ہے۔ جو ابتداً محض داستان گوئی کی شان سے قلمبند کر لیے گئے۔اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ محض خیال آفرینی چھوڑ کے تاریخی واقعات میں رنگ آمیزی کو دلچسپ داستانوں کی شان پیدا کی گئی۔ اس کے بعد ناول کی ترقی کا تیسرا درجہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کے واقعات نئے نئے اسلوب سے دکھائے جائیں اور ان کے ذریعے سے معاشرت و اصلاح زندگی کا سبق دیا جائے۔[۱۱۵]

مضمون نگار نے یہ بتایا ہے کہ قصہ نویسی کا آغاز مصر والوں سے ہوا اور ان کا لکھا ہوا پہلا قصہ ''لندن کے عجائب خانہ برٹش میوزیم'' میں موجود ہے شرر نے کمال فن سے اس کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ شرر ایک ناول نگار تھے اس لیے ان کے مضامین میں قصہ پن بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ''دہلی اور لکھنو کی اردو'' بھی ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے اس مضمون میں مضمون نگار نے دہلی لکھنو اور اہل دہلی کے اعتراضات وشکوک کا ذکر کیا ہے۔'' ''بد قسمت زبان اردو''مضمون بھی اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ایک اچھا مضمون ہے۔اس مضمون میں شرر نے اردو زبان کی ترقی عہد برطانیہ میں اس کے فروغ ومقبولیت پر روشنی ڈالی ہے۔ساتھ ہی اس زبان کی ترقی کے راستے میں حائل ''اردو ہندی تنازعہ'' پر بھی مدلل خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دہلی اور لکھنو کے اہل قلم اور ادباء وشعرا کے بنیادی جھگڑوں کو بھی بیان کیا ہے۔

اس جلد میں ناول کے بارے میں دو مضامین موجود ہیں۔ایک کا عنوان ''ناول'' ہے جب کہ دوسرے کا عنوان ''ہمارا جدید ناول''ان مضامین میں شرر نے اپنا نظریہ ناول نگاری بیان کیا ہے۔اس جلد میں شامل ان مضامین کے بارے میں پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں۔''شرر نے ناول کے متعلق چند مضامین بھی لکھے تھے۔ یہ مضامین شرر'' کی چوتھی جلد میں یکجا مل جاتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگاری کے بارے میں شرر کے تصورات کیا تھے۔ ''[۱۱۶]ان مضامین میں شرر نے ناول کے بارے میں اپنے تصورات وخیالات۔اور فن وتکنیک کے بارے میں جن پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔انہی مضامین کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''دلگداز'' میں انہوں نے ناول پر مضامین بھی لکھے اور ان کی ادبی اور فنی حیثیت سمجھنے کے لیے ان مضامین کی طرف توجہ ضروری ہے۔ان میں سے اکثر مضامین ان کے کسی آنے والے ناول کے دیباچہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔مگر دو خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔ایک 'دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء' اور دوسرا ''ناول'' پہلے مضمون میں وہ ناول کی بابت کہتے ہیں کہ ''ہماری قدیم امانت ہے جس کو ان امانت داران مغرب سے واپس لے آئے ہیں'' وہ بتاتے ہیں کہ مصری داستانیں اس قسم کی پہلی چیزیں تھیں اور مسلمانوں کے عہد میں ان کو بڑی ترقی دی گئی۔اور ''الف لیلیٰ'' کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں ایسی باتیں پڑھنے کے بعد ہمیں احساس ہوتا ہے کہ موجودہ داستان اور ناول کی مناسبت پر نظر رکھتے ہیں۔مگر اس اہم ترقی سے ناواقف ہیں۔جو داستان نے ناول کی نوعیت اختیار کر کے حاصل کی اور کسی مذہبی جذبہ خود پسندی یا قوم پرستی کے ماتحت وہ حقیقت کی گہرائیوں میں جانے سے انکار کر رہے ہیں ......اس مضمون میں ایک اور اہم بات ہے جو مولانا کی ناول نگاری کے سلسلے میں خاص ہے۔وہ یہ کہ تاریخی ناول کی بابت وہ تحریر کرتے ہیں۔''ان ہی طبع زاد خیالی قصوں سے تاریخی ناولوں کا آغاز ہوا۔کسی عشق یا جنگ کے واقعہ کو گھٹا بڑھا کے ایسی رنگین عبارت میں لکھا جاتا کہ قصہ سے زیادہ لطف تاریخ میں پیدا ہوتا'' یہ ان کا نظریہ ہے اس فن کی بابت جس کے وہ خاص طور پر قائل ہیں۔ ۱۱۷

دوسرے مضمون کے بارے میں شرر کے نظریات کیا تھے؟ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اس مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں۔

دوسرا مضمون اس امر کے جواب میں لکھا گیا کہ ناول مخرب اخلاق ہے۔کیونکہ اس میں عشق و عاشقی کے قصے ہوتے ہیں۔مولانا ان معترضین پر حسد کا الزام لگاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ قرآن میں بھی یوسف زلیخا کا قصہ عشق ہے۔غرض ناول میں عشق کے وجود کو وہ لازمی مانتے ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ ناول کیا ہے۔عشق کیوں اور کہاں تک لازمی ہے۔عشق کو جس طرح انہوں نے باندھا ہے۔وہ ان کی ناولوں کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے

> گا۔آ گے چل کر ناول کے اخلاقی مقصد پر وہ جو کچھ فرماتے ہیں۔وہ سطحی سہی مگر صحیح ضرور ہے۔اس کے بعد وہ ناول کالٹریچر میں جو درجہ بتاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ وہ محض ہیئت ہی ناول کو ناول جانتے ہیں۔ان کی رائے ہے کہ ناول کالٹریچر وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں لائٹ لٹریچر کہتے ہیں۔پھر وہ ناول کا ایک تعلیمی مقصد بھی بتاتے ہیں کہتے ہیں۔''ناول ہمیں اسلوب زندگی کے جتنے نمونے دکھا چکے ہیں۔گزشتہ صدہا اور ہزار ہا'' سال کالٹریچر نہیں دکھا سکا تھا اور آج کل کے معیار تعلیم کے اعتبار سے بھی سب سے بڑی تعلیم ہے۔[۱۱۹]

اس جلد میں شرر کا مخصوص اسلوب بیان دکھائی دیتا ہے۔کم وبیش اسلوب کی وہی خصوصیات اس جلد میں بھی موجود ہیں جو پچھلی جلدوں کے مضامین میں موجود ہیں۔اس جلد کے مضامین میں بھی عربی اور انگریزی زبان کے الفاظ موجود ہیں بعض مضامین میں شرر نے واقعات نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔سادہ وآسان اور عام فہم زبان میں اپنے موضوع کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔قاری کی دلچسپی کا خاص طور پر مضمون نگار نے خیال رکھا ہے۔مقصدیت کا پہلو شرر کسی طرح نہیں چھوڑتے۔ناصحانہ اور خطیبانہ انداز ان مضامین میں بھی موجود ہے۔قومی دور اور قومی ترقی کی خواہش اور تڑپ یہاں بھی موجود ہے۔وسیع مطالعہ،معلومات کا ذخیرہ،وسعت نظر،مضمون نگاری کے اصول وضوابط کو شرر نے نبھانے کی کوشش کی ہے۔بعض مضامین خشک اور دلچسپی کے عنصر سے خالی بھی ہیں لیکن اکثر مضامین دلچسپ ہیں۔عبدالحلیم شرر اپنے آس پاس کی ٹھوس صورت حال سے خیال،جذبے، احساسات اور تخیلات لے کر مضمون نگاری کی ابتداء کرتے ہیں۔وسعت مطالعہ اور مشاہدے سے وہ اپنے موضوع کو دلچسپ بناتے ہیں۔شرر اس لحاظ سے اپنے دور کے مضمون نگاروں سے منفرد ہیں کہ انہوں نے پہلی بار مضمون کو موضوعات کی تنگ دامانی سے نکال کو رزندگی کی حقیقی صورتوں سے آشنا کیا ہے۔ان سے پہلے اتنے موضوعات پر کسی نے نہیں لکھا جتنا شرر نے لکھا ہے۔

عبدالحلیم شرر ایک منجھے ہوئے مضمون نگار ہیں۔ان کے فن نے اردو مضمون نگاری کی عمر میں اضافہ کیا مضمون نگاری کی بنیادی خوبیاں اور خصوصیات ان کے مضامین میں پائی جاتی ہیں۔خوبصورت اسلوب موجود ہے۔ ان کے مضامین نے اردو مضمون نگاری کو ایک نیا موضوعاتی رخ عطا کیا ہے جس سے مضمون میں فکری وسعت کے

ساتھ ساتھ موضوعاتی دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔ جلد پنجم شرر کا یہ مجموعہ مضامین بھی ان کے پہلے مجموعہ مضامین کی طرح اردو مضمون نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کرتا رہے گا۔ یہ مجموعہ مضامین ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کے موضوعات کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں۔

.....موضوعات مختلف ہیں جن کے تحت علی گڑھ کالج کی یونیورسٹی میں تبدیلی کی حمایت دنیا کی ابتدائی سادگی، تعلیم نسواں، علم کی قدر و قیمت، اردو ادب کا معشوق اور اس کا تجزیہ، ہندی فارسی عربی کے معشوقوں اور ان کی نفسیات کا ارتقاء قدیم وجدید تعلیم کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کی ضرورت، ہندو مسلم، شیعہ سنی، مسلم عیسائی اتحاد تاریخ کی روشنی میں ان کا ایک دوسرے سے طرز عمل، ترکوں کی شکست اور برطانیہ سے مدد کی درخواست، انگریزی مصنفین مثلاً لوئی ولیم، سرجان منڈویل اور گبن کی غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان کی تصانیف پر تبصرہ جس سے سرسید کا اثر ظاہر ہوتا ہے وغیرہ چیزیں موجود ہیں۔ اہم اور نمائندہ موضوعات یہ ہیں۔ عشاق سخن، ہندو مسلمانوں کا اتحاد، علم کی خوبیاں، ہماری مغربی تعلیم، زوال عجم، مسلمانوں میں جوش وخروش، اسلام میں حرمت خمر کا سبب، عثمانی سطوت کا خاتمہ، خیالات وواقعات، مسلمان لڑکیوں کا نصاب تعلیم، ایک اسماعیلی داعی کا حملہ شیعوں سنیوں بلکہ تمام مسلمانوں پر وغیرہ۔"[۹]

عبدالحلیم شرر سے پہلے اور ان کے عہد میں بھی اسلامی اور مذہبی مضمون لکھے گئے۔ سرسید احمد خان نے ایسے مضامین زیادہ لکھے ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا مضمون ’ہمارے ریفارمر‘‘ ہے۔

’’علم کی خوبیاں‘‘ مضمون میں شرر نے علم کی اہمیت وفضیلت بتائی ہے اور علم کی برکتوں اور فضیلتوں کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے یہ حقیقت بھی فاش کر دی کہ آج دنیا میں جو علم کی دولت ہے وہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے پھیلی ہے اور مختلف مثالیں بھی سلف کی پیش کی ہیں۔ شرر نے رسول پاک ﷺ کے ارشادات، حضرت علی کے اقوال بھی نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر کو اپنے مذہب سے کس قدر پیار تھا اور ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

ان مضامین کا مقصود اصلاحی تھا۔ انہوں نے مضامین اس لیے نہیں لکھے تھے کہ نئی صنف

> ادب اردو میں متعارف ہو بلکہ مقصد صرف اصلاح مفاسد قوم تھا اور انہوں نے اس نوع کو اپنے لیے ایک موثر آلہ تصور کیا ..... سرسید کے سامنے ایک اور ہی عظیم مقصد تھا۔قوم کی تعمیر اور تدبیر تنزل۔[۱۲۰]

چونکہ شرر بھی اس عہد کے مضمون نگار ہیں جس عہد میں سرسید نے مضامین لکھے تھے۔اس لیے ان کے ہاں بھی ہمیں اصلاحی مضامین ملتے ہیں جو سرسید احمد خان کے تتبع میں لکھے گئے یا پھر ان سے اثر پذیری کے انداز میں شرر نے لکھے ہیں۔شرر کا مضمون ''خوب و زشت'' بھی دلچسپ انداز میں لکھا ہوا ہے۔اس مضمون میں جس مقصد کو شرر نے بیان کیا ہے وہ شرر کے الفاظ میں یہ ہے: ''ہمیں صرف اس سے بحث ہے کہ خوب و زشت ہے کیا چیز؟ اور جس چیز کو ہم اچھا کہتے ہیں کیا اس میں کوئی برائی نہیں؟ اور جس چیز کو ہم برا کہتے ہیں اس میں کوئی خوبی نہیں؟''[۱۲۱] شرر نے مثالوں سے اس موضوع کو واضح کیا ہے اور اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔''عشاق سخن'' بھی ایک منفرد قسم کا مضمون ہے۔اس میں شرر نے عاشق اور معشوق کے بارے میں بتایا ہے اور اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ شاعری کے عاشق اور معشوق اکثر زبانوں میں بدل جاتے ہیں اور ان کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔''ہندو مسلمانوں کا اتحاد'' وقت اور حالات کے تقاضوں کا مظہر ہے اور اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شرر اصلاح قوم کے کس قدر خواستگار تھے اور قوم کا درد ان کے دل میں کس قدر تھا۔لکھتے ہیں:

> اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کا دارومدار انھیں دونوں گروہوں کے اتحاد پر ہے جو ہندوستان کی آبادی کے زبردست عنصر ہیں اور ان کے اتحاد کی ضرورت ثابت ہوتی جاتی ہے۔اسی قدر یہ بھی نظر آتا جاتا ہے کہ ان دونوں میں اتحاد کرانا دشواری کی حد سے تجاوز کر کے غیر ممکن ہو گیا ہے۔[۱۲۲]

''مسلمانوں میں جوش و خروش''، ''اسلام میں حرمتِ خمر کا نیا سبب'' بھی دلچسپ مضامین ہیں جن کو شرر نے دلکش انداز میں لکھا ہے۔اس مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر کا مطالعہ کس قدر وسیع اور مشاہدہ کتنا گہرا تھا۔''ایمان کی خیر'' میں آپ نے ''مسلم یونیورسٹی'' علی گڑھ کے قیام کی کوششوں اور مسلمانوں کے اس خواب کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے جو انہوں نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کا دیکھا تھا۔''عثمانی سطوت کا خاتمہ'' میں شرر نے دکھ بھری داستان اور موضوع کو قلمطراز کیا ہے۔

مضامین شرر ''تاریخی واقعات پر خیال آرائی'' کئی عنوانات و موضوعات پر مشتمل ہیں۔یہ جلد ۳۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔بلحاظ موضوع طرز بیان بہت عمدہ ہے ان میں اموی، عباسی، ہندوستانی، رومی، یونانی اور دیگر عربی و

اسلامی تاریخوں سے مواد لیا گیا ہے اور مختلف ومتنوع موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون ایک شعر سے شروع ہوتا ہے۔

بیدرد ہیں جو درد کسی کا نہیں رکھتے
ایسے بھی ہیں یا رب کہ تمنا نہیں رکھتے

یہ مضمون پانچ صفحات پر مشتمل ہے اور اس مضمون میں انہوں نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے: ''یہ سچ ہے کہ آرزو سے کوئی دل خالی نہیں مگر ان لوگوں کی پیغمبرانہ آرزومندی کا اثر عجیب دلخراش سماں دکھا دیتا ہے جن کے دل سے لگی ہو کہ کسی ارمان کو نکال ہی کے چھوڑیں۔''[۱۲۳] اس مضمون کے آخر میں قومی درد اور قوم کی بگڑتی ہوئی حالت زار کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> قوم سے زیادہ کون ہمدردی کے قابل ہوگا مگر افسوس اس کی جانب سے سب بے پرواہ ہیں۔ ہر موقع پر کسی نہ کسی کو ترس آ جاتا ہے۔ مگر قوم کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے اور کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں۔ خدا ہماری قوم کو دل دردمند دے۔[۱۲۴]

''زمانے کی دلچسپیاں''، ''ایک اگلا اسلامی بہادر'' میں شرر نے عقبہ کی بہادری کے کارنامے دکھائے ہیں۔ یہ مضمون (اکتوبر ۱۸۸۷ء) کا ہے...... ایک اور مضمون ''بیان پر درد ہے گزری ہوئی اگلی کہانی ہے'' کے عنوان سے بھی اس جلد میں موجود ہے۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل مضمون ہے، جس میں شرر نے خالد اور فرار کی بہن خولہ کا ذکر کیا ہے جس کو اپنے بھائی کی تلاش ہے۔ ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے جو اس وقت کے ہیں، جب ان کی عمریں صرف اٹھارہ برس اور تیرہ برس تھیں سفر کامیابی کی کنجی ہے، جاہلیت کا شجاعانہ عشق، اگلی فیاضیاں کے عنوانات سے بھی دلچسپ مضامین لکھے ہیں جس میں کسی نہ کسی تاریخی واقعہ کو یا روایت کو بیان کیا ہے۔ شرر کے مضامین کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> کولمبس کی دریافت کے ضمن میں سفر کی برکتوں کا اظہار کیا ہے اور بیرونی الارض کا حوالہ دیا ہے۔ جہاں آرا بنت شاہ جہاں کے مزار پر کندہ حسرت ناک شعر کو نقل کر کے اس کی سابقہ عظمت اور موجودہ حالت کا مقابلہ کیا ہے۔ اگلی ضیافتوں کی مثالیں پیش کی ہیں۔ جاہلیت کا شجاعانہ عشق بہت ہی پر اثر مضمون ہے۔ اس سے عربوں کی حد درجہ شرافت وغیرت کا احساس ہوتا ہے۔ عربوں کے وفائے عہد اور عورتوں کی پارسائی کی بھی مثالیں دی ہیں۔ سسی پنوں کا افسانہ نہایت دردناک پیرائے میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ زمانے کے

اتفاقات قسمت کی ستم ظریفوں، زندگی کی ناپائداری، اولوالعزمی، ایثار نفس وغیرہ کی مثالیں دی ہیں اور ان کی وضاحت کی ہے۔[۱۲۵]

''خاتونانِ عرب کی غفلت'' ایک چھوٹے ذرے کی سرگزشت اور ''سکندر کا تابوت'' بھی عمدہ مضامین ہیں۔ ہر ایک مضمون میں کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ مصنف نے بیان کیا ہے۔ ''سکندر کا تابوت'' کے نام سے جو مضمون کہا ہے اس میں شرر نے اس حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ سکندر کے مرنے کے بعد اس کی میت کو تابوت میں رکھا گیا تو بڑے حکیم اور فلاسفر جن کا تعلق مختلف مما لک سے تھا۔ ہر ایک نے تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بائیس حکماء اور فلاسفر جب اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تو داروغہ باورچی اور خزانچی کی باری آئی انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پہلی صدی کا ایک مرتد، ایثار نفس، وطن اور ابنائے وطن، عدالت فاروقی، نیچر کی ترقیاں، ہارون رشید کے دربار میں ہندوستانی تحفہ، بہاروں کا رعب وغیرہ نامی مضامین لکھ کر شرر نے نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ آنے والے ہر دور میں اپنا ایک خاص مقام ومرتبہ بنالیا۔ جب تک اردو ادب ہے تب تک شرر اپنے ان مضامین کی وجہ سے شہرت حاصل کرتے رہیں گے۔ دوست نما دشمن، چند اگلی تمنائیں، ہندوستان کا ایک دلچسپ مناظرہ، روحانی جاسوس، ایک قاضی صاحب کا فتوی جیسے مضامین لکھ کر شرر نے اس فن کو جلا بخشی۔ عبدالحلیم شرر کے ان مضامین کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> غیر ملکی تاریخی واقعات میں رگیولیس کا واقعہ اردو میں بہت مقبول تھا اور نصاب میں بھی شامل رہا۔ گولڈ سمتھ کی طرح جس نے آبادی میں تناسب پیدا کرنے کے لیے خواتین کو جنگ اسپین میں شرکت کا مشورہ دیا تھا۔ شرر نے بھی جنگوں میں صنف نازک کی شرکت کی موافقت کی ہے۔ حب وطن، عمر کی عدالت، نیچر کی ترقیاں، (دنیا میں برہنگی کی روز افزوں ترقی کا ذکر) شخصی رعب وداب کے اثر وغیرہ کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ خلفائے بنی آمیہ خصوصاً اسپین کے خلفا کے حیرت انگیز علمی ذوق کا تذکرہ کیا ہے۔ سلاطین کے تقدس اور نیکی کا بیان کیا ہے۔ آلِ تیمور کی زبوں حالی کے مدِنظر ان کی امداد کے لیے چندہ فراہم کرنے کی تحریک کی ہے۔ تاریخ کے عبرت ناک واقعات کے تحت واثق اور اس کے بیٹے جعفر کا ذکر قابل توجہ ہے کسی انگریز کے قول کے مصداق کہ وہ ہندوستان بادشاہوں اور فقیروں کا دیس ہے۔ ہندوستان میں ہر قسم کے بادشاہوں مثلاً ہیجڑوں اور فقیروں میں بادشاہوں کی موجودگی کا مذاق اڑایا ہے۔ ہندوستان کے اپنے دور کے مناظروں کے معیار کا سابقہ مناظروں سے مقابلہ کیا ہے۔ اور لڑائی جھگڑوں پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ دولت نما

دشمنوں یا منافقوں سے بچتے رہنے کی بھی تاکید کی ہے۔[۱۳۶]

جلد ششم کے تمام مضامین میں کوئی نہ کوئی واقعہ مضمون نگار نے پیش کیا ہے۔ جو اس بات کی شہادت ہے کہ مضمون نگار کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی نظر کی باریکی، مطالعے کی گہرائی اور اسلوب و بیان کے حسن نے ان مضامین میں اور زیادہ نکھار پیدا کیا اور قاری جب مضمون پڑھنا شروع کرتا ہے تو ان دلچسپ تاریخی واقعات کی تہہ میں پہنچ جاتا ہے اور اس کا تخیل اس واقعہ کے منظر کو اس کے سامنے بیان کر دیتا ہے۔ شرر کے ان مضامین کا اسلوب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ دیگر مضامین کا تھا۔ اس لیے کہ اسلوب کسی بھی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ ان مضامین میں خوبیاں اور خامیاں دونوں پائی جاتی ہیں۔ بعض وہ چیزیں بھی پیش کی گئی ہیں جو اردو ادب میں بالکل نئی ہیں۔ اس لیے مختلف ملکوں کی تاریخوں کے وسیع مطالعے کا ثبوت ملتا ہے۔ جو سر سید کے انشائیوں کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ عربی ماخذات سے جو واقعات و بیانات لیے ہیں ان کی زبان سادہ اور دلآویز ہے۔ شاید ترجمے کے بعد اصل کا اثر باقی رہ گیا ہے۔ جیسے سر سید کے ''خطبات احمدیہ'' کے تراجم سے اصل عربی عبارت کا رنگ جھلکتا ہے۔

شرر کی اس جلد کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر مضمون کے اختتام پر اس کا سن موجود ہے اور مہینہ بھی جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مضمون کب لکھا گیا۔ ان مضامین میں شرر نے عقبہ بن خالد، سعد بن ابی وقاص، خولہ، عمر بن العاص اور فرار وغیرہ کی جانبازیوں کا ذکر بھی کیا ہے جس کی وجہ سے ان مضامین کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ان مضامین کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ نہ صرف تاریخی ہیں بلکہ بعض مضامین کو مضمون نگار نے تاریخی رنگ دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ شرر کے یہ مضامین مختصر بھی ہیں اور جامع بھی اور شرر کے مخصوص اسلوب اور انداز بیان کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ ان مضامین میں شرر نے قرآن پاک کی آیات اور احادیث کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ شرر کی طبیعت میں تضاد ہے اور یہ صورت حال یہاں بھی نظر آتی ہے۔ اگر چہ ان مضامین میں شرر نجومیوں اور توہم پرستی کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی ''آہ پر تاثیر'' اور ''روحانی جاسوسی'' پر یقین بھی رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان مضامین میں طرزِ تحریر کی دلآویزی بھی موجود ہے۔ مضامین کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مضمون نگار کے جذبات میں گہرائی کم اور سطحیت زیادہ ہے اور ان کی تحریر کا اثر کچھ دیر رہتا ہے لیکن دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں کہ:

> طرزِ تحریر کی دلآویزی کے ساتھ ساتھ شرر کے ہاں بعض خامیاں بھی نمایاں ہیں ان کے جذبات میں گہرائی کے بجائے سطحیت کا احساس ہوتا ہے اور اس لیے ان کی تحریر کا اثر دیرپا نہیں ہوتا .... اس قسم کے جملے بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً اس مقام پر سبھوں کی رفتار زمانہ کی نیرنگیاں یاد آتی ہوں گی۔ کیوں نہ یاد آئیں یہ واقعہ ہی ایسا تھا۔ یا

یہ ایسا واقعہ ہے کہ سننے والوں کے کلیجے میں بھی ناسور پڑ جاتا ہو گا۔حالانکہ پڑھنے پر کچھ اثر نہیں مرتب ہوتا۔[۱۲۷]

جلد ہفتم کا نام ''نظم و ڈرامہ ہے''اور یہ مجموعہ مضامین ۶۷۱صفحات پر **مشتمل** ہے۔

شرر کی شعری کاوشوں کا ادراک اس جلد کے مطالعے سے ہوتا ہے شرر کی شعری کاوشوں کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں:

شرر کی شعری کاوشیں نظر انداز ہوتی رہی ہیں حالانکہ شرر کو اردو میں نظم معرا اور نظم آزاد کے بانیوں میں اپنے دور کے کہنہ مشق شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن ان کے کلام کو صحیح تناظرات میں پرکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔شرر کے شعری نظریات پر جمالیاتیحظ، تاثراتی اور تخیلی سحر آفرینی اور وجدانی عناصر حاوی رہتے ہیں۔انہوں نے شاعری کو دل کا معاملہ قرار دیا ہے جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔[۱۲۸]

عبدالحلیم شرر کی یہ نظم ان کی شعری کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔شرر کی اس نظم کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے عام فہم انداز میں اور آسان الفاظ کے استعمال سے اس نظم کو خوبصورت بنا دیا ہے۔''شب وصل'' کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا کا کہنا ہے کہ:

یہ پوری نظم ہوس ناکی جذبات سے لبریز ہے جس میں عریانی اور بے باکی غضب ڈھا رہی ہے البتہ معاملہ بندی کہیں کہیں نفسیاتی کیفیات کا مرقع بن گئی ہے مثلاً

اب بازیب بڑھاتے ہونگے   تھوڑی دیر میں آتے ہونگے

……………

کمرے میں ہم کو بیٹھا پا کر   چھپ گئے دروازے پر آ کر[۱۲۹]

شرر نے دوسری نظم ''شب غم''لکھی جس میں ۲۸بند ہیں۔

دوسری نظم شب غم ہے جس کی بحر، ہیت، لب ولہجہ وغیرہ شب وصل کی طرح کا ہے۔شب غم کو غیر کی شب وصل

تصور کر کے معاملہ بندی کی گئی ہے:

صدمہ فرقت ہوش رہا ہے — غم کا ساں آنکھوں میں بندھا ہے
رات اندھیری کالی بلا ہے — ہو کا عالم رنج فزا ہے

درد کے مارے رو رو دینا
آفت جاں ہے سانس کا لینا ۱۳۰

شرر کی تیسری نظم ''زمانہ اوراسلام'' ہے۔دوسری دونظموں کے مقابلے میں یہ طویل نظم ہے۔یہ بھی مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔اس میں بھی استفہامیہ انداز ہے۔الفاظ سادہ اورآسان ہےاور تمثیلی انداز میں شرر نے یہ نظم لکھی ہے۔اس کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا اپنی کتاب ''عبدالحلیم شرر (حیات اور کارنامے) میں لکھتے ہیں کہ:

> شرر کی تیسری نظم زمانہ اوراسلام ہے جو پچاس بند پر مشتمل ہے اورمسدس حالی کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔اس کی بحر ہیئت اورلب ولہجہ مسدس حالی کے مماثل ہے۔لیکن ان معنوں میں مختلف ہے۔شرر نے تمثیلی اسلوب اختیار کیا ہے۔اس نظم کا مکمل پلاٹ ہے جس میں قصہ پن بھی ہے۔اس کا پلاٹ ان کے ناولوں کے پلاٹ سے مختلف نہیں ہے۔اسی طرح کی رومانی اورتخیلی دنیا آباد کی گئی ہے۔زمانہ تشخص ہو کرترقی اسلام کی تلاش میں نکلتا ہے جس سے اس کو گیارہ سو سال قبل عشق ہو گیا تھا اور ایک مدت تک اس کی خدمت میں باریاب رہنے کے بعد یورپ کی سیر کو چلا گیا تھا۔ایک دن اچانک اس کو اپنی محبوبہ کا خیال پیدا ہوتا ہے اوردوبارہ اس کی تلاش میں نکلتا ہےلیکن اس کا ٹھکانہ ڈھونڈ ھنے سے نہیں ملتا۔ایک طوفانی رات میں خوفناک جنگل میں ہمت ہار دیتا ہے۔اس وقت ایک درویش صفت بزرگ نمودار ہوتے ہیں۔زمانہ کو ایک کھنڈر میں لے جاتے ہیں۔زمانہ ان سے اپنا حال دل کہتا ہے۔درویش اسے بتاتا ہے کہ جب محبوب کی تلاش میں سرگرداں وپریشان ہے اوربار افتاد کا شکار ہو چکا ہے۔دولت وحشمت نے آنکھیں پھیر لیں۔قصر تباہ ہو گیا۔اب یہی کھنڈرات اس کی نشانی ہیں۔یہ سن کر درویش اور زمانہ دونوں رونے لگتے ہیں۔اس منزل پر شاعر برآمد ہوتا ہے اورتلقین کرتا ہے کہ رونا دھونا بہت ہو چکا اب وقت کا تقاضا پورا کرو۔ہم سب کو مل کر اسلام کی گذشتہ عظمت واپس لانا ہے۔یہ نظم بندش اور پلاٹ دونوں

کے اعتبار سے خاصی ڈھیلی ڈھالی ہے۔[۱۳۱]

عبدالحلیم شرر کی نظم ''زمانہ اور اسلام'' کے چند بند ملاحظہ کیجئے:

ہر اک علم کے باکمال اور یکتا　　　ہر اک فن کے مشتاق اور اس کے جویا
ہنر مندہ صناع ادیب اور اطبا　　　مہندس، منجم، حکیم اور دانا
جواں مرد۔ جنگ آزما۔ مرد میداں
سبھی قسم کے لوگ آباد تھے یاں

……………

مسلمانو! افسوس عبرت کی جا ہے　　　زمانہ غمِ قوم میں مبتلا ہے
تمہیں ڈھونڈھتا دربدر وہ پھرا ہے　　　بڑی مشکلوں سے لگایا پتا ہے
بہت رو چکے رونے والے۔ اٹھو اب
زمانہ جو کہتا ہے وہ ہی کرو اب[۱۳۲]

ممکن ہے کہ شرر نے اور بھی کچھ کہا ہو جو ان کی بے اعتنائی کی بنا پر ضائع ہو گیا ہو۔ شرر کے دستیاب کلام میں صرف تین نظمیں دستیاب ہیں جو مسدس کی ہیئت میں ہیں۔ ان میں دو نظمیں ایک ہی بحر میں ہیں۔ البتہ تیسری مختلف ہے۔ پہلی دو نظموں کے عنوان۔ شب وصل اور شب غم ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے نظم معریٰ کا صحیح استعمال کیا۔ ڈرامے کے چھ مناظر جن میں نظم معریٰ ہے۔ دلگداز میں شائع کیے تھے۔ شرر کے نظم معریٰ کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ شرر نے صحیح طور پر نظم معریٰ کا استعمال کیا ہے لیکن شاعری فنی ریاض، وابستگی اور درون بینی کا مطالبہ کرتی ہے اور شرر کی عجلت پسند طبیعت فنی ریاض سے زیادہ بسیار نویسی کی قائل تھی۔ نتیجہ میں ان کی معریٰ شاعری نومشقی کا شکار ہو کر رہ گئی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:
>
> فلورنڈا:　　کیا کرو گی جا کے اب؟
>
> ساقیا:　　ان کو نہ روکیں

فلورنڈا: کس لیے

ساقیا: بادشاہ کو گر ذرا بھی شک ہوا ہو تو بس

مجھے اور ان کو قتل کر ڈالیں گے

فلورنڈا: تو جاؤ بہن

اب کیا جاؤ گی تم؟

مریم: جس جا خدا لے جائے

فلورنڈا: تم

کس طرح جاؤ گی یاں سے؟

خاک اڑاتی ٹھوکریں

کھاتی ننگے پاؤں جاؤنگی بہن اور جس طرح بن پڑے گی پہنچاؤ گی

منزلوں میں"

اس نظم میں یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ اس کے تمام مصرعے باہمی طور پر نثر سے مربوط ہیں۔ جو مغربی شاعری میں مروج ہے۔ اس طرح شرر نے ایک اور غنایہ اسیری بابل بھی لکھا جو گولڈ اسمتھ سے ترجمہ ہیں۔[۱۳۳]

اس دور میں شرر کے ان تجربات اور نظم معریٰ کے بارے میں ان کے خیالات کو پذیرائی ملی۔ ان کے شعری کارناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر اس کے مردِ میداں نہیں۔ اردو میں منظوم ڈراموں کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ البتہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بدولت کسی حد تک نثری ڈراموں کے پہلو بہ پہلو منظوم ڈراموں اور غنائیوں کی مدھم سی شمع روشن ہے۔

اس مجموعہ مضامین میں "بنی اسرائیل کی مختصر تاریخ"، مختصر ترین مضمون ہے۔ "نیچرل شاعری" میں شرر نے اپنے خیالات کا اظہار موثر انداز سے کیا۔ آسان اور عام فہم انداز سے اپنی بات کو موثر طور پر بیان کرنے کی صلاحیت شرر میں موجود تھی۔ بنی اسرائیل کی مختصر تاریخ کو مصنف نے "اسیری بابل" کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ شرر کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے عنوانات و موضوعات اور اسلوب و تکنیک میں آفاقیت کے

عناصر پائے جاتے ہیں۔انہوں نے اس مضمون میں جن پہلوؤں کا ذکر کیا ہے یا جو خیالات بیان کیے ہیں وہ آج کے دور میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنے اس دور میں۔عبدالحلیم شرر اپنے مضامین میں پند و نصائح اور اخلاقی درس دیتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے اپنے مضمون ''شادی وغم'' میں بڑی فلسفیانہ باتیں بیان کی ہیں اور مثالوں کے ذریعے سے ''شادی وغم'' کی کیفیتوں کو اجاگر کیا ہے۔خوبصورت اور دلکش اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔آسان اور عام فہم الفاظ کے ذریعے سے اس موضوع کی حقیقت واصلیت پر سے پردے اٹھائے ہیں۔لکھتے ہیں:

دنیا میں کوئی چیز اور کوئی جذبہ انسانی نہیں جس میں اسی قسم کی دو مخالف ومتضاد کیفیتیں نہ ہوں۔ وہی بہت جو دوزخ و جنت، اعلی و ادنی، لطیف وکثیف، مزے دار و بے مزہ، پر لطف و بے لطف اور اچھے اور برے میں ہے۔وہی ان دونوں لفظوں میں بھی ہے۔دنیا میں کوئی کیفیت اور کوئی حالت نہ ہوگی جو اسی قسم کی دو متضاد جہتوں اور منددوں کی تابع نہ ہو......[۱۳۴]

سچ یہ ہے کہ ہمیں خوشی یا غم ان دونوں میں سے جو چیز نصیب ہوتی ہے وہ خود اپنے ہی ہاتھوں نصیب ہوتی ہے۔اسی مجموعہ مضامین میں دو مضامین ''ایک اصلاح'' اور ''پھر وہی اصلاح زبان'' کے عنوان سے بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ قبرستانوں کا مسئلہ'' بھی بڑی اہمیت کا حامل مضمون ہے۔اس مضمون میں شرر نے قبرستانوں کے مسائل پر بحث کی ہے جو لکھنو میں میونسپلٹی کی کاروائیوں سے پیدا ہو رہے ہیں اور قبرستانوں کی اہمیت اور مسلمانوں کے لیے ان کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔''بدقسمت زبان اردو'' بھی ایک منفرد مضمون ہے جس میں شرر نے عام فہم انداز میں اردو زبان اور اس کے لٹریچر کے بارے میں اپنے نظریات واحساسات کو بیان کیا ہے۔یہ مضمون نسبتاً طویل ہے اور دو نمبروں پر مشتمل ہے۔

مضامین شرر جلد آٹھ مقالات شرر پر مشتمل ہے۔یہ جلد ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔اس جلد میں بھی رنگا رنگ موضوعات شامل ہیں۔اس جلد کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل مقالات کا آغاز خوبصورت اشعار سے کیا گیا ہے۔جو شرر کے شاعرانہ ذوق کے عکاس ہیں۔یہ مقالات شرر کے وسعت مطالعہ اور وسیع مشاہدے کے ترجمان ہیں۔ان جلد میں ''گم شدگان سلف'' اور ''گورغریباں'' نظم کے پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔جو شرر کے مقام ومرتبہ شاعری کو نمایاں کرتے ہیں۔نمونے کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

بہت کچھ ہمارے لیے ساتھ لائے   بہت علم ہم کو سکھائے پڑھائے

بہت بھید کھولے بہت گر بتائے　　　　　بہت کی اعانت بہت کام آئے

کہاں تک اب اظہار اس کا کریں ہم

کہاں تک کمالات ان کے گنیں ہم [۱۳۵]

گرمیوں کی رت، برکھا رُت یا برسات، اوس کی رت، حریف کی رت، کالی داس کے مضامین کے تراجم ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شرر نے یہ مضامین ترجمہ کیے ہیں۔ عبارت میں روانی اور تسلسل موجود ہے۔ اس جلد کے مقالات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرر ہر ایک موضوع پر لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ موضوع کی مناسبت سے خوبصورت اسلوب شرر نے اپنایا ہے۔ سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال اس جلد میں موجود ہے، شاعرانہ مزاج کی عکاسی ان مقالات میں موجود ہے۔

مضمون کے موضوع کے متعلق ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> جہاں تک مضمون کے موضوع کا تعلق ہے۔ ایک مضمون نگار کسی بھی شے کو جو اسے متاثر کرے۔ اپنا موضوع بنا سکتا ہے حیات و کائنات کے وسیع تر مظاہر۔ آسمان سے زمین تک اور رائی سے پربت تک ہر چیز مضمون کا موضوع بن سکتی ہے۔ ایک مضمون نگار اپنے ماحول کا مبصر اور زندگی کا نقاد ہوتا ہے اور ایک صاحب فن کی حیثیت سے اس کی نگاہ باریک بین معمولی معمولی چیزوں میں بڑے بڑے سربستہ اسرار و رموز کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز بھی پیش پا افتادہ نہیں ہوتی۔ وہ گل و گلزار سے محفوظ ہوسکتا ہے تو خار فصیل ان سے بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ وہ زندگی کے عظیم مسائل سے لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں یکساں دلچسپی لیتا ہے اور نہ صرف دلچسپی لیتا ہے بلکہ ان کی مصوری کرتا ہے اور ان کے دلچسپ مرقع اور جاذب توجہ نقشے بنا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان معمولیات میں ایک حسن اور کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک مضمون نگار کو متفرق نویس بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ مختلف اشیاء سے وقتاً فوقتاً متاثر ہو کر انہیں اپنا موضوع بناتا ہے۔[۱۳۶]

عبدالحلیم شرر کے ہاں بھی موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ وہ بھی اردگرد سے حالات احوال اور اشیاء مناظر اور معاشرے کی صورتحال کو اپنے مضمون کا موضوع بناتے ہیں۔ شرر کے مضامین کے عنوانات اس قسم کے

ہیں کہ وہ ہر دور اور ہر عہد میں جب بھی چھپتے ہیں پرانے نہیں سمجھے جاتے۔

جاوید اختر بھٹی اپنے مضمون ''عبدالحلیم شرر کے ''دل گداز'' مضامین کا مجموعہ'' میں لکھتے ہیں: ''شرر نے زندگی اور زمانے کو شعور کی آنکھ سے دیکھا۔ ان کے موضوعات میں بے پناہ وسعت ہے۔ وہ زندگی کو انقلاب زمانہ سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ وہ ایک ہی ساگر میں کائنات کا عکس دیکھتے ہیں''۔[۱۳۷]

عبدالحلیم شرر کے مضامین کی اہمیت اور ان کے مقام و مرتبہ کا تعین اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے بعض مضامین شامل نصاب بھی رہیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر کس پائے کے مضمون نگار ہیں اور ان کے مضامین میں ایسا کون سا پہلو ہے کہ انہیں نصاب میں شامل کیا گیا۔ اگست ۱۹۸۲ء اور ایڈیشن اول میں ''صحبت برہم'' مضمون شامل نصاب تھا اور یہ گیارہویں بارہویں جماعت کی اردو نصاب لازمی کا مضمون ہے۔ اردو انشاء کے الماس پارے کے نام سے جو کتاب بی اے، بی اے آنرز۔ ایم اے اردو اور فائنل اردو مقابلہ کے امتحانات کے امیدواروں کے لیے ایک نادر تحفہ کی مانند ہے۔ اس میں ڈاکٹر احسن فاروقی کے خیالات بعنوان شرر اور ناول نگاری کا سلیقہ موجود ہے۔ جو شرر کے مقام و مرتبہ کے تعین میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ محمد طفیل نے ''دل دینا'' مضمون کو نقوش کے صفحات کی زینت بنایا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دل دیا اور نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دل دیتے ہیں۔ صدہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دلدی اور دلبری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔[۱۳۸]

''نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی'' نامی مضمون ''تلخیص الاردو'' مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی کے صفحات کی زینت بنا۔ سہ ماہی رسالہ ''اردو'' میں شرر کا مضمون ''شاعری اور پریاں'' موجود ہے۔ عبدالحلیم شرر کا یہ وہ مضمون ہے جو اردو کانفرنس میں لکھنو کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس مضمون کا نام ''ہندوؤں کا تعلق اردو سے'' ہے۔ آل احمد سرور کی کتاب ''ہمارا ادب'' میں بھی ان کے دو مضمون ''باغ آرزو'' اور ''مٹیا برج کے حالات'' کے عنوان سے موجود ہیں جو ان کے بڑا مضمون نگار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ایک اقتباس بطور نمونہ درج ہے۔

آہ! یہ خوبصورت اور دل فریب نقش تو مٹنے کے قابل نہ تھا! مگر ہائے زمانے نے مٹا ہی دیا اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ھ (۱۸۸۷ء) میں یکا یک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ: خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

سب باتیں خواب وخیال تھیں۔ ایک طلسم تھا کہ یکا یک ٹوٹ گیا اور وہ خوبصورت بقیہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والہان ملک کو رہا کرتی تھی آج ایک دشتان فنا اور عبرت کدہ ہے۔ جہاں کچھ بھی نہیں۔ جس نے اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا۔ اب وہاں کے سناٹے کو دیکھ کر سوا اس کے کمال حضرت واندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے ''رہے نام اللہ کا'' اور کیا کر سکتا ہے۔[۱۳۹]

ج: عبدالحلیم شرر کی مضمون نگاری کی خصوصیات واہمیت اوران کا مقام ومرتبہ

عبدالحلیم شرر نے تمام مضامین اصلامی مقصد اور جذبہ کے تحت لکھے۔ان کے مضامین میں اخلاقی تعلیم دینے کا بھی ایک پہلونمایاں ہے۔عبدالحلیم شرر نے اپنے مضامین میں فطری سنجیدگی،قناعت،سادگی ورنگینی،شگفتگی کی امتزاجی شان کو مجروح ہونے سے بچایا۔کوئی بھی موضوع ہو ان کے قلم کی روانی میں کمی واقع نہیں ہوتی۔عبدالحلیم شررایک محبِ وطن انسان تھے اور سچے اور پکے مسلمان بھی انہوں نے مضامین کے ذریعے سے بھی اسلامی افکاروشعار کی پاسداری کا فریضہ ادا کیا۔ان کے مضامین میں مشرقی،اسلامی سوچ اورتہذیب وتمدن پوری آب وتاب سے دکھائی دیتی ہے۔

ان کے تاریخی مضامین میں قرون اولیٰ کی اسلامی دنیا زندہ وتابندہ ملتی ہے اوراسلامی واقعات کی سچی عکاسی بھی۔شرر کا وصف یہ ہے کہ وہ کسی بھی واقعے کو محض بیان کی خاطر مضمون میں داخل نہیں کرتے۔ بلکہ مضمون کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ واقعات ضرورت ایک منطقی ضرورت کے تحت خود بخود آتے ہیں۔ان کے ذکر سے قاری میں شوکت رفتہ کا خوشگوار احساس جنم لیتا ہے۔اس لحاظ سے یہ کہنا بجا ہے کہ مولانا شرر نے اپنے مضامین کے ذریعے سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردارادا کیا ہے۔انہوں نے تاریخی واقعات کوتوڑ موڑ کر پیش نہیں کیا۔ بلکہ اپنے تخیل کی بناپران میں دلچسپی اورحسن اوردلکشی پیدا کرتے ہیں۔ان کے مضامین موضوعات کی بناپر رنگا رنگ ہیں لیکن ہرایک میں دلچسپی کا عنصر شامل ہے۔

شررخوب صورتی،دلچسپی اورلگن کو برقراررکھتے ہوئے واقعات کو بیان کرتے ہیں۔شرراپنے مضامین میں کسی منظر کی تصویر جب کھینچتے ہیں تو پورا منظر واضح ہوجاتا ہے۔شرراپنے مضامین میں جب تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ایک دم سے عہدرفتہ میں نہیں پہنچ جاتے بلکہ وہ قاری کو اپنے موجودہ ماحول سے بھی وابستہ رکھتے ہیں۔ایسے مقام پران کی فنی خوبیوں کے جوہرنمایاں ہوکرابھرتے ہیں۔وہ ان امورکوبھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ عوامی دلچسپی برقرار رہے۔اس لیے کہ شررکو خدا تعالیٰ نے یہ وصف عطا کیا تھا کہ وہ کسی بھی مخصوص طبقے کے لیے نہیں لکھے گئے بلکہ اصلاح قوم اورمقصدیت اورعوام کی طلب پر لکھے گئے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین پوری قوم کی میراث ہیں۔

شرر نے اپنے نقطہ نظر کی تبلیغ وتشہیر کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان بھی ایسا اپنایا جو عام فہم تھا اوراسلوب وہ اختیار کیا جس میں لکھنوی روایات کا اثر،مقصدیت،سلاست،خطیبانہ رنگ،تفصیل پسندی،منظر نگاری،تشبیہ اور استعارہ کا استعمال محاوروں کا استعمال،واقعہ نگاری،تاریخی مزاج،شعریت اوررومانویت کے عناصر شامل تھے۔شرر

نے جیسا اسلوب مضامین میں اپنایا وہ انہی کا خاصہ تھا۔عبدالحلیم شرر نے اپنے مضامین میں انداز بیان اس قدر شتہ اور دلکش رکھا ہے کہ قاری اس میں محو ہو جاتا ہے اور یہ بھی ان کی خوبی ہے کہ وہ طرز بیان میں شگفتگی کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔اس طرح قاری کے سامنے ایک ایک نقطہ پورے پس منظر کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے اور خوبصورت استعارات اور تشبیہات کے استعمال سے موضوع کو اور زیادہ دلکش اور رنگین بنا دیتے ہیں۔

شرر اپنے مضامین میں استدلال سے بھی کام لیتے ہیں۔شرر نے انسانی نفسیات کے پیش نظر رومانیت اور رومان آور فضاؤں کو بھی خوب ملحوظ رکھا ہے۔انہی رومانوی حوالوں کی وجہ سے شرر کو اردو ادب میں رومانوی دبستان کا بانی کہا جاتا ہے۔ان کے مضامین میں رومانی فضائیں، حسن وعشق کی ستائش وتوصیف اور جذبات واحساسات کے عناصر ملتے ہیں۔تخیل و خیال آفرینی سے وہ اپنے مضامین کو فنی بلندی بخشتے ہیں۔قیاسی اور تخیلاتی حالات و واقعات کو شرر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ مجسم صورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔

شرر اپنے مضامین میں خطیبانہ انداز بھی اپناتے ہیں۔شرر نے تشبیہات واستعارات، عربی وفارسی تراکیب، بے تکلفانہ انداز میں بیان سے بڑی خوبصورتی سے ہمکنار کیا ہے۔وہ خالص ٹکسالی زبان استعمال کرتے ہیں اور پڑھنے والے کی تفریح طبع کو بھی مدِنظر رکھتے ہیں۔شرر عورتوں کے لیے حسن عالم فریب، پری رخ، باوفا معشوقہ، کیش محبوبہ، حورش محبوبہ، حسن ملائک فریب کے سے القاب استعمال کرتے ہیں اور مردوں کے لیے سعادت مند، اے اہل اسلام، حضور، صاحب فرزند ذی وفا وغیرہ القاب و آداب استعمال کرتے ہیں۔شرر اپنے مضامین میں موقع محل کے مطابق اپنے بیان کو جاندار اور موثر وتوانا بنانے کی خاطر اشعار بھی استعمال کرتے ہیں۔عربی، فارسی اور انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ان کے مضامین ان کے عہد کے دوسرے مضامین نگاروں سے کم اہم نہیں۔ان کے موضوعات میں رنگا رنگی ہے۔اندازِ بیان مختلف ہے۔جو بات ان کے دل سے نکلتی ہے وہ قاری کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے مضامین پوری دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

اردو مضامین نگاری کی تاریخ وارتقاء میں عبدالحلیم شرر کے مضامین سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔بقول یحیٰی تنہا: ''آپ کے مضامین انشا پردازی کے نمونے ہیں۔خیالات بھی عمدہ ہیں اور ان کو اچھی زبان میں ادا کیا ہے''[۱۴۰] شرر کے مضامین میں ندرت تحریر، شگفتگی، اچھوتا پن، تازگی اور نیا پن کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے فنی وتکنیکی معیاروں کو جابجا اختیار کیا ہے۔ان کے مضامین تاریخ ساز اہمیت کے مالک ہیں۔شرر کے بعض مضامین میں کہانی کا انداز ملتا ہے۔ان مضامین میں شرر کا اسلوب مختلف النوع تجربات کا حامل ہے۔سید احتشام حسین شرر کے مضامین کے اسلوب کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''شرر کی زبان بھی دل کش اور رنگین تھی اور قصہ گو کے لیے بہت موزوں تھی۔لیکن انہوں نے علمی مضامین بھی دل نشین انداز میں لکھے ہیں۔''[۱۴۱] شرر کے مضامین میں مختلف

النوع فنی وتکنیکی تجربے ان کے خیال وتصور کی وسعت اور نئی سمتوں کی تلاش کے میلان کا مظہر ہیں۔جن میں ندرت اور اچھوتا پن نظر آتا ہے۔ بقول سجاد نقوی:

> اسلوب کیا ہے! اسلوب فن کار کی ذات ہے۔اس سے ہٹ کے اسلوب کی اور کوئی تعریف نہیں ہے۔ یہاں ذات سے مراد وہ ذات نہیں جو ظاہر میں نظر آتی ہے۔ذات تو ایسا پھول ہے جس کا اپنا رنگ ہوتا ہے اور الگ سی خوشبو بھی ہوتی ہے۔ یہ پھول جہاں نمائش کا متمنی ہوتا ہے۔ وہاں اس کی خوشبو بکھرنے کے لیے ہر دم بے قرار بھی ہوتی ہے۔مگر اس پھول کی نمائش کا کون وسیلہ بنے؟ لفظ! مگر لفظ تو ایسی ہرجائی مخلوق ہے جو ہر کسی کی رعایا بننے پر تیار رہتی ہے۔ ایسے میں لفظ کے اس عمومی مزاج کو کیسے بدلا جائے؟ لفظ کی قلب ماہیت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے وہ انوکھی خوشبو عطا کی جائے جو پہلے سے اس کے گرد پھیلی خوشبو پر اس درجہ حاوی ہو جائے کہ اپنی انفرادیت کا اعلان کرتی نظر آئے یوں لفظ بظاہر مانوس مگر بباطن نئی نویلی صورت اختیار کر جائے گا۔ الگ سے بو باس کا حامل یہی وہ لفظ ہے جو پھول یعنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنتا ہے۔اس طرح ثابت ہوا کہ لفظ جب کسی ذات کی کسی خوشبو میں بنا کر برآمد ہوتا ہے تو پھر اس کی حیثیت روایتی اور عمومی نہیں رہتی۔ ذات کی اس خوشبو ہی کو میں اسلوب سمجھتا ہوں۔ یہ جتنے بھی بڑے صاحب طرز فن کار آج تک گزرے ہیں ان کے ہاں بظاہر الفاظ ایک سے ملے نہیں مگر ان الفاظ کو ان کی شخصیت نے جو خوشبو دی ہے وہ الگ الگ ان کی شناخت اور پہچان کا وسیلہ بنتی ہے۔[۱۴۲]

شرر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا تھا۔اس صنف سخن کو سمجھنے۔ پرکھنے، برتنے میں جو مہارت وکمال شرر کو حاصل ہے وہ دیگر مضمون نگاروں کو حاصل نہ ہو سکا۔شرر نے متعدد موضوعات وخیالات پر مبنی مضامین لکھے۔مضمون لکھنے کے لیے وسعت مطالعہ یا گہرے مشاہدے، قریبی تجربے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں ادب کے طویل ریاض کے بعد شرر کی شخصیت اور سوچ میں رچ بس گئی تھیں۔شرر کے مضامین شاعرانہ حسن بیان، شخصیت کے دلکش انعکاس اور مظاہر فطری کے مخفی گوشوں کے انکشاف سے عبارت ہیں۔ان میں ایسا مضمون نگار سامنے آتا ہے۔جس کے احساسات بے حد نازک اور وہ فطرت کی ہر لرزش مخفی کو محسوس کرتا ہے۔ ماحول کی ذرا سی تبدیلی اور زندگی کا معمولی سا ارتعاش ان کی روح پر لطیف ردِعمل پیدا کرتا ہے۔مضمون نگار کسی بلند مقام پر کھڑا ہو کر اپنے قاری کی اصلاح کرتا ہے۔شرر بھی اپنے اس فریضے کو ادا کرتے ہیں۔شرر نے ادب کو صحیح مقام ومرتبہ دلانے میں اپنا کردار با حسن طریق سے ادا کیا ہے۔حفیظ الرحمٰن خان لکھتے ہیں:

> ادب جہاں زندگی کی سچائیوں اور حقیقت کو جذبہ احساس کی نیرنگی میں سمو کر پیش کرتا ہے۔ وہاں خود ادیب کے ذہنی افق، افتادِ طبع کردار و شخصیت، تجربات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ اس میں خود ادیب کے جذبہ و فکر کے ......نشیب و فراز بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اچھے اور عمدہ ادب کی تخلیق میں ادیب کی شخصیت کی اچھائی عمدگی اور نفاست بھی شامل ہوتی ہے۔ ادیب کی وسعتِ نظر اور خیال و فکر کا پھیلاؤ ادب میں اثر آفرینی کے دائرے کو وسیع تر کر دیتا ہے اور اس کی سرحدیں آفاقیت سے جاملتی ہیں۔[۱۴۳]

عبدالحلیم شرر نے سوانحی مضامین میں شخصیات کی صفات کے ساتھ ساتھ ان کی خامیاں بھی دکھائی ہیں۔ ان کے مضامین میں کردار و افکار دونوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے، شرر کے ان سوانحی مضامین کا اسلوب اتنا شگفتہ اور ہلکا پھلکا ہے کہ قاری کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہے اور مضمون کے مطالعے کے بعد اس شخصیت، سیرت، مزاج و ذہن کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتی ہے۔ شرر نے اپنے سوانحی مضامین میں شخصیت کے بنیادی مزاج، اس کی افتادِ طبع، اندازِ فکر و عمل اور اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے مضامین میں اختصار اور جامعیت کا بنیادی وصف موجود ہے۔ شرر نے اپنے مضامین میں شخصیت کے تفصیلی حالات و واقعات یا اس کے کارناموں اور فتوحات وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ مختصر تذکرے سے شخصیت کا کوئی نہ کوئی خاص پہلو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس شخص کی شخصی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں سے بھی قاری کو آگاہ کیا ہے۔ شرر کا بے ساختہ اور شگفتہ قلم نکتہ آفرینیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ سوانحی مضامین کے لیے قدرتِ بیان کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کا گہرا مشاہدہ اور زندگی کے متنوع پہلوؤں کا وسیع مطالعہ اشد ضروری ہے۔ اس اعتبار سے سوانحی مضمون نگاری آسان نہیں۔ یہ اس پل صراط سے گزرنے کا مترادف ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔ اس کے کوئی اصول و ضوابط نہیں ہوتے۔ شرر کی سلیقہ مندی، فنی مہارت اور حسنِ ترتیب کے صحیح عکاس ان کے سیر نسواں اور سر رجال کے مضامین ہیں۔ ان مضامین کے اثرات ادب کے میدان میں بھی بڑے واضح، معین اور قطعی ہیں۔ ان مضامین نے نہ صرف قوم کی عام خدمت، تہذیب اور تربیت ہی کی بلکہ ان کی وجہ سے علم و ادب اور علم انشا کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ شرر نے ادب کو اس روش سے بچایا جس میں کوئی علمی و ادبی چاشنی نہیں تھی۔

شرر نے ادب کو پرانی چیزوں کے کھوکھلے پن سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین میں ادبی پہلو موجود ہے۔ ان میں بحث و تمحیص اور اخلاقیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شرر کے مضامین نے افسردہ دل قوم کے اندر زندہ دلی پیدا کی۔ شرر نے ثابت کر دیا ہے کہ زبان اردو میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی کے ساتھ سادگی سے ادا ہو سکتے

ہیں۔شرر کے ان مضامین سے صرف علم و ادب اور علم انشا ہی کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ اخلاق و عادات اور خصلت کو بھی بہت فروغ ملا۔شرر نے اپنے مضامین کے ذریعے سے قوم کو دکھایا ہے کہ مضامین لکھنے کا کیا طریقہ ہے؟ زبان اردو میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کچھ طاقت ہے۔عبدالحلیم شرر کے مضامین کئی قسم کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔

۱) کچھ ایسے ہیں جن میں اصلاح معاشرت کی بحث ہے۔یہاں شرر سوشل ریفارمر، مصلح معاشرت کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

۲) زیادہ تر مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق تاریخ سے ہے۔یہاں شرر ایک تاریخ دان کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

۳) کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جن میں شرر ایک ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ان مضامین کے موضوعات بھی متفرق ہیں۔

۴) بعض مضامین ایسے ہیں جن میں تحقیقی پہلو موجود ہے اور بعض مضامین شاعرانہ و عاشقانہ نوعیت کے ہیں۔

شرر کے ان مضامین کے مطالعے سے شرر کی کئی ایک حیثیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔مثلاً مصلح قوم، مذہبی شخصیت، مورخ، ادیب و انشا پرداز، مقالہ نگار۔شرر کے بعض مضامین بہت لمبے ہیں اور بعض مختصر، لیکن ہر ایک مضمون میں دلچسپی و شگفتگی کا عنصر موجود ہے۔مواد کی تنظیم اور تسلسل بھی موجود ہے۔انداز بیان عام فہم ہے اور شرر کا خاص اسلوب ہر ایک مضمون میں موجود ہے۔

مضامین کے علاوہ بہت کچھ شرر نے لکھا ہے اگر وہ صرف مضمون نگاری پر ہی توجہ دیتے تو آج ان کا مقام و مرتبہ اس میدان میں کچھ اور ہوتا۔شرر کی ایک عادت متفرق نویسی بھی تھی۔ورنہ ان میں قابلیت، مضمون نگاری کی بہت زیادہ تھی۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر لکھنے کا خاص میلان بھی شرر رکھتے تھے۔ایک مضمون نگار جزویت کو معمولی معمولی باتوں کو بھی دلچسپی سے دیکھتا ہے۔شرر میں بھی یہ صلاحیت موجود تھی۔وہ معمولی معمولی باتوں پر لکھنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔زیرکی اور دانش کا سبق ان کے مضامین میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

شرر کی تحریر سلیس اور بے تکلف ہے۔ان کا انداز بیان ہر طرح کی بناوٹ و تصنع سے پاک ہے۔یہ چیز ان کی تحریر میں دلچسپی کا عنصر پیدا کر دیتی ہے۔شرر کے مضامین میں مقصدیت تلقینی اور ترغیبی انداز موجود ہے۔شرر نے سرسید احمد خان کی طرح اپنی قوم کی معاشرتی، اخلاقی اور مجلسی ضابطہ زندگی کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔شرر ادیب پہلے او

مصلح بعد میں تھے۔شرر کے مضامین میں تخیل کی کارفرمائی بھی موجود ہے۔مصورانہ اور تمثیلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ رمانویت،منظر نگاری وغیرہ کے جوہر بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔شرر نے اپنی نثر سے اردو میں اسلوب نثر کا ایک نیا دور شروع کیا۔پرانے طرز کا اسلوب جس میں تصنع اور بناوٹ ہوتی تھی۔شرر کے ہاں بہت کم یہ رنگ دکھائی دیتا ہے۔

پرانے لکھنے والے اکثر تصنع اور بناوٹ سے کام لیتے ہیں۔وہ بات کو صاف صاف اور سادہ زبان میں کہنے کے بجائے آراستہ وپیراستہ زبان میں ادا کرتے ہیں۔ان کے یہاں تخیل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بنی بنائی ترکیبیں،مشتبا یہ جملے اور فقرے پائے جاتے ہیں۔عبدالحلیم شرر کے عہد تک یہ اندازِ نثر نگاری کافی حد تک تبدیل ہو گیا تھا۔فورٹ ولیم کالج،مرزا غالب،سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے یہ اندازِ بیان تبدیل ہوا تھا۔شرر نے بھی پرانے اندازِ نثر نگاری کو ترک کر کے وہ نثر لکھی جو کہ عام فہم،دلکش،شگفتہ اور دلچسپ ہو،جو قاری کے مزاج کے مطابق ہو اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے۔انہوں نے وہ اندازِ بیان اختیار کیا جو سننے والے کی سمجھ میں فوراً آجائے اور جو کچھ مضمون میں بیان کیا پورے خلوص وسچائی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جو کچھ ان کے دل میں تھا وہی زبان وقلم سے کاغذ پر منعکس کر دیا۔شرر اپنے مضامین میں مدعا نگاری اور مطلب نویسی کے علمبردار دکھائی دیتے ہیں۔شرر ادب کو ابلاغ کا ذریعہ اظہار سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وہ اندازِ بیان اختیار کیا جو سب کی سمجھ میں آسکے۔شرر کے ہاں ادب کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے اس کا تعلق بنی نوع انسان سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ادب کو رابطہ پیدا کرنا،اپنی بات پہنچانا اور دوسرے کی بات سمجھنا قرار دیتے ہیں۔

شرر کا ہر مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جذبے کے تحت لکھ رہے ہیں۔ان کے پیش نظر کوئی ذاتی غرض مندی ہے نہ انہیں کسی سے ذاتی بغض وعناد اور ذاتی رنجش ہے۔ان کی تحریر کو دیکھ کر سچائی اور خلوص کو ہم محسوس کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی تحریر میں مقصدیت کی عظمت بھی پائی جاتی ہے۔

د: انشائیہ آغاز وارتقاء

انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جو ہمیشہ مضمون کی شکل میں لکھی جاتی ہے لیکن وہ مضمون سے مختلف ہوتی ہے۔مضمون یا مقالہ سنجیدہ تحریر کی حیثیت رکھتا ہے اور انشائیہ ایک ہلکا پھلکا مضمون ہوتا ہے۔مضمون اور مقالے کا مقصد کسی مسئلے کی وضاحت یا کسی موضوع سے متعلق ضروری باتیں قارئین تک پہنچانا ہوتا ہے۔جبکہ انشائیے کا مقصد پڑھنے والوں کے لیے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانا ہے۔انشائیہ کچھ سکھانے کی خاطر نہیں لکھا جاتا۔یہ ممکن ہے کہ پڑھنے والا انشائیے سے بھی سیکھ لے۔مضمون اور مقالے میں لکھنے والے کا لب ولہجہ سنجیدہ ہوتا ہے۔اس کے برعکس انشائیہ نگار بے تکلفی سے اپنے قارئین سے بات چیت کرتا ہے۔کہیں شوخی، کہیں ظرافت اور کہیں طنز کے پیرائے میں لکھتا ہے۔انشائیہ نگار کا مقصد نہ تو لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے اور نہ ان کو اپنا ہم خیال بنانا ہوتا ہے۔مضمون یا مقالے میں لکھنے والا اپنی علمیت اور اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار کرتا ہے۔انشائیے میں انشائیہ نگار زیادہ تر اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کرتا ہے اور وہ یہ خیال نہیں کرتا کہ دنیا والوں کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟مضمون یا مقالے میں اصل اہمیت موضوع کی ہوتی ہے۔انشائیے میں اصل اہمیت لکھنے والے کی ذات کی ہوتی ہے۔مضمون نگار موضوع کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔انشائیہ نگار اپنی ذات کی تہوں کو کھولتا ہے اور وہ اپنی حماقتیں اور کمزوریاں بھی بیان کر دیتا ہے۔محمد ارشاد کا کہنا ہے:

> پرسنل ایسے (انشائیہ) اس ایسے (مضمون) کو کہا جاتا ہے جو پرسنل (شخصی) کی صفت سے متصف ہو۔جس طرح عربی گھوڑا گھوڑا ہی ہوتا ہے۔لیکن بعض مخصوص اوصاف کی بنا پر جو صرف عربی گھوڑے میں موجود ہیں گھوڑوں کی دیگر انواع سے ممیّز کیا جاتا ہے۔لیکن ان مخصوص اوصاف کی بنا پر گھوڑوں کی جنس سے خارج نہیں ہو جاتا۔اسی طرح پرسنل ایسے (انشائیہ) نوع ہے جسے پرسنل ہونے کی صفت سے متصف ہونے کی بنا پر ایسے مضمون کی دیگر انواع سے ممیّز کیا جاتا ہے۔لیکن اس صفت کی بنا پر وہ اپنی جنس (مضمون) سے خارج نہیں ہو جاتا۔ہر انشائیہ مضمون ہی ہوتا ہے۔اس طرح جس طرح عربی گھوڑا گھوڑا ہی ہوتا ہے۔[۱۴۴]

محمد ارشاد کی اس تعریف کے بارے میں ڈاکٹر شیر سیفی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں کہ: ''محمد ارشاد کی یہ بات درست ہے کہ انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر مضمون انشائیہ ہوتا ہے۔''[۱۴۵]

جمیل آزر کا کہنا ہے: ''انشائیہ انگریزی کے ان مضامین کا مرہون منت ہے جو پرسنل ایسز Personal

Essay کہلاتے ہیں۔"۱۴۶ مشکور حسین یاد لکھتے ہیں:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صنف ادب تو تمام نثری اصناف ادب کی ماں ہے۔میرا خیال ہے ہر زبان کی نثر کا اسی صنف سے آغاز ہوتا ہے۔کہانی، افسانہ، ناول، داستان، مقالہ، مضمون سبھی اصناف ادب انشائیہ کے بعد وجود میں آئی ہیں۔اس کی وجہ ظاہر ہے لکھنے والے کے ذہن میں انشائیہ لکھتے وقت کوئی صنف ادب پیش نظر نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر میں صنف انشائیہ کو ادب کی امکانی صنف کا نام دیا کرتا ہوں۔میرے خیال میں آئندہ بھی اگر کوئی صنف ادب وجود میں آئی تو وہ انشائیہ کے بطن سے وجود میں آئے گی۔۱۴۷

مشکور حسین یاد تو تمام اصناف کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ انشائیہ سے جنم لیتی ہیں۔ بقول شہزاد قیصر: "انشائیہ کی تعریف میں اس قدر مصائب ہیں کہ مشکل کشائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"۱۴۸ انشائیہ کی محفل بزم بے تکلف کے مترادف ہے۔اس کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔یہ وہ بزم بے تکلف ہے جہاں انسان اپنے دل کی بات مزے لے لے کر بیان کرنے کی جسارت کرسکتا ہے۔اس بزم میں یہ پابندی نہیں ہے کہ یہ بات کہی جائے اور یہ نہ کہی جائے۔انشائیہ کسی موضوع پر لکھاری کے ذہن اور کردار کا کھیل ہے جس کا مقصد قاری کو خوش کرنا اور تفریح بہم پہنچانا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں: "انشائیہ انسان اور انسان کے متعلقات سے بحث کرتا ہے۔اس لیے اس میں زندگی کے سارے ہی پہلو سمٹ آتے ہیں۔بطور صنف اس میں بڑا تنوع ہے۔"۱۴۹ بقول سلام سندیلوی:

انشائیہ کی سرحد مقرر کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہ موضوع مقصد اور اسلوب کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔اس میں مختلف قسم کے موضوعات داخل ہو گئے ہیں۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع کو منتخب کرسکتا ہے۔۱۵۰

درج بالا اقتباسات سے ثابت ہوا کہ انشائیہ کے لیے موضوع کی قید نہیں ہے۔یہ نثر کا وہ ٹکڑا ہے جس میں ادیب کسی بھی موضوع پر لکھ سکتا ہے۔اس کے موضوع بے شمار ہیں۔اس کا مقصد قاری کو خوش کرنا اور تفریح بہم پہنچانا ہے۔اس کا اسلوب سہل و سلیس ہونا چاہیے۔بطور صنف اس میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔اپنے موضوع، مقصد اور اسلوب کی بنا پر یہ بہت وسیع صنف نثر ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی انشائیے کی ہیئت کے بارے میں لکھتے ہیں:

انشائیے، افسانے، ڈرامے اور دیگر فنی صورتوں میں بھی لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جاتے رہے ہیں اور ان کا رشتہ کبھی ناول سے کبھی ڈرامے سے کبھی افسانے سے جا ملتا ہے۔انشائیے کی

اپنی خارجی شکل نہیں ہے ۔وہ یہ فارم دوسرے اصناف سے حاصل کرتا ہے ۔[۱۵۱]

ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی ''دوسرا کنارا'' میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ''انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے لازمی طور پر مضمون ہی کے اسلوب میں لکھا جائے۔''[۱۵۲] یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ شاید انشائیہ کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں حالانکہ ایسا نہیں ۔بعض اوقات انشائیہ میں کہانی کا عنصر آجاتا ہے مگر انشائیہ کہانی نہیں بننے پاتا ۔گاہے انشائیہ نگار مکالمے سے استفادہ کرتا ہے جس سے انشائیہ ڈرامہ کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے لیکن ڈرامہ نہیں بنتا۔کبھی انشائیہ نگار، سفر نامہ اور رپورتاژ کی تکنیک سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کبھی طنز ومزاح سے کام لیتا ہے ۔لیکن نہ تو انشائیہ کو سفر نامہ یا رپورتاژ بننے دیتا ہے اور نہ اسے طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں تبدیل ہونے دیتا ہے ۔کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بعض اوقات اس میں دیگر اصناف کا عکس نظر آتا ہے ۔ورنہ انشائیہ مختلف اصناف کی تکنیک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی اپنا ایک داخلی مزاج اور خارجی ہیئت رکھتا ہے ۔اردو میں انشائیے عموماً مضمون کی ہیئت میں لکھے جاتے رہے ہیں ۔تاہم اسے مضمون کے مترادف نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ مضمون ایک مخصوص ترتیب اور توازن کا حامل ہوتا ہے ۔انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ اس میں اختصار پایا جاتا ہے ۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بہت ہی مختصر سا ہو ۔یہ دو چار صفحات پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے اور زیادہ پر بھی ۔اس کا انحصار موضوع اور انشائیہ نگار کے علم مشاہدہ اور تجربات پر ہے ۔بعض دفعہ انشائیہ نگار دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے انشائیے میں طنز ومزاح سے بھی کام لیتا ہے ۔انشائیہ میں طنز ومزاح کا داخلہ ممنوع نہیں ہے ۔جہاں انشائیہ نگار کی مرضی پر منحصر ہے کہ آیا وہ طنز ومزاح سے کام لیتا ہے یا نہیں ۔اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگر انشائیہ نگار طنز سے کام لیتا ہے تو اس کی نشتریت کسی کی دل آزادی کا باعث نہ بنے اور اگر انشائیہ نگار مزاح سے کام لیتا ہے تو اس میں تہذیب وشائستگی کا پہلو نہ چھوڑے ۔ڈاکٹر بشیر سیفی کے خیال میں: ''انشائیہ کا مقصد نہ کسی کی دل آزادی ہے اور نہ کسی کا مضحکہ اڑانا۔''[۱۵۳] ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے:

> ایک اچھے انشائیہ میں طنز بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ محض ایک سہارے کا کام دیتی ہے ۔اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا کیونکہ مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے ۔[۱۵۴]

انشائیہ کی پہچان کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعے کے بعد کتاب کو چند لمحوں کے لیے بند کر دیں گے اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود ہی

سوچتے اور محفوظ ہوتے چلے جائیں گے۔[۱۵۵]

سلیم اختر انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> انشائیہ دراصل مہذب ذہن کی ترجمانی کا نام ہے۔ اسے مہذب معاشرے میں لکھا جا سکتا ہے اور اس سے مہذب قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ جملہ اصناف ادب سے ہر ذہنی سطح کا قاری بقدر ہمت اوست لطف اندوزی کی اہلیت رکھتا ہے لیکن انشائیہ ہر ذہن کے لیے نہیں ہے۔[۱۵۶]

انشائیہ نگار موضوع کے بارے میں ٹھوس، سنجیدہ اور عالمانہ انداز بیان اختیار کرنے کے بجائے ہلکے پھلکے انداز کو اپناتا ہے۔ انشائیہ نگار تکلف تصنع کی بجائے بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اپنے تاثرات کو بیان کرتا ہے۔ انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں انشائیہ نگار شگفتہ انداز میں اپنا ماضی الضمیر قاری تک پہنچاتا ہے۔ وہ بعض اوقات طنز ومزاح سے بھی کام لیتا ہے۔ انشائیہ نگار ہونے کے لیے صاحب طرز نثر نگار ہونا ضروری ہے۔ انشائیہ نگار زندگی کا نقاد اور مبصر بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے انشائیہ کے ذریعے سے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے۔ اس کا مقصد فوری اصلاح نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کے ذریعے کسی مشن کی تبلیغ کا کام کرتا ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل کو بے نقاب کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ انشائیہ نگار نے زندگی کو جس طرح برتا اور جس رنگ میں دیکھا ہے، اسے وہ اپنی تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ وہ اختصار سے کام لیتا ہے لیکن اس اختصار میں بھی جامعیت ہوتی ہے۔ وہ نہ تو بات کو پھیلاتا ہے اور نہ ہی لفظوں کو چباتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی بات کو بغیر صناعی کے مختصر بیان کر دیتا ہے۔ انشائیہ نہ تو مزاحیہ مضمون ہے نہ افسانہ اور مقالہ ہے، اس میں پلاٹ نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار آغاز سے اختتام تک خود بھی بے خبر ہوتا ہے یہ وہ صنف ادب ہے جس میں منطق کا غلبہ نہیں، جس میں تبلیغ و اصلاح کا نظریہ نہیں ہے۔ جس میں موضوع کی قید نہیں ہے۔ انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی قوت مشاہدہ تیز ہو۔ الفاظ کو نئے معنی میں پرونے کے فن سے واقف ہو۔ غزل کے بنیادی عناصر انشائیہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انشائیہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ انشائیہ کے بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔ انشائیہ نگار افسانہ نگار کی طرح افسانوی ڈھانچہ نہیں بناتا۔ اس میں پلاٹ اور کردار بھی نہیں ہوتے۔ اس کے لیے درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ اختصار، غیر رسمی، اسلوب کی شگفتگی، عدم تکمیل کا احساس اور شخصی نقطہ نظر ان اجزاء سے مل کر جو فن پارہ تکمیل پائے گا وہ انشائیہ کہلائے گا۔

انشائیہ کے بڑے بڑے ناقدین نے اردو ادب میں انشائیہ کی موجودگی اور انشائیہ نگاری کے رجحان کی

نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو ادب کے ابتدائی دور سے ہی انشائیہ نگاری کا رجحان غالب تھا۔ کسی نے انشائیہ نگاری کی روایت کی ابتداء ملا وجی سے کی ہے اور کسی نے سرسید سے اور کسی نے سجاد حیدر یلدرم سے: ڈاکٹر انور سدید ''انشائیہ اردو ادب میں'' لکھتے ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کے کچھ ابتدائی نقوش بکھری ہوئی حالت میں قدیم اردو نثر میں بھی مل جاتے ہیں۔''[۱۵۷]

لطیف ساحل لکھتے ہیں:

> ''سب رس'' بنیادی طور پر داستان کی کتاب ہے لیکن مصنف اپنی علمی، فکری اور صوفیانہ اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے جا بجا انشائیے لکھتا چلا جاتا ہے۔ جن کا بنیادی داستان سے بظاہر کوئی مربوط تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان انشائیوں کو ''مضامین وجی'' قرار دیا ہے۔[۱۵۸]

سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے اگرچہ اصلاحی نقطۂ نظر سے نثر لکھی۔ لیکن ان کے ہاں بھی انشائیے کی صنف نظر آتی ہے۔ لطیف ساحل ''اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش'' میں لکھتے ہیں:

> سرسید اور ان کے رفقاء کو جہاں ادب کا ایک معتبر تاریخی حوالہ تسلیم کیا جاتا ہے وہاں انشائیہ نگاری کے سلسلے میں بھی ان کی خدمات کچھ کم نہیں ہیں۔ اس وقت ان کے لکھے ہوئے مکمل مضامین کی تفصیل میں جانا کچھ درست معلوم نہیں ہوتا تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سرسید، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور خواجہ الطاف حسین حالی کی تحریروں میں انشائیے بخوبی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ سرسید رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' اردو ادب میں انشائی تحریک کا ایک روشن باب ثابت ہوا۔[۱۵۹]

سرسید، میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ نے انشائیے لکھے ہیں۔ یوسف جمال انصاری ''نقوش''، ''آپ بیتی نمبر'' کے ص ۱۷ پر لکھتے ہیں:

> اردو میں انشائیہ بھی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں وجود میں آیا۔ اس کی مناسب ترقی گو کہ ہمارے زمانے میں ہوئی ہے۔ عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی اور دوسرے اکابر نے اردو انشائیہ کو ترقی دے کر اسے دوسری زبانوں کے بہترین انشا پرداز کے شاہکاروں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔[۱۶۰]

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو ادب میں انشائیہ نگاری نے جنم لیا۔عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، سرسید احمد خان، مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسن آزاد، مولانا حالی، شبلی اور دیگر اکابرین نے اس صنف نثر کو ترقی دی۔اطہر پرویز اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> اردو میں کئی اچھے انشائیہ پرداز ہوئے ہیں جن میں شرر، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، پطرس کپور وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ ان میں زیادہ تر مزاح نگار اور طنز نگار ہیں۔لیکن ان سب کے یہاں انشائیہ کا عنصر نمایاں ہے اور اس کے بل بوتے پر نئے انشائیہ کی تعمیر ہو سکتی ہے۔[۱۶۱]

عبدالحلیم شرر کے دور میں انشائیہ نگاری نے ترقی کے مراحل طے کرنے شروع کر دیئے تھے۔اسی دور میں بعض دیگر رسائل میں انشائیے چھپتے تھے۔مثلاً ابوظفر کا انشائیہ ''کشمیری میگزین'' نے شائع کیا تھا۔اسی دور میں میاں عبدالعزیز، سجاد انصاری اور فرحت اللہ بیگ کے متعدد انشائیے بھی شائع ہوئے۔یوں انشائیہ نگاری کی ابتداء ہوئی اور آج اسے جدید صنف ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔عبدالحلیم شرر کے عہد میں محمد حسین آزاد، مولوی ذکا اللہ دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، میر ناصر علی دہلوی، خواجہ حسن نظامی، مولوی احمد دین، مولوی عزیز مرزا، سجاد حیدر یلدرم، سر شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اکرام، عبدالرشید چشتی، شیدا دہلوی، سلطان حیدر جوش، مرزا سلطان امرتسری، سید سرفراز حسین، ابوالبیانی، رضا صدیقی الہ آبادی، تاجور نجیب آبادی، ابوظفر، مولوی محمود الرب، خالد بنگالی، بطور انشائیہ نگار ابھرے اور کئی انشائیے لکھے۔سلیم آغا قزلباش رقمطراز ہیں:

> کہنے کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو انشائیہ نے مغرب کی انشائیہ کی سیکی سے جنم لیا ہے۔مگر اب بفضل خدا یہ بالغ اور باشعور ہو چکا ہے۔اس نے مغرب کے پرنسل ایسے کے تمام مثبت پہلوؤں کو خود میں سمونے کے بعد اب اس میں اپنی زمین ماحول اور روایت کے عناصر کو بھی شامل کر لیا ہے اور یوں اس کی رگوں میں تازہ خون شامل ہو گیا ہے۔[۱۶۲]

اگرچہ اردو انشائیہ کی صنف مضمون نگاری کی صنف کی طرح مغرب سے آئی ہے اور عبدالحلیم شرر کے عہد تک کئی ایک انشائیہ نگار ابھرے جنھوں نے اردو ادب کی اس صنف کو ترقی دی اور اپنی سرزمین، ماحول اور روایت کے عناصر کو اس صنف میں شامل کیا۔مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری الگ الگ صنف نثر ہیں۔انشائیہ کی روایت و ارتقاء کی اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ یہ ایسے یا مضمون کی ایک ارتقائی شکل ہے۔لیکن یہ صنف اپنا منفرد اسلوب بھی رکھتی ہے۔جس کی وجہ سے انشائیہ کو ایک علیحدہ صنف ادب کا درجہ حاصل ہے اور یہ کہ انشائیہ میں کسی

بھی موضوع پر فکری اور تخلیقی کوشش کا رجحان غالب ہوتا ہے۔انشائیہ میں موضوع کے مختلف پہلوؤں کو ممکنہ زاویوں سے دیکھنے کی غیر رسمی سعی بھی کی جاتی ہے۔یہ دو باتیں انشائیہ کی پہچان میں آسانی کا باعث بنتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> کچھ محققین نے اس کا سراغ پرانی نثر میں لگایا ہےتو وہ اس حد تک حق بجانب ہیں کہ انہوں نے ان تحریروں میں انشائیہ کی بعض اساسی خصوصیات کو منتشر حالت میں پایا ہے۔مثال کے طور پر میر امن کے اسلوب میں جو روح پرور شگفتگی ملتی ہے وہ انشائیہ کے مزاج کے ایک غالب عنصر سے مماثل ہے۔مرزا غالب کے خطوط کا غیر رسمی انداز انشائیہ کی بنیادی صفات میں سے ہے۔سرسید نے واضح طور پر سپکٹیٹر اور ٹیٹلر کو مثال بنایا اور بعض ایسے موضوعات پر اظہار خیال کیا جنہیں اس زمانے کا قاری یقیناً انوکھا تصور کرتا ہوگا۔موضوع کا انوکھا پن انشائیہ کا لازمی جزو ہے۔ اس قسم کے کچھ عناصر عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی حتیٰ کہ مولانا الطاف حسین حالی، پریم چند، نیاز فتح پوری، خلیق دہلوی اور راشد الخیری کی بعض تحریروں میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔لیکن جس طرح ان سب کی نثر کے انفرادی اوصاف مجتمع کرنے سے صنف انشائیہ کا مزاج مرتب نہیں ہوسکتا اسی طرح اس صنف کی کسی ایک روشن کرن کی موجودگی کی بدولت ان میں سے کسی ادیب کو انشائیہ نگار بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔[۱۶۳]

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> نریندر رام جوہر نے شرر کو انشائیہ نگار تسلیم کر کے وزیر آغا کے اس دعویٰ کی قلعی کھول دی کہ میں انشائیہ کی اصطلاح اور صنف کا موجد ہوں بلکہ اس دعویٰ کی عملی تکذیب جوہر نے یوں کر دی ہے: ناول نویس شرر کے پردے میں ایک عظیم انشائیہ پرداز بھی چھپا ہوا ہے۔جس کے قلم میں ناول کی رنگینی کلام کی شیرینی اور مضامین کی معنی آفرینی کے ساتھ انشائیے کا آزاد اسلوب بھی موجود ہے۔جدید اردو انشائیہ آج جس حالت میں ہے وہ دراصل نقش ثانی ہے۔نقش اول تو وہ انشائیے ہیں جو عہد سرسید میں لکھے گئے اور جس میں شرر کے انشائیہ اہم بھی ہیں اور ممتاز بھی۔[۱۶۴]

حفیظ الرحمٰن خان لکھتے ہیں:

ڈاکٹر وزیر آغا کا اصرار تھا (اور اب بھی ہے) کہ اردو ادب میں انشائیہ کی صنف بالکل نو وارد ہے۔ ......نظیر صدیقی کے نزدیک انشائیہ اتنی بھی کم صنف ادب نہیں بلکہ ان کے ابتدائی نقوش بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔سرسید کا مضمون ''امید کی خوشی'' اور اودھ کے قلمکاروں کی تحریریں اردو میں انشائیہ نگاری کے پیش رو ہیں۔بعد میں شرر، یلدرم، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمن، کرشن چندر، منٹو، ابراہیم جلیس، امجد حسین، وزیر آغا ان سب کے ہاں قابل قدر انشائیے ملتے ہیں۔[۱۶۵]

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے انشائیے بھی لکھے ہیں:

شرر کا محض ناولٹ کی حیثیت سے مشہور رہونا قدرت یا پڑھنے والوں کی ستم ظریفی ہے...... وہ بیک وقت ناول نگار، مورخ، انشائیہ نگار، نقاد، عالم، معلم، صحافی، ڈراما نگار، ماہر تعلیم اور سیاستدان سب کچھ تھے۔لیکن جن تین چیزوں نے انہیں امتیازی حیثیت دی وہ ان کے ناول، تاریخیں اور انشائیے ہیں۔[۱۶۶]

ہ:عبدالحلیم شرر بطور انشائیہ نگار

اردو ادب میں عبدالحلیم شرر کی پہچان کا سبب تاریخی ناول نگاری ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبدالحلیم شرر نے انشائیے بھی لکھے۔لطیف ساحل شرر کے انشائیوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان کے مضامین کو موضوعات کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ...... ان حصوں میں ''شاعرانہ و عاشقانہ'' موضوعات کا حصہ درحقیقت انشائیوں سے متعلقہ حصہ ہے۔ایسے مضامین لکھتے ہوئے شرر کو اندازہ تھا کہ وہ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کوئی نئی چیز تخلیق کر رہے ہیں ......[۱۶۷]

ڈاکٹر سید شاہ علی مضامین شرر کی جلدوں میں انشائیوں کے پہلوؤں پر اظہار خیال ظاہر کرتے ہوئے ہر ایک جلد کو انشائیہ کی ذیل میں پیش کرتے ہوئے۔لکھتے ہیں:

> تاریخی وجغرافی انشائیوں میں شرر نے مختلف ملکوں،شہروں،قوموں،فرقوں،عمارتوں،دیو مالا، اسلامی تاریخ کے جزوی واقعوں، سفرناموں وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے اور بعض تراجم شامل کیے ہیں۔
>
> تاریخی وجغرافی انشائیوں کے دوسرے مجموعہ میں بھی حسب معمول موضوعات اور مواد میں تنوع اور وسعت موجود ہو۔اس مجموعہ میں شامل کردہ انشائیوں میں بعض ایسے ہیں جن کا تعلق تاریخ اور جغرافیہ کے مقابلے میں دوسرے عنوانات سے زیادہ ہے۔'' تاریخی واقعات پر خیال آرائی سے متعلق انشائیوں میں بلحاظ موضوع طرز بیان بعض بہت عمدہ ہیں ان میں اموی، عباسی، ہندوستانی، رومی، یونانی اور دیگر عربی و اسلامی تاریخوں سے مواد لیا گیا ہے اور مختلف ومتنوع موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔
>
> بعض بہترین انشائیے یہ ہیں
>
> (۱)وفائے عہد۔(۲) ایک چھوٹے ذرے کی سرگزشت۔(۳) ایثار نفس۔(۴) جاہلیت کا شجاعانہ عشق۔(۵) ایک کمسن بدویہ کی فصاحت و طباعی۔(۶) خلفائے بنی امیہ کا ادبی مذاق۔(۷) بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مراد (جہاں آرا بیگم کے مزار کا ذکر۔)

سیر رجال سے متعلق انشائیوں میں بھی شرر نے سیر نسواں کی طرح بعض مشہور و مقتدر ہستیوں کے حالات بیان کیے ہیں اور اردو ادب اور انشائیے کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔[۱۶۸]

اردو انشائیہ میں شرر کا رول کافی دقیع ہے۔ انہوں نے تقریباً ایک ہزار انشائیے سپرد قلم کیے ہیں۔ ان کے اودھ پنچ اور دیگر پرچوں کے ابتدائی دور کے انشائیوں، اودھ اخبار کے ادارتی بورڈ کے زمانے کی تحریروں اور ''محشر'' ''مہذب'' اور ''پردہ عصمت'' کے مضامین سے قطع نظر صرف دلگداز کے انشائیے مختلف عنوانات کے تحت کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان انشائیوں میں علمی، ادبی، تخلیقی، تاریخی، جغرافیائی، تنقیدی، مذہبی، سوانحی وغیرہ شامل ہیں۔

بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:

> رسالہ دلگداز کی اردو ادب میں صنف ناول سے زیادہ انشائیہ کے علمبردار کی حیثیت سے بڑی اہمیت ہے۔ سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں میں بیداری کا صور پھونکا۔ اودھ پنچ نے لندن پنچ کی طرز پر طنز و مزاح اور ظرافت کی چاشنی پیدا کی۔ اودھ اخبار نے بھی اس کے حریف مقابل کے طور پر کافی ترقی کی لیکن دلگداز نے اردو دانوں میں تاریخ خصوصاً اسلامی تاریخ، فلسفیانہ اور شاعرانہ خیال آرائی اور ایک اچھوتے ادبی ذوق سے لگاؤ پیدا کیا۔[۱۶۹]

شرر کی مضمون نگاری کی طرح انشائیوں کی ابتداء بھی ''اودھ پنچ''، ''اودھ اخبار'' اور دیگر پرچوں میں انشائیے لکھنے سے ہوئی۔ دلگداز کے انشائیوں میں بیشتر تاریخی، جغرافیائی، سوانحی، ساجی اور تخلیقی ہیں اور یہ کہنا درست ہے کہ یہ ان کی ناول نگاری کی ضمنی پیداوار بھی ہیں۔ ان کے انشائیوں کی وہ جلد جو تاریخی وجغرائی ہے۔ اس میں رشر نے مختلف ملکوں، شہروں، قوموں، عمارتوں، فرقوں، اسلامی تاریخ، دیو مالا اور سفر ناموں پر طبع آزمائی کی ہے۔ دمشق کے عنوان سے شرر نے جو انشائیہ لکھا ہے۔ اس کا ایک اقتباس بطور نمونہ درج ہے:

> اگر شگفتہ پھولوں پر نظر ڈالیے تو گویا دمشق کے دوش پر ہفت رنگ ملے پڑے ہوئے ہیں اور اگر اس کے باغوں کی نفاست اور تازگی کو دیکھئے تو جابجا سندسی حلون کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس کی سنگین چٹانیں گزرنے والوں کو پکار کے کہتی ہیں کہ آیئے دیکھئے کہ کیسا خوشگوار شریں پانی ہے، دمشق کے لیے بڑا مایہ ناز یہ بھی ہے کہ ایزد ذوالجلال نے اس کی ایک بلندی کو حضرت مسیح اور مریم بتول کے لیے قرارگاہ بنایا۔ باغ ایسا حلقہ کیے ہوئے ہیں جیسے ماہ کو ہالہ، اس کے مشرقی

جانب ایک نہایت وسیع میدان حدنظر تک سبز رنگ ہے۔جس طرف نگاہ گردش کرتی ہے اس میدان کی سبزی نگاہ کے لیے زنجیر پا ہو جاتی ہے۔ بیشک لوگوں کا یہ قول سراپا صداقت ہے کہ ''اگر فردوس روئے زمین پر ہے تو وہ خطہ دمشق ہے''۔[۱۷۰]

دمشق ہی کے عنوان سے شرر نے ایک اور انشائیہ بھی تحریر کیا ہے۔ پہلے میں انہوں نے اس شہر کے حالات قلمبند کیے ہیں اور دوسرے میں اس شہر کے دلچسپ حالات و واقعات ناظرین کے سامنے پیش کیے ہیں۔''دہلی مرحوم'' کے نام سے بھی آپ نے ایک مضمون لکھا ہے۔جس میں انشائیے کے چند پہلو موجود ہیں۔اس میں آپ نے ''آثار الصناوید'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا انہیں افسوس ہے کہ دہلی کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں ہے۔اپنے اس انشائیے میں لکھتے ہیں:

> ہندوستان کا قدیم دارالخلافت دہلی ایک ایسا شہر ہے جس کی تاریخ کی طرف توجہ کی جائے تو ہمیں بہ نسبت دیگر مقامات کے یہاں زیادہ دلچسپی کے سامان نظر آئیں۔ افسوس اس شہر کی تاریخ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔جس طرح حافظ ابوالقاسم علی بن حسن عسکری نے شہر دمشق کی تاریخ اسی جلدوں میں لکھی تھی اور جس طرح ابو بکر خطیب بغدادی نے شہر بغداد کی تاریخ دس جلدوں میں لکھی تھی۔اسی طرح ضرورت تھی کہ قدمائے ہندوستان میں سے کوئی حوصلہ مند اور واقف کار عالم دہلی کی بھی ایک مکمل تاریخ لکھتا.....صرف ایک منفرد کوشش آنریبل سرسید احمد خان بہادر نے البتہ کی کہ اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں انہوں نے دہلی کی کل عمارتوں کا حال لکھا ہے۔[۱۷۱]

شرر نے ''دہلی اور اس کا اگلا دربار'' جس میں دہلی کے بارے میں معلومات کا خزانہ اپنے انداز سے شرر نے پیش کیا ہے۔''گرج یا چرکس'' کے نام سے انشائیہ بھی منفرد مقام کا حامل ہے۔اس میں شرر نے وہاں کے لوگوں کی معاشرت اور عورتوں کے حسن کو بیان کیا ہے۔انشائیہ گرج یا چرکس میں گرجستان کے لوگوں کی معاشرت اور ان کی عورتوں کے حسن کا بیان ہے۔اقتباس بطور نمونہ:

جس طرح ہمارے ہاں ہمالیہ کے کوہستان پر نیپال کا ملک واقع ہے اسی طرح کوہ قاف کے نشیب و فراز میں اور اس کی گھاٹیوں اور وادیوں کے اندر چرکس لوگوں کا ملک پھیلا ہوا ہے۔جسے ترک گرجستان اور انگریز کریشیا کہتے ہیں۔ یہاں کی عورتوں کا حسن و جمال مشہور ہے۔ ہر قوم کے سیاح ان نازک بدن ناز آفرینوں کی دلربا صورتیں دیکھ کے حیرت زدہ ہو گئے اور ابن بطوطہ کا سا عہد قدیم کا سیاح بھی بے اختیار ورد پڑھنے لگا۔لیکن اس امر سے لوگ کم واقف ہونگے کہ جیسی گرجستان

کی مہ طلعتیں حسین وجادو نگاہ اور دلربا ہیں ویسے ہی وہاں کے مرد شجاع اور اول درجے کے بہادر ہیں ۔[۱۷۲]

بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:

شرر نے اپنے جبرالٹر، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے سفر پر بھی انشائیے قلم بند کیے ہیں۔ جبرالٹر اور اٹلی کے ذکر میں جذباتیت کا مظاہرہ زیادہ ہے۔ ان میں کہیں کہیں شرر بچوں کی طرح مچلنے لگتے ہیں۔[۱۷۳]

جبرالٹر، اٹلی، سوئٹزرلینڈ کے اقتباس بطور نمونہ درج ہیں۔

مسلمانوں کی گذشتہ شان وشوکت کی یادگاروں اور خیر القرون کے قابل قدر تبرکات میں سے ایک یہ مقام بھی ہے جو بحیرہ روم کے پھاٹک پر آج بھی کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ مجھے بھی انگلستان سے واپس آتے وقت جب یہ خیال آیا کہ چند ساعت کے لیے ہمارا جہاز جبرالٹر پر ٹھہرے گا تو شوق نے ایک بے چینی کی انتظار کی صورت پیدا کر لی۔

(چند گھنٹے جبرالٹر میں، ص ۱۰۷)

یہاں کا حسن و جمال بھی یورپ کے دیگر مقامات سے بڑھا ہوا ہے۔ مردوں کا لباس تو قریب قریب سارے یورپ میں ایک ہو گیا ہے مگر عورتوں کی وضع میں کسی قدر فرق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اٹلی کی عورتوں کا لباس انگلستان سے زیادہ بانکا اور دلفریب ہے۔ وہاں کی ہر چیز میں ایک مشرقیت کی بو ہے۔ وہ حسن و جمال اور وہ نازوادا جسے مشرقی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں ان کا پتہ اٹلی میں ہر جگہ اور ہر چیز سے لگ سکتا ہے۔

(اٹلی کی مختصر سیر، ص ۱۲۰)

یورپ میں سوئٹزرلینڈ کو قریب قریب وہی حیثیت حاصل ہے جو ایشیا میں ہمالیہ اور کاکیزس مونٹین (کوہ قاف) کی وادیوں کو بلکہ بعض انگریزی سیاح تو دعویٰ کرتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کی نزہیت وشادابی اور یہاں کے شہروں کی خوشنمائی ونظر فریبی دنیا بھر کے ممالک سے بڑھی ہوئی ہے .... الغرض یہ اور ایسا روح افزا اور فرحت بخش ملک ہے جہاں ہم ملدان سے ریل پر سوار ہو کر اور اٹلی کی سرحد سے نکل کے پہنچے۔[۱۷۴]

اس مجموعہ انشائیہ میں دیگر منفرد اور اچھے انشائیے موجود ہیں۔ جن سے شرر کے وسیع مطالعہ اور وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں شرر نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کے لیے وجہ امتیاز ہے۔

تاریخی وجغرافی انشائیوں کا دوسرا مجموعہ جس کے انشائیے مختلف موضوعات پر ہیں اس مجموعے میں ہندوؤں مسلمانوں کے حالات، مسلمان اور عیسائی بادشاہوں کے حالات، خانقاہوں، گرجوں، مساجد کی تفصیلات، ہندوستان اور یورپ کے بانکول کی تفصیلات اور عبرت ناک واقعات جو تاریخ سے متعلق ہیں شرر نے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:

> جغرافی انشائیوں میں ملکوں، شہروں اور دیگر مقامات کا بیان ہے جن میں کوریا، ہندوستان قدیم، شہر واسط، مدینہ منورہ، دریائے نیل کا منبع، مسجد باصوفیہ، مقیاس نیل وغیرہ قابل ذکر ہیں اور شہر اسلامی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل کردہ انشائیوں میں بعض ایسے ہیں جن کا تعلق تاریخ اور جغرافیہ کے مقابلے میں دوسرے عنوانات سے زیادہ ہے۔ چنانچہ بعض معاشرتی معلوم ہوتے ہیں۔[۱۷۵]

تاریخی واقعات پر خیال آرائی سے متعلق جو انشائیے شرر نے لکھے ہیں ان میں شرر نے بعض وہ چیزیں بھی شامل کی ہیں جو اردو ادب میں نئی اور انوکھی ہیں۔ ان انشائیوں کے مطالعے سے مختلف ملکوں کی تاریخوں کے وسیع مطالعے کا بھی پتہ چلتا ہے اور کہیں کہیں انشائیے کے اختتام پر شرر قوم کی بے حسی اور ان کے تنزل اور حالات زار کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ سرسید احمد خان کے انشائیہ کا اثر بھی شرر پر کافی تھا۔ جو بیانات و واقعات عربی ماخذات سے لیے ہیں ان کی زبان دلاویز ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ بھی ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں بعض انشائیے ایسے ہیں جن کو بہترین انشائیوں میں شمار کیا ہیں۔ اقتباسات بطور نمونہ:

> عرب کی جرأت اور بہادری کے نمونے مورخین نے بہت دکھائے پھر بھی بعض ایسے واقعات ہیں جن کو سن کے اب بھی لوگ ایک نئے قسم کی حیرت پیدا ہو جائے گی۔ ان لوگوں میں دو باتیں قیامت کی تھیں۔ ایک شجاعت دوسرے وفاداری اور راست بازی جہاں خود شجاع تھے وہاں کسی دوسرے بہادر کی قدر دانی اور احسان مندی میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ اور افضل ثابت کر دیا ہے۔[۱۷۶]

> بے وفائی اور وعدہ کر کے بھول جانا چاہے شعرا کے مذہب میں کسی دلربا نازنین کے لیے جائز ہو۔ مگر حقیقت میں وفاداری ایک جوہر ہے اور اخلاق انسانی کی سب سے بڑھی

جڑھی۔صفت جس کے پاس یہ جوہرنہیں وہ انسانیت میں بہت ناقص ہے اوراس قابل نہیں کہ اخلاق وشائستگی کے دربار میں باریابی کی عزت دی جائے۔اس وصف کو اگر چہ ہر قوم والے مانتے ہیں اور اس کی ضرورت وخوبی کوتسلیم کرتے ہیں مگر بعض قوموں کے خصائص میں یہ صفت اس قدر عام ہے اور ایسی اہمیت کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ فلسفہ اخلاق پر بحث کرنے والے یہ رائے قائم کرتے جاتے ہیں کہ ایک خاص وضع اور خاص بناوٹ کے دماغ میں ہر چیز ہوتی ہے اور جن کے سر اس بناوٹ کے نہیں ہے۔ ان میں نہیں ہوتی عربوں کی تاریخ اور ان کی موجودہ حالت کا اگر لحاظ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ صفت ان میں کثرت سے اور اس قدر عام ہے کہ اور قوموں میں نہیں۔[۱۷۷]

(وفائے عہد۔ص ۱۰۱)

اپنا عجز اور اپنی بے حقیقی یاد آ تا تھی کہ خیال سب طرف سے پھر پھرا کے کروڑوں برسوں میل کی مسافت طے کر کے پھر اپنے اس کلیہ اجزا ان میں واپس آیا اور اپنی حقیقت دریافت کرنے میں مشغول ہوگیا مگر علم قدرت کے محافظ ذروں نے روکا اور ڈانٹ کے کہا۔"بس آگے قدم نہ بڑھانا،سب سے بڑا طلسم خود تیری نفس ہے۔جسے تو ہرگزنہیں سمجھ سکتا۔"[۱۷۸]

(ایک چھوٹے ذرے کی سرگزشت۔ص ۷۷)

سچی ترقی یافتہ قوم وہ ہے جس میں مذکورہ صفات یعنی باہمی انس ومحبت اور ہمدردی واتفاق کا جوش وجذبہ اعتدال کی حد سے تجاوز کر کے اس درجہ کو پہنچ جائے جیسے اپنا نفس کہتے ہیں۔ یعنی قوم اور وطن کی فلاح کے سامنے اپنی جان ومال کا خیال نہ رہے۔ بلکہ لوگ قومی مفاد پر شخصی فوائد ومنافع کے قربان کرنے کو تیار ہو جایا کریں۔ دنیا میں کسی قوم نے ترقی نہیں کی جب تک اس میں ہمدردی وایثارِ نفس کا جوش نہیں پیدا ہوا ہے۔[۱۷۹]

(ایثار نفس،ص ۱۰۷)

خالص عربی مذاق کو قائم رکھ کے جیسی شاندار و کروفر کے کرشمہ بنی امیہ کے خلفا نے دکھائے اور کوئی اسلامی سلطنت نہیں دکھا سکی ہے اور یہی سبب تھا کہ اصلی عربی لٹریچر اور ادبی علم وفضل کا جتنا بڑا مرکز مملکت ہسپانیہ بن گئی تھی بغداد کی عباسی خلافت بھی نہ تھی۔[۱۸۰]

(خلفائے بنی امیہ کا ادبی مذاق ۔ص ۱۸۵)

مامون رشید ایک دن دل بہلانے اور سیر وتفریح کے لیے اپنے قصر سے نکلا اور کھلی فضا کے شوق میں شہر اور آبادی سے باہر دور تک بڑھتا چلا گیا ۔صحرا میں جا رہا تھا کہ ایک کمسن بدویہ لڑکی دکھائی دی جس کے کندھے پر مشکیزہ تھا اور اس کے بوجھ سے دبی جاتی تھی ۔[۱۸۱]

(ایک کمسن بدویہ کی فصاحت وطباعی ۔ص ۲۷۵)

حقیقت یہ ہے کہ مضامین شرر کی جلد اول جو کہ شاعرانہ وعاشقانہ مضامین سے متعلق ہے اس میں انشائیے کے عناصر کی نشاندہی دیگر محققین نے بھی کی ہے اور انشائیے کے آغاز وارتقاء میں جلد اول کے حصہ اول اور حصہ دوم ہی کا ذکر ملتا ہے ۔ مضامین شرر کی دیگر جلدوں کا ذکر نہیں ملتا ۔ہم دیکھتے ہیں کہ ان انشائیوں میں شرر نے کن موضوعات پر بات کی ہے ؟ کون سا اسلوب اپنایا ہے ؟ اور ان میں کون کون سی خصوصیات پائی جاتی ہیں ؟ سب سے پہلے جلد اول کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔اس جلد میں کل ۸۳ مضامین شامل ہیں جن میں زیادہ تر انشائیے کی خصوصیات رکھتے ہیں ۔بقول ڈاکٹر سید شاہ علی:

شاعرانہ و عاشقانہ انشائیے دو جلدوں میں شائع کیے گئے ہیں ۔شرر کے ان انشائیوں میں خیال آرائی اور رنگینی بہت ہے اور خیالات ومعلومات کم ہیں ۔ان مجموعوں میں بعض ایسے تراجم بھی ہیں جیسے کالی داس کی ،موسموں کی یاد اور گولڈ سمتھ اور ایڈسن کے انشائیوں کے ترجمے یا چربے جن سے شرر کے انشائیوں کا مقابلہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا ۔ اول الذکر کے یہاں ایک طرف تخیل اور لازوال حسن کی کارفرمائی ہے ۔تو دوسری طرف حکیمانہ نکات اور اخلاق آموزی لیکن شرر کے یہاں یہ سب عنقا ہیں ۔[۱۸۲]

جلد ول کے ان مضامین میں انشائیہ کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً امید، کل، جوش، کامیابی، انتظار، آہ، لالہ خودرو، وغیرہ ۔شرر کی ان جلدوں میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی ۔بعض انشائیے جو مکالموں کی شکل میں ہیں ۔ دوسروں کی بہ نسبت کچھ بہتر ہیں بعض انشائیوں میں شرر ایک ہی مضمون کو بار بار دہراتے رہتے ہیں ۔جس سے پڑھنے والا اکتا جاتا ہے ۔مگر وہ نہیں اکتاتے ۔بعض مصرعے اور شعر بھی اس اعتراض کے تحت آ جاتے ہیں ۔اکثر انشائیوں سے ان کی بعض خاص تراکیب اور ذہنی طریقوں کا پتہ چلتا ہے جو ہر جگہ نمایاں ہیں ۔ مثلاً گلوئے صفا کلیہ اجزان ستم رسیدہ بیوہ، جوانا مرگ کی لاش ۔ننھا یتیم ،ہجراں نصیب عاشق ، جاں بلب بوڑھا ۔ بزم جانان، زاہد شب زندہ دار، ترستی ہوئی نگاہ وغیرہ ایک روپے کی سرگزشت اور مغرور جوتا اس مجموعے کے بہترین

انشائیے ہیں۔ان انشائیوں میں بھی انگریزی الفاظ شرر نے استعمال کیے ہیں اور تکرار الفاظ بھی یہاں ملتی ہے۔

انگریزی الفاظ کا بھی بکثرت اور غیر ضروری استعمال پایا جاتا ہے مثلاً ہسٹری،فیچر، انسپکشن، ایمفی تھیٹر، پنکچوئٹی، ماٹو، پرسن، سپریم، پریچو، کمپٹیشن، مارل کیریکٹر، رپورٹر، وغیرہ بعض اوقات الفاظ کی تکرار بھی حد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔مثلاً راتوں کو اٹھ اٹھ کے لبھا لبھا کے، پڑے پڑے، دیکھ دیکھ کر، کس کس انداز سے، نگاہ اٹھا اٹھا کے، جھنکا جھنکا کے، بڑھ بڑھ کر، ان ابتدائی انشائیوں میں لفظ پیارے کا استعمال بھی زیادہ ہوا ہے اور کہیں کہیں رومانویت اور عریانی کا رنگ بھی غالب ہے مثلاً بوسہ کی طلب اور گلے سے لپٹے رہنے کا لطف، بھینچ بھینچ کے گلے لگانے اور لپٹنے کا سماں ابھرے ہوئے سینہ کا ذکر، سینہ مست، اٹھتے جوبن اور مسکی ہوئی چولیوں کا ذکر غرض شرر کے یہ مجموعے کافی دلچسپ ہیں۔ جو خوبیاں، خامیاں یا خصوصات بیان کی گئی ہیں وہ شاید ان کے طرز بیان کا نتیجہ ہیں۔اصلاح قوم وملت سے متعلق انشائیوں کے موضوعات مختلف ہیں جن کے تحت علی گڑھ کالج کی یونیورسٹی میں تبدیلی کی حمایت، دنیا کی ابتدائی سادگی، تعلیم نسواں، علم کی قدر و قیمت، اردو ادب کا معشوق اور اس کا تجزیہ، ہندی فارسی عربی کے معشوقوں اور ان کی نفسیات کا ارتقاء قدیم وجدید تعلیم کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کی ضرورت۔ ہندو مسلم، شیعہ وسنی، مسلم وعیسائی، اتحاد تاریخ کی روشنی میں ان کا ایک دوسرے سے طرزِ عمل، ترکوں کی شکست اور برطانیہ سے مدد کی درخواست انگریزی مصنفین مثلاً لوئی ولیم، سرجان مونڈ ویل اور گبن کی غلط فہموں کا ازالہ اور ان کی تصانیف پر تبصرہ جس سے سرسید کا اثر ظاہر ہوتا ہے وغیرہ چیزیں موجود ہیں۔

آغاز واختتام سال کی جلد میں بھی کچھ انشائیے پائے جاتے ہیں۔ان انشائیوں میں شرر نے آغاز و اختتام سال کے نام سے دلگداز کی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کی پوری تاریخ،مصروفیات اور زندگی کے اتار چڑھاؤ، سفر وحضر اور خدمات کا سن کے لحاظ سے ذکر کیا ہے۔اس مجموعہ میں ان کے ناولوں کی اشاعت کا بھی ذکر ہے۔یہ انشائیوں کا مجموعہ زمانہ کے اہم تاریخی واقعات پر تبصرہ کی وجہ سے دلچسپی کا عنصر رکھتا ہے۔

مختصراً یہ کہ عبدالحلیم شرر کے مضامین کی جتنی بھی جلدیں ہیں ان سب میں انشائیے موجود ہیں لیکن سارے انشائیے نہیں ہیں بلکہ مضامین کی کثرت ہے۔جس عہد میں شرر نے لکھنا شروع کیا ہے انشائیہ کی صنف اردو میں باقاعدہ طور پر موجود نہیں تھی۔لہٰذا الگ سے شرر نے اپنے انشائیوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ مضامین کا ذکر کثرت سے موجود ہے لیکن انشائیے کی کچھ نہ کچھ خصوصیات، موضوعات، اسلوب بھی ان مضامین کی جلدوں میں موجود ہے۔لہٰذا اسی نقطہ نظر کے تحت شرر کے انشائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ درست ہے کہ شرر نے زیادہ تر مضامین لکھے ہیں۔انشائیے اور مقالے بہت کم لکھے ہیں اور جب وہ لکھ

رہے تھے تو وقت کی ضرورتوں اور اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کر رہے تھے۔ انہیں شاید یہ خود بھی پتہ نہ ہو کہ مضامین لکھتے لکھتے انہوں نے اردو انشائیے کی بھی بڑی خدمت کر دی ہے۔ لہٰذا جب بھی اردو انشائیے کی تاریخ وارتقاء کا ذکر ہو گا شرر کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہی سمجھا جائے گا۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر: ''دلگداز میں انہوں نے متنوع موضوعات پر خاصی تعداد میں انشائیے بھی قلم بند کیے۔''[۱۸۳]

رشید حسن خان لکھتے ہیں:

> شرر کا دوسرا قابل قدر اور قابل ذکر کارنامہ انشائیہ نگاری ہے۔ وہ اردو کے اولین انشائیہ نگاروں میں سے ہیں۔ موضوعات کا تنوع، عبارت کی شستگی، مختصر جملے اور تصنع سے معرا اسلوب ان کی خصوصیات ہیں۔ اگر چہ کہیں کہیں فارسی عربی کے کچھ بوجھل لفظ بھی آ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کم ہے۔ خیالات میں شگفتگی ہے۔ ناول نگاری نے جزئیات کی تصویر کشی کا رنگ چمکا دیا تھا۔ ان عناصر کی بنا پر ان کے انشائیے خاصے دلچسپ ہیں۔ البتہ خیالات میں جتنی شگفتگی ہوتی ہے۔ عبارت میں اتنی شگفتگی نہیں ہوتی اور اس سے کچھ نقصان پہنچتا ہے۔[۱۸۴]

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''انشائیہ کی بنیاد'' میں شرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> عبدالحلیم شرر ان اہل قلم میں سے ہیں جو نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں چنانچہ انہوں نے جہاں تاریخی ناول لکھنے کی روایت کا آغاز کیا وہاں ڈرامہ اور نظم معرا کی طرف بھی توجہ کی اور انشائیہ نگاری بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔ اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں انہوں نے متعدد مسائل اور متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا۔ آج اگر چہ وہ اپنے تاریخی ناولوں کی بنا پر مشہور ہیں لیکن وہ محض تاریخی ناول نگار ہی نہ تھے۔ ان کا قلم تیز رفتار بھی تھا اور متنوع پسند بھی سات جلدوں میں مدون کیے گئے۔ ''مضامین شرر'' اور ''مقالات شرر'' ان کی ذہنی دلچسپی کے وسعت پذیر آفاق کے مظہر ہیں۔ اگر ایک طرف انہوں نے معاشرتی مسائل تمدن، اصلاح احوال، ادب اور تنقید پر ٹھوس مقالات قلم بند کیے تو دوسری طرف ''نہیں''، ''نسیم سحر''، ''صحبت برہم''، ''عمر رفتہ''، ''دیہات کی زندگی''، ''لالہ خودرو'' اور ''ہم تم اور وہ'' جیسے موضوعات پر انشائیے بھی لکھے۔[۱۸۵]

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی شرر کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے جس کو بہت سے ادیب اور محقق مانتے ہی نہیں

ہیں۔شرر نے جہاں مقالہ نگاری مضمون نگاری میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا تھا وہاں انشائیہ کے میدان میں بھی ان کا ایک منفرد مقام ہے۔نہیں،نسیم سحر،صحبت برہم،عمر رفتہ، دیہات کی زندگی، لالہ خودرو اور ہم تم اور وہ جیسے شاہکار انشائیے انہی کے قلم سے نکلے ہیں جو کہ اردو انشائیہ کی تاریخ و ارتقاء میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں: ''شرر کے مضامین داخلی ہیں۔ان میں احساس ملال زیادہ ہے اور مسرت کی کرن پیدا نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ان مضامین کا انشائیہ سے واسطہ بہت کم نظر آتا ہے۔''[۱۸۶]

اگرچہ مضمون نگاری کی ابتدا شرر کے عہد سے پہلے ہو چکی تھی اور مضمون نگاروں نے انشاء پردازی کے جوہر بھی دکھائے تھے لیکن شرر کے عہد میں اور اس سے قبل کسی نے بھی انشائیہ کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔اردو ادب میں یہ صنف نثر بہت بعد میں شامل ہوئی۔لیکن اس صنف کی خصوصیات ان مضمون نگاروں کے ہاں کافی مقدار میں پائی جاتی تھی۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں تخلیقی قسم کی نثر لکھی گئی۔ اس میں مضمون نگاری کا متذکرہ رجحان غالب حیثیت رکھتا ہے۔اور اس کا سلسلہ سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد دہلوی، میر ناصر علی دہلوی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور عبدالحلیم شرر سے لے کر سجاد حیدر یلدرم، مہدی آفادی، سجاد انصاری، حسن نظامی، عبدالعزیز، فلک پیما، نیاز فتح پوری، فرحت اللہ بیگ، سعادت حسن منٹو اور پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی تحریروں کے لیے ''انشائیہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔[۱۸۷]

رشید حسن خان ''گذشتہ لکھنو'' تنقیدی و تحقیقی جائزہ میں لکھتے ہیں:

> شرر کو ہم کئی حیثیتوں سے اچھی طرح جانتے ہیں۔وہ اردو کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے تاریخی ناول نگار تھے...... یہاں ایک اور متنوع موضوع ایسا بھی ہے جس میں ان کی حیثیت بہت نمایاں ہے اور وہ ہے انشائیہ نگاری۔ تاریخی ناولوں اور ان کے تاریخی و معاشرتی مضامین اور انشائیوں نے پورے ملک میں ان کو مشہور کر دیا۔[۱۸۸]

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ شرر کو کوئی انشائیہ نگار مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انشائیہ کے آغاز و ارتقاء میں شرر کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں وہ مشہور تاریخی ناول نگار اور مضمون نویس تھے۔وہاں اعلی پائے کے انشائیہ نگار بھی تھے۔شرر نے ہر میدان ادب میں قدم رکھا اور اپنی نشانیاں چھوڑتے

ہوئے یہاں سے رخصت ہوئے۔ جب بھی اردو انشائیہ کی بحث چھڑے گی شرر کا نام ضرور لیا جائے گا اس لیے کہ اس میدان ادب میں بھی ان کا ایک منفرد مقام و مرتبہ ہے۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کے موضوعات

انشائیے کا کوئی موضوع مخصوص نہیں ہوتا اس میں ہر قسم کے موضوعات داخل ہو سکتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے رنگا رنگ موضوعات کو اس صنف میں پیش کیا، شرر نے فلسفہ اخلاق، حیات کا تجزیہ، ماضی و حال کی سیر، مادی اثرات کا غلبہ، روحانی جذبات، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوعات پر انشائیے لکھے۔ شرر نے متنوع اور گونا گوں موضوعات پر لکھ کر یہ ثابت کیا کہ دنیا کی ہر چیز انشائیہ کا موضوع بن سکتی ہے۔

انشائیہ کا کوئی ایک موضوع نہیں ہے۔ انشائیہ میں فلسفہ بھی داخل ہو سکتا ہے اور اخلاق بھی۔ اس میں قہقہے بھی شامل کیے جا سکتے ہیں اور آنسو بھی۔ اس میں حیات کا بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور کائنات کا بھی۔ اس میں ماضی کی بھی سیر کی جا سکتی ہے اور حال کی بھی۔ اس میں مادی اثرات کا بھی غلبہ ہو سکتا ہے اور روحانی جذبات کا بھی۔ الغرض انشائیہ میں رنگا رنگ موضوعات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں بھی کئی قسم کے موضوعات شامل ہیں۔ بقول پروفیسر نظیر صدیقی: ''انشائیہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی لکھا جا سکتا ہے اور غیر سنجیدہ سے غیر سنجیدہ موضوع پر بھی۔''[۱۸۹] عبدالحلیم شرر نے بھی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ ہر دو موضوعات پر انشائیے لکھے ہیں۔ انشائیہ کے موضوعات کے بارے میں رضی عابدی لکھتے ہیں:

> اس کا خالق مونٹین ہو یا بیکن۔ سرسید ہو یا منشی سجاد اس کا ایک موضوع ہوتا ہے۔ مثلاً ''آدم خور''، ''موت''، ''لندن کی آوازیں''، ''امید''، ''ہولی'' دوسری اصناف سخن کے موضوعات نہیں ہوتے۔ ان کے صرف نام ہوتے ہیں۔ مثلاً ''ٹیڑھی لکیر''، ''چھوے''، ''خدا کی بستی''، ''وینس کا سوداگر'' وغیرہ۔[۱۹۰]

بقول ڈاکٹر سید شاہ علی: ''دلگداز کے موضوعات اس قدر متنوع اور گونا گوں ہیں کہ ان پر بلاشبہ یہ قول صادق آتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز انشائیہ کا موضوع بن سکتی ہے۔''[۱۹۱] عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کی ابتداء اودھ اخبار اور دیگر پرچوں سے ہوئی۔ جو انہوں نے وقتاً فوقتاً نکالے۔ تاریخی و جغرافی انشائیوں کے دوسرے مجموعہ میں بھی حسب معمول موضوعات اور مواد میں تنوع اور وسعت موجود ہے۔ تاریخی واقعات پر خیال آرائی سے متعلق انشائیوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ انشائیہ نگار نے مضامین کی اس جلد کے انشائیوں میں مختلف موضوعات پر

خیال آرائی کی ہے اور کچھ ایسی چیزوں کا بیان ہے جو کہ اردو ادب میں بالکل نئی اور اچھوتی ہیں۔ ان انشائیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر کو مختلف ممالک کی تاریخ کا وسیع مطالعہ تھا۔ یہ انشائیے سرسید کے انشائیوں کا اثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان انشائیوں کی زبان سادہ اور دلآویز بھی ہے اور ان کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرر ایک زیرک انسان تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر ان تمام حالات وواقعات پر پڑتی ہے۔ جمیل آزر رقمطراز ہیں:

اچھا انشائیہ نگار زیرک ہی نہیں ہوتا عقاب جیسی تیز نظر بھی رکھتا ہے۔ بہت سے ایسے مسائل ومشکلات جن میں عام لوگ پھنسے ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار کی نظر میں آجاتے ہیں۔[۱۹۲]

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کی خصوصیات

انشائیہ کی خوبی اختصار ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے مضمون مقالہ سے الگ کرتی ہے۔ انشائیہ کی خصوصیات کے ضمن میں ڈاکٹر سلام سندیلوی رقمطراز ہیں:

> انشائیہ کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت اختصار ہے اور یہی چیز اس کو خاص طور سے مقالہ سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ اختصار موضوع کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے اور اسلوب کے لحاظ سے بھی موضوع کے اعتبار سے یہ مطلب ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ نہ بیان کیا جائے اور نہ علمی بحث ومباحثہ چھیڑا جائے۔ صرف ان نکات اور واقعات کو بیان کیا جائے جو مصنف کے تجربات کے اندر ہوتی ہے۔ اسلوب کے اختصار سے یہ مراد ہے کہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات کو مختصر الفاظ میں پیش کردے اور اپنے نظریہ کی وضاحت کے لیے وہ طویل بیانات سے گریز کرے... مرے (MURRAY) کے نقطہ نظر سے انشائیہ کی دوسری خصوصیت اس کی بے ربطی ہے۔ اس میں خیالات غیر منظم طریقہ پر پیش کیے جاتے ہیں اور اسلوب غیر منطقی ہوتا ہے۔ جانسن بھی انشائیہ کو دماغ کی ایک غیر منظم تخلیق سمجھتا ہے۔[۱۹۳]

انشائیہ کی خصوصیات میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اشاریت اور رمزیت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دل و دماغ کو فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے اور اس کا اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ جو دل پر اثر کرتا ہے۔ انشائیہ میں شاعری کی طرح اشاریت ورمزیت ہوتی ہے۔ اس سے دل ودماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اسلوب دل پر ان مٹ نقوش چھوڑتا ہے۔ شرر کے انشائیوں میں یہ خوبی کس حد تک پائی جاتی ہے۔ ان کا

اندازِ بیان ایسا ہے جو دل پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کی شخصیت کا عکس ہو۔ اس خوبی کی بنا پر انشائیہ شاعری کے بہت قریب ہے۔ شخصیت کی عکاسی شاعری میں بھی ہوتی ہے۔ انشائیہ کو ہم مصنف کی شخصیت سے الگ نہیں کر سکتے۔ یوں انشائیہ داخلی اور ذاتی ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی شرر کے انشائیوں میں اظہار ذات وشخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اردو میں سرسید، آزاد، حالی، شرر، مہدی افادی، سجاد انصاری اور حسن نظامی وغیرہ کے بعض انشائیہ میں بھی ان کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ دراصل انشائیہ کو شخصیت سے ہم جدا نہیں کر سکتے۔''[۱۹۴]

انشائیہ کا مقصد مسرت ولذت فراہم کرنا ہے۔ جس طرح نظم وغزل کو پڑھ کر مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھے انشائیے کو پڑھنے کے بعد قاری پر سرور ووجدان کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ شرر کے انشائیوں میں بھی یہ خوبی کہیں زیادہ اور کہیں کم موجود ہے۔ ان کے انشائیوں کو پڑھنے کے بعد قاری پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اشیا اور مناظر کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کائنات کی معنویت کو سمجھنے کے لیے وہ بعض اوقات بہت سامنے کی چیزوں اور منظروں کو مثال بناتا ہے۔ یہ منظر اور چیزیں یوں تو برسوں سے ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔ لیکن جب انشائیہ نگار انہیں ایک مختلف معنی اور مواد دیتا ہے۔ تو ان کی صورتیں اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کی خوبی یہ بھی ہے کہ انشائیہ نگار نے اشیا اور مناظر کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالحلیم شرر بھی ایک منفرد انشائیہ نگار ہیں اگر چہ بعض ادیب اور نقاد انھیں انشائیہ نگار سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ لیکن انشائیہ کے ابتدائی نقوش اور اس کی بنیادی خوبیاں، انکشاف ذات، اپنی مسرت میں دوسروں کو شریک کرنا اور خوبصورت اسلوب بیان ان کے یہاں انفرادی خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں۔ شرر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو انشائیہ کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے۔ ان کے انشائیوں کی وجہ سے اردو انشائیہ میں معنوی اور فکری وسعت ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ موضوعاتی دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔ عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کو اردو انشائیہ کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل ہوتا رہے گا۔ نر بجے رام جوہر نے اپنے مقالہ بعنوان ''عبدالحلیم شرر ایک انشائیہ نگار'' مطبوعہ اردو زبان سرگودھا جون ۱۹۶۷ء میں شرر کو انشائیہ نگار ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اپنے انشائیوں میں شرر نے فن انشائیہ نگاری کی تمام خصوصیات یعنی اختصار، بے ربطی، اظہار شخصیت اور انبساطی مقصد وغیرہ کو کسی حد تک ملحوظ نظر رکھا ہے۔ وہ انشائیے جن کے موضوعات، مناظر فطرت، انسانی اوصاف، جذبات اور احساسات، معاشرتی اقدار اور حسن فطرت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ نہ صرف مختصر ہیں بلکہ بے ربطی، خیال کا عمدہ نمونہ ہیں۔[۱۹۵]

شرر کے انشائیوں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

شرر کے خیالات ابتداء میں بہت سطحی لگتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے ان میں پختگی آتی گئی، خیالات میں نسبتاً سنجیدگی پیدا ہوتی گئی اور طرز بیاں نکھرتا گیا...

شرر کے ابتدائی زمانے کے انشائیوں میں (شاید جلد اول میں وہی شامل کیے گئے ہیں) دقیع خیالات خال خال ہی ملتے ہیں اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شرر کے دماغ پر بعض تاریخی و جغرافیائی انشائیوں کا جن کا شاید وہ ان دنوں مطالعہ کرتے رہے ہوں۔ شدید اثر ہے اور یہ ان کے انشائیوں میں کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ سارے ابتدائی انشائیوں میں جابجا قومی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے اور ہر ایک کا خاتمہ قوم کے مرثیے پر ہوتا ہے۔ جو سرسید کے اثر کا راست نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سرسید کے پاس ایک تعمیری پروگرام تھا جس کی طرف وہ لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے۔ شرر نے شاید محض زبانی جمع خرچ کو ہمدردی سمجھ لیا۔ ان کے ہاں بغیر کسی منزل مقصود کے یہ راگ الاپا گیا۔ شرر کے ان انشائیوں سے ان کے خیالات، طرز ادا وغیرہ کے ارتقاء کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے تاریخی اور سوانحی انشائیے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے زبان اردو کی جس میں اس قسم کے انشائیے عام نہ تھے، کی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان اور محاورے کی غلطیاں بھی اس خامی کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً بیان کرتا ہوتا ہے۔ دنیا کی دلچسپیوں کا لالچ نہیں دیا تھا کہ ہم کنج عدم سے چل نہ کھڑے ہوتے ہیں۔ [۱۹۶]

شرر کے انشائیوں کا اسلوب

ان کا انداز سادہ، سلیس اور رواں دواں ہے۔ کچھ حد تک پیراگراف وغیرہ کے اصولوں کی پابندی کرنے کی کوشش بھی ظاہر ہوتی ہے۔ شرر نے زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوں کو مدنظر رکھ کر انشائیے قلم بند کیے ہیں۔ انشائیہ کے اسلوب کے ضمن میں سلیمان بٹ لکھتے ہیں: ''انشائیہ نگار زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ان پہلوؤں کو نئے زاویوں سے پرکھتا ہے۔ انشائیہ آزادانہ اسلوب رکھتا ہے۔ چنانچہ کسی مخصوص ترتیب اور قاعدے کا حامل نہیں ہوتا۔'' [۱۹۷] انشائیہ کا اسلوب ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ اس میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر سلیم اختر انشائیہ کے اسلوب کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

جہاں تک اس کے اسلوب کا تعلق ہے سبھی لکھنے والوں نے اس امر کی توثیق کی ہے کہ انشائیہ کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہیے۔ لطافت ایسی کہ انشائیہ متبذل نہ ہو جائے اور شگفتگی ایسی کہ مزاح نہ ہونے کے باوجود تحریر فرحت بخش ہو۔[۱۹۸]

انشائیہ کے اسلوب کے متعلق اکبر حمیدی لکھتے ہیں: ''انشائیہ نئے خیالات اور دلکش اسلوب سے عبارت ہے۔اس کے اسلوب کو کسی بھی ایک خوبی سے مشروط کر دینا انشائیہ نگار کو فاعلاتن فاعلات کی گردان میں ڈال دینے کے مترادف ہے۔''[۱۹۹]

عشق و محبت کے سلسلہ میں شرر کا طرزِ بیان شگفتہ ہو جاتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے۔مثلاً لیلائے اخیلیہ،قلوپطرہ،نوار زوجہ فرزوق اور خصوصاً بثینہ محبوبہ جمیل کی داستان بہت ہی دل سوز ہے۔ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

انہوں نے اردو زبان و ادب میں ایک لچک پیدا کر دی اور اسے گونا گوں زیورات سے آراستہ کیا۔مثلاً جا بجا اشعار اور مصرعوں کی مدد سے وہ حسن کی بہت عمدہ ترجمانی کرتے ہیں جو ان کے ناولوں کی بھی خصوصیت ہے یا عام تاریخی واقعات ہیں۔ایک افسانے کا سا لطف اور تسلسل پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ''حسن کی کرشمہ سازیوں'' کے عنوان سے انہوں نے ایک انشائیہ میں حضرت آدم کا حوا کے باعث جنت سے نکلنا ،ہابیل قابیل کا واقعہ، مہا بھارت کی جنگ، رام اور سیتا کی کہانی،ہیلین اور یونانیوں کی جنگ،مسلمانوں اور مسیحیوں کا حوروں سے عشق اور ان کی تمنا میں خوشی سے جان دینا وغیرہ خوب لکھا ہے۔[۲۰۰]

اصلاح قوم و ملت سے متعلق انشائیوں میں سرسید اور ان کے رفقاء کی طرح شرر بھی غیر ضروری انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔مثلاً پولیٹکل، ان نیچرل، سوشل وغیرہ۔شرر کی تحریروں میں ایسے بے تکلفانہ الفاظ بھی ملتے ہیں جن کا سب سے پہلے استعمال سنجیدہ ادب میں سرسید نے کیا۔مثلاً ہائے ہائے۔افسوس، پیاری وغیرہ لیکن ان کے ہاں وہ متانت اور وقار باقی نہیں رہتا جو سرسید کی فوقیت ہے۔ بلکہ اودھ پنچ کی طرح عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔

شرر کے اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

شرر نے اگرچہ اپنے ناولوں میں خاصہ رنگین اسلوب برتا ہے۔اتنا رنگین کہ بعض اوقات وہ

ناول کی عمومی فضا اور کرداروں کی نفسیات اور ان کی حیثیت سے لگا نہیں کھاتا۔لیکن ناولوں کے برعکس انہوں نے انشائیوں میں اسلوب کی رنگینی کی شعوری کاوش نہ کی۔حالانکہ ''نسیم سحر'' اور''لالہ خودرو'' جیسے انشائیوں میں ایسے اسلوب کی گنجائش تھی۔مگر وہ تشبیہات اور استعارات سے صرف اتنا کام لیتے ہیں کہ ان سے موضوع میں نکھار پیدا ہو جائے اور بس۔''نہیں'' بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن شرر نے اسے منفی سوچ اور سلبی خیالات کی علامت بنا دیا اور یوں نہایت لطیف انداز میں انہوں نے اصلاح معاشرہ کو کیموفلاج کر دیا۔

مگر انصاف کیجئے کہ''نہیں'' ایک ایسا لفظ ہے جو عقلمند اور بے وقوف سمجھ دار اور ناسمجھ ہر ایک کی مصیبت ٹال دیتا ہے۔عقلمند جس بات کو نامناسب سمجھتا ہے اس کی نسبت سوچ سمجھ کے ''نہیں'' کہہ دیتا ہے۔بے وقوف جس امر میں ایک ادنیٰ ظاہری مخالفت پاتا ہے۔فوراً بے غور کیے نہیں کہہ دیتا ہے۔سمجھ دار اس لفظ کو لوگوں سے مشورہ کے لیے کہتا ہے اور ایک ناسمجھ بچہ ضد پر آجاتا ہے تو نوجوان امرائے قوم کی طرح بری اور بھلی ہر بات پر''نہیں'' کہنے لگتا ہے۔غرض کوئی نہیں جو اس لفظ کو استعمال میں نہ لاتا ہو۔جو بری رائے کسی حسب دشمن کی طرح لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ اگر ٹلتی ہے تو''نہیں'' سے حقیقت میں''نہیں'' ایک بڑا مفید اور کارآمد منتر ہے۔

''اچھوتا پن'' میں اندازِ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے زندگی کی رنگینی کی اساس تنوع اور اس کے''اچھوتے پن'' پر استوار کی ہے کہ ان کے بقول:

سچ یہ ہے کہ دنیا میں اگر مزہ ہے تو اس چیز میں جس میں کچھ اچھوتا پن بھی پایا جاتا ہے۔وہ ناپید کنار ریگستان جہاں تشنگی انسان کو موت کا آرزومند کر دیتی ہے۔وہاں بھی اگر اس جانب خیال جاتا ہے کہ دامن ریگ پر کسی انسان کا نقش قدم نہیں پڑا اور اس جگہ تک ہم سے پہلے کسی کا گذر نہیں ہوا تو اس حقیقت میں بھی دو گھڑی کو کچھ مزا سا آجاتا ہے۔

اور اس کے ساتھ''لالہ خودرو'' کی یہ سطریں ملا کر پڑھیے تو کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے:

ہمارے باغ میں جس کا ہر پھول بڑی تمناؤں سے دو چار روز کے لیے شگفتہ ہوا ہے لاکھ بہار کا موسم آئے اور ہزار علم نباتات کے اصول برتے جائیں اصل تو یہ ہے کہ جب مقابلہ

کیجئے تو یہی دل میں آتا ہے کہ سارے باغ کولالہ خودرو کے اس دلفریب پھول پر قربان کر دیجئے جو بے کسی کی کوششوں کے خود بخود کسی صحرا میں اگ آتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں فکر کی جو لہر زیریں سطح پر چلتی ہے وہ قاری کو اسلوب میں گم نہیں ہونے دیتی بلکہ کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ گہرا تفکر نہیں ہوتا بلکہ یوں ہی پڑھتے پڑھتے اچانک ٹھٹھک جانے کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اسلامی نکتہ سمجھانے میں سرسید کے برعکس واشگاف نہیں ہو جاتے بلکہ انشائیہ کا لطیف انداز برقرار رکھتے ہیں۔[۲۰۱]

پروفیسر جعفر رضا عبدالحلیم شرر کے انشائیوں اور ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

بعض مضامین اپنی شگفتگی اور بے ساختگی کی بنا پر انشائیے کے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں شرر کا اسلوب مختلف النوع تجربات کا حامل ہے۔ ان میں سنجیدہ فکری اور اصلاحی زاویہ نظر بھی ہے اور ہلکے پھلکے تفریحی موضوعات بھی ہیں جن کو پڑھ کر سنجیدہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اے ہماری باوفا معشوق وہ تیرے ہی حسن کی شعاعیں ہیں جو ان گورے گورے چہروں پر چمکتی ہیں۔ جن پر دل و جان سے عاشق ہو جاتے ہیں۔ وہ تیرے ہی دلربا ناز و انداز ہیں جو پری رخوں کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو کر ہمارے بے قرار دلوں کو اپنا والہ و شیدا بنا لیا کرتے ہیں۔ ...... (امید)

حسن کی کشش ایسی زبردست ہے کہ غور سے دیکھئے تو وہی انسان خود بنانے اور بگاڑنے والا اور خدا نے واقعی ایسی قدرت پیدا کر دی ہے جو انسان سے جیسا کام چاہے کرا لیتی ہے۔
(حسن کی کرشمہ سازیاں)

اے افکار عمر مانا کہ تمہیں ہم سے دشمنی ہے۔ عداوت ہے تم ہمیں خوش و خرم نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری مسرت تمہارے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ ہرگز نہیں چاہتے کہ ہماری کوئی آرزو بر آئے۔ یہ نہیں گوارہ کہ ہم معشوق آرزو سے ہم کنار ہوں اور کسی کے اخلاق عالیہ

کے مورد عنایت نہیں مگر ہمیں رونے تو دو، تم رونے بھی نہیں دیتے۔......(کسی کی یاد)

وہ تاریخ کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ ورق ہے۔کسی اگلی بزم طرب اور گذشتہ محبت عشق کے گل ہونے کے قریب کی ہے۔ اس کے نقش و نگار کسی گزرے ہوئے اور لٹے ہوئے کنگورے وہ سر ہیں جنہیں سرکشی کے جرم میں زمانے کے بے رحم ہاتھ نے مار مار کر زبردستی اپنے آگے جھکایا ہے۔ وہ مجسم کتاب نصیحت اور مرقع عبرت ہو رہا ہے۔......(ٹوٹا ہوا کھنڈر)

ان اقتباسات میں شرر کا روحانی انداز بیان رواں دواں نظر آتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں کشش و دلچسپی کے سامان ہیں۔[۲۰۲]

و۔ بطور انشائیہ نگار شرر کا مقام و مرتبہ

عبدالحلیم شرر اردو ادب کے بحر بے کنار ہیں۔ اپنی اتھاہ گہرائیوں کا شاید انہیں بھی علم نہ تھا لیکن اہل ادب جانتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں بیک وقت ناول نگار، سیرت نگار، سوانح نگار، مکتوب نگار، صحافی، شاعر، مضمون نگار، مقالہ نگار اور انشائیہ نگار اپنی اپنی سبھا سجائے بیٹھے ہیں۔ شرر کے انشائیے شاعرانہ حسن بیان، شخصیت کے دلکش انعکاس اور مظاہر فطرت کے مخفی گوشوں کے انکشاف کے ساحرانہ عمل سے عبارت ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ایک ایسا انسان سامنے آتا ہے جس کے احساسات بے حد نازک ہیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت کا جتنا اظہار انشائیہ میں کیا ہے کسی اور صنف سخن میں نہیں کر سکے ہیں۔

عبدالحلیم شرر ناول اور مضمون نگاری کے میدان میں تو صدر دروازے سے داخل ہوئے اور ایک دھماکہ کے ساتھ اپنا مقام حاصل کر لیا، مگر انشائیہ کے سلسلہ میں انہوں نے وہ دروازہ اختیار کیا جہاں سے دبے پاؤں وہ داخل ہوئے لیکن انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنے انشائیے لکھ دیئے کہ ان کا شمار بھی انشائیہ نگاروں میں ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادیب اور محقق مضامین شرر کے شاعرانہ و عاشقانہ حصوں کو انشائیوں میں شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> اگر سرسید احمد خان کے انشائیہ کی ذیل میں آنے والے مضامین اور محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال کے بعد کی نثری کاوشوں کا انشائیہ کے لحاظ سے جائزہ لیں تو اس عہد کے بیشتر قلم کاروں کے ہاں ایسی تحریریں ضرور مل جائیں گی جن میں نگاہ کی تازگی، اسلوب کی لطافت اور تدبیر کی نزاکت کی صورت میں انشائیہ کی کسی نہ کسی خصوصیت کی جھلک نظر آجائے گی اس ضمن میں سید حسنین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔
>
> اردو انشائیہ کا ابتدائی دور محمد حسین آزاد سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی، عبدالحلیم شرر، مرزا فرحت اللہ بیگ اور ملا رموزی اس دور کے نمائندے ہیں۔ ان کی نگارشات میں ایسے ادب پارے کم نہیں ہیں۔ جن میں انشائیہ کی بوباس موجود نہ ہو۔ یہ ادب پارے اس فن کے فریم میں فٹ نہیں ہوتے مگر اردو انشائیہ نگاری میں یہ انشائیہ نما تحریریں قابل مطالعہ قرار دی جائیں گی۔[۲۰۳]

ڈاکٹر سید شاہ علی رقمطراز ہیں:

جس طرح شرر نے ناول نویسی کی دنیا میں اپنے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کی جدت اور کثرت سے اس کے موضوعات میں تنوع پیدا کیا اپنے پیش رو ناول نویسوں کی اہمیت میں اضافہ کیا اور ناول کو مقبول بنایا۔ اس طرح ان کے انشائیوں کی رنگا رنگی اور وسعت نے اردو انشائیہ کو چار چاند لگا دے اور اردو ادب کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کیا جو اس عہد کے انگریزی اسلوب کا جواب تھا۔ ناول کے طرز ادا میں پلاٹ، منظر نگاری اور اس کے دیگر اجزائے ترکیبی سے جان پڑ جاتی ہے لیکن انشائیہ کے طرز بیان میں ناول اور افسانے کا سا لطف پیدا کر دینا شرر ہی کا حق تھا۔ اردو انشائیہ میں شرر کا رول کافی وقیع ہے۔ انہوں نے تقریباً ایک ہزار انشائیے سپردِ قلم کیے ہیں۔ ان کے اودھ پنچ اور دیگر پرچوں کے ابتدائی دور کے انشائیوں اودھ اخبار کے ادارتی بورڈ کے زمانے کی تحریروں اور محشر، مہذب اور پردہ عصمت کے مضامین سے قطع نظر صرف دلگداز کے انشائیے مختلف عنوانات کے تحت کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔[۲۰۴]

عبدالحلیم شرر کا رسالہ دلگداز اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس رسالے نے انشائیہ کے ارتقاء و ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ سر سید احمد خان کے ''تہذیب اخلاق'' نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا رول ادا کیا۔ ''اودھ پنچ'' نے لندن پنچ کی طرح طنز و مزاح کی چاشنی پیدا کی۔ ''اودھ اخبار'' نے بھی شرر کے عہد میں بہت ترقی کی۔ لیکن ''دلگداز'' ان سب سے سبقت لے گیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں جو کچھ لکھا گیا قوم کی اصلاح کے لیے لکھا گیا۔ ''اودھ پنچ'' نے دیوالی، بسنت، چہلم محرم، بقر عید، شب برات، مشاعروں، محفلوں، مقدموں، مقامی میلوں پر روشنی ڈالی لیکن دلگداز کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت میں سر سید احمد خان کو محسن الملک، وقار الملک، حالی، چراغ علی اور دیگر رفقاء کا تعاون و مدد حاصل رہی اور ''اودھ پنچ'' کے حلقۂ تحریر میں بھی منشی سجاد حسین کے ساتھ مرزا اچھو بیگ، ستم ظریف، احمد علی، شوق، تربعون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی اور اکبر وغیرہ شریک رہے۔ لیکن دلگداز کا تمام تر بوجھ اور ذمہ داری تن تنہا شرر کے کندھوں نے اٹھائی اور برسوں تک انہوں نے اس بوجھ کو اٹھائے رکھا۔ ڈاکٹر سید شاہ علی رقمطراز ہیں:

غرض جو کام سر سید نے شروع کیا تھا اسے شرر نے ایک نئی منزل پر پہنچا دیا۔ شرر کے تاریخی ناولوں کی مقبولیت نے ان کے انشائیوں کو نمایاں نہیں ہونے دیا ورنہ اردو انشائیہ کے ارتقاء میں ان کا ایک اہم حصہ ہے۔ جیسے انشائیہ کا کوئی نقاد یا متعلم نظر انداز نہیں کر سکتا۔[۲۰۵]

انشائیہ نگاری میں عبدالحلیم شرر کو جو اہمیت ابھی تک دی جاتی رہی ہے ان کے انشائیے اس سے کہیں زیادہ

اہمیت کے حامل ہیں۔انشا ئیہ نگاری میں سرسید کے بعد شرر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی انشا ئیہ نگاری ان کے دیگر ادبی کارناموں تلے دبی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔شرر کے انشائیوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں وہ تازگی اور خیال آفرینی موجود ہے جس کا تقاضا ہم دورِ جدید کے انشا ئیہ نگاروں سے کرتے ہیں۔ یہ بات وثوق و یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے عاشقانہ مضامین کی دونوں جلدیں زیادہ تر انشائیوں ہی سے تکمیل کے مراحل میں داخل ہوئی ہیں۔''انتظار''اور''نہیں'' جیسے انشا ئیہ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔شرر کا شمار صف اولین کے انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔آپ نے انگریزی انشا پردازی کی بندشوں کو ادب اردو میں داخل کیا ہے۔انور سدید عبدالحلیم شرر اور ان سے قبل کے انشا ئیہ نگاروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

......مجھے مرزا غالب، میر امن، عبدالحلیم شرر، میر ناصر علی دہلوی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، خلیقی دہلوی، فلک پیما کنیا لال کپور، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، منصور قیصر، سید ہاشم علیم اور محمد خالد اختر کی نثری تحریروں میں کہیں کہیں انشا ئیہ کے نقوش تو مل جاتے ہیں لیکن اس کا مکمل پر تو نہیں ملتا۔صرف ایک روشن کرن کی موجودگی کی بنا پر ان میں سے کسی ایک ادیب کو انشا ئیہ نگار قرار دینا مناسب نہیں۔[۲۰۶]

انور سدید عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں انشا ئیہ کے نقوش کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن انہیں انشا ئیہ نگار تسلیم نہیں کرتے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبدالحلیم شرر بھی انشا ئیہ نگاروں کی صف میں اپنا مقام و مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کے انشا ئیے ان کے عہد کے ترجمان بھی ہیں۔اس لیے کہ بقول اکبر حمیدی:

انشا ئیہ بنیادی طور پر نئے خیال کی صنف ہے اور ہر نیا خیال اپنے عہد سے جنم لیتا ہے۔اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نیا خیال اپنے عہد سے مربوط ہوتا ہے بالکل اس طرح جیسے کوئی واقعہ اپنے عہد سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ خیال بھی ایک واقعہ ہے۔[۲۰۷]

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۶۸۶

۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، منتخبات تہذیب الاخلاق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۔ ز

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۹۵

۴۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۴

۵۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۔۱۲

۶۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۷۸۔۷۹

۷۔ سید محمد حسنین، ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ، نگار پاکستان کراچی، اصناف ادب نمبر، ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۶

۸۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، منتخبات تہذیب الاخلاق، ص ط

۹۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۳۰

۱۰۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۰

۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجی سے عبدالحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۷

۱۲۔ سیدہ جعفر، ڈاکٹر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ، ابوالکلام آزاد، اورئینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد، ۱۹۶۰ء، ص ۵۲

۱۳۔ افتخار الدین صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۶۳

۱۴۔ خواجہ احمد فاروقی، ماسٹر رام چندر فن اور تنقید، مرتب: انور کمال حسینی، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۹۶۶

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، انشائیہ اردو ادب میں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۶

۱۶۔ ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر، اردو اسیز، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ بمبئی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۴

۱۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر، مکتبہ کاروان، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۴۶

۱۸۔ صالحہ عابد حسین، ادبی جھلکیاں، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۴۳

۱۹۔ سید احتشام حسین، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، ادارہ فروغ اردو لکھنو، ۱۹۵۶ء، ص ۷۷

۲۰۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادبی اشارے، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۲۹

۲۱۔ مہدی افادی، افادات مہدی، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۲۱۳

۲۲۔ قاضی افضل حق قریشی، مولانا شبلی کا ایک نایاب مضمون، مشمولہ ادبی دنیا شمارہ ۲۱، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء، اتحاد پریس لاہور، ص ۹

۲۳۔ مفتون احمد، مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۲۴۔ بشریٰ جبین راٹھور، اردو زبان و ادب مختلف ادوار میں، سورج پبلشنگ بیورو، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۶

۲۵۔ عنایت علی قریشی، محسوسات، (مجموعہ مضامین) کتاب نگر، ملتان، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹

۲۶۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادبی اشارے، ص ۱۲

۲۷۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، علمی بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۹۳، ۴۹۴

۲۸۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۴

۲۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مرتب: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۰

۳۰۔ عبدالحلیم شرر، فردوس بریں، (مقدمہ) ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۔۲۴

۳۱۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان، عظیم اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۵۵۶

۳۲۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر مختصر تاریخ ادب اردو، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۳۴ء، ص ۳۲۲

۳۳۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین (اوّل) دار الاشاعت غازی آباد، دہلی، ۱۹۲۴ء، ص ۵۸۷

۳۴۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر۔حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۲

۳۵۔ آل احمد سرور، ہمارا ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۵

۳۶۔ سید احتشام حسین، اردو کی کہانی، ادارہ فروغ اردو لکھنو، ۱۹۵۶ء، ص ۸۳۔۸۴

۳۷۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یاد ایام، عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۷

۳۸۔ علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۸

۳۹۔ ایس ایم معین قریشی، اردو زبان و ادب، شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۸

۴۰۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین (اوّل)، ص ۵۸۶

۴۱۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مشمولہ، رسائل کے دفینوں سے اردو کی بازیافت، ۱۹۱۰ء۔۱۹۱۳ ائث ادیب الہ آباد، ص ۶۷

۴۲۔ فرحت شاہ جہاں پوری، مولانا شرر لکھنوی (سوانح وتخلیقات)، ص ۶۵

۴۳۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر (حیات اور کارنامے)، ص ۱۰۴

۴۴۔ اکبر حمیدی، تتلی کے تعاقب میں، (پیش لفظ) نظیر صدیقی، پروفیسر، بٹر پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰

۴۵۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، شاعرانہ و عاشقانہ، حصہ اوّل، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص ۴

۴۶۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، شاعرانہ و عاشقانہ، جلد اوّل حصہ اوّل مضمون، چاندنی رات، ص ۲۱۔۲۲

۴۷۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، شاعرانہ و عاشقانہ، جلد اوّل حصہ اوّل مضمون، آ ثار سلف، ص ۳۲

۴۸۔ مضامین شرر، شاعرانہ و عاشقانہ، جلد اوّل مضمون، خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، ص ۳۷

۴۹۔ ایضاً، ص ۸۲

۵۰۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، سواد وطن، ص ۵۳

۵۱۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، شہر کی رات، ص ۹۹

۵۲۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۹۵

۵۳۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، جھلملاتا ہوا تارا، ص ۱۲۹

۵۴۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، آنے والی گھڑی، ص ۴۱۵

۵۵۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، دماغی دربار، ص ۴۹۴

۵۶۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، وہ، ص ۵۵۹۔۵۶۰۔۵۶۱

۵۷۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر جلد اوّل، ذکر عیش بہ از عیش، ص ۵۷۳

۵۸۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۰۶

۵۹۔ عبدالحلیم شرر، کبوتر، بلبل، شاعرانہ عاشقانہ، حصہ دوم، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، س۔ن، ص ۴۴۴

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۶۱۔ ممتاز منگلوری، مرتب، طیف نثر، ص ۱۳۶

۶۲۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۰۷

۶۳۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۹۶۔۹۷

۶۴۔ عبدالحلیم شرر، ۱۸۸۸ء اور ہم، آغاز و اختتام سال کے مضامین، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص ۱۱

۶۵۔ عبدالحلیم شرر، لب گور ۱۹۰۵ء، آغاز و اختتام سال کے مضامین، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص ۶۱

۶۶۔ عبدالحلیم شرر، نیا سال اور نیا خیال، آغاز و اختتام سال کے مضامین، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص ۱۱۳

۶۷۔ عبدالحلیم شرر، ۱۹۱۶ کا کوچ، آغاز و اختتام سال کے مضامین، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص ۱۳۱

۶۸۔ عبدالحلیم شرر، سال انیس سو انیس مبارک باشد، آغاز و اختتام سال کے مضامین، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص ۱۵۹

۶۹۔ عظیم الحق جنیدی، اردو ادب کی مختصر تاریخ، فیمس بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳۵

۷۰۔ علامہ سید سلیمان ندوی، یادرفتگان مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۵۷

۷۱۔ عبدالحلیم شرر، تاریخی وجغرافیائی، حصہ اوّل، الیس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص ۳۱۔۳۲

۷۲۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۷۲۔۷۳

۷۳۔ ایضاً، ص ۷۵۔۷۶

۷۴۔ عبدالحلیم شرر، دارالخلافہ قرطبہ، تاریخی وجغرافیائی، حصہ اوّل، الیس عبدالرشید اینڈ برادرز، س۔ن، ص ۷۵۔۷۶

۷۵۔ ایضاً، ص ۹۵

۷۶۔ عبدالحلیم شرر، ملک یمن ساری دنیا کی تہذیب وتمدن کا سرچشمہ، تاریخی وجغرافیائی، حصہ اوّل، الیس عبدالرشید اینڈ برادرز، س۔ن، ص ۱۴۱

۷۷۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۷۳

۷۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۷۹۔ عبدالحلیم شرر، نقطہ یا گریک فائر، تاریخی وجغرافیائی، حصہ اوّل، الیس عبدالرشید اینڈ برادرز، س۔ن، ص ۱۴

۸۰۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۷۷

۸۱۔ ایضاً، ص ۷۸

۸۲۔ عبدالحلیم شرر، دارالخلافت اسلام، تاریخی و جغرافیائی، حصہ اوّل، الیس عبدالرشید اینڈ برادرز، س۔ن، ص ۲۰۶

۸۳۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۷۸

۸۴۔ ایضاً، ص ۷۹۔۸۰

۸۵۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، مرتب وتعارف: رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۵

۸۶۔ محمد اکرام چغتائی (دیباچہ) گزشتہ لکھنو عبدالحلیم شرر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱

۸۷۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، مقدمہ: سلیم اختر، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۔۲۳

۸۸۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۴۵ء، ص ۲۳۴

۸۹۔ عبدالحلیم شرر، فلورا فلورنڈا (پیش لفظ) اشرف حسینی، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۴

۹۰۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، علمی بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۹۷

۹۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، معاصرین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن، ص ۱۱۸

۹۲۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، مقدمہ: سلیم اختر، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۳۴

۹۳۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر، لکھنو کا شعر و ادب، الفلاح پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص۶۵

۹۴۔ عبدالحلیم شرر، لیلائے اخیلیہ، سیر نسواں، حصہ اوّل، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص۱

۹۵۔ ایضاً، ص۲

۹۶۔ عبدالحلیم شرر، ربا ملکہ عرب، سیر نسواں، حصہ اوّل، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص۱۰

۹۷۔ عبدالحلیم شرر، حسن کی کرشمہ سازیاں، سیر نسواں، حصہ دوم، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۲۰

۹۸۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۹۱

۹۹۔ ایضاً، ص۹۴

۱۰۰۔ یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء، ادارہ فروغ ادب، لاہور، ص۵۷

۱۰۱۔ عبدالحلیم شرر، راخیل، سیر نسواں، حصہ دوم، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص۲

۱۰۲۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۸۳

۱۰۳۔ عبدالحلیم شرر، مجنوں عامری، سیر رجال، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص۳

۱۰۵۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۸۴

۱۰۶۔ عبدالحلیم شرر، حاتم طائی، سیر رجال، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۱۳

۱۰۷۔ ایضاً، ص۱۳

۱۰۸۔ ایضاً، ص۱۴

۱۰۹۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۸۳

۱۱۰۔ عبدالحلیم شرر،، فلسفہ تصوف اور اسلام، سیر رجال، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۲

۱۱۱۔ ایضاً، ص۸

۱۱۲۔ عبدالحلیم شرر، عربی سے فارسی و اردو کے تعلقات، مضامینِ شرر جلد چہارم، گیلانی پریس، لاہور، س۔ن، ص۱۷

۱۱۳۔ عبدالحلیم شرر، اسلام اور تھیٹر، ادب و تحقیق مسائل، جلد چہارم، ص۲۳

۱۱۴۔ عبدالحلیم شرر،، ریش مقدس، جلد چہارم، ص۵۸۔۵۹

۱۱۵۔ عبدالحلیم شرر، دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء، ادب وتحقیق مسائل، ص ۱۶۲

۱۱۶۔ عبدالسلام، پروفیسر، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۴۲

۱۱۷۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔۱۰۳۔۱۰۴

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۱۹۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۹۸

۱۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۲۱

۱۲۱۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، جلد پنجم، اصلاح قوم وملت، ص ۲۶۔۲۷

۱۲۲۔ عبدالحلیم شرر، ہندو مسلمانوں کا اتحاد، اصلاح قوم و ملت، جلد پنجم، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص ۳۳

۱۲۳۔ عبدالحلیم شرر، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۸۸

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۷

۱۲۵۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص ۸۸

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۸۲

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۸۲۔۸۳

۱۲۸۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر (حیات اور کارنامے)، ص ۱۱۵

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۳۲۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، جلد ہفتم، زمانہ اور اسلام، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص ۱۹

۱۳۳۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر (حیات اور کارنامے)، ص ۱۲۱۔۱۲۲

۱۳۴۔ عبدالحلیم شرر، شادی وغم، مضامین شرر، جلد ہفتم، ص ۱۰۵

۱۳۵۔ عبدالحلیم شرر، گم شدگان سلف، مقالات شرر، جلد ہشتم، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص ۴۷

۱۳۶۔ سرسید احمد خان، مضامین سرسید، مرتب و مقدمہ، غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ز

۱۳۷۔ جاوید اختر بھٹی، عبدالحلیم شرر کے دل گداز کے مضامین کا مجموعہ، مشمولہ، ماہ نو، جلد ۶، شمارہ ۲۰، ۲۰۰۷ء، ریجنل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۴

۱۳۸۔ محمد طفیل، نقوش، افسانہ نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، طبع ثانی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۸

۱۳۹۔ آل احمد سرور، ہمارا ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۷

۱۴۰۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین، دار الاشاعت غازی آباد، دہلی، ۱۹۳۴ء، ص۲۰۰

۱۴۱۔ سید احتشام حسین، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۵۶ء، ص۸۴

۱۴۲۔ سجاد نقوی، مطالعہ، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۲۰۹۔۲۱۰

۱۴۳۔ حفیظ الرحمٰن خان، خیال و نظر، کاروان ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۲۲

۱۴۴۔ محمد ارشاد، انشائیہ اور انشائیہ نگاری، مشمولہ فنون، شمارہ ۲۱، جولائی اگست ۱۹۸۲ء، میکلوڈ روڈ، لاہور، ص۴۷

۱۴۵۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۲۴

۱۴۶۔ جمیل آذر، اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۶ء، ص۸

۱۴۷۔ مشکور حسین یاد، کیا انشائیہ ایک سنجیدہ صنف ادب ہے، مشمولہ فنون، شمارہ، ۱۵، ۸۰، ۱۹۸۱ء، میکلوڈ روڈ، لاہور، ص۱۱۴

۱۴۸۔ شہزاد قیصر، صاف چھپتے بھی نہیں (انشائیے) بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۷ء، ص۱۵

۱۴۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۳۵

۱۵۰۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۲۱۴

۱۵۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، انشائیہ ایک بحث، مشمولہ، اوراق، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء، لاہور، ص۲۶۹

۱۵۲۔ وزیر آغا، دوسرا کنارہ، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص۱

۱۵۳۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، ص۴

۱۵۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، خیال پارے، اکادمی پنجاب، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص۱۱

۱۵۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۱

۱۵۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، مکتبہ جامعہ، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۲۹۶

۱۵۷۔ انور سدید، ڈاکٹر بحوالہ لطیف ساحل، انشائیہ اور اردو ادب، الحمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۳۳

۱۵۸۔ لطیف ساحل، اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش، الحمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۳۸

۱۵۹۔ ایضاً، ص۴۲

۱۶۰۔ یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء، ص۱۷

۱۶۱۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، ص۱۱۷

۱۶۲۔ سلیم آغا قزلباش، مغرب کے انشائیے، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۰

۱۶۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۱۶۲

۱۶۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، ص۲۰۷

۱۶۵۔ حفیظ الرحمٰن خان، خیال و نظر، ص۶۱۔۶۲

۱۶۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، نویں جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۳۷۲

۱۶۷۔ **لطیف ساحل**، اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش، ص۴۷۔۴۸

۱۶۸۔ سید علی شاہ، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۷۲۔۷۷۔۷۹

۱۶۹۔ ایضاً، ص۷۰

۱۷۰۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، تاریخی وجغرافیائی، ص۵

۱۷۱۔ ایضاً، ص۶۸

۱۷۲۔ عبدالحلیم شرر، گرج یا چرکس، تاریخی وجغرافیائی، گیلانی پریس، لاہور، س۔ن، ص۱۹۴۔۱۹۵

۱۷۳۔ سید علی شاہ، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۷۵

۱۷۴۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، تاریخی وجغرافیائی، ص۱۰۷، ۱۲۰، ۱۲۴۔۱۲۵

۱۷۵۔ سید علی شاہ، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۷۶

۱۷۶۔ عبدالحلیم شرر، جاہلیت کا شجاعانہ عشق، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، مکتبہ کلیاں لکھنو، ۱۹۲۱ء، ص۳۸۔۳۹

۱۷۷۔ عبدالحلیم شرر، وفائے عہد، مشمولہ تاریخی واقعات پر خیال آرائی، ص۶۴

۱۷۸۔ عبدالحلیم شرر، ایک چھوٹے ذرے کی سرگزشت، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، ص۷۷

۱۷۹۔ عبدالحلیم شرر، مضمون ایثار نفس، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، ص۱۰۷

۱۸۰۔ عبدالحلیم شرر، خلفائے بنی امیہ کا ادبی مذاق، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، مکتبہ کلیاں لکھنو، ۱۹۲۱ء، ص۱۸۵

۱۸۱۔ عبدالحلیم شرر، ایک کمسن بدویہ کی فصاحت وطباعی، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، ص۲۷۵

۱۸۲۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۹۹۔۱۰۰

۱۸۳۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، مقدمہ: سلیم اختر، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۲۶

۱۸۴۔ رشید حسن خان، مرتب، گزشتہ لکھنو، عبدالحلیم شرر، جامعہ مکتبہ، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص۳۱۔۳۲

۱۸۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۱۰۸

۱۸۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، انشائیہ اردو ادب میں، مکتبہ فکر وخیال، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۱۶۹

۱۸۷۔ ایضاً، ص۴۶

۱۸۸۔ رشید حسن خان، گزشتہ لکھنو، ص۳۳

۱۸۹۔ اکبر حمیدی، تتلی کے تعاقب میں، ص۹

۱۹۰۔ رضی عابدی، تیسری دنیا کا ادب، مکتبہ فکر ودانش، لاہور، س۔ن، ص۱۴۶

۱۹۱۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۱۷

۱۹۲۔ جمیل آذر، رت کے مہمان، مکتبہ فکر و خیال، لاہور،۱۹۹۴ء، ص۱۳

۱۹۳۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، لاہور،۱۹۶۴ء، ص۲۱۰

۱۹۴۔ ایضاً، ص۲۱۲

۱۹۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۴۰۷

۱۹۶۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۹۴

۱۹۷۔ سلیمان بٹ، انشائیہ ۱۹۸۱ء، مسعود پرنٹرز، لاہور،۱۹۸۲ء، ص۲

۱۹۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کا اسلوب، مشمولہ، فنون، شمارہ ۲۳، میکلوڈ روڈ، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۵، ص۷۰

۱۹۹۔ اکبر حمیدی، مضامین غیب، بٹر پبلشرز، اسلام آباد،۱۹۹۳ء، ص۱۳۲

۲۰۰۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۸۷

۲۰۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، ص۱۰۸۔۱۰۹۔۱۱۰

۲۰۲۔ جعفر رضا، عبدالحلیم شرر (حیات اور کارنامے)، ص۱۰۴۔۱۰۵

۲۰۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، ص۱۰۵۔۱۰۶۔

۲۰۴۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، ص۶۹

۲۰۵۔ ایضاً، ص۱۰۰

۲۰۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص۹۳۔

۲۰۷۔ اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو (انشائیے)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص۳

باب چہارم

عبدالحلیم شرر بطور مؤرخ رپورتاژ نگار اور نقاد

الف۔فن تاریخ نویسی ایک مطالعہ

ہمیشہ سے انسان تاریخ میں دلچسپی لیتا رہا۔ ماضی کے گزرے ہوئے لمحات اور اس کی یادیں ایک طرف اسے ایک رومان پرور ماحول اور خوش گوار فضا میں لے جاتی ہیں تو دوسری طرف ایک صحت منداور زندہ رہنے کی قوت بخشتی ہیں۔ انسان کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ رہتی ہے کہ گذری ہوئی دنیا، تجربوں، کارناموں اور خوشگوار یادوں کا حسین مجموعہ ہوتی ہے۔لہٰذا اس سے مواد، روشنی اور آگے بڑھنے کی قوت حاصل کیے بغیر ارتقاء کی طرف مائل رہنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ ذہن اور تہذیب وسماج کی ارتقائی منزلیں اسی انداز سے طے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں جہاں سائنس، نفسیات، لٹریچر اور دیگر علوم نے اپنی ایک منفرد حیثیت منوالی ہے وہاں دیکھا جائے تو تاریخ کا بھی اپنا ایک الگ مقام ہے۔ ماضی کے تجربوں اور کارناموں کو تلاش کر کے انھیں عروج بخشنا آج کے علم وادب کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کا تعلق عوام، سماج اور تہذیب سے ہوتا ہے، چونکہ وقت تغیر پذیر ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کی تہذیب وثقافت کا معیار تبدیل ہوتا رہا۔تبدیلیاں انسانی ذہن کے کمال وزوال کے اصولوں کو متعین کرتی ہیں۔تاریخ ہمیں پچھلے عہد میں واپس لے جاتی ہے۔ پرانی اقدار، پرانی روایات، رسم ورواج، رہن سہن اور تہذیب وثقافت کو یہ علم روشن کرتا ہے۔تاریخ مری ہوئی چیزوں کو دوبارہ زندہ کرتی ہے اور گذشتہ سرمائے کو برباد ہونے سے بچاتی ہے۔حقیقتاً ماضی کی دنیا اندھیری ہوتی ہے۔ ذروں کی طرح بکھری ہوئی ہوتی ہے۔تاریخ اس اندھیری دنیا میں مشعل کا کام کرتی ہے اور پوری چمک دمک اور آب و تاب کے ساتھ گذشتہ تصویر کا عکس دکھاتی ہے۔

تاریخ کو ہم ماضی کی طرف دیکھتی ہوئی مڑتی ہوئی وسیع دنیا کہہ سکتے ہیں۔گذرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچ بچار، انہیں یاد کرنا اور ان یادوں کو محفوظ کرنے کا نام اصل میں تاریخ ہے۔اس سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ تاریخ ماضی کی جانب مڑ کر دیکھنے کا نام ہے۔ یہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ ہم ماضی کی طرف کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ زندگی کا اضطراب بہتر سے بہتر انداز میں زندگی گزارنے کی خواہش ہمیں ماضی کی طرف لے جاتی ہے۔مورخ ماضی کے انھیں کارناموں کی تلاش وتجزیہ کرتا ہے

جس کی روشنی سے حال کوتقویت پہنچتی ہے۔

مورخ جب تاریخ لکھ رہا ہوتا ہےتو اس کے ذہن میں حال کی تمام صورتیں رقص کرتی رہتی ہیں۔انھیں کی تشکیل وتنظیم کے لیےمورخ پیچھے کی طرف دیکھتا ہے۔ان حالات وواقعات کوپیش کرتا ہے۔تاریخ خواہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو اوراس کے عناصر کتنے ہی قدیم دور سے تلاش کیے گئے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ واقعات اورموجودہ ضرورتوں سے اس کارشتہ اپنے آپ جڑ تا رہتا ہے۔ماضی میں بےشمار واقعات رونما ہوتے ہیں۔یہ تمام واقعات تاریخ نہیں بنتے۔ مورخ صرف انھیں واقعات کا مطالعہ کرتا اورپیش کرتا ہے جواپنے آپ میں انفرادیت اورمخصوص چمک رکھتے ہیں۔جس ماضی کا نقشہ مورخ پیش کرتا ہےوہ حال میں بھی زندہ رہتا ہے۔تاریخ کی دنیا اصل میں غوروفکر اورمطالعہ کی دنیا ہے۔ تاریخ عربی زبان کالفظ ہے۔تاریخ کے لیے انگریزی میں''ہسٹری''کالفظ استعمال ہوتا ہے جولاطینی لفظ''ہسٹوریا''سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی اطلاع،تحقیق اورمعلومات کے ہیں۔لغوی اعتبار سے وقت سے آگاہ کرنےکوتاریخ کہتے ہیں۔ کسی چیز کےوقوع پذیر ہونے کاوقت بتانے کولغوی طورپر تاریخ کا نام دیا جاتا ہے۔تاریخ کا مادہ عربی لفظ ارخ ہےجس کےمعنی القاموس، المنجد اورمحیط المحیط میں احادیث اورحقائق کا مجموعہ بتائے گئے ہیں۔رشید اختر قمطراز ہیں:

> صاحب کشف الظنون کے بیان کی رو سےلغوی لحاظ سے تاریخ کےمعنی محض وقت کے ہیں۔کہا گیا ہے کہ عرفاً تاریخ سے مراد کسی ایک وقت کاتعین ہے جس کی طرف کسی زمان کی نسبت کی جا سکے۔خواہ یہ ماضی ہویا مستقبل طرف اورلغت دونوں سے قطع نظر لفظ تاریخ جب علم کی سبب منسوب ہواتو اس کی تعریف قطعاً اور ہی ہوگی۔علم تاریخ سے مراد وہ معرفت ہے جوانسانی گروہوں، ان کے شہروں، ان کے رسوم ورواج اوران کے اشخاص کےکارناموں اورانساب سے متعلق ہے.....[۱]

ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کےمتعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:''۲صدی ہجری میں تاریخ کا لفظ ایسی کتابوں کے لیے استعمال ہوا کہ جن میں تاریخ (Date) ہوتی تھی اوروہ کتابیں جن میں واقعہ کی تاریخ بیان نہیں کی جاتی تھی وہ تاریخ نہیں کہلاتی تھی۔''[۲] فرانس کامشہورادیب ومفکر اناطول فرانس ایک مصنف کی رائے پیش کرتا ہے:

> تاریخ دھوکہ دینے والی۔قوی لوگوں کی حامی، بادشاہوں کی وظیفہ یاب مصاحب،عوام الناس کی دشمن، انصاف کی مخالف اور دورغ گو ہے حقیقی تاریخ عمرانی واقعات کا وہ علم ہے جو اعدادوشمار کےذریعے سے ظاہر کیا گیا ہو۔[۳]

اس کے برعکس انگلستان کا نام ورادیب ومفکر ایچ جی ویلس نسل انسانی کی تاریخ کواپنی اہمیت اورفائدہ

کے لحاظ سے کتاب مقدس کا ہم پایہ اور بدل قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

......ہمیں نسل انسان کی تاریخ لکھنی ہے۔ کس طرح لاکھوں برس میں اس نے قدرت پر قابو پایا، شکار کھیلنا سیکھا، زراعت کی، پھل کاٹے، کس طرح دھاتوں کے راز معلوم کیے۔ کس طرح موسموں کے معمے حل کیے اور سمندر کو پار کیا۔ نسل انسان کی مشترکہ وارثت اور تدریجی ترقی کی کش مکش تمام بنی نوع آدم سے اور سب سے بڑھ کر جھونپڑوں اور دور از راہ کسانوں کے گھروں میں بیان کرتی ہے۔ یہ تاریخ مشروطہ امیدوں انسانی امکانات کی امیدوں کی داستان ہوگی جس میں گناہوں، غلطیوں اور کھوئے ہوئے سنہرے موقعوں کے حالات ہوں گے ......وہ ہماری زندگی کے ایک ایسے مشترکہ مستقبل کی طرف رہبری کرے گی جو ہماری موجودہ زندگیوں کا انعام اور اس کا محاکمہ ہوگا۔[۴]

محمد صالح طاہر لکھتے ہیں:

تاریخ دنیا کا قدیم ترین علم ہے۔ اسے تمام علوم کی شہ رگ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ ماضی کی سیاست کا نام تاریخ اور حال کی تاریخ کا نام سیاست ہے۔ کچھ مشہور مورخین نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

۱۔ تاریخ سے مراد تلاش حق ہے۔ (ہیروڈوٹس)

۲۔ تاریخ درحقیقت انسانی معاشرے کے بارے میں معلومات کا نام ہے۔ (ابنِ خلدون)

۳۔ تاریخ مختلف سوانح عمریوں کا نچوڑ ہے۔ (کارلائل)

۴۔ تاریخ سائنسی طرز فکر اور ماضی کی مکمل داستان ہے۔ (دی ڈی گھاٹے)

۵۔ تاریخ تحقیق و تفتیش کا نام ہے۔ (کالنگ وڈ)

۶۔ تاریخ انسانی تجربات کی سچی اور اصل معدن ہے۔ (جانسن)

۷۔ تاریخ زیادہ تر اس سوال کا جواب فراہم کرتی ہے کہ واقعات کس طرح رونما ہوئے۔ (برٹرینڈ رسل)

۸۔ تاریخ صرف عجائبات زمانہ کا نام نہیں بلکہ اس میں ہر گزشتہ واقعہ کا پتہ لگانا اور اس کو ترتیب دینا جس سے پتہ چلے کہ موجودہ واقعہ گذشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا، تاریخ کہلاتا ہے۔(شبلی نعمانی)

۹۔ انسانی خطا پذیر شہادت وضم کے مطابق قصہ ہائے پارینہ کا زیادہ صحت کے ساتھ بیان تاریخ کہلاتا ہے۔(انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا)

۱۰۔ تاریخ تمام اقوال واعمال انسانی کا علم ہے۔(کارل ہیکر)

۱۱۔ تاریخ باہمی رضامندی سے اپنائے گئے واقعات اور قصوں کا نام ہے۔(نپولین)

۱۲۔ انبیاء، خلفاء، سلاطین اور بزرگان دین ودولت کے حالات وواقعات سے واقف ہونے کا نام تاریخ ہے۔(ضیاء الدین برنی) [5]

بقول آرنلڈ ٹائن بی: ''تاریخ انسانی زندگی کے تمام حقائق کو ضبط تحریر میں لانے سے سروکار نہیں رکھتی ...... بلکہ صرف حقائق سے تعلق رکھتی ہے''۔[6]

تاریخ کا علم قدیم علم ہے اور اسے تمام علوم کی شہ رگ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے ہم ماضی کی مکمل داستان بھی کہہ سکتے ہیں۔تاریخ انسانی تجربات کو ضبط تحریر میں لانے کا دوسرا نام ہے۔ یہ علم کی وہ شاخ ہے جس کے ذریعے سے ہم وہ سب کچھ جان سکتے ہیں جو ماضی میں ظہور پذیر ہوا اور اس سے ہم اچھا یا برا درس بھی حاصل کر سکتے ہیں۔کسی بھی عہد کی تاریخ رقم کرتے ہوئے ایک مورخ کو کئی سرکاری وغیر سرکاری رسمی اور غیر رسمی، دستاویزی وغیر دستاویزی معاونین سے معلومات حاصل کرنی پڑتی ہیں۔تاریخ لکھتے وقت مورخ کو معاہدے ونشور گرانٹ خفیہ رپورٹیں، سرکاری ریکارڈ، سرکاری اعلانات چارٹر، خط وکتابت، روزنامچے، مذہبی ریکارڈ، سیاحوں کے قصے، سفرنامے، سوانح عمریاں، آپ بیتیاں، تذکرے، ڈائریاں، اقرارنامے، یادداشتیں، رٹ، وصیت نامے، بہی کھاتے اور رول یا عدالتی ریکارڈ وغیرہ سے معلومات حاصل کرنی پڑتی ہے۔آثار قدیمہ، قدیم عمارات، کتبے، سکے اور قدیم آرٹ بھی اس کے لیے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

تاریخ نویسی چونکہ ایک ذمہ داری کا کام ہے۔لہٰذا مورخ کا انداز بیان مرصع اور مرقع نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا انداز بیان عام فہم، سادہ اور واضح ہونا چاہیے تاکہ تاریخی واقعات کی صحت متاثر نہ ہو اور پڑھنے والا بھی بآسانی سمجھ سکے کہ مورخ کہنا کیا چاہتا ہے۔مورخ کو غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔قصہ گوئی اور داستان طرازی کی بجائے اسے حق

گوئی اور بے باکی کو اپنانا چاہیے۔ وہ جو کچھ دیکھے اور جس انداز میں دیکھے اسے اسی طرح بیان کر دے۔مورخ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جو کچھ بھی بیان کرے اس کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرے۔مورخ کے لیے لازم ہے کہ وہ جس عہد کی تاریخ رقم کرنے پر مامور ہے، اپنے آپ کو اسی کے حسب حال ڈھال لے، تاکہ اس عہد کی صحیح عکاسی کرنے میں کامیاب ہو سکے۔صحیح تاریخ مورخ اسی وقت لکھ سکتا ہے جب وہ اپنے آپ کو اسی عہد اور ماحول کا فرد بنالیتا ہے، جس دور کی تاریخ وہ لکھ رہا ہے۔تاریخ لکھتے وقت آدمی کو مذہبی تعصب کی عینک اتار دینی چاہیے۔اپنی رائے قائم کرنے میں مورخ کسی حد تک آزاد ضرور ہوتا ہے لیکن حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا مختار نہیں۔اس لیے کہ آزادی رائے کے باوجود حقائق مقدس ہوتے ہیں۔تاریخ نویسی سے تحقیق وتدقین سب سے اہم اور ضروری چیز ہے۔مورخ کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے اور تاریخ نویسی کے لیے موضوع سے ہٹ کر کچھ نہیں کہنا چاہیے۔تاریخ نویسی میں کسی بھی قسم کی مقصدیت نہیں آنی چاہیے۔تاریخ نویسی صرف بزرگان دین، اکابر مملکت، حاکم اور واقعات جنگ کے ذکر تک محدود نہیں ہوتی اور اس کا کسی خاص عہد، زمانے، وقت اور ماحول سے بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا۔افسانہ، ڈرامہ، داستان اور ناول نگار کی طرح مورخ کے ذہن میں پہلے سے کوئی خاکہ یا پلاٹ نہیں ہونا چاہیے۔مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعہ و کردار کو جس رنگ جس انداز میں دیکھے اسی طرح بیان کر دے۔

مورخ کے لیے مولوی ذکاءاللہ نے چند شرائط کا ذکر کیا ہے:

> شرط اول: تاریخ نویس سالم العقیدہ و پاک مذہب ہو کیوں کہ بہت سے بے دین مشورو مسجو دو مردود وقبول باتیں اپنی تصنیفات میں داخل کر کے آدمیوں کو فریب دے دیتے ہیں اور جس شخص کو ان کے اصل کید وخدع پر اطلاع نہیں ہوتی وہ اس کی سب باتوں کو صحیح جانتا ہے۔
>
> شرط دوم: مورخ جو کچھ لکھے وہ بیان واقعہ ہو اور تمام حالات کو قید کتابت میں لائے۔جیسے اعیان اور اکابر کیفصائل وخیرات وعدل واحسان کا بیان ہوا ایسے ہی ان کے طرز رذائل اور عیوب کا ذکر ہو۔ان میں سے کوئی چھپایا نہ جائے۔اگر دوسری بات کو بالتصریح نہ بیان کر سکے تو رمز کنایہ وایماو اشارت سے بیان کرے۔
>
> شرط سوم: مدح و ذم افراط تفریط سے خالی ہو۔اپنے جلب منفعت اور دفع مضرت پر نظر نہ ہو۔بلکہ صدق معاملہ اور صحت واقعہ پر توجہ ہو۔
>
> شرط چہارم: تاریخ نویس جو کچھ لکھے۔اس میں تکلف و بناوٹ نہ ہو اور سیاق کلام ایسا

اختیار کرے کہ اس کے کلمات واضح اور تقریرات شافی ہوں اور عبارت پاک، سلیس، عام فہم ہو اور رکاکت کلمات و دناءت الفاظ اور لغات نازلہ و عبارات سافلہ سے ابعاد اور اجتناب لازم جانے تا کہ ہر ایک آدمی عوام میں سے بہ قدر اپنی عقل و فہم کے اس سے لطف اٹھائے۔ ایسی تالیفات اکثر قبول ہوتی ہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد مردود ہو جائیں۔

شرط پنجم: تاریخ نویس امانت و دیانت میں معروف اور صدق گفتار اور حسن کردار میں مشہور ہو۔ مورخ پر یہ اعتبار ضروری ہونا چاہیے کہ وہ اپنی راستی کو دنیا کے لیے نہیں فروخت کرے گا اور جھوٹ لکھ کر اپنے تئیں بدنام نہیں کرے گا۔[7]

تاریخ کی کئی صورتیں ہوتی ہیں جن کا ذکر مستند تاریخی کتب میں ہوتا ہے۔

''خبریہ تاریخ''، ''روزنامچہ تاریخ''، ''مقامی تاریخیں''، ''طبقات''، ''سوانح نگاری''

ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کی اقسام کے متعلق لکھتے ہیں:

جب عباسی خلافت کو زوال ہونا شروع ہوا اور خودمختار سلطنتیں ابھرنا شروع ہوئیں تو اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں اہم سیاسی و سماجی طبقات بھی پیدا ہوئے اور اس کے نتیجہ میں تاریخ نویسی کی مختلف قسمیں وجود میں آئیں۔ جن میں عالمی تاریخ، علاقائی تاریخ یا مقامی تاریخ، شہروں کی تاریخ، حکمران خاندانوں کی تاریخ اور اہم سماجی طبقوں کی تاریخ، سوانح حیات، ذاتی یاداشتیں، انتظامی اور دستور العمل شامل تھیں۔ اس کے علاوہ خاص اور اہم موضوعات پر بھی تاریخیں لکھی گئیں جیسے ادبی اور سائنسی موضوعات۔[8]

تاریخ کے مطالعے سے شعور کی نشو و نما ہوتی ہے۔ عقل و دانش میں اضافہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ کمالات کے حامل افراد کی داستانوں کے مطالعہ سے ویسا بننے کی لگن و تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ حضرت حسینؓ جیسے شہدا اور سقراط جیسے حکماء کے حالات وواقعات پڑھ کر انسان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے نیک نام اور دانش مند حکمرانوں کے طرزِ حکومت اور ان کے عہد کی ایجادات و خصوصات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ کے علم سے ترقی کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ ورنہ تاریخ کے علم کے بغیر ترقی کا پہیہ رک جاتا ہے۔ اسلاف کی تحقیقات کی مدد سے علمی دنیا میں آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ علم تاریخ سے نگاہ میں وسعت اور قلب و ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ ایک انسان

جو تاریخ عالم سے بے خبر ہوتا ہے اور دوسرا جو تاریخ عالم اقوام کا علم رکھتا ہے اقوام عالم کے ادوارِ حیات، ان کی جد وجہد، آثار و میراث اور علوم وفنون سے آگاہی رکھتا ہے اس کے نقطۂ نظر اور سوجھ بوجھ میں دوسرے انسان کی بدولت زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ تاریخ کا مطالعہ درس ہدایت دیتا ہے۔ وہ اقوام جن کا ماضی تابدار ہوتا ہے۔ تاریخ ان کی نسل نو کو باعزم و بلند نظر بنا دیتی ہے۔ وہ اقوام جن کے آبا و اجداد مصنف، ادیب، فاتح، مورخ یا حکمران تھے۔ تاریخ کا مطالعہ ان کی نئی نسل کو بھی ان جیسا بننے پر اکساتی ہے۔ مطالعہ تاریخ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کرہ ارض پر کون کون سی قومیں آباد تھیں؟ ان کے طرزِ معاشرت اور اس کے اثرات ان کے عروج و زوال کی داستان یہی علم سناتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کل کون آباد تھے اور آج کون کہاں کہاں قیام پذیر ہے؟ زمین کے طول و ارض اور حجابِ ماضی کو یہی علم اٹھاتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے انسان کی عقل اور رائے کو پختگی اور کمال حاصل ہوتا ہے۔ صبر و رضا کا مادہ انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ انبیائے کرام اور رسل اعظم کے حالات کو دیکھے گا کہ کیسے کیسے مصائب سخت ان پر واقع ہوئے اور کس صبر و رضا کا انہوں نے مظاہرہ کیا۔ تو وہ بھی اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ حکمرانوں اور قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھ کر انسان عبرت حاصل کرتا ہے۔ مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی لکھتے ہیں: ''علم تاریخ زیادتی عقل کا سبب اور ازدیادِ فضل کا واسطہ اور صحت رائے و تدبیر کا وسیلہ ہوتا ہے ......''[۹] انسان ابھی نیم وحشی دور اور قبائلی تمدن سے آگے نہ بڑھا تھا کہ اسے اپنے آباؤ اجداد اور ناموروں کے کارناموں کو محفوظ کرنے کا خیال آیا۔ ان کی یاد میں رزمیہ گیت اور منظوم کہانیاں جو کہ جلد زبان زدِ عام ہوں اور لوگوں کو یاد بھی رہیں۔ ان کی ابتداء ہوئی۔ اس کے بعد رسم الخط اور تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتدائی شکل وہ کتبے اور Ideograms ہیں جو ہمیں پہلے مصر اور پھر بابل میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد تشریحی تاریخ کی روایت نے جنم لیا۔ اس کے بعد بیانیہ اور عالمگیر تاریخ کا رواج ہوا اور بقول ڈاکٹر محمد خان اشرف:

> فنیقی لوگوں میں (Phoenicians) وسیع پیمانہ پر بحری تجارت کے ساتھ ساتھ باضابطہ رسم خط کا رواج پڑا اور اس کی وجہ سے بیانیہ (Narrative) تاریخ کا نیا باب کھلا۔ بیانیہ تاریخ فنیقوں سے شروع ہو کر فلسطین، یونان اور بابل کے زیر اثر شام میں رائج ہوئی اور یہودیوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کتاب الایام (Book of Days) لکھی جو ایک مرکزی تصور کے ماتحت مرتب تاریخ لکھنے کی پہلی مثال ہے......[۱۰]

ہیروڈوٹس کو بجا طور پر بابائے تاریخ کا لقب دیا گیا۔ اس سے قبل کوئی باضابطہ تاریخ نہیں ملتی۔ تاریخ کی اصطلاح سب سے پہلے افلاطون نے طبیعات کے سلسلے میں استعمال کی تھی۔ ہیروڈوٹس کے ہاں واقعات مربوط ہیں یہی وجہ ہے کہ اسے پہلا مورخ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد تھیوسی ڈائڈس نے حکیمانہ تاریخی ادب کی ابتدا کی۔ اس کے بعد پولی بیس (Polybius) نے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

یہ تو تاریخ نویسی کا پہلا دور تھا۔ اس کا دوسرا دور ظہور اسلام سے شروع ہوا اور اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں نے اس فن میں صحت اسناد، ترتیب واقعات کی اعلیٰ پایہ روایتیں قائم کیں جس سے تاریخ میں بڑی جان پڑی اور علم بننے کی صلاحیت فن تاریخ میں پیدا ہوئی۔ اسلام میں فن تاریخ کی ابتدا مغاذی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اکرام کی جنگوں کے بیان سے ہوئی۔ اس کا ایک جزو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جس کی بنیاد سیرۃ ابن اسحاق سے پڑی اس کے بعد ابن ہشام، ابن سعد اور الواقدی نے فن سیرۃ کو مستحکم بنیادیں عطا کیں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے:

> سیرت کے مواد کو مورخوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت اسماعیل تک اور حضرت اسماعیل سے رسول اللہ تک اور رسول اللہ کے عہد آپ کی وفات تک۔ تاریخ کا یہ مواد توریت، انجیل، عرب قبیلوں کے نسب ناموں اور قرآن وحدیث سے لیا گیا۔[11]

چودھویں صدی میں ابن خلدون نے حکیمانہ تاریخ کی روایت کو از سرنو زندہ کیا اور اسے جدید علم تاریخ کا مورث اعلیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ یورپ میں تاریخ کے جدید دور کی ابتداء اٹھارویں صدی میں اور یونان کے تتبع سے ہوئی بعد میں یہ فن مسلسل ارتقاء کی منازل طے کرتا رہا۔ برصغیر پاک وہند میں انگریزوں کے دور حکومت میں سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی، ذکاء اللہ، امیر علی اور شبلی وشرر نے اس فن کو ترقی دی۔ ڈاکٹر وقار عظیم رقمطراز ہیں:

> اپنی ابتداء سے آج تک تاریخ نے کئی کینچلیاں بدلیں۔ ارتقاء کے سینکڑوں روپ دھارے اور ہزاروں بھیس اختیار کیے ہیں۔ قصے سے حقیقت، کہانی سے سائنس، حقیقت سے فلسفے اور آرٹ سے وجدان (Intuition) کی حد تک پہنچنے کے لیے اسے ایک طویل سفر طے کرنا پڑا ہے۔ اس طویل سفر کے تجربات نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، آج تاریخ ساری دنیا کے علوم کی شہ رگ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔[12]

تاریخ کے متعلق آرنلڈ جے ٹائن بی کا خیال ہے: ''ڈرامے اور ناول کی طرح تاریخ بھی اساطیر سے پیدا ہوئی۔ یہ ادراک و اظہار کی ایک قدیم شکل تھی ......۔''[13] اپنی ابتداء سے لے کر آج تک تاریخ نے ارتقاء کی کئی منازل طے کیں اور کئی ایک روپ دھارے اور بھیس بدلے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج تاریخ تمام علوم کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ ادراک و اظہار کی قدیم ترین شکل ہے۔

ب۔ عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی کے محرکات و مقاصد

عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی کا اگر جائزہ لیجئے تو تاریخ لکھتے وقت ان کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔

اول: یہ کہ وہ کسی طرح ان غلط فہمیوں کو دور کریں جو غیر مسلم مورخین نے مسلمانوں کے خلاف پھیلا رکھی ہیں۔

دوم: وہ شکست خوردہ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے آباؤاجداد کی عظمت کی داستانیں سنا کر احساس کمتری دور کرنا چاہتے تھے۔ جو جنگ آزادی میں شکست کھانے پر ان کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی۔

شرر کو قدرت نے مورخ کا ذہن و دل عطا کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو مورخ کی باریک بین نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی نظر میں ان کے آباؤاجداد کو گرانے کی کوشش کی تو شرر نے ''سلسلہ نامورانِ اسلام'' کے نام سے عظیم مسلمان رہنماؤں پر کتابیں لکھ کر مسلمانوں کو ان کے آباؤاجداد کی عظمت کے گیت سنائے۔ شرر نے جب تاریخی واقعات پر قلم اٹھایا تو ان کے سامنے اپنی تاریخ نویسی کا یہی مقصد تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تاریخی کتب میں کئی ایسے واقعات قلم بند کیے جن سے مسلمانوں کے دل میں ان کے آباؤاجداد کی یاد تازہ ہوجائے۔ ان کی تاریخ نویسی میں ایسے تاریخی واقعات زیادہ ہیں جن میں مسلمانوں کی عظمت کی جھلک نمایاں ہے۔ شرر کی تاریخ نویسی کا زمانہ برصغیر پاک و ہند پر انگریزی تسلط کا ہے۔ ہندوستان کی حکومت سنبھالتے ہی انگریزوں نے یہ کام شروع کیا کہ ایک طرف عوام کو اپنی عظمت کے قصے سنا کر مرعوب کرنے کی کوششیں شروع کیں اور دوسری طرف انہوں نے کوشش کی کہ جس طرح بھی ہو مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جائے تاکہ وہ گردن اٹھا کر دیکھنے کے قابل نہ رہیں۔ انھیں اپنے آباؤاجداد سے اتنی نفرت ہوجائے کہ وہ ان کا نام لیتے ہوئے شرمائیں۔ شبلی نعمانی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہمیں کو یقین آ چلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔[۱۴]

اس غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری کو کم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اسلامی تاریخ کے زرین اوراق الٹ کر دکھائے جائیں جن سے مسلمانوں میں یہ احساس ابھرے کہ ہم ایک ایسے دین سے تعلق رکھتے ہیں جس کی عظمت و بلندی اور بڑائی کے سامنے بڑی بڑی قومیں پست اور ہیچ نظر آتی ہیں۔ اسی تاریخ نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس ابھارا اور قوم کے اندر آزادی کے جذبات کو فروغ بخشا۔ ڈاکٹر مبارک علی کا خیال ہے: ''برصغیر کی

تحریک آزادی میں تاریخ نویسی نے نہ صرف قوم میں آزادی اور حریت کے جذبات کو پیدا کیا بلکہ سوئے ہوئے قومی جذبات کو ابھارا اور غیر ملکی اقتدار سے جدوجہد کا حوصلہ بیدار کیا۔"[۱۵]

عبدالحلیم شرر کے نزدیک تاریخ نویسی کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کے اس احساس کمتری کو دور کیا جائے۔ جنگ آزادی میں شکست اور ناکامی کے بعد ان کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ انہی کی تاریخ نویسی نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے قومی جذبات کو ابھارا۔ ان کے اندر آزادی و حریت کے جذبات پیدا کیے اور غیر ملکی اقتدار سے نجات کا حوصلہ پیدا کیا۔ عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے وقار عظیم کہتے ہیں:

......ان کی تصانیف کا بنیادی جذبہ بھی اسلام کے شاندار ماضی کا احیاء اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی برتری کا اظہار ہے۔ شبلی کی طرح یہ بھی اسلام کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ لیکن ان کے گیت شبلی کے گیتوں سے بہت مختلف ہیں۔ شبلی کے ہر گیت کی لے سے مسلمانوں کی عظمت اور شہادت کی آواز پھوٹتی سنائی دیتی ہے اور شرر کی ہر لے میں رنج و غم کی پکار ہے۔ شبلی مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے مدح خواں ہیں اور شرر مرثیہ خواں۔[۱۶]

ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی رقمطراز ہیں:

پاک و ہند پر جب انگریز نے قبضہ کیا تو اس نے مغلوب مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے جہاں اور طریقے اختیار کیے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کو اس انداز میں لکھا اور لکھوایا کہ خود مسلمانوں کو اپنی تاریخ پڑھ کر شرم و ندامت محسوس ہونے لگی اور ان کے اسلاف کے کارناموں کو اس انداز میں پیش کیا کہ ان میں سے کوئی لیٹرا معلوم ہوا اور کوئی ظالم و جابر مسلمانوں کے شاندار اور درخشاں ماضی کو تاریک بنا کر پیش کیا گیا اور ان کو باور کرایا گیا کہ ان کے اسلاف ایسے نہ تھے کہ جن پر ناز کیا جائے اور ان کے کارنامے ایسے نہ تھے کہ جن کی پیروی کی جائے۔

شرر نے جب قلم اٹھایا تو اس وقت مسلمانوں کے ماضی کی یہی شکل پیش کی جارہی تھی جس کے بُرے اثرات اس دور پر تو پڑ ہی رہے تھے لیکن مستقبل بھی تاریک نظر آرہا تھا۔ ان حالات کا شرر نے جائزہ لیا اور اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ مسلمانوں کے سامنے ان کے

> شاندار ماضی کی تصویریں پیش کی جائیں۔ تاکہ وہ اسلاف کے کارناموں کو پڑھیں اور ان میں حوصلہ پیدا ہو کہ وہ اپنے اسلاف کے رنگ میں رنگیں اور خود کو اسی انداز پر ڈھالیں۔[۱۷]

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک طرف شرر نے تاریخی ناول لکھے اور دوسری طرف تاریخی کتب لکھیں۔ اس کے طفیل قاری تاریخی واقعات سے واقف ہوا۔ تاریخ پڑھنے کی طرف شرر نے توجہ دلائی۔ اس انداز سے تاریخی مواد پیش کیا کہ تاریخ پڑھنے والا اپنے اسلاف کے کارناموں کا مطالعہ کرے۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں جانے ان کی خصوصیات اور خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی سعی کرے۔ اس طرح ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے تاریخ نویسی شروع کی تھی۔ پروفیسر شرر نعمانی عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی کے محرکات کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ......انہیں تاریخ سے خاص طور پر لگاؤ تھا اور وہ ایک شاندار ماضی کی شاندار روایات کو پیش کر کے اپنی قوم کے مغلوب گمان افراد میں احساس سربلندی اور جذبہ خود شناسی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ بہت سی ایسی غلط فہمیوں کو بھی دور کرنا چاہتے تھے جو غیروں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کے ماضی سے وابستہ کر رکھی تھیں۔[۱۸]

اعجاز الرحمٰن شرر کے تاریخی ذوق کے بیدار ہونے کے متعلق اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> شرر ناول نگار ہونے کے علاوہ ایک مورخ بھی تھے۔ اُنہیں تاریخ کا یہ ذوق اول اول تب پیدا ہوا جب وہ ۱۸۷۷ء میں لکھنو واپس آئے اور مولوی عبدالحی اور مفتی میر عباس سے عربی کی درسی کتابیں پڑھنے کے بعد ایک شیعہ عالم مولوی حامد حسین کی بعض تاریخی سرگرمیوں میں شریک ہو گئے۔ مولوی صاحب کی عادت تھی کہ وہ اہل سنت کی تاریخ اور حدیث کی کتابوں کا مطالعہ اس غرض سے کرتے تھے کہ ان سے شیعہ نقطہ نظر کی تائید کے لیے مواد حاصل کیا جائے۔ شرر گو خود شیعہ خیال کے آدمی نہ تھے۔ مگر دو سال تک مولوی حامد حسین کے شریک کار رہے تاریخ سے دلچسپی لینے کا رجحان یہیں سے پروان چڑھا۔[۱۹]

شرر نے جو زمانہ دیکھا تھا درحقیقت وہ مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی، علمی اور سماجی زوال کا زمانہ تھا۔ قوم کے تمام اہل فکر و نظر قوم کی گرتی ہوئی حالت پر پشیمان تھے۔ سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد اور دوسرے ادباء نے اصلاح قوم وملت کے لیے کوششیں کیں اور اس عہد میں کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ جس کے نتیجے میں خواب غفلت میں مدہوش قوم کچھ کچھ بیدار ہوئی۔ لیکن غنودگی ابھی باقی تھی۔ اسی کو ختم کرنے کے لیے شرر نے رجز خوانی شروع کی،

تا کہ قوم کے دل میں پھر سے اپنے ماضی و اسلاف، اپنی تاریخ و تہذیب اور روایات و اقدار کی عظمت، عہد رفتہ سے محبت، نئے جوش و ولولہ اور عزم پیدا ہو۔ سفر انگلستان اور اسکاٹ کے ناولوں نے اس ادیب کی حساس اور فعال طبیعت اور دردمند دل پر اثر کیا۔ یورپ کی سیاحت اور سسلی و اندلس کی سرزمین پر جب انہوں نے اپنے اسلاف کی یادگاریں اور آثار الصنادید دیکھے تو اسلامی عہد کی سطوت و عظمت کے نقوش اور زیادہ اجاگر ہوئے۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کا خیال ہے:

> ان سب محرکات کے زیر اثر شرر نے محسوس کیا کہ قوم کی اصلاح کے لیے اس میں دینی حمیت اور تاریخ سے والہانہ لگاؤ پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فکر و نظر کے مطابق اسلامی تاریخ کے اس درخشاں عہد کو موضوع بنایا ہے۔ جسے ان کے دور کا مسلمان فراموش کر چکا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے سنہرے اوراق دفتر نسیاں سے نکال کر قوم کے سامنے پیش کیے اور اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر اپنے تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرانا چاہا۔[۲۰]

شرر نے قوم کی اصلاح کی خاطر ان میں دینی حمیت پیدا کرنے اور تاریخ سے والہانہ لگاؤ کے لیے تاریخ نویسی شروع کی۔ انہوں نے اپنی تاریخ نویسی کے ذریعے سے اس عہد کو اجاگر کیا جسے اس دور کا مسلمان فراموش کر چکا تھا۔ آپ نے تاریخ کے ذریعے سے اسلاف کے کارناموں کو زندہ کر دکھایا تا کہ افسردہ اور خوابیدہ قوم کے اندر کوئی نہ کوئی جذبہ فروغ پا سکے۔

ج۔ تاریخ نویسی میں شرر کے موضوعات اوران کی کتب کا تنقیدی و تحقیقی تجزیہ

تاریخ نویسی بھی ایک مقدس پیشہ ہے۔ جو کسی کسی مصنف کے حصہ میں فرض کفایہ کے طور پر آتا ہے۔ تاریخ ہی وہ علم ہے جو ہمیں اپنی شناخت کرواتا ہے۔ تاریخ ہمیں ماضی کے اندھیروں سے نکالتی ہے اور روشن مستقبل کی شہادت دیتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جس قوم کی تاریخ نہیں وہ کنگال قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخی ورثے سے ہم اپنی شناخت کرتے ہیں۔ اپنی تہذیب کی تالیف اور قومی روایت وضع کرتے ہیں۔ اسی علم کی بنا پر اخلاقی قدروں کی شناخت کرتے ہیں۔ تاریخ کے تسلسل ہی میں ہمارے ادبی و سیاسی میلانات کا کھوج پوشیدہ ہے۔ مورخ بننا بھی بہت مشکل کام ہے۔ تاریخ نویسی ایک ایسا فن ہے جسے سائنس کا درجہ حاصل ہے۔ یہ وہ علم ہے جس پر ہر کس و ناکس عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ تاریخ کے آغاز سے عبدالحلیم شرر تک جتنے بھی مورخ گزرے ہیں۔ ان میں بہت سارے مورخوں نے تاریخ سے صحیح انصاف نہیں کیا۔ اچھے اور صحیح مورخ کی پہچان یہ ہے کہ وہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کرے۔ تاریخ ایسے مورخین سے بھری پڑی ہے۔ جنہوں نے تاریخ شاہی ایوانوں میں بیٹھ کر مرتب کی۔ عبدالحلیم شرر کی اگرچہ بہت ساری حیثیات ہیں انہوں نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی کئی اصناف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ تاریخ نویسی میں بھی ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ آپ نے تاریخ پر قلم اٹھایا اور فطری تقاضوں کے مطابق اس کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اگرچہ تاریخ نویسی کے اصول وضوابط اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ہر تاریخ دان ان اصولوں کی پیروی مکمل طور پر نہیں کرتا۔ کہیں نہ کہیں وہ ان اصولوں سے ٹکراتا ضرور ہے۔ یہی فطری اور بشری تقاضا ہے۔ اس بنا پر عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی بھی فطری اور بشری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

بطور تاریخ دان شرر نے کئی ایک کتب تصنیف کی ہیں۔ مثلاً

۱۔قدیم مسیحیت،۲۔تاریخ سندھ ۱۸۹۱ء،۳۔عصر قدیم ۱۹۱۲ء،۴۔تاریخ عزیز مصر ۱۹۱۷ء،۵۔تاریخ یہود ۱۹۱۷ء،۶۔مسیح اور مسیحیت / المعروف تاریخ ارض مقدس ۱۹۱۷ء،۷۔منظوم تاریخ اسیر بابل ۱۹۲۰ء،۸۔تاریخ خلافت ۱۹۲۳ء،۹۔صقلیہ میں اسلام ۱۹۲۹ء،۱۰۔تاریخ اسلام،۱۱۔گذشتہ لکھنو،۱۲۔تاریخ حروب صلیبیہ وغیرہ وغیرہ

قدیم مسیحیت

بطور مورخ مولانا شرر کی یہ کتاب بھی اہم ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ

اردو دان طبقہ کو دکھایا جائے کہ قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں نے کیا سلوک کیا؟ مسلمان مسیحیوں سے کس طرح پیش آتے؟ یہ بھی بتایا ہے کہ جس قدر اس مذہب سے فرقے نکلے ہیں وہ کون کون سے ہیں؟ سب کو جدا جدا مفصل بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔شرر نے مسیحیوں کے مذہب کی ترقی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔شرر نے یہ کتاب تحقیق وتدقین کے بعد لکھی ہے۔اس میں تعصب اور مذہبی غلو نہیں پایا جاتا ہے۔شرر نے دونوں قوموں کے قدیم وجدید تعلقات پر عمدہ طور سے روشنی ڈالی ہے۔شرر نے دعویٰ کیا ہے کہ تعصب کو اس میں جگہ نہیں دی گئی اور پوری کتاب کے مطالعے کے بعد ان کا یہ دعویٰ کسی حد تک درست بھی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:
''تعصب اور مذہبی غلو کا زمانہ گذر گیا اور روز بروز گزرتا جاتا ہے۔'' [۲۱]

یہ کتاب جس مقصد کے تحت شرر نے لکھی ہے وہ یہ ہے:''دیکھنا چاہیے کہ عیسائیوں نے قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا اور مسلمان مسیحیوں سے کس طرح پیش آئے۔'' [۲۲] یہ کتاب ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں نمبر بھی دیئے گئے ہیں اور عنوانات بھی، درج ذیل عنوانات کے تحت یہ کتاب شرر نے لکھی ہے۔قدیم مسیحیت نمبر ۱، دین عیسوی کی ترقی کے اسباب نمبر ۲، مسیحیت کے متبدعہ فرقے نمبر ۳، تماشائے معجزات، ان تین بڑے عنوانات کے تحت شرر نے یہ تاریخ لکھی ہے۔

یہ کتاب شرر نے بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھی ہے۔ان کی تاریخ نے جو احاطہ کیا ہے اس سے قاری کو خاطر خواہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ کتاب قاری کے علم میں اضافہ کرتی ہے اس کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے مولانا نے مختلف تاریخی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔

یہ تاریخ کی مختصر ترین کتاب ہے۔لیکن معلومات کے حوالے سے اس کو ہم شرر کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت کی روزافزوں ترقی کیسے ہوئی ہے؟ شرر نے اس کتاب میں دین مسیحی کو بمقابل دین اسلام کے دیکھا ہے۔شرر نے اپنی اس کتاب میں مسیحیوں کے دیگر اقوام عالم کے ساتھ برتاؤ کے متعلق نہیں لکھا۔اس کا ثبوت ان کے یہ جملے ہیں:

> مسیحیوں نے اپنی اس ترقی اور فتح مندی کی رفتار میں دیگر اقوام کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا۔ اس کے بیان کرنے کی ہمیں کچھ ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم دین مسیحی کو بمقابل دین اسلام کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیگر اقوام کے مقابل میں دنیا بھر جانتی ہے کہ اس وقت مسیحیوں میں کسی قسم کی شائستگی نہ تھی ......[۲۳]

واقعات کے بیان میں تسلسل موجود ہے۔زبان وبیان آسان اور عام فہم ہے۔کہیں کہیں جانبداری کا بھی

مظاہرہ شرر نے کیا ہے لیکن زیادہ تر وہ غیر جانبدار ہی رہے۔ شرر نے تاریخ کی اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوش کی ہے کہ آغاز اسلام سے لے کر موجودہ دور تک عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے رویے بہتر رہے۔ مسلمانوں کے رویے ان کے ساتھ کیسے رہے؟ شرر نے اس کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ تا کہ الزامات تراشی کا سلسلہ بند ہو۔ انگریز مسلمانانِ ہند و عالم اسلام میں غلط فہمیوں کو پیدا کرنے میں ناکام رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اس نظرے کا پرچار وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ان تمام مظاہر اور شواہد سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اہل اسلام کا برتاؤ مسیحی راہبوں کے ساتھ کیسا تھا۔ ان کو پوری آزادی دی جاتی تھی اور ان کے حقوق کی نگہداشت کی جاتی تھی۔ جو عہد کر لیا جاتا تھا اس پر ہر مسلمان عملدرآمد کرتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ پختگی تھی کہ جانشینان خلافت اسلام جنھوں نے شخصی حکومت قائم کر کے اپنی زبانوں کو قانون بنا دیا تھا وہ بھی ان عہدناموں کی پوری پوری تعمیل کرتے۔ عہد کا پورا کرنا اور باوجود اپنے نقصان کے اس پر قائم رہنا مسلمانوں ہی کا حصہ تھا۔ جس کی نظیر اس وقت کی دیگر اقوام تو درکنار شاید ان سے اور بعد میں کسی قوم میں نہ پائی گئی ہوگی۔[۲۴]

شرر نے جہاں ضروری سمجھا وہاں مسلمانوں کی خوبیوں اور اچھائیوں کو سراہنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ سچائی کا دامن نہیں چھوڑا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے۔ شرر نے اس تاریخ میں مسلمانوں کی حکومت کے آغاز سے لے کر اس عہد تک جو کہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا موثر طور پر بیان کیا ہے۔ تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو سکے کہ وہ کس قوم کا حصہ ہیں اور ان کے آباؤ اجداد کے کیا کیا کارنامے تھے؟ شرر نے ایک طرف تو مسلمانوں کے اچھے برتاؤ کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف جاہل اور متعصب حکمرانوں کے رویے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے مورخ کے فرائض ادا کیے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> اس زمانہ کے جب صلیبی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ ان ذمی مسیحیوں کے ساتھ جیسے برتاؤ اہل اسلام کی جانب سے کیے گئے۔ تمام کتب تواریخ ان کی شائستگی کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ عیسائیوں پر مسلمانوں نے کبھی ظلم کیے ہی نہیں بے شک بعض اوقات بعض جاہل اور متعصب حکمرانوں نے اس قسم کے جور کیے کہ ان کے معابد اور کینسے ڈھادیئے اور مذہبی توہین کی لیکن تاریخ یہی بتا دیتی ہے کہ ہمیشہ ان مظالم کا نہایت عمدہ معاوضہ ہو گیا اور اس دل شکنی کے عوض ایسی دلدہی کی گئی کہ عیسائی اپنی مظلومیت کو بھول گئے۔[۲۵]

شرر نے مدافعت کا رویہ اختیار کیا ہے تقابلی جائزہ بھی پیش کیا۔مسلمانوں کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ اور ان کے رویے مسلمانوں کے ساتھ کیسے تھے!شرر نے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

آج بارہ برس کا زمانہ ہوا۔مسلمان ایشیا کے یہودیوں اور عیسائیوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ ان کی رعایا میں لاکھوں نہیں کروڑوں کا مذہب عیسائی رہا اور ہے۔لیکن ان کے ساتھ جیسا برتاؤ رہا جس بیدار مغزی سے ان کے جان ومال کی نگہداشت کی گئی۔جس فیاضی سے وہ اپنے مذہبی ارکانوں اورآداب کے بجالانے میں آزادر کھے گئے ۔ اس کی ایک مثال بھی عیسائی نہیں پیش کر سکتے اور پھر کتنی بڑی شرم کی بات ہے کہ الٹا مسلمانوں کو الزام دیا جاتا ہے ۔ وہ ظالم ہیں وہ جلاد ہیں وہ اپنی سرکار کے وفادار نہیں ۔ان کا مذہب جہاد ہے ۔ان سے سلطنت کو ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔شرمائیں وہ جو کہتے ہیں۔مسلمان جلاد ہیں نہیں بلکہ ان میں اتنا ضرورت سے زیادہ رحم تھا کہ انہوں نے جلادوں سے ظلم وستم کا بدلہ نہیں لیا اور معاف کر دیا۔[۲۶]

شرر نے غیر متعصبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دین عیسوی کی ترقی کے اسباب بھی بتائے کہ یہ دین کیسے پھیلا اور اس میں ترقی کن امور کی وجہ سے ہوئی ؟ شرر نے کیتھولک بیلف مصنفہ جوزف فاڈی برونو ''گہن'' اور تاریخ کلیسائے مسیحی مصنفہ ڈی گلن سے مواد اخذ کیا ہے۔شرر نے ایک طرف تو اس دین کے پھیلنے کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالی ہے تو دوسری طرف ''میسیحت کے مبتدعہ فرقے'' پر بھی روشنی ڈالی ہے۔تمام معلومات تمام مواد انہوں نے مستند تاریخی کتب سے اخذ کیا ہے۔شرر نے مناظروں کی بحث بھی یہاں چھیڑی ہے اور اپنے نظریات کا پرچار بھی کیا ہے۔

شرر نے اس تاریخ کو لکھتے وقت جذبات سے بھی کہیں کہیں کام لیا ہے۔ایک غیر جانبدار مبصر کا کردار بھی سلیقے سے ادا کیا ہے۔یہ بات بھی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس تاریخ میں شرر نے محض واقعات کی شیرازہ بندی سے کام نہیں لیا بلکہ جگہ جگہ پر مدلل محاکے اور تبصرے بھی کیے ہیں۔مورخ کے فرائض کو بخوبی ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔تاریخ نویسی کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھا۔اگر چہ بعض اصولوں پر وہ عمل پیرا نہ ہوسکے۔

تاریخ سندھ

''تاریخ سندھ'' شرر کی وہ کتاب ہے جس کو کافی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔اس کتاب کو پڑھ کر کچھ

ناظرین وقارئین شاید یہ سمجھیں گے کہ اس کو لکھنے والے مولانا عبدالحلیم شررتاریخی ناول لکھنے والے نہیں ہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے مولف بھی وہی شرر ہیں جنہوں نے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک بڑا نام اوراہم مقام حاصل کیا۔اس حقیقت سے انکار نہیں کہ شرر زود نویس تھے ۔علاوہ انہوں نے کئی تاریخی کتب بھی لکھیں ۔جوکافی مشہور ومقبول ہوئیں ۔یہ بڑی مستند تاریخی کتاب ہے۔اس کتاب میں بعض باتیں وہ بیان ہوئی ہیں کہ اس سے پہلے کسی اورتاریخی کتاب میں ناپید ہیں ۔اگر چہ بقول ڈاکٹر مبارک علی:''عبدالحلیم شرر نے عہد وسطی کی تاریخ پر سندھ میں عربوں کی فتح کی تاریخ لکھی ۔مگر اس کتاب کی بنیاد بھی ماخذوں پر ہے اور انہوں نے بھی واقعات کو تجزیاتی طور پر نہیں دیکھا۔''[۲۷] عبدالحلیم شرر نے جتنی بھی تاریخی کتب لکھی ہیں ان میں سے دو''گزشتہ لکھنو''اور''تاریخ سندھ''ہندوستانی تاریخ سے متعلق ہیں ۔باقی سب میں ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا و دیگر دنیاؤں کا ذکر ملتا ہے۔پروفیسر جعفر رضا رقمطراز ہیں:

> ......صرف ایک تصنیف تاریخ سندھ ہندوستانی تاریخ کے اس دور سے متعلق ہے جب مسلمانوں نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سرزمین ہند پر پہلی بار قدم رکھا تھا حالانکہ ابتداً مسلمانوں کی حیثیت بیرونی حملہ آوروں کی تھی ۔جن کے لیے ملک کے قدیم باشندوں کے دلوں میں نفرت وحقارت کا جوالامکھی ابلتا رہا ہوگا ۔لیکن تاریخ شاہد ہے کہ بعد کے ادوار میں نہ صرف یہ کہ جوالامکھی سرد ہو گیا بلکہ وہی سرزمین رنگا رنگ کے پھولوں سے مہک اٹھی ۔دو عظیم قومیں ایک دوسرے کے قریب آئیں تو ہر دو جانب سے دلوں میں محبت و اخوت کے سرچشمے موجزن ہوئے ۔ہم آہنگی ،مساوات ،خلوص ،اورتعاون کو قصرِ دل وجان کے خشت اولین کا رتبہ ملا ۔جسے مورخوں نے مشترکہ تہذیب کا لقب دیا۔[۲۸]

اگر اس تاریخی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحلیم شرر نے محمد بن قاسم کی فتوحات اور سندھ پر حملہ کے اسباب وحالات واقعات کو زیادہ بیان کیا ہے۔وہاں کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے بارے میں کم مواد موجود ہے ۔زیادہ تر محمد بن قاسم کی مہم جوئی کا تذکرہ ہے کہ کس طرح سے اس نے سندھ پر قبضہ کیا؟ کون کون سی مشکلات کا اسے سامنا کرنا پڑا اوران کو کس کس طرح سے اس نے راستے سے ہٹایا؟ شرر نے جن حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق پروفیسر جعفر رضا نے لکھا ہے:

> ......اس دور کے حالات قلم بند کرتے ہوئے مورخ سے مزید احتیاط تحقیق متوقع ہے۔ کیوں کہ معمولی سی لغزش صدیوں کے تاریخی پس منظر اور پیش منظر کو غیر صحیح تناظرات میں پیش کرنے کا ذریعہ بھی کہی جا سکتی ہے۔[۲۹]

اس لیے کہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے حملہ آوروں کی حیثیت سے کسی بھی ملک کی قدیم تہذیبی و ثقافتی زندگی کو تباہ و برباد نہیں کیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے تاجرانہ ذہنیت کے ساتھ کسی ملک کی معیشت کا استحصال کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے اور غیر مسلم مورخ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان جس ملک میں بھی رہے وہاں انہوں نے کسی کی تہذیب و ثقافت کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ قدیم باشندوں سے تعاون کی فضا برقرار رکھتے ہیں۔ اپنا علیحدہ لباس، نشست و برخواست، زبان و ادب، تعلیم و تمدن، خورد و نوش قدیم باشندوں جیسا ہی رکھنے کی کوشش کی اور ایسے تہذیبی و سماجی عناصر مرتب کیے کہ دونوں فریقین کے لیے نہ صرف قابل قبول بلکہ ان کی اپنی تہذیبی و سماجی قدریں بھی الگ رہیں۔ مسلمان جہاں بھی گئے ان کے طرز عمل نے دوسروں کو متاثر کیا۔ دوسروں کو اپنا بنانے کا گُر مسلمانوں نے ہی اس دنیا کے مکینوں کو سکھایا۔ عبدالحلیم شرر ہی وہ پہلے مسلمان مورخ ہیں جنھوں نے اس سرزمین کی تاریخ اردو زبان میں پیش کرنے کا شرف حاصل کیا۔ شرر نے یہ کتاب نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی اعانت و دستگیری سے تالیف کی۔ اس کتاب کو لکھنے کے لیے ان کا پورا کتب خانہ استعمال کرنے کا موقع انھیں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شرر نے اپنی اس محنت پر سب سے بڑا حق انہی کا تسلیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> عالی جناب انرایبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی ادام اللہ اقبالہ ڈائریکٹر آف پبلک انزکشن دولت آصفیہ علم و فضل اور سنز باعتبار قومی خدمات بجا لانے کے مسلمانوں کے سچے بہی خواہ اور قوم کے سرتاج ہیں۔ ان کے صدہا علمی برکات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے تصنیف کرتے وقت ان کا پورا کتب خانہ میرے اختیار میں تھا اور انہیں کی اعانت و دستگیری سے میں اس تالیف کو مرتب کر سکا۔ سچ یہ ہے کہ یہ تاریخ اگر کچھ بھی قابل قدر تصور کی جائے تو انہیں کی ایک باقی رہنے والی برکت ہے۔ اگرچہ فی الحال میں ان کی عالمانہ صحبت سے دور ہوں اور حسرت کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں کہ اب کسی قسم کا تعلق نہیں باقی رہا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میری اس محنت پر سب سے بڑا حق انہی کا ہے۔ لہٰذا میں اپنی اس حقیر محنت کو ان کے نام نامی سے معنون کر کے بکمال ادب ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ [۳۰]

تاریخ سندھ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ''تاریخ سندھ'' رقم طراز کرنے کا محرک کیا تھا؟ اس پر شرر نے خود ہی روشنی ڈالی ہے۔

> سارے ہندوستان کو چھوڑ کر سندھ کے ایک گمنام حصہ ملک کی طرف آنا اور خصوصاً اس شخص

کے لیے جو نہ کبھی وہاں گیا ہو نہ وہاں موجودہ حالات سے کوئی ذاتی واقفیت رکھتا ہو نہ اسے
وہاں کے باثر لوگوں سے تعارف حاصل ہو۔ ناظرین کے لیے قابل حیرت ضرور ہوگا مگر
سچ یہ ہے کہ ہندوستان میں سندھ ہی وہ ملک ہے جس کی تاریخ کی طرف توجہ کرنے کی
ضرورت ہے کیونکہ ناواقف مصنفین فارسی وانگریزی کے ہاتھوں جتنا ظلم اس ملک کی تاریخ
پر ہوا ہے شاید کسی تاریخ پر نہ ہوا ہو۔[۳۱]

یہ سچ ہے کہ شرر نہ تو کبھی سندھ میں تشریف لائے تھے اور نہ ہی وہاں کے باثر لوگوں سے ان کا میل جول تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے تاریخ لکھی جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اس سرزمین کے متعلق فارسی وانگریزی مصنفین نے جو کچھ لکھا وہ حقیقت پر مبنی نہیں تھا اور دوسرا عربی تاریخوں جغرافیوں اور سفرناموں کا مطالعہ تھا جس نے شرر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس خطہ کی تاریخ لکھیں۔ وقار الامرا بہادر کی خاص نظر کرم سبب حوصلہ افزائی تھی جس نے شرر کے ارادوں کو پختہ کیا اور پھر نواب عماد الملک بہادر نے جب اپنے بیش بہا کتب خانے کو استعمال کرنے کی اجازت دی تو شرر نے اس تاریخی کتاب کو مکمل کرلیا۔ شرر لکھتے ہیں:

پہلے پہل اس جانب میرا خیال فتوح البلدان بلاذری کو دیکھ کے رجوع ہوا اور اس کے بعد
عربی تاریخوں، جغرافیوں اور سفرناموں پر جس قدر زیادہ نظر پڑتی گئی اسی قدر زیادہ
ضرورت محسوس ہوتی گئی۔ لیکن فراہمی کتب کی دشواریوں اور اپنی بے بضاعتی کا خیال کر
کے جرات نہ ہوتی تھی۔ اتفاقاً ریاست حیدرآباد میں ان دنوں وقار الامرا بہادر اریکہ
آرائے مسند وزارت تھے اور مجھے ان کی سرکار سے خاص تعلقات تھے۔ جن کو مرحوم کے
خلف الرشید نواب سلطان الملک بہادر اپنی کریم النفسی سے آج تک نباہ کررہے ہیں۔
جب میرا یہ خیال ان مرحوم کو معلوم ہوا تو قدر افزائی کی۔ بطور انعام پانچ ہزار روپیہ مرحمت
فرما کے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور حکم دیا کہ اس کے جس قدر اجزاء مرتب ہوتے جائیں
ان کے ملاخطہ میں پیش کرتے جایا کریں۔ ادھر نواب عماد الملک بہادر نے اپنے بیش بہا
کتب خانے کو گویا میرے ہاتھوں میں دے دیا۔[۳۲]

انہی فیاضانہ اعانتوں کے بعد شرر نے تاریخ کو مدون کرنا شروع کیا جو اجزا لکھے جاتے وہ نواب صاحب کی نظر کیمیا سے گذارنے کے لیے بھیجے جاتے یوں پوری کتاب مرتب ہوگئی لیکن کتاب ابھی چھپنے کے مراحل میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ نواب وقار الامرا بہادر کا انتقال ہوگیا۔ شرر نے ''تاریخ سندھ'' اور ''تاریخ ارض مقدس'' انہی کے حکم سے لکھنی شروع کی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد شرر نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کتاب دلگداز کے ساتھ

شائع کرنی شروع کی۔ اگر چہ شرر نے بہت کوشش کی ہے کہ یہ مکمل تاریخ کی کتاب ثابت ہو لیکن وہ خود کہتے ہیں کہ بعد میں آنے والوں کے لیے ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ لکھتے ہیں:

جب ان کتابوں کے چھپنے کی اور کوئی معقول صورت نہ پیدا ہوئی تو میں نے تاریخ سندھ کو دلگداز کے ساتھ شائع کرنا شروع کر دیا اور الحمد اللہ کہ اس کی پہلی جلد مرتب ہو گئی جواب کتابی صورت میں مرتب کر کے پبلک کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔

اس میں ضرورتاً جغرافیہ اور قدیم حالات بھی بڑھا دیے گئے ہیں کیونکہ بغیر ان کے کتاب مکمل نہ ہوئی۔ لیکن میری محنت کا پتہ ناظرین کو صرف اس حصہ کے دیکھنے سے لگے گا جہاں سے خیر القرون یعنی حضرت رسالت کا عہد شروع ہوا۔ سندھ میں عربوں کا دور کوئی معمولی چیز نہ تھا۔ وہ مستقل تاریخوں کو چاہتا ہے۔ اگر چہ میں نے تکمیل کی بہت کوشش کی مگر پھر بھی بعد والوں کے لیے ابھی اس میدان میں بہت گنجائش باقی ہے۔[۴۳]

یہی وجہ ہے کہ بعد میں سندھی ادبی بورڈ نے ایک مفصل اور مستند تاریخ لکھوائی۔ ڈاکٹر مبارک علی کا خیال ہے:

عرب دور پر اردو، سندھی اور انگریزی میں بھی جدید کام بہت کم ہوا ہے۔ اردو میں سندھ کی تاریخ پر پہلا کام مولانا عبدالحلیم شرر کا ہے اور دوسرا اہم کام ابوظفر ندوی کا ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں صرف واقعات کو جمع کیا گیا ہے۔ ان کا تجزیہ نہیں ہے۔ سندھی میں مولائی شیدائی کی کتاب ''منتِ السندھ'' بھی اسی نمونے پر لکھی گئی ہے اور یہی کچھ انگریزی میں ممتاز پٹھان کی کتاب کا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے تاریخی واقعات کا تو علم ہو جاتا ہے مگر تجزیاتی کمی کی وجہ سے تاریخی شعور میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔[۴۴]

سندھ کی تاریخ بہت قدیم زمانے سے شروع ہو جاتی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ابھی تک اس کی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی شرر ہی وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے اس خطہ ارض کی تاریخ دلچسپ انداز سے لکھی۔ تاریخ ہی وہ علم ہے جو بقول حسام الدین راشدی:

قوموں میں زندگی کے جذبوں اور ولولوں کو تازہ رکھنے اور ان کے افراد کی رگوں میں جوش عمل کا نیا خون دوڑانے کا سب سے اہم ذریعہ قومی تاریخ ہے۔ قومی تاریخ ہی کے صفحات پر

اسلاف کرام کے بلند پایہ کارنامے، آنے والی نسلوں کے لیے مستقل درس حیات بن جاتے ہیں۔ اسی آئینے میں ہر قوم اپنے ماضی کو بے نقاب دیکھ سکتی ہے اور عروج وزوال کے اسباب وعوامل پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اپنے مستقبل کے خط وخال درست کر سکتی ہے۔ جس قوم کے سامنے اپنی تاریخ جامع صورت میں موجود نہ ہو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زندگی کے میدان میں محرکات عمل کے ایک بہت بڑے وسیلے سے محروم ہے۔[۳۵]

جلد اول بارہ ابواب پر **مشتمل** ہے اور جلد دوم دس ابواب پر **مشتمل** ہے

جلد اول کا پہلا باب ''سندھ کی ابتدا اور اس کا جغرافیہ'' پر **مشتمل** ہے۔ دوسرا باب سندھ کی قدیم تاریخ، تیسرا باب ہندوستان پر قدیم الایام کی غیر قوموں کے حملے، چوتھا باب رائے چچ کا عروج، پانچواں سندھ کی ہندو سلطنت کا آخری دور، چھٹا خیر القرون، ساتواں خلاف آل مردان فتوحات سندھ، باقی فتوحات محمد بن قاسم، نواں محمد بن قاسم دریائے سندھ کے اس پار، دسواں داہر کا بیٹا جے سنگھ اور محمد بن قاسم، گیارہواں باب محمد بن قاسم کی بے نظیر کامیابیاں جبکہ بارہواں محمد بن قاسم کے انجام کا احاطہ کرتا ہے۔ شرر نے جلد اول میں تمام حالات دلچسپ انداز سے پیش کیے ہیں۔ واقعات کے بیان میں تسلسل قائم ہے۔ غیر متعصبانہ رویہ مورخ نے اختیار کرتے ہوئے ہر واقعہ قلم بند کیا ہے اور اس تاریخ میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ:

ناواقف مورخین نے غلط باور کرا دیا ہے کہ سندھ پر حکومت عرب صرف محمد بن قاسم کے زمانے میں شروع ہوئی اور اسی پر ختم ہوگئی اور اس کے بعد اس کا کچھ بھی اثر ارض سندھ پر نہیں باقی رہا۔ حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ اس نوعمر سپہ سالار نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اثر ڈال دیا تھا ویسا اثر پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی ہندوستان پر نہیں ڈال سکیں۔ ہندوستان میں آج مسلمان تھوڑے ہیں اور باوجود یہاں بس جانے کے ملک پر ہندوؤں سے زیادہ اثر نہیں رکھتے۔ مگر بخلاف اس کے سندھ میں سب سے بڑا غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہے اور یہ صرف عربوں اور خاصۃً محمد بن قاسم کی برکت ہے۔[۳۶]

دوسری جلد میں محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی حالت کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بنی امیہ کا باقی ماندہ عہد خلافت، تیسرا باب دولت عباسیہ کی ابتداء، چوتھا ہارون الرشید سے ماموں کے آخر عہد تک، پانچواں سندھ میں عباسیوں کا آخری اثر، چھٹا عربی النسل خود مختار دول سندھ، ساتواں شیعہ اسماعیلیہ، آٹھواں قرامطہ، نواں باقی حالات قرامطہ اور دسویں میں باقی حالات قرامطہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں جو حالات وواقعات شرر نے

بیان کیے ہیں۔ان کے مطالعے سے شرر کا یہ دعویٰ سچ نظر آتا ہے کہ:

> چونکہ محمد بن قاسم کا زمانہ ختم ہوگیا۔ لہٰذا اس تاریخ کی پہلی جلد کو یہیں پر تمام کرتے ہیں۔ بعد کے حالات دوسری جلد میں بیان کریں گے اور اس کو دیکھ کے لوگوں کو نظر آئے گا کہ فارسی اور عام انگریزی مورخین نے تاریخ سندھ کے متعلق کیسی غلطیاں کی ہیں اور کتنے بڑے حصے تاریخ کو، ان کی ناواقفیت نے گویا کہ ہاتھ سے کھو دیا ہے۔[۳۷]

دوسری جلد کا آغاز جنوری ۱۹۰۷ء میں ہوا اور اس جلد میں جو واقعات قلم بند ہوئے ہیں وہ مسٹر ایلٹ کے جمع کردہ مواد سے اخذ کیے گئے ہیں۔شرر لکھتے ہیں:

> دوسری جلد جس کا جنوری ۱۹۰۷ء سے آغاز ہوگا بتائے گی کہ اس ملک کی تاریخ میں فارسی اور انگریزی مصنفوں سے کتنی بڑی فروگزاشتیں اور کیسی فاش غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیونکہ اس جلد میں جو واقعات مذکور ہوئے ہیں تھوڑا بہت اور تاریخوں میں بھی موجود ہیں۔ دوسری جلد میں وہ واقعات آئیں گے جن کا پتہ مسٹر ایلٹ کے جمع کیے ہوئے غیر مرتب مادہ تاریخ کے اور کہیں نہ نظر آئے گا۔[۳۸]

اس کتاب کی تیاری میں مورخ کو بڑی محنت اور تگ و دو کرنی پڑی۔اس کتاب کو قاری کی دلچسپی کے مدِ نظر شرر نے لکھا ہے اور کہیں کہیں اپنے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کی ہے۔شرر نے پوری کتاب میں کہیں کہیں کوئی سن لکھا ہے ورنہ بغیر تاریخ کے واقعات قلم بند کیے ہیں جس سے قاری یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ واقعات و حالات کب پیش آئے۔مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> غرض سندھ کے اس عظیم الشان شہر دیبل کی شہر پناہ کے گرد اتر کے محمد بن قاسم نے محاصرے کا سامان شروع کیا۔محمد بن قاسم جس روز دیبل کے سامنے خیمہ زن ہوا ہے جمعہ کا دن تھا اور خوش نصیبی سے اسی روز وہ جہاز بھی بندرگاہ دیبل میں داخل ہوگیا جو اسلامی مجاہدین کے لیے سب کچھ مدد اور قوت کا سامان لایا تھا۔جس میں وہ عالیشان منجنیقیں تھیں جو بڑے بڑے قلعہ کی دیواریں منہدم کرنے کے لیے کافی خیال کی جاسکتی تھیں......[۳۹]

اگر چہ اس کتاب میں خامیاں بھی ہیں لیکن جس دور میں شرر نے یہ تاریخ لکھی ہے اس دور میں ان کے سامنے اپنی زبان میں اس تاریخ کی مثال موجود نہ تھی اور پھر شرر چونکہ ناول نگار بھی تھے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ

واقعات کو قصہ گوئی کے انداز میں شرر نے پیش کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب ہمیں اپنے اسلاف کی سیاسی، معاشی، مجلسی زندگی سے روشناس کرانے میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو سامنے رکھ کر ہم اپنے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہو جائیں۔ عمل پیہم، یقین محکم، اخلاق کی بلندی، صداقت، جفاکشی، معیشت و معاشرت کی سادگی اور اطاعت امیر کے پاکیزہ جذبات سے سرشار ہو کر ہم ان اسلامی روایات کو پھر زندہ کریں۔ جنھوں نے اس عہد کی تاریخ و سیاست میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ تاریخ کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ اس پوری کائنات کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کا انتظام کس گروہ کے سپرد کرے۔ اس کے فیصلے کا دارومدار کسی نسلی، قومی یا آبائی حق پر نہیں ہوتا بلکہ اس بنا پر ہوتا ہے کہ کس گروہ کے اندر زیادہ صلاحیتیں ہیں اور مجموعی بھلائی کس انتظام میں ہے۔ شرر کی یہ تاریخی کتاب ہمیں سندھ کی ابتدا اور اس کے جغرافیہ سے اس کی قدیم تاریخ اور اس سر زمین پر غیر قوموں کے حملے سے آگاہ کرتی ہے۔ سندھ کی ہندو سلطنت کے آخری دور کے اہم واقعات پر روشنی ڈالتی ہے اور فتوحات سندھ اور محمد بن قاسم کی بے نظیر کامیابیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے محمد بن قاسم اور حجاج بن یوسف کی زندگی کے اہم واقعات قاری کے سامنے آتے ہیں۔ محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی کیا حالت تھی؟ اس کا اندازہ بھی ہم اس کتاب کے عمیق مطالعے سے کر سکتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ تاریخ سندھ ایک مستند اور اہم کتاب ہے۔ اس کے مطالعے سے وہ باتیں قاری کے سامنے آتی ہیں جو اس سے قبل کی تاریخوں میں موجود نہیں تھیں۔ ''تاریخ سندھ'' اور ''تاریخ ارض مقدس'' بڑی تحقیق کی کتب ہیں۔ محمد عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں: ''مولانا کی تصنیفات میں تاریخ سندھ اور اسلامی تاریخیں بھی مقبول عام ہیں''۔[۴۰] اگرچہ مولانا نے کئی ایک تاریخی کتب لکھی مگر ان میں تاریخ سندھ اور تاریخ ارض مقدس کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ سندھ مولانا کی وہ کاوش ہے جس کے لیے انہوں نے عربی و انگریزی تاریخی کتب کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں:

> تاریخی ذوق بڑھنے کی بدولت مولینا ناولٹ سے ایک مورخ بن گئے۔ آپ نے دلگداز میں جو تاریخی مضامین لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مسائل تاریخی اور اکثر ناموران سلف کی سوانح عمری لکھ کے آپ نے ہندوستانی پبلک کی واقفیت بہت بڑھا دی ہے مگر ان کے علاوہ آپ نے دو تاریخیں بھی لکھی ہیں جو بہت بڑے پیمانے پر ہیں۔ ایک تاریخ سندھ جس میں آپ نے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور ہی ثابت کر دیا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے عربی اور انگریزی تاریخوں کی بہت ورق گردانی کی ہے۔

دوسری تاریخ ارض مقدس ہے جس میں یہود کے ابتدائی زمانے سے رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات بڑی تنقیح و تحقیق سے لکھے ہیں۔[۴۱]

شرر نے تاریخی مضامین اور تاریخی کتب لکھ کر ہندوستانی عوام کی بہت بڑی خدمت کی۔ ان میں تاریخ سے لگاؤ پیدا کیا اور تاریخی شعور کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ شرر نے تاریخی کتب لکھنے کے لیے اگر چہ عربی و انگریزی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن انہوں نے عربی کی بجائے انگریزی تاریخی کتب سے زیادہ مواد اخذ کیا ہے۔ انہوں نے جو کتب تاریخ لکھی ہیں ان کے مطالعے سے یہی نظر آتا ہے کہ عربی کتب سے زیادہ مواد اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عضفر امروہوی لکھتے ہیں:

اگر چہ شرر نے فارسی عربی کی تحصیل عالمانہ طریقہ سے کی تھی۔ مگر ہمارے علما کو تاریخ سے مس بالکل نہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی معلومات بالکل سطحی ہوتی ہیں اور شرر کے عہد میں تو تاریخ کی کتابیں بھی کمیاب تھیں۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ شرر نے انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا اور اپنی ذہانت طبع سے کام لے کر اپنے مضامین کو اس انداز سے پیش کیا کہ پڑھنے والے یہی سمجھتے رہے کہ یہ کتابیں عربی تاریخوں کی مدد سے لکھی گئی ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے جن اصولوں کے تحت عجمی ناموں کو اپنے رسم الخط میں لکھا ہے شرر کے یہاں ان میں انحراف پایا جاتا ہے۔[۴۲]

جبکہ حکیم برہم اس کے برعکس نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں:

یہ نہایت ہی معرکۃ الا تاریخ ہے جس میں سندھ کے زمانہ حکومت عرب کے حالات عربی کی مستند کتابوں قدیم عرب سیاحوں کے سفرناموں اور پرانے جغرافیوں سے پہلے جمع کیے ہیں۔ جو اس وقت تک کسی مورخ کی نظر سے نہیں گذرے تھے ... بڑی تنقید و تحقیق سے بحث کی ہے۔[۴۳]

فرحت شاہ جہاں پوری کا کہنا ہے: ''مولانا اس کو اپنی بہترین تاریخ سمجھتے تھے اور واقعی یہ ایک نہایت عمدہ تصنیف ہے۔ اس کو انہوں نے بڑی کاوش، تحقیق و تدقیق سے لکھا تھا۔''[۴۴]

سیر المصنفین کے مصنف نے اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> تاریخ سندھ آپ کی نہایت عمدہ تصنیف ہے۔ آپ نے بے حد تلاش اور تجسس سے یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔ اول اول جب عرب ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں اور اس وقت کی ہندو سلطنتوں سے ان کی مٹ بھیڑ ہوئی ہے۔ اس کا حال شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے اور نہایت خوب لکھا ہے۔[۴۵]

اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ مولانا کی یہ تاریخ ایک بہترین تاریخ ہے مولانا اپنی تاریخی کتب میں اسے خود بھی بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہ کتاب بڑی تحقیق و دقیق اور محنت و کاوش سے مولانا نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قاری پر واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سندھ کو کس طرح سے فتح کیا؟ وہ کیا حالات واقعات تھے جن کا سامنا مسلمانوں کو کرنا پڑا اور آخر کار محمد بن قاسم نے اس کو فتح کر کے یہاں نیا انداز حکمرانی رائج کیا، جس سے رعایا بہت زیادہ خوش ہوئی۔ مولانا نے جتنی بھی تاریخی کتب لکھی ہیں ان میں سب سے اہم اور خاص کتاب ''تاریخ سندھ'' ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی اشاعت ۱۹۰۵ء کے بعد دلگداز میں قسط وار ہوئی۔ اس کتاب کی خوبی بقول محمد یحییٰ تنہا یہ ہے کہ:

> اس تاریخ میں سندھ کی حکومت عرب کے حالات عربی کی مستند کتابوں قدیم عرب سیاحیوں کے سفرناموں اور پرانے جغرافیوں سے لے کر جمع کیے ہیں۔ جو اس وقت تک کسی مورخ کی نظر سے نہیں گزرے تھے اور تمام معاملوں میں بڑی تنقید و تحقیق سے کام لیا۔[۴۶]

اس کتاب کو شرر نے خوب صورت اسلوب کا جامع پہنایا۔

عصرِ قدیم

شرر کی لکھی ہوئی ایک اہم کتاب ہے۔ یہ عہد سلف کی ایک مختصر اور جامع تاریخ ہے۔ جس میں ابتدائے تخلیق عالم سے ولادت حضرت مسیح تک کے واقعات شرر نے قلم بند کیے ہیں۔ یہ کتاب شرر کے مورخانہ ذوق کی نمائندہ کہی جاسکتی ہے۔ یہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بارہ ابواب ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے کتاب کے آغاز میں وہ محرک بتایا ہے جو کہ اس کو منظر عام پر لانے کا سبب بنا۔

> ہم مسلمانوں کو یقین ہے کہ تاریخی ذخیرہ جتنا ہم نے فراہم کیا ہے اور ہمارے پاس ہے کسی کے پاس نہیں۔ یہ بے شک سچ ہے۔ مگر اب تو ہم تاریخ میں بالکل بے بصیرت ہو گئے ہیں

ہمارا جو کچھ اصلی ذخیرہ تاریخی ہے عربی میں ہے اور ہندوستان کے مسلمان روز بروز بے بہرہ ہوتے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے تھوڑی بہت واقفیت جو اپنے موجود لٹریچر سے ہمیں حاصل بھی ہو سکتی ہے وہ زمانہ اسلام تک محدود ہے۔ اسلام سے بیشتر کے حالات سے ہم بالکل ہی نا آشنا ہیں اور سخت ضرورت تھی کہ اردو میں ایک ایسی مختصر اور جامع تاریخ مدون و مرتب ہو جائے۔ جس میں حضرت رسالت سے پہلے اور قدیم الایام کے حالات و واقعات اسی طرح سلجھا کے بیان کیے گئے ہوں کہ اس کے مطالعہ سے تاریخ قدیم کا صحیح خاکہ اردو دان طلبہ کے دماغ میں محفوظ ہو جائے۔[۴۷]

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے سے پہلے مورخ کے کیا نظریات تھے؟ شرر نے باوجویکہ یہ دشوار گداز کام تھا اسے اپنے ذمے لیا اور یہ تاریخ لکھ کر اپنے اہل وطن کے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب کو جس مقصد کے پیش نظر شرر نے لکھا ہے وہ مقصد اس کتاب کے مطالعے کے بعد پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ شرر نے انگریزی زبان کی ''لینڈ مارکس ہسٹری'' کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کا ثبوت ان کا اپنا یہ بیان ہے لکھتے ہیں:

اس بارے میں مجھے انگریزی زبان کی ''لینڈ مارکس ہسٹری'' بہت پسند آئی۔ جس میں تخلیق عالم کے آغاز سے لے کر اسرائیلوں، مصریوں، اسیریا اور بابل والوں، ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں اور قرطاجنہ والوں کے حالات نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بلحاظ زمانہ مرتب کر کے اور خوب سلجھا کے بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کا بعینہ ترجمہ کر دینا مناسب نہ تھا۔ کیونکہ اس میں بہت سی باتیں مسلمانوں کے مذاق و معتقدات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ میں نے بجائے ترجمہ کر دینے کے اس بات کو زیادہ مناسب سمجھا کہ واقعات اپنی زبان میں لے لیے جائیں۔ کتب آسمانی کی تحریف کی وجہ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان میں مناسب اصلاح و ترمیم کر دی جائے۔ مگر ترتیب وہی قائم رکھی جائے میں نے اس میں اتنی اور زیادتی کی کہ سنین کا حساب بجائے اس کے کہ ولادت مسیح سے رکھا جائے ولادت سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے قائم کیا تاکہ ہر واقعہ کی نسبت مسلمانوں کو بخوبی ذہن نشین ہو سکے کہ آغاز اسلام سے کتنے دنوں پیشتر تھا۔[۴۸]

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ شرر نے آسان زبان میں یہ تاریخ لکھی ہے جس کا مطالعہ ایک عام قاری بھی کر سکتا ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ قاری کی معلومات اور علم میں اضافے کا سبب بننے والی کتاب ہے۔ اس

کتاب میں شرر نے اپنا خاص انداز اپنایا ہے۔ قدیم الایام اشخاص بلدد کے نام جو انگریزی میں لیے جاتے تھے ان کا تلفظ شرر نے عربوں اور عربی مذاق کے مطابق کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یونانیوں اور رومیوں اور سلف کے تمام ناموں کو انگریزی غارت کرتی ہے۔ عرب اس بارے میں زیادہ محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ: ''اس کتاب میں قدما کے جو نام آتے ہیں ان میں چاہے ''پ'' کی جگہ ''ف'' اور ''چ'' کی جگہ ''ص'' نہ لکھا جائے مگر حرکات کا تلفظ وہی رکھا گیا ہے جو عربوں کا ہے۔''[۴۹] اس کتاب میں تاریخ نگار نے ولادت مسیح علیہ السلام تک حالات وواقعات قلم بند کیے ہیں اگرچہ انہوں نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ولادت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ''خیر القرون'' کے آغاز تک لکھے گئے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر مورخ یہ نہ کر سکا۔ شرر کی اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ اس قابل ہے کہ اسلامی مدارس کے سلسلہ نصاب کا حصہ بنے۔ یہ کتاب قدیم الایام کی تاریخ سے واقفیت دلاتی ہے۔ اردو زبان میں اس پایہ کی کوئی اور کتاب موجود نہیں ہے۔ شرر نے عصر قدیم کے حالات جس طرح قلم بند کیے ہیں وہ انہی کا خاصہ ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں کیسے کیسے حالات وواقعات رونما ہوئے اور کس طرح قومیں عروج وزوال کا شکار ہوئیں؟ شرر نے اردو دان طبقے کے سامنے عصر قدیم کی مستند اور مبسوط تاریخ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ شرر نے تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کا کسی قدر لحاظ بھی رکھا ہے۔ ایک ہی کتاب سے استفادہ کا پتہ چلتا ہے۔ دیگر کتب کی فہرست نہیں ملتی جن سے کتاب لکھتے وقت استفادہ کیا گیا ہو۔ یہ ایسی کتاب ہے جو عام قاری اور تاریخ کے طالب علم کے لیے خاطر خواہ معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ یہ تہذیب وتمدن کے عروج وزوال اور مختلف زمانے کے لوگوں کے رہن سہن اور ان کے حالات وواقعات کی داستان ہے۔ شرر نے بڑی محنت اور جانفشانی سے یہ تاریخ رقم کی ہے۔ اس کتاب کا مواد حاصل کرنے کے انگریزی کی تاریخی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ شرر نے اس تاریخ کی تصنیف میں ایک غیر جانبدار مبصر کا بھی کردار بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ شرر نے واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ محاکے اور تبصرے بھی کیے ہیں۔

شرر کی یہ کتاب پڑھ کر اسرائیلیوں، مصریوں، اسیریا، بابل والوں، ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں اور قرطاجنہ کے حالات وواقعات کا پتہ چلتا ہیں۔ باذوق اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب معیاری اور نادر نمونہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے شرر کے صحیح مورخانہ ذہن کا ادراک ہوتا ہے اور تاریخ سے ان کی دلچسپی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یادیان دین، ملک مصر، سلطنت نبی اسرائیل، نینوا، بابل، شہنشاہی فارس، کرے سوس کی تباہی، زوال بابل، سائرس کے جانشین، مملکت یونان، ان کا مذہب اور ان کے دیوتا، اہل یونان کے عادات واطوار، اسپارٹا، یونان کی اور ریاستیں اور نو آبادیاں، یونان پر ایرانیوں کی چڑھائی، معرکہ

ماراتھون، ریاست ہائے یونان، سقراط اور فلسفہ یونان تھے بیا والوں کی عظمت، شازشائی، مقدونیہ، سکندر اعظم ایشائے کوچک میں، فلسطین اور مصر کی فتح، فتح ایران، ہندوستان کی مہم اور سکندر کی موت، سلطنت مصر و شام، رومیوں کی فتح اٹلی، اٹا کیہ میں قرطاجنہ کی لڑائیاں، قرطاجنہ کی پہلی اور دوسری لڑائی کے نتائج، دولت روم کے عروج و زوال کی داستان اور رومیوں کی پولٹیکل پارٹیوں سے قاری آگاہ ہوتا ہے، معلومات کا ایک وافر ذخیرہ اس کتاب میں شرر نے یکجا کر دیا ہے۔ اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کے لحاظ سے یہ شرر کی وہ کتاب ہے جیسے اپنے عہد میں اور آنے والے ادوار میں مقبولیت حاصل ہوتی رہے گی۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہم یہ جاننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ حضرت مسیح کس عہد میں پیدا ہوئے؟ ان کی پیدائش سے قبل دنیا میں کیا کیا انقلابات، حادثات و واقعات رونما ہوئے اور حضرت مسیح کی پیدائش سے اس دنیا میں کون سا نیا انقلاب برپا ہوا؟

یہ کتاب ہمارے علم میں یہ اضافہ کرتی ہے کہ اس دنیا میں کون کون سے بادشاہ آئے اور ان کا طرز حکومت کیسا تھا؟ انہوں نے اپنی رعایا کے لیے کیا کچھ کیا؟ تہذیب وتمدن ان کے رسم و رواج کیا تھے؟ اس کتاب کے مطالعے سے اہل یونان کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ ان کا طرز زندگی کیسا تھا؟ اور تعلیم کے کیا طریقے تھے؟

درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> یونانیوں میں زیادہ تر مردوں کے جلانے کا رواج تھا۔ جنازوں کو لے جا کے لکڑیوں کی ایک چتا پر رکھ دیتے۔ ان کے ساتھ بعض مسالے بھی رکھ دیے جاتے اور بڑی متانت کے ساتھ آگ لگا دی جاتی۔ جل چکنے کے بعد ان کی خاک ایک ظرف میں بھر کے رکھ چھوڑی جاتی اور اس کی نہایت ہی حفاظت اور تعظیم وتکریم کی جاتی۔

> تقریباً تمام یونانی تعلیم یافتہ تھے۔ جو لکھنا پڑھنا بخوبی جانتے تھے۔ تحریریں چمڑے پر ہوتیں یا پیاترس پر فلسفیوں کے مدارس میں وہ تعلیم پاتے اور مذاق کے اصلاح اور دل کا تزکیہ کرنے کی ان میں بڑی قدر تھی۔ اسی تعلیم نے وہ یونان قدیم بنایا تھا جس کی علمی ترقیوں کو دیکھ کے ہم عش عش کر جاتے ہیں اور ہمیں نظر آتا ہے کہ انسان تعلیم کے ذریعہ سے کس درجہ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے دانائی میں بے حد ترقی کی اور تھوڑے ہی زمانہ میں اس چھوٹے ملک میں مصنفوں، بت تراشوں، فن تعمیر جاننے والوں، فصیح البیانوں اور سپاہیوں کی اتنی بڑی جماعت موجود ہوگئی تھی جو اس وقت سے آج تک دنیا

میں ترقی وتکمیل کا ایک بے مثل نمونہ تصور کی جاتی ہے۔مختلف کمالات میں اس زمانہ تک
کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکا۔[۵۰]

عبدالحلیم شرر ان کے کمالات کو بیان کر کے اپنی قوم کے اندر ترقی کرنے کے جذبات کو ابھارنا چاہتے ہیں تا کہ مسلمان بھی آگے بڑھ سکیں لکھتے ہیں:

ان کے ٹوٹے پھوٹے آثار ہمارے عہد تک باقی ہیں جن کی خوبی اور عظمت دیکھ کر ہم مبہوت اور حیرت ذرہ ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ ان کے ظاہری محاسن پر بہت گہری نظر ڈالیں اور اس اصلی جوہر کا پتہ لگائیں جو اس قدیم زمانہ کے ان عظیم الشان اور باکمال لوگوں میں تھا۔ دراصل وہ خدائے عزوجل کا پرعظمت ہاتھ تھا جو ان کی رہبری کرتا۔ ان کے کاموں سے اپنی خوبیوں اپنی برکتوں اور اپنی عظمت وجلال کی شعاعوں کو چمکاتا اور نمایاں کرتا تھا۔[۵۱]

اس کتاب کے مطالعے سے جہاں اہل یونان کی ترقیوں کے اسباب کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارسپارٹا والوں کی اصلاح کس طرح ہوئی؟ ان دونوں کے بیان میں شرر نے صداقت کے پہلو کو نہیں چھوڑا۔ کہیں تعصب وغلو نظر نہیں آتا۔ بلکہ جس طرح کے حالات وواقعات تھے اسی انداز سے شرر نے رقم کیے ہیں اور اس انداز سے لکھے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہو اور اسپارٹا کی اصلاح کے انداز پر اپنی اصلاح کرے۔

اسپارٹا والے ابتداً نہایت کاہل، زنانہ مزاج اور عیش پرست ہو گئے تھے..... لی قورغوس نے ارادہ کیا کہ اسپارٹا کے لوگوں میں ایک بڑی بھاری اصلاح کر کے ان کی کاہلی و زمانہ منشی کو بالکل دور کر دے اور ایک ایسی تعلیم جاری کرے جس کے اثر سے اس کا ہم وطن ساری دنیا کے لوگوں سے زیادہ جفاکش بہادر اور اپنی جگہ سے قدم نہ ہٹانے والے سپاہی بن جائیں۔ اس اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس نے قلمرو کی ساری زمین لوگوں میں بانٹ دی۔ سونے چاندی کی قسم سے جو کوئی چیز کسی کے پاس پائی لے لی تا کہ کسی جگہ سے سامانِ عیش فراہم کرنے کے ذرائع میں ان کے ہاتھ میں نہ باقی رہیں اور روپیہ پیسہ کے عوض لوہے کے بھاری اور کم قیمت ٹکڑے ان کے ہاتھ میں دے دیے۔جن کو کوئی سوداگر پوچھتا ہی نہ تھا اور ان کے معاوضہ میں کوئی چیز نہ دیتا تھا......ان میں کوئی چیز اتنی اہمیت نہ رکھتی تھی جتنا کہ اسلحہ کا استعمال کرنا اور ضبط وتحمل کی قوت بڑھانا تھا۔اس بارہ خاص میں اہل اسپارٹا کو جو

> تعلیم دی جاتی تھی وہ اس قدر سخت تھی کہ ان لوگوں کے لیے لڑائی کا زمانہ بمقابل اس زمانہ کے جب کہ وہ اپنے شہر اور اپنے گھروں میں ہوتے زیادہ آرام و آسائش کا زمانہ نظر آتا۔[۵۲]

ان حالات وواقعات کے مطالعے سے جہاں قاری میں عہد قدیم کی تاریخ سے واقفیت بڑھتی ہے وہاں اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی قوم کے افراد کی تعلیم وتربیت صحیح نہج پر ہوتو وہ قوم دنیا کی عظیم قوم بن سکتی ہے۔ یہ کتاب قاری کو دعوت غور وفکر دیتی ہے کہ وہ بھی گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کرے اور اپنی اصلاح کر کے اپنے معاشرے اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرے۔

مسیح اور مسیحیت/ المعروف تاریخ ارضِ مقدس

یہ بھی شرر کی لکھی ہوئی تاریخ ہے۔ اس کے دو نام مشہور ہیں اور بعض قاری اس کتاب کے ناموں کی وجہ سے الگ الگ کتب تاریخ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہی کتاب ہے جس کے دو نام ہیں۔

یہ کتاب حضرت مسیح اور دین مسیحی کی مکمل تاریخ ہے۔ اس کتاب کے مولف عبدالحلیم شرر ہیں۔ یہ کتاب دلگداز پریس سے چھپ کر شائع ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں اس کی طبع ثانی منظر عام پر آئی۔ شرر کی یہ وہ کتاب ہے جیسے بہت قدر ومنزلت ملی۔ یہ کتاب ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا اصل نام تاریخ ارضِ مقدس ہے اور یہ موسوم بہ ''مسیح ومسیحیت'' ہے۔ یہ کتاب ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے اور قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب بھی بحکم نواب وقاالامرا لکھی گئی۔ بطور مورخ یہ شرر کی وہ کتاب ہے جیسے مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ اردو دان طبقہ کو ارضِ مقدس کی تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ ''مسیح اور مسیحیت'' کے کوائف وافکار کے متعلق عام واقفیت حاصل ہو۔ اس کتاب کی تالیف کے لیے انہوں نے بڑی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کیا۔ شرر کے انتخاب کردہ تاریخی حالات مستند تاریخی شواہد پر مبنی ہیں۔ کتاب نہایت آسان زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ تاکہ شائقین آسانی سے پڑھ سکیں۔ یہی مورخ کا مقصد ہے جس کو انہوں نے اپنے سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شرر ایک محقق کے انداز میں سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے تاریخ نویسی کے مسلمہ اصول وضوابط کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب رقم کی ہے۔ یہ ایک معلوماتی کتاب ہے۔ جو عام

قاری کے لیے تو یقیناً فائدہ مند ہے لیکن تاریخ کے سنجیدہ طالب علم کے لیے بھی اس میں خاطر خواہ معلومات و مواد موجود ہے۔شرر نے یہ کتاب بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھی ہے۔اس کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے مولانا نے عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں کی تاریخی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔یہ کتاب کل ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے اور ان تمام ابواب میں شرر نے حضرت مسیح کی ولادت کے وقت زمانے کی حالت سے لے کر ارضِ مقدس میں رومیوں کا ''آخری عہد'' تک کے تاریخی حالات قلم بند کیے ہیں۔

اس کتاب میں واقعات تسلسل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔شرر نے تمام حقائق ضبط تحریر میں لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر نے تلاش حق کے لیے بڑی محنت و کاوش کی ہے۔ تحقیق و تنقید سے کام لیا اور حالات و واقعات کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔گذشتہ حالات و واقعات کے مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔مورخ کا انداز بیاں مرصع و مرقع نہیں ہے بلکہ اس نے سادہ عام فہم انداز اپنایا ہے تاکہ تاریخی واقعات کی صحت متاثر ہونے سے بچے اور قاری باآسانی مورخ کا نقطہ نظر سمجھ بھی جائے۔شرر نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تاریخ لکھی ہے اور داستان طرازی قصہ گوئی کے بجائے حق گوئی کو اپنایا ہے ۔جو کچھ انہوں نے محسوس کیا ہے اسی انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ مورخ نے جس عہد کی تاریخ لکھی ہے اپنے آپ کو اسی کے حسب حال ڈھالنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس عہد کی صحیح عکاسی میں کامیاب ہو جائے۔تاریخ لکھتے وقت مورخ نے مذہبی تعصب سے پاک رویہ اپنایا ہے۔شرر جانتے تھے کہ تاریخ نویسی کے لیے تحقیق اہم اور ضروری چیز ہے۔شرر نے کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع سے ہٹ کر کچھ نہ لکھا جائے۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد قاری کے شعور کی نشو ونما ہوئی ہے۔عقل و دانش میں اضافہ ہوتا ہے۔ مختلف افراد، تہذیبوں، ثقافتوں اور قوموں کے بارے میں پڑھ کر قاری میں کچھ کرنے کا ذوق پروان چڑھتا ہے۔ مختلف افراد و اشخاص، حکمرانوں، تہذیبوں کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے۔شرر کی تاریخی کتب کے مطالعے کے بعد علمی دنیا میں آگے بڑھنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔اس کے مطالعے کے بعد نگاہ میں وسعت اور قلب و ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔اس کے مطالعے سے درس ہدایت ملتا ہے۔اس تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کرہ ارض پر کون کون سی قومیں آباد تھیں؟ ان کے طرزِ معاشرت، ان کے اثر و رسوخ، ان کے عروج و زوال کا علم ہوتا ہے۔عبدالماجد دریا آبادی شرر کی تاریخ نویسی کے متعلق رقمطراز ہیں کہ: ''تاریخ امم خصوصاً تاریخ امت کو اگر جاننا ہو اور مسیحیت کی تاریخ سے اگر واقفیت کامل حاصل کرنا ہو تو شرر صاحب کی تاریخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔''۵۳ شرر کی لکھی ہوئی تاریخی کتب میں سے یہ وہ کتاب ہے جو بڑی عرق ریزی کے بعد مورخ نے لکھی

ہے۔اس کتاب میں ذیلی عنوانات بھی موجود ہیں۔جن کی مدد سے کتاب کا مفہوم سمجھنے میں قاری کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی،اس کتب کے مطالعے سے حضرت عیسیٰ کے طریقہ تبلیغ کا پتہ چلتا ہے۔عبدالحلیم شرر کا خیال ہے:

> آپ کی تعلیمیں بالکل ضرورت زمانہ کے موافق تھیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں زمانہ سازی کو دخل تھا۔بلکہ یہ غرض ہے کہ اس زمانہ میں جو عیوب پیدا ہو گئے تھے اور جنھوں نے قوم یہود کے رگ و پے میں سرایت کر کے دین موسوی کو بے کار و بے جان کر دیا تھا۔وہ جس طرح ممکن ہو دور کیے جائیں ......آپ کی پہلی تعلیم یہی تھی کہ لڑائی اور خون ریزی کا نام ہی نہ لینا چاہیے۔آپ نے عجیب پیغمبرانہ رعب وداب سے یہ جملہ پکار کے کہہ دیا کہ ''جو لوگ تلوار سے لڑیں گے وہ تلوار ہی سے مارے جائیں گے''۔۵۴

اس کتاب کے مطالعے سے یہودیوں کے عقائد ونظریات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے:

> ......وہ سمجھتے تھے کہ خدا کے منتخب اور برگزیدہ لوگ صرف ہمیں ہیں اور باقی ساری دنیا کا شمار کافروں بلکہ ان لوگوں میں ہے جو خدا کی رحمت سے دور ہیں۔تمام برکتیں اور ساری خوبیاں ان کے خیال کے مطابق کل مخلوق سے چھین کے صرف اولاد اسرائیل کے حصہ میں کر دی گئی تھیں یہ خود پسندی کا غرور ہزار ہا سال پیشتر سے ہر اسرائیلی بچے کے دل میں جوش مارتا چلا آتا تھا۔۵۵

اس وقت سے لے کر موجودہ دور تک یہودیوں کی یہی سوچ ہے۔ان کی اس سوچ کو اگر چہ حضرت عیسیٰ نے تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ حضرت عیسیٰ ہی کے دشمن بن گئے۔آج بھی پوری دنیا میں یہودیوں کی یہی سوچ پھیل رہی ہے۔''تاریخ ارض مقدس'' کے مطالعے سے حضرت عیسیٰ کے عہد اور ان کے انداز تعلیم وتبلیغ کا صحیح علم ہوتا ہے وہ مشکلات جو حضرت عیسیٰ کو پیش آئیں تھیں ان کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔شرر نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کے انجام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے لگتا ہے کہ وہ عیسائیوں کے خیالات کے مطابق لکھا ہے۔شرر لکھتے ہیں:

> یہ جتنے واقعات بیان کیے گئے سب عیسائیوں کے خیالات اور ان کے معتقدات وروایات کے مطابق ہیں۔ہم بتا چکے ہیں کہ آپ کے حالات زندگی کے بارے میں سوا مسیحیوں کے اور کسی قوم کے مورخوں سے کچھ حالات نہیں معلوم ہو سکتے۔مگر ہاں آپ کی مصلوبیت کے متعلق قرآن پاک کی سچی اور معصومانہ شہادت سے جو واقعات معلوم ہوتے ہیں۔وہ

عیسائیوں کے بیان کے بالکل خلاف ہیں۔عیسائیوں کی تمام انجیلیں اس امر پر متفق ہیں کہ آپ ہی مصلوب کیے گئے مگر قرآن مجید کہتا ہے وَ ما قتلوہ وما صلبوہ یعنی نہ انہوں نے آپ کو قتل کیا اور نہ صلیب پر لٹکایا۔ولکن شبہ لھم بلکہ ان لوگوں کو دھوکا ہو گیا اس شہادت قرآنی کی بنا پر مسلمانوں کا عملی العموم یہ عقیدہ ہے کہ دوران مقدمے میں خدا نے آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور ایک یہودی شخص کی صورت بالکل آپ کی سی بنا دی اور آپ کے دھوکے میں لوگوں نے اسے لے جا کے مصلوب کر دیا۔[۵٦]

اس پیراگراف سے پتہ چلتا ہے کہ شرر نے عیسائی مورخوں کی تاریخی کتب سے مواد اخذ کیا ہے لیکن ساتھ ہی قرآن پاک اور مسلمانوں کے ہاں جو خیالات ان کے بارے میں پائے جاتے تھے اس کا بھی برملا اظہار کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں جو کچھ لکھا عیسائیوں اور مسلمانوں کے نقطہ نظر کے مطابق لکھا ہے۔لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہودیوں کے نقطہ نظر کو بھی بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے دین کے پھیلنے کے اسباب وعلل پر شرر نے موثر انداز سے روشنی ڈالی ہے۔مسیحیت کی اشاعت وکامیابی کے چھ اسباب گنوائے ہیں۔

درحقیقت اس دین کی عام ترقی و رواج کے چھ سبب ہوئے۔(۱) دین یہود کا عام دنیا میں پھیلا ہونا اور ان کے آئین و اصول مذہبی کا اس وقت کے تمام مہذب ممالک میں حیرت سے دیکھا جانا۔(۲) مسیحی مذہب کا آسان اور اس قابل ہونا کہ ہر مذاق اور ہر ملک اور ہر قوم کے رسم ورواج کے سانچے میں ڈھل جائے۔(۳) ابتدائے زمانے کے عیسائیوں کی خالص و بے ریا للّٰہیت اور ان کے اخلاق و عادات کا مستقل اور غیر متغیر ہونا۔(۴) آئندہ زندگی کا کامل اور بے شبہ یقین۔(۵) عیسائیوں کا باہمی اتفاق اور (٦) ابتدائی کلیسا اور پہلے دور کے مسیحیوں کے کرامات۔خوارق عادات جو اس دنیا اور اس زمانے کے دل پر سب پوری گرفت رکھتے تھے۔[۵۷]

شرر نے بڑی محنت و جانفشانی کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔اگرچہ اس میں سن وغیرہ نہیں لکھے ہوئے ہیں لیکن حالات وواقعات کے بیان میں تسلسل ہے۔کڑی سے کڑی ملی ہو نظر آتی ہے۔اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ شرر نے عیسائیوں کے مذہبی عقائد اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں لکھ کر ثابت کیا کہ مسلمان حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیا نظریات رکھتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کا مقام و مرتبہ مسلمانوں کے ہاں کیا ہے؟

۱۹۱۷ء میں شرر نے تاریخ عزیز مصر اور ''تاریخ یہود'' بھی لکھی۔ جو ان کے مورخانہ ذوق کی نمائندہ کتابیں ہیں اور شرر کے وسعت مطالعہ، ذوق وشوق اور تحقیق وتنقید کا بہترین مظہر بھی ۔۱۹۲۰ء میں شرر نے ایک منظوم تاریخ اسیر بابل لکھی ہے جو کہ شرر کی معلومات اور ذوق وشوق کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔

تاریخ خلافت

شرر نے جتنی بھی تاریخی کتب لکھی ہیں ان میں یہ سب سے مختصر ہے۔ یہ کتاب ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں شرر نے خلافت اسلامیہ کے حالات اول سے آخر تک مختصراً بیان کیے ہیں۔ مولانا نے خاصی محنت سے یہ تاریخ لکھی ہے۔ جو بلاشبہ مولانا کی اسلام سے دلچسپی اور عشق کا ثبوت ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ دلگداز پریس لکھنو سے اسے حکیم محمد سراج الحق صاحب منیجر دلگداز ایڈیٹر نے شائع کیا۔ یہ کتاب شرر کے جذبات کی صحیح عکاس ہے۔ انھیں تاریخ اسلام سے جو محبت تھی وہ لازوال تھی ۔ وہ اپنے آباؤاجداد کے کارناموں پر خود بھی فخر کرتے تھے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ناز کرنے کا درس دیتے تھے۔ جب انہوں نے یہ کتاب لکھی اس وقت خلافت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ وہ شدید حزن وملال کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے اس غم میں اوروں کو بھی شامل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

> ......سال حال کچھ ایسے خوفناک اسلوب اور نا امید کرنے والے انداز سے آیا ہے کہ اظہار حزن و ملال اور ادائے شکوہ و شکایت کے لیے ہمیں الفاظ نہیں مل سکتے۔ درحقیقت اس سال نے ہمیں قومی و دینی حیثیت سے مطلقاً ہلاک کر ڈالا...... ۔[۵۸]

پوری دنیائے اسلام جس دردوقرب میں مبتلا تھی۔ شرر نے اس کی صحیح عکاسی اس کتاب میں کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''اس پہلے زوال خلافت کو دنیائے اسلام نے اتنا محسوس نہ کیا ہوگا۔ جتنا کہ فی الحال اہل اسلام اس صدمے سے خون کے آنسو بہار ہے ہیں۔''[۵۹]

خلافت کی مختصر تاریخ لکھنے کا محرک ۱۹۲۰ء کا سال ہے۔ جس نے اسلام کی سیاسی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا اور مسلمان مجبور تھے کہ اس موت کو برضاورغبت یا مجبوراً قبول کریں۔ جب خلافت کا خاتمہ ہوا تو شرر نے محسوس کیا کہ اس خلافت کی مختصر تاریخ لکھی جائے۔ تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو سکے کہ خلافت کا آغاز کب ہوا؟ اس کے فروغ کے محرکات کیا تھے؟ اور اس کا خاتمہ کیونکر ہوا؟ اگرچہ یہ مختصر تاریخ ہے، لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی اس میں جامعیت پائی جاتی ہے۔ شرر نے خلافت کے آغاز ربیع الاول ۱۱ھ سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کی تاریخ کو اس کتاب

میں یکجا کر دیا ہے۔انہوں نے ایک مورخ کے فرائض کواور تاریخ کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے یہ تاریخ لکھی۔تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کے عروج وزوال کے کیا اسباب و علل ہیں؟ خلافت راشدہ کے دور پر شرر نے مختصراً روشنی ڈالی ہے اور اس کو وہ خلافت کا دور اولین تصور کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> خلافت کا یہ دور اولین جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر ختم ہوا۔خلافت راشدہ کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ ان بزرگوں نے کمال نیک نفسی و پابندی شرع سے دین الٰہی کی خدمت کی اور چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے خلفائے راشدین کی پیروی کرو۔لہٰذا یہ پانچوں محترم جانشین حضور نبوت مسلمانوں کے عقیدے میں خلفائے راشدین تسلیم کیے گئے۔[۶۰]

یہ تاریخ بھی انہوں نے بالاقساط اپنے مشہور و معروف رسالے دلگداز میں شائع کی تھی۔یہ تاریخ لکھ کر شرر نے یہ ثابت کیا کہ خلافت اسلام کا خاتمہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں ہوا ہے اور اس کے خاتمے کی بڑی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ دارالخلافت مدینہ منورہ سے جب دوسری جگہوں پر منتقل ہوا تو بیرونی آفتوں کا مرکز بنا اور دشمنان اسلام اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔شرر نے اس تاریخ کے ذریعے سے قوم کی بے حسی اور غفلت شعاری کو بیان کرنے کی سعی کی ہے،انھیں دکھ ہے اور وہ اپنے دکھ کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> یہود کا جب بیت المقدس میں استیصال ہوا ہے تو ان میں جب مقابلہ کی قوت نہ باقی رہی تو رونے والوں کا ایک پر جوش گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنے قومی زوال پر پانچ چھ صدیوں تک روتا اور نوحہ خوانی کرتا رہا۔ہمارے یہاں تو افسوس کوئی رونے والا بھی نہیں۔جتنے ہیں خوش اور بشاش اور بہ اطمینان تمام شادان و فرمان ہیں۔[۶۱]

شرر نے قوم کی بے حسی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس سانحہ کو وہ تاریخ اسلام کے لیے ایک بڑا سانحہ قرار دیتے ہیں۔ایک طرف تو برصغیر پاک و ہند میں انگریز مسلمانوں کا استیصال کر رہے تھے اور دوسری طرف عالم اسلام کا مرکز خلافت ختم کر دیا گیا تھا۔لکھتے ہیں کہ:''لہٰذا اب ہم مردہ ہیں اور جینے کے تمام علامات و آثار ہم سے مفقود ہو چکے ہیں۔''[۶۲]

شرر نے مسلمانوں کی خلافت کے آغاز و اختتام کا مرثیہ لکھ کر مسلمانوں کو دعوت عمل دی ہے۔انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں

مسلمانوں کو پامال کیا جارہا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ ہم متحد ہو کر اسلام دشمن عناصر کا مقابلہ کریں اور اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس مقصد میں شرر کسی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے جتنی بھی تاریخی کتب لکھی یا تاریخی ناول لکھے ان کے پیش نظر مقصد ایک ہی تھا کہ مسلمانوں کو ان کے عروج و زوال کی داستان سنا کر انھیں خواب غفلت سے جگایا جائے اور عمل پر ابھارا جائے۔ اس لیے کہ اس وقت حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اگر چہ اس میں کچھ خامیاں بھی ضرور پائی جاتی ہیں لیکن جب ہم اس سیاسی پس منظر اور ان حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اس کتاب کا مطالعہ کریں تو خامیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

صقلیہ میں اسلام

یہ ایک محققانہ تاریخ ہے۔ اس میں تاریخ نویس نے یہ بتایا ہے کہ مسلمان کب اور کیونکر جزیرہ صقلیہ میں آئے اور فتح یاب ہوئے اور پھر ان کے عہد کا خاتمہ کس طرح اور کیونکر ہوا؟ اس کتاب کا سال اشاعت ۱۹۲۹ء ہے۔ یہ کتاب دلگداز پریس لکھنو محلہ کڑہ بزن بیگ خان میں طبع ہوئی۔ حکیم محمد سراج الحق مینجر و پرنٹر و پبلشرز نے اس کو شائع کیا۔ اس سے قبل یہ دوبار شائع ہو چکی تھی۔ یہ طبع سوم ہے جو کہ ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی معروف و مشہور تاریخ تھی۔ شرر کی اکثر تاریخی کتب کی طرح یہ کتاب بھی ان کے خاص انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شرر نے عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ ایک نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ شرر کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب شرر نے بہت محنت اور کاوش کے بعد لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تین اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ مسلمان کب اس سرزمین پر آئے؟

۲۔ کب انھیں فتح نصیب ہوئی؟

۳۔ اور کس طرح ان کے عہد کا خاتمہ ہوا؟

اس کتاب میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ واقعات کے بیان میں ترتیب ہے۔ شرر نے جب یہ تاریخ رقم کی ہے اس وقت بقول شرر:

> آج کل یہ جزیرہ دولت ایطالیہ کے قبضے میں ہے، جس سلطنت کو اب سواحل افریقہ پر دست درازی کرنے کی بھی جرأت ہوگئی۔ حالانکہ جس عہد کی سرگزشت ہم مہندم مساجد

> کے کھنڈروں سے سن کر سنا تے ہیں اس زمانے میں خود مملکت ایطالیہ مسلمانان افریقہ کی الوالعزمیوں کی جولان گاہ تھی ۔[۶۳]

شرر کی مورخانہ کاوشوں کے پیچھے ان کا یہ مقصدی پہلو جلوہ فرما ہے کہ انگریزوں کے پھیلائے ہوئے زہریلے مادے کو روکا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ اس لیے کہ انگریز سیاسی ہتھکنڈوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کرتے تھے کہ سیاسی تدبیر میں انگریز ان سے آگے ہیں ۔شرر نے یہ تاریخ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ مسلمان بھی جب اپنے اندر لافانی اوصاف پیدا کر لیتے ہیں تو پوری دنیا میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔شرر لکھتے ہیں کہ:

> فی الحال اس جزیرے کے کل رہنے والے مسیحی ہیں اور مسلمانوں کا اس میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہ تھا۔ کبھی اس میں لاکھوں مسلمان آباد تھے۔ ابن جبیر اندلیسی اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ ''اس میں مساجد کی اس قدر کثرت ہے کہ ہر شہر کی زد پر کوئی نہ کوئی مسجد ضرور ملتی ہے'' یا تو وہاں اتنے نمازی تھے کہ ان کے لیے اتنی مسجدوں کی ضرورت پیش آئی ۔[۶۴]

شرر اس تاریخ میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت اور شان وشوکت کا مرثیہ سناتے ہیں ۔شرر نے اپنے ناولوں اور تاریخی کتب میں مسلمانوں کو ان کی گذشتہ تاریخ کے واقعات سنائے ہیں اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔پروفیسر جعفر رضا شرر کی مورخانہ حیثیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> شرر کو اردو ادب کی تاریخ میں امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے ناول نگار اور مورخ دونوں حیثیتوں سے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان کی مورخانہ اور ناول نگار شخصیتوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں طرح کی شخصیت ایک دوسرے کے لیے غذا فراہم کرتی ہے ۔مورخ شرر پر تاریخی ناول نگاری کی گہری چھاپ ہے۔ جو صدا تاریخی صداقتوں میں ایسے واقعات وحالات کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے مخصوص طرح کے قاری کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرسکیں ۔ناول نگار شرر بعض اوقات تاریخ ادوار اور اعداد وشمار صحیح صحیح پیش کرتا ہے اور بسا اوقات انھیں مسخ کر کے اپنے مفید مطلب بناتا ہے ۔شرر تاریخ اور ناول کو اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے تھے ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہی

طے شدہ مقصد ......آئینہ ماضی میں امت مرحومہ کو اس کی عظمت کی تصویر دکھانا۔[۶۵]

مسلمانوں کی روحانی، مذہبی اور شخصی عظمت سے ساری دنیا واقف ہے۔شرر نے اس تاریخ میں مسلمانوں کے سیاسی نظام حکومت کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور اپنے مورخانہ، عالمانہ و محققانہ طرز تحریر اور استدلال سے یہ ثابت کر دیا کہ اہل یورپ جس نظام حکومت اور جس طاقت پر آج ناز کرتے ہیں اس کا حیرت انگیز سبق سب سے پہلے مسلمانوں نے پڑھا دیا ہے۔شرر نے اس سرزمین میں مسلمانوں کے قائم کردہ نظام حکومت اور ان کے عہد کی ترقی کا نقشہ کھینچا ہے اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس عہد میں گھوم پھر رہے ہیں جب صقلیہ میں اسلام کا بول بالا تھا۔شرر کی دوسری تاریخی کتب سے یہ کسی حد تک مختلف ہے۔شرر تاریخ کی دلفریب وادیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی خبر بھی نہیں رہتی۔شرر نے جس زمانے میں تاریخ نویسی شروع کی تھی وہ انسانیت اور آدمیت کے زوال کا زمانہ تھا۔ ہندوستان میں درندگی، ظلم و ستم اور بربریت کا راج تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے تخت و تاج پر قبضہ جمانے کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے کہ انھیں دیکھ کر شیطان بھی منہ چھپاتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ پھٹے پڑ رہے تھے اور کوئی دردمند نہ تھا جو ان کی دادرسی کرتا۔ ایسے میں سرسید اور ان کے رفقا اور شرر کے خون نے جوش مارا اور وہ قلم کی تلوار لیے میدان جہاد میں اترے سب نے انگریزوں پر واضح کر دیا کہ یہ ظلم و ستم جیسے تم اپنا دین اور ایمان سمجھتے ہو بہادروں کا شیوہ نہیں۔ بہادر تو ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تعریف دشمن بھی کریں۔شرر نے اپنی تاریخ نویسی کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کیا اور ان کے دورِ حکومت میں اس دنیا میں کیسا راج تھا۔انسانیت و آدمیت میں کوئی فرق تھا نہ کوئی امتیاز تھا۔ایک طرف تو شرر نے یہ تاریخ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان جب کسی علاقے کو فتح کرتے ہیں تو کن اصولوں کو اپناتے ہیں؟ تو دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کو اسلامی حکومت کے عہد کی تصویر دکھا کر ان کے حوصلے بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔

شرر اپنے عہد کی کمزوریاں اور خوبیاں دونوں کو بیان کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے آبا واجداد کی عظمت کے گیت سناتے ہیں، تاکہ ان کا بنیادی مقصد حاصل ہو جائے۔شرر صرف جنگ وجدل کے ذکر اور لڑائیوں کے حالات بیان کرنے کو تاریخ نہیں سمجھتے بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ تہذیب وتمدن انسانی کے ذکر کے بغیر تاریخ کا تصور ممکن نہیں۔ وہ جہاں تک جنگ وجدل کے واقعات قلم بند کرتے ہیں وہاں تہذیب وتمدن کی تصویر کشی بھی کرتے جاتے ہیں۔

شرر نے اس تاریخ میں مسلمانوں کی فتح مندی کے قصے سناتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ اپنی کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں نے کتنی قربانیاں دیں، کتنی جدوجہد کی، کتنی مشکلات و مصائب برداشت کیے۔شرر نے

اس تاریخ میں مختلف مسلم سپہ سالاروں کے کارنامے بیان کیے ہیں جن کو پڑھ کر قاری میں کچھ کرنے کا جذبہ جنم لیتا ہے۔

شرر نے تاریخ لکھ کر مسلمانوں کے عہد گزشتہ کے کارناموں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ''صقلیہ میں اسلام'' میں شرر نے تاریخ نویسی کی تمام خصوصیات کو یکجا کر دیا ہے وہ اسے ایک بہترین تصنیف سمجھتے تھے اور یہ سچ ہے کہ شرر کے جلائے ہوئے دیوں میں یہ بھی ایک روشن دیا ہے۔ اس تاریخ میں شرر نے ایک مورخ کے فرائض جہاں بخوبی ادا کیے ہیں وہاں تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کا بھی لحاظ رکھا ہے اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ تاریخ رقم کی ہے۔ کتاب کے آخر میں شرر لکھتے ہیں:

> یہ تھی جزیرہ صقلیہ کی مختصر تاریخ جس میں عربی سطوت قائم ہوئی بڑھی جنوبی ایطالیہ تک پھیلی اور آخر باہمی نفاق خودسریوں اور بدتنظیموں سے گھٹنا شروع ہوئی یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے بالکل فنا ہوگئی۔ مسلمانوں نے صقلیہ میں ہزاروں مسجدیں بنائی تھیں سیکڑوں حمام قائم کیے تھے۔ صدہا قلعے بنائے تھے اور خدا جانے کتنے ایک بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان تعمیر کیے تھے۔ مگر جب ان کی نالائقی کی سزا میں خدا نے اپنا یہ عہد پورا کیا کہ'' جولوگ اپنی حالت کو بدلتے ہیں۔ ہم بھی ان کی حالت بدل دیتے ہیں'' اور ان کے عروج وزوال کا کہیں پتہ نہ تھا اور اس دور کی عظمت کا نام ونشان بھی نہ باقی تھا۔ جس کے دونوں رخوں کی تصویریں یہ ہیں کہ ابن جبیر اندلسی نے اپنے سفر میں تو یہ حالت پائی تھی کہ سارے جزیرے میں کوئی جگہ مسجدوں سے خالی نہ نظر آتی تھی۔ یا اب یہ حالت ہے کہ وہاں کسی مسجد کا پتہ ہے نہ مسلمانوں کے آنے رہنے اور حکومت کرنے کی کوئی یادگار کہیں نظر آسکتی ہے۔[۶۶]

شرر کے پیش نظر یہی مقصد رہا کہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کو پیش کر کے وہ مسلمانوں کی افسردگی کو دور کریں اور ان کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کر کے ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ علی عباس حسینی مولانا شرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مولانا عبدالحلیم شرر عربی و فارسی کے عالم تھے اور تاریخ سے آپ کو خاص ذوق تھا۔ آپ نے انگلستان اور ممالک یورپ کی سیاحت بھی کی تھی۔ اس سفر کے سلسلہ میں آپ نے وہ آثار الصنادید بھی دیکھے تھے جن سے ان ایام گزشتہ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ جب عرب کا پرچم صقلیہ اور اندلس پر لہراتا تھا......مورخانہ ذوق، قبولیت عام کی خواہش، مذہبی جوش اور

> مسلمانوں کے احیاء کا خیال ......آپ نے مسلمانوں کو ان کے قدیم کارنامے یاد دلا کر
> موجودہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرنا چاہا......۔[۶۷]

اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک محققانہ تاریخ ہے۔شرر نے اپنے مورخانہ ذوق، قبولیت عام کی خواہش، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیاء کی خاطر یہ کتاب لکھی ہے۔آپ مسلمانوں کو ان کے کارناموں کی یاد دلا کر موجودہ پستی پر غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔اس کتاب میں بھی سن موجود نہیں ہیں اور عنوانات کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کتاب کے مطالعے سے مسلمانوں کی جرأت و بہادری کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کی عظیم الشان فتح کا پتہ چلتا ہے اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام دو حصوں پر مشتمل ہے۔جس کا پہلا حصہ جزیرہ نما عرب اس کی وضع حالت اور تاریخ جاہلیت سے لے کر فاروقی سیاست وتمدن تک ہے۔دوسرے حصے میں حضرت عثمان ذی النورین، خلافت علی مرتضیٰ تا حضرت حسن مجتبیٰ کے زمانہ کے تاریخی پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔مولانا نے خاصی محنت سے یہ تاریخی کتاب تحریر کی ہے اور بلاشبہ شرر کی جو اسلام سے دلچسپی اور عشق ہے اس کا اقرار نہ کرنا کفر کے مترادف ہے۔انہوں نے اپنے مذہب سے محبت کا ثبوت یہ کتاب لکھ کر دے دیا ہے ان کی یہ خدمت ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ڈاکٹر سید یحیٰی احمد ہاشمی رقمطراز ہیں:

> شرر نے تاریخ اسلام کو اس لیے ہاتھ لگایا تھا کہ عیسائی مشنری کی اس کوشش کو ناکام بنا دیں
> کہ جس میں مسلمان ناواقفیت کی بنا پر عیسائیت کی خوبیوں سے متاثر ہو رہے تھے اس لیے
> انہوں نے عیسائیت سے براہ راست فکر کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے بلند
> اخلاق اور شجاعت و بہادری کے کارناموں کو تاریخ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا......۔[۶۸]

یہ ایک مدافعت کا طریقہ تھا جو شرر نے اپنایا تھا۔شرر کی تاریخ نویسی نے مسلمانوں کی اخلاقی برتری کا ثبوت فراہم کیا۔شرر نے دانستہ یا نادانستہ جو کچھ لکھا ہے ان کے مدنظر ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کو پیش کر کے اپنے عہد کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا جائے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقصد میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ضرور ہوئے ہیں۔عبدالعلیم صدیقی نے درست کہا ہے کہ:''ان کی ہمدردی نہ صرف اپنے ملک کے مسلمانوں سے تھی بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے وہ عمر بھر کوشاں رہے۔''[۶۹]

تاریخ ادب اردو میں وہ اپنی جامع الحیثیات کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ڈاکٹر سید مرتضٰی جعفری کا خیال ہے:

> اردو زبان وادب نے کچھ ایسی دیو پیکر ادبی شخصیتوں کو دنیا سے متعارف کیا جن کی عظمت و شکوہ کے سامنے گردنیں خود بخود جھک جاتی ہیں۔جن کا نام زبان پر آتے ہی ایک بیکراں سمندر کی موجوں کا شور ذہن میں ہنگامہ مچا دیتا ہے۔انہی پرعظمت شخصیتوں کی فہرست میں مولانا عبدالحلیم شرر بھی شامل ہیں جن کو خداوند عالم نے اپنی فیاضیوں کے خزانوں سے بیک وقت کئی نعمتوں سے مالا مال کیا تھا جن کی ذات میں کئی ادیب،شاعر،سوانح نگار، ناول نویس، ناقد،صحافی اور تاریخ دان یکجا ہو گئے تھے اور کسی میدان میں بھی وہ نہ صرف اپنے معاصرین میں ہی کسی سے کم نہ تھے بلکہ بعض اصناف میں تو تاریخ ادب اردو آج تک ان کی نظیر پیدا نہیں کر سکی۔[۷۰]

شرر کو خدا نے کئی صلاحیتوں عطا کیں تھیں ایک مورخ کا ذہن دیا تھا اور اس صلاحیت کو شرر نے مسلمانوں کی اصلاح اور احیائے اسلام کے لیے استعمال کیا،اس میدان میں خدا تعالٰی نے انھیں کامیابی بھی نصیب کی۔

تاریخ اسلام جلد اول ۵۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں عہد رسالت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کا تذکرہ ملتا ہے۔اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قبل، ملک عرب، اس کی وضع و حالت اور تاریخ جاہلیت،عرب کے رہنے والے، ان کی قدیم تاریخ، ان کی معاشی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالت زار کے ذکر کے ساتھ عرب قبائل کا تذکرہ اور ان کی خوبیوں وخامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولات سے جوانی تک کے حالات وواقعات کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ غزوات کی تفصیل کا احاطہ کیا گیا ہے اور غزوات کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

قاری کو جو چیز متاثر کرتی ہے وہ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت وسیرت وکردار سے متعلق تفاصیل ہیں جو کتاب کے صفحہ ۳۱ سے ۱۲۵ تک ہیں اور دوسری خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ملک عرب کی وضع قطع اور تاریخ جاہلیت کا پتہ چلتا ہے۔اسلام سے قبل کے مذاہب،عرب کے رہن سہن،حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم، واقعہ قربانی،تعمیر کعبہ اور حضرت ابراہیم کی وفات تک کے حالات وواقعات سے قاری آگاہ ہوتا ہے۔ظہور اسلام سے قبل آل اسماعیل کی تفصیلات سے بھی آگاہی اس کتاب کے مطالعے سے ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام کی جلد اول ہی میں حضرت ابو بکر صدیق کے دور حکومت اور حضرت عمر کے دور حکومت سے متعلق

تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق کے دورِ حکومت میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات، فتوحات، نئے محکموں کا اجراء، ان کے عہد خلافت میں اسلامی ریاست کے دوسری حکومتوں سے تعلقات اور اسلامی ریاست کی وسعت سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت سے متعلق تفصیلات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے عہدِ خلافت میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیلات کا ذکر ملتا ہے۔فتوحات کا تفصیلاً تذکرہ ملتا ہے۔حضرت عمر فاروق کے عہد میں اسلامی طرزِ حکومت اور اسلامی ریاست کے دوسری حکومتوں سے تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ فاروقی سیاست وتمدن اور ان کی سیرت و کردار کے متعلق تفصیلات اس کتاب میں موجود ہیں۔

یہ ایک مستند اور مبسوط تاریخ ہے جو کہ تاریخ نویسی کے اصولوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ظہورِ اسلام سے قبل اور بعد کے صحیح صحیح حالات و کوائف لکھ کر شرر نے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے۔اس جلد کے مطالعے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مولف نے حالات و واقعات کو کہیں مختصراً اور کہیں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ انداز سیدھا سادا ہے۔تنقید و تجزیہ بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔مولانا نے تاریخ نویسی کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔اس جلد میں مستند اور غیر مستند تاریخی ماخذوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ان کتب کے دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ شرر نے جتنی بھی تاریخی کتب لکھی ہیں ان میں سے واحد یہ تاریخی کتاب ہے جس میں مولف نے بڑی محنت کی ہے۔اس کتاب کے لکھنے میں انہیں وقت بھی زیادہ دینا پڑا۔ ان کی باقی تاریخی کتب سے اگر موازنہ وتقابل کیا جائے تو یہ تاریخی کتاب اپنے مواد، موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے سب پر سبقت لے جاتی ہے۔اس جلد کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ شرر نے حوالہ جات دے کر نتائج اخذ کیے ہیں اور ہر صفحے کے نیچے اپنے نظریات و خیالات بھی پیش کیے ہیں اور اختلافی نظریات بھی بیان کیے ہیں۔ ایک ہی واقعہ یا بات کو وہ مختلف کتب میں دیکھنے کے بعد اپنے نقطہ نظر کی وضاحت حاشیے کے نیچے کر دیتے ہیں۔ جس سے کتاب پڑھنے والا کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔

شرر کی یہ کتاب ایک مستند اور تسلیم شدہ تاریخ ہے۔ عام قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے اور تاریخ کے سنجیدہ طلباء کے لیے بھی یہ ایک اہم کتاب ہے۔شرر نے تمام اہم واقعات اور ان کے اثرات کو درج کیا ہے۔اس جلد میں ہر فصل میں ذیلی عنوانات کے تحت مواد پیش کیا گیا ہے۔مولف نے کہیں کہیں اپنے نقطہ نظر کو بھی جگہ دی ہے اور بہت ساری ایسی باتیں، ایسے واقعات لکھے ہیں جو اس سے پہلے بہت کم لکھے گئے اور اگر قابل توجہ سمجھے بھی گئے تو ان پر ویسی توجہ نہ دی گئی جیسی کہ دی جانی چاہیے تھی۔اگر کتاب کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس میں

خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔کہیں کہیں ان حالات و واقعات کی تفصیلات دینے سے گریز برتا گیا ہے جو کہ ضروری تھیں۔مثلاً غزوات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔مختصراً غزوات کا ذکر ہوا ہے۔اس کتاب میں شرر کا انداز بیان ایسا ہے کہ عام قاری بھی اس تاریخ کو پڑھ کر اس سے نتائج اخذ کر سکتا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> اب عرب کے ہر ہر کونے اور ہر ہر قبیلے میں دعوت رسالت اور تبلیغ حق کی آواز گونج رہی تھی۔مگر اب رحمۃ اللعالمین تھے اور ساری دنیا کی ہدایت کے لیے تشریف لائے تھے۔لہذا آپ کی رسالت کا منشا اس وقت پورا ہو سکتا تھا جب سارا عالم چونکا دیا جائے۔[۷۱]

جلد دوم ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت عثمان ذی النورین کے عہد سے لے کر حسن مجتبیٰ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے۔یہ جلد ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی۔اس جلد کا پہلا باب عہد خلافت عثمانی یعنی حضرت عثمان کی جانشینی اور آپ کے عہد کے ابتدائی واقعات پر مشتمل ہے۔دوسرے باب میں علی مرتضیٰ کے عہد خلافت اور ان کی شہادت کا تذکرہ ہے۔اس باب میں پندرہ فصلیں ہیں۔حضرت علی کے حالات اور خصائل وفضائل مختلف معرکوں یعنی جنگوں کا تذکرہ موجود ہے۔تیسرا باب خلافت حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کا احاطہ کرتا ہے۔اس باب میں بنوامیہ کی دنیوی خلافت، امیر معاویہ اور حضرت امام حسن کی جنگ، امیر معاویہ کی وفات اور خلافت راشدہ کے خاتمہ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب میں حضرت عثمان کے دور حکومت کی مہموں، حرم کعبہ کی توسیع، مسجد نبوی کی از سر نو تعمیر، حضرت عثمان کے خلاف بغاوت اور ان کی شہادت کے اسباب و واقعات سے متعلق بحث کی گئی ہے۔مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بطور خلیفہ انتخاب قصاص عثمان کی تحریک، جنگ جمل، جنگ صفین، مکہ اور مدینہ میں شامیوں کی یلغار حضرت علیؓ کے خلاف خوارج کی شازش، حضرت عثمان کے دور حکومت کے دوران سر اٹھانے والے فتنوں کے اسباب وعلل کی تمام تر تفاصیل سے بحث کی گئی ہے۔تاریخ اسلام کی دونوں جلدیں سات ابواب پر مشتمل ہیں۔پہلی جلد میں چار جبکہ دوسری جلد میں تین ابواب شامل ہیں۔

اس جلد کو شرر نے بڑی محنت وجستجو کے بعد لکھا ہے اور انہوں نے چونکہ خلافت راشدہ کے خاتمے تک کے حالات و واقعات ان دو جلدوں میں پیش کیے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر بعد کے ادوار مثلاً بنوامیہ اور بنو عباس کے ادوار کو تاریخ اسلام کہہ دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔تاریخ اسلام کا دور جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے کہا ہے کہ خلافت راشدہ تک ہی محدود ہے۔بعد کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے اور مسلمانوں کی برائیاں اسلام کے کھاتے میں ڈالنا مناسب دکھائی نہیں دیتا۔یہی نظریہ شرر کے پیش نظر تھا انہوں نے چونکہ اس تاریخی کتاب کا نام تاریخ اسلام رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ تک کے حالات وواقعات مولف نے بیان کیے ہیں۔

مولف نے ان تمام اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ملوکیت کا پیش خیمہ ہے۔اگر چہ بظاہر یہ بحث کم نظر آتی ہے لیکن درپردہ مولف کے سامنے یہ نقطہ نظر بڑا واضح تھا۔ کہ تاریخ کے طلباء کے سامنے وہ تمام واقعات آجائیں جو اتنی زبردست تبدیلی کا پیش خیمہ ہیں جو ہیئت اسلامی کو تبدیل کرنے کا سبب بنے۔شرر نے وہ انداز اختیار کیا ہے کہ خلفائے راشدین عظیم رہنماؤں کی صف میں شامل ہوئے۔فتوحات دورِ خلافت کو بھی تفصیلاً بیان کیا ہے۔اس لحاظ سے تاریخ اسلام کا طالب علم اور عام قاری ان تمام کارناموں کی اہمیت وافادیت سے فیض یاب ہوا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے یہ تاریخ پانچ سالوں میں مکمل کی۔ بقول پریم چند: ''......چار سو روپیہ ماہوار تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر ہوئے ......اور پانچ برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔''[۷۲]

شرر نے اپنے اسلاف کے زریں کارنامے گنوا کر مسلمانوں کے مردہ دلوں میں ایک نئی روح پھونکی، مولانا نے اپنے زورِ قلم اور قوت ایمانی سے تاریخ اسلام کو ایک نیا رنگ بخشا۔مولانا کی تاریخی کتب نے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔عبدالعلیم صدیقی نے بجا لکھا ہے کہ:

> اگر مولانا عبدالحلیم شرر اپنے زمانے میں تاریخی موضوعات اور تاریخی شخصیتوں پر قلم نہ اٹھاتے اور ان عظیم اور نامور شخصیتوں کے کارناموں کو زمانے کی گرد کی تہوں کے نیچے سے نہ نکالتے جو گرد ان کے چہروں پر غیر مسلم مصنفین اور خاص طور پر سر واٹر سکاٹ کی بہتان طرازیوں اور غلط بیانیوں سے پڑ چکی تھی تو شاید آج ادب تاریخ اور ثقافت کے طالب علم اپنی ان شخصیتوں سے اس طرح متعارف نہ ہوتے۔مولانا شرر کا ایک عظیم احسان ہے جس کو تاریخ ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔[۷۳]

تاریخ اسلام کی جلدیں شرر کے وسعت مطالعہ اور تاریخ سے لگاؤ کا ثبوت دیتی ہیں۔مولف نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے، غیر جانبداری کا رویہ اپنایا ہے۔اس میں فصاحت و بلاغت کے عنصر پائے جاتے ہیں۔عبدالحلیم شرر نے تاریخ اسلام کو قلم بند کرنے کے لیے خاصی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ایک تو شرر مورخانہ ذہن کے مالک تھے اور دوسرے ان کے اندر اپنے مذہب سے عشق کا جذبہ تھا اور تیسرے ان کا خاص مقصد تھا۔اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔اس میں شرر نے ایک مورخ کے فرائض صحیح طور پر ادا کیے ہیں اور تاریخ نویسی کے اصول کا اس تاریخی کتاب میں بدرجہ اتم لحاظ رکھا گیا ہے۔

شرر نے مسلمانوں اور انگریز مورخین کی کتب کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔شرر نے ان انگریز مورخین کی کتب تاریخ کا بھی مطالعہ کیا جو جانبدار رویے کے حامی رہے اور ان کا بھی جو تعصب کا شکار رہے

اور اپنے موضوع کی مناسبت اور ضرورت کے مطابق جہاں ضروری خیال کیا ہے مواد اخذ کیا ہے۔ مولانا نے ان متعصب مورخین کی اچھی خاصی خبر لی ہے۔ شرر سے پہلے سرسید اور ان کے رفقاء نے مختلف عنوانات کے تحت یہی کام کیا تھا۔ جن میں چراغ علی اور شبلی نعمانی قابل ذکر ہیں۔ مولوی چراغ علی نے بہت سی ایسی کتب رقم کی جن میں انگریزوں کے متعصبانہ حملوں کا خاطر خواہ جواب دیا۔

عبدالحلیم شرر نے بھی یہ کام مذہبی فریضے کے طور پر ادا کیا ہے۔ بعض جگہوں پر شرر نے وہ لہجہ اختیار کیا جو فن تاریخ نویسی کے منافی تھا۔ لیکن جس عہد میں انہوں نے یہ تاریخ لکھی اگر ان حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو شرر کو ہم قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ بہرحال یہ تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے اس کی اپنی افادیت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

گزشتہ لکھنو

شرر نے دلگداز میں تاریخی مضامین جب پیش کیے تو ناظرین نے اسے بہت پسند کیا۔ اس پسندیدگی کی بنا پر انہوں نے ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے عنوان سے لکھنو کی تاریخ کا سلسلہ جاری کیا، یہ سلسلہ کافی عرصہ تک دلگداز میں چلتا رہا۔ اس بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

> دلگداز میں اب تاریخی مضامین بڑھتے جاتے ہیں جن کی بنسبت اہل الرائے حضرات اپنی عنایت سے اکثر اچھی ہی رائے قائم کیا کرتے ہیں۔ ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے عنوان سے جو تمدن لکھنو کی تاریخ کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے اسے دو سال ہو گئے۔ دو چار حضرات اس سلسلے سے اکتا بھی گئے ہیں۔ مگر عام رائے اس کی موید ہے۔ یہاں تک کہ بعض تعلیم یافتہ و شاستہ صاحب امرائے بزرگوں نے اس قدر حوصلہ افزائی فرمائی کہ لکھتے ہیں ''یہ مضامین ایک جداگانہ کتاب کی حیثیت سے مرتب کر کے شائع کیے جائیں'' اور بہت سے احباب اس کی بہت سی جلدیں خریدنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ انشا اللہ ایسا ہی ہو گا۔ مگر پہلے یہ سلسلہ پورا تو ہو لے۔ اس کو شروع ہوئے دو سال ہو گئے اور ہمارا خیال ہے کہ تکمیل کے لیے دو ہی سال اور چاہیے اس لیے کہ سوسائٹی کی اہم ترقیوں کا تذکرہ ابھی بہت زیادہ باقی ہے اور جب یہ سلسلہ پورا ہو جائے گا تو امید ہے کہ معلومات کا ایک بہت اچھا اور یاد رکھنے کے قابل ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔[۷۴]

اس اقتباس سے ثابت ہوا کہ شرر کی یہ کتاب بعد میں کتابی صورت میں آئی۔اس سے قبل اس کے متعلق مضامین قسط وار دلگداز میں شائع ہوتے تھے۔جن کو دلگداز کے ناظرین قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اس میں شامل مضامین چار سال تک شائع ہوتے رہے۔جو شرر کی وسعت نظر اور وسیع مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔''گزشتہ لکھنؤ'' کے اسلوب بیان کے متعلق نسیم عباس لکھتے ہیں:

> سادہ اور پر تاثیر اسلوب کی مثال ''گزشتہ لکھنؤ'' ہے اس میں رنگینی بیان کی پر تکلف زبان کی روایت موجود نہیں ہے۔اگر چہ لکھنویت کا خاص رنگ یہی پر تکلف زبان تھی۔اس تکلف میں فارسی کا غلبہ نہیں ہے۔سپاٹ نہیں ہے۔روکھی پھیکی نثر نہیں ہے۔کوئی تصنع نہیں ہے۔ محض سادہ نہیں ہے بلکہ داخلی تاثیر رکھتی ہے۔شرر کے ذہن میں ایک خاص موضوع لکھنؤ کی تاریخ، تہذیب، معاشرت ہے اور اس کا نقش اجاگر کرنے کے لیے وہ براہ راست طریقہ اختیار کرتے ہیں۔[۷۵]

اس کتاب کا پورا اور مکمل نام ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنؤ'' ہے۔کتاب کے نام سے مصنف کے اندازِ فکر اور موضوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس کتاب میں شرر نے یہ نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے عہد میں تہذیب نے جس قدر ترقی کی تھی مغل حکمرانوں کی تباہی کے بعد یہ تہذیب لکھنؤ کی سرزمین میں منتقل ہوگئی اور ایک نئی معاشرت کے نقش نے جنم لیا۔اس کی بنیاد اگر چہ پہلے سے آنے والی تہذیبی روایتوں پر تھی لیکن اس نے یہاں آکر جلد ہی ایک نیا پیکر اختیار کیا اور یہ پیکر دہلی تہذیب وثقافت اور مغلیہ عہد معاشرت سے زیادہ نفیس، شاندار، لطیف، روشن اور ترقی یافتہ تھا۔اس نے جہاں تک ترقی کی کہ اس کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا جانے لگا۔شرر نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ ان خصوصیات کو بیان بھی کیا ہے۔جن کی وجہ سے اس تہذیب کی پہچان ہو سکتی تھی۔مولانا نے اس کتاب میں ان تمام باتوں کو نمایاں کیا ہے جو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور ان چیزوں کی بھی وضاحت کی جو یہاں آکر ذرے سے آفتاب بنی تھیں۔

ابتداء سے ہی تاریخ نویسی کا مقصد یہ رہا ہے کہ جو لوگ فرماں روائی کا خواب دیکھتے ہیں وہ دوسروں کے حالات وواقعات کا مطالعہ کر کے درس عبرت حاصل کریں، اور ان اقدامات سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں جو اگلوں کی ناکامی کا سبب بنے ہیں اور ان اقدامات کو زیر عمل لائیں جو اگلوں کی کامیابی کا زینہ بنے ہیں،شروع میں جو تاریخ لکھی جاتی تھی اس میں انسان کی خون آشامی، جذبہ انتقام اور درندگی کی بھیانک تصویر کشی کی جاتی تھی۔ انسانیت کی تاریخ رقم کرنے کا رواج بہت کم تھا۔بقول غضنفر امروہوی:

ضرورت تھی کہ انسانیت کی تاریخ بھی لکھی جائے۔عصر حاضر کے مورخین نے اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور ثقافتی تاریخ وجود میں آئی۔ اردو کا دامن اس قسم کی تاریخ سے خالی ہے۔شرر نے تاریخ کے اس مطالبہ کو نظر انداز نہیں کیا اور ''گذشتہ لکھنؤ'' یا ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ لکھ کر تاریخ کے اس شعبہ کی بنیاد ڈالی۔
مگر یہ یاد رہے کہ شرر ناول نگار اول ہیں اور مورخ بعد کو......۔[۷۶]

اس اقتباس سے واضح ہوا کہ شرر نے ثقافتی تاریخ کے شعبے کی بنیاد ڈالی، لیکن شرر مورخ بعد میں ہیں اور تاریخی ناول نگار اول ہیں۔چونکہ شرر زورنویس بھی تھے اسی وجہ سے انھوں نے تاریخی واقعات کی چھان بین کی طرف توجہ کم دی ہے۔اگر چہ وہ عربی کے فاضل تھے لیکن تاریخ نویسی میں انہوں نے انگریزی تاریخوں پر زیادہ اعتماد کیا ہے جس کی وجہ غضنفر امروہوی نے یہ بیان کی ہے:

اسی وجہ سے ایسے تسامحات بھی نظر آتے ہیں جن کو مسلمان معاف نہیں کر سکتے۔مثلاً سن محمدی کا کہیں رواج نہیں۔مسلمانوں میں عام طور پر سن ہجری سے تاریخ شماری ہوتی ہے۔ عیسائی مصنفوں نے سن محمدی سے کام لیا۔جس کا آغاز سن عیسوی سے پانچ سو کہتر سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک سے کیا جاتا ہے۔مسلمانوں کے لیے یہ فن اجنبی ہے مگر شرر نے کتاب زیرنظر میں کئی جگہ بلا تکلف استعمال کیا ہے۔سرسید نے بھی محمدی کو رواج دینا چاہا تھا مگر جلد ہی اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اس کو ترک کر دیا۔[۷۷]

عنوانات قائم کرنے کی بجائے کتاب چون حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔جن کے صرف نمبر دئے گئے ہیں۔کتاب زیرنظر کے پہلے آٹھ نمبروں میں لکھنو اور فیض آباد کی تاریخ ہے۔بارہویں نمبر تک ادب اردو کا ارتقا دکھایا گیا ہے۔سولویں نمبر تک دوسرے علوم وفنون کا ذکر ہے۔ستر ہویں نمبر سے فنون حرب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اکیسویں نمبر سے موسیقی اور اس سے ملتے جلتے فنون مثلا رقص وسرور کا ذکر کیا گیا ہے۔اٹھائیویں نمبر سے خوراک کے موضوع کی وضاحت شروع ہوتی ہے۔تیسویں نمبر سے لباس کی بحث شروع ہوتی ہے۔اڑتسیویں نمبر سے اخلاق وعادات ملاقات کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تینتالیس ویں نمبر سے تقریبات شادی وغم کو بیان کیا گیا ہے۔متفرق آداب کا بیان کتاب کے پچاسویں نمبر سے آخر تک ہے۔عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کے عہد کی ثقافتی تاریخ مرتب کی ہے جو کہ ایک بہت بڑا کارنامہ اور ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔اب بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ اس انداز میں مسلمانوں کے عہد کی ثقافتی تاریخ مرتب کی جائے اور انگریزی کتب تاریخ کے بجائے عربی، فارسی اور ہندی کتب کو بطور ماخذ استعمال کیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ ایک نہایت ہی عمدہ اور اچھی تاریخ مرتب ہو

سکتی ہے۔ جو ہمارے ملک وقوم کے لیے ایک مفید اور کارآمد چیز ثابت ہو سکتی ہے۔ شرر کی یہ کتاب تمدنی تاریخ کا ایک بہترین شاہکار ہے۔ بقول شمیم انہونوی:

.....مولانا عبدالحلیم شرر نے بیسوں مضامین اور کتابیں لکھیں، لیکن اگر وہ کچھ نہ لکھتے اور صرف پیش نظر کتاب یعنی مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (گذشتہ لکھنو) ہی لکھ جاتے، تب بھی اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام چھوڑ جاتے۔ تاریخی مضامین اور تاریخی ناول لکھنا شرر کا محبوب مشغلہ تھا اور اس موضوع پر بلاشبہ انہوں نے کئی ناقابل فراموش یادگاریں چھوڑی ہیں لیکن ''گذشتہ لکھنو'' میں انہوں نے لکھنو کے تمدن کی تاریخ جس دلچسپ انداز میں لکھی ہے اس سے داستان گوئی، ناول نویسی اور تاریخ تینوں کے فرائض ادا ہو جاتے ہیں۔ کسی عہد یا کسی زمانے کے تمدن کی جیتی جاگتی تصویر اس سے بہتر اردو کیا بیتری زبانوں میں نہ ملے گی۔ یہ صرف ایک تمدن ہی کا نمونہ نہیں بلکہ تمدنی تاریخ نویسی کا بھی شاہکار ہے۔[۸۷]

لفظ تمدن اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے۔ اس میں بے شمار مفہوم پوشیدہ ہیں۔ اس میں ایک طرف تاریخی واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں اور لوگوں کے مذہبی وفلسفی عقائد نیز توہمات کی طرف بھی اور دوسری طرف لوگوں کی معاشرت ومعیشت، رہن سہن، کھانے پینے، میل جول، عادات ورسومات، ان کے پیشے، ان کی تجارت، صنعت وحرفت، تفریحی مشاغل، مختلف رسومات مثلاً پیدائش، شادی اور موت غرضیکہ زندگی کے تمام مراحل کا پایا جانا اہمیت رکھتا ہے۔ مشرقی ''تمدن کا آخری نمونہ'' کتاب کو اگر بغور پڑھیں تو اس کے تمدن کے مختلف نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ شرر کی یہ کتاب لکھنو کی تمدنی معلومات کا گنجینہ ہی نہیں بلکہ ایک ادب پارہ بھی ہے۔ اس تمدنی تاریخ کو تخلیق کرتے وقت ادیب شرر مورخ شرر کا برابر شریک رہا ہے۔ ادیب شرر نے جہاں اس کی تالیف میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا وہاں یہ سبب پنہاں تھا کہ لکھنو کی تمدنی تاریخ صرف لکھنو کی تاریخ ہی نہ تھی بلکہ شرر اور ان کے بزرگوں کی سوانح عمری بھی تھی۔ اسی تمدن میں انہوں نے آنکھ کھولی۔ اسی تمدن کی آغوش میں پلے بڑھے۔ اسی تمدن نے انھیں بنایا سنوارا اور وہی تمدن جب انگریزوں کے عہد حکومت میں پاش پاش ہو رہا تھا تو شرر خاموش کیوں رہتے۔ محبت ودلسوزی کا یہی تقاضا تھا کہ مورخ شرر اور ادیب شرر اس کو اسی طرح قلم بند کرتے کہ بیتے ہوئے لمحوں اور گذرے ہوئے زمانہ کی یاد تازہ ہو جائے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے ہم لکھنو کے تمدن کی تاریخ کہہ سکتے ہیں اور ادیب کا انسائیکلوپیڈیا بھی۔ ڈاکٹر مبارک علی کا خیال ہے:

ان کی کتاب ''مشرقی تمدن کی آخری بہار'' ہم عصر تاریخ ہے۔ یہ لکھنو کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ ہے۔ جس کے عینی شاہد وہ خود تھے۔ اس میں وہ اس نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ آخر

> وقت میں بھی لکھنو کے تمدن نے بڑے بڑے صاحب فن وہنر پیدا کیے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمدن زوال پذیر نہیں بلکہ جاندار تھا۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ تمدن تھا۔ جو صرف حکمران طبقوں نے مشاغل کے طور پر پیدا کیا اور اسی لیے یہ معاشرہ میں کوئی ذہنی اور فکری تبدیلی نہیں لا سکا۔[۷۹]

عبدالحلیم شرر کی دو تاریخی کتب ''تاریخ سندھ'' اور گزشتہ لکھنو'' عہد وسطی کی تاریخ کے ضمن میں شمار ہوتی ہیں۔ شرر کے عہد میں سرسید احمد خان نے تاریخ کے تین اہم بنیادی مآخذوں کو ایڈٹ کیا اور شائع کیا جن میں ''آئین اکبری''، ''تزکِ جہانگیری'' اور ''طبقات ناصری'' ہیں۔ شرر کے دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداریاں ہندوستان سے باہر امت اسلامیہ اور خلیفہ کے ساتھ تھیں۔ سرسید سمجھتے تھے کہ جب تک یہ وفاداریاں ختم نہیں ہوں گی۔ انگریزی حکومت سے وفاداری کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کی تشکیل کی طرف توجہ دی تا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی تاریخ سے واقف ہوکر اس پر فخر کریں۔ شرر کے دور میں سرسید کے علاوہ مولوی ذکاءاللہ نے ''تاریخ ہند'' کے نام سے عہد وسطی کے مسلمان حکمران خاندانوں کی سیاسی تاریخ لکھی۔ انہوں نے تاریخ نویسی کے قدیم طریقہ کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں تجزیہ اور تنقید کی کمی ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ میں مسلمان حکومت کے عہد کی قانونی، اخلاقی، ادبی اور آرٹ کی ترقی کو بیان کیا ہے۔

د۔ ہم عصر مورخوں میں ان کا مقام ومرتبہ

مولانا عبدالحلیم شرر کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کے مزاج کو سمجھتے تھے۔اگر چہ بطور تاریخ دان ان کی حیثیت کو بعض نقاد تسلیم نہیں کرتے ۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ بطور مورخ ان کا خاص مقام ومرتبہ ہے۔ جن تاریخی حقائق کو زیر بحث لائے ہیں اور جس طرح اس فن کو پروان چڑھایا یہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔

جب ہم شرر کی تاریخی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کو سب سے زیادہ لگاؤ تاریخ اسلام سے تھا۔آپ کا انداز بیان اپنے پیش رو سے قدرے مختلف تھا۔آپ نے تاریخ اسلام سے متعلق اپنی کتابوں میں جزئیات وتفصیلات کو بڑی خوبصورتی سے مرتب کیا۔آپ کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعات کی فراوانی سے کبھی نہیں اکتاتے اور جو لکھتے ہیں اپنے زور بیان سے ثابت کرتے ہیں۔آپ کے انداز تحریر میں بے ساختہ پن اور روانی پائی جاتی ہے۔واقعات کے بیان میں تسلسل پایا جاتا ہے۔یہ چیزیں آپ کو اچھے تاریخ نویسوں کی صف میں شامل کرتی ہیں۔قاری تاریخی واقعات کو پڑھتے ہوئے قطعاً بوریت محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہے۔اگر چہ آپ انشا پرداز تھے۔لیکن آپ نے اپنے قلم کو مرصع ومرقع نگاری سے ہر ممکن حد تک دور رکھا۔

مسلمانان ہند پر انیسویں وبیسویں صدی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے بڑے بڑے عالم دین، تاریخ دان، سیاست دان، صحافی، حریت پسند، ادیب وشاعر اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد پیدا کیے۔ تاریخ انسانی میں ان صدیوں میں جن بڑی بڑی شخصیات نے نام پیدا کیا۔ان میں سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، جمال الدین افغانی، قائداعظم، علامہ اقبال، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی ذکاءاللہ، سید امیر علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر نامی گرامی اشخاص قابل ذکر ہیں۔ان افراد نے نئی تاریخ رقم کی اور ہر ایک نے اپنے اپنے شعبے میں نام کمایا۔عبدالحلیم شرر بھی انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے بطور تاریخ دان نام پیدا کیا اور انسانی تاریخ پر جس انداز سے روشنی ڈالی وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل فخر بھی ہے۔تاریخ کے قارئین کے لیے باعث فخر اور تاریخ کے طلباء کے لیے کارآمد بھی۔لکھاری کا یہ کمال فن ہے کہ وہ قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلے اور قاری کی تحریر میں دلچسپی بڑھتی جائے۔اس سے لکھنے والے کے وسیع مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے لکھنو کی فضا اور اس کے ماحول وحادثات و واقعات کا خود مشاہدہ کیا تھا اور انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کی حالت زار کا خود جائزہ لیا تھا۔پہلی جنگ عظیم کی ہنگامہ آرائیاں اور چیرہ دستیاں خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کی تھیں اس لیے اس نقطہ نظر سے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آنے والے وقتوں میں تاریخ کے طالب علم کے لیے گراں سرمایہ ہوگا اور ان کے مقام کا تعین بطور مورخ

کرنے میں آسانی ہوگی۔

عبدالحلیم شرر کو ہم مورخوں کی صف میں اس لیے شامل کرتے ہیں کہ ایک تو انہوں نے تاریخی ناول لکھ کر تاریخ کی گراں قدر خدمت کی ہے اور دوسری طرف تاریخ پر مبنی کئی ایک نامی گرامی کتب لکھی ہیں۔ان کا مقصد مسلمانانِ ہند کو بیدار کرنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گذشتہ ادوار کی تاریخ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی سعی کی۔ان کی ہر ایک کتاب اور ہر تاریخی ناول اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔اس لیے کہ اس نے تاریخ کی خدمت کا حق ادا کیا ہے۔

آپ کی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ گو ہمارے تاریخ دانوں میں سرسید احمد خان، مولوی چراغ علی، شبلی نعمانی، سید امیر علی، مولوی ذکاءاللہ اور دیگر مورخوں کا اپنا مقام و مرتبہ ہے۔لیکن ان لوگوں کے درمیان مولانا نے جو کچھ لکھا اس کا بھی اپنا ایک الگ رنگ اور مقام و مرتبہ ہے۔شرر کی تحریروں کے مطالعے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ نے ہر جگہ وہ اندازِ بیان اور پیرایہ اختیار کیا ہے جو اس کے لیے موزوں بلکہ مناسب تھا۔ان کی تاریخی کتب کے جائزے کے بعد یہ حقیقت ہم پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ایک نظریاتی اور پختہ فکر رکھنے والے انسان تھے اور آپ کے کچھ مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے آپ نے تاریخی کتب لکھی تھی۔شرر اور شبلی نعمانی ایک ہی دور کے تاریخ نویس ہیں۔ان دونوں کے متعلق نسیم عباس اپنے نظریات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> تاریخ نویسی کے لیے زبان کا واضح، مبالغے سے گریز، علمی، استدلالی، انداز بیان اور واقفیت سے قریب ہونا ضروری ہے۔شرر اور شبلی کا موضوع تاریخ ہے۔لیکن دونوں کا اندازِ بیان غیر تاریخی ہے۔شبلی جذباتی ہو جاتے ہیں البتہ شرر کے ہاں اس پر کنٹرول کی کیفیت نمایاں ہے۔شبلی کی تصنیف سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک باب ''ظہور قدس'' میں دو اسٹائل ملتے ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کو بیان کرتے ہوئے شبلی کا قلم عقیدت سے سرشار ہو جاتا ہے اور ولادت کے بیان کے بعد وہ پھر عمولی اور سطحی اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔شبلی اور شرر کے ہاں جوش بیان کی یکسانیت کا رنگ مملو ہے جو کہ قاری کو براہِ راست پرجوش بنا دیتا ہے۔شبلی کا تخیل، مبالغہ اور استعاراتی بیان تاریخ کو مجروح کرتا ہے۔اس کے علی الرغم شرر کا اسلوب اس لیے معنویت کا حامل ہے کہ وہ تاریخ کو ناول کے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔[۸۰]

شرر کے انداز بیان پر اعتراضات بھی ہوئے کہ ان کا اندازِ بیان غیر تاریخی ہوتا ہے۔لیکن اگر دیکھا جائے تو شرر نے ایک طرف ناول نگاری کے ضمن میں تاریخ لکھی اور دوسری طرف خالص تاریخی کتب دونوں کے اسلوب میں ایک فرق نظر آتا ہے۔ ناول لکھتے ہوئے جو انداز وہ اپناتے ہیں۔تاریخی کتب میں اگرچہ اس کے برعکس انداز ہوتا ہے۔لیکن فرق بہت ہی کم نظر آتا ہے۔اس لیے کہ شرر بنیادی طور پر ایک ناول نگار تھے۔تاریخی کتب میں شرر اپنے جذبات پر کنٹرول کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی تاریخی کتب میں پر جوش انداز پایا جاتا ہے۔جس سے قاری متاثر ہوتا ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ جیسا انداز تاریخ لکھتے وقت اختیار کرنا چاہیے وہ انداز شرر نہ اپنا سکے۔

مورخ کی حیثیت ایک رہنما کی سی ہوتی ہے۔قاری اس سے صرف قصے سننے کا خواہش مند نہیں ہوتا بلکہ اس کی رہنمائی میں اپنی منزل کی طرف قدم بڑھانے کا متمنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخ کو صرف واقعہ نگار نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ تاریخ رقم کرتے وقت یہ بھی سمجھائے کہ ماضی میں کوئی خاص کام کرنے سے بھلا یا برا کیا نتیجہ نکلا اور آئندہ اس قسم کے معاملات اگر پیش آئیں تو کیا قدم اٹھانا چاہیے؟ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب مورخ قصہ گوئی اور داستان طرازی کی بجائے حق گوئی اور صداقت کو اپنا مسلک بنائے اور جو کچھ دیکھے جس طرح دیکھے کم وکاست بیان کر دے۔عبدالحلیم شرر کی تاریخ نویسی میں قصہ گوئی اور داستان طرازی کے عنصر پائے جاتے ہیں۔لیکن غیر جانبدار ہو کر تاریخ لکھتے ہیں اور خامیوں اور اچھائیوں کو ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔شرر کی تاریخی کتب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نویس نے کئی روپ اور بھیس بدلے ہیں۔ان کی سوچ کا تعلق صرف اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے نہیں بلکہ وہ ہر اس زمانے اور ماحول کے فرد بنے ہیں جس کی وہ تاریخ لکھ رہے تھے۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ نویسی میں بھی ان کا ایک ممتاز اور خاص مقام و مرتبہ ہے۔یہ مقام انھیں ایسے ہی بیٹھے بٹھائے نہیں ملا بلکہ اس کے لیے انہوں نے بہت محنت کی ہے۔عبدالحلیم شرر نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ تاریخ کے اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کریں۔اس لیے کہ بقول اختر وقار عظیم:

> تاریخ بڑی نازک شے ہے۔وہ اپنے مزاج کے خلاف نہ تو کوئی بات برداشت کرتی ہے اور نہ کسی خلاف مزاج شے کو قریب بھٹکنے دیتی ہے۔اس کی اسی نزاکت مزاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر مورخوں نے تاریخ نویسی کے لیے چند اصول اور قاعدے ترتیب دے رکھے ہیں۔ یہ اصول اور قاعدے مورخ کے لیے پاؤں کی زنجیر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس زنجیر سے مورخ کی آزادی، تاریخ کو قطعاً گوارا نہیں۔[۸۱]

شرر کے سامنے چونکہ ایک خاص مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے تاریخ نویسی کا

آغاز کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی خاص طبقہ کو متاثر نہیں کیا بلکہ پوری قوم کو تاریخ سے روشناس کر کے اپنا ہمنوا اور ہم خیال بنایا ہے۔ انہوں نے تاریخ نویسی میں ایسا راستہ منتخب کیا کہ قاری آزمائش میں پڑے بغیر واقعات سے لطف اندوز ہو اور تاثر قبول کرے جو تاریخ نگار اسے دینا چاہتا ہے۔ شرر نے تاریخ نویسی کو اپنے خیالات و تصورات اپنے اصلاحی مقصد کے حصول کا وسیلہ بنایا اور شروع سے ہی انہوں نے تاریخ کے اصول وضوابط کو بھی مدنظر رکھا۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ بات موثر اور دل نشین نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اصول وضوابط کا لحاظ نہ کیا جائے۔ انہوں نے تاریخی کتب میں ان اصول وضوابط کی پیروی ضروری سمجھی جنہیں تاریخ نویس کے فن کے مبادیات کہا جا سکتا ہے۔

ہر چیز میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں شرر کی تاریخی کتب میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں لیکن خامیاں بتلانے یا گنوانے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ جب ہم جانتے ہیں کہ شرر نے خاص مقصد کے حصول کے لیے تاریخ نویسی کی اور فن کو بھی بڑی حد تک برتنے کی ہر ممکن کوشش کی اور شرر کی تاریخ نویسی نے ہمیں تاریخ اسلام کی طرف راغب کیا، اپنے اسلاف کے کارناموں کی طرف توجہ دلائی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی رقمطراز ہیں:

> جس وقت شرر نے لکھنا شروع کیا اس وقت اردو صحافت اپنا ابتدائی جوش دکھا رہی تھی۔ قوم ایک نئی صورت سے جاگ کر اپنا اخلاق درست کرنے میں لگی تھی اور تمام طاقت کا مقصد یہی تھا کہ عام لوگوں کو ترقی کی راہ پر لگایا جائے۔ اس سلسلہ میں قوم کو اپنی عظمت یاد دلانا بھی ضروری تھا۔ حالی اپنے مسدس میں یہی کر چکے تھے اور تمام مسلمانوں کی توجہ تاریخ اسلامی کی طرف جا رہی تھی۔ ہر اس شخص کا جو تحریر وتصنیف میں دلچسپی رکھتا تھا یہ تمام تر فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی مسائل یا قومی تاریخ کو پڑھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اپنی تصانیف میں روشنی ڈالے۔ پھر اس زمانے میں عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کافی زور کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض تھا کہ ان کے خلاف بھی قلمی جہاد کرے اور عیسائیت کے عیوب نکالے۔ عبدالحلیم شرر ان تمام صحافتی رجحانات کے موافق تصنیف کے میدان میں آئے تھے۔[۸۲]

شرر کی کتب تاریخ کا ایک سبب تو ان کی تاریخ سے وابستگی اور دلبستگی تھی اور دوسرا سبب ان کے عہد کا عصری پس منظر یہی وجہ ہے کہ نسیم عباس لکھتے ہیں:

ان کی کتب کی تخلیق کا دوسرا سبب ان کے عہد کا عصری منظر نامہ بھی ہے جو کہ اسلامی احیاء کی کوششوں اور روشن خیالی کے بین بین اپنی پہچان کے عمل سے گزر رہا تھا۔ سرسید، محسن الملک، امیر علی اور شبلی نعمانی اس میدان میں اصلاحی مقاصد کی ہمسری کا بین ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ اسی عصری شعور کے سیاق اور اصلاح قوم کے مقصد کے پیش نظر شرر نے بھی اسلامی حیاء کی کوشش میں اپنی الگ راہ عمل کا تعین کیا۔[۸۳]

شرر کی کتب تاریخ مسلمانوں کے لیے احیا کا باعث بنی۔ شرر نے اسلامی احیا کی کوششیں کرتے ہوئے اپنے لیے یہ راستہ منتخب کیا تھا اور تاریخی کتب لکھ کر ایک طرف تو اپنی تاریخ سے وابستگی اور ذوق وشوق کا ثبوت فراہم کیا اور دوسری طرف اپنی قوم کے اندر تاریخ سے محبت اور اسلاف کے کارناموں سے واقفیت پیدا کی۔ شرر نے جتنا بھی تاریخی مواد پیش کیا ہے چاہیے وہ افسانوی نثر میں ہے یا غیر افسانوی نثر میں، سب میں جو حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں وہ اسلامی حکومتوں کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ پروفیسر جعفر رضا شرر کی تاریخ نویسی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شرر کی کتب تاریخ کا دائرہ وسیع ہے۔ جو ایشیا، یورپ اور افریقہ کے کئی ممالک پر محیط ہے۔ لیکن ان کی قسمت ...... ایک ہے ...... مسلمانوں کی حکومتیں جنھیں شرر اسلامی حکومت کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں انھیں اسلامی حکومتوں کے گرد وپیش واقعات و حالات کو چکر کاٹتے رہنا ہے۔ ان کے قیام کے لیے جدوجہد غیر اسلامی قوتوں سے نبرد آزمائی اور فتح مندی، عدل و انصاف، حق و صداقت، ناول نگار کی طرح مورخ کی حیثیت سے بھی شرر کے تمام نظریات مقررہ قبل از وقت اور حتمی ہوتے ہیں ......۔[۸۴]

عبدالحلیم شرر نے جتنی بھی کتب تاریخ لکھی ہیں ان میں ''تاریخ سندھ''، ''تاریخ عصر قدیم''، ''تاریخ مسیح و مسیحیت''، ''تاریخ قبل اسلام''، ''تاریخ ارض مقدس'' اور ''صقلیہ میں اسلامی تاریخ'' وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر ہم شرر کے تاریخی ناولوں اور ان کی تاریخی کتب کا گہرا مطالعہ کریں تو شرر کے تاریخی نتائج، تاریخی ناولوں ہی کی طرح کے ہیں۔ اندازِ بیان بھی کم وبیش ویسا ہی ہے۔ اس لیے کہ ایک ہی شخصیت نے ناول بھی لکھے ہیں اور تاریخیں بھی۔ شرر کی تاریخی کتب میں بھی مسلمانوں کی برتری، مخالفوں کی تذلیل اور جانب دارانہ رویہ کہیں کہیں نظر آتا ہے تحقیق وتدقیق کی بجائے سطحی جذباتیت ان کی کتب تاریخ میں نظر آتی ہے۔ جس سے ایک سنجیدہ تاریخ کے طالب علم کو مایوسی ہوتی ہے۔

شرر کی کتب تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک وہ کتب تاریخ جن میں قبل اسلام کے مما لک اوران کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا گیا ہے اور دوسری وہ جن میں مسلمانوں کے عہد حکومت وعہد خلافت کا ذکر ہے۔ ہر دو طرح کی کتب میں حالات و واقعات کے بیان کرنے میں تاریخ نویس نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔کہیں کہیں اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے اعتبار سے واقعات قلم بند کر کے اختلافی مسائل ومباحث کے لیے راہیں کھول دی۔جس کی ایک مثال ''سکینہ بنت حسین'' پر لکھے جانے والے حالات وواقعات ہیں۔جن کی شدید الفاظ میں مذمت ہوئی اور شرر سے اختلافات بڑھے اور مختلف رسائل میں ان کی اس تصنیف کے بارے میں لکھا گیا۔ شرر کی تاریخی کتب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھیں ترکی،مصر اور عرب سے ایک خاص لگاؤ تھا۔بقول پروفیسر جعفر رضا:

> شرر کی کتب تواریخ کے مطالعہ سے ترکی،مصر اور عرب سے ان کے غیر معمولی تعلق خاطر کا اندازہ ہوتا ہے۔بعد کے زمانے میں ہندوستان کے لیے ترکی کو تحریک خلافت کی بنا پر اہمیت حاصل ہوئی۔۱۷۷۴ء سے ۱۸۸۶ء کے دور میں ترکی مشرق ومغرب کی آویزش، نظریاتی تصادم اور روحانیت و مادیت کی کش مکش کا مرکز بنا رہا۔شرر کے لیے ترکی مسلمانوں کا مسئلہ عمومی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کش مکش کی بنا پر مصر میں نظریاتی، مذہبی اور فکری آویزشوں سے اصلاح وتجدد کی تحریک نمایاں ہوئی۔جس کے سرخیل محمد عبدہ تھے۔ انہوں نے مشرق ومغرب کے متضاد تصورات کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ان پر جمال الدین افغانی کے اثرات تھے۔[۸۵]

شرر کی تاریخی کتب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا شمار بھی مورخین اسلام میں کیا جا سکتا ہے۔تاریخی کتب لکھتے وقت انھوں نے جس نقطۂ نظر کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے مورخین اسلام کے فرائض کو پہنچانتے ہوئے لکھا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ مورخین اسلام کے بارے میں یہ نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں: ''مورخین اسلام کا پہلا فرض یہی تھا کہ اسلام کی پرانی اور قدیم ادوار کی تاریخ کو اردو میں منتقل کریں۔''[۸۶]

عبدالحلیم شرر نے بھی اسلام کی پرانی اور قدیم ادوار کی تاریخ رقم کر کے ایک بہت بڑی قومی خدمت سرانجام دی ہے۔ان کی تاریخوں کے مطالعے سے جہاں ہم اسلام سے قبل کی دنیا کی حالت سے آگاہ ہوتے ہیں وہاں ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد اس دنیا کے نظام میں کیا تبدیلیاں آئیں اور مسلمان حکمرانوں میں کیا خوبیاں اور خامیاں تھیں جن کی وجہ سے انھیں عروج وزوال نصیب ہوا۔شرر اور شبلی دونوں نے ایک ہی عہد

میں تاریخ اسلام پر روشنی ڈالی ہے۔ ان دونوں کے سامنے تاریخ نویسی کے چند اصول تھے جن پر روشنی ڈالتے ہوئے اختر وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

> شبلی کی طرح تاریخ نویسی کے چند اصول ان کے بھی پیش نظر رہتے ہیں جو ان کے رہنما اور کسی حد تک ہر وقت کے ساتھی ہیں۔ شرر شبلی کی طرح تاریخ نویسی میں غیر جانبداری اور سچائی کے قائل ہیں۔ شبلی نے ایک جگہ سچائی اور غیر جابنداری کو مذہب پر فوقیت دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر سچ بات کہنے کے لیے مذہب کی قربانی بھی دینی پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔[۸۷]

اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار شرر نے بھی ایک جگہ کیا ہے لکھتے ہیں:

> ہم چاہتے ہیں کہ اسلام میں مختلف عقائد کے ظہور اور مذاہب کے پولٹیکل تغیرات و انقلابات پر ایک مفصل اور کسی قدر ضخیم کتاب لکھی جائے جس میں تعصب کو دخل نہ ہو اور آزادی وانصاف پسندی سے ہر فرقے کے حالات درج ہوں۔[۸۸]

اگر شرر کی تاریخی کتب کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر کے یہ خیالات صرف کہنے کی حد تک تھے۔ عملی طور پر وہ غیر جانبدار مورخ نہیں ہیں۔ انھیں ہم غیر متعصب ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ تعصب کی وجہ سے وہ نہ تو کسی پر چھینٹیں اچھالتے ہیں اور نہ آوازے کستے ہیں۔ بلکہ جہاں بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ غیر مذاہب کی تعریف وتوصیف بھی کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں انھیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ شرر کی بے تعصبی کا یہ حال تھا کہ وہ متعصب شخص کو مورخ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ ''تاریخ ارض مقدس'' میں کسی کے تعصب کا گلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''وہ تعصبات کے رنگ میں اس قدر رنگنے ہوئے ہیں کہ تاریخی اعتبار کے درجے سے بالکل ساقط ہیں۔''[۸۹]

ان کی بے تعصبی کا ثبوت اس امر میں پنہاں ہے کہ انہوں نے ''تاریخ ارض مقدس'' کے نام سے حضرت مسیح اور دین مسیح کی ایک پوری تاریخ قلم بند کی ہے۔ جس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ کہیں اس مذہب کی برائی بیان کی ہے اور نہ اس کے ماننے والوں کی۔ البتہ جہاں انھیں عیسائیوں کے اندر کوئی خامی نظر آئی۔ اس کا اظہار انہوں نے برملا کیا ہے۔ لیکن ایسا انہوں نے تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ سچائی کی وجہ سے کیا ہے۔ اس لیے کہ مورخ کو سچائی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر وہ اس چیز کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر وہ اچھا مورخ نہیں ہے۔ مورخ کا پہلا فریضہ ہی حقائق کو سامنے لانا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود ہم مانتے ہیں۔ وہ تاریخ نویسی کے اصولوں کا ذکر تو جابجا کرتے ہیں لیکن خود ان پر بہت کم عمل کرتے ہیں۔ ان کا مزاج ایک ناول نگار کا مزاج ہے۔ مورخ کا مزاج نہیں رکھتے۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ لکھتے وقت ان کی نگاہیں مسلسل ان واقعات کو تلاش کرتی اور قلم ان کو لکھتا ہے۔ جن میں قصہ بننے کی تھوڑی سی بھی گنجائش ہو۔ وہ اپنی اسی خواہش کو مدنظر رکھ کر تاریخ نویسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہ۔ عبدالحلیم شرربطور رپورتاژ نگار

عبدالحلیم شرر کو اردو کے اولین رپورتاژ نگاروں میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ رپورتاژ نگاری ایک نئی صنف ادب ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں گزشتہ واقعات کی سرگذشت اور واقعات کا روزنامچہ کسی طرح کی رنگ آمیزی کے بغیر لکھا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر میں واقعات کی ترتیب ردوقبول اور مدعا وجذبہ کو ثانوی اہمیت دی جاتی ہے۔ ادیب وصحافی کسی واقعہ یا سرگزشت کو اپنے ذہنی وتخیلی تصورات کے بغیر پیش نہیں کرسکتا۔ رپورتاژ کے لیے انگلش میں Reportage کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اس صنف ادب کے بارے میں لکھا ہے:

> رپورتاژ فرانسی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی رپورٹ ہی کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں رپورتاژ چشم دید حالات و واقعات کی وہ رپورٹ ہے جو اگرچہ معروضی واقعات ہی پر مشتمل ہوتی ہے لیکن مصنف کا تخیل اور واقعات کے بارے میں اس کا موضوعی رویہ ان واقعات میں ایک بصیرت افروز معنویت اور ایک فکر انگیز فضا پیدا کر دیتا ہے۔[۹۰]

۱۹۳۰ء کے قریب جب یورپ میں سیاست ومعیشت کے ہنگامی مسائل نے ابدی مسائل سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی اور دوسری طرف افراط زر اور سولینی کے ہلاکت خیز ارادے اور ۱۹۳۶ء میں سپین کی خانہ جنگی جیسے مسائل نے جنم لیا تو ادیبوں نے وقتی اور ہنگامی مسائل پر لکھنا شروع کر دیا لیکن وقتی مسائل پر کوئی بڑا ناول یا نظم لکھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے کہ ادیب روزمرہ کے سیاسی، معاشی مسائل کی طرف متوجہ ہوا۔ ضرورت اس وقت اسی کی تھی۔ اس زمانے میں ادیبوں کا فرض بنتا تھا کہ وہ ہنگامی مسائل پر لکھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی تحریروں کو ادبی بھی بنانا تھا تا کہ وہ محض صحافی ہی نہ بن جائیں۔ ان دو رجحانات نے اس صنف ادب کو جنم دیا۔ اس طرح رپورتاژ کی صنف وجود میں آئی۔ اس دور میں رپوتاژ لکھنے والوں نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ہم ادب تخلیق نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے مشاہدات سنا رہے ہیں۔ رپورتاژ اس صورت میں ادب کی کوئی باقاعدہ صنف نہیں ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی رپورتاژ انفرادی طور پر ادب کا درجہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔ رپورتاژ زمانہ حال میں مچرد ہے۔ اسے ماضی و مستقبل سے کوئی سروکار نہیں۔ رپورتاژ تخیل، ایجاد واختراع کے لیے نہیں بلکہ واقعات کی ترتیب وتدوین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

رپورتاژ اور اخباری رپورٹ میں ان معنوں میں فرق ہے کہ اخبار نویس کا اصل کام واقعات بیان کرنا ہے۔ ان کی تشریح وتوضیح کرنا نہیں ہوتا۔ جبکہ رپورتاژ نگار واقعات کی معنویت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس لیے کہ

رپورتا ژ اس وقت لکھی جاتی ہے جب واقعات میں سماجی وانسانی معنویت نظر آ ئے ۔ رپورتا ژ میں اصل چیز واقعات کا بیان نہیں ہے بلکہ وہ معنی ہیں جو رپورتا ژ نگار نے واقعات میں چھپے ہوئے محسوس کیے ہیں اور واقعات اس معنویت کو قاری تک منتقل کرتے ہیں ۔ رپورتا ژ نہ تو پوری طرح صحافت ہے اور نہ ہی خالص ترین ادب ۔ رپورتا ژ نگار کو ذاتی مشاہدے کے علاوہ ایک واضح سماجی نقطہ نظر، مورخ کا قلم، مصور کی نظر اور ادیب کا دماغ چاہیے تب وہ صحیح رپورتا ژ لکھ سکتا ہے ۔

اردو ادب میں رپورتا ژ نگاری کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی کے اواخر میں نظر آ ئے ۔ اس عہد میں ملکی زندگی میں اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا تھا۔ ان تحریکوں سے متعلق روداد، اخبار ورسائل میں چھپتی تھی ۔ شرر کا دور بھی کم وبیش وہی تحریکوں کا دور ہے ۔ پروفیسر جعفر رضا شرر کو اردو کے اولین رپورتا ژ نگاروں میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شرر کو اردو کے اولین رپورتا ژ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ جنھوں نے اتوار ۹ مئی ۱۸۸۷ء کو انجمن دار السلام سے متعلق جلسے کا رپورتا ژ لکھا۔ یہ جلسہ لکھنو کے قیصر باغ کی تاریخی عمارت میں منعقد ہوا۔ شرر کا بیان ہے کہ اس جلسہ میں تقریباً بیس ہزار افراد شریک ہوئے ۔ اس یادگار جلسہ سے متعلق چھ صفحات پر مشتمل رپورتا ژ لکھ کر شرر نے دلگداز کے اپریل ۱۸۸۸ء کے شمارہ میں شائع کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:
>
> ان پر شوق آنکھوں نے کیا دیکھا۔ ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی نہیں دیکھا۔ نہیں دیکھ رہی ہیں ۔ ہم ایک وجد کے عالم میں جھوم رہے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان خطیبوں کی معجز بیانیاں دلوں میں آگ لگائے دیتی ہیں ۔ ایک طرف جناب منشی امتیاز احمد صاحب جوش و خروش کے ساتھ تقریر کر رہے ہیں ۔ غصہ میں ابھرنے والے خون کی طرح اسلامی جوش رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور بے ساختہ وجد میں آ کر مسلمانوں کے پر جوش ہجوم سے سبحان اللہ، جزاک اللہ، اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں ۔ دوسری طرف مرزا محمد ہادی صاحب (مرزا رسوا) اپنی عالمانہ تقریر سے ایک بہت بڑی جماعت کو اسلام کا جاں فروش خادم بنائے دیتے ہیں ۔[۹۱]

اس اقتباس کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ عبدالحلیم شرر جہاں اعلیٰ پائے کے مورخ تھے وہاں وہ ایک بلند پایہ رپورتا ژ نگار بھی تھے ۔ اگرچہ ان کے چھ صفحات پر مشتمل ایک ہی رپورتا ژ کا ابھی تک پتہ چلتا ہے ہوسکتا ہے کہ مزید

تحقیق سے کوئی اور رپورتاژ بھی منظر عام پر آئے۔

شرر بطور نقاد

شرر کی شخصیت میں قدامت اور جدت پسندی کا عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا تھا۔ یہ تو مسلم ہے کہ اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز انہوں نے کیا اور مضمون نگاری کو انشائیہ کا رنگ دیا رسائل کے صفحوں میں مختلف النوع موضوعات پر لگاتار اور مسلسل انشائیے اور مضامین لکھے۔ انہوں نے جدید اردو نثر کو مقصدیت کے ساتھ ساتھ ہنگامی نوعیت کے مسائل کے لیے بلا تکلف استعمال کیا۔ جدید صحافتی نقطہ نظر کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا منفرد کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مضامین میں مختلف تنقیدی تصورات پیش کیے۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو میں ''نظم معری'' کی ابتداء کی اور اس کے حق میں مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ نظری بنیاد پر اس کے فروغ کی بھی وکالت کی اور خود اس پر عمل پیرا بھی ہوئے۔ ''نظم معری'' کو ڈرامے میں استعمال کر کے اس کی مثال قائم کی۔ شرر نے اردو میں ناول نگاری کے حق میں پر دلائل مضامین لکھے اور ان کے ناول اس کی مثال ہیں۔ علاوہ ازیں شرر نے شاعری، ادب، تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، تہذیب و تمدن جیسے موضوعات پر بھی لکھا۔ علم و ادب اور صحافت میں تحقیق و تنقید کا معیار بھی قائم کیا۔ ڈاکٹر محمد خان اشرف اس بات کے قائل ہیں: ''شرر کی تنقیدی آراء ان کے مضامین میں اکثر و بیشتر بکھری ہوئی ہیں اور ان میں سے بہت سی عصری مباحث، وقتی تقاضوں اور ہنگامی موضوعات کے لحاظ سے لکھی گئی تھیں''۔[۹۲]

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو میں رومانوی تحریک کا آغاز و عروج ہوا۔ سرسید احمد خان اور دوسرے حریت پسندوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیمی میدان میں جس مہم کا آغاز کیا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام پذیر ہوتے ہی اس کے اثرات برصغیر پاک و ہند کے معاشرے میں نمودار ہونے شروع ہوئے۔ ہندوستانی معاشرے اور یہاں کے دانشوروں کے نقطہ نظر اور فکر و شعور میں بنیادی تبدیلیاں انگریزی تعلیم اور مغربی تحریکوں کے اثرات، انگریزی ادب اور دیگر علوم کے مطالعہ، جدید خیالات و رجحانات، یورپی ذرائع ابلاغ و اطلاعات اور نظریات کے سبب آئیں اور پھر برصغیر پاک و ہند کے ساکن و منجمد معاشرے میں تغیر و انقلاب آیا اور کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان میں سے اہم ترین ''رومانوی تحریک'' تھی۔ جس نے نہ صرف تخلیقی ادب کو متاثر کیا بلکہ اردو تنقید کو بھی بہت زیادہ متاثر کیا۔ جدید رومانوی تنقید کے ابتدائی آثار کے بارے میں ڈاکٹر محمد خان اشرف رقمطراز ہیں:

> جدید رومانوی تنقید کے اولین آثار محمد حسین آزاد کی تنقیدی تحریروں، شرر کے مضامین اور صحافیانہ تحریروں اور شبلی کی تاریخی و تنقیدی نگارشات میں نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اس

> نئے انداز نظر، فکری و ذہنی آزادی کی اس نئی روایت اور اس نئی ''حسیت'' یا طرزِ احساس کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔[۹۳]

رومانویت صرف ادبی طرز تحریر ہی نہیں زندگی اور ادب کو اپنی پوری وسعت میں دیکھنے، محسوس کرنے، برتنے اور جانچنے کا طریق بھی ثابت ہوئی۔ اردو ادب میں یہ ایک انقلابی تحریک تھی۔ اس کے اثر سے اردو ادب نے کلاسیکی پابندیوں اور بندھنوں کو توڑا اور آزادی کا سفر شروع کیا۔ اردو ادب میں اس قدر گہری اور دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں جو ابھی تک جاری و ساری ہیں۔ رومانوی تحریک نے اردو ادب کو لڑکپن سے نکالا اور تخلیقی بلوغت میں داخل کیا۔ ادب اس قابل ہوا کہ زندگی کی پیچیدگیوں، آب و تاب، مسائل و تضادات کو موضوع اظہار بنا سکے۔ بقول ڈاکٹر نجیب جمال:

> اسے ہم مشرق اور مغرب کے طرزِ فکر و اظہار کے امتزاج (Co-Relation Ship) کا زمانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں زمانوں کا سنگم ہے۔ یعنی انیسویں صدی بیسوی صدی سے گلے مل رہی ہے۔[۹۴]

عبدالحلیم شرر کی ایک حیثیت نقاد کی بھی تھی۔ شرر کے تنقیدی تصورات اور رویوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر پر حالی اور سر سید احمد خان کی عقلیت، عملیت، افادیت اور اصلاحی و اخلاقی رویوں کا اثر تھا اور کسی حد تک وہ اس کے قائل بھی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف جمالیاتی خط، شعری تاثرات اور شعر کے وجدانی و تخیلاتی سحر کے بھی قائل تھے۔ ان کے نزدیک شاعری بنیادی طور پر انسانی جذبات و احساسات کا اظہار ہے۔ ان کے نزدیک شاعری سحر آفرینی و جادو بیانی بھی ہے۔ جو قارئین و ناظرین کے دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ شرر کے نزدیک شاعری قدرتی جذبات کے اظہار کا دوسرا نام ہے جو انسان کے دل میں فطری طور پر جنم لیتے ہیں۔ شرر کے نظریے کے مطابق شاعری انسانی دل کا معاملہ ہے جو ایک دل میں جنم لیتا ہے اور دوسرے دل کو موثر انداز سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> شاعری وہ قدرتی جذبات ہیں جو انسان کے دل کو پوری قوت اور ایک بے مثال کشش سے اپنی طرف کھینچ لیا کرتے ہیں۔ یہ جذبات قدرتی اور فطری طور پر خود بخود دل میں پیدا ہوتے ہیں اور زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کوئی تعلیم اور کوئی کوشش ان کو پیدا نہیں کر سکتی ...... اگر دنیا میں کوئی سچا جادو ہے اور اگر دل کو قابو میں لانے والی کوئی تسخیر تو وہ یہی شعر و سخن ہے۔[۹۵]

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شرر یہ نہیں کہتے کہ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ یا ان جذبات کی ترجمانی ہے یا تقلید ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ جذبات خود شاعری ہیں اور یہ کہ جذبات فطری طور پر دل میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور زبان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شرر شاعری میں آمد کے قائل ہیں اور یوں شرر رومانی نقادوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں جو شاعری کو شدت جذبات کا اظہار قرار دیتے ہیں۔ بلکہ وہ رومانی نقادوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے جذبات ہی کو شاعری کہتے ہیں اور شرر شعر کو سچا جادو اور تسخیر بتاتے ہوئے جمالیاتی نقطہ نظر کے قائل نظر آتے ہیں۔ شرر ذوق جمال اور رومانی و جمالیاتی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ موسیقی کو شاعری کا جزو لاینفیک قرار دیتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ کسی نظم میں شاعری اور موسیقی دونوں مل کر اپنا اثر پیدا کرتی ہیں۔ شرر شاعری کو دل پر اثر کرنے والے خیالات اور موسیقی کو سروں اور نغموں کی عمدہ ترتیب سے تعبیر کرتے ہیں اور یوں شرر اپنے تمام تر اصلاحی و اخلاقی رویوں کے باوجود شاعری کو ''معاشرتی سدھار'' کا ذریعہ نہیں گردانتے۔ بلکہ وہ شاعری کے جمالیاتی حظ، جذباتی تاثیر اور سحر انگیزی کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس طرح یہ رومانی نقادوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں رومانی تنقید کے محض اشارے ہی ملتے ہیں۔ اس لیے کہ رومانی نقادوں کی تنقید کے بنیادی مفروضات کا تعلق زندگی کے خاص رویوں سے ہے جب کہ شرر اپنی تنقید کی بنیاد کسی فلسفہ زیست اور نظریہ زندگی پر نہیں رکھتے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> موسیقی بھی ایک چلتا ہوا جادو ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو موسیقی کی قوت بڑھانے میں بھی زیادہ کام شعر وسخن سے لیا جاتا ہے۔ موسیقی صرف اس وجہ سے جادو کا اثر نہیں رکھتی کہ عمدہ سروں اور پیارے گلے سے کام لیا جاتا ہے .... موسیقی کا زیادہ اور ابتدائی حصہ چونکہ نغموں اور سروں کی ترتیب پر منحصر تھا لہٰذا اس کی بنا نظم ہی کی سطح پر قائم کی گئی۔
>
> نظم کو اگر اس حد پر دیکھیے تو اس میں دو باتیں ہیں ایک تو موزونیت جیسے سروں اور نغموں کی عمدہ ترتیب ہی کہنا چاہیے۔ دوسرے شعر یعنی وہ خیالات جو دل پر پورا اثر ڈالیں اور ایسے امور وواقعات کو یاد دلائیں جو دلی جذبات کے قوی محرک ہیں۔''[۹۴]

شرر کے ان خیالات سے ثابت ہوا کہ شرر شاعری کا جوہر جذبات و موسیقی کو قرار دیتے ہیں۔ اس تصور شاعری میں علامت پسند شعراء کے خیالات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے جو موسیقی کو شعر کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ شرر ایک طرف تو موسیقی کو شعر کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ فن عروض اور موسیقی اپنے اپنے طور پر علیحدہ فن بن گئے ہیں اور ان کے تصور کے مطابق یہ بات خرابی کی ہوئی اور عروض و موسیقی

کی جدائی کی اصل وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ:

> خرابی یہ ہوئی کہ عروض اور موسیقی دو جداگانہ فن ہوئے ورنہ اگر دونوں کو باہم ملا کر ترتیب دی جاتی تو دونوں کے جذبات اور دونوں کی کشش ہزار درجہ زیادہ ہو جاتی۔ اس تفریق کی وجہ غالباً بلکہ یقیناً اسلامی دور ہے۔[۹۷]

شرر کے نزدیک شاعری کا جوہر جذبہ وموسیقی ہے۔ لیکن اثر کے لحاظ سے جذبہ کو فوقیت دیتے ہیں۔ شعری جذبات نغمہ وراگ کے تناسب سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں۔ شرر جذبات اور جذباتی تاثر کو شعر کی اصل قرار دیتے ہیں اور رومانی نقادوں کی طرح جذباتی اظہار کو اخلاقی مسائل کے ساتھ ملاحظہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری میں وہ طاقت ہے جو مختلف جذبات کے اظہار سے انسان کی اندرونی شکلوں کا محرک ثابت ہوتی ہے۔ شرر نے کئی مثالیں بھی دی ہیں۔ ظالم بادشاہ کا رحم کی طرف مائل ہونا۔

> امرا کے دل میں فیاضی کا جوش پیدا ہوا اور انھوں نے غربا کو خدا جانے کیا کچھ دے ڈالا۔ سپاہی کے دل میں ایک حرارت پیدا ہوئی اور اس بیتابی کے جوش سے کہ بخوشی خاطر جان دینے پر تل گیا۔ عبادت گزار کا عبادت میں دل لگ گیا اور مقبولیت کا اسے کچھ ایسا یقین ہو گیا کہ انتہا سے زیادہ رقتِ قلب سے رو کے دعائے مغفرت مانگنے لگا ...... ظالم بادشاہ کا نیچر اگرچہ ظلم ہی کی طرف مائل تھا۔ لیکن اسے یک بہ یک کسی مبتلائے ظلم پر ترس آ گیا اور وہی مظلوم اس کے دربار سے خلعت واکرام سے سرفراز ہو کے اپنے گھر گیا۔[۹۸]

اس سے ثابت ہوا کہ شرر کے نزدیک شاعری بھی بعض مقاصد کو پورا کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ مائل ترغیب کرنے کا جوہر اس میں موجود ہے ان کا خیال ہے کہ طبیعتوں کے بدلنے، ارادوں میں فرق پیدا کرنے کے لیے شاعری سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یوں شاعری کے بارے میں شرر کے تصورات، جمالیات کی حدود سے نکل کر اخلاقیات کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ رومانی نقاد، ورڈز ورتھ بھی اخلاقی نقطہ نظر کے حامل نظر آتے ہیں اور ان کے یہاں اخلاقی نقطہ نظر اس کے فلسفہ زندگی سے پیدا ہوتا ہے۔ تمام رومان پسندوں کا یہ خیال ہے کہ انسان اپنے جذبات کا اظہار کر کے معاشرتی بندھنوں کو توڑتا ہے اور فطرت کی جانب لوٹتا ہے اور جذبہ و جبلت کا اظہار انسان کی بنیادی نیکی اور خوبی کا اظہار ہے۔ مگر شرر کے یہاں جذبات کے اظہار سے نیکیوں اور خوبیوں کی تحریک کا تصور، راغب کرنے اور طبیعتوں کے بدلنے کا تصور سرسید تحریک کے اخلاقی اور اصلاحی رویوں کا نتیجہ ہے۔ شرر پر سرسید تحریک کے اثرات اگرچہ بہت گہرے تھے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ تصور انگریزی حوالوں سے لیا ہو،

یہ تصور جہاں سے بھی آیا اس کے پیچھے کوئی نظام حیات یا فلسفہ زندگی کا سراغ نہیں پایا جاتا۔

شاعری اور تخلیقی ادب کے بارے میں شرر کا رویہ یہ ہے کہ وہ ادب کے اخلاقی و اصلاحی اور جمالیاتی نقطہ نظر کے درمیان متذبذب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دونوں نقطہ نظر اسی طرح ہم آہنگ ہیں جس طرح فارسی و اردو کے قدیم شعرا کے ہاں۔ سرسید کی تحریک سے قبل اردو ادب اور فارسی ادب کی روایت میں کوئی واضح فرق نہ تھا۔ جمالیاتی، اخلاقی اور اصلاحی نقطہ ہائے نظر میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن سرسید تحریک کے بعد اردو ادب میں جمالیاتی اور اخلاقی تصورات میں ہر جگہ ایک آویزش پائی جاتی ہے۔ عقلیت، افادیت اور اصلاحی تصورات کے باعث ایسا نظر آتا ہے۔ اگر شرر کے تنقیدی مضامین کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے جمالیاتی ذوق، حساس طبیعت اور فنی تربیت کے باعث شعر کے سحر اور تاثیر کے قائل نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اپنے عہد کے رائج عقلی و افادی نقطہ نظر سے بھی دامن نہیں بچا سکتے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شاعری میں تاثیر و سحر اور لذت کے قائل ہونے کے باوجود ''نیک و بد شاعری'' کافر و دیندار، شاعری میں حد فاضل قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم شاعری کو عقلی اور افادی و اصلاحی نقطہ نظر سے دیکھیں تو ایسا ہی ہوگا۔ اگر مغربی تنقید کا جائزہ لیا جائے تو شاعری پر بالخصوص اصلاحی و اخلاقی نقطہ نظر سے جتنے بھی اعتراضات ہوتے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ شاعری انسانوں کو بدی کی طرف راغب کرتی ہے۔ غفلت کی بنا پر یا مذہبی نقطہ نظر سے جب ہم اردو یا فارسی شاعری اور بالخصوص غزل کا محاسبہ کرتے ہیں تو خلاف شرع نظر آئے گی۔ شرر کے وہ مضامین جو شاعری سے متعلق ہیں ان کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ جذباتی اعتبار سے شاعری کے طرفدار ہیں اور عقلی اعتبار سے اس کے خلاف۔

اگر شرر کے عہد پر نظر ڈالی جائے تو یہ دور جہاں مذہب میں متصوفانہ فکر و نظر کا حامی تھا وہاں شاعری میں تخیلاتی و وجدانی زاویہ نظر کے در کا بھی دور تھا۔ چاہے سرسید احمد خان کی تحریک ہو یا کرنل ہالرائیڈ کی اگر جائزہ لیا جائے تو استعاروں کے خلاف جذبہ کارفرما ہے۔ ہمارے ادب کی یہ دونوں تحریکیں قدیم طرزِ احساس و فکر کے خلاف نئے طرز و فکر کے حق میں ایک سرد جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

> کافر شاعری، بے دین، بے ایمان شاعری، مردود و ملعوں شاعری، تیرا کچھ دین و ایمان بھی ہے۔ اس کا بھی کچھ خیال ہے کہ ایک دن مرنا اور خدا کو جواب دینا ہے۔ تیری کیا شامت اعمال ہے کہ علانیہ کفر کا اقرار کرتی ہے، جینو پہننے اور ماتھے پر قشقہ لگانے کا شوق دلاتی ہے۔ بت پرستی و شرک عاشق زار ہے اور اپنے پیرووں کی زبان سے اقرار کرتی ہے کہ:

مرادلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار

برکعبہ بردم و بازش برہمن آودم ۹۹

اس اقتباس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شرر فارسی واردو کے شعری رویوں سے خوش نہیں ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ اپنی تمام تر دریدہ دینی، بے دینی اور بے لگامی کے باوجود شاعری کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس کے پاس سندِ عفو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں:

خوش نصیب شاعری، سندِ عفور کھنے والی شاعری! ہم تیری تعریف کرتے ہیں اور تیرے کمالات کا اقرار کرنے پر ہم مجبور ہیں اور ملتجی ہیں کہ کوئی ایسا ہی نسخہ ہمیں بھی بتا دے۔ اگر چہ تیری طرح ہم سے بدزبانی وزبان درازی نہ ہو سکے گی۔ مگر اتنا تو ہو کہ اگر کبھی اتفاق سے کسی کی نسبت کوئی کلمہ زبان سے نکل جائے تو وہ برا نہ مانے اور اس کے جواب میں کچھ نہ کہے۔۱۰۰

ان دونوں اقتباسات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ شرر متذبذب دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ شاعری کی لذت و تاثیر کی بات چھیڑتے ہیں اور دوسری طرف اس کی ظاہر اور نام نہاد بداخلاقیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ یوں شرر کے طرزِ احساس میں ایک بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بے ربطی محض شرر ہی میں نہیں ہے اس عہد کے بیشتر ادباء وشعرا اور مصلحین کے ہاں یہ پائی جاتی تھی۔ عملی، افادی اور عقلی نقطہ نظر سے شاعری بے شک بے راہ روی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن جذباتی و جمالیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں لذت وتاثیر بھی ہے۔ شرر ان دونوں باتوں کے بیک وقت قائل ہونے کی بھرپور کوشش کرتے اور دیکھا جائے تو جذباتی طور پر وہ اس تضاد کو کسی حد تک حل بھی کر لیتے ہیں مگر عقلی طور پر یہ تضاد موجود ہے۔ لیکن وہ اپنے عہد کے رویوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر شرر کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو تین چیزیں نظر آتی ہیں اسلامی دور حسن اور عشق اس طرح شرر ماضی کے کارناموں کو بیان کر کے اخلاقی درس بھی دیتے ہیں اور حسن وعشق کی کہانی سے لذت بھی پہنچا دیتے ہیں۔ شرر کے عہد کی عقلیت پسندی اور عملی اخلاقیات انہیں شاعری کے علامتی اور استعاراتی مفہوم تک نہیں پہنچنے دیتی۔ اپنے ایک مضمون آزادی میں لکھتے ہیں:

ہمارے لٹریچر اور ہماری شاعری نے مدت ہائے دراز سے ہم میں رندانہ مشربی کی آزادی کا شوق پیدا کر رکھا تھا کیونکہ شاعری کی تعلیم سے ہم میکشی پر آمادہ، بت پرستی کے رسیا، بزرگان دین کی اطاعت سے گریزاں، انبیاء اور مقتدیان امت کی خدمت میں گستاخ اور نفس کے بندے ہو

> رہے تھے لیکن ان جذبات کو اخلاقی و مذہبی تعلیم، بڑوں کی صحبت اور معاشرت دباتی جس کی وجہ سے ہمارے خیالات وجذبات چاہیے کیسے ہی ہوں لیکن ہماری اخلاقی حالت نہیں بگڑنے پائی تھی۔ اب آزادی کی ایک موثر آواز یورپ سے آئی جس نے رندانہ مشربی کی آزادی سے مل کر نوجوانوں کے جذبات کو ابھارا اور ہندوستان ایک ایسی خطرناک آزادی کا گھر بن گیا جس سے تباہی کے سوا اور کسی بات کی امید نہیں کی جا سکتی۔[۱۰۱]

شرر ایک طرف تو شاعری کی بے پناہ قوت کے قائل ہیں اور اس کی تاثیر و کشش اور لذت کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف اقتباس بالا کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری سے خوف زدہ بھی ہیں اور شرر کے خیال میں شاعری ''رندانہ مشربی کی آزادی کا شوق'' پیدا کرتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ خوف زندگی کی تخلیقی قوتوں کا خوف ہے۔ عقلیت پرست اور اخلاق کے معلم زندگی کو سخت گیر سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا مسلم حقیقت ہے کہ تخلیقی قوتیں جکڑ بندیوں کو توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایک طرف تو شرر شاعری کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور جب شرر پر ان کی ناول نگاری کی وجہ سے بداخلاقی کا فتویٰ لگتا ہے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

> چنانچہ جن حضرات کے سروں پر فضلیت کی پگڑی رکھی ہے (جس کی وجہ سے وہ قوم کے حق میں ایک غیر قابل برداشت بار بن گئے ہیں) انہوں نے فتوے دینے شروع کر دیے کہ ناول نہایت ہی مخرب اخلاق چیز ہے اور جس طرح ناسمجھ یونانیوں نے تعلیمات سقراط کی نسبت کہا تھا کہ وہ نوعمروں کے اخلاق بگاڑتی ہیں اس طرح ہمارے ہندوستان کے یہ ناعاقبت اندیش ریفارمر ناولوں کو مخرب اخلاق بتاتے ہیں اور محض اس لیے کہ ان میں حسن و عشق کے افسانے درج ہوتے ہیں اور ان کے مطالعے سے اگر براہِ راست نہیں تو ضمنی طور پر رویوں میں بداخلاقی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔
>
> لیکن اگر بداخلاقی کا یہی معیار ہے تو ان بزرگوں کے نزدیک سب سے پہلے بداخلاقی کی تعلیم قرآن مجید سے ہوئی ہو گی۔ جس میں حضرت یوسف اور عزیز مصر کی بی بی کا قصہ عجب دلکش انداز میں مذکور ہے۔ پھر اس کے بعد بڑی مخرب اخلاق حدیث وفقہ کی کتابوں کو ہونا چاہیے جن کی کتاب الطہارت اور دیگر بحثوں میں ان شرمناک باتوں کو جائز کر لیا گیا ہے جو اگر یہی معیار قرار دیا جائے جو ہمارے ان فضلیت مآبوں اور ناسمجھ ریفارمروں نے قرار دے رکھا ہے تو کسی حال میں جائز نہیں قرار دی جا سکتیں۔[۱۰۲]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ناولوں میں تعلیم اخلاق کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا تھا کہ واقعات عالم کو دکھا کے ان کے برے یا بھلے انجام کے متعلق علماء کے فتووں کی طرح حکم نہ لگایا جائے بلکہ ان کے ہر قسم کے انجام کی تصویریں دکھا دی جائیں اور ان کا مشاہدہ کیا جائے اور یہی تعلیم اخلاق کا وہ طریقہ ہے جو ناولوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔

> اصل یہ ہے کہ ناول سے زیادہ کوئی موثر پیرایہ کسی مسلے یا کسی تہذیب کے ذہن نشین کرنے اور لوگوں کو پابند بنا دینے کا ہو سکتا ہی نہیں۔ ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑوی دوا کے خوشگوار بنانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے ..... موجودہ ناول ہمیں اسلوب زندگی کے جتنے نمونے دکھا چکے ہیں۔ گذشتہ صدہا اور ہزار ہا سال کا لٹریچر نہیں دکھا سکا تھا اور آج کل کے معیارِ تعلیم کے اعتبار سے یہی سب سے بڑی تعلیم ہے۔[۱۰۳]

یہ مضمون شرر نے اس وقت لکھا جب ان پر بد اخلاقی کا الزام لگتا ہے اور وہ اپنے ناولوں کا دفاع کرتے ہیں۔ لیکن اس اقتباس کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے تنقیدی نظریات بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ شرر نے ناول کے لیے چند بنیادی اصولوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

☆ ناول کا اسلوب قرآن کے اسلوب کی طرح ہے۔

☆ واقعات عالم کی تصویر دکھا کر ان کا انجام دکھایا جائے۔

☆ ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑی دوا کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔

☆ ناولوں میں چونکہ اسلوب زندگی کے نمونے ہوتے ہیں اور یہی سب سے بڑی تعلیم ہے۔

شرر نے جن خیالات کا اظہار درج بالا اقتباس میں کیا ہے اس کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شرر اپنے عہد کے اخلاقی و اصلاحی اور افادی پہلو سے کنارکشی نہ کر سکے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شرر کے نزدیک ناول کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ درس دے، اگلوں کے قصوں سے موجودہ دور کا انسان عبرت حاصل کرے۔ شرر چونکہ تاریخی ناول نگار تھے لہٰذا تعلیم و تربیت اور درس کے سلسلے میں بھی ان کا اپنا ایک زاویہ نظر تھا۔ اپنے مضمون ''ہمارا جدید ناول'' میں شرر اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

نئے تعلیم یافتہ کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اور ابنائے وطن کی مروجہ معاشرت پر ناول لکھے جانے چاہیں جیسا کہ انگریزی میں ہو رہا ہے۔مگر ہمارے خیال میں یہ ان کی ناتجربہ کاری ہے۔ بے شک انگلستان اور ممالک یورپ میں بیشتر ناول ایسے ہی ہوتے ہیں اور وہاں وہی عنوان دلچسپ رہتا ہے۔مگر ہندوستان کی پبلک میں جہاں تک میرا تجربہ ہے یہ عنوان بالکل دلچسپ نہیں ہوسکتا۔انسانوں میں انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ اور کامیابی کے واقعات ڈھونڈتا ہے اور ناکامی اور ٹریجڈی بھی پسند آتی ہے تو اسی عہد کی جب کہ اپنے حالات میں کامیابی اور مقصد دری کی صورتیں نظر آیا کرتی تھیں جس طرح ہر انسان اپنی جوانی کے واقعات کو زیادہ پسند کرتا اور مزے لیلے کر کہتا اور سنتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی اپنے عروج وکمال اور اوج واقبال کے واقعات کوزیادہ پسندیدہ خیال کرتی ہیں۔ ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی قومی زندگی کے اس حصے کے واقعات میں مزہ آ سکتا ہے۔ جو کامیابی اور عروج کا زمانہ تھا اور نصیحت اور عبرت کے لیے بھی ہم انہیں ان کے اوج و عروج کے کارنامے دکھائیں تو شاید وہ زیادہ غصہ ہوں گے۔ ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہیے۔ بلکہ رومانس چاہیے جن میں انہیں کے کسی اگلے ہم وطن یا ہم مذہب کی اعلیٰ کارگزاریاں دکھائی گئی ہوں اور جن کے ذریعے سے انہیں اپنا اگلا علم وفضل اور اوج وعروج یاد دلایا گیا ہو۔[۱۰۴]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ شرر ادب کے بارے میں کیا تصور رکھتے تھے۔

☆ ادب مسرت بخش ہوتا ہے۔

☆ قارئین کو دلچسپی اور حظ کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

☆ درس عبرت اور تنبیہ کا کام بھی سرانجام دیتا ہے۔

☆ شرر کے نزدیک ادب کے مسرت بخش عنصر کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں۔

☆ وہ انگریزی کے ناقدوں کی طرح اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ادب اس وقت درس دیتا ہے جب وہ مسرت بخش ہو۔

☆ بلکہ یوں لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں ادب کی اخلاقی قدر کے ساتھ ساتھ جمالیاتی قدر کا تصور موجود ہے۔

ادب کی جمالیاتی قدر کو شرر زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اخلاقی قدر کی حیثیت ان کے نزدیک ثانوی ہے۔

شرر کے نظریات سرسید، حالی اور ڈپٹی نذیر احمد سے مختلف نظر آتے ہیں۔ شرر رومانوی طرزِ احساس کے حامل تھے۔ ''وہ سنہرے ماضی'' کا تصور رکھتے تھے۔ شرر اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے ماضی سے پیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے ان قصوں کو اہمیت دیتے ہیں جن میں رومانس ہو اور شرر اپنے تاریخی ناولوں کا جو جواز پیش کرتے ہیں ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ تحریک سرسید کی حقیقت پسندی اور معاشرتی اصلاح کے تصورات سے مختلف تصور رکھتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اسی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں اپنے عہد کی معاشرت کا نقشہ دکھایا اور شرر نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کے ''سنہرے ماضی'' کی تصویر دکھائی۔ چونکہ شرر حظ اور دلچسپی کے لیے اسے ضروری سمجھتے تھے۔

یہ تو تھا ناول کے متعلق شرر کے تنقیدی نظریات کا ایک مختصر سا خاکہ اب دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری کے دبستانوں کے متعلق ان کے تصورات کیا تھے؟ دہلی دبستان اور لکھنوی دبستان کے متعلق شرر کے نظریات کا اگر عمیق جائزہ لیا جائے تو وہ تصور نظر آتا ہے جو کہ آج کل ہمارے ادب کی تنقید میں رائج ہے۔ شرر دہلی کی شاعری کی ان خوبیوں کو لکھنوی شاعری کی خوبیوں پر ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دلی کی شاعری میں سادگی، جذباتی اپیل اور نیچر کا سماں دکھانے کی خوبی تھی اور اس خوبی کو شرر لکھنو کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کے جواز میں یہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں کہ انگریزی شاعری میں بھی یہی خصوصیات ہیں اگر دیکھا جائے تو شرر بھی شعر اور شاعری کی انہی خوبیوں کی بات کرتے ہیں جو الطاف حسین حالی نے کی ہے۔ اپنے خیالات و تصورات کو شرر ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ دہلی والے عموماً قدیم سے دلی جذبات کے ابھارنے اور نیچر کا سماں دکھانے کی طرف متوجہ رہے اور تھوڑے بہت اب بھی ہیں۔ بخلاف لکھنو والوں کے جو ہمیشہ سے بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی طرف جاتے ہیں۔ اس محل پر ہم دہلی کے رنگ کو لکھنو کے خیالی معرکہ آرائیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ہم پر کیا منحصر ہے۔ انگریزی جو ترقی کرتی جائے گی دلی والوں کا رنگ ہر دلعزیز ہوتا جائے گا۔ انگریزی تعلیم سے شکسپیئر اور گولڈ اسمتھ کے پردرد رنگ سے دلوں کو ایک خاص قسم کا لگاؤ ہو جاتا ہے اور انسان اسی قسم کا رنگ ہر جگہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔[۱۰۵]

اگر شرر کے عہد کو دیکھا جائے تو اس وقت یہ تصور عام تھا کہ انگریزی شاعری اپنی سادگی اور دلپذیری کے باعث مقبول ہورہی ہے یہی وجہ ہے کہ شرر نے بھی شکسپیئر اور گولڈ اسمتھ کا نام لیا ہے اور ان کی شاعری کی انہی خصوصیات کو سراہا ہے۔ شرر سے قبل حالی اور آزاد نے بھی انگریزی شاعری کی تعریف کی تھی۔

اسی مضمون میں شرر نے جہاں دہلی اور لکھنو کی شاعری کی بات کی ہے وہاں دلی اور لکھنو کی زبان پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اگر چہ زبان اردو کے بارے میں شرر کا خیال ہے کہ اردو دلی میں بچہ تھی لکھنو میں اس نے ترقی کی۔ علمی واخلاقی دنیا میں قدم رکھا۔ یہی پر اس میں بلند پروازی اور نازک خیالی پیدا ہوئی، یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شرر زبان کے اعتبار سے لکھنو کو دلی پر اور خیال کے اظہار سے دلی کو لکھنو پر فوقیت دیتے ہیں۔ پہلے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ شرر شاعری کی خوبی سادگی اظہار اور خلوص جذبات بتاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دلی کی شاعری کو لکھنو کی شاعری پر فوقیت دیتے ہیں اور یہ خیال بھی پیش کرتے ہیں۔

> شاعری کا قاعدہ ہے کہ فطری طور پر ہر زبان میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعری جس زبان میں پیدا ہوتی ہے اس زبان کے علمی اور مضبوط ہونے کا انتظار نہیں دیکھتی مگر ہر زبان کی ابتدائی حالت اور اس زبان کے بولنے والوں کا مذاق چونکہ سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے پہلے شعراء انہیں چیزوں اور انہیں خیالات سے کام لیتے ہیں جو بالکل سامنے کے پیش پا افتادہ ہیں اور قدرتی طور پر بے ارادہ ان کے کلام سے نیچر کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ مگر وہ زبان جو جو علوم وفنون اور قواعد وضوابط کی دنیا میں قدم رکھتی جاتی ہے شعراء اور زبان دانوں کا مذاق بھی بدلتا جاتا ہے... دنیا کی تمام زبانوں کی ابتدائی اور انتہائی حالت کا جب اندازہ کیجئے گا صاف معلوم ہو جائے گا کہ علوم نے بے تکلف نیچرل مذاق کو تدریجاً کس قدر بدل دیا ہے۔ ہاں انگریزی زبان کی شاعری اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ انگریزی جو جو ترقی کرتی گئی وہ وہ اس کا نیچرل مذاق اور نکھرتا گیا اور انگریزی شعراء روز بروز جلا دیتے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے شاعری کی اہمیت پر غور کر کے فیصلہ کر لیا تھا کہ شاعری صرف انسان کے دل پر اثر ڈالنے اور واقعے کی تصویر دکھانے کا نام ہے۔ اسی خیال نے نہ انہیں علم کے عالیشان چھ منزلوں پر چڑھنے دیا اور نہ فنون کی پیچیدہ بھول بھلیوں میں قدم رکھنے دیا۔ مگر اردو شعرا نے شاعری کا کوئی مسلم الثبوت اصول نہیں قرار دیا تھا لہٰذا اردو انگریزی کی طرح ترقی السنہ کے عام قاعدے سے نکل نہیں سکتی تھی۔[۱۰۶]

اس اقتباس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ شرر نے ''ترقی السنہ'' کا ایک اصول دریافت کیا، مگر فوراً ہی انگریزی کو اس اصول سے خارج بھی کر دیا اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شاعری انسان کے دل پر اثر ڈالنے اور واقعات کی تصویر کشی کا نام ہے۔ درج بالا اقتباس میں حاکموں کی زبان و شاعری کے بارے میں کم علمی کا تاثر جہاں ملتا ہے وہاں شدید احساس کمتری کا جذبہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ وقت کا تقاضا تھا اس اقتباس میں شرر نے اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری سادگی سے تکلف کی طرف، جذبہ و خلوص سے صنعت گری کی طرف سفر کرتی ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس سے دنیا کی کوئی زبان نہیں بچ سکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی شعر و ادب میں تکلف و تصنع در آئے تو ردِ عمل کے طور پر ایسی تحریکیں چلتی ہیں جو زبان کو سادگی و خلوص کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن شرر اس جانب کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ شرر نے کہی ہے کہ ''شاعری صرف انسان کے دل پر اثر ڈالنے اور واقعے کی تصویر دکھانے کا نام'' اس مضمون کے شروع میں شرر نے شاعری کو جذبہ و موسیقی کا حامل قرار دیا ہے اور اب وہ واقعے کی تصویر دکھانے کی بات کر رہے ہیں یوں شرر کے ہاں شاعری جذبہ، موسیقی اور تمثال کاری کا معاملہ ٹھہرتی ہے۔ اگرچہ انگریزی کے بارے میں شرر کے تصورات ناقص ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کو اپنے معاشرے کی خدمت کے ساتھ جمالیاتی تسکین کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔

ڈرامے کے متعلق شرر کے نظریات و تصورات کا اگر جائزہ لیا جائے تو انہیں ڈرامے پر بھی اعتراض ہے۔ اس لیے کہ یہ بت پرستوں کی ایجاد ہے اور اسلام کے منافی بھی۔ انہیں ڈرامے پر یہ بھی اعتراض ہے کہ یہ مخرب اخلاق ہے وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ کامیڈی نے جنسی ناہمواری اور ٹریجڈی نے خودکشی جیسے جرائم کو انگلستان اور یورپ میں رائج کیا۔ شرر شعر و ادب کے بارے میں جمالیاتی نقطۂ نظر بھی رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے تمام تر ذوق جمال کے باوجود ادب کو احکام شرعی کا پابند بھی سمجھتے ہیں اور ڈرامے کا فن ان کے نزدیک خلاف شرع ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اگرچہ انھوں نے خود بھی ڈرامے لکھے ہیں۔

اردو تنقید میں شرر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار ''نظم معریٰ'' کے بارے میں کیا۔ ۱۹۰۰ء میں شرر نے ''نظم معریٰ'' کے اسلوب میں ایک منظوم ڈرامہ لکھا اور ۱۹۱۰ء میں اس صنف شعر کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا۔ اس کے مطالعے سے شرر کی آزاد خیالی اور قوت ایجاد کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل وہ ڈرامے پر اعتراض کر چکے تھے لیکن بعد میں اس ڈرامے اور مضمون کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تصورات تبدیل کر لیے تھے۔ ایک طرف تو شرر نے ڈرامے کو قبول کیا اور دوسری طرف ''نظم

معریٰ'' کے اسلوب کو اردو میں رواج دینے کی کوشش کی۔ شرر کو اردو شاعری کی تاریخ میں نظم معریٰ کا موجد کہا جا سکتا ہے۔ آزاد اور حالی نے تو اردو شاعری میں نئے موضوعات کو شامل کرنے پر زور دیا تھا اور شرر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو نظم میں ایک نئے اسلوب کو اپنایا اور دوسروں کو اپنانے کی دعوت دی۔ نظم معریٰ کی ضرورت اور شعری ڈرامے میں اس کے اسلوب کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سنسکرت، یونانی، لاطینی، انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ایک قسم کی نظم ہوتی ہے جس میں قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ جسے انگریزی زبان میں ''بلینک ورس'' کہتے ہیں۔ یہ نظم ڈرامے کے لیے نہایت ہی مناسب بلکہ لا بدی ہوتی ہے۔ کیونکہ مکالمے سے صحیح لطف سوا اس کے اور کسی قسم کی نظم میں نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس نظم میں ایک ایک مصرعے کے الفاظ ٹوٹ کر کئی زبانوں پر جا سکتے ہیں۔ گفتگو سادی اور بے تکلف رہتی ہے اور پھر اس کے ساتھ موزونیت کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے۔
>
> اگر چہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ قافیوں کی قید سے آزاد ہونے کے باعث ایسی نظمیں لکھنا زیادہ آسان ہوگا مگر دراصل یہ سب قسم کی نظموں سے زیادہ دشوار ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اور نظموں میں الفاظ کا اپنی اصلی اور صحیح ترتیب سے ہٹنا کسی نہ کسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس میں چونکہ مکالمے اور بے تکلف گفتگو سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور شاعری کی حقیقی شان قائم رکھنا پڑتی ہے۔ اس میں ترتیب الفاظ میں ایک ادنیٰ تغیر بھی معیوب ہے یا یوں کہیے کہ تعقید لفظی سب نظموں میں تھوڑی بہت جائز ہے مگر اس میں مطلقاً جائز نہیں اور اس وجہ سے تصور کرنا کہ اس قسم کی نظمیں کہنا آسان ہے۔ بڑی فاش غلطی اور ناواقفیت کی دلیل ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ بلینک ورس (نظم معریٰ) ہر طرح کی نظموں سے زیادہ دشوار ہے۔[۱۰۷]

اس مضمون میں ''نظم معریٰ'' پر بحث کرتے ہوئے شرر اپنے زمانے کی عملی تنقید پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اردو تنقید لفظی محاسن پر بحث کر کے تنقید کا حق ادا کر دیتی ہے اور معنوی خوبیوں کی طرف توجہ نہیں دیتی اس بحث میں شرر شاعری کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ شاعری ایک خاص قسم کے تخیل کا نام ہے۔ جسے قافیہ کی ضرورت نہیں۔

اس پوری بحث سے یہ ثابت ہوا کہ شرر کے نزدیک شاعری میں جذبہ، موسیقی، تمثال کاری (جسے شرر

واقعے کی تصویر دکھانا کہتے ہیں) خیال افرینی اور تخیل کا ہونا ضروری ہے۔شرر ''خاص وضع کے طرز ادا'' کی شرط بھی ضروری سمجھتے ہیں اور شعر کی لفظی خوبیوں کی بجائے معنوی خوبیوں پر زور دیتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ شرر نے شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے۔مقصدیت، افادیت یا اخلاقی تقاضوں کی بات نہیں کی اور اگر کی بھی ہے تو بہت کم۔ وہ شاعری کو اصلاح معاشرہ کا تقاضا نہیں سمجھتے۔ یوں لگتا ہے کہ شرر ایک طرف تو سرسید تحریک کے حامی ہیں اور دوسری طرف اس تحریک کے ردعمل کے طور پر ابھرتے ہیں۔ یہی وہ حدود ہیں جن کے درمیان شرر کے تنقید تصورات دکھائی دیتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرر اردو کی رومانوی تحریک کے سرخیل تھے۔اس لیے کہ وہ شعر میں جذبہ، موسیقی، تمثال کاری، تخیل، دلکشی، سحر اور اثر پذیری کے قائل تھے اور دیکھا جائے تو شرر کے ناولوں میں بھی ان کے رومانوی رجحانات نظر آتے ہیں۔ رومانوی تنقید نے اردو ادب میں جدیدیت، آزادی فکر، بغاوت، کلاسیکی معیاروں اور روایات سے انحراف، مغربی نظریات کے فروغ کے ساتھ ساتھ مشرقی انداز میں تفاخر کا احساس، وسعت علم اور جرأت افکار کے رجحانات کو اردو ادب میں فروغ دیا۔ڈاکٹر محمد خان اشرف نے بجا لکھا ہے:

> شرر نے سرسید تحریک کے عروج کے دور میں جدید ادب، اردو ناول اور نظم معریٰ کے حق میں ایسے مضامین لکھے جو تنقیدی لحاظ سے اہم ہیں۔ جن میں انہوں نے نئے جدید اور رومانوی رجحانات کی پرزور وکالت کی ہے اور جنہوں نے ان کی دیگر تحریروں کے ساتھ مل کر اس فضا کو پیدا کرنے اور ان خیالات کو ترویج دینے میں اہم کردار ادا کیا جو بعد ازاں رومانوی تحریک کی بنیاد بنے۔تاریخ تنقید میں شرر کا یہ کردار ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے گو اس بات کے سبھی قائل ہیں کہ ان کے مزاج میں رومانویت پسندی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید بھی اس بات کے قائل ہیں کہ شرر کی ہیجان پسندی درحقیقت ان کے رومانی فراج کا بنیادی عنصر ہے اور ان کے ہاں رومانیت صرف اصناف نثر میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ انہوں نے شاعری کو بھی منقلب کرنے کی کوشش کی۔ اردو ادب وتنقید میں رومانوی انداز کو فروغ دینے کے باعث شرر رومانوی نقادوں کے پیشرو قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کئی ایسے مباحث کا آغاز کیا جو بعد میں رومانویت پسندوں کے ہاں پسندیدہ قرار پائے۔[۱۰۹]

ان کے تنقیدی نظریات ان مضامین میں جلوہ گر ہیں جو ناول اور تاریخی ناول سے متعلق لکھے گئے ہیں۔ شرر ادب کو کسی بھی مخصوص صنف یا چند اصناف تک محدود رکھنے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ وہ یہ نقطہ نظر پیش کرتے تھے کہ ادیب ہر اس طریقے سے اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ جسے وہ ضروری اور مناسب سمجھتا ہے اور معاشرے کو یہ حق نہیں

پہنچتا کہ وہ ادیب پر پابندیاں عائد کرے۔ان کے یہ نظریات اس وقت سامنے آتے ہیں جب وہ ناول کے حق میں دلائل دیتے ہیں اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ وہ وسعت زبان کے بھی قائل تھے۔ ناول کے لیے دلچسپی بنیادی عنصر ہے۔ یہ بھی شرر کا نظریہ ہے۔ان کے نزدیک ناول اعلیٰ فنی ساخت اور زندگی کی تعبیر و تغیر کا نام نہیں۔ یہ ایک ایسی دلچسپ صنف ہے جو پڑھنے والے کی توجہ کھینچ لیتی ہے اور شرر ناول کو اخلاق کے اصلی مصلح بھی کہتے ہیں۔ اگر چہ شرر ناول کو دلچسپ بنانا چاہتے ہیں لیکن دلچسپی بغیر حسن وعشق کے بہت کم آسکتی ہے۔ اس پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

شرر کی تحریروں نے عوام الناس میں ایک خاص نقطہ نظر کو رائج کیا۔ان کی رومانویت پسندی اور ادبی اصناف میں نئے تجربوں نے ان نظریات کو رائج کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر چہ وہ مقصدیت اور اسلام کی سربلندی کا راگ ہمیشہ الاپتے رہے۔ اردو ادب میں شرر نے تنقید کے وجود کو متعارف کروایا۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے بجا کہا ہے:

> اردو ادب میں تنقید کا وجود فرضی نہیں۔ نہ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے نہ معشوق کی موہوم کمر، بلکہ وہ آئینہ ہے جس میں ادب اپنے پورے خدوخال سے نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ وہ دریا ہے جس کی تہہ میں زندگی کی بڑھتی ہوئی قدریں، زمانے کا رچا ہوا مذاق، فکر وعمل کا صحیح توازن، سماج کا ابھرتا ہوا شعور، فطرت کے گہرے نقوش، عرض گردوپیش کی وہ تمام دنیا ہے جس سے ایک ادیب متاثر ہوتا ہے یا جس کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔[۱۰۹]

شرر کے عہد کے تین نقاد مشہور ہوئے۔ حالی، آزاد اور شبلی نعمانی۔ان کے تنقیدی نظریات نے بھی اردو ادب میں تنقید کو فروغ دیا۔''اردو میں حالی ہی کی تنقید ایسی ہے جس کے پیچھے ایک وسیع نظر، فکر، اعلیٰ خیال اور ہیرو کے سے کردار والی ہستی نظر آتی ہے ..... آزاد نے بھی تنقید کی مگر آزاد صاف صاحب طرز ہیں نقاد نہیں۔ اس کے کچھ ہی بعد شبلی نے بھی اہم تصانیف چھوڑیں مگر ان کی ہستی مورخ کی ہے نقاد کی نہیں ......''[۱۱۰] بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:''آزاد کا حقیقی کارنامہ انکی انشا پردازی ہے۔ مگر وہ ایک عملی نقاد بھی تھے''۔[۱۱۱] ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:''حالی جس طرح جدید سوانح نگاری اور جدید شاعری کے بانی تھے۔اس طرح انہوں نے جدید تنقید کی بنیاد بھی استوار کی۔''[۱۱۲]

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ شرر کے عہد کے کون سے نقاد تھے اور ان کی کیا حیثیت تھی؟ لیکن یہ سچ ہے کہ حالی ہی کی بدولت اردو ادب میں تنقید کا آغاز ہوا اور ہر ایک نے ان کے کارنامے کو سراہا ہے۔ وزیر آغا کا

خیال ہے: ''حالی کی نظری تنقید میں تین باتوں کو اہمیت ملی ہے۔ اول تخیل، دوم مطالعہ کائنات اور سوم تفحصِ الفاظ۔''۳

ڈاکٹر کلیم الدین احمد کے خیال میں ''اردو تنقید کی ابتداء حالی سے ہوئی ہے۔ وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی۔''۴ بقول حسن اختر ''حالی نے سب سے پہلے نظریاتی تنقید کی ابتدا کی تھی۔''۵ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ''حالی نے اپنی شاعری اور تنقید کا رخ زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تعین کیا۔''۶ ڈاکٹر عبادت بریلوی حالی کی تنقید کے متعلق رقمطراز ہیں ''انہوں نے تنقید اور خصوصاً عمرانی تنقید کے صحیح تصور سے اردو تنقید کو آشنا کیا۔ انہوں نے تنقید کی اہمیت پر زور دیا۔''۷ اگرچہ حالی سب سے بڑے نقاد تھے اور ان کے تنقیدی نظریات مسلم ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شرر نے حالی کی طرح اگرچہ کوئی باقاعدہ کتاب اس فن پر نہیں لکھی لیکن انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات جگہ جگہ بیان ضرور کیے ہیں۔ انہی نظریات کی بنا پر ان کو ادب میں یہ جگہ ملی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید اختر، مسلمان مورخین، مشمولہ ثقافت، جنوری ۱۹۶۲ء، اسلامیہ کلب، لاہور، ص ۴۶

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴

۳۔ اناطول فرانس، بحوالہ سید حسن برنی، مقالات برنی، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۶۲

۴۔ ایچ جی ویلس۔ بحوالہ سید حسن برنی، مقالات برنی، ص ۶۴

۵۔ محمد صالح طاہر، تحقیقی مقالہ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کی ادبی خدمات، مملکولہ پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل، کالج لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۱، ۲۷۲

۶۔ آرنلڈ جے ٹائن بی، تالیف مطالعہ تاریخ، ترجمہ غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۹۳

۷۔ مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی، مکارم اخلاق مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۵۳۷، ۵۳۸

۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، ص ۳۵

۹۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی، مکارم اخلاق، ص ۵۳۲، ۵۳۳

۱۰۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، تاریخ اور مورخ، (ترتیب وتعارف) مبارک علی، ڈاکٹر فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷

۱۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، ص ۲۸

۱۲۔ وقار عظیم، ڈاکٹر شبلی بحیثیت مورخ، تصنیفات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۸

۱۳۔ آرنلڈ جے ٹائن بی، مطالعہ تاریخ (مترجم) غلام رسول مہر، ص ۹۳

۱۴۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد چہارم مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء، ص ۸۲

۱۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، ص ۷

۱۶۔ وقار عظیم، ڈاکٹر شبلی بحیثیت مورخ، ص ۲۲۶

۱۷۔ سید تحی احمد ہاشمی، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناولوں میں مقصدیت، مشمولہ خیابان شرر نمبر، شمارہ۔ ۷، جون ۱۹۷۲ء، آئینہ ادب، لاہور، ص ۸۶، ۸۷

۱۸۔ شرر نعمانی، پروفیسر، فردوس بریں ایک مطالعہ، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، ص ۱۰۴

۱۹۔ اعجاز الرحمٰن، شرر کا اسلوب بیان، خیابان شرر نمبر، ص ۵۳

۲۰۔ عبد الحلیم شرر، فردوس بریں (مقدمہ) ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۲۶

۲۱۔ عبد الحلیم شرر، قدیم مسیحیت، سید ظہور الحسن قومی پریس، دہلی، سن۔ن، ص ۱

۲۲۔ ایضاً،ص۱

۲۳۔ ایضاً،ص۳

۲۴۔ ایضاً،ص۵

۲۵۔ ایضاً،ص۸۔۹

۲۶۔ ایضاً،ص۱۴

۲۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی،ص۷۵

۲۸۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر، حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء،ص۹۸

۲۹۔ ایضاً،ص۹۹

۳۰۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ سندھ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۷ء،ص۵

۳۱ ایضاً،ص۷

۳۲۔ ایضاً،ص۷

۳۳۔ ایضاً،ص۸

۳۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ سندھ عرب دور حکومت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء،ص۱۰

۳۵۔ حسام الدین راشدی، (گدازش)، تاریخ سندھ، مرتب غلام رسول مہر، سندھ ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۸ء،ص۱۔۲

۳۶۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ سندھ،ص۱۹۵

۳۷۔ ایضاً،ص۱۹۵

۳۸۔ ایھاً،ص۸

۳۹۔ ایضاً،ص۱۰۲

۴۰۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یاد ایام، عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد، دکن، ۱۹۴۶ء،ص۳۳۸

۴۱۔ رام بابوسکسینہ، تاریخ سندھ، مترجم مرزا محمد عسکری، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، س۔ن،ص۵۴۸

۴۲۔ عبدالحلیم شرر، مفتوح فاتح، (مقدمہ) غضنفر امروہوی، سلطان حسن اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء،ص۶

۴۳۔ حکم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مشمولہ رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت، مملوکہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۱۰ء،ص۸۳

۴۴۔ فرحت شاجہاں پوری، مولانا شرر لکھنوی، سوانح و تخلیقات، مشمولہ صحیفہ شمارہ ۳۳، اکتوبر ۱۹۶۵ء،ص۷۱

۴۵۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین، جلد دوم، دار اشاعت غازی آباد، دہلی، ۱۹۲۴ء،ص۲۰۰

۴۶۔ ایضاً،ص۵۶۹

۴۷۔ عبدالحلیم شرر، عصر قدیم، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص۳

۴۸۔ ایضاً، ص۳

۴۹۔ ایضاً، ص۴

۵۰۔ ایضاً، ص۴۴۔۴۵

۵۱۔ ایضاً، ص۴۵

۵۲۔ ایضاً، ص۴۶۔۴۷

۵۳۔ عبدالماجد دریا آبادی، معاصرین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، سن۔ن، ص۱۱۸

۵۴۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ ارض مقدس، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۳۱ء، ص۳۱

۵۵۔ ایضاً، ص۳۲

۵۶۔ ایضاً، ص۴۹۔۵۰

۵۷۔ ایضاً، ص۵۷

۵۸۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ خلافت، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۳ء، ص۱

۵۹۔ ایضاً، ص۱

۶۰۔ ایضاً، ص۴

۶۱۔ ایضاً، ص۲۸

۶۲۔ ایضاً، ص۲۸

۶۳۔ عبدالحلیم شرر، صقلیہ میں اسلام، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۹ء، ص۲

۶۴۔ ایضاً، ص۱۔۲

۶۵۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر، حیات اور کارنامے، ص۹۷

۶۶۔ عبدالحلیم شرر، صقلیہ میں اسلام، ص۱۰۳

۶۷۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، انڈین بک ڈپو، لکھنو، س۔ن، ص۱۷۲۔۲۷۲

۶۸۔ سید یحیٰی احمد ہاشمی، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناولوں میں مقصدیت، خیابان شرر نمبر، ص۸۷

۶۹۔ عبدالعلیم صدیقی، شرر اور اسکاٹ، خیابان شرر نمبر، ص۹۳

۷۰۔ سید مرتضیٰ جعفری، ڈاکٹر، شرر کی زندگی، خیابان شرر نمبر، ص۴۴

۷۱۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، جلد اول، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۷

۷۲۔ پریم چند، مضامین پریم چند، مرتب عتیق احمد، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۳۷

۷۳۔ عبدالعلیم صدیقی، شرر اور اسکاٹ، ص ۱۰۱

۷۴۔ عبدالحلیم شرر، مضمون ''آ'' ۱۹۱۲ء، جلد اول، حصہ سوم، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص ۱۲۹

۷۵۔ نسیم عباس، گزشتہ لکھنو، اسلوبیاتی مطالعہ، مشمولہ نوادر، شمارہ ۱۶۔۱۷، جنوری تا اپریل ۲۰۰۶ء، مجلس یادگار لاہور، ص ۱۰۹

۷۶۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، عبدالحلیم شرر، مرتب، محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۸۸

۷۷۔ ایضاً، ص ۳۸۸۔۳۸۹

۷۸۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، ص 415

۷۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، ص ۵۷

۸۰۔ نسیم عباس، گزشتہ لکھنو، اسلوبیاتی مطالعہ، مشمولہ سہ ماہی نوادر، شمارہ ۱۶۔۱۷، جنوری تا اپریل ۲۰۰۶ء، فریدیہ پریس لاہور، ص ۱۰۹

۸۱۔ وقار عظیم، ڈاکٹر، شبلی بحیثیت مورخ، تصنیفات، لاہور، س۔ن، ص ۳۰

۸۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، فروغ اردو، لکھنو، س۔ن، ص ۱۰۸

۸۳۔ نسیم عباس، گذشتہ لکھنو اسلوبیاتی مطالعہ، مشمولہ سہ ماہی نوادر، ص ۱۰۸

۸۴۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۹۸

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔۱۰۱

۸۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو ادب جنگ عظیم کے بعد، اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص ۴۳

۸۷۔ وقار عظیم، ڈاکٹر، شبلی بحیثیت مورخ، ص ۲۲۶

۸۸۔ عبدالحلیم شرر، حسن بن صباح، حافظ محمد الدین اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۶۸

۸۹۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ ارض مقدس، ص ۱۰

۹۰۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۸۵

۹۱۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۰۸۔۱۰۹

۹۲۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، اردو تنقید کا رومانوی دبستان، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۶۸

۹۳۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۹۴۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، نگاہ، (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ) بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۴ء، ص ۹۳

۹۵۔ عبدالحلیم شرر، شعر وسخن، مشمولہ، مضامین شرر حصہ اوّل، مطبوعہ عبدالرشید اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۳۰۰

۹۶۔ ایضاً،ص۳۰۰۔۳۰۱

۹۷۔ ایضاً،ص۳۰۱

۹۸۔ ایضاً،ص۳۰۲۔۳۰۳

۹۹۔ عبدالحلیم شرر،شاعری کی بے باکیاں،مشمولہ،شاعرانہ و عاشقانہ،(جلد دوم) عبدالرشید اینڈ سنز لاہور،س۔ن،ص۶۴۱

۱۰۰۔ ایضاً،ص۶۴۲۔۶۴۳

۱۰۱۔ عبدالحلیم شرر،آزادی،مشمولہ،شاعرانہ و عاشقانہ،ص۶۴۹

۱۰۲۔ عبدالحلیم شرر، ناول، مشمولہ، ادب و تحقیقی مسائل، مضامین شرر، جلد چہارم، عبدالرشید اینڈ سنز، لاہور، س۔ن،ص۲۲۹

۱۰۳۔ ایضاً،ص۲۲۹۔۲۳۰

۱۰۴۔ عبدالحلیم شرر، ہمارا جدید ناول،ص۲۵۶

۱۰۵۔ ایضاً،ص۲۶۲

۱۰۶۔ ایضاً،ص۲۶۳

۱۰۷۔ عبدالحلیم شرر،نظم معریٰ،مشمولہ،نظم و ڈرامہ،عبدالرشید اینڈ سنز،لاہور،س۔ن،ص۵۹

۱۰۸۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، اردو تنقید کا رومانوی دبستان،ص۲۶۹

۱۰۹۔ وحید الحسن ہاشمی،تنقیدی جہتیں، الحبیب پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۴ء،ص۱۰

۱۱۰۔ محمد احسن فاروقی، اردو میں تنقید،ص۷۷

۱۱۱۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۱۹۸۶ء،ص۱۴۷

۱۱۲۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، افکار حالی، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان،۱۹۷۹ء،ص۹۸

۱۱۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر،تنقید اور جدید اردو تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان،۱۹۸۹ء،ص۱۶۰

۱۱۴۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر،عشرت پبلشنگ ہاؤس،لاہور،س۔ن،ص۸۷

۱۱۵۔ حسن اختر، ڈاکٹر، تنقید اور تحقیقی جائزے،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۸۳ء،ص۲۳۰

۱۱۶۔ ملک حسن اختر،تنقیدی نظریے،مکتبہ میری لائبریری،لاہور،۱۹۸۱ء،ص۱۸۷

۱۱۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر،تنقید اور اصول تنقید، ادارہ ادب و تنقید، لاہور،۱۹۸۴ء،ص۱۶۳

باب پنجم

عبدالحلیم شرر بحیثیت صحافی

الف۔ صحافت کا آغاز وارتقاء

اردو نثر کے آغاز وارتقاء میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا بہت زیادہ حصہ ہے، داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ نے جہاں اس کے تاریخی سفر کو طے کرنے میں مدد دی وہاں سیرت وسوانح، مضمون ومقالہ اور انشا نگاری نے بھی اہم کردار ادا کیا۔مکتوباتی ادب، صحافت نگاری اور دیگر غیر افسانوی نثر نے بھی اس کو ترقی دی۔عبدالحلیم شرر نے بھی اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے اس کو ترقی کی منازل طے کرائیں۔صحافتی ادب میں بھی ان کا ایک خاص نام ومقام ومرتبہ ہے۔کیونکہ انہوں نے اخبارات ورسائل کے ذریعے اردو نثر کے تدریجی ارتقاء اور اس کے اسلوب کو ترقی دی، وہ بھی وقت اور حالات کی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے۔عبدالحلیم شرر کے اخبارات و رسائل اپنے وقت اور ماحول کے عکاس ہی نہیں زبان وادب کے ترجمان بھی ہیں۔ان کا صحافتی ادب اپنی تہذیب وثقافت کا مظہر ہے۔شرر نے اپنے صحافتی کارناموں کی بدولت زبان وادب کو خوب ترقی دی۔

اردو لفظ ''صحافت'' دراصل انگریزی لفظ ''جرنلزم'' (Journalism) کا مترادف ہے اور صحیفے سے مشتق ہے۔اس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ چونکہ ''جرنل'' کے معنی حساب اور روزنامچہ کے ہوتے ہیں۔اس لیے ''جرنلزم'' کا لفظ اس تمام مواد پر محیط ہے جو پابندی وقت کے لحاظ سے شائع کیا جاتا ہو۔صحافت کے ضمن میں ڈاکٹر عطش درانی لکھتے ہیں:

> صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے۔جس کا مطلب ''لکھا ہوا'' یا ''روداد'' ہے گویا روداد نویسی یا ایسی تحریر جس میں روداد یا خبر پائی جائے صحافت کے دائرہ کار میں آئے گی ......صحافت کی جدید تعریف میں خبروں کا لکھنا، کالم نگاری، فیچر نگاری، انٹرویو، رپورتاژ اور روزنامچے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔[1]

بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی: ......صحافت معاشرے اور زمانے کی عکاس ہے اور صحیح قسم کی صحافت اپنے دور کی تاریخ کہلاتی ہے ... اعلیٰ پایہ کی صحافت کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔[2]

صحافت کے متعلق ریاض احمد لکھتے ہیں: صحافت ہنگامی اقدار سے اپنا مواد اخذ کرتی ہے اور ہنگامی اقدار ہی کی

حمایت یا مخالفت تک محدود رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس ادب اجتماعی، عمومی اور ازلی اقدار کی پیش کش کا نام ہے۔[۳]

صحافت اپنے زمانے اور اپنے معاشرے کی عکاس اور تاریخ ہوتی ہے۔ معیاری صحافت وہی کہلائے گی جو مقصد خدمت انسانیت کو اپنائے گی۔ صحافت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت و افادیت ہر عہد اور ہر دور میں رہی ہے۔

درج بالا بیانات سے ثابت ہوا کہ ایسا تمام مواد جو مقررہ اوقات میں اور پابندی وقت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے صحافت کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ لفظ صحافت ''جرنلزم'' کا مترادف ہے اور صحیفے سے بھی نکلا ہے۔ اس کے لغوی معنی بھی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ مگر ''جرنل'' کے معنی حساب اور روزنامچہ کے ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لفظ اس سارے مواد پر محیط سمجھا جاتا ہے جو مخصوص اور پابند اوقات میں شائع ہو۔ اخبارات اور ماہناموں میں شائع ہونے والی تمام تحریریں ''جرنلزم'' کے زمرے میں آتی ہیں۔ لہٰذا خبریں، اشتہارات، تجارت سے متعلق مواد یہ سب ''جرنلزم'' کے زمرے میں شامل کی جاتی ہیں۔ ایسی تمام تحریریں جن میں خبر، روداد کا عنصر پایا جائے صحافت کے دائرہ کار میں آئیں گی۔ جدید صحافت کے پہلو میں خبریں، اشتہارات، کالم، فیچر، انٹرویو، رپورتاژ اور روزنامچے سا گئے ہیں۔ صحافت اپنے عہد اور معاشرے کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ اسے ہم اپنے عہد یا زمانے کی تاریخ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ معیاری صحافت کی خوبی یہ ہے کہ وہ عوام الناس کے معاملات و مسائل کو حل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو۔ صحافت ہنگامی اقدار، اجتماعی، عمومی اور ازلی اقدار کی ترجمانی کرتی ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم رقمطراز ہیں:

> صحافت کا میدان کافی وسیع ہے۔ اس میں ماہنامے یعنی رسائل ہفت روزہ، پندرہ روزہ، اخبار، روزنامے اور اسی قسم کی دوسری تحریریں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آج کے سائنسی دور میں صحافت کی حدود میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی صحافت بھی وجود میں آ چکی ہے مگر پھر بھی یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اخبارات خاص طور پر روزنامے صحافت کی ابتدائی شکل ہی نہیں بلکہ اہم ترین صورت بھی ہیں۔[۴]

صحافت کی بھی کئی اقسام ہیں لیکن تین اقسام مشہور و معروف ہیں۔ ''اخباری صحافت''، ''جدید صحافت''،

''علمی صحافت''، ہر ایک قسم اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے اور انہی تین اقسام کی بدولت صحافت نگاری کا فن ارتقا کی منازل طے کر کے آج فن کے عروج تک پہنچ چکا ہے۔ اخباری صحافت کی ذیل میں عام خبریں، تذکرے اور کالم وغیرہ آتے ہیں۔ جدید صحافت میں انٹرویو، فیچر اور مضامین وغیرہ شامل ہیں جبکہ علمی صحافت میں علمی مضامین مقالے اور اداریے کو نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔

صحافت کے دائرہ کار میں روزمرہ کی خبریں، بھاؤ، کھیلوں کے بارے میں معلومات، موسم کا حال وغیرہ آتا ہے۔کالم نگاری کی وجہ سے یہ فن بہت ترقی کر رہا ہے۔اخبارات کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی صحافت نے بھی ترقی کر لی ہے۔آج صحافت کے پہلو میں ادبی، سیاسی، فلمی رسائل و جرائد، انٹرویو، فیچر نگاری، مضامین نگاری، علمی جریدوں و کتابوں کی تدوین و اشاعت، مقالے، اداریے وغیرہ سامنے ہوئے ہیں۔موجودہ دور میں اپنی اقسام کی وجہ سے یہ فن بہت وسیع ہوگیا ہے۔صحافت کی قدروقیمت موجودہ زمانے میں بہت زیادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ صحافت نگاری کے ذریعے سے تبصرہ نگاری کے فن کو توسیع وترقی حاصل ہوئی ہے۔حفیظ الرحمٰن خان لکھتے ہیں:

> صحافت کے فروغ اور اخبارات و رسائل کی بڑھتی ہوئی اشاعت کے ساتھ ساتھ تبصرہ نگاری کو بڑی ترقی حاصل ہوئی ہے۔کتابوں کے قارئین کی اطلاع اور رہنمائی کے لیے اخبارات اور ادبی رسائل میں نئی مطبوعات پر کسی ماہرفن کی مختصر مگر جامع رائے شامل کی جاتی ہے......۵

جہاں صحافت نے تبصرہ نگاری کو فروغ دیا۔وہاں فنون لطیفہ کی اخباری کوریج میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہے۔حسن عابدی رقمطراز ہیں:

> موسیقی، رقص یا تھیٹر پر اخبار کے لیے لکھنا سیاست اور تجارت کے شعبوں کی کوریج سے مختلف نہیں ہے......جس طرح ایک عام رپورٹر اپنی بیٹ کی خبریں دیتا ہے اس طرح فنون لطیفہ کا رپورٹر اس شعبے میں متعلقہ لوگوں کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھتا ہے......وہ اپنے شہر کے اور ملک کے سرکردہ فنکاروں کے نام جانتا ہے اور ان میں مصور، موسیقار، ڈائریکٹر، ایکٹر، مصنف، رقاص اور وہ تمام افراد شامل ہیں جو فن کی تخلیق کرتے ہیں۔۶

موجودہ صحافت میں جس طرح کالم اہم اور لازمی جزوصحافت ہے اسی طرح فیچر نگاری بھی اردو اخبارات کے لیے ضروری اور اہم ہے۔شفیق جالندھری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> دنیائے صحافت میں فیچر کا لفظ ایسی تحریروں کے لیے مستعمل ہے جو اخبارات کی عام بے رنگ اور پھیکی تحریروں کے برعکس ڈرامائی اور افسانوی انداز میں لکھی جائیں جن میں قارئین کی دلچسپی کو فوقیت دی جائے۔۷

ہماری روزمرہ کی زندگی میں صحافت کا اہم کردار ہے۔اس کی اہمیت وافادیت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ ملکی اور بین الاقوامی خبریں صحافت ہی کے ذریعے سے عوام الناس تک پہنچتی ہیں۔اس فن کے ذریعے سے علم وادب، سائنسی معلومات، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، معاشی و معاشرتی اور مذہبی معلومات عوام تک پہنچائی جاتی ہیں۔بقول پروفیسر ڈاکٹر نعیم نقوی: ''صحافت نہ صرف مختلف علوم وفنون کی تفہیم میں مدد دیتی ہے بلکہ انسانی ذہن کی برتر نشو ونما بھی کرتی ہے۔''[۸] صحافت جہاں مختلف علوم وفنون کی تفہیم میں مدد دیتی ہے وہاں انسانی ذہن کی نشو ونما اور فکری بالیدگی میں بھی اہم کردارادا کررہی ہے۔ یہ ایک مقدس پیشہ ہے اوراس کے تقدس کو بحال رکھنے کے لیے صحافی کو مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگراس کے تقدس کوصحافی برقرار نہ رکھے تو معاشرہ اسے معاف نہیں کرتا۔صحافت کا تعلق چونکہ خبر سے ہے اس لیے اس کی اہمیت ہر ذی شعور بخوبی سمجھتا ہے۔صحافت تہذیب وتمدن کی مشعل بردار ہے۔ ہرقوم اپنے تہذیب وتمدن کوصحافت ہی کے ذریعے سے اجاگر کرتی ہے۔تہذیب وتمدن کی بقاو ترقی میں صحافت کا اہم کردار ہے۔ ہر ملک کی صحافت وہاں کے باشندوں کے جذبات و احساسات کا آئینہ ہوتی ہے۔اگر ترقی یافتہ اور روشن خیال قوم ہے تو اس قوم کی صحافت بھی ترقی یافتہ اور روشن خیال ہوگی اوراگرقوم تباہ حال اور محکوم ہے تو صحافت بھی ایسی ہی ہوگی یہ صحافت ہی کا کمال ہے کہ غلامی اور محکومیت کی زنجیریں اسی سے کاٹی جاتی ہیں۔اس فن کا مقام ومرتبہ آزاد اقوام عالم کی وجہ سے بڑھا ہے۔بقول شفیق جالندھری: ''اخبارات معلومات اور تفریحی اورفکری رہنمائی کے مقاصد پورے کرتے ہیں۔''[۹]

ڈاکٹر شہناز انجم رقمطراز ہیں:

> اخبارات خواہ کسی بھی زبان کے ہوں وہ صرف اپنے زمانے کے سماج اور ماحول کے ہی عکاس نہیں ہوتے بلکہ زبان وادب کے ترجمان اور تہذیب وثقافت کے مظہر بھی ہوتے ہیں۔لہٰذا ان کے ذریعہ زبان وادب کی ترقیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[۱۰]

اس سے ثابت ہوا کہ اخبارات خواہ کسی بھی زبان کے ہوں وہ اپنے عہد اور معاشرے کے عکاس ہوتے ہیں اور زبان وادب کے ترجمان بھی۔اپنے عہد کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے اظہار کا وسیلہ بھی ہوتے ہیں۔ اخبارات ورسائل جہاں یہ امور خاص سرانجام دیتے ہیں وہاں انہیں کے طفیل زبان وادب کی ترقی بھی ہوتی ہے۔

صحافت کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی تہذیب اوراس کے تمدن کی طرح یہ قدیم ہے۔صحافت کی ابتدا بھی وہیں سے ہوتی ہے جہاں سے انسانی تہذیب وتمدن اورسماجی وثقافتی زندگی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔سماج کے ارتقائی مدارج کی طرح اس نے بھی درجہ بدرجہ اپنی منزلیں طے کی ہیں۔ ہر عہد

اور ہر زمانے کے سماج کی بھر پور عکاسی صحافت میں ہوتی رہی اور ازل سے اس کا رشتہ انسانی زندگی اور اس کی تہذیب وتمدن سے جڑا رہا۔ خبر رسانی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انسان کو قوت گویائی عطا کی گئی۔قوت گویائی کے بعد جب انسان نے اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا تو خبریں وجود میں آئیں اور عرصہ دراز تک انسان اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا یوں بڑی مدت تک زبانی صحافت ہی کا دور دورہ رہا۔اس کے بعد انسان نے جوں جوں ترقی کی اور اس کی آبادیوں میں اضافہ ہوا ،اس نے اپنے معاشرے کا نظم وضبط شروع کیا۔تو ریاستیں وجود میں آئیں۔اس طرح واقعات وخیالات کا تسلسل بھی بڑھا۔حالات وواقعات کی تبدیلیوں نے لوگوں کے خیالات کو بھی تبدیل کیا اور ان میں وسعت پیدا کی۔بعد میں قوت ترسیل کے اضافے نے ایک جگہ کی چیزیں دوسری جگہ پر پہنچانی شروع کیں۔انسان کے ذوق تجسس نے خبر ہی کے ذرائع کو جنم وفروغ دیا۔ایک مخصوص عرصہ تک کافی ہاؤس، چائے خانے اور کلیسا اس زبانی صحافت کے اہم مرکز بنے رہے۔شعراء، ادباء اور پادریوں کے پیغامات کے ذریعے اور ڈھنڈورچیوں کے ذریعے خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے لگیں۔اس کے بعد جب لکھنے پڑھنے کا رواج ہوا اور تحریر کی ابتدا ہوئی تو صحافت میں زبردست انقلاب برپا ہوا۔پھر قلمی خبرنامے ایجاد ہوئے۔انسانی ضروریات زندگی نے جیسے جیسے وسعت اختیار کی ویسے ویسے ایجادات نے اس کا دامن بھرا اور پھر چھاپے خانے کی ایجاد نے فن صحافت کو مزید ترقی ووسعت دی۔

صحافت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔مختلف ادوار میں مختلف انداز سے صحافت اپنا کردار ادا کرتی رہی۔ قدیم عہد میں علامتوں اور تصویروں کے ذریعہ سے خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔پھر درختوں کی چھال اور پتوں پر لکھنے کا رواج ہوا۔ساتی لون نامی ایک شخص جس کا تعلق چین سے تھا اس نے درخت کی چھال اور ماہی گیروں کے جال کو کوٹ کر سب سے پہلے کاغذ تیار کیا اور پھر اس پر کتابت ہونے لگی۔اعلانات وفرامین جاری ہونے لگے۔یوں اخباری دنیا کے تحریری دور کا آغاز ہوا۔برصغیر پاک و ہند میں مطبوعہ صحافت کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ''ہیکیز گزٹ'' کے اجرا سے ہوا۔لیکن اس کے اجرا سے قبل یہاں پر قلمی اور زبانی صحافت کا رواج تھا۔عبد اللہ یوسف علی اس ضمن میں رقمطراز ہیں: ''ہندوستانی اخبار نویسی کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے ملک میں اخبار نویسی کا آغاز موجودہ مطبوعہ اخبارات کی صورت میں ہوا''۔[۱۱]

ان بیانات سے واضح ہوا کہ مطبوعہ صحافت کے آغاز سے قبل ہندوستان میں صحافت کا آغاز ہو چکا تھا۔منو مہاراج کے قدیم عہد سے یہ فن کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔اشوک اور چندر گپت کے عہد میں بھی خبر رسانی کے ذرائع پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور شیر شاہ سوری کا عہد اس ذرائع خبر رسانی میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں برصغیر میں صحافت کا آغاز ہوا اور انگریزی زبان کا پہلا ہفت روزہ شائع ہوا جس کا نام

''دہیکلنز گزٹ'' تھا۔اس کے ایڈیٹر جیمس آگسن تھے۔اس کا دوسرا نام ایڈورٹائزر تھا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء میں ''جام جہاں نما'' نامی اخبار شائع ہوا اگر چہ بعض ناقدین اس کو باقاعدہ اردو کا اخبار تسلیم نہیں کرتے ۔ جون ۱۸۲۲ء تک یہ اردو کا اخبار رہا مولانا محمد باقر کے جاری کردہ اخبار کو اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار کہتے ہیں ۔ ۱۸۳۷ء میں یہ اخبار جاری ہوا۔ ۱۰ مئی ۱۸۴۰ء سے دہلی اردو اخبار کے نام سے یہ مشہور ہوا۔اس عہد میں ۱۸۴۳ء میں مظہر حق کے نام سے بھی ایک اخبار جاری ہوا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں سید الاخبار کے نام سے سرسید احمد خان کے بھائی نے ایک اخبار نکالا۔ یہ اخبار ۱۸۵۰ء میں بند ہوا۔ مغلیہ عہد میں بھی خبر نویسی ہوتی تھی ۔ مرکزی حکومت کو یہ خبریں مختلف ذرائع سے حاصل ہوتی تھیں ۔ اس میں (۱) وقائع نگار، (۲) سوانح نگار، (۳) خفیہ پولیس، (۴) ہرکارے شامل تھے ۔ اول اذکر تینوں خبریں لکھ کر بھیجتے تھے اور ہرکارہ بعض اوقات خود بھی بادشاہ کے نام چھٹیاں لکھتا تھا اور کسی دوسرے ہرکارے کے ہاتھ بھیجتا تھا۔ قلعہ معلیٰ کے وقائع نگار کے متعلق اس ایم ناز نے لکھا ہے کہ: ''مغلوں کے زمانے میں قلعہ معلیٰ کے وقائع نگار بھی ہوتے تھے جو دربار کی مکمل روداد کا روزنامچہ مرتب کرتے تھے۔''[۱۲]

بقول سید اعجاز حسین:

> صحافت نگاری سے اردو کو دلچسپی کم از کم ۱۸۳۵ء سے ہوگئی تھی ۔ اخبارات ورسائل کا سلسلہ عہد قدیم میں شروع ہوگیا تھا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ رجحان واخبارات میں اضافہ ہوتا گیا۔ دورِ جدید یعنی ۱۸۶۷ء سے صحافت نگاری و اخبار بینی کے مذاق میں باقاعدگی و ہمہ گیری زیادہ ہونے لگی ۔[۱۳]

عہد مغلیہ میں صحافتی ذرائع کو بہت زیادہ ترقی ہوئی ۔ اس دور میں خبر رسانی کے مخصوص افراد تھے اور باقاعدہ ان کے امور کو تقسیم کیا گیا تھا۔ عتیق صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> مرکزی حکومت کو جن ذرائع سے خبریں حاصل ہوتی تھیں وہ یہ تھے: ۱۔وقائع نگار، ۲۔ سوانح نگار، ۳۔خفیہ پولیس، ۴۔ہرکارے...... اول الذکر تینوں خبریں لکھ کر بھیجتے تھے۔ ہرکارہ جس کے لغوی معنی ہیں لے جانے والا ۔ وہ خبریں زبانی سناتا تھا۔[۱۴]

یہ وقائع نگار ملک کے مختلف حصوں میں مقرر ہوتے تھے ۔ ان کا کام یہ تھا کہ واقعات کی صحیح خبر دیں۔ چونکہ وقائع نگاروں کو خفیہ پولیس اور سزاؤں کا خدشہ ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ کوشش کرتے تھے کہ صحیح خبریں پہنچائیں اور جھوٹ وغلط بیانی سے کام نہ لیں۔ ہرکارے چست اور پھرتیلے ہوتے تھے ۔ اس لیے کہ اس عہد میں ذرائع آمد و رفت کی ترقی موجودہ دور کی طرح نہ تھی ۔

تمام اخبارات صرف خبر رسانی ہی کا ذریعہ نہ تھے بلکہ یہ اس عہد کے زبان و ادب کے بھی ترجمان تھے۔ ان خبارات نے صحافت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہی کے طفیل اس دور کی زبان و ادب میں ترقی و تبدیلی رونما ہوئی۔ ڈاکٹر تنویر علوی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> علم کے دوسرے شعبوں سے قطع نظر اخبارات اور خاص طور پر اردو اخبارات کا مطالعہ اس زبان کی تہذیبی اہمیت کو سمجھنے اور اس کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کے لیے غیر معمولی اہم ہے......اردو نثر کے مراحل تمام تر نہیں تو بہت کچھ اخبارات کی خاموش خدمت کے وسیلے سے طے ہوئے ہیں۔[۱۵]

بقول عبدالمجید سالک: ''اردو اخبار نویسی کی عمر کوئی سوا سو سال کے قریب ہو چکی ہے۔''[۱۶] ہمارے ادب کی تمام نظم ونثر کے اسالیب اور علمی و ادبی تحریکات کی بنیاد فارسی زبان پر رکھی گئی ہے۔ ہماری صحافت کا آغاز بھی فارسی ہی سے ہوا۔ ''شمس الاخبار'' اور ''جام جہاں نما'' اس وقت جاری ہوئے جب چھاپہ خانہ کی ایجاد ہوئی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اردو کے سب سے پہلے اخبارات کے ضمن میں رقمطراز ہیں: ''اردو اخبار'' اور ''سید الاخبار'' غالباً اردو کے سب سے پہلے اخبار ہیں۔''[۱۷] نادر علی خان ''جام جہاں نما'' کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''......اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہے جو ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتے سے جاری کیا گیا تھا۔''[۱۸] مولانا صابری اس اخبار کے متعلق لکھتے ہیں: ''......فارسی اور اردو زبانوں میں نکلتا تھا۔ آٹھ صفحہ فارسی میں اور چار صفحہ اردو میں شائع ہوتے تھے۔''[۱۹] اس اخبار میں خبروں کی حیثیت ضمنی تھی۔ تاریخی، ادبی اور سیاسی مضامین کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اس اخبار کی نثر مروجہ نثر اردو سے مختلف تھی۔ اس دور میں اردو نثر حقیقت نگاری، سادگی اور تکلفی کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ اس اخبار نے بھی اسی انداز کو اپنایا۔ مثال کے طور پر یہ خبر ملاحظہ کیجئے۔

> اخبار کے کاغذ میں دیکھا گیا کہ برہان پور کے ملک میں جو دکھن کے علاقہ میں ہے، ایک برہمن رہتا تھا۔ اتفاقات سے وہ ایک دن کسی کام کے واسطے جنگل میں جا نکلا۔ اس کو اکیلا دیکھ کر ایک باگھ کئی دن کا بھوکا جو اپنی تھل میں پڑا ہوا تھا ایک بارگی بجلی کی طرح تڑپ کر اس دکھیا برہمن پر گرا۔ حقیقت میں چنڈال غریب برہمن کے خون کا پیاسا تھا۔ اپنا کام کر گیا۔[۲۰]

اس عبارت کے مطالعہ سے واضح ہوا کہ زبان کافی حد تک صاف، سادہ، عام فہم اور روزمرہ کے قریب ہے۔ اندازِ بیان عام فہم ہے اور اس میں سادگی و سلاست کا عنصر کارفرما ہے۔ جملے مختصر لکھے گئے ہیں اور اس میں

روانی بھی موجود ہے۔اگر چہ اردو اخبار نویسی کا آغاز تو ''جام جہاں نما'' سے ہوا تھا۔لیکن صحیح معنوں میں صحافت نے ۱۸۲۶ء میں ترقی شروع کی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور صحافت کو آزادی دی گی۔جس کے نتیجے میں ملک بھر سے اخبارات ورسائل جاری وشائع ہونے لگے اور اردو زبان ملک بھر میں اہم اور وسیع ترین ذریعہ اظہار کی زبان بن گئی تھی۔مشہور فرانسیسی مستشرق گارسان ڈی تاس اس صحافتی ترقی کے ضمن میں لکھتا ہے:

> چھپائی کے ذکر سے خود بخو دمیرا خیال ایک دوسرے مضمون کیطرف پہنچا۔جس کا تعلق بھی ایک طرح ادب سے ہے اور جو پہلے ایشیا میں ناپید تھا۔مگر اب ہندوستان میں ترقی کر رہا ہے۔میرا مطلب پریس (اخبار ورسائل) سے ہے جس کی حکومت روز بروز پھیلتی جاتی ہے اور جس نے بے فکر ہندوستان کو بھی اپنا غلام بنا لیا ہے۔[۴۱]

جب اردو زبان سرکاری زبان بنی تو اس میں جہاں اور اصناف ادب داخل ہوئے وہاں صحافت جو پہلے ہی سے کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی۔اس نے بھی ترقی کا آغاز کیا اور اس دور میں صحافتی آزادی کی وجہ سے ملک بھر میں مختلف اخبارات ورسائل جاری ہونے لگے۔صحافتی خدمت کے اس پہلو کی وجہ سے اردو زبان وادب کو بہت فائدہ پہنچا۔لکھنو سے بھی کئی اخبارات شائع ہوئے۔مرزا ہادی رسواء کا تعلق بھی لکھنو سے تھا اور انہوں نے بھی کئی ایک رسائل جاری ہے۔عشرت رحمانی اس ضمن میں لکھتے ہیں:ایک رسالہ اشراق کے نام سے نکالا ......انہوں نے ایک رسالہ ''الحکم'' نکالا، یہ علمی ومذہبی پرچہ تھا۔[۴۳] لکھنو جو کہ علم وادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا وہاں سے ''مخزن الاخبار''، ''طلسم لکھنو''، ''سحر سامری''، ''تاج الاخبار''، ''اودھ اخبار''، ''الناظر لکھنو''، ''صادق الاخبار'' وغیرہ جاری ہوئے۔اگر چہ یہ اخبارات شرر کے اخبارات ورسائل کی اشاعت سے قبل کے تھے لیکن انہوں نے علم وادب کی خدمت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔''اشراق''، ''الحکم'' نامی رسائل بھی نکلتے تھے۔جنہوں نے اردو صحافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔جہاں لکھنو سے اخبارات ورسائل کی اشاعت ہوئی وہاں پنجاب، کلکتہ، بنگال، مدارس، شمالی ہند اور دیگر علاقوں سے بھی اخبار ورسائل کی اشاعت کے سلسلے کا آغاز ہوا اور ایسے ایسے اخبارات ورسائل جاری ہوئے جو اپنے وقت کے مشہور ومعروف اخبارات ورسائل تھے۔انہوں نے بھی اردو ادب اور صحافت کی بہت خدمت کی وہ اپنے عہد کے حالات وواقعات کی جہاں نمائندگی کرتے تھے وہاں اس عہد کی تہذیب وثقافت، عوام کے مسائل وغیرہ کے ترجمان بھی تھے۔

ب۔ شرر کی صحافتی زندگی پر ناقدانہ نظر

انیسویں صدی صحافت نگاری کے عروج کی صدی ثابت ہوئی۔اس صدی کے آخر میں مولوی عبدالحلیم شرر نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔جس کے متعلق عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> انیسویں صدی کے اواخر میں ملک کا گوشہ گوشہ اردو اخباروں اور رسالوں سے معمور ہوگیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اخباری زبان بے حد صاف ہوگئی اور یہی زمانہ ہے جب مولانا عبدالحلیم شرر،مولوی سید احمد صاحب،فرہنگ آصفیہ،منشی محبوب عالم،شیخ عبدالقادر، مولوی سید ممتاز علی جیسے مستند ومقتدر انشا پردازوں نے صحافت کی وادی میں قدم رکھا۔[۲۳]

اس دور کی صحافت نگاری کے متعلق عزیز ملک لکھتے ہیں:''برصغیر میں انیسویں صدی کے آخری پچیس برسوں میں اخبارات نے صحافت کے جدید تقاضوں کواپنانے کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کی مذہبی اور سیاسی راہنمائی کا فرض ادا کیا''۔[۲۴] شرر نے اپنی صحافت اور اپنی تحریروں سے اپنے دور کے انسانوں اور خاص طور پر مسلمانان ہند کی وہ خدمت کی جو تاریخ کے صفحات میں آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔ان کے دور میں صحافت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کرے۔ملکی اور غیر ملکی خبروں کواپنے اخبارات ورسائل میں جگہ دے۔بین الاقوامی سیاست اور حالات وواقعات پر بات چیت کرے تا کہ لوگوں میں شعور پیدا ہواوروہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں کہ زمانہ کس قدر بدل رہا ہے؟ صحافت کی ترقی ایک تو زبان اردو کوسرکاری زبان قرار دینے کے بعد شروع ہوئی تھی دوسرا سبب اس کی ترقی کا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تھی اور تیسرا سبب اس کی ترقی وارتقا کا بیسویں صدی کی اردو صحافت ہے۔بیسویں صدی کی صحافت پہلے ادوار کی صحافت سے مختلف تھی۔اس میں انقلابی رنگ دکھائی دیتا تھا۔تلخ وترش لب ولہجہ نے اپنی جگہ بنالی۔مغرب کے خلاف جذبات پروان چڑھنے لگے۔اخبارات ورسائل پہلے ہی کافی تعداد میں شائع ہورہے تھے۔ان کی تعداد میں قدرے اضافہ ہوا۔اگرچہ صحافیوں کو پابند سلاسل بھی کیا گیا ان کے اخبارات ورسائل کو بھی بند کیا گیا لیکن پھر بھی اس دور کی صحافت نے وہ کارنامے اور خدمت کی جو آج بھی تاریخ میں زندہ ہے۔بقول ڈاکٹر روف پاریکھ:''بیسویں صدی میں برعظیم کی صحافت نے زبردست پلٹا کھایا۔اس کا لب ولہجہ جو پہلے مجموعی طور پر فدویانہ تھا اب بڑی حد تک انقلابی اور تلخ وترش ہوگیا۔اخبارات کی اشاعتیں بڑھ گئیں۔''[۲۵] اردو صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:پہلا دور ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۷ء تک،دوسرا دور ۱۸۵۷ء یعنی جنگ آزادی سے ۱۹۰۰ء تک،تیسرا دور ۱۹۰۱ء سے موجودہ عہد تک۔

شرر کا دور صحافت کی ترقی کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔اس زمانے میں روزنامے ہفت روزہ اور ماہوار رسائل

جاری ہوئے۔اخبارات کا ایک وسیع سلسلہ جاری ہوا جس نے صحافت کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا اور صحافت کو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح اور ترقی میں اہم کردار صحافت ہی کا ہے۔شرر کے عہد میں چونکہ صحافت ابتدائی مراحل سے گزر کر ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے بہت آگے نکل آئی تھی۔انہوں نے اپنے اس فن کو اس دور کے دوسرے ادباء وشعراء اور صحافیوں کی طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔اپنے دور کے مسلمانوں کو ہر طریقے سے جھنجھوڑا، ان کے لیے منزل کی نشاندہی کی۔اپنے مقصد کے حصول کے لیے کئی رسائل واخبارات جاری ہے جو سب اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن ''دلگداز'' کے ذریعے سے انہوں نے زبان وادب اور قوم وملت کی جو خدمت کی وہ ان کا کوئی دوسرا رسالہ نہ کر سکا۔مسلمانانِ ہند اس دور میں کڑی آزمائش سے گزر رہے تھے۔اس دور کے صحافیوں نے بھی ان حالات سے متاثر ہو کر اپنی صحافت کا رخ اصلاح قوم وملت کی طرف موڑ دیا تھا۔بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

> برعظیم پاک وہند میں صحافت کا مقصد صرف یہ نہیں رہا کہ وہ قارئین تک خبریں پہنچائے اور انہیں ان کے پس منظر سے آگاہ کرے۔صحافت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی رہا ہے کہ وہ لوگوں میں علم کو فروغ دے......یہی وجہ ہے کہ ہر اخبار میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی چھپتے رہے ہیں۔۲۶

برصغیر پاک وہند میں شرر کے عہد میں جو صحافت پنپ رہی تھی۔اس کا مقصد صرف خبروں کی ترسیل نہ تھی اس دور میں صحافی جہاں مسلمانانِ ہند کو نئی نئی خبروں سے آگاہ کرتے تھے، نئے نئے حالات وواقعات کو اپنے فن کے ذریعے سے عوام الناس تک پہنچانے کی سعی کرتے تھے۔وہاں وہ پبلک کے لیے سب سے ضروری یہ بھی سمجھتے تھے کہ خبروں کے ساتھ ساتھ علم کے فروغ میں بھی یہ اہم کردار ادا کرئے۔برصغیر پاک وہند میں برطانوی دور اقتدار میں صحافت نے بہت ترقی کی۔کئی اخبارات ورسائل جاری ہوئے۔جنہوں نے عوام کو مغربی علوم وسائنس کی ترقیات سے بھی آگاہ کیا اور معاشی، معاشرتی، علمی، سیاسی، ادبی موضوعات پر مضامین بھی شائع کیے جو کہ پبلک کی بہت بڑی خدمت کے مترادف عمل تھا۔اس بنا پر لوگوں میں شعور وبیداری کی لہر پیدا ہوئی صحافیوں نے اپنے فن صحافت کے ذریعے سے اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کیا تاکہ اس میں ذوق وشوق جنم لے اور وہ موجودہ پستی کی حالت سے باہر نکل سکیں۔اس عہد کی صحافت کے ضمن میں سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> اس دور میں زبان ومذاق کے لحاظ سے صحافت نگاری کا معیار نسبتاً بلند نظر آتا ہے۔طرزِ تحریر میں نمایاں فرق ہے۔عبارت پہلے سے زیادہ سلیس اور چست ہے مگر پھر بھی عربی وفارسی کے الفاظ وتراکیب کا دباؤ ضرورت سے زیادہ ہے۔انگریزی الفاظ اردو جملوں میں جابجا

> چمکتے ہیں۔مغرب کے ضرب الامثال ومحاورات کے ترجمے سے زبان کو مالدار بنانے کی کوشش شعوری یا غیر شعوری طور پر ہونے لگی۔مغربی ادب وخیالات سے متاثر ہونے کی وجہ سے مدیروں کے طرز تخیل واظہار رائے میں بھی ایک گونہ آزادی نظر آتی ہے۔۲۷

شرر کے دور میں زبان و مذاق کے لحاظ سے صحافت کا معیار پہلے سے بلند دکھائی دیتا ہے۔اس دور میں جہاں صحافت نے زبان و مذاق کے لحاظ سے ترقی کی وہاں طرز تحریر میں بھی ایک نمایاں خوبی پیدا ہوئی۔عبدالحلیم شرر نہ صرف ایک اچھے مضمون نگار اور تاریخی ناول نگار تھے۔بلکہ وہ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔جنھوں نے مختلف رسائل نکالے اور اس دور میں جب کہ برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی حکومت تھی اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک تھا۔اس عہد میں شرر جیسے صحافی نے اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیئے۔مستقبل میں بھی جب مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کوئی بھی مورخ لکھے گا تو وہ شرر جیسے انشاپرداز،حق گو اور تاریخی ناول نگار کو خراج عقیدت پیش کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔اگر چہ اس عہد میں حالات بہت ہی نا مساعد تھے لیکن شرر نے اپنی صحافت سے مسلمانوں کو بیداری کا درس دیا۔مسلمانوں میں سیاسی شعور اور اپنے آباؤ واجداد کے کارناموں کے ذریعے نشاۃ الثانیہ کے احیاء کے لیے اہم کارنامہ سرانجام دیا۔بقول سید ظہور مہدی:

> پاک وہند کی داستان صحافت دراصل جدوجہد کی نا قابل فراموش داستان ہے۔جس کے بنیادی ستون صحافی ہی تھے۔جنھوں نے مسلمانوں میں سامراجیوں سے ٹکر لینے کی بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی۔ان میں سرسید احمد خان،مولانا محمد باقر،مولانا عبدالحلیم شرر،مولانا محمد علی جوہر،مولانا ظفر علی خان،مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد سرفہرست ہیں۔۲۸

ایک طرف سرسید احمد خان اور دیگر صحافیوں نے حالات کا جائزہ لے کر مسلمانوں کے تشخص اور ان کی قومیت کے جذبے کو ابھارا اور دوسری طرف شرر نے صحافت کے ذریعے سے مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کی تصویر دکھائی تاکہ مسلمانوں کو احساس ہو کہ وہ کس قوم کے افراد ہیں؟ اور ان کے آباؤ اجداد کے کیا کیا کارنامے تھے؟ جن کی بنا پر انہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی تھی۔انگریزوں کی غلامی نے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار سے محروم کر کے رکھ دیا تھا۔مسلمانوں کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا۔شرر نے بھی اس دور کے دیگر صحافیوں کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس قوم میں زندگی کی نئی رمک پیدا کرنے کی کوشش کی۔شرر ایک ایسے صحافی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے شاندار ماضی اور تابناک مستقبل کی راہوں کو زورِ قلم سے اجاگر کیا اور ماضی وحال کو اس انداز سے پیش کیا کہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور مسلمان دوبارہ ایک باعزت، باوقار قوم بن کر ابھریں۔شرر جیسی جامع الصفات شخصیت کی خوبیوں اور ان کی صحافیانہ خدمات پر

سیر حاصل تبصرہ کرنا بہت دشوار ہے، لیکن پھر بھی حقیر سی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی صحافیانہ خدمات کو پیش کیا جائے۔ڈاکٹرعبدالسلام خورشید نے بجا لکھا ہے کہ: ''شرر کی ادبی زندگی کا ایک اور پہلوان کی صحافت ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔''۲۹

بقول فیض احمد فیض:

شررکا ناول نویس مشہور ہونا قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ ان کا صحیح میدان صحافت یا جرنلزم ہے۔موجودہ ادبی رسالوں کی تاریخ میں دو رسالوں کو سب سے زیادہ ممتاز جگہ ملنی چاہیے۔ ان میں پہلا مخزن ہے اور دوسرا دلگداز۔ اکثر حضرات جانتے ہیں کہ ایک عرصہ تک پہلے صفحہ سے آخری صفحہ تک رسالہ کے تمام مضامین مولانا شرر خود لکھتے رہے۔ یہ صرف محنت اور الوالعزمی کی دلیل نہیں لکھنے والے کی قدرت اور مشق کا ثبوت بھی ہیں۔ اکثر نوجوانوں میں اردو علم وادب کا شوق انہیں دو رسالوں نے پیدا کیا ہے اور مولانا شرر کی یہ خدمت فراموش نہیں کی جاسکتی۔۳۰

اس سے ثابت ہوا کہ ''مخزن'' اور ''دلگداز'' جو کہ اپنے وقت کے مشہور رسائل تھے۔ ان میں دلگداز کا مقام بلند ہے اور وجہ یہ ہے کہ شرر خود ہی اس رسالے میں اپنے قلم سے سب کچھ لکھتے تھے۔ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ اور ادبی خدمت ہے اور ان کا اصل میدان صحافت ہی ہے۔اپنی طویل ادبی اور صحافتی زندگی میں شرر نے متعدد رسالے جاری کیے۔جن میں ہفتہ وار محشر ماہنامہ دلگداز، ماہنامہ مہذب، پندرہ روزہ پردہ عصمت، ماہنامہ الفرقان، ماہنامہ دل افروز، ہفت روزہ ظریف اور ماہنامہ مورخ وغیرہ شامل ہیں۔''منصور عاقل'' صحافت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

.....صحافت صرف اخبار نویسی ہی تک محدود نہیں بلکہ اس میں اب خبروں پر تبصرہ وتنقید کے علاوہ سیاسی، سماجی اور معاشی موضوعات اور خاکے وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ قارئین کے بڑھتے ہوئے سیاسی و سماجی شعور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے روزناموں کے علاوہ ماہانہ اور پندرہ روزہ رسالوں، ہفتہ وار اور سہ روزہ اخبار وجرائد کا عام ہو جانا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔۳۱

منصور عاقل نے ''فن صحافت'' کے ضمن میں جو باتیں کی ہے وہ عبدالحلیم شرر نے اس دور میں صحافت میں شامل کی تھیں۔ اس لیے کہ شرر ایک بہترین صحافی تھے۔بہترین صحافی وہ شخص ہے جو متقدمین کی حکمت و ذہانت، جدید حکماء کے فلسفوں، سائنسدانوں کی معلومات، انجینئروں کی میکانکس اپنے اور دوسرے ادوار کی تاریخ، معاشی،

سماجی و سیاسی زندگی کے نمایاں عوامل پر عبور حاصل کر لے اور ان تمام معلومات کو اپنے سینہ میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو، ان میں سے اپنے قارئین کو اس قدر پیش کر سکے جس کے وہ متحمل ہو سکیں۔ شرر ایک عظیم صحافی تھے اور باوقار پیشہ سے منسلک تھے۔ ان میں تمام احساسات کو جمع اور ترتیب دینے کی خداداد صلاحیت تھی۔ عام رجحانات اور عمومی دلچسپیوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ شرر نے اپنی ذہانت و مہارت کی وجہ سے کٹھن اور نامساعد حالات میں بھی اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا تھا۔ صحافیوں کے فرائض کے متعلق مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے: ''ان کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پبلک کے مذاق کو اگر وہ فاسد ہے تو صحیح اور اگر صحیح ہے تو اعلیٰ درجے کا صحیح بنا دیں۔''[۴۲] عبدالحلیم شرر بھی ایک صحافی کے فرائض سے آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے خاص رنگ میں مضامین لکھ کر اودھ اخبار میں شائع کرائے تو ان کے مضامین نے اردو دان طبقے میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے اپنی جادو بیانی سے پبلک کو متاثر کیا۔ بقول خواجہ عبدالرؤف عشرت: ''اودھ اخبار میں شرر کے مضامین نے ایک ہلچل ڈال دی۔''[۴۳] شرر نے بطور صحافی جو کچھ بھی لکھا ہے اس پیرائے و انداز سے لکھا ہے کہ قاری پر اثر دیر تک رہتا ہے۔ جتنا اچھا اندازِ بیان ہوتا ہے اتنا ہی اس کا تاثر دیرپا اور اور وسیع ہوتا ہے۔ مرزا ادیب اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ: ''......اندازِ بیاں جس قدر موثر ہو گا اس قدر اس کا حلقہ وسیع ہو گا ......''[۴۴] عبدالحلیم شرر کو ایک تو خدا کی طرف سے ادب کی دلچسپی کا ملکہ عطا ہوا تھا دوسرا انہوں نے تعلیم و تربیت کے مدارج جس ماحول میں طے کیے وہ زمانہ بھی ادب کے فروغ کا تھا۔ اگرچہ انگریزوں کی حکومت تھی اور ادیب آزادیِ اظہار نہیں رکھتے تھے۔ لیکن شرر نے اس غلامی کے دور میں رہتے ہوئے بھی اردو ادب کا دامن افسانوی اور غیر افسانوی نثر سے مالا مال کر دیا اور خاص کر صحافت کے میدان میں اپنے ذوق و شوق کے کارنامے واضح طور پر دکھائے جو قابلِ صد تحسین ہیں۔

شرر کی صحافتی زندگی کا آغاز اوراودھ اخبار سے وابستگی

شرر نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اودھ اخبار کے نامہ نگار کی حیثیت سے کیا۔شرر کی صحافتی زندگی کے آغاز کے بارے میں علی عباس حسینی کا کہنا ہے:''شرر کی باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز ۱۸۸۰ء میں اس وقت ہوا جب منشی نول کشور نے انہیں اودھ اخبار کے ادارتی عملے میں شامل کرلیا۔''۳۵ پروفیسر جعفر رضا شرر کی صحافت نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:''قوم کو اپنی پرانی عظمت یاد دلانا شرر کی صحافت کا بنیادی مقصد تھا۔تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شرر کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوتا ہے۔''۳۶ شرر کی صحافتی زندگی کے بارے میں اشتیاق طالب لکھتے ہیں:

> مولانا کی ادبی زندگی ''اودھ پنچ'' کے نامہ نگار کی حیثیت سے شروع ہوئی۔انہوں نے جلد ہی عبارت آرائی، رنگین بیانی اور نت نئے موضوعات ومسائل، استعارات وتراکیب برجستہ اور رواں دواں تحریروں کے ذریعے ادبی دنیا میں نام پیدا کیا۔۳۷

جس زمانے میں شرر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔اس وقت صحافت میں کیا رجحانات غالب تھے؟ اور قوم کی حالت زار کیسی تھی؟ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رقمطراز ہیں:

> جس وقت شرر نے لکھنا شروع کیا اس وقت اردو صحافت اپنا ابتدائی جوش دکھا رہی تھی۔قوم ایک نئی صورت سے جاگ کر اپنا اخلاق درست کرنے میں لگی تھی اور تمام صحافت کا مقصد یہی تھا کہ عام لوگوں کو ترقی کی راہ پر لگایا جائے۔اس سلسلہ میں قوم کو اپنی پرانی عظمت یاد دلانا بھی ضروری تھا۔حالی اپنے مسدس میں یہی کر چکے تھے اور تمام مسلمانوں کی توجہ تاریخ اسلام کی طرف جا رہی تھی۔ہر اس شخص کا جو تحریر وتصنیف میں دل چسپی رکھتا تھا یہ تمام تر فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی مسائل یا قومی تاریخ کو پڑھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اپنی تصانیف میں روشنی ڈالے۔پھر اس زمانے میں عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کافی زور کے ساتھ کر رہے تھے۔اس لیے ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ ان کے خلاف بھی قلمی جہاد کرے اور عیسائیت کے عیوب نکالے۔عبدالحلیم شرر ان تمام صحافتی رجحانات کے موافق تصنیف کے میدان میں آئے تھے......۳۸

یہی وہ حالات ورجحانات تھے جنہوں نے شرر کو ایک اعلیٰ پائے کا صحافی بنایا۔ڈاکٹر فاروق عثمان شرر کی صحافت سے دلچسپی کے متعلق اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں:

> اخبارات سے ان کی دلچسپی کا آغاز کلکتہ کی رہائش کے دوران ہوا۔ کلکتہ انگریزوں کا دارالحکومت تھا اور یہاں صحافت کا ماحول کافی حد تک ترقی کر چکا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر بحیثیت نامہ نگار کلکتہ سے اودھ اخبار کو لکھنو میں خبریں بھیجنے لگے۔ یہ ان کی صحافتی زندگی کی ابتدا تھی...... منشی احمد علی کسمنڈوی جیسے احباب نے حوصلہ دیا اور رغبت کو بڑھاوا دیا تو عبدالحلیم شرر لکھنے لکھانے کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ گو اس عہد میں سیاست کا محاذ بھی کافی گرم تھا۔ لیکن شرر نے عموماً انشا پردازی کے میلان کے ساتھ ادبی چاشنی سے بھرپور اسلوب میں مضامین لکھنے کی طرف خاص توجہ دی۔ اس روش نے اپنی منفرد دلکشی کی وجہ سے بہت جلد انہیں صحافتی حلقوں میں ایک جانے پہچانے نام کے طور پر متعارف کرا دیا۔ اسی سے متاثر ہو کر اس وقت کے نامی گرامی پبلشر منشی نول کشور نے انہیں اودھ اخبار کے ادارتی عملے میں شامل کر لیا۔ یہ جہاں ایک اعزاز تھا وہاں شرر کی صحافتی تربیت کا آغاز بھی تھا چونکہ جوانی کا زمانہ تھا طبیعت میں ذوق وشوق بھی فراواں تھا۔ کچھ ماحول بھی سازگار تھا اور مضمون کی صنف نے ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر کے ادبی منظر نامے کو پوری طرح اپنی گرفت میں بھی لیا ہوا تھا۔ شرر نے ان سازگاریوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہی وہ تجربات تھے جنہوں نے آگے چل کر ''دل گداز'' کے معاملے میں انہیں کافی فائدہ پہنچایا۔[۳۹]

اس سے بھی ثابت ہوا کہ قیام کلکتہ کے دوران شرر نے صحافت نگاری شروع کی اس لیے کہ یہاں کا ماحول سازگار تھا۔ پہلے پہل وہ صرف خبریں لکھا کرتے تھے بعد ازاں انہوں نے مضامین لکھنے شروع کیے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں مختلف قسم کے موضوعات کو شامل کیا اور اپنے دور ہی کی نہیں بلکہ مسلمانان عالم کی تاریخ وتہذیب و ثقافت کو اپنے مضامین میں اجاگر کیا۔ یہ اودھ اخبار کی ادارت ہی تھی جس نے شرر سے کئی رسائل واخبارات شائع کروائے۔ انہی تجربات سے گزر کر انہوں نے اپنا شہرہ آفاق ''دلگداز'' شائع کیا تھا جس نے ادب کی دنیا میں نہ صرف ہل چل مچا دی تھی بلکہ ادب اور سماج کی خدمت بھی بہت کی۔ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز بطور صحافی کیا تھا اس ضمن میں غضنفر امر ہوی بھی لکھتے ہیں کہ: ''شرر نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا''۔[۴۰]

شرر کی صحافت نے ملک وادب دونوں کی گراں بہا خدمت کی۔ صحافت کا تعلق صرف اس عہد کے انسان سے ہی نہیں ہوتا بلکہ ادب اور اس کے سماج کے ساتھ بھی اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ صحافت اور ادب کا گہرا رشتہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شہناز انجم رقمطراز ہیں:

صحافت کا تعلق صرف انسان سے ہی نہیں اس کے ادب اور اس کے سماج سے بھی بہت گہرا ہے اور سماج کے قدیمی ارتقاء اور ادب کی ترویج کے ساتھ صحافت نے بھی قدیمی مدارج طے کیے ہیں۔ اس نے سماج اور ادب میں ہونے والی تبدیلیوں سے تاثر بھی لیا ہے اور اس نے ان حالات و کوائف کی ترجمانی بھی بھرپور انداز میں کی ہے۔[۴۱]

مولانا کے جو مضامین ''اودھ اخبار'' میں چھپتے وہ بہت ہی اچھے ہوتے تھے۔ انہی مضامین میں سے ایک مضمون ''روح'' کے عنوان سے بھی لکھا جو کہ ایک محققانہ مضمون تھا۔ سرسید احمد خان نے جب یہ مضمون پڑھا تو انہیں اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے منشی نولکشور کو ایک خط لکھا کہ وہ اودھ اخبار میں روح پر جو مضمون چھپا ہے بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ میں اس سے چند خیالات کو اپنی تفسیر میں لینا چاہتا ہوں۔ لہٰذا ان صاحب سے جن کا وہ مضمون ہو مجھے اخذ کرنے کی اجازت دلوا دیجئے'' منشی نولکشور نے مولانا سے دریافت کر کے سید صاحب کو ان کی خواہش کے مطابق اجازت دے دی۔[۴۲] اودھ اخبار ایک نامی گرامی اخبار تھا۔ یہ اخبار تقریباً نوے سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار سے بڑے بڑے ادیب اور انشا پرداز منسلک تھے۔ یہ ایک غیر فرقہ وارانہ اور مسلمانوں کا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ایس ایم معین قریشی لکھتے ہیں:

...... یہ اخبار نوے سال تک شائع ہوا۔ یہ ایک غیر جانبدار فرقہ وارانہ اخبار تھا بلکہ ظاہری طور پر مسلمانوں کا اخبار لگتا تھا۔ اس اخبار سے بڑے بڑے ادیب اور انشا پرداز وابستہ رہے ...... کچھ عرصہ مولانا عبدالحلیم شرر بھی اس کے مدیر معاون رہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک معیاری اخبار تھا۔ اس کی خبریں، مضامین، مقالے، تبصرے، ترجمے، اداریے غرض ہر چیز متاثر کن تھی۔[۴۳]

شرر کے ان مضامین کی وجہ سے اس وقت اودھ اخبار کو جو شہرت ملی وہ کسی اور اخبار کے حصہ میں نہ آئی۔ اودھ اخبار سے کئی ایڈیٹر وابستہ تھے۔ سرشار نے بھی اس اخبار کے لیے اداریے لکھے تھے اور وہ بھی اس کے ایڈیٹر تھے۔ فیروز مکرجی کے بقول: ''اودھ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر ۱۰ اگست ۱۸۷۸ء کو ہوا تھا''۔[۴۴] پروفیسر محمود بریلوی کا خیال ہے کہ: ''اس اخبار نے بہت سے اہل قلم کو شہرت کی معراج تک پہنچایا۔ اسی اخبار کے ذریعہ سے سرشار اور شرر بھی مقبول عام ہوئے تھے......''[۴۵] اس ضمن میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی لکھتے ہیں:

اس اخبار کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ ملک کے بعض قابل اور نامور اہل قلم اس اخبار کی ادارت کرتے رہے مثلاً مولوی غلام محمد تپش تلمیذ غالبؔ، مولوی سید امجد علی اشہری، پنڈت رتن

> ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، منشی نوتب رائے نظر، مرزا حیرت دہلوی، جالب دہلوی، مرزا یاس عظیم آبادی، شوکت صاحب تھانوی، مرزا محمد عسکری اور مسٹر پیارے لال شاکر ...... اودھ اخبار اپنے سنجیدہ سیاسی، علمی و ادبی مضامین کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور اس نے طویل عمر پائی۔ اردو کے اخباروں میں شاید ہی کوئی اخبار اس عمر کو پہنچا ہو۔[۴۶]

اودھ اخبار ہی کے طفیل شرر نے اپنے مضامین قارئین تک پہنچائے۔ اس ضمن میں غضنفر امروہوی کی رائے ملاحظہ کیجئے: ''......اودھ اخبار کے عملہ ادارت میں شریک ہو کر علمی، خیالی اور فلسفیانہ مضامین لکھے۔''[۴۷] شرر نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ خدمات صحافت ادا کیں کہ آج تک تاریخ میں زندہ ہیں، ان کے مضامین جو اودھ اخبار میں چھپتے تھے ان کے بلند مقام صحافت و ادب کی دلیل ہیں، شرر کے مضامین میں جو کچھ بیان ہوتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا کہ چاہے کتنا ہی وقت کیوں نہ گزر جائے ان کی تاثیر میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ وہ اس دور میں بھی اہمیت کے حامل تھے اور آج کے دور میں بھی۔ ''۱۸۸۲ء میں شرر نے اودھ اخبار کی ملازمت ترک کر دی وجہ یہ تھی کہ انہیں اخبار کی طرف سے خصوصی نامہ نگار بنا کر بھیجا گیا تھا۔ انہیں وہاں رہنا پسند نہ تھا۔ اس لیے نوکری چھوڑ کر لکھنو آ گئے''۔[۴۸]

ان کا تعلق اگرچہ اب اس اخبار سے نہ تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی صحافتی تربیت اسی اخبار نے کی۔ اسی نے ان کو لکھنے کی ترغیب دلائی۔ یہی وہ اخبار تھا جس نے شرر کے مضامین کو شائع کر کے ان کو بڑا مضمون نگار ثابت کیا۔ اسی اخبار سے شرر ادبی اور صحافتی دنیا میں پہنچانے جانے لگے تھے۔

''ہزار داستان'' نامی اخبار کی ادارت کے لیے بھی شرر کو آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے مالک نے شرر سے کہا کہ وہ ''اودھ اخبار'' سے قطع تعلق کر کے ان کی اخبار سنبھالیں۔ غضنفر امروہوی لکھتے ہیں:

> ......اخبار ''ہزار داستان'' کے مالک نے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ لکھنو جا کر ''اودھ اخبار'' سے قطع تعلق کر کے حیدر آباد واپس آ کر ''ہزار داستان'' کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لیں مگر لکھنو پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ''ہزار داستان'' بند ہو گیا......۔[۴۹]

شرر نے ''اودھ پنچ'' میں بھی مضامین لکھے تھے یہ اپنے زمانے کا ایک بہترین مزاحیہ اخبار تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ یہ وہ اخبار ہے جس نے ہونہار اہل قلم دریافت کیے تھے۔ اس کے مضمون نگاروں کے بارے میں پروفیسر محمود بریلوی لکھتے ہیں:

> ۱۸۷۶۔۷۷ء میں اردو کے ۴۵ نئے جرائد جاری ہوئے۔ لیکن ان میں مشہور ترین ''اودھ

پنچ'' لکھنو تھا جس کے مدیر منشی سید سجاد حسین تھے اور جس کے مضمون نگاروں میں ایسے معروف اہل قلم تھے جیسے کہ عبد الغفور شہباز پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر اور اکبر آلہ آبادی وغیرہ......۵۰

یہ پرچہ اپنے عہد کا پہلا اور معروف پرچہ تھا۔ اس کی تقلید میں کئی ایک ظریفانہ اخبار نکلے لیکن کسی ایک کو بھی شہرت نہ مل سکی اور زمانے کی ٹھوکروں کے بعد بند ہو گئے یہ واحد پرچہ تھا جس کا جادو اردو زبان پر عرصے تک چلتا رہا۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو ''اودھ پنچ'' کے قلم کاروں کے ہاتھ سے بچا ہوا اس کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ساتھ ساتھ ''اودھ پنچ'' نے شاعری اور صحت زبان کے متعلق بھی زبردست مباحثے چھیڑے تھے جو مہینوں اور برسوں تک قائم رہے اور ان کی وجہ سے اردو دان سوسائٹی میں چہل پہل رہی۔ اس کے آخری مباحثے کے ضمن میں مضامین چکبست میں لکھا ہے کہ:

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنو کے مشہور افسانہ نویس مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شائع کیے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے۔ نسیم کا نام محض فرضی ہے اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان اور محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارے کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں ہوش پر آ گئیں اور اودھ پنچ کی بجھتی ہوئی آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہنچی۔ گلزار نسیم کا مقصد تو درکنار رہا مولانا شرر کی زبان دانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے اور عرصہ تک نظم ونثر کی پھلجھڑیاں چھوٹا کیں......۵۱

شرر نے چکبست پر تنقید کی اور ان کی ایڈٹ کی ہوئی مثنوی پر اعتراضات کیے تو منشی سجاد حسین کو یہ بات بہت ناگوار خاطر ہوئی اور انہوں نے دنیائے تنقید میں ہنگامہ برپا کرنے کے لیے شرر کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ شرر ''دلگداز'' میں ان اعتراضات کا جواب دیا کرتے تھے۔ آج بھی تاریخ ادب اردو میں ''معرکہ شرر و چکبست'' کی یاد محفوظ ہے۔ نادم سیتاپوری اپنے مضمون ''اودھ پنچ'' میں لکھتے ہیں: ''ہندوستانی صحافت میں طنز ومزاح کا صحت مند دور اور شائستہ ماحول کو منشی سجاد حسین مرحوم کے ''اودھ پنچ'' (اجراء جنوری ۱۸۷۷ء) ہی نے پیدا کیا۔''۵۲ ''اودھ پنچ'' کی تنقید کے ضمن میں ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی رقمطراز ہیں:

چکبست نے دیا شنکر کی مثنوی ایڈٹ کی تو شرر نے اس پر تنقید کر دی۔ شرر کی تنقید میں عصبیت تھی کیونکہ ایک ہندو کی مثنوی کو ہندو نے مرتب کیا تھا۔ شرر کی تنقید منشی سجاد حسین کو ناگوار گزری پھر کیا تھا منشی سجاد حسین اور ان کا ادارہ اودھ پنچ شرر کے پیچھے پڑ گیا ...... اور دنیائے تنقید میں ایک ہنگامہ برپا رہا...... اس زمانے کے اودھ پنچ اور دلگداز (ایڈیٹر عبدالحلیم شرر) کے فائل دیکھنے کے قابل ہیں اور اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں جو تنقید کے نقطہ نظر سے اہم ہیں۔[۵۴]

ج۔ شرر کے اخبارات و رسائل کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

عبدالحلیم شرر نے صحافتی زندگی کو کس طرح شروع کیا اور اخبارات و رسائل کس وجہ سے شائع کیے؟ اگر ان سوالات پر ہم غور کریں تو اس دور کا پورا منظر نامہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس دور کے جو حالات و واقعات تھے ان کا تقاضا تھا کہ ملک و قوم کی حالت سنوارنے کے لیے صحافی اپنا کردار ادا کریں۔ شرر بھی اسی نکتۂ نظر کے حامی نظر آتے ہیں جب وہ یہ لکھتے ہیں: ''اخبار اس امید سے اپنا پورا زور قلم صرف کیے دیتے ہیں کہ کچھ تو ملک کی حالت سنبھلے گی۔'' [۵۴] اس جملے سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شرر کا نظریہ صحافت کیا تھا اور اخبارات و رسائل کی اہمیت و افادیت ان کے نزدیک کیا تھی؟ انہوں نے کئی ایک رسائل و اخبارات شائع کیے۔ ان میں کچھ نے تو طویل عمر پائی اور کچھ تھوڑی دیر جاری رہنے کے بعد بند ہو گئے۔ لیکن جتنے بھی اخبارات و رسائل شرر نے شائع کیے وہ جہاں اپنے عہد کے ترجمان ثابت ہوئے وہاں ادب کی بھی بہت خدمت کی۔ مولانا نے نہ صرف ''دلگداز'' ہی نکالا اور کامیاب رہے بلکہ ان کے اور صحافتی کارنامے بھی ایسے ہیں کہ جو تاریخ ادب میں بلند مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی تھے جنھوں نے محشر، دلگداز، مہذب، پردہ عصمت، الفرقان، دل افروز، ظریف اور مورخ وغیرہ جاری کیے۔

مختلف لوگوں کی آراء مختلف ہیں بعض ان کے چند ایک رسائل کا ذکر کرتے ہیں اور بعض ایک سے زائد رسالوں کا بھی نام لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف لوگوں نے ان کے رسائل و اخبارات کے ضمن میں کیا آراء پیش کیں ہیں تا کہ ہم ثابت کر سکیں کہ شرر نے کون کون سے رسائل و اخبارات شائع کیے تھے جو اپنے دور میں معروف و مشہور ہوئے تھے اور ان کی شہرت کے کیا اسباب تھے؟ پروفیسر اولیس احمد ادیب کا خیال ہے: ''محشر (ہفتہ وار)، دلگداز (ماہوار)، مہذب (ہفتہ وار)، پردہ عصمت (پندرہ روزہ)، الفرقان، دل افروز، ظریف ہفتہ وار تھے اور مورخ بھی جاری کیا''۔ [۵۵] آغا محمد باقر کا خیال ہے: ''مولانا شرر نے تقریباً آٹھ نو رسالے اور اخبار نکالے۔'' [۵۶] پروفیسر جعفر رضا شرر کے دیگر رسائل کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مہذب کے علاوہ شرر نے ظریف، دل افروز، مورخ وغیرہ بھی جاری کیے۔ جو تھوڑی تھوڑی دیر تک جگنو کی طرح چمک کر بجھ گئے۔'' [۵۷] علامہ سید سلیمان ندوی نے شرر کے تین رسائل کا ذکر کیا ہے۔

> دلگداز کے علاوہ تین اور رسالے بھی اپنے نام سے نکالے ہیں۔ موجودہ پردہ کے خلاف پردہ عصمت انہوں نے نکالا سب سے پہلے انہیں نے مسلمانوں میں ہندو مسلم اتحاد کی باقاعدۂ تحریک پیدا کی اور اس کے لیے اتحاد نکالا۔ کچھ دنوں کے لیے تصوف کا بھی ایک رسالہ نکالا تھا...... مہذب نام ایک اور صحیفہ نکالا تھا۔ بہر حال وہ جو کچھ تھے ہماری زبان کے

نامور مصنف، ہندوستان کا فخر اور لکھنو کی آبرو تھے۔[۵۸]

شرر کی صحافتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں:

مولانا علمی خدمت کے اس قدر حریص تھے کہ ان کا مدِ مقابل آج ایک متنفس بھی نظر نہیں آتا۔ ستر برس کی عمر ہوئی پچپن برس تک زبان اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ اودھ اخبار، روزانہ اخبار صحیفہ نامی ہمدرد میں کام کیا۔محشر، مہذب، دلگداز، اتحاد، پردہ عصمت، العرفان، ان سب رسالوں میں مضمون لکھے۔ ان میں ۴۶ برس تک دلگداز کو جاری کیا۔[۵۹]

رام بابو سکسینہ نے ''تاریخ ادب اردو'' میں اخبارات و رسائل کی فہرست یہ دی ہے:

اخبارات و رسائل

۱۔	محشر	ہفتہ وار	۸۱ء، ۱۸۸۲ء
۲۔	دلگداز	ماہوار	۱۸۸۷ء
۳۔	مہذب	ہفتہ وار	
۴۔	پردہ عصمت	پندرہ روزہ	
۵۔	اتحاد	پندرہ روزہ	
۶۔	العرفان	ماہوار	
۷۔	دل افروز	ماہوارز	
۸۔	ظریف	ہفتہ وار	

آخر میں چند سال ہوئے ایک ماہوار پرچہ ''مورخ'' کے نام سے بھی نکالا تھا۔[۶۱]

بقول عزیز ملک:

۱۸۸۱ء میں ''محشر'' کے نام سے اپنا ذاتی ہفت روزہ جاری کیا۔ اس کے بعد ''مہذب''، ''ظریف''، ''پردہ عصمت'' اور ''اتحاد'' نکالے۔ مولانا شرر نے چار ماہوار مجلّے بھی جاری کیے جن کے نام یہ ہیں: دلگداز، العرفان، دل افروز اور مورخ۔[۶۱]

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۶ء تک کا دور شرر کی تصنیفی زندگی کا اہم دور ہے۔ ان کی تصنیفی زندگی کے بارے میں جاوید اختر بھٹی رقمطراز ہیں:

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۶ء کا دوران کی تصنیفی زندگی کا بھرپور زمانہ ہے۔ ''دلگداز'' اور کچھ دوسرے رسائل مثلاً ''العرفان''، ''مورخ'' اور ''دل افروز'' وغیرہ نکالتے رہے ...... بڑی بھرپور ادبی اور صحافتی زندگی گزاری۔[۶۲]

عبدالحلیم شرر نے نہ صرف خود مختلف اخبارات اور رسائل شائع کیے بلکہ انہوں نے مختلف اخبارات و رسائل میں بھی لکھا۔ جس کے متعلق خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھتے ہیں:

......مولانا نے مختلف اخبارات میں بمعاوضہ کام کیا اور روزانہ اخبار میں جو انوار محمدی پریس سے منشی محمد رفیع بہادر کے اہتمام سے نکلتا تھا۔ کچھ مضامین لکھے۔ ''صحیفہ نامی'' اخبار جو مطبع نامی لکھنو سے نکلتا تھا اس میں بھی کچھ کام کیا۔[۶۳]

ثابت ہوا کہ انہوں نے نہ صرف اودھ اخبار، ہمدرد اور ہزار داستان کی ارادت کی ذمہ داریوں کو قبول کیا بلکہ درج بالا اخبارات میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔

ہفتہ وار رسالہ محشر

اس رسالے پر نام تو مولوی محمد عبدالباسط کا ہوتا تھا۔ لیکن تمام تر مضامین شرر لکھتے تھے

......انہوں نے ایک ہفتہ وار رسالہ ''محشر'' کے نام سے نکالا۔ اگر چہ اس پر نام تو مولوی محمد عبدالباسط صاحب کا ہوتا تھا مگر تمام مضامین شرر کی تراوش قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ''محشر'' رنگین اور شاعرانہ مذاق کا پرچہ تھا۔ اردو میں یہ نیا اور اچھوتا رنگ تھا اس لیے سب لوگوں نے عموماً اور انگریزی خوان نے خصوصاً ان مضامین کو پسند کیا۔[۶۴]

اس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش تھا کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اٹھارہ انیس نمبروں میں محض صبح کا سماں دکھایا گیا تھا۔ اس میں فارسی کی تشبیہیں اور استعارے تھے لیکن بندشیں انگریزی تھیں۔ انہوں نے قافیہ بندی، رعایت لفظی اور جابجا اشعار چسپاں کرنے سے بھی پرہیز کیا۔ شروع میں اس طرزِ عبارت کو بنانے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ تھوڑی مدت میں ان کی عبارت نے ایک خاص طرز اختیار کر لی اور یہ طرز ایسی مقبول ہوئی کہ ساری اخباری دنیا پر چھا گئی۔ شرر کے وہ مضامین جو اودھ اور محشر میں نکلے دستیاب نہیں ہوئے۔ ورنہ ان کی بہت زیادہ قدر ہوتی۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں: ''ان کے اسلوب نگارش کی وجہ سے ''محشر'' تھوڑے ہی عرصہ میں بے حد مقبول ہوا''۔[۴۵] اس رسالے کے بارے میں حکیم برہم اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> محشر عجیب نئے رنگین شاعرانہ مذاق کا پرچہ تھا۔ جس میں بہت ہی نازک قسم کی خیال آرائیاں ہوتیں اور ہر چیز کے سین رندانہ مشربی کے عجیب پرلطف مذاق میں کھینچے جاتے ایک زمانہ تک اس میں 'زمانہ کا جائزہ' کے عنوان سے ایک نرالے مضمون کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کا ہر نمبر ایک نئی اور نئے رنگ کی صبح سے شروع ہوتا۔ محشر کے مضامین اور خاصۃً ان صحبتوں کا غلغلہ سارے ہندوستان میں بلند ہوا اور ہر طرف سے تحسین و مرحبا کے شور میں یہ کلمات سنے جا رہے تھے کہ یہ انشا پردازی نہیں سحر کاری معجز نگاری ہے۔ اردو میں یہ بالکل نیا اور اچھوتا رنگ تھا اور وہ شاعرانہ طبیعتیں جو انگریزی مذاق سخن سے نئی نئی آشنا ہونے لگی تھیں ان کو اس قدر بھلا معلوم ہوا کہ جابجا لوگوں نے اس رنگ کو اختیار کر لیا اور ہندوستان کا سارا لٹریچر مولانا ہی کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ اسی زمانے میں رفیق ہند لاہور نیا نیا نکلا تھا اور بڑے زور کا پرچہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس میں ... رجب علی صاحب راجہ بلی کے نام سے اکثر مضامین لکھتے تھے۔ راجہ بلی نے ایک بار لکھا کہ جو رنگ محشر کا ہے صرف شاعری اور عاشقی کی دنیا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر ایڈیٹر محشر کو دعویٰ ہے تو ان دو چار سبجیکٹوں پر اسی رنگ میں مضامین لکھیں جو ہم بتاتے ہیں اور انہوں نے چند سبجیکٹ بھی شائع کیے۔ جن میں ایک تو ''روح'' تھا۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے لیے استمراری بندوبست مناسب ہے یا میعادی'' اور اسی قسم کے اور بھی سبجیکٹ تھے۔ مولانا نے ان سب سبجیکٹوں پر اپنے اسی رنگ میں نہایت پرزور مضامین لکھ کے محشر میں شائع کیے جن کو دیکھ کر لوگ ہر طرف عش عش کرنے لگے اور راجہ بلی صاحب سے سوا اس کے کہ خاموشی سے قبول کر لیں اور کچھ بنائے نہ بنی۔ یہ عجب با مذاق اور پرلطف پرچہ تھا اور سچ یہ ہے کہ جو مذاق بعد پیدا ہونے والا تھا اس کی بنیاد پہلے پہل اسی نے ڈالی اور ہر جگہ کے صاحبان

ذوق کوشش کرنے لگے کہ اسی رنگ میں مضامین لکھا کریں ۔[۶۶]

محشر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار رام بابو سکسینہ نے یوں کیا:

جس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش اور دلفریب تھا کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اس میں اٹھارہ انیس نمبروں میں انھوں نے مسلسل صبح کا سماں دکھایا تھا۔ جس نے تمام صاحب ذوق لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ رنگ اردو میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس میں فارسی کے تشبیہات و استعارات تھے مگر بندشیں انگریزی تھیں ۔ گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی و اردو کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اسی ضرورت سے قافیہ بندی اور رعایت لفظی بالکل چھوڑ دی اور اس سے بہت پرہیز کیا کہ نثر میں جابجا اشعار شامل کیے جائیں ...... یہی طرز عبارت آج ساری اردو انشا پردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ اسی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا بے انتہا گرویدہ ہو گیا اور فوراً اس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ شرر کے وہ اودھ اور محشر کے مضامین کسی نے علیحدہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوئے ورنہ شاید اب ہندوستان بہ نسبت سابق کے ان کی زیادہ قدر کرتا ۔[۶۷]

ثابت ہوا شرر نے جو رنگ عبارت اختیار کیا وہ بہت مشہور ہوا اور وہی رنگ عبارت ہے جو آج اردو انشا پردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے، اگر اصل پرچے دستیاب ہوتے یا وہ مضامین جو ''اودھ اخبار'' اور ''محشر'' میں شرر نے لکھے تھے وہ ملتے تو آج ان کا مقام و مرتبہ اور زیادہ ہوتا ۔

اخبار مہذب کے اجراء کے محرکات اور اغراض و مقاصد

دنیا کی تمام طاقتیں اس کوشش میں مصروف کار تھیں کہ مسلمانوں کا نام ونشان اس سرزمین سے مٹ جائے اور ان کے سیاسی وتمدنی اقتدار کا شیرازہ بکھر جائے ۔ انیسویں اور بیسوی صدی کے اختتام اور آغاز پر مسلمانوں کے احیاء کی پہلی کوشش سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کی ۔ عبدالحلیم شرر نے بھی مسلمانوں کی بیداری کو فریضہ سمجھ کر اپنے ہفت روزہ اخبار ''مہذب'' کو جاری کیا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عفیرہ حامد لکھتی ہیں:

عبدالحلیم شرر نے جب مسلمانان ہند کی زبوں حالی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ تو وہ بھی ایک نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ اس میدان کارزار میں کود پڑے۔ اس وقت کے سیاسی حالات و واقعات سے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی جو شمع روشن ہو چکی تھی

اس کی روشنی کو صحافت کے ذریعے سے پھیلایا اور عبدالحلیم شرر نے اپنی صحافت کے ذریعے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے تصور کو اجاگر کیا۔ انھوں نے ۱۸۹۰ء میں لکھنو سے ایک ہفت روزہ اخبار ''مہذب'' جاری کیا۔ اس پرچے کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کو ایک ایسے تصور سے روشناس کرانے کی کوشش کی جسے ہم تصور پاکستان کا ابتدائی خاکہ قرار دے سکتے ہیں۔ شرر نے اس وقت کے سیاسی حالات کی نبض پر ماہرانہ انداز میں انگلیاں رکھیں اور مسلمانوں کی سیاسی وسماجی اور معاشی واخلاقی ترقی وخوشحالی کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔[۶۸]

عبدالحلیم شرر نے یہ اخبار کس ایما پر نکالا اور اس کا محرک کیا تھا؟ اس بارے میں عزیز ملک لکھتے ہیں:

یکم اگست ۱۸۹۰ء کو مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک ہفت روزہ ''مہذب'' نکالا۔ مہذب نام سے ذہن خود بخود سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ غالباً ''تہذیب الاخلاق'' کی ہردلعزیزی اور قومی خدمات کو دیکھ کر مولانا شرر کو انہی اصولوں کے مطابق یہ پرچہ نکالنے کا خیال آیا ہوگا۔ اس پرچہ میں بیشتر مضامین مشاہیر سلف کے تذکروں سے متعلق ہوا کرتے۔[۶۹]

ہفت روزہ ''مہذب'' کی اشاعت سے ان کے پیش نظر خاص مقاصد تھے۔ جن میں ملکی اور غیر ملکی خبروں اوران پر تبصروں کے علاوہ مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور دینی امور پر راہنمائی اولیت رکھتی ہے۔ مولانا شرر اپنی تاریخی بصیرت کی وجہ سے اہل ادب میں اسلام اور اسلامی روایات کے شیدائی کی حیثیت سے پہلے ہی متعارف تھے۔ ''مہذب'' کے صفحات پر انہوں نے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔

مہذب کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ

''مہذب''، میں شرر نے معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالی جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

بعض معاشرتی مسائل پر بھی مواد ملتا ہے جو چند پرچے میرے پیش نظر ہیں ان میں پردے کے مسئلے پر بڑے زوروشور سے لکھا گیا ہے۔ یہ معاملہ یوں شروع ہوا کہ حیدرآباد دکن میں کسی غریب نے کہہ دیا کہ عورتوں کو تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ برقعے سے کنارہ کشی کی جائے۔ اس پر مولانا شرر کا قلم حرکت میں آیا اور اس نے پہلے ہلے میں سرسید احمد

خان کو لپیٹ میں لے لیا فرمانے لگے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاقی ریفامر جناب سرسید احمد خان بہادر کی تحقیق کے مطابق پردہ شاید صرف ستر عورت کا نام ہے کیوں کہ ان کے اس آخر زمانے کے اجتہاد میں منہ اور ہاتھ پردے میں شامل نہیں ہیں مگر میں کیا کروں کہ عام مسلمانوں کی طرح میرا خیال بھی اس کی تقلید سے انکار کرتا ہے۔

''سرمورگزٹ'' کے مدیر منشی محمد سراج الدین صاحب نے جھٹ سرسید کے نام خط میں لکھ کر شرر کے الزام کا جواب مانگا اس پر سرسید نے یہ چھٹی لکھی:

مخدومی بے شک میں پردے کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد دین ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہونچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ میں فقہائے متاخرین نے بہ سبب فسادات زمانہ منہ کو پردے میں داخل کیا ہے۔مولوی شرر نے ایک لغو بات میری بابت لکھ دی شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہوگا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردے میں داخل نہیں ہیں۔ ان کو چاہیے کہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں۔والسلام

علی گڑھ خاکسار سید احمد

۱۷ اگست ۹۰ء

اس کے جواب میں شرر نے پہلے تو اطمینان کا اظہار کیا کہ سید صاحب کے بارے میں جو خیالات تھے وہ غلط ثابت ہوئے۔ پھر لکھا:

مگر ہاں گفتگو اس میں ہے کہ ہم نے لغو بات کہی، بے شک سید صاحب ایسے بزرگ کے سامنے ہماری سب باتیں لغو ہیں مگر ایسی لغو ہیں کہ سید صاحب خود اعتراف کر رہے ہیں کہ شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہوگا۔[۷۰]

انہوں نے جو مضامین ''مہذب'' میں شائع کیے ان میں سے ایک صحافت کے متعلق بھی ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> بعض مضامین سے اس زمانے کی صحافت کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ۸ اکتوبر کے شمارے میں ''ہندوستانی خریدار ان اخبار'' کے عنوان سے ایک مفصل مضمون میں بتایا گیا ہے کہ شاذونادر ہی کوئی ایسا ایڈیٹر ہوگا جسے اخبار نویسی کے اصول سے واقفیت ہو۔ زیادہ تر اخبار ان لوگوں نے نکال رکھے ہیں جو کثیر الاحباب ہیں۔ انہوں نے اخبار کو چندہ بٹورنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ان کے اخبار عام طور پر بند ہی پڑے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنی کسی قسم کی تجارت کے اشتہار چھاپنے کے لیے اخبار جاری کر رکھے ہیں۔ انھیں ایڈیٹروں کی ضرورتوں سے کوئی واقفیت نہیں۔ جو پرچے تبادلے میں آتے ہیں انھی سے مضمون کاٹ چھانٹ کر چھاپ دیتے ہیں۔ صرف چند اخبار ملک میں نظر آتے ہیں جو لائق لوگوں کے ہاتھ میں ہیں اور کسی نہ کسی قدر اپنے فرائض منصبی کو پورا کرتے ہیں......اس مضمون میں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اخبارات کے بارے میں لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ان میں سچی بات لکھی ہی نہیں جاتی۔[۱]

اس اقتباس سے واضح ہوا کہ اپنے عہد کے صحافیوں اور اخبارات کے متعلق شرر کے کیا خیالات تھے؟ اپنے دور کی صحافت کو وہ کس زاویے سے دیکھتے تھے؟ ۸ دسمبر کے شمارے میں ایک مضمون موجود ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں: ''۸ دسمبر کے شمارے میں فن تنقید پر ایک مقالے کی پہلی قسط چھاپی گئی۔ بر سبیل تذکرہ عرض ہے۔ Criticism کا ترجمہ ''نکتہ چینی'' کیا گیا ہے۔''[۲] اس اخبار میں جو مضامین شرر کے قلم سے نکل کر شائع ہوتے انہوں نے اردو ادب میں جہاں بلند مقام حاصل کیا وہاں اپنی قوم کو بیدار بھی کیا۔ ہندو اور مسلم کے الگ الگ قوم ہونے کے تصور کو بھی ابھارا۔ ایک مضمون بعنوان ''ہندو مسلمان'' شرر نے لکھا اس میں اپنا نکتہ نظر یوں بیان کرتے ہیں۔

> ......ہم کو اصل مسئلہ سے بحث نہیں اس لیے کہ شاید ہندو ناراض ہوں گے کہ ہمارے خلاف یک طرفہ ڈگری دی گئی اور بے شک اگر ان کے مذہب نے ان کو اس قدر مجبور کیا ہے کہ کوئی اپنے گھر میں چھپا کر گائے کی قربانی کرے تو یہی وہ قانون کو چیر پھاڑ کے اور پاؤں سے روند کر گھروں میں گھس کے اس کا سدباب کریں تو ہمیں کوئی عذر نہیں بلکہ اگر وہ دنیا بھر سے گاؤ کشی موقوف کرانے کی کوشش کریں تو ہماری زبان سے کوئی خلاف کلمہ نہ نکلے گا۔ لیکن اس قسم کی کارروائی کہ وہ قدیم آٹھ سو برس کے تعلقات جو ہندو مسلمانوں میں نسلاً بعد نسل چلے آتے ہیں۔ توڑے جائیں کیوں کر جائز تسلیم کی جاسکتی ہے۔ ہمارے خیال

میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین شکنی کیے نہیں پوری ہوتیں اور نہ صبر وتحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی آبادی علیحدہ کر لیں کیونکہ ہندوؤں کا یہ اتفاق در پردہ اسی کو چاہتا ہے کہ اب وہ مسلمانوں کو اپنے پڑوس میں نہ رہنے دیں گے۔[۴۳]

درج بالا اقتباس میں شرر نے ہندوستان کی تقسیم کا نظریہ مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے مذہبی تعصب کو بنیاد بنا کر گاؤکشی کے جس مسئلے کی بنا پر نظریہ پیش کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جو متحدہ ہندوستان میں کسی صورت میں بھی اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ گاؤکشی کی مذہبی رسومات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی جو کسی صورت ختم نہ ہوئی تھی اور دونوں فریق اس بات پر آمادہ نہ ہوتے تھے کہ وہ کسی ایک کی غلطی کو درگزر کر دیں اور شرر نے اس کی اہم وجہ یہ بتائی ہے۔ ہندو قوم متعصب ہے ان کے اس تعصب نے مسلمانوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ الگ وطن کے حصول کے لیے جدوجہد کریں۔ اس ہفت روزہ کے ذریعے سے شرر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمایاں فرق کو واضح کیا اور یہ ثابت کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت، اخلاقیات، معاشرت، معاشیات، مذہب اور رسم و رواج الگ ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے ہفت روزہ ''مہذب'' کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں کے طرزِ حیات میں جو نمایاں فرق موجود تھے ان کی شکلوں کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جو کبھی اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی معاشرت، اخلاقیات، معاشیات، رسم و رواج، مذہب، تہذیب وتمدن اور ثقافت گویا کہ ان کا تمام تر نظامِ حیات ہندو قوم سے یکسر مختلف ہے۔ ''مہذب'' نے مسلمانوں کو ایک الگ قوم کا درجہ دینے کے لیے کئی شذرات شائع کیے اور لوگوں میں اس حقیقت کو عیاں کیا کہ ہندو مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔

عبدالحلیم شرر کے زمانے میں ہندو مسلم فسادات بہت ہوتے تھے۔ جن کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شرر نے ''مہذب'' کے صفحات پر اس کے بارے میں اپنے خیالات کا موثر انداز سے اظہار کیا ہے۔ اس کے متعلق عزیز ملک لکھتے ہیں:

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں برصغیر کے بعض شہروں میں ہندو مسلم فسادات کی رو چل پڑی تھی ان کی خبریں محض اخباری اطلاعات تک محدود نہ رہیں بلکہ ان سے مسلمانوں کے باشعور طبقہ میں اندیشہ ہائے دور دراز پیدا ہونے لگے۔ ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کے شمارہ میں مولانا شرر نے ہگلی کے امام باڑہ کے قریب کسی ہندو بابو کے گھڑیال کھڑکانے اور سنگھ بجا کر

اشتعال دلانے کے واقعہ پر کھل کر لکھا ہے۔۔۔۔۔اس سے اگلے شمارہ میں مولانا شرر یہ تک لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ ''جب سے کانگرس کا وجود عمل میں آیا ہے۔ہندو اور مسلم فسادات شروع ہو گئے ہیں اور اس کے بعض ریزولیشن ایسے ہیں جو مسلمانوں کے قومی اغراض کے سخت مخالف ہیں۔ان الفاظ میں ہمیں تحریک پاکستان کے اولین نقوش ملتے ہیں جو آگے چل کر ملک گیر حیثیت میں مستحکم ہو کر ملتِ اسلامیہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئے۔ بلاشبہ ملکی حالات نے جو رخ اختیار کر لیا تھا اس کی وجہ سے اس دور کے دوسرے اخبارات میں بھی اس بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا۔مگر جس انداز سے مولانا شرر نے تقسیم ملک کا ذکر کیا ہے وہ ان کی دور بینی پر دلالت کرتا ہے۔۷۴

شرر نے مہذب کے مضامین میں تقسیم ملک کا جو ذکر کیا ہے اس سے مضمون نگار کی دور رس نگاہ کا ادراک ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید:

ہندو مسلم چپقلش کے بارے میں انھوں نے جو شذرے وقتاً فوقتاً لکھے ان سے اس زمانے کی سیاست کا یہ پہلو قدرے اجاگر ہوتا ہے۔ برعظیم کی اسلامی سیاست کے طالب علم پر یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ دو قومی نظریہ کسی ایک شخص یا ایک جماعت کی ایجاد نہیں تھا۔۷۵

عبدالحلیم شرر نے ''مہذب'' میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے سیاسی اختلافات کی بھی نشاندہی کی اور مسلمانوں کو ان کے ملی تشخص سے بھی روشناس کرایا۔اس سلسلے میں شرر نے ایک مضمون بعنوان ''ہندو مسلمان'' لکھا جو جلد ۱ شمارہ ۳۰ میں موجود ہے۔شرر رقمطراز ہیں:

ہندوستان کی پولیٹکل قوت کا دارومدار بالکل ان دونوں مذکورہ قوموں کے اتفاق پر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت تک متواتر کوششیں کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں ایک مضبوط اور ضروری نیشنلٹی پیدا ہو لیکن تجربہ بتاتا جاتا ہے کہ وہ سب کوششیں خاک میں مل گئیں اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا ہوا۔ بعض لوگ اس خیال میں تھے کہ ہندوستان تعلیم کے اثر سے چند روز بعد ایک نیا پولیٹکل مذہب پیدا کرے گا جس کے آگے ہندوستان پارس اور چینی سب سر اطاعت جھکائیں گے لیکن ان لوگوں نے اپنی تدبیروں میں تھک کر اس مسئلہ کو چھوڑ دیا اور ناامید ہو کے عام پبلک کے غیر مفید جوشوں سے علیحدہ ہو گئے۔۷۶

شرر کے ہفت روزہ ''مہذب'' نے مسلمانانِ ہند کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے درمیان پائے جانے والے

تمام اختلافات کوختم کر دیں اورمتحدہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کریں تا کہ وہ بھی ترقی کر سکیں اور موجودہ صورت حال سے نکل سکیں۔شرر نے متعدد جگہوں پر مسلمان قوم کو ان خطرناک نتائج سے آگاہ کیا جو قومی تفریق کے باعث منظر عام پر آ رہے تھے۔اس ضمن میں انھوں نے اپنے مضمون ''قومی تفریق'' میں لکھا ہے کہ:

......لیکن افسوس کی یہ بات ہے کہ باوجود تمام امیدوں کے پھر بھی ہمیں اتفاق کی صورتیں مشکل نظر آتی ہیں ......قطع نظر اس کے خود انگریزی تعلیم اپنے کورس میں تواریخ کی مختلف اور متضاد خیالات کے ذریعے سے دماغوں میں کچھ ایسا تعصب قومی پیدا کر دیتی ہے کہ جس قدر حصہ دماغ کا اس مذہبی جوش سے خالی ہوتا ہے اس کو قومی یا خونی اور وطن کا جوش بھر دیا کرتا ہے۔......تجربہ ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ جنھوں نے موجودہ مذاق پر تعلیم پائی ہے ہر چھوٹے اختلاف کو جو ہندوستان کی دو قوموں میں کبھی پیدا ہو جاتا ہے اپنی پر جوش تحریروں سے بڑھا دیا کرتے ہیں۔۷۷

اس مضمون میں عبدالحلیم شرر نے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو مسلمانان برصغیر میں نفاق کا باعث بنے۔ انھوں نے خاص طور پر انگریزی نصاب کے حوالے سے لکھا ہے اور ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ تعلیم یافتہ افراد ہر مقام پر اپنی تحریروں کے ذریعے سے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں جس کی بنا پر باہمی تفریق پیدا ہو رہی ہے۔

اس کی اہمیت اور اس کے مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

ماہ نامہ ''دل گداز'' کا ذکر تو ادب کی تاریخ میں نظر آ جاتا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان کے اصلی صحافتی شاہکار ''مہذب'' کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔حالاں کہ پچھلی صدی کے اواخر میں نکلنے والے ہفت روزہ جرائد میں ''مہذب'' ایک نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ وجہ تسمیہ ملاحظہ ہو:

مہذب اپنے نام کے مطابق اپنے اغراض کو نہایت تہذیب کے ساتھ پورا کرے گا۔قدیم شرفا کا برتاؤ جس متانت کا نمونہ ہوتا تھا اس کو ہمارے ہم وطن مہذب کے مضمون اور اس کی رفتار اشاعت سے نمایاں پائیں گے۔شریفوں کی یہ رفتار کہ اپنی عزت کو ہمیشہ سنبھالتے رہیں اور کوئی آوارہ گرد بدمعاش ان پر ہزار حملے کرے مگر وہ اسے خوب صورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ٹال دیا کرتے ہیں۔وہی رفتار مہذب کا دستور العمل ہوگی۔۷۸

شرر کا یہ اخبار یکم اگست ۱۸۹۰ء کو منظر عام پر پہلی بار آیا۔ اپنے نام کی مناسبت سے یہ اخبار شرفا کے برتاؤ کو صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا تھا۔ اس لیے کہ شرفا اپنی عزت کو ہمیشہ سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر چہ ان کی شرافت پر ہزار ہا حملے ہوں لیکن وہ ان حملوں کو اپنے انداز سے ٹالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی روش اس ''مہذب'' کی بھی تھی۔ شرر نے اس کے لیے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید یہ تھی:

پہلے شمارے میں پالیسی ان الفاظ میں واضح کی گئی:

تین ہی اصول ہیں جن پر عام اخبارات کی تحریروں کا شمار ہے۔ پالیٹکس۔ سوسائٹی اور لٹریچر۔ مہذب بھی ان تینوں معاملات میں اپنے ناظرین سے پوری ترقی اور کامیابی کا وعدہ کرتا ہے۔ پالیٹکس کی حیثیت سے وہ اول درجہ کا آزاد ہوگا۔ نہ گورنمنٹ کی دوستی میں ملک کے ساتھ دشمنی کرے گا اور نہ اہل ملک کی دوستی میں گورنمنٹ کا دشمن بن جائے گا۔ دیسی ریاستیں مہذب کو اپنا بہت بڑا خیر اندیش اور دوست پائیں گی۔ سوشل یعنی اخلاقی معاملات میں مہذب رہنمائے ملک بن کے ایک نہایت ہی مہربان اتالیق کی صورت میں ظاہر ہوگا اور اخلاقی دنیا میں موجود ریفارمروں کے ہل چل ڈال دینے سے زلزلے اور طوفان بپا رہا کرتے ہیں ان کو بھی یہ اخبار رفع کرے گا۔ باقی رہا لٹریچر اس حیثیت سے مہذب کے چاہے کتنے وعدے ہوں ملک سب کو تسلیم کرے گا کیوں کہ جن ہاتھوں میں دلگداز ہے انھی ہاتھوں میں یہ اخبار بھی ہے۔[۷۹]

اس اقتباس سے ثابت ہوا کہ یہ رسالہ نہیں بلکہ اخبار تھا اور اس میں پالیٹکس سوسائٹی اور لٹریچر جیسے موضوعات پر بات ہوتی تھی۔ پالیٹکس یعنی سیاسی لحاظ سے یہ اخبار آزاد نہ تھا نہ تو یہ گورنمنٹ کی خوشنودی کے لیے ملک کے ساتھ دشمنی کا رویہ اپناتا اور نہ ہی ملک کی دوستی میں یہ گورنمنٹ کا دشمن بنا۔ بلکہ شرر نے یہ بات بیان کی ہے کہ دیسی ریاستیں اس کو اپنا خیر اندیش اور دوست سمجھیں گی۔ اخلاقی لحاظ سے بھی اس اخبار نے اہم کارنامہ سرانجام دیا اور لٹریچر کے حوالے سے یہ بہت اہم اخبار تھا۔ شرر نے دلگداز کے ساتھ اس کا موازنہ بھی کیا ہے اور اپنے تاریخی ذوق وشوق کی بات بھی کی ہے اور آخر میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی اخبار تاریخی حیثیت سے عمدہ ہونے کی امید رکھ سکتا ہے تو وہ مہذب ہی ہے۔ مہذب کے بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''مہذب'' کا ہر شمارہ... بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے صفحے پر نام کی پٹی کے بعد

مختصر شذرات درج ہیں ایک گوشے میں فہرست مضامین دی ہوئی ہے۔ پہلے شمارے میں مہذب کے عنوان سے اس پرچے کی شان نزول بیان کی گئی ہے جس سے مندرجہ بالا اقتباسات لیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ملک کے ہندو مسلم فساد اور اسلام اور پردہ کے عنوان سے دو مضمون درج ہیں۔ پھر ابواسحاق شیرازی کے حالات زندگی کی پہلی قسط درج ہے اور بعد میں مراسلات اس نوٹ کے ساتھ ''کچھ ضرورت نہیں کہ ایڈیٹر کو بھی ان راؤں سے اتفاق ہو'' اس کے بعد خبریں درج ہیں۔ جو زیادہ تر غیر ممالک کی ہیں۔ آخر میں 'توکل' کے عنوان سے لکھنو کی مقامی خبریں اور موسم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ آخری صفحے پر اشتہار ہیں۔[۸۰]

اس کو کس قدر اہمیت اور قدر و قیمت حاصل تھی اس بارے میں ''حکیم برہم'' کا خیال ملاحظہ کیجئے:

اس کی لکھائی، چھپائی، مضامین اور خبریں سب چیزیں ایک خاص دلچسپی رکھتی تھیں۔ ہر پرچے میں علمائے سلف میں سے کسی کی سوانح عمری بھی لازمی طور پر رہا کرتی تھی۔ جن کا مجموعہ بہت سے لوگوں کے پاس آج بھی مرتب موجود ہے اور جن نگاہوں نے مہذب کو دیکھا ہے آج تک یاد کر رہی ہیں اور اکثر لوگوں کی طرف سے اب بھی دوبارہ مہذب کے شائع ہونے کا تقاضا ہو رہا ہے۔[۸۱]

اس کے پہلے شمارے کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں: ''اس کے پہلے شمارے میں شرر نے مہذب کی پالیسی کی وضاحت کی ہے ان کے صحافتی زاویہ نظر کے مطالعہ میں کلیدی اہمیت دی جاسکتی ہے۔''[۸۲]

اس کی اہمیت و افادیت اور اس کے اندازِ بیان کا اندازہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے اس خیال سے ظاہر ہوتا ہے: ''جو مواد، خیالات اور کتابت کے لحاظ سے ایک اعلیٰ پائے کا اخبار تھا۔ اس کا غالب حصہ اداریوں اور مضامین پر مشتمل ہوتا تھا اور قومی و بین الاقوامی خبریں مختصر انداز میں دی جاتی تھی۔[۸۳]

رام بابو سکسینہ کا خیال ہے: ''مولانا شرر نے ۱۸۹۰ء میں مہذب نام کا ایک اخبار جاری کیا۔ جس میں مسلسل علمائے اسلام کے سوانح عمری ہوا کرتے تھے۔''[۸۴] ''مہذب'' کے ضمن میں جاوید اختر لکھتے ہیں:

......۱۸۹۰ء میں انہوں نے اپنا پریس ''دل گداز'' کے نام سے شروع کیا اور اسی سال ''مہذب'' کے نام سے ایک اور رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے میں مشاہیر اسلام کی زندگی کے حالات بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن رسالہ زیادہ دیر نہ چل سکا اور ایک سال کے اندر اندر بند ہو گیا......۔[۸۵]

شرر کے ہفت روزہ ''مہذب'' کی اہمیت وافادیت اپنے عہد میں بہت زیادہ تھی۔ ایک تو اس کا دائرہ اشاعت بہت وسیع تھا۔ دوسرا اس میں مسلمانوں کے علم وادب، تاریخ، ثقافت اور تہذیبی ورثے سے متعلق مضامین چھپتے تھے۔ نہ صرف ان موضوعات پر بلکہ سیاست اور حالات حاضرہ کے متعلق خبریں بھی شائع ہوتی اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں شرر تنہا ہی لکھتے تھے کوئی ان کا معاون و مددگار نہ تھا۔ مولانا شرر کے اس ہفت روزہ ''مہذب'' کے متعلق عزیز ملک نے بالکل درست لکھا ہے:

> مولانا شرر کی شگفتہ تحریروں کی وجہ سے ''مہذب'' کا دائرہ اشاعت بھی بہت وسیع تھا۔ ہر پرچہ بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا جس میں مسلمانوں کے ثقافتی ورثے، علم وادب، تاریخ اور ثقافت کے علاوہ سیاست اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق مواد چھپا کرتا۔ بیشتر مضامین مولانا شرر خود لکھتے۔ کسی بھی موضوع پر ان کا قلم بند نہیں تھا۔ ملک کے دوسرے پرچوں میں اعلیٰ پایہ کے معروف مضمون نگار حصہ لیتے لیکن ادھر مولانا شرر تنہا تھے۔ مگر کسی سے کم تر نہ تھے۔[۸۶]

شرر نے جو مضامین اس ہفت روزہ میں شائع کیے ہیں ان کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ بقول عبدالماجد دریا آبادی: ''مہذب جناب شرر لکھنوی کی ادارت میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔''[۸۷] شرر کا یہ اخبار اعلیٰ پائے کے اخبارات میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں شذروں، اداریوں اور مضامین کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ اس نے سرسید احمد خان کی پالیسی پر کام کیا۔ یہ حکومت کی پالیسوں کا حامی تھا اور علی گڑھ تحریک کے خلاف تھا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان کانگریس اور ہندوؤں سے دور رہیں۔ اس اخبار کی خوبی یہ تھی کہ اس میں دینی، تاریخی، معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی ہر قسم کے موضوعات پر مضامین چھپتے تھے۔ یہ سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس اخبار کے متعلق ڈاکٹر مسکین علی حجازی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ مندرجات کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا اخبار تھا۔ اس میں اداریوں، شذروں اور مضامین کو زیادہ جگہ دی جاتی تھی۔ حکومت سے تعلقات کے بارے میں سرسید احمد خان کی پالیسی کا حامی تھا۔ لیکن علی گڑھ تحریک کے خلاف تھا۔ مسلمانوں کو کانگرس اور ہندوؤں سے الگ رکھنے کا حامی تھا۔ اس میں علمی، ادبی، سیاسی، تاریخی، معاشرتی اور دینی ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔ ضخامت سولہ صفحات اور سائز ۲۲×۱۸ تھا۔[۸۸]

دوقومی نظریے کی حمایت شرر نے اس کے صفحات کے ذریعے سے کی تھی اور اشارتاً تصور پاکستان سب سے پہلے انہوں نے ہی اس ''مہذب'' کے ذریعے سے دیا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے جب ''دلگداز'' کی اشاعت بند کی

تو ''مہذب'' کو بھی بند کر دیا۔رسالہ ''دلگداز'' جس قدر اہم تھا اس قدر شرر کا اخبار ''مہذب'' بھی شرر خود اس اخبار کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہم نے جس وقت پبلک اسٹیج کو چھوڑا ہے۔اس وقت ہم صرف دلگداز ہی کو نہیں شائع کر رہے تھے۔ بلکہ دلگداز کے دفتر سے ''مہذب'' نام ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری تھا۔جس کے رنگ عبارت، جس کے مضامین اور جس کے ذریعے سے شائع ہونے والی مرحوم و مغفور علمائے اسلام کی زندہ تصویروں کو زمانہ مدتوں یاد کرے گا۔اگر چہ مہذب کی نسبت بعض احباب کی رائے تھی کہ ملک کو چنداں اس کی ضرورت نہیں۔ ہمارے بعض احباب بھی اس کے خلاف تھے مگر ہم اب بھی کہتے ہیں کہ چاہیے ہندوستان کو نہ ہو لیکن اسلام کو اس کی ضرورت اس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔لیکن افسوس یہ ہے کہ نیز اپنے مشاغل اور نیز مصارف کے لحاظ سے ہم ابھی مہذب کی کمی پوری نہیں کر سکتے۔ اگر چہ ہم کو اس کا بڑا صدمہ ہے اور غالباً ہمارے وہ احباب بھی افسوس کریں گے جو اس کو بڑے ہی شوق اور بے انتہا تمناؤں کے ساتھ لیا کرتے تھے۔تاہم یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ کمی پوری نہ ہو گی۔اگر ہم زندہ رہیں اور زمانے نے ان مجبوریوں سے ذرا بھی نجات دی تو ہم فوراً مہذب کو جاری کر دیں گے۔[۸۹]

یہ اخبار تین باتوں کی وجہ سے اہمیت کا حامل تھا۔''رنگ عبارت''، ''مضامین''، ''سوانح عمریاں'' یہی وہ اخبار تھا جس نے اردو ادب کا دامن اپنے رنگ عبارت، اپنے مضامین کی رنگا رنگی اور مرحوم و مغفور علمائے اسلام کے تذکروں سے مالا مال کر دیا تھا۔مولانا بشیر الدین ایک طرف تو اس اخبار میں مسلمان مشاہیر کی سوانح عمریوں کے شائع ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ وہ اخبار ہے جو زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکا۔ ''اخبار اگر چہ عمدہ تھا اس میں مسلمان مشاہیر کی سوانح عمریاں ہوتی تھیں لیکن یہ اخبار زیادہ مقبول نہ ہوا''۔

اخبار ''ظریف'' اور ''پردہ عصمت''

''ظریف'' نامی اخبار بھی شرر کی صحافتی زندگی اور کارناموں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس اخبار کے ایڈیٹر منشی نثار حسین تھے اور اس اخبار کے اجراء کی وجہ یہ تھی کہ جب چکبست نے ''مثنوی گلزار نسیم'' کا نیا ایڈیشن شائع کیا

اور اس کا مقدمہ لکھتے وقت چکبست نے ''گلزار نسیم'' کے شاعر کی تو مدح وتعریف بیان کی لیکن دوسرے شعراء کے نقائص نکالے تو شرر نے اس مثنوی پر ریویو لکھا جس میں اس مثنوی کے عیوب پر سے پردہ اٹھایا گیا۔ شرر کے اس ریویو پر ''اودھ پنچ'' نے اپنے خاص انداز میں جواب دیا۔ اس جواب کے بعد شرر نے اپنا اخبار نکالا، جس کا نام ''ظریف'' رکھا معرکہ شرر اور چکبست آٹھ مہینے تک چلتا رہا جس سے اردو دان طبقہ محظوظ ہوتا رہا اس معرکے نے اردو زبان و ادب کی بھی بہت خدمت کی۔ اس اخبار کے بارے میں پریم چند نے لکھا ہے: ''......مولانا نے ظریف اخبار نکالا اور پنچ کے رنگ میں جواب الجواب لکھا۔ ظریف کے ایڈیٹر منشی نثار حسین صاحب تھے۔''[۹۰] ''اودھ پنچ کے جواب اور شرر صاحب کی حمایت میں ایک پرچہ ظریف نامے بھی غالباً منشی نثار حسین کی ادارت میں نکلتا رہا۔''[۹۱]

اخبار ''ظریف'' کے اجراء، اغراض و مقاصد اور محرک پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھتے ہیں:

> ......مسٹر چکبست مرحوم نے مثنوی ''گلزار نسیم'' کا ایک جدید ایڈیشن شائع کیا اس کے مقدمے میں مصنف کی مدح سرائی اور دوسرے شعراء کی منقعت کا پہلو نکلتا تھا۔ مولانا نے اس پر ریویو کیا اور اس ضمن میں مثنوی کے بعض عیوب پر نظر ڈالی۔ اس کا جواب ''اودھ پنچ'' نے اپنے خاص پیرائیہ میں دیا۔ جس کے بعد مولانا نے ''ظریف'' اخبار نکالا اور ''پنچ'' کے رنگ میں ''جواب الجواب'' لکھا۔ ''ظریف'' کے ایڈیٹر منشی نثار حسین صاحب تھے۔ یہ بحث آٹھ مہینے تک جاری رہی اور اس میں فریقین میں بہت کچھ ردو کد رہی۔[۹۲]

''پردہ عصمت'' کے اجراء کا محرک اور غرض وغایت پردے کی مخالفت تھی۔ جس کے لیے نہ صرف شرر نے ''پردہ عصمت'' رسالہ جاری کیا بلکہ انہوں نے ایک ناول اور ڈراما بھی اس مقصد کے لیے لکھا۔ اس بارے میں غضنفر امروہوی لکھتے ہیں:

> ......آپ پردہ کے مخالف ہو گئے اور اس سلسلہ میں ناول ''مہر النساء کی مصیبت'' اور ڈراما ''میوہ تلخ'' تصنیف کیے اور ایک رسالہ ''پردہ عصمت'' اپنے ایک دوست سید حسن شاہ کے نام سے جاری کیا۔[۹۳]

اس رسالے کے اجراء کے محرکات کے ضمن میں مولانا بشیر الدین لکھتے ہیں:

مولانا چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے موجودہ پردہ کے مخالف تھے۔ لہٰذا انہوں نے

ایک زمانہ میں ''پردہ عصمت'' بھی نکالا جس کی بہت زیادہ مخالفت ہوئی اور یہ اخبار کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔[۹۴]

اس رسالے کے اجراء پر معترضین اور نکتہ چینوں نے بہت نکتہ چینی کی۔شرر نے ایک مضمون بعنوان ''جنگجو عورتیں'' لکھا۔جس میں شرر نے یہ تجویز پیش کی کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی فوج میں بھرتی ہونا چاہیے شرر نے ایک دفعہ پھر اس بات کو دہرایا ہے کہ میری یہ باتیں پردے کے حامیوں کو گراں گزریں گی اور وہ میرے ان خیالات کو بھی پردے پر حملہ تصور کریں گے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ مردوں کی طرح یہ بھی بہادری دکھا سکتی ہیں۔شرر لکھتے ہیں: ''اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح فوج میں بھرتی کیا جائے۔''[۹۵]

عبدالحلیم شرر پردے کی مخالفت اس لیے کرتے تھے کہ اس زمانے میں شرعی پردہ نہیں کرایا جاتا تھا بلکہ زبردستی عورتوں کو خانہ نشینی پر مجبور کیا جاتا۔جس کے باعث طرح طرح کی بداخلاقیاں اور برائیاں جنم لیتی تھیں۔شرر مخالفت اس لیے بھی کرتے تھے کہ پردے کی وجہ سے عورتوں کو اپنی صلاحتیں دکھانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔اس رسالے کی ادارت کے فرائض بھی شرر خود ہی سرانجام دیا کرتے تھے یہ رسالہ ۱۹۰۰ء میں جاری ہوا۔جس کے اجراء سے مسلمانوں میں ایک ہجان پیدا ہو گیا۔

''پردہ عصمت'' کے بارے میں حکیم برہم لکھتے ہیں:

> مولانا کا خیال کئی سال بیشتر سے مسلمانوں کے پردے کے خلاف تھا۔چنانچہ حیدرآباد میں ''معلم نسواں'' میں متعدد مضامین پردے کے خلاف شائع کیے تھے اور اس رسالہ میں اپنا ایک چھوٹا ناول ''بدرالنساء کی مصیبت'' اور اپنا ایک چھوٹا ڈراما ''میوہ تلخ'' بھی پردے کی مخالفت میں شائع کرائے تھے۔اس مسئلہ میں ان کی دلچسپی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ لکھنو آتے ہی ابتدائے ۱۹۰۰ء سے ایک ماہوار رسالہ بنام ''پردہ عصمت'' اپنے دوست سید حسین شاہ کے نام سے جاری کرادیا۔جس میں خود ہی لکھتے تھے اور خود ہی اول سے آخر تک اسے ایڈٹ کرتے تھے۔مگر مولانا کا رنگ بھلا چھپانے سے چھپ سکتا تھا۔ساری دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ رسالہ مولانا شرر ہی کے قلم کا نمونہ ہے۔پردہ عصمت نے مسلمانوں میں ہر جگہ عجب ہل چل ڈال دی۔جس وقت وہ شائع کیا گیا ہے اس زمانے میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ تمام مسلمانوں کو اپنے رسم پردہ پر اس قدر غرور وناز تھا کہ پردہ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالنا گالی دینے کے حکم میں تھا۔ہزارہا آدمی مخالف ہو گئے تردید

میں رسالے شائع ہوئے، کتابیں لکھی گئیں، بعض ناول بھی پردے کی تائید اور مولانا پر حملہ کرنے کے لیے شائع کیے گئے۔حتیٰ کہ دلگداز کی اشاعت کو بھی ضرر پہونچنے لگا، مگر مولانا شرر اسی خیال پر قائم رہے اور ان کا یہ اعتقاد ہو گیا تھا اور آج تک ہے کہ شرع اسلام میں پردہ صرف مہذب اور ساتر لباس کا نام ہے اور اس کے حدود یہ ہیں کہ چہرہ اور ہاتھ داخل ستر نہیں۔ رہی خانہ نشینی جیسا کہ مروج ہے اس پر عورتوں کو مجبور کرنا شرعاً ناجائز ہے اور ساری اخلاقی خرابیاں اسی خانہ نشینی سے پیدا ہوتی ہیں۔[۹۶]

اس خیال اور اس رسالے نے دوررس اثرات مرتب کیے۔ اگرچہ اس رسالے کی عمر بہت مختصر تھی لیکن اس کے اثرات نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ بقول رام بابو سکسینہ

جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں پردے کا رسم اٹھا دیا جائے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہے نہ گھر کی چاردیواری میں بند کر دینے کا......ہر جگہ سخت اختلاف ہوا مگر اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اس لیے کہ اس وقت تک اس مسئلہ کو علانیہ کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرف دار ہے اور پردے کے توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔[۹۷]

شرر نے ایک ڈراما 'میوہ تلخ' کے عنوان سے لکھا تھا اور یہ ڈرامہ انہوں نے اس وقت لکھا تھا جب عورتوں میں نکاح ثانی کو ایک بڑا عیب سمجھا جاتا تھا اور پردہ کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور پھر عورتوں میں تعلیم کا حصول بھی برا سمجھا جاتا تھا چونکہ عبدالحلیم شرر نے انگلستان میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا تھا اور وہاں پر انہوں نے مشاہدہ بھی کیا ہوگا کہ یہ قوم اتنی ترقی یافتہ کیوں ہے؟ آپ نے مرد و زن کی آزادی، ترقی اور تعلیم کے پہلو پر بھی غور کیا ہوگا۔ جب آپ انگلستان سے واپس آئے تو آپ نے سوچا کہ وہاں تو مرد و زن میں مساوات کا دور دورہ ہے اور ہر کام وہ مل کر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تعلیم کی فراوانی ہے اور پابندیاں بھی نہیں ہیں اور ہمارے ہاں تو بے جا پابندیاں ہیں۔ ہمارے ہاں کی عورت، جہالت اور بے جا پابندیوں اور معاشرے کی جکڑ بندیوں کا شکار ہے پھر ہم ترقی کس طرح کر سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 'میوہ تلخ' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا جس کے بارے میں مناظر عاشق ہرگانوی رقمطراز ہیں:

میوہ تلخ مولانا کا ایک اخلاقی، اصلاحی، واقعاتی، معاشرتی اور مقصدی ڈراما ہے جس کے ذریعے عورتوں میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورتوں کو بھرپور طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ پردہ کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے۔ نکاح ثانی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی اہمیت پیش کی گئی ہے اور سماج اور معاشرے میں رائج اندھی رسم کی تقلید کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔[۹۸]

عبدالحلیم شرر کے اس ڈرامے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

کوئی ذی علم مسلمان اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ خود آنحضرت صلعم نے اپنی بیوی ام المومنین جناب حفصہ کو پڑھنے کی اجازت دی تھی شاید آپ فرماتے کہ عرب میں ان دنوں دو تین سے زیادہ پڑھی لکھی عورتیں نہیں ثابت ہوئیں۔ مگر میں کہوں گا کہ عورتوں پر کیا موقوف ہے پڑھے لکھے مرد بھی بہت کم ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قوم عرب عموماً جاہل تھے جن کو قرآن میں خود اللہ جل شانہ، امی کے لقب سے یاد کر رہا ہے۔ اگر اسی کی پابندی کرنا ہے تو لڑکوں کو بھی جاہل رکھا کیجیے۔ علم کی فضلیت قوم عرب کی حالت سے نہیں بلکہ اسلام کے احکام اور جناب سرور کائنات صلعم کے ارشاد سے ثابت ہوئی ہے اور ان احکام میں آنحضرتؐ نے مردوں کی تخصیص نہیں کی ہے۔ ان کی پابندی جس طرح سے مردوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے۔[۹۹]

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ شرر نے یہ ڈراما کس مقصد کے تحت لکھا وہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی مساوات پر زور دیتے ہوئے پردے کہ مروجہ طریق کار پر بھی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نورن: اے بیوی پردہ کروائیے قاضی صاحب پوچھنے کو آتے ہیں

بڑی بیگم: قاضی صاحب آ گئے؟

نورن: جی ہاں آ گئے جب ہی تو آئے ہیں۔

بڑی بیگم: تو پردہ میں کیا دیر لگتی ہے۔ لوٹے جاتے ہیں۔ بیویو اوپر پردے میں جا کر بیٹھو۔ یہ بھی نگوڑی زبردستی کی رسم ہے۔ اے ہاں جب ہم ہی راضی ہیں تو بھلا پوچھو لڑکیوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

نورن: بیوی دروازے پر میاں کھڑے ہیں۔ صاحبزادے بھی ہیں قل ہو اللہ شاہ کو بھی لائی ہوں۔ پردہ گرائیے تو اندر آئیں۔

بڑی بیگم: پردہ... ہائے میں کیا کروں۔ بیویو جسے جانا ہو جائے۔ میں تو یہیں کھڑی رہوں گی۔

بدرالنساء: ارے صاحب بلا بھی لو یہ پردہ کا وقت ہے نورن بلا بھی لے جسے ہٹنا ہوگا آپ ہی ہٹ جائے گا۔

نورن: (چلا کے) میاں آیئے پردہ ہوگیا۔

رضا حسین: ادھورا پردہ دیکھ کر دل میں، لاحول ولاقوۃ

واہ رے پردہ۔ اور اسی پر ناز کیا جاتا ہے۔......[۱۰۰]

وہ عورتوں کے اس حق میں نہیں کہ انہیں پردے میں بٹھا کر ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مردوں کی طرح ملک وقوم کی ترقی و فلاح اور بہبود میں وہ شانہ بشانہ کام کریں۔ اگر چہ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتیں جسمانی اور روحانی کمزوری کا شکار ہوتی ہیں اور ان میں بہادری وشجاعت، جان بازی وسرفروشی مردوں کی طرح نہیں ہوتی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تعلیم وتربیت سے ہم ان کے اندر یہ چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فطری چیزیں نہیں ہیں لیکن عورتوں کی تعلیم وتربیت اور صحت ومعاشرت پر اگر خصوصی توجہ دی جائے تو اس میں شک نہیں کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح بہادری و شجاعت کے کارنامے دکھا سکیں۔ پھر وہ مثالوں سے اپنی اس بات کو سمجھاتے ہوئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ تعلیم و تربیت سے عورتوں کو بھی بہادر بنانے کی کوشش کی جائے تو مردوں سے زیادہ شوق ولگن اور دلچسپی سے بہادری و شجاعت کے جوہر دکھائیں گی اور مردوں کی طرح نہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بہادر اور جنگجو بن سکتی ہیں۔ اس دور میں اگر چہ شرر کے خیالات ونظریات کا مذاق اڑایا گیا اور ان کے اس رسالے کی شدید مذمت کی گئی اور پردے کا حامل طبقہ ان پر شدید طنز اور لعن وطعن کرتا تھا۔ لیکن آج کے دور میں دیکھیں تو ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے جن نظریات وخیالات کو اس دور میں پیش کیا۔ آج اس دور میں ان کے خیالات کو پذیرائی مل رہی ہے اور آج کے دور کا انسان مردوں کی طرح عورتوں کی صلاحیتوں کو ابھارے اور کام میں لانے کا حامی ہے۔ یہ رسالہ ڈیڑھ سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس کی عمر اگر چہ مختصر تھی لیکن اس نے دیرپا اثرات مرتب کیے بقول حکیم برہم:

پردہ عصمت کی زندگی اگر چہ ڈیڑھ ہی سال کی تھی مگر اس نے اتنے زمانے میں اپنا مشن پورا کر دیا یا تو ہندوستان میں ایک مسلمان بھی پردے کی مخالفت کی جرات نہ کرسکتا تھا یا پردہ

> عصمت نے ہر جگہ صد ہا بلکہ ہزار ہا مخالفین پردہ پیدا کر دیے اور آج کوئی شہر اور کوئی صحبت نہیں جس میں بعض لوگ پردے کے مخالف نہ ہوں۔[۱۰۱]

اتحاد

شرر نے اتحاد کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا اس کو نکالنے کا سبب ہندو مسلم اتحاد تھا۔ یہ دو سال تک نکلتا رہا جب شرر نے محسوس کیا کہ وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے تو انہوں نے اسے بند کر دیا۔اس رسالے کے اجرا کا کیا مقصد تھا؟اس کا ثبوت حکیم برہم کے مضمون کے اس اقتباس سے ملتا ہے:

> مولانا اوائل ۱۹۰۴ء میں پھر لکھنو واپس آئے۔ یہاں آ کے جون ۱۹۰۴ء سے پھر دلگداز جاری کیا۔لیکن اب کی مولانا دل میں ایک نیا خیال لے کے آئے تھے۔وہ یہ کہ ہندوستانیوں میں اتفاق ہونا چاہیے جس کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا اور ہندوستان کی ترقی غیر ممکن ہے۔چنانچہ آتے ہی دلگداز سے پہلے ہی 'اتحاد' نام ایک پندرہ روزہ رسالہ نکال دیا جس کی خاص کوشش یہ تھی کہ ان دونوں گروہوں میں اتفاق پیدا کرایا جائے مگر مولانا کا خیال ہے کہ زندگی بھر انہوں نے جتنے کام کیے ان سب میں کامیابی ضرور ہوئی مگر نہ ہوئی تو اس بارے میں اور آخر ڈیڑھ سال اس رسالہ کو جاری رکھ کے انہوں نے بند کر دیا۔[۱۰۲]

شرر ہندوستانی قوموں میں اتحاد و اتفاق کے زبردست حامی تھے۔انہوں نے اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے پندرہ روزہ اتحاد اپریل ۱۹۰۴ء میں جاری کیا بسلسلۂ اشاعت زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا لیکن شرر اپنے بلند مقصد کی تکمیل کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔اتحاد میں دیگر مفید مضامین شائع کرنے کے علاوہ انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات، ہندو مسلم چپقلش وغیرہ پر اتفاق و اتحاد کے نظریے سے اداریے قلم بند کیے۔فرحت جہاں پوری اس کے بارے میں لکھتے ہیں:''مولانا نے ایک پندرہ روزہ رسالہ 'اتحاد' نکالا۔اس میں ہندو مسلم اتحاد پر مضامین و شذرات شائع ہوتے تھے''۔[۱۰۳]

رام بابو سکسینہ اس کی غرض و غایت کچھ یوں بیان کرتے ہیں:''اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کیے جائیں''۔[۱۰۴]

محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں:''ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کیا جائے جس کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا اور ہندوستان کی ترقی غیر ممکن ہے.....''[۱۰۵]

اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی فضا پیدا ہو جائے ۔ اپنے انہی مقاصد کے حصول کے لیے شرر نے اتحاد کے صفحات پر ہندو مسلم اتحاد پر مضامین و شذرات شائع کیے۔ عبدالحلیم شرر کے عہد میں ہندو مسلم تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ دو قومیں جو انگریزوں کی آمد سے قبل آپس میں پیار و محبت سے رہتی تھیں۔ اب اس دور میں ایک دوسرے کی جانی دشمن بن گئی تھیں۔ شرر سمجھتے تھے کہ انگریز ہمیشہ اتفاق و اتحاد سے رہنے کا درس تو دیتے ہیں لیکن ان کے مورخین اپنے فن تاریخ کی بنا پر ان دونوں قوموں کے درمیان بغض و عناد کا بیج بونے میں ہمہ تن تیار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف مورخین اور دوسری طرف رائج الوقت نصاب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات خراب کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ اس نصاب کی بدولت تعلیم یافتہ افراد میں بغض و عناد پروان چڑھ رہا ہے۔ اس صورت حال کا ذکر شرر یوں کرتے ہیں:

> ......انگریزی حکام نے تو ہمیشہ اتحاد و اتفاق کی ہمیں نصیحت کی مگر انگریزی مورخین نے اور خصوصاً ان مصنفین تاریخ نے جن کی کتابیں ہمارے مدارس تعلیم میں لازمی قرار دی گئی ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض و عناد کا بیج بونے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی حالت دیکھ کر لوگوں کو قریب قریب یقین ہو گیا تھا کہ ان مصنفین کا پورا جادو چل گیا اور ایک ایسے اختلاف کی بنیاد پڑ گئی جو قیامت تک دور نہ ہو سکے گا اور اب کے بچھڑے ہوئے ابنائے وطن یعنی ہندو مسلمان اس عالم میں جا کے بھی شاید مل کے نہ رہ سکیں گے۔[۱۰۶]

عبدالحلیم شرر نے 'ہندو مسلمانوں کا اتحاد' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا ہے جس میں انہوں نے اپنے خیالات و نظریات کا پرچار کیا ہے وہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد پر ہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ دونوں قومیں اکثریت میں تھی اور اس زمانے کی آبادی کے بنیادی عنصر مسلمان اور ہندو ہی تھے۔ شرر ان کے اتحاد و اتفاق پر زیادہ زور دیتے تھے تا کہ ملک میں امن و سکون کی فضا قائم و دائم رہے۔ لیکن جتنا وہ اس اتفاق و اتحاد کا پرچار کرتے اتنے ہی مشکل حالات جنم لیتے تھے۔

شرر اس اتحاد کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں جب نا کام ہوئے تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے۔ ان دونوں قوموں میں اتحاد پیدا کرنا بہت دشوار اور مشکل کام ہے جس کو وہ نہیں کر سکتے بلکہ کوئی بھی ذی روح یہ کام نہیں کر سکتا۔ تب شرر نے یہ خیال پیش کیا:

> سب سے پہلے خود ہم نے نہایت اہمیت کے ساتھ اس کام کو اپنے ذمہ لے کے رسالہ اتحاد نکالا جو تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا مگر تجربہ سے نظر آ گیا کہ ہندو مسلمانوں میں خدا ہی اتفاق پیدا کرائے تو کرائے یہ کام ہمارے بس کا نہیں بلکہ ہم تو تجربے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ کام انسان ہی کا نہیں ہے۔[۱۰۷]

عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تعلیم سے انسان کے خیالات ونظریات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔اس دور کے عام انسان کی سوچ یہ تھی کہ تعلیم کے حصول سے برصغیر پاک و ہند میں اتحاد کی فضا قائم ہوسکتی ہے لیکن شرر سمجھتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں اتحاد کا نا پیدا ہونا، دونوں قوموں کے تعلیم یافتہ افراد کی وجہ سے ہے۔مہذب و تعلیم یافتہ افراد فساد کی جڑ ہیں، اگر تعلیم یافتہ طبقہ اپنی سوچ اور اپنے انداز نظر کو درست سمت میں لے جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں میں اتحاد پیدا نہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں:

> لوگ سمجھتے ہیں کہ تعلیم سے اتحاد پیدا ہوگا اور میرا خیال یہ ہے کہ جو تعلیم ہندوستان میں دی جاتی ہے نا اتفاقی کا باعث ہے اور اصلی بانی فساد دونوں طرف کے مہذب و تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ بفرض محال اگر دونوں طرف کے سارے تعلیم یافتہ پکڑ کے کہیں باہر بھیج دیے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ فوراً اتفاق و یکجہتی کے روابط مضبوط ہو جائیں گے اور کسی قسم کا جھگڑا نہ باقی رہے گا۔[۱۰۸]

عبدالحلیم شرر اس بات کے متمنی تھے کہ دونوں فریقین امن و امان اور پیار و محبت سے زندگی بسر کریں لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اس لیے کہ دونوں فریقین ایک دوسرے کے نظریات و خیالات کی نفی کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ہر سیاسی قدم اور سیاسی بات ہندوؤں کو بری لگی تھی اور ہندوؤں کا ہر سیاسی مسئلہ مسلمانوں کو اپنی خواہشات کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔شرر نے اس صورت حال کو بھی اس مضمون میں بیان کیا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتفاق واتحاد پیدا نہیں ہونے دیتی۔

شرر تعلیم کو سب سے زیادہ مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ پہلے ہندو اور مسلمان آپس میں پیار و محبت سے رہتے تھے۔ایک دوسرے کے غم و راحت میں شریک ہوتے تھے۔ایک دوسرے سے دوستیاں کرتے اور نبھاتے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے جان قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے لیکن آج اس تعلیم کی وجہ سے یہ ساری باتیں ختم ہوتی جاتی ہیں۔یہی وہ صوت حال ہے جس کی بدولت مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی خواہش شرر کی پوری نہ ہوسکی اور جب انہوں نے اپنی ہر ممکن کوشش وجد وجہد کے بعد دیکھ لیا کہ یہ دونوں

فریقین راہ راست پر نہیں آ سکتے تو انہوں نے اپنے جاری کردہ 'اتحاد' کو ہی ختم کر دیا۔ اس لیے کہ یہ جس مقصد اور جن اغراض کے لیے نکالا گیا تھا وہ کسی طرح بھی پورے ہونے کی امید شرر کو نظر نہ آتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتفاق واتحاد کے ناپید ہونے کا ایک سبب تعصب بھی ہے جس کے متعلق شرر لکھتے ہیں:

> ہم ہندوستانیوں کے دل ابھی تک اس پرانے جوش تعصب سے لبریز ہیں اور واقعی ہمارے جذبات و خیالات ایسے ہیں کہ اگر برٹش گورنمنٹ روک تھام نہ کرتی رہے تو ہم موقع پاتے ہی اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے پیس ڈالنے اور ان کے تباہ و برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ ہر سال محرم، بکرید اور مذہبی جوش کے دیگر مواقع پر ہم اپنے جوش وخروش اور اپنے متعصبانہ جذبات کا ثبوت دے دیا کرتے ہیں اور کسی کے سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے۔[۱۰۹]

عبدالحلیم شرر سے قبل سر سید احمد خان بھی ہندو مسلم اتحاد کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ لیکن شرر کی طرح ان کی بھی یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ سرسید اور شرر ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ دونوں قومیں تعصب کو چھوڑ کر متحد ہو جائیں بقول عبید اللہ قدسی:

> سرسید ہندو مسلم اتحاد کے لیے برابر کوشاں رہے کبھی تو انہوں نے دونوں قوموں کو ہندوستان کی دو آنکھیں کہا اور کبھی دو بھائی۔ جن کے اوپر ایک دوسرے کی مدد کرنا فرض ہے۔ ہندو مسلمان یہیں پیدا ہوئے، یہیں مریں گے اگر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام نہیں کریں گے تو کبھی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح اخوت و اتحاد کا پیغام وہ بنارس، گورکھپور، لدھیانہ، جالندھر، گورداسپور غرض ہر جگہ اپنی تقریروں کے ذریعے دیتے رہے۔ لیکن سرسید کی یہ تمام محنت اکارت گئی۔[۱۱۰]

ہندو نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں اور ان میں اتفاق واتحاد پیدا ہو جائے اور وجہ یہ تھی کہ مسلمان یہاں پر اقلیت میں ہونے کے باوجود حکمران رہ چکے تھے۔ انگریزوں کے دور میں ہندوؤں نے اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیے، چونکہ وہ مسلمانوں کو اپنا جانی دشمن سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ ہر ممکن طریقے سے اتفاق واتحاد کی فضا ختم کرنے کی سعی کرتے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنی قومیت، وجود اور تہذیب وثقافت سب کو ختم کر دیں یہی ہندوانہ سوچ تھی جس نے شرر کی کوششوں کو بھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب شرر نے دیکھا کہ باوجود کوشش کے ان میں اتحاد کی فضا قائم نہیں کی جا سکتی تو انہوں نے اپنا رسالہ ہی بند کر دیا۔

دلگداز کے اجراء کے محرکات، اغراض و مقاصد اور اس کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ

'اودھ اخبار' سے جب انہوں نے اپنا تعلق ختم کیا تو ان کی مالی حالت کچھ بہتر نہ رہی جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ انہی حالات میں ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے مولانا بشر الدین کی ملاقات شرر سے ہوئی تو انہوں نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خود رسالہ نکالیں۔ اس رسالے کے اجراء کا سب سے بڑا محرک یہی تھا۔ مولانا بشر الدین اس واقع کو یوں بیان کرتے ہیں:

> مالی مشکلات اور بیکاری کی وجہ سے مولانا مرحوم تمام علمی مشاغل کو ترک کر چکے۔ خود مولانا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آئندہ وہ کیا کریں مختلف تجویزیں سوچتے تھے لیکن سب ناقابل عمل ہوتی تھیں۔ اسی زمانہ میں میں جب لکھنو گیا اور مولانا کی پریشانی کا مجھے علم ہوا اور انہوں نے مختلف تجویزیں جو اپنے متعلق سوچی تھیں۔ میرے سامنے پیش کیں۔ آخر کو بہت سی گفتگو کے بعد میں نے ان کو مشورہ دیا کہ جس قسم کا انداز تحریر دلچسپ اور دلکش، میں اختیار کیا گیا ہے، اگر اسی انداز اور اسی رنگ میں کوئی ماہواری رسالہ نکالا جائے تو یقیناً رسالہ کامیاب ہوگا...... جب میں نے ایک تعداد اپنے ذمے مقرر کر کے پیشگی قیمت ادا کی اور یہ کہا کہ اس میں اشتہار طبع کرایا جائے اور میں لکھنو کے دوستوں سے کہہ کر اس قدر روپیہ جمع کردوں گا کہ جس سے پرچہ شائع ہوجائے تو مولانا کی ہمت بندھی۔ اسی وقت رسالہ کے مختلف نام تجویز ہوئے۔ آخر کار 'دلگداز' نام قرار پایا۔ اشتہار لکھا اور فوراً طبع ہو کر مختلف اخبارات کے نام اور مولانا کے احباب اور 'دلکش' اور 'دلچسپ' کے خریداروں کے نام روانہ کیا گیا۔[۱۱]

ڈاکٹر فاروق عثمان رقمطراز ہیں:

> اس رسالے میں ایسے مضامین کی اشاعت ہوئی جو مقفیٰ مسجع عبارت اور اسلوب سے ہٹ کر ایسے طرز تحریر کے حامل تھے جو فارسی عربی اور اردو زبان کی ساری تشبیہاتی اور استعاراتی دل کشی کے ساتھ عام فہم اور اعلیٰ مذاق ادب کے مطابق تھے۔ اس طرح کے نمونے اردو ادب میں اب تک بہت کم تھے......[۱۲]

اس سے ثابت ہوا کہ شرر کے ''دلگداز'' کی وجہ سے مضامین لکھنے والوں کو ایک نیا اسلوب ملا جس کو اپنا کر بڑے بڑے مضمون نگاروں نے اردو ادب میں اپنا خاص مقام حاصل کیا اگر چہ سر سید احمد خان اور محمد حسین آزاد شرر

سے پہلے اس میدان ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔لیکن شرر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان سے الگ ایک راستہ اپنایا۔شرر نے ''دلگداز''عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا یہ مضمون اس رسالے کی اشاعت کی تمہید وتقریب کے لیے لکھا گیا تھا۔اپنے اس مضمون میں شرر نے ''دلگداز'' کے اغراض و مقاصد اپنے مخصوص انداز میں بیان کیے ہیں لکھتے ہیں:

> قومی اغراض قوم سے بیان کرنے کے لیے اس وقت صدہا اخبار جاری ہیں بلکہ بعض اخبارات بڑی محنت و جاں کاہی سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ایسے وقت میں ایک اور پرچے کا نکال دینا کسی حیثیت سے مفید نہیں ہوسکتا۔مگر دلگداز اس غرض سے شائع کیا گیا ہے کہ اپنے موثر اور دل ہلادینے والے الفاظ سے اگر قوم کے دلوں پر فتح نہ پا سکے تو اپنا قومی مرثیہ آپ ہی پڑھے اور آپ ہی روئے اور اس بہانے سے اپنے دل کا بخار نکال ڈالا کرے۔[۱۱۳]

قوم کے اندر بیداری کی لہر پیدا کرنے کا سب سے بڑا محرک ''دلگداز'' ثابت ہوا: ''.....دلگداز اردو رنگ سخن میں ایک نئی روح پھونکنے اور نئی طرح کی قوت مقناطیسی پیدا کرنے کے لیے جاری ہوا تھا''[۱۱۴] شرر نے ''دلگداز'' کے ذریعے سے اردو میں ایک نیا اور اچھوتا رنگ پیدا کیا اور قوم کے اندر نئی روح پھونکنے کے لیے پُر درد اور پر سوز لہجے میں نالہ کشی کرتے رہے۔دلگداز کی وجہ سے اردو زبان و ادب کو بہت فائدہ پہنچا،اگرچہ اس پر بہت لوگوں نے اعتراضات بھی کیے لیکن اس کی اہمیت و افادیت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ اپنے رنگ کا یہ اکیلا پرچہ تھا۔اس کا ایک ایک لفظ دل پر نشتر کا کام کرتا تھا اور اس کے خریداروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔اس میں جو مضامین چھپتے تھے ان کا اثر بھی مہینوں قاری کے دل و دماغ پر رہتا تھا۔اس پر نکتہ چینی کرنے والوں نے بہت نکتہ چینی کی لیکن شرر نے اپنے اس پرچے کو بند ہونے کے بعد پھر جاری کر کے ثابت کر دیا کہ اس پرچے کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس پرچے کی قدر و قیمت کا اندازہ شرر کے مضمون ''۱۸۸۷ء اور ہم'' سے لگایا جا سکتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> اس میں شک نہیں کہ دل گداز اپنے رنگ میں اکیلا ہے اور جس رنگ میں جاری رہا وہ سب طبقوں کے نزدیک غیر مانوس ہے۔ہماری آواز بہتوں کے کانوں کو گراں گزرتی ہے اور اکثر لوگ سمجھتے بھی نہ ہوں گے......ہم اپنے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے خیال میں مستعد ہیں۔ہماری حیرت بھری آواز کا مزہ کوئی ہمارے ہی درد آشنا دل سے پوچھے......دل گداز کا ایک ایک لفظ ان کے دل پر نشتر کا کام کرتا ہے اور ایک ایک مضمون کا

اثر مہینوں ان کے دل پر پڑا رہتا ہے ......دل گداز اپنے دعوؤں میں اس حیثیت سے بھی کامیاب ہوا کہ اس کے رنگ پر چلنے والے ملک میں کچھ اور بھی نظر آنے لگے۔ بہت سے لوگ اس رنگ کو اپنی لیاقت اور اپنے درجے سے زیادہ سمجھ کر برا سمجھنے لگے تو اکثروں نے اسے اختیار بھی کیا اور کوشش کرنے لگے کہ جس طرح ہو سکے اردو زبان کو موثر بنائیں۔ہم ان حضرات کے ممنوں ہیں۔اپنی اغراض میں ان کو اپنا قوت بازو سمجھتے ہیں۔۱۱۵

شرر نے ''دلگداز'' میں جو رنگ اپنایا تھا۔اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ اس رنگ میں ملکی،اخلاقی یا علمی مسئلے پر دو جملے بھی نہیں لکھے جا سکتے،لیکن شرر نے اسی رنگ میں اور اسی پرچے میں مختلف موضوعات پر لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اس رنگ میں بھی ہر طرح کے مضامین لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ان کے معترضین کو آخر کار یہ ماننا پڑا کہ شرر نے غلط نہیں کہا۔شرر اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

بہت بڑا اعتراض دل گداز کے رنگ پر ہے کہ اس زمین میں ملکی یا اخلاقی یا علمی مسئلے پر دو سطریں بھی نہیں لکھی جا سکتیں۔یہ ایسی بات ہے کہ خواہ مخواہ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گی مگر تسلیم کرنے سے پہلے ہم معترضوں کی سمجھ پر افسوس ضرور کر لیں گے... یہ نازک خیالی ہمارے ہم عصر انشا پردازوں ہی کو سوجھی ......نکتہ چینیوں کی خامہ فرسائیوں کی ہمیں کچھ پروا نہیں اور یہ ہمارے دل کو اس قدر مضبوط کر چکا ہے کہ آئندہ بھی ہمیں پروا نہیں۔ہم کبھی ان کی طرف مخاطب ہی نہ ہوں گے ہاں اعتراض کرنے کا انہیں اختیار باقی ہے۔۱۱۶

''دلگداز'' کے صفحات پر جو مضامین شرر نے لکھے ان سے ان کا قومی درد اور اپنی قوم کو بیدار کرنے کا جذبہ موجود ہے۔وہ تمنا کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں پھر سے وہ جذبہ پیدا ہو جن کی بنا پر انہوں نے دنیا پر حکمرانی کی ہے۔شرر نے اپنے مضمون ۱۸۸۸ء میں ''دلگداز'' کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے اور تاریخی مضامین جو دل گداز میں اس سال چھپے تھے ان کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:''۸۷ء میں صرف خیالات سے مدد لی گئی تھی......لیکن ۸۸ء میں واقعات پر بھی نظر ڈالی گئی اور حتی الامکان عمدہ عمدہ تاریخی مضامین شائع کیے گئے۔''۱۱۷

۸۸ء کا سال ''دلگداز'' کی ترقیوں کا سال ثابت ہوا۔اب اس پرچے میں نہ صرف شاعرانہ خیالات پر مبنی مضامین چھپتے ہیں بلکہ تاریخی واقعات پر مبنی مضامین اور ناول بھی اس پرچے میں شائع ہونے لگے۔ان مضامین اور ناولوں نے مسلمانان ہند کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا اور مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ کس قوم کے افراد ہیں اور آج کیوں ذلت آمیز زندگی بسر کر رہے ہیں؟

عبدالحلیم شرر کے جو مضامین ''دلگداز'' میں شائع ہوئے تھے وہ اپنے دور میں بھی بڑی قدر و قیمت کے حامل تھے اور آج کے دور میں بھی ان کی قدر و قیمت کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ نہ صرف مضامین بلکہ جو ناول اس میں چھپتے تھے انہوں نے اس زمانے میں اپنے ایک ایک حرف اور ایک ایک جملے سے حمیت اسلامی کو جگایا اور انہی ناولوں کی بدولت قومی جوش وخروش اور ترقی کرنے کے جذبات مسلمانان ہند میں ابھرے تھے۔ ''دلگداز'' کے 'اداریۓ' جو مضامین شرر آغاز و اختتام سال کے مجموعے میں شامل ہیں ان میں قومی ہمدردی اور مسلمانان ہند کے متعلق فکرمندی کے احساسات و جذبات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ شرر کے عہد میں جتنے بھی اخبارات ورسائل نکلتے تھے ان سب میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال موجود ہوتا تھا۔ لیکن شرر کو ان اخبارات کا طریقہ نصیحت کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں:

> قومی دنیا کس رنگ پر ہے؟ اس کو سب ہی جانتے ہیں، آئے دن اخبارات میں یہی تذکرہ رہتا ہے کہ مسلمان لوگ سُست ہین، جفاکشی سے بھاگتے ہیں۔ ترقی کرنا نہیں جانتے اور ترقی کے متعلق ان کو کسی بات کی آرزو نہیں ہوسکتی۔ مگر ہم کو تو یہ طریقہ نصیحت اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سچ پوچھیے تو اس قسم کے مضامین نے اور ہمتیں پست کر دیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ریفارمران قوم جس رنگ پر لوگوں کو لے جانا چاہتے ہیں اکثر مسلمانوں نے اسی رنگ کو اختیار کر لیا ہے اور روز بروز اختیار کرتے جاتے ہیں۔ عام طور پر قومی دنیا میں ایک حرکت نمودار ہوئی۔ اب رہا یہ کہ انتہائی درجہ ترقی پر پہنچے ہوئے زیادہ مسلمان نظر آئیں یہ ہوتے ہوتے ہوگا۔ [۱۸]

شرر کا یہ رسالہ اس وجہ سے بہت اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں جو مواد شائع ہوتا تھا وہ ہر حالت میں اور ہر وقت اپنا لطف دکھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

بقول شرر:

> ......دل گداز اخبار نہیں ہے کہ اس کے نہ پہنچنے سے چیزوں کا سلسلہ موقوف ہو جائے۔ دیر میں شائع ہونے سے خبریں پرانی ہو جائیں وہ ایسے مضامین اور ایسے خیالات پیش کرتا ہے جو ہر وقت نئے اور ہر حالت میں اپنا لطف دکھا سکتے ہیں۔ [۱۹]

جس طرح اس عہد میں 'تہذیب الاخلاق'' کو اہمیت دی جاتی تھی وہ پبلک کا مقبول ترین رسالہ تھا۔ اسی طرح شرر کا ''دلگداز'' بھی پبلک میں بڑی قدر و منزلت رکھتا تھا۔ یہی وہ پرچہ تھا جس نے اردو زبان و ادب پر بہت

احسانات کیے، اردو زبان میں نئی روح پھونکی ۔ جو نہ صرف شرر کو ہی دل پذیر تھا بلکہ پبلک بھی اس کی شیدائی تھی۔

> دل گداز جس کو پبلک نے مدت تک بڑی عزت کی نظر سے دیکھا اور جس نے اپنے امکان بھر اردو لٹریچر پر بہت کچھ احسانات کیے اور جس کا یہ دعویٰ کسی حد تک قابل تسلیم خیال کیا جانے لگا تھا کہ اس نے اردو زبان میں ایک نئی روح پھونکی ۔ اور جو اپنی مذکورہ یادگار زمانہ کارگزاریوں کی بنا پر ہم کو اور نیز ہماری قوم کو بہت پیارا تھا۔[۱۴۰]

عبدالحلیم شرر کا یہ رسالہ اپنے پر جوش مضامین، تاریخی واقعات، پر درد نغموں اور دلفریب عبارتوں کی وجہ سے پبلک میں مقبول تھا۔ اس رسالے کو زمانے کے ہاتھوں بار بار منظر عام سے ہٹنا پڑا اور بار بار اشاعت کے مراحل سے گزرنا پڑا نہ چاہتے ہوئے بھی شرر اس کو اپنی مصلحتوں اور مجبوریوں کے تحت بند کرنے پر مجبور ہوئے ۔انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز کے وقت کئی ایک پرچے نکل رہے تھے۔ لیکن ان تمام میں یہ بڑا ''تہذیب الاخلاق'' کی طرح کا نمایاں پرچہ تھا۔

جس طرح سر سید احمد خان کا ''تہذیب الاخلاق''، مولانا محمد علی کا ''ہمدرد'' ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' آج بھی اپنی اہمیت وافادیت کے پہلو کی بنا پر تاریخ ادب اردو کا حصہ بنے ہوئے ہیں اسی طرح شرر کا ''دلگداز'' بھی 'تاریخ ادب اردو' کی زینت کا باعث ہے۔ شرر نے ۱۹۰۸ء اور دل گداز، کے نام سے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں ''دلگداز'' کے عروج و زوال کی داستان اور اس کی مکمل تاریخ اپنے دلکش پیرائے میں بیان کر دی تھی۔ اس رسالے کی داستان کو شرر داستان غم سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ذرا اس کی سرگزشت تو سنو، گو یہ ایک داستان غم ہے مگر داستان غم ہی مزے کی بھی ہوتی ہے اور کچھ ایسی ہی باتیں دل میں بھی لگتی ہیں آج سے بائیس سال پہلے جب کہ یہ بیسویں صدی شروع نہیں ہوئی تھی اور ایک تمہارے جانشین نائب زمانہ ۱۸۸۷ء کا عمل تھا۔ دل گداز لکھنو سے جاری ہوا۔ اس کی اس وقت کی آب و تاب، چمک دمک اور دلفریبی و رعنائی دیکھنے کے لائق تھی اور اس کی اس وقت کی میٹھی اور دل میں اتر جانے والی باتیں سننے کے قابل تھیں۔ اس وقت یہ صرف ۱۶ صفحوں کا رسالہ تھا مگر وہ سولہ صفحے جن پر فقط عاشقانہ مضامین اور خیال آرائی، خیال آفرینی کے کرشمے ہوا کرتے تھے کیا کہیں کہ کیسے پر لطف، پر مذاق اور سراپا سوز و گداز ہوتے تھے۔ چند ہی روز میں اس کی دھوم مچ گئی اور ہر اردو زبان میں مذاق رکھنے والا اس کا دلدادہ و شیدا ہو گیا۔ غرض ۱۸۸۷ء ہر طرح اس کے حال

پر شفیق ومہربان تھا۔[۱۲۱]

پہلے پہل یہ سولہ صفحات پر مشتمل دھوم مچانے والا پرچہ تھا۔ ان سولہ صفحات پر شاعرانہ وعاشقانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ پرچہ پر لطف، پر مذاق اور سراپا سوز و گداز تھا۔ اردو ادب کا ہر جاننے والا اس کا شیدائی تھا۔ ۱۹۰۶ء میں اس پرچے میں ۱۶ صفحات پر مضامین، ۱۶ صفحات پر ناول، ۱۶ صفحات پر تاریخ اور ۸ صفحات پر سوانح عمری شائع ہو رہی تھی۔ لیکن اس نے زمانے کے نشیب و فراز میں بھی اردو ادب کی وہ خدمت کی کہ کوئی اور رسالہ نہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے عہد کا مشہور و معروف پرچہ تھا۔ اس نے اردو ادب میں مضمون نگاری، تاریخی ومعاشرتی ناول نگاری، تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کے وہ نمونے چھوڑے ہیں کہ جب تک اردو ادب قائم و دائم ہے۔ یہ اصناف بھی شرر کی یاد کو اور اس رسالے کی یاد کو تازہ کرتی رہیں گی۔ اس نے انشا پردازی اور لٹریری خدمات سرانجام دے کر اپنے عہد کے رسائل میں اپنی اہمیت وافادیت اور خوبیوں کو ثابت کر دیا۔ بقول شرر:

> اگر انصاف کیجیے تو ان ناکامیوں اور ایسی پریشان حالیوں کے ساتھ دل گداز کی لٹریری خدمتیں تھوڑی نہیں اور باوجود مر مر کے جینے اور گر گر کے اٹھنے کے دل گداز نے انشا پردازی کی دنیا میں ایسی یادگاریں نہیں چھوڑی ہیں جو کبھی زمانے کو بھول سکیں اور اردو زبان کے تمام رسالوں میں صرف دلگداز ہی اس دعوے کا مجاز ہو سکتا ہے کہ ''بہت است بر جریدہ عام و دوام'' یہ دل گداز ہی کے لیے ہے کہ اس کے ناولوں کی ہر دلعزیزی و مقبولیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ان کی اشاعت مطابع کی ہوس اور پبلک کے ہجوم شوق کی بدولت ہمارے بس اور تابو میں نہ رہ سکی ......[۱۲۲]

شرر کا ''دلگداز'' ۱۹۰۹ء سے پہلے جس انداز جس وضع و حالت پر نکلتا تھا اس کو شرر نے تبدیل کر دیا۔ نیا ''دلگداز'' پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ اس کی چھپائی بھی اچھی تھی۔ ۱۹۰۹ء سے ''دلگداز'' کے تقطیع ۱۸+۲۲ کے بجائے ۲۰ + ۲۶ کر دی اور سطر جو پہلے چھوٹے صفحات پر ۲۵ ہوا کرتی تھیں اب آیندہ کے پرچوں میں ان کی تعداد ۲۱ کر دی گئی تا کہ خوب واضح اور روشن ہوں اور اس کی قدر دانی میں کمی واقع نہ ہو۔ دوسری تبدیلی یہ کی گئی کہ اس میں تاریخ اور سوانح کے سلسلے کو ختم کر دیا گیا اور جو صفحات ان کے لیے مخصوص تھے ان کو مضامین کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اب نئی وضع کے ''دلگداز'' میں ۴۰ صفحات پر مضامین شائع ہوتے تھے اور ایک تبدیلی اس میں یہ بھی کر دی گئی کہ ہندوستان کے معروف ومشہور انشا پردازوں، محققوں اور فاضلوں کے مضامین اس میں شائع کیے جائیں۔ وہ ۴۰ صفحات جو مضامین کے لیے مخصوص تھے ان میں سے ۳۲ صفحات تو مضامین ہی کے لیے متعین کر دیئے گئے اور ۸ صفحات ہندوستان کے حالات وواقعات پر ریمارکس کے لیے مخصوص کیے گئے۔

> اب اس میں ایک پر اثر متانت پیدا ہوئی جو سنجیدہ اور متین لوگوں کو اپنا فریفتہ کر لیتی۔ چند سال بعد ایک جز تاریخ کا اور بڑھایا گیا جس نے اس میں پختہ مغزی کا جوہر پیدا کیا۔ اس کے چندروز بعد اس میں لائف کا ایک جز اور اضافہ کیا گیا اور اب یہ ساڑھے تین جز یعنی ۵۶ صفحوں کا ایک معقول و متین رسالہ تھا جس میں ہر مذاق کی باتیں تھیں اور ہر رنگ کی دلفریبیاں۔[۱۲۳]

۱۹۰۰ء سال دلگداز کے لیے اس لیے بھی بہتر ثابت ہوا کہ اس سال اس میں ادبی خوبیاں بہت زیادہ تھیں۔ زبان، الفاظ، رنگ اور دلچسپ انداز سے اس سال ''دلگداز'' نے جو مواد پیش کیا وہ اس کی کامیابی اور قدردانی کی دلیل ہے۔ بقول شرر: ''بڑی ناشکری ہوگی اگر اس موقع پر ہم تیرے ان احسانات کو نہ ظاہر کریں گے جو خاص ہم پر اور ہمارے ''دلگداز'' پر ہوئے ہیں۔ ''دلگداز'' کے لیے سچ یہ ہے کہ تو تمام گزشتہ سنین سے اچھا اور خوش نصیبی کا سال تھا''۔[۱۲۴] یہ سال ''دلگداز'' کی اصلاح و ترمیم کا سال ثابت ہوا۔

شرر کے اس رسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جتنے بھی مضامین پیش ہوتے ہیں وہ سب ایڈیٹر کے اپنے دل و دماغ کی اختراع ہوتے تھے۔ شرر بہت اچھے مضمون نگار تھے ان کی مضمون نگاری کے ضمن میں باب مضمون میں بہت کچھ بتایا جا چکا ہے جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ ان کے تمام رسائل میں دلگداز اپنے مضامین کی اشاعت کے حوالے سے انفرادیت کا حامل تھا۔ اس میں اگر چہ یک رنگی تھی۔ لیکن ایڈیٹر ''دلگداز'' کو اس یک رنگی پر بھی ناز تھا۔ بقول شرر:

> دلگداز کی خصوصیت ہے کہ اس میں جو کچھ ہوتا ہے خاص ایڈیٹر کے دماغ و قلم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں اور کسی کے مضامین نہیں ہوتے۔ یہ شرط بجائے خود سخت ہے۔ بہت آسان تھا کہ ایک دس پانچ جز کا رسالہ نکال دیا جاتا جس میں ملک کے بہت سے انشا پردازوں کے مضامین جمع کر دیے جاتے۔ لیکن دلگداز کو اپنی اس یک رنگی پر ناز ہے اور دست بہ دعا ہے کہ خدا اس کو آخر تک نباہ دے۔ لیکن ناظرین سے امید ہے کہ اگر کبھی اس کے کسی مضمون کو اپنے مذاق میں پھیکا پائیں تو اس سخت ذمہ داری کا خیال کر کے جو دلگداز نے اپنے سر لی ہے معاف فرمادیں۔[۱۲۵]

''دلگداز'' کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> ......اس کے شائع ہوتے ہی شوق نے سارے ہندوستان میں ایک سرگرمی پیدا کر دی...

اس میں خاص قسم کے ایسے مضامین تھے جن کے نمونے اگر کوئی ڈھونڈے تو صرف انگریزی اعلیٰ لٹریچر میں مل سکتے۔ اردو کا خزانہ اس وقت تک اس سے خالی تھا کسی خیال کو موثر بنانا اور بغیر تشبیہ و استعارہ کے اور بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دلکش و دلفریب بنا دینا دلگداز کے معجز نگار ایڈیٹر کا خاص حصہ تھا۔ اس کے مضامین اس قدر پسندیدہ اور ایسے دلکش رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے کہ سر رشتۂ تعلیم کو بھی اس کے کہ مولانا کو اس محکمے سے کوئی لگاؤ ہو۔ آپ کے مضامین لینے پڑے اور ہندوستان میں اردو کا کوئی کورس نہیں ہے جس میں دو ایک مضامین شرر کے نہ ہوں۔[۱۲۶]

شرر نے جو کچھ بھی لکھا اور دلگداز میں شائع کیا۔ اس کا مقصد قبولیت عام کا شوق، مذہبی جوش، مسلمانوں کا احیاء تھا۔ بقول علی عباس حسینی:

......آپ نے مسلمانوں کو ان کے قدیم کارنامے یاد دلا کر موجودہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرنا چاہا۔ اس لیے آپ نے کبھی صلیبی جنگوں کے معرکے 'ملک العزیز ورجینا' اور 'شوقین ملکہ' میں یاد دلائے کبھی روسوں پر ترکوں کی فتح 'حسن انجلینا' میں دہرائی، کبھی 'منصور موہنا' میں سندھ کے انصاری خاندان کے حالات قلمبند کیے اور کبھی 'فردوس بریں' میں فرقہ باطنیہ کی ملکی و مذہبی جنگ کے خاکے پیش کیے اور جیتے جی جنت کی سیر کرائی......[۱۲۷]

عبدالحلیم شرر کا یہ مشہور و معروف رسالہ اپنے وقت میں بہت مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کا سبب شرر کا اس سے لگاؤ اور اس میں شائع ہونے والا لٹریچر اور زبان و ادب کی خدمت تھا۔ شرر نے اگرچہ دیگر رسائل و اخبارات بھی جاری کیے لیکن جتنا عزیز رسالہ یہ تھا اور کوئی نہ ہوسکا۔ شرر کا یہ رسالہ اتنا خوش قسمت ہے کہ شرر کو بھی اس پر ناز ہے اور حسد کا اقرار بھی شرر کرتے ہیں۔ یہ رسالہ کئی دفعہ بند ہوا لیکن اس کی مقبولیت میں ذرا بھر کمی واقع نہ ہوئی۔ ''دلگداز'' وہ رسالہ تھا جس نے شرر کی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشات و نظریات کو پبلک تک پہنچا کر ان کی عزت و وقار میں اضافہ کیا۔ یہ وہ رسالہ تھا کہ جو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ مکہ معظّمہ کی سرزمین میں بھی مقبول تھا۔ اس ضمن میں شرر لکھتے ہیں:

صاحبو! ہمیں آج تک حج بیت اللہ اور زیارت نبوی کی تمنا ہی رہی مگر ہمارا دلگداز ہر مہینے مکہ معظّمہ میں حاضری دے آتا ہے اور ایسے ایسے متبرک و محترم مقامات اور انوار قدس کی

> ایسی پاک منزلوں میں اس کی رسائی ہو جاتی ہے جہاں تک ہماری آرزو بھی خیال کے پروں سے اُڑ کے نہیں پہنچ سکتی۔[۱۴۸]

دلگداز نہ صرف عوام الناس کا پسندیدہ رسالہ تھا بلکہ روسائے قوم ووالیان ملک اورامراء بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو شرر کی صحافت کی بلندی کی علامت ہے۔ دلگداز جہاں مردوں کے ہاں مقبولیت واہمیت اور قدر و قیمت رکھتا تھا وہاں مہذب، تعلیم یافتہ پاک دامن عورتیں بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں، مرد و زن کا پسندیدہ رسالہ اس دور میں اگر کوئی تھا تو یہی تھا۔ وہ تخلیقی ادب جو اس کے صفحات پر چھپتا تھا۔ اس سے خواتین بھی بھرپور فائدہ اٹھاتی تھیں۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے شرر رقمطراز ہیں:

> ... تعلیم یافتہ اور صاحب علم خاتونیں، عفت شعار و پاک دامن بیبیاں جن کے دامن عفت پر حوریں نماز پڑھتی ہیں اور جن کے حریم محترم تک ہواؤں کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ ان کی پاک بازی و عصمت شعاری کی خلوت گاہ میں اسے آپ ویسا ہی مقبول اور ویسا ہی رسا اور باریاب پائیں گے جیسا کہ دوسرے مقامات میں۔[۱۴۹]

یہ رسالہ ہر طبقہ فکر کو بہت دل عزیز تھا کیونکہ اللہ تعالی نے اس رسالے پر خاص فضل وکرم کر رکھا تھا۔ اس کو وہ نگاہیں خدا کی طرف سے ملی ہوئی تھیں جن کی بنا پر وہ اپنے ناظرین واحباب کو دیکھتا تھا۔ اسے وہ رازدارانہ کان دیے گئے تھے جن کی وجہ سے وہ ناظرین کی باتیں سن سکتا تھا اور ہر بری و بھلی صحبت میں اسے پذیرائی ملتی تھی۔ مرد و زن اس کے صفحات کو پڑھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک سطر پڑھ کر ان کا دل چاہتا کہ دل و جان اس پر لٹا دیں۔ اس رسالے کو قبول عام کیوں نہ حاصل ہوتا۔ اس لیے کہ یہ اپنی وضع کو نہیں چھوڑتا تھا، اگر چہ ہر صحبت میں جاتا تھا، لیکن نہ تو کسی سے متاثر ہوتا تھا اور نہ کسی کے رنگ ڈھنگ کو اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے اس انداز کے متعلق شرر لکھتے ہیں:

> ہر صحبت میں جاتا تھا مگر اس سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ کچھ اپنا ہی اثر ڈال دیتا ہے۔ وہ سب کا بن گیا اور سب نے اسے اپنا بنا لیا۔ مگر پھر بھی وہ ویسا ہی الگ تھلگ رہا جیسا کہ تھا وہ ہر ایک کی دلداری کرتا اور ہر سینے میں اپنی جگہ پیدا کر لیتا۔ مگر اس لیے نہیں کہ ان کی برائیوں کو اختیار کرے۔ جس طرح زاہد شب زندہ دار کے پاس جا کے وہ نمازیں پڑھتا اسی طرح ایک شرابی کی صحبت میں بیٹھ کے وہ شراب نہیں پینے لگتا۔[۱۳۰]

اس رسالے کی مقبولیت میں اضافہ اس وجہ سے ہوا کہ محبت والفت کی محفلوں میں یہ محبت کے چراغ کو

روشن کرتا، اور اگر یہ چراغ پہلے ہی سے روشن ہوتا، تو اس کی لو کو اور زیادہ بڑھاتا، مذہبی دنیا میں وہ ہل چل پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ دینداری کی محفلوں میں ایک طرف وہ جوش وعقیدت کے جذبات کو ابھارتا تھا تو دوسری طرف اپنے ناظرین کو خدا کی طرف متوجہ کرتا تھا۔علمی دنیا میں بھی اس کو قدر ومنزلت حاصل تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ اس لیے کہ یہ اعلی درجے کے علمی مسائل پر بحث کرتا تھا اور اپنے وجود سے بڑے بڑے علمی مسائل کو حل کرنے کی صلاحتیں رکھتا تھا۔ یہ اپنے ناظرین اپنے احباب اور قدر افزاؤں اور قدر دانوں میں عجیب وغریب قسم کا ذوق وشوق پیدا کرنے والا رسالہ تھا۔ اس سے ہر صحبت اپنے مذاق کے مطابق لطف اٹھا سکتی تھی۔ ہر گروہ کے لیے دلچسپی کے سامان اس میں موجود ہوتے تھے اور ہر ذہنی سطح کا شخص اس سے ذوق حاصل کرتا تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس سے کبھی کسی کو شکایت نہ ہوتی تھی۔ ہر ایک کے دل میں جگہ پانے کی صلاحیتوں سے مالا مال، ہر دلعزیز پرچہ روز بروز مقبول سے مقبول تر ہوتا گیا، شرر کے ادبی فن پاروں کو اپنے صفحات میں جگہ دے کر روز بروز ان کے ادبی مقام و مرتبہ کو بلند سے بلند تر کرتا گیا۔ اس سے بڑھ کر اس کی مقبولیت کا اندازہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ شرر کو اپنے باقی تمام اخبارات اور رسائل میں یہ پرچہ بہت عزیز تھا۔ شرر کا یہ ماہنامہ رسالہ خالص ادبی اور تاریخی رسالہ ثابت ہوا۔ شرر کو تاریخ اور ادب دونوں سے بہت لگاؤ تھا۔ اس رسالے کی زبان خوب صورت اور شستہ ہوتی تھی۔ شرر اگر چہ سرسید کی تحریک علی گڑھ سے منسلک نہ تھے لیکن اس رسالے کے اداریوں اور مضامین کے مطالعے سے سرسید کی سادگی و سنجیدہ نثر کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اس رسالے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں لکھنو کی زبان کی چاشنی اور سرسید کی طرز کی نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ اس رسالے کے مقالات پر بھی سرسید اور ان کے تہذیب الاخلاق کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق کوثر:

> دلگداز ایک ماہنامہ رسالہ تھا جسے عبدالحلیم شرر نے ۱۸۸۷ء سے جاری کیا تھا یہ ایک خالص ادبی و تاریخی رسالہ تھا۔ شرر کو ادب اور تاریخ دونوں سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی خوب صورت اور شستہ زبان ہے۔ شرر اور ان کا خاندان سرسید تحریک سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے رسالے میں جہاں ایک طرف لکھنو کی زبان کی چاشنی وشیرینی ملتی ہے تو دوسری طرف سرسید کی سادگی اور سنجیدگی کے آثار بھی واضح ہیں۔ رسالے میں جو علمی مقالات چھپتے تھے ان پر سرسید کے تہذیب الاخلاق کا اثر بالکل واضح ہے۔ شرر چونکہ سرسید کے معاصر تھے اور ان کا اثر پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔[۱۳۱]

رسالہ 'العرفان'

الہیات وتصوف پر بحث کرنے کے لیے مولانا محمد سعید الحسن کے نام سے ایک رسالہ ''العرفان'' شرر نے نکالا۔اس رسالے نے بہت مقبولیت حاصل کی۔حکیم برہم لکھتے ہیں:

> ......مولانا نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار مولوی محمد سعید الحسن صاحب کے نام سے رسالہ 'العرفان' نکالا جو اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب وغریب رسالہ تھا۔اس میں الہیات اور تصوف سے بحث کی جاتی اور دینداری کی تعلیم ایسے دلچسپ اور مروجہ طریقہ سے دی جاتی تھی کہ جس کسی نے اسے دیکھا پسند کیا اور صوفیوں کی دنیا میں اسے خاص شہرت حاصل ہوگئی۔مگر مولانا کے مختلف خانگی افکار اور سفر حیدر آباد کی وجہ سے وہ رسالہ بھی بند ہوگیا۔لیکن العرفان نے اخباری دنیا کو دینداری اور روحانیت کی طرف توجہ دلائی تھی۔اس کا اثر ہمیشہ زندہ وباقی رہے گا،چنانچہ آج تصوف اور علوم باطنی کے متعلق ہندوستان میں کئی رسالے نکل رہے ہیں جو درحقیقت العرفان ہی کی یادگار ہیں۔[۱۳۲]

اس کے اڈیٹر حکیم سراج الحق صاحب تھے۔اس میں بھی تمام مضامین مولانا کے قلم سے نکلتے تھے اس رسالے کی عمر بھی بہت کم تھی۔بقول فرحت شاہ جہاں پوری:''اس میں الہیات اور تصوف پر کھل کر اظہار خیال کیا جاتا ہے اور دینی تعلیمات دل چسپ اور دل پذیر انداز میں دی جاتی تھی۔''[۱۳۳]

اس رسالے کے بارے میں محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں:

> ......اس میں الہیات اور تصوف سے بحث کی جاتی اور دینداری کی تعلیم ایسے دلچسپ اور مروجہ طریقہ سے دی جاتی تھی کہ جس کسی نے اسے دیکھا پسند کیا اور دنیائے تصوف میں اسے خاص شہرت حاصل ہوئی۔[۱۳۴]

اگر چہ یہ ایک مشہور رسالہ تھا لیکن شرر کی مصروفیات نے اسے دیرپا جاری نہ رکھا۔اس رسالے کی خوبی یہ تھی کہ اس نے دین داری کی تعلیم اس انداز اور موثر طریقے سے پیش کی کہ ہر ایک نے اس کے انداز کو سراہا اور دینی حلقوں میں اس کو بہت پذیرائی بھی ملی۔اس نے اخباری دنیا کو تصوف اور دین داری کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اگر چہ یہ رسالہ دیرپا ثابت نہ ہوا تھا لیکن آج جتنے بھی دینی رسالے نکل رہے ہیں ان کا پیش رو ہم اس رسالے کو قرار دے سکتے ہیں۔اس میں تمام مضامین شرر خود لکھتے تھے اور موضوع اظہار تصوف ہی ہوتا تھا۔

ماہنامہ مورخ وہمدرد اخبار

عبدالحلیم شرر نے ماہنامہ مورخ بھی جاری کیا تھا۔اس میں شرر تاریخی مضامین شائع کرتے تھے۔یہ بھی اپنے عہد کا ایک نامی گرامی ماہنامہ تھا۔اگر چہ یہ رسالہ بھی زیادہ دیر تک نہ جاری رہ سکا۔لیکن جتنا عرصہ بھی یہ رسالہ نکلتا رہا۔اس نے بھی علم وادب کی بہت خدمت کی۔شرر کے صحافتی کارناموں میں اس کی بھی اپنی اہمیت وافادیت تھی۔اس ماہنامے کی خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں شرر تاریخی مضامین شائع کرتے تھے۔بقول عزیز ملک:''ماہنامہ مورخ'' میں تاریخی مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔''[۱۴۵]

۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر'ہمدرد' اخبار نکالنا چاہا تو اس کی ادارت کے لیے انہوں نے شرر کو منتخب کیا،دو سو روپے ماہوار پر شرر دہلی چلے گئے۔اس اخبار کی ادارت کی ذمہ داری شرر نے اگر چہ قبول کر لی تھی،لیکن منشی حکیم سراج صاحب کے والد کی بیماری کی وجہ سے دفتر 'دلگداز' سے جانا اور شرر کے صاحبزادے محمد صدیق کی بیماری کی وجہ سے شرر کو ہمدرد کی چیف ایڈیٹری سے منہ موڑنا پڑا پھر ہمدرد اخبار کسی وجہ سے جاری بھی نہ ہو سکا،جس کی وجہ سے شرر دہلی کو چھوڑ کر واپس لکھنو آ گئے۔اس کا ذکر شرر یوں کرتے ہیں:

> ہم نے بعض احباب کے مجبور کرنے سے اخبار'ہمدرد' کی چیف ایڈیٹری قبول کر لی تھی اور دہلی چلے گئے۔دفتر'دلگداز'منشی حکیم سراج الحق صاحب منیجر'دلگداز' کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا تھا مگر ہمارے جانے کے دس پندرہ روز بعد سراج الحق صاحب کے والد یکا یک ایسے بیمار ہوئے کہ انہیں مجبوراً ان کی تیمارداری کے لیے چلے جانا پڑا......سراج الحق صاحب کے چلے جانے سے دفتر'دلگداز' میں کوئی اتنا بھی نہ رہا کہ معمولی خطوں کے جواب دے سکے۔ادھر ہم جو دہلی میں گئے تو آفات وحوادث زمانہ کے ایسے شکار بنے کہ خدایاد آ گیا۔بندہ زادہ محمد صدیق حسن سلمہ جو علی گڑھ میں پڑھتا تھا،یکا یک بیمار ہو کے ہمارے پاس دہلی میں آیا......
>
> الحاصل ہمیں دہلی میں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور جتنے دنوں رہے مایوسیوں اور طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا رہے۔ادھر'ہمدرد' اخبار جس کے لیے ہم گئے تھے وہ بھی بیروت سے ٹائپ کے غیر مکمل آنے اور مہینوں تک اس کا تکملہ نہ ہو سکنے کے باعث جاری نہ ہو سکا۔مسٹر محمد علی نے کوئی کوشش اور کسی قسم کی تگ ودو اٹھا نہیں رکھی لیکن معاملہ ایسا تھا کہ کسی کا زور نہ چل سکتا تھا اور کوئی تدبیر بنائے نہ بنتی تھی۔آخر یہ دیکھ کے کہ وہاں ہماری موجودگی سے کوئی کام نہیں نکلتا اور'دلگداز' کا کام بگڑتا جاتا ہے۔۲۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہم صدیق

سلمہ کے ساتھ لکھنو واپس آ ئے ۔[۱۳۶]

رسالہ ’دل افروز‘

شرر نے ایک رسالہ ۱۹۱۵ء میں جاری کیا جس کا نام دل افروز تھا۔اس رسالے کے اجراء کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے شرر لکھتے ہیں:

> پبلک میں ناولوں کا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اس پر بھی بہت سے احباب تقاضا کیا کرتے تھے کہ دلگداز میں کسی ناول کا سلسلہ جاری کیا جائے اور ہر پرچے کے ساتھ اس کا ایک جز شائع ہوا کرے۔ ان کی یہ خواہش تو ہم اس لیے نہیں پوری کر سکتے کہ اب ہم دلگداز کی قیمت بڑھانا نہیں چاہتے ......لیکن ان کا شوق پورا کرنے سے ہم نے دل افروز نام کا ایک رسالہ اپریل ۱۵ء یعنی آغاز ۳۴ قمری سے جاری کردیا۔[۱۳۷]

’دل افروز‘ زیادہ دیر نہ چل چکا لیکن دلگداز کو شرر نے زندگی کے آخری لمحے تک جاری وساری رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔اردو صحافت میں شرر بلند مقام ومرتبہ کے حامل ہیں۔

عبدالقادر شرر کی نثر کو دلچسپ کہتے ہیں ۔احسن فاروقی ان کی قوت بیان اور زور قلم کو ان کی انشا پردازی کی خصوصیات قرار دیتے ہیں۔چکبست بھی شرر کی عبارت کو سلیس و دلچسپ قرار دیتے ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی عبارت جدت سے خالی ہوتی ہے۔ ان کی نثر کو نان بے نمک اور شہد بے شکر بھی کہا جاتا ہے ۔علی عباس حسینی کا دعویٰ ہے کہ ان کے یہاں الفاظ کے انتخاب میں احتیاط نہیں برتی گئی۔بعض نقاد ان کی عبارت میں بہت سی غلط ترکیبوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور ان کی تشبیہوں کو بے محل اور ناموزوں بھی ٹھہراتے ہیں۔لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دلگداز کے ذریعے جس میں ان کے تاریخی،شاعرانہ و عاشقانہ،فلسفیانہ، اخلاقی و دیگر مضامین کے علاوہ ان کے ناول اور دیگر نگارشات چھپتی تھیں ایک ایسے طرز تحریر کو رواج دیا جو مغرب ومشرق کی سادگی اور رنگینی کا امتزاج بھی ہے اور قاری کے لیے باعث کشش بھی ۔شرر نے اپنے معاصرین کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ خود کہتے ہیں کہ ہم سے جیسی عبارت بن پڑتی ہے لکھ دیتے ہیں،ان باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ’دلگداز‘ کی انشا پردازی ایک خاص طرح کی انشاپردازی ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سلیس و رواں بھی ہے اور شگفتہ و دل نشین بھی اور اپنے ادوار اور آنے والے عہد کے ادباء کو ایک ایسا راستہ دکھاتی ہے جس پر چلنا آسان اور نتیجہ خیز ہے ۔شرر نے جو انداز اپنایا اس میں جو بات بھی کی وہ دلچسپ وموثر ضرور ہوئی۔بس جس طرح شرر نے ناول نگاری کو فن کا ایک سانچا دیا اسی طرح ان کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے نثر میں تحریر کے ایسے طرز کو رواج دیا جو ادب اور صحافت دونوں کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو افسانے کی مختصر تاریخ، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۳

۲۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، صحافتی زبان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹

۳۔ ریاض احمد، ادب اور صحافت، مشمولہ نئی تحریریں، ستمبر ۱۹۵۴ء، حلقہ ارباب ذوق Hلاہور، ص ۵۷

۴۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، پروگریسو بکس لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۰۸

۵۔ حفیظ الرحمٰن خان، خیال و نظر (علمی و ادبی خیالات)، کاروان ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۶۳

۶۔ حسن عابدی، اردو جرنلزم، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۰

۷۔ شفیق جالندھری، فیچر نگاری، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۷

۸۔ نعیم نقوی، ڈاکٹر، تنقید و آگہی، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۳

۹۔ شفیق جالندھری، اردو کالم نویسی، علمی کتب خانہ، لاہور، س۔ن، ص ۳۴

۱۰۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، ص ۳۰۷

۱۱۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، کریم سنز پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۵

۱۲۔ ایم۔ ایس ناز، اخبار نویسی کی مختصر تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص ۵

۱۳۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، ادبی رجحانات، کتاب خانہ دانش محل، لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۳۱۴

۱۴۔ عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۲۵،۲۶

۱۵۔ صابری امداد، احمد، روح صحافت، مقدمہ، تنویر علوی، ڈاکٹر، مکتبہ براہ دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ج

۱۶۔ عبدالمجید سالک، اردو صحافت، مشمولہ ماہ نو، شمارہ ۴، جلد ۶، م۔ن، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۸

۱۷۔ سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، روح تنقید، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۱۸

۱۸۔ نادر علی خاں، اردو صحافت کی مختصر تاریخ، بک چینل سمن آباد، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱

۱۹۔ مولانا صابری، اردو کے اخبار نویس، صابری اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۴۱

۲۰۔ جام جہاں نما، مملوکہ نیشنل آرکائیوز دہلی، ۹ مارچ ۱۸۲۵ء، ص ۷

۲۱۔ عبدالحق، ڈاکٹر، خطبات گارساں دی تاسی، انجمن ترقی اردو ہند حیدر آباد، دکن، ۱۹۳۵ء، ص ۱۷۹

۲۲۔ عشرت رحمانی، اردو کا کلاسیکی ادب مرقع لیلیٰ مجنوں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۴

۲۳۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، دنیائے اسلام کی صحافت، مقدمہ، عبدالمجید سالک، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ۸۔۱۱

۲۴۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی، شعیب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۵۳

۲۵۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان،

۱۹۹۶ء،ص۱۹۱

۲۶۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، اردو میں علمی و ادبی صحافت کا آغاز، مشمولہ، مجلّہ، شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۱ء، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ص۵۳

۲۷۔ سید اعجاز حسین، ادبی رجحانات، کتاب خانہ دانش محل، لکھنو، ۱۹۴۲ء، ص۳۱۶

۲۸۔ سید ظہور مہدی، آئینہ افکار، الحبیب دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۵۶

۲۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، کاروان صحافت، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص۴۹

۳۰۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۸۷ء، ص۲۳۴

۳۱۔ منصور عاقل، حرف بہ حرف، اردو اکیڈمی، بہاولپور، ۱۹۸۲ء، ص۹۱

۳۲۔ الطاف حسین حالی، مولانا، کلیات نثر حالی، مرتب: شیخ محمد اسمٰعیل مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۱۸۶

۳۳۔ عبدالروف عشرت، مولانا شرر مرحوم، مشمولہ، زمانہ (کانپور) فروری ۱۹۲۷ء، ص۸۵۔۹۱ مشمولہ عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنو، مرتب محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۴۲۴

۳۴۔ شفیق جالندھری، فیچر نگاری، تعارف، مرزا ادیب علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۱۵

۳۵۔ علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۰ء، ص۱۳۶

۳۶۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۰۹

۳۷۔ اشتیاق طالب، تمہید، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص۳۵

۳۸۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۴ء، ص۱۰۷۔۱۰۸

۳۹۔ عبدالحلیم شرر، دل گداز مقدمہ، فاروق عثمان، ڈاکٹر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۸

۴۰۔ عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنو، مقدمہ، غضنفر امروہوی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۳۸۷

۴۱۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۳۱۰

۴۲۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم شرر مشمولہ، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت، ص۶۷

۴۳۔ ایس ایم معین قریشی، اردو زبان و ادب، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص۵۶

۴۴۔ فیروز مکرجی، لکھنو اور سرشار کی دنیا، مترجم، مسعود الحق، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۱۷

۴۵۔ محمود بریلوی، پروفیسر مختصر تاریخ ادب اردو با تصویر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۴۲۳

۴۶۔ قاضی احمد میاں جونا گڑھی، مضامین اختر جونا گڑھی، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص۳۵۱۔۳۵۲

۴۷۔ غضنفر امروہوی، ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنو (تنقیدی و تحقیقی جائزہ)، مشمولہ عبدالحلیم شرر گزشتہ لکھنو، (مرتب) محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۳۸۶

۴۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، فروری

۱۹۷۲ء،ص ۳۷۰

۴۹۔ غضنفر امروہوی، ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنو(تنقیدی و تحقیقی جائزہ)،ص ۳۸۶

۵۰۔ محمود بریلوی، پروفیسر، مختصر تاریخ ادب اردو با تصویر،ص ۴۲۵

۵۱۔ معین الدین صاحب، مضامین چکبست، مکتبہ معین الادب، لاہور، س۔ن،ص ۱۰۱،۱۰۲

۵۲۔ نادم سیتاپوری، اودھ پنچ، مشمولہ مجلّہ، اردونامہ، شمارہ۔۱۸، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء، ترقی اردو بورڈ کراچی،ص ۷۱

۵۳۔ سید وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ نقد، آگہی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۷ء،ص ۳۵۷

۵۴۔ عبدالحلیم شرر، امید، مشمولہ، مضامین شرر جلد اول، شاعرانہ و عاشقانہ، الیس عبدالرشید اینڈ سنز، لاہور، س۔ن،ص ۱۰

۵۵۔ اویس احمد ادیب، پروفیسر، ادبی تعارف، یونائیٹڈ بک سیلرز، کراچی، ۱۹۸۵ء،ص ۵۳

۵۶۔ آغا محمد علی باقر، تاریخ نظم و نثر اردو، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۵ء،ص ۲۳۵

۵۷۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء،ص ۱۱۱،۱۱۲

۵۸۔ علامہ سید سلیمان ندوی، یادرفتگان، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۳ء،ص ۶۷

۵۹۔ پریم چند، مضامین پریم چند، مرتب: عتیق احمد، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۱ء،ص ۳۲۸

۶۰۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۲۹ء،ص ۵۵۰

۶۱۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی،ص ۵۶

۶۲۔ جاوید اختر بھٹی، عبدالحلیم شرر کے دل گداز کے مضامین، مشمولہ ماہ نو، جلد ۶۰ شمارہ۔۲ فروری ۲۰۰۷ء، ادارہ مطبوعات پاکستان،ص ۳۳

۶۳۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت، زمانہ، کانپور، بابت فروری ۱۹۲۷ء،ص ۸۵،۹۱

۶۴۔ فیروز سنز، ادبائے اردو، فیروز سنز لاہور، ۱۹۵۴ء،ص ۱۱۰

۶۵۔ علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۰ء،ص ۱۳۸

۶۶۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم شرر، مشمولہ، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت، ۱۹۱۰ء۔۱۹۱۳ء، ادیب الہ آباد،ص ۷۶۔۷۷

۶۷۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو،ص ۴۸۹

۶۸۔ عفیرہ حامد، ڈاکٹر، تحریک پاکستان میں مسلم صحافت کا کردار، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء،ص ۱۸

۶۹۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی،ص ۵۶

۷۰۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، کاروان صحافت،ص ۵۷

۷۱۔ ایضاً،ص ۵۷، ۵۸

۷۲۔ ایضاً،ص۵۴۔۵۵

۷۳۔ عبدالحلیم شرر، ہندو مسلمان، مشمولہ مہذب شارہ۔۴، جلد۱،۱۳۔اگست۱۸۹۰ء

۷۴۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی، ص۵۸۔۵۹

۷۵۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، کاروان صحافت، ص۵۱۔۵۲

۷۶۔ عبدالحلیم شرر، ہندو مسلمان، ص۲۶

۷۷۔ عبدالحلیم شرر، مہذب، شارہ۱۲ جلد۱، ۲۳ اکتوبر ۱۸۹۰ء، م۔ن، ص۶۷

۷۸۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، کاروان صحافت، ص۴۹۔۵۰

۷۹۔ ایضاً، ص۵۰۔۵۱

۸۰۔ ایضاً، ص۵۱

۸۱۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم شرر، ص۹۷

۸۲۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر (حیات اور کارنامے)، ص۱۱۰

۸۳۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، صحافت پاکستان وہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص۲۷۰،۲۷۲

۸۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص۸۹۱

۸۵۔ جاوید اختر بھٹی، عبدالحلیم شرر کے دل گداز مضامین کا مجموعہ، ص۳۲

۸۶۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی، ص۵۹

۸۷۔ عبدالماجد دریا آبادی، اردو صحافت اور لکھنو، مشمولہ نقوش، شارہ۔۶۹۔۷۰، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص۲۰۳

۸۸۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پاکستان وہند میں مسلم صحافت کی مختصر تاریخ، ص۲۴،۲۵

۸۹۔ عبدالحلیم شرر، قدر رہر نعمت است بعد زوال، مشمولہ، مضامین شرر، جلد اول حصہ سوم، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۳۸،۳۹

۹۰۔ پریم چند، مضامین پریم چند، ص۳۲۸

۹۱۔ عبدالماجد دریا آبادی، اردو صحافت اور لکھنو، ص۲۰۳

۹۲۔ عبدالرؤف عشرت، خواجہ، زمانہ کانپور، ص۸۵۔۹۱

۹۳۔ غضنفر امروہوی، مضمون گزشتہ لکھنو، ص۳۸۸

۹۴۔ مولانا بشیر الدین، عبدالحلیم شرر، مشمولہ، روزنامہ زمیندار، لاہور، ۳۰ جنوری ۱۹۲۷ء، ص۴

۹۵۔ عبدالحلیم شرر، جنگجو عورتیں مشمولہ، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، جلد ششم، مکتبہ کلیاں، لکھنو، ۱۹۶۱ء، ص۲۸۹

۹۶۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم شرر، ص۸۲

۹۷۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص۵۴۹

۹۸۔ عبدالحلیم شرر لکھنوی، میوہ تلخ، مقدمہ: مناظر عاشق ہرگانوی، نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۷۱ء، ص۱۲۔۱۳

۹۹۔ عبدالحلیم شرر، میوہ تلخ (مرتب) مناظر عاشق ہرگانوی، نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۷۱ء، ص۷۶۔۷۷

۱۰۰۔ ایضاً، ص۶۰، ۶۱، ۶۲۔۶۳

۱۰۱۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم شرر، ص۸۳

۱۰۲۔ ایضاً، ص۸۳

۱۰۳۔ فرحت شاہ جہاں پوری، عبدالحلیم شرر (سوانح وتخلیقات)، مشمولہ، صحیفہ شمارہ۔۲۳، اکتوبر ۱۹۶۵ء، مجلس ترقی اردو، لاہور، ص۱۷

۱۰۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص۵۴۹

۱۰۵۔ محمد یحییٰ تنہا، سیرالمصنفین، محبوب المطابع، دہلی، ۱۹۲۴ء، ص۵۹۵۔۵۹۶

۱۰۶۔ عبدالحلیم شرر، نیا سال اور نئی امنگ، مضامین شرر جلد اول حصہ سوم، آغاز و اختتام سال، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۶۸۔۶۹

۱۰۷۔ عبدالحلیم شرر، ہندو مسلمانوں کا اتحاد، مضامین شرر جلد پنجم، اصلاح قوم وملت، گیلانی پریس، لاہور، س۔ن، ص۳۳

۱۰۸۔ ایضاً، ص۳۴

۱۰۹۔ عبدالحلیم شرر، بے تعصبی، مضامین شرر جلد پنجم، اصلاح قوم وملت، ص۳۸۔۳۹

۱۱۰۔ عبیداللہ قدسی، آزادی کی تحریکیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۲۹۶

۱۱۱۔ مولانا بشیر الدین، عبدالحلیم شرر، ص۴

۱۱۲۔ فاروق عثمان، مقدمہ، دل گداز، عبدالحلیم شرر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۹

۱۱۳۔ عبدالحلیم شرر، دل گداز (ترتیب وتدوین)، فاروق عثمان، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۲۹

۱۱۴۔ عبدالحلیم شرر، ۱۸۸۷ء اور ہم، مضامین شرر جلد اول حصہ سوم، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن، ص۲

۱۱۵۔ ایضاً، ص۲۔۳

۱۱۶۔ ایضاً، ص۳۔۴۔۵

۱۱۷۔ ایضاً، ص۱۲۔۱۳

۱۱۸۔ عبدالحلیم شرر، ۱۸۹۰ء کا خیر مقدم، جلد اول حصہ سوم، ص۲۵

۱۱۹۔ عبدالحلیم شرر، ۱۸۹۰ء کا اختتام، ص۳۲

۱۲۰۔ عبدالحلیم شرر، قدر ہر نعمت است بعد از زوال، ص۳۷

۱۲۱۔ عبدالحلیم شرر، ۱۹۰۸ء اور دلگداز، ص۴۷

۱۲۲۔ ایضاً،ص۷۰۔۷۶

۱۲۳۔ عبدالحلیم شرر، دلگداز،ص۷۸۔۷۹

۱۲۴۔ عبدالحلیم شرر، ۱۹۱۰ء سے رخصتی ملاقات،ص۸۵

۱۲۵۔ عبدالحلیم شرر، آ! ۱۹۱۴ء آ،ص۱۳۰

۱۲۶۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو،ص۵۴۴۔۵۴۵

۱۲۷۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید،ص۲۷۲

۱۲۸۔ عبدالحلیم شرر، ہم اچھے ہیں یا ہمارا دلگداز،ص۴۴۱

۱۲۹۔ ایضاً،ص۴۴۱۔۴۴۲

۱۳۰۔ ایضاً،ص۶۶۳

۱۳۱۔ انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ، لائبریری پروموشن بیورو، کراچی، ۱۹۸۴ء،ص۴۳۹

۱۳۲۔ حکیم برہم، مولانا مولوی عبدالحلیم شرر،ص۸۳

۱۳۳۔ فرحت جہاں پوری، عبدالحلیم شرر (سوانح وتخلیقات)،ص۱۷

۱۳۴۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین،ص۵۹۶

۱۳۵۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی،ص۵۶

۱۳۶۔ عبدالحلیم شرر، ۱۹۱۲ء ختم سال اور ہم،ص۱۰۱۔۱۰۲

۱۳۷۔ عبدالحلیم شرر، آ ۱۹۱۶ء آ،ص۱۳۱

باب ششم

عبدالحلیم شرر بحیثیت مکتوب نگار اوران کا اسلوب

الف) مکتوب نگاری آغاز وارتقاء

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضلیت دی، اسے گروہ اور قبیلے میں تقسیم کیا، اور متمدن بنایا۔ اس کو یہ شرف بھی بخشا کہ اس کو طاقت گفتار عطا کی۔ ابتدائے آفرینش میں انسان ایک دوسرے کو اشاروں سے مخاطب کرتا تھا پھر بے ہنگم آوازوں کو کام میں لاتا تھا۔ مختلف قسم کے جذبات مثلاً غصہ، نفرت، محبت کو بے ہنگم آوازوں اور اشاروں کنایوں سے دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ جیسے جیسے انسان تہذیب وتمدن سے آشنا ہونے لگا تو اس کی ضرورت زندگی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ جب آبادی بڑھی اور دور دور بستیاں آباد ہوئیں تو بے ہنگم آوازوں اور اشاروں کے ذریعے سے ابلاغ کا کام نہ ہوسکا تو انسان نے تصویر بنا کر اپنا پیغام اپنے عزیزوں اور دوستوں تک پہنچانے کی کوشش کی اور پھر جب حروف تہجی ایجاد ہوئے تو انسان نے اپنا پیغام تحریر کی صورت میں بھیجنا شروع کر دیا۔ خطوط نویسی سے پہلے رقعہ نویسی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر شہناز انجم رقمطراز ہیں: ''......خط سے بہت پہلے ہمارے سامنے صرف رقعہ ہی آتا ہے۔ یہ اپنے لفظی معنوں میں نظم یا نثر کی شکل میں وہ تحریر ہے جو عام طور پر ''انجیل'' کے اقتباسات پر مشتمل ہوتی ہے......''[1]

> خط عربی زبان کا لفظ ہے اور لغوی اعتبار سے اس کے معنی ''لکیر'' یا ''سطر'' ہیں۔ عربوں کے یہاں یہ لفظ تحریر کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ بظاہر ''خط'' سیدھا سادہ اور دوحرفی لفظ ہے جو عام طور پر دو اشخاص کے درمیان ترسیل خیال کا تحریری ذریعہ ہے۔[2]

ڈاکٹر شہناز انجم کی اس تعریف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خط عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی سطر یا لکیر کے ہیں۔ پہلے عربوں کے یہاں یہ لفظ تحریر کے لیے استعمال ہوتا تھا اور بعد میں نامہ، مکتوب اور مراسلہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ مکتوب نویسی ادب کی قدیم ترین شکل ہے۔ خط کو بالعموم نصف ملاقات کا نام دیا جاتا ہے۔ خط بالمشافہ ملاقات کی کمی کو بہت حد تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بعض اوقات خط میں وہ باتیں بھی لکھ دی جاتی ہیں جن کا برملا اظہار مشکل ہوتا ہے۔ اس صورت میں خط کی اہمیت وافادیت بالمشافہ ملاقات سے بھی

زیادہ ہوجاتی ہے۔ خط نجی اور ذاتی باتوں کے اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس میں لکھنے والا اپنی شخصیت کو کھل کر بیان کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ وہ تحریر ہے جس کی تشہیر نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مخاطب کو رازداں بنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ مکتوب نویسی ادب کی قدیم ترین شکل ہے۔ خط کو بالعموم ''نصف ملاقات'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ خط بالمشافہ ملاقات کی کمی کو ایک حد تک پورا کرتا ہے۔ بعض اوقات خط میں وہ باتیں بھی لکھ دی جاتی ہیں جن کا اظہار منہ پر مشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں خط کی اہمیت بالمشافہ ملاقات سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ خطوط نگاری کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> خطوط نگاری ذاتی اور نجی عمل ہے۔ اس لیے اسے بالعموم باقاعدہ فن کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ فن شخصیت کا پردہ ہے لیکن خط کسی پردے کو قبول نہیں کرتا۔ فن ابلاغ عام کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن خط شریک عام سے گریز نہیں کرتا۔ خط کی غایت اولاً خبر رسانی بھی ہے اور مخاطب کو رازداں بنانا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا بھی۔ اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے یہ سمجھ کر لکھا جاتا ہے کہ اس کی تشہیر نہیں ہوگی اور مکتوب نگار اپنی شخصیت کو آشکار کر رہا ہے تو اس کی حقیقت مکتوب الیہ تک ہی محدود رہے گی۔[۳]

معین الدین احمد انصاری خط کی تعریف اس کے آغاز وارتقاء اور اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب سے انسان نے لکھنے کا آغاز کیا اس کا پیام دوسرے تک پہونچنے کا طریقہ بھی شروع ہوا۔ جیسے آج ہم مکتوب نگاری کا نام دیتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ کام ٹھیکروں اور درختوں کی چھال سے لیا جاتا تھا اور آج ہم کاغذ کے ذریعے اپنا پیام دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ مکتوب نگاری کی اصل غرض آج بھی وہی ہے جو اس زمانے میں تھی ......موجودہ مکتوب نگاری زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے اس میں کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی۔ اس کے علاوہ اس میں اپنے خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ غرض یہ کہ وہ ساری باتیں جو ملاقات میں ممکن تھیں خطوط نویسی اور مکتوب نگاری کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔[۴]

جبکہ مکتوب نگاری کے ضمن میں شہاب الدین ثاقب کا خیال ہے: ''مکتوب نگاری کا تعلق سماجی ضرورتوں سے ہے جو سب کو درپیش رہتی ہیں۔''[۵] ڈاکٹر خورشید الاسلام رقمطراز ہیں:

> ناول یا افسانہ لکھتے وقت فنکار کے ذہن میں قارئین ہوتے ہیں۔خط لکھتے وقت دماغ میں نہ کوئی غول بیابانی ہوتا ہے نہ کوئی محفل۔ایک باتیں کرنے والا ہوتا ہے۔ ایک باتیں سننے والا۔اس عمل میں صرف دو انسانوں کی خودی بیدار ہوتی ہے۔صرف دو انسان زندہ ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ ساری دنیا غنودگی کے عالم میں ہوتی ہے ......یہی وجہ ہے کہ انسان کے وہ سب سے دلکش اور نازک پہلو جو اس کے بلند ادبی کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے۔ خطوں میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔[۶]

ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال میں: خطوط نگاری گو ایک معمولی کاروباری چیز ہے مگر یہ ایک آرٹ بھی ہے۔خطوط نگاری کا مقصد چند معلومات کو پیام کی شکل میں چند باتوں کو تحریر کے جامے میں مکتوب الیہ تک پہنچانا ہے۔[۷]

بقول یوسف جمال انصاری: خط و کتابت ایک فطری اور بے تکلف طریقہ اظہار ہے جس میں انسان اپنے حالات و خیالات کو سیدھے سچے طریقے سے ظاہر کرتا ہے ......[۸] بقول شیلے: 'خط عام طور سے مکتوب نگار (پہلا آدمی) اور مکتوب الیہ (دوسرا آدمی) کے بیچ تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے۔'[۹]

مکتوب نگاری کی ابتداء:

مکتوب نگاری کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں مکتوب نگاری کے ابتدائی نمونے روم میں نظر آتے ہیں۔اس لیے کہ اہل روم کی زبان دور دور تک سمجھی و بولی جاتی تھی اور ادبی صلاحیتوں کی مالک بھی یہی زبان تھی۔ یونان جس کو علم و دانش کا مرکز سمجھا جاتا ہے وہاں خطوط نگاری کے نمونے نہیں ملتے وجہ یہ ہے کہ ان کی معاشرتی زندگی بجز روم کی معاشرتی زندگی کے مختصر تھی۔اس ضمن میں ڈاکٹر خورشید الاسلام رقمطراز ہیں:

> مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنت روما کے سایہ میں ہوئی ہے۔ممکن ہے قدیم تہذیب کے دوسرے مرکزوں میں بھی اس نے کچھ فروغ پایا ہو لیکن یہ ثابت نہیں۔یہ عجیب بات ہے کہ یونان میں یہ شغل نہ عوام میں محبوب ہوا اور نہ خواص میں شاید اس لیے کہ ان کی شہری ریاستیں سیاسی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر سیاروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ہر ریاست ایک دنیا تھی۔معاشرت محدود تھی۔ورزش کے میدانوں میں دوستوں کی محفلوں میں لوگ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔[۱۰]

پروفیسر سید مسعود ہاشمی لکھتے ہیں:

روم میں خط نگاری کی ابتداء سرو سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے خطوط میں ہمیں رومی سلطنت کی معاشرتی زندگی، عملی روابط کی شکلیں صاف نظر آتی ہیں۔ مکتوب نگاری کے قواعد اور ضوابط مقرر کیے گئے۔ خطوط کی اقسام سے لے کر آغاز وسط انجام کے قاعدے مقرر کیے گئے۔"

انگریزی زبان و ادب میں خطوط نگاری کا آغاز پندرھویں صدی سے ہوا۔ اس دور میں جو خطوط لکھے گئے وہ بیشتر واقعات کی صورت میں ہیں اور ان میں الفاظ کا اک ہجوم پایا جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں خطوط کی ابتداء اطالوی تراجموں سے ہوئی۔ انگریزی ادب میں نشاۃ الثانیہ کے ساتھ ساتھ مکتوب نگاری کے فن پر بہت کچھ لکھا جانے لگا۔ جمیز پال اس فن کا نقطہ آغاز ہے۔ اٹھارویں صدی میں گرے اور میری ارٹلے کے مکتوب مشہور رہوئے۔ یورپ میں مکتوب نگاری کا آغاز اطالوی تراجموں سے ہوا اور مختلف **مراحل** سے گذرنے کے بعد آج یہ فن ہر جگہ ترقی کے ذینے طے کر رہا ہے۔

اردو میں خطوط نگاری کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اردو زبان کی عمر اتنی زیادہ نہیں، لیکن اس کم عمری کے باوجود اردو ادب خطوط نگاری کی دولت سے مالا مال ہے۔ ابتداء میں فارسی زبان میں خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ جس طرح دوسری اصناف ادب فارسی کے ذریعے سے اردو ادب میں متعارف ہوئیں ہیں۔ اسی طرح خطوط نگاری کا فن بھی فارسی سے اردو میں آیا۔ ایرانیوں کو یہ فن عربوں کی بدولت ملا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مکتوب نگاری ادب کی ترویج وترقی کے لیے نہیں بلکہ تبلیغ دین کے لیے کی جاتی تھی۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب کے ذریعے سے مذہبی احکام کی اشاعت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں با قاعدہ سرکاری ادارہ قائم تھا اور ان کے دور میں فن مکتوب نگاری کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔

فارسی مکتوب نگاری کے فن نے ایران کی بجائے ہندوستان میں زیادہ ترقی کی اور اس کی وجہ یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات تھے۔ یہاں اس فن کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اس لیے کہ سرکار اور دربار کی زبان فارسی تھی اور عرصہ دراز تک یہ فن سرکاری تعلقات اور شاہی آداب کی حدود میں قید رہا۔ شمس الرحمٰن محسنی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

عربی و فارسی خطوں نے حکومت کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کا ان کی نشوونما پر بہت اثر

> پڑا۔حکومت کی طرف سے جو خط لکھے جاتے تھے ان میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔سب سے پہلی بات جس کا لحاظ رکھنا شاہی کاتبوں یا منشیوں کے لیے نہایت ضروری تھا وہ یہ تھی کہ خط میں شروع سے لے کر آخر تک رکھ رکھاؤ باقی رہے۔کوئی حرف حکومت کی آن بان اور شان وشوکت کے خلاف نہ ہو۔خط پڑھنے سے حکومت کی چھوٹی سے چھوٹی کمزوری ظاہر نہ ہونے پائے۔کسی ایسی بات کا بھی خط میں گزر نہ ہونا چاہیے جس سے خط پڑھنے والے کو احساس ہو جائے کہ حکومت کی نظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔[۱۲]

معین الدین انصاری کی اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ:''حکومت کی سرپرستی نے فارسی مکتوب نگاری کے فن کو سنوارا اور اسے آگے بڑھایا۔ابتدا میں ان مکتوبات میں شاہانہ آداب اور آن بان کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔''[۱۳] اس عہد کے مکاتیب میں بے تکلفی،سادگی اور شخصی اظہار نہ ہونے کے مترادف تھا۔فارسی میں بقول مرزا عسکری:

> فارسی میں تو مکتوبات کی اور رقعات کی وہ کثرت ہے کہ''پنج رقعہ''''رقعات ابوالفضل''، ''رقعات بیدل''انشائے طاہر وحید''،''رقعات نعمت خان عالی''،''رقعات عالمگیر''فارسی کی بہت مشہور اور متداول کتابیں ہیں۔[۱۴]

یہ مکتوبات اور رقعات حکومت کے انتظامی امور کے پیش نظر لکھے گئے تھے۔فارسی مکتوب نگاری کے تمام تر لوازمات اردو مکتوب نگاری کو اولیت کے طور پر ملے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی مکاتیب میں بھی تکلف،تصنع اور عبارت آرائی نظر آتی ہے۔عبارت آرائی،مشکل پسندی اور پیچیدگی دراصل عظمت اور قابلیت کا نشان تھی یہی وجہ ہے کہ ادباء وشعراء کے علاوہ عام پڑھے لکھے افراد بھی سادہ اسلوب اور اندازِ بیان اختیار نہیں کرتے تھے۔جب برصغیر پاک وہند کے سیاسی وسماجی اور تمدنی حالات تبدیل ہوئے تو انیسویں صدی میں صنف نثر میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔یوں تو مرزا غالب کو اردو خطوط نگاری کا بانی کہا جاتا ہے۔لیکن ان سے قبل بھی اردو خطوط نویسی موجود تھی۔جس کے بارے میں مختلف آراء موجود ہیں۔احسن مارہروی لکھتے ہیں:''اردو زبان میں خطوط نویسی کی ابتدا مرزا غالب نے کی۔''[۱۵] مالک رام نے واضح کیا ہے کہ:''غالب سے پہلے''فسانہ عجائب''والے رجب علی بیگ سرور نے خطوط لکھے اور شائع کیے اور یوں اکا دکا خط تو کئی اور احباب کے بھی ملتے ہیں۔''[۱۶] خواجہ احمد فاروقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:''سرور اور مرزا غالب سے بہت پہلے تپش دہلوی، راسخ عظیم آبادی نے اردو میں خط لکھے۔''[۱۷] حامد حسن قادری کی تحقیق ہے:''بے خبر نے ......اردو میں نثر نگاری وخطوط نویسی کی طرف ۱۸۴۶ء میں توجہ کی تھی غالب سے بھی کچھ پہلے۔''[۱۸] اویس احمد ادیب نے لکھا ہے:''فارسی خطوط نویسی کے خلاف جہاد کرنے

والا اور اردو میں خط لکھنے والا یہی غوث بے خبر تھا مرزا غالب میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ اپنے زمانے کے رجحانات کے خلاف **علم بغاوت بلند** کرتے''۔[۱۹]

ان بیانات سے ثابت ہوا کہ غالب سے قبل بھی اردو خطوط نگاری کی روایت موجود تھی۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان خطوط میں غالب کے خطوط کی سی سادگی، بے تکلفی اور سلاست تھی یا نہیں۔ مرزا غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ آفاق حسین کا خیال ہے:

> اردو نثر کے ارتقاء میں غالب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر مرزا نے آج سے سو سال پہلے سادہ اور بے تکلف اندازِ تحریر اختیار نہ کیا ہوتا تو شاید اس وقت ہماری زبان میں اس طرح کی عبارت آرائی کی جاتی اور ہم اسی طرح قوافی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے۔[۲۰]

بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

> سب سے قابل قدر اور اہم بات جس کا اثر اردو پر پڑا وہ غالب کے خطوط اور رقعات ہیں۔ جن میں انھوں نے ایک نرالا ڈھنگ اختیار کیا ہے یعنی القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ چھوڑ کر وہ روش اختیار کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سامنے بیٹھا ہے جس سے مخاطب ہوتے ہیں۔[۲۱]

غالب کے خطوط نثری خوبیوں اور تاریخی جھلکیوں کے اعتبار سے اہم ہونے کے علاوہ سوانحی اور شخصی جلوہ گری کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں: غالب نے اردو میں باقاعدہ خط لکھنے کا سلسلہ ۱۸۴۸ء۔۱۸۵۰ء کے لگ بھگ شروع کیا اور آخر دم تک جاری رکھا۔[۲۲] ان خطوط کی وجہ سے جہاں اردو خطوط نگاری کا آغاز وارتقاء ہوا وہاں ان کے اندازِ نگارش نے اردو خطوط نویسی کے آداب و مقاصد بھی متعین کیے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> مرزا غالب نے اردو نثر کی تاریخ میں بھی بڑا اضافہ کیا...... انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ ترک کر دیا۔ وہ عام طور پر اس طرح خط لکھتے ہیں۔ جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کے بعض خطوں میں بڑے ڈرامائی انداز کے مکالموں کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ عبارت بناوٹ بے تکلف اور برجستہ ہے۔ اس میں جا بجا ظرافت کی چاشنی ہے۔[۲۳]

ڈاکٹر عبدالقیوم نے درست لکھا ہے:

......غالب جیسے بے نظیر شاعر ہیں۔ ویسے ہی بلند پایہ نثر نگار بھی۔ نثر میں غالب کا سرمایہ صرف وہ خطوط ہیں جو دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کے نام لکھے گئے۔ جن میں دلی کیفیات کو ایک سیدھے سادھے اور بے تکلف انداز میں پیش کیا گیا۔ لیکن اس سادگی میں جو حسن اور تاثیر ہے وہ شاید ہی اردو کے کسی نثار کو میسر آتی ہو۔[۴۴]

اردو میں ابتدائی خطوط نویسی پر تکلف۔ انشا پردازی، مشکل پسندی اور عبارت آرائی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ غالب نے اسے اس بوجھ سے آزاد کر دیا۔ سادہ نویسی کی طرح ڈالی۔ غالب نے روایتی قسم کی مکتوب نویسی کے بت کو پاش پاش کیا۔ سرسید احمد خان کے خطوط سے ان کے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کی محبت اور خلوص کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جمیل یوسف لکھتے ہیں:

سرسید اپنے بے تکلف اور قریبی دوستوں کو کس قدر چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ خان بہادر سید زین العابدین کے نام ان کے اس خط سے ہوتا ہے۔ ’’... ابھی تمہارا خط پہنچا۔ کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا...... حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدایا ذہیں آنا تم یاد آتے ہو۔[۴۵]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خان کے خطوط کا اسلوب، اندازِ بیان کیا تھا؟ شبلی نعمانی نے بھی خطوط لکھے ہیں ان کے بارے میں مفتون احمد لکھتے ہیں:

مولانا کے خطوط کے دو بلکہ تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تو وہ مجموعہ ہے جسے ’’مکاتیب شبلی‘‘ کے نام سے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے..... دوسرا وہ مجموعہ ہے جسے ’’خطوط شبلی‘‘ کے عنوان سے مولوی محمد امین زبیری نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔......[۴۶]

نثر کے عہد تک اور بعد میں بھی یہ روایت برقرار رہی۔ حالی کے خطوط ان کی شخصیت، دردمندی و خلوص کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ محمد حسین آزاد، محسن الملک، وقار الملک، اکبر آلہٰ آبادی، شبلی نعمانی اور دیگر مکتوب

نگاروں نے اس فن کو بہت عروج بخشا۔مولوی عبدالحق کے خطوط میں زبان کا چٹخارہ اور دلچسپی و شگفتگی کا عنصر شامل ہے۔ابو الکلام آزاد کے خطوط انشا پردازی اور ان کے فکر و ذہن کی بلند پروازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔تعداد کے لحاظ سے علامہ اقبال کے اردو مجموعے بہت زیادہ ہیں۔ان کے خطوط ان کی شاعری کی طرح اہمیت کے حامل ہیں۔ مہدی آفادی،محمد علی جوہر،مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کے خطوط بھی اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔عہد شرر اور بعد کے ادوار کے ہر ادیب نے اس فن میں اپنا حصہ ڈالا۔جن میں عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری،جگر مراد آبادی،فراق گورکھپوری،منٹو،پطرس بخاری وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ب۔ شررکے خطوط کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ

اردو مکتوب نگاری کا بغور مطالعہ کریں تو چھوٹے بڑے ادباءاورشعراء کے مکاتیب کے مجموعوں کا ایک دفتر ہمیں نظر آتا ہے۔کاروباری، دفتری یا اخباری مراسلوں کو ہم خط نگاری کے ذیل میں نہیں لاتے لیکن ذاتی اور نجی قسم کے وہ خطوط جن میں مکتوب نگار کی ذات کچھ اس طرح آشکار ہو کہ ادیب اور شاعر کی فطرت کے تمام گوشے اسلوب کی وارفتگی اور قلم کی برجستگی سے وا ہو جائیں اور اس واشگافی میں ادبیت کا رنگ بھی نمایاں ہو، یقیناً ادبی کارنامہ ہیں۔عبدالحلیم شرر کے خطوط بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ اس میں مکتوب نگار کی فطرت کے تمام گوشے ادبیت کے رنگ میں ظاہر ہورہے ہیں۔خطوط کی بہت سی اقسام ہیں جن میں کاروباری خطوط، اطلاعاتی خطوط،تفریحی خطوط، تعزیتی خطوط، عاشقانہ خطوط، سیاسی خطوط اورادبی خطوط وغیرہ شامل ہیں۔پروفیسر سید مسعود ہاشمی لکھتے ہیں:

> خطوط کی اقسام کا ذکر کیا جائے تو خطوط کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔مبارک بادی خطوط، ناصحانہ خطوط،تعزیت نامہ، تشفی کے خطوط، دینی خطوط، محبت نامے، اصلاح نامے اور عام جن میں روزمرہ کو حکایت کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔[۴۷]

خطوط دو طرح کے ہوتے ہیں۔کاروباری خطوط اور نجی خطوط۔کاروباری خطوط کے موضوعات متعین ہوتے ہیں جب کہ نجی خطوط کے متعین نہیں ہوتے۔عبدالحلیم شرر کے خطوط کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ہر قسم کے خطوط ملتے ہیں۔کاروباری بھی اور نجی بھی۔خط چونکہ ایک ذاتی چیز ہوتا ہے اس لیے مکتوب نگار ان ذاتی خطوط میں ہر طرح کی باتیں لکھ دیتا ہے۔بقول رشید حسن خان:

> خط ذاتی چیز تھا اور بے ساختہ اظہار رائے کا مجموعہ گفتنی اور ناگفتنی دونوں طرح کی باتیں لکھ دی جاتی تھیں۔دور بیٹھے ہوئے یاران باصفا اور دوستانِ بے ریا کا باہم گفتگو کرنے کو جی چاہا یا اس کی ضرورت پیش آئی تو خط لکھنے بیٹھ گئے۔جو دل میں تھا وہ کاغذ پر اتر آیا۔کسی خیال کسی بات یا کسی شخص کی مناسبت سے اسے لفظ یا جملے بھی قلم کی زبان سے ادا ہو گئے۔جن کو خوش ذوق اور ذہنی طور پر صحت مند افراد اس دائرے سے باہر کی چیز نہیں سمجھتے۔[۴۸]

عبدالحلیم شرر کے ذاتی خطوط کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان خطوط میں بے ساختگی موجود ہے۔گفتنی اور ناگفتنی کی کیفیت بھی یہاں پائی جاتی ہے۔ان کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے وطن سے دور اپنے دوستوں،عزیزوں کی محفل کو وہ خطوط کے ذریعے سے سجاتے ہیں اور جو ان کے دل میں آتا ہے اسے

لکھ دیتے ہیں۔عبدالحلیم شرر نے اپنے اہل خانہ کوخطوط لکھے ہیں جو کہ خانگی خطوط کی ذیل میں آتے ہیں۔خانگی خطوط کے بارے میں معین الدین احمد انصاری اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> خطوط عموماً دوست احباب اورعزیز واقارب کو لکھے جاتے ہیں اوران کی حیثیت خانگی ہوتی ہے۔لیکن ان کی مدد سے مکتوب نگار کی دلی کیفیات اورحقیقی جذبات ظاہر ہوجاتے ہیں۔ دراصل خطوط دل کی آواز ہوتے ہیں۔[۴۹]

شرر کے خطوط کے مطالعے سے ان کی دلی کیفیات اورحقیقی جذبات کے اظہار کا پتہ چلتا ہے۔شرر نے جو خطوط اپنے عزیز واقارب اور دوست احباب کو لکھے ہیں وہ دراصل ان کے دل کی آواز ہیں۔شرر نے جہاں اور اصناف ادب میں نام کمایا وہاں اس صنف نثر میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔انہوں نے متعدد خطوط لکھے۔ان خطوط میں شرر نے زیست کے معاملات ومسائل کو سادگی وپرکاری اوراپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ وسیع تناظر میں پیش کیا ہے۔انہوں نے دوستوں،عزیزوں، ساتھیوں،ادبی شخصیتوں، سیاسی رہنماؤں، بزرگوں،نوجوانوں، بچوں ہم عمر اور ہر طبقہ کے لوگوں کوخطوط لکھے۔ادبی نوعیت کے خطوط میں ادبی مسائل کا تذکرہ ہے۔سیاسی رہنماؤں کے نام لکھے گئے خطوط میں قومی مسائل اورقومی درد کا بیان ہے۔ماتحتوں اور دوستوں، بچوں،عزیزوں کے نام لکھے گئے خطوط میں ان کے ذاتی مسائل سے دلچسپی ہمدردی وخلوص، کام کی ترتیب اور لائحہ عمل، احساس ذمہ داری اوراپنے فرائض کوخوش اسلوبی سے ادا کرنے کی تلقین موجود ہے۔شرر کے خطوط جہاں ان کی شخصیت، کارناموں کی عکاسی کرتے ہیں وہاں ان کی مخلصانہ اوردردمندانہ طبیعت کے غماز بھی ہیں۔بچوں کے نام لکھے گئے خطوط میں بچوں کی نفسیات اوراستعداد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔مولانا کے خطوط میں سادگی ودلچسپی کا عنصر شامل ہے۔شرر کی شخصیت کی رنگارنگی،مزاج کا تنوع، دل آویزی،خلوص،جذبے کی روانی، دردمندی،قومی زوال کا احساس، تاریخ سے دلچسپی وغیرہ سبھی خطوط میں ملتے ہیں۔ان خطوط میں وہ شخصیت پوری طرح اجاگر ہے جیسے ناول نگاری کا شوق۔اردو زبان اورقومی مسائل سے بے پناہ ہمدردی تھی۔جیسے مضمون نگاری، سیرت نگاری اور سوانح نگاری کا شوق تھا۔جوذودنولیس تھا۔مقصد کی لگن اور جذبے کی صداقت ان میں ہرجگہ پائی جاتی ہے۔مولانا کے اخلاق وعادات،طبیعت اورمزاج کے صحیح عکاس ان کے خطوط ہی ہیں۔ان خطوط کے ذریعے شرر کی علمی وادبی سرگرمیاں، حالات وحوادث پران کے تاثرات،مسائل کی تفہیم اوراس عہد کے سیاسی وسماجی حالات پربھی روشنی پڑتی ہے۔ قومی اداروں کے معاملات۔اردو ہندی تنازعہ،قومی وسیاسی نظریات جیسے اہم معاملات پربھی یہ خطوط روشنی ڈالتے ہیں۔زندگی کی وسعتوں کی طرح ان کے خطوط کے موضوعات بھی وسیع، متنوع اور رنگارنگ ہیں مولانا نے نجی باتوں اورمسائل اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کے بیان میں ایک لطف پیدا کیا ہے۔خطوط کا موضوع کچھ بھی ہوسکتا

ہے۔علمی ،تنقیدی، تحقیقی ،تاریخی ،ادبی ،سوانحی ہرطرح کے خیالات کوخطوط کے پیرائے میں ادا کیا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

اردو میں مکاتیب کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نیاز اور مجنون نے مکاتیب کے پردے میں تنقیدیں لکھیں ۔قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط جیسا ناول محض خطوط کے پیرائے میں لکھا۔ ابوالکلام آزاد نے غبارِخاطر کے خطوط سے انشائیہ نگاری کا کام کیا۔ خطوط میں تنقیدی، تحقیقی، علمی سبھی قسم کے موضوعات اور بحثیں ملتی ہیں۔ ادبی خطوط غالب کا موضوع ان کے نام سے ظاہر ہے۔ انگریزی میں جواہر لال نہرو نے اپنی بیٹی کے نام خطوط میں تاریخ بیان کی۔[۳۰]

خط کے موضوع کے بارے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

جس طرح بات چیت کے لیے کسی موضوع کی ضرورت نہیں اور گفتگو میں کسی موضوع کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔اسی طرح خط میں نہ اصول کی ضرورت نہ خیال کی ضرورت، نہ موضوع کی ضرورت۔[۳۱]

خطوطِ شرر کے موضوعات

عبدالحلیم شرر کے خطوط میں بھی کئی موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔شرر کے خطوط کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں جیسے جیسے خیالات آتے ہیں ویسے ویسے وہ صفحۂ قرطاس پر اتار دیتے ہیں۔خطوط خیالی اصول اور موضوع کے پابند نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ شرر نے اپنے دل کی بات خطوط میں ظاہر کر دی، ان کا لہجہ و زبان اور انداز بیان عام فہم ہے۔عبدالحلیم شرر کا ایک خط ''بنام حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی'' ہے۔اس خط میں شرر نے حکیم سعید الدین صاحب کی وفات کا ذکر کیا ہے اور ان کی خدمت خلق کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:'' جس دن انتقال ہوا ہے عین اسی تاریخ جناب خلیل اللہ خان صاحب کے گھر کے لوگوں کا علاج کرنے کو جانے والے تھے''۔[۳۲] شرر نے ان اوصاف کو بھی سراہا ہے۔ایسے اوصاف اسی طبقہ کے بزرگوں کی ذات سے وابستہ تھے اور ان لوگوں کے اٹھ جانے سے ایسی اوصاف والی ہستیاں بھی ختم ہوگئی ہیں اور اس صدمے کی شدت کا ذکر کیا ہے جو کہ مولانا کو ان کے جانے سے ہوا ہے اور ان کی خوبیوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:'' ......اور بیوہ عورتوں کی

ایک بڑی جماعت کی خبر گری وہی کرتے تھے ۔ اب ان لوگوں کی بے کسی کی حالت ایسی نازک ہے کہ خیال کرنے سے بھی دل کانپ جاتا ہے''۔[۴۳]

اس پورے خط میں حکیم سعید الدین صاحب کی وفات ان کے اوصاف ان کی ذات کی خوبیوں اور لوگوں کے ساتھ ان کے رویے کے بارے میں شرر نے اپنے مخصوص انداز سے لکھا ہے ۔شرر کے خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی حیثیت رہنما کی سی بھی ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور نجی باتوں کا ذکر بھی خطوط میں کرتے ہیں ۔اس خط میں شرر نے اپنی ادبی زندگی اور مصروفیات زیست کا ذکر بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ حیدر آباد دکن میں سیرۃ لکھنے کے لیے بلائے گئے ہیں اور یہاں آکر انھیں یہ بھی حکم ہوا ہے کہ وہ تاریخ اسلام بھی لکھیں ۔نمونے کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے ۔

> میں یہاں حضور کی سیرۃ لکھنے کے لیے بلایا گیا تھا اور میرا سابق کا وظیفہ ملا کے پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ قرار پائی تھی ۔ یہاں آنے کے بعد اس کام کے لیے تین سو تتالیس ماہوار کا عملہ ملا اور مواد جمع کرنے کی کوشش شروع ہوگئی اور دفتر کا نام دفتر شوکت عثمانیہ قرار پایا۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایک فرمان سے حکم ہوا کہ مجھ ہی سے ایک مکمل تاریخ اسلام تصنیف کرائی جائے ۔[۴۴]

یہ خط مولانا شرر نے ۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء کو محبوب پورہ، جام باغ حیدر آباد دکن سے لکھا ہے ۔اس خط کے مطالعے سے اس دور کے نوابوں کے درباروں کے انداز و آداب کا بھی پتہ چلتا ہے ۔یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> میرے حال پر نظر عنایت بھی غیر معمولی ہے ۔مگر باریابی کا موقع ابھی ایک ہی بار ملا ہے لیکن صاحب اور شاہی مزاج کی نزاکت کی یہ حالت ہے کہ اپنے امور متعلقہ کے سوا اور کسی بات کے غرض کرنے کی مجھے یا کسی اور کو جرات نہیں ہو سکتی ۔ آئندہ اگر زیادہ صحبت ہوئی جس کا چار پانچ ماہ قطعی امید ہے اس وقت شاید کسی اور بات کے عرض کرنے کا موقع بھی مل سکے ۔[۴۵]

شرر بول چال کے انداز میں خط لکھتے ہیں ۔ جیسے دو افراد کے مابین گفتگو ہو رہی ہے ۔ایک دوسرے کے حالات دریافت کیے جاتے ہیں ۔ دعا سلام ہوتی ہے، دوسروں کے مسائل کو سلجھایا جاتا ہے ۔اپنی مصروفیات اور مسائل بتائے جاتے ہیں اور اس کے حالات و واقعات کی عکاسی بھی کی جاتی ہے ۔عبدالحلیم شرر نے لندن سے جو

خطوط لکھے ہیں۔ان میں بھی ہرطرح کے موضوعات ملتے ہیں۔مثلاً ۶ اگست ۱۸۸۶ء کوانہوں نے عزیزہ ام محسنہ کے نام ایک خط لکھا جس کا موضوع دادا صاحب کے انتقال کی خبر کا شرر کوملنا اوران کا اظہار افسوس ہے شرر نے ان کی موت کوایک بڑا صدمہ قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بزرگ تھے اورصرف برکت ہی برکت تھے۔اس کے علاوہ عزیزہ ام محسنہ کی طبیعت کی ناسازی کا ذکر کرتے ہوئے شرر نے لکھا ہے:

> تمہاری بیماری کے حالات سن کر میں اور پریشان ہو جاتا ہوں۔شاید مجھے خط لکھنے سے تمہاری طبیعت پر کچھ بار پڑتا ہو......سب سے مقدم تم کواپنی طبیعت کا خیال کرنا چاہیے اور خصوصی آنکھوں کے دکھنے میں تو پڑھنا لکھنا دونوں کاموں سے احتراز کرنا چاہیے۔[۳۶]

اس خط میں شرر نے فاروق کی شرارتوں کا ذکر بھی کیا ہےاور بڑے پتے کی بات بھی بتائی ہے۔

> یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عورتو ں میں رہ کرلڑکے کیوں خراب ہوجاتے ہیں۔یہاں لڑکےعورتوں کے پاس ایسے اچھے اور نیک رہتے ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتا۔مسز نائلز کے دونوں بچےصرف ماں اورنانی اورخالاؤں میں رہتے ہیں مگر ایسے اچھے اور نیک ہیں کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ایک ہمارے یہاں ہے کہ عورتو ں کے ساتھ رہ کرلڑکے ایسے خراب ہوتے ہیں کہ آخر ہرطرف سے ہائے ہائے مچ جاتی ہے۔[۳۷]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ شرر نے اولاد کی تربیت کا موازنہ کس طرح سے کیا ہے؟ شرر کے خطوط میں رنگا رنگ موضوعات پائے جاتے ہیں۔جب وہ لندن میں قیام پذیر تھے اپنے اہل خانہ کو جوخطوط لکھتے تھے ان میں وہاں کے موسموں اورتہواروں کا حال بھی لکھتے تھے۔۲۶ دسمبر ۱۸۹۵ء پنجشنبہ کوایک خط بنام ام فاطمہ ومحسنہ کو لکھتے ہیں اوراس میں کرسمس کا ذکر بھی کرتے ہیں اوروہاں برف باری کے مناظر بھی اہل خانہ کو دکھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> میں الحمد اللہ خیریت سے ہوں۔کل یہاں انگریزوں کی کرسمس تھی جس کوتم لوگ بڑا دن کہتے ہو۔ہر جگہ بڑی خوشی تھی۔ہر ایک دوسرے کومبارک باد دیتا تھا۔بچے کھلونے لیے ہوئے خوش خوش پھرتے تھے۔دعوتیں تھیں اور بچہ کیا بوڑھے تک طرح طرح کے کھیل کھیل رہے تھے۔[۳۸]

اس اقتباس میں شرر نے انگریزوں کے مذہبی تہوار کرمس کا ذکر کیا ہے لوگوں کے رویوں پر اس دن کے اثرات مرتب ہونے کا بھی ذکر اس میں موجود ہے ۔لندن میں موسم سرما کس انداز میں آتا ہے اور برف باری کس طرح اس موسم کی شدت میں اضافے کا باعث بنتی ہے کا منظر ملاحظہ کیجئے:

> کل رات سے برف پڑنا شروع ہوگئی۔اس سے پہلے نہ کبھی برف میرے سامنے پڑی تھی اور نہ میں نے برف پڑتی کبھی دیکھی تھی۔آج رات کو خوب برف پڑی... آسمان سے سفید سفید روئی سی یا بھوسی سی گرتی ہے اور زمین پر گرتی جاتی ہے تمام در و دیوار چھتیں اور سڑکیں سفید ہو رہی ہیں اور ہر جگہ برف کا فرش بچھا ہوا ہے۔اسی برف کی وجہ سے سردی بھی خوب زوروں پر ہے۔کمرے میں آگ روشن ہے۔دروازے بند ہیں مگر یہ عالم ہے کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں اور صرف ٹھنڈے نہیں بلکہ سردی کی شدت سے چہرے اور ہاتھوں پر چونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں مگر آگ بڑی خوبصورت اور اچھی معلوم ہوتی ہے۔[۳۹]

شرر کے خطوط کے مطالعے سے پورا منظر نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے ۳۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۸۹۶ء روز پنجشنبہ کو ایک خط عزیزہ ام محسنہ کے نام لکھا جس میں فاروق کی پڑھائی پر توجہ دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ ماموں اور ام محسنہ کی بیماری کا ذکر ہے۔شرر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے غافل دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ وہ ام محسنہ کو تلقین کرتے ہیں کہ فاوق کی پڑھائی پر خاص توجہ دے یا تو اسے کڑھ کے سکول میں بھرتی کرا دے یا پھر کسی انگریزی دان کو نوکر رکھ لے کہ وہ شد بد جانتا رہے اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ بچے کو اس کی خوشی پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔شرر جہاں فاروق کی پڑھائی پر توجہ دینے کی بات کرتے ہیں وہاں وہ لندن میں راج نظام تعلیم پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ لندن میں چھوٹے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔اگر والدین اپنے بچوں کو سکول نہ بھیجیں تو عدالت ان کو سزا دینے کی مجاز ہے اور وجہ بتاتے ہیں کہ لندن میں ہر فرد کیوں پڑھا لکھا ہے۔لکھتے ہیں:

> ... جب تک اس کے پڑھنے کی طرف خاص توجہ نہ کی جائے گی۔ مجھے اطمینان نہ ہوگا۔یہ سن کے شاید تم کو تعجب ہوگا کہ یہاں انگلستان میں تمام شہروں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے قانون کی رو سے لازمی ہے اگر کوئی اپنے لڑکوں کو نہ پڑھائے یا لڑکیوں کو اسکول نہ بھیجے تو ان کو حاکم اور عدالت کے وہاں سے سزا ہو جاتی ہے۔اسکول کے ماسٹر اور لڑکیوں کے اسکولوں کی ماسٹرنیاں اپنے حلقہ میں اگر کسی لڑکے یا لڑکی کو دیکھتے ہیں کہ وہ اسکول میں نہیں آتے تو سرکار میں اطلاع کرتے ہیں۔ جہاں سے

ماں باپ کو سزا ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یہاں کوئی ادنی سے ادنی مزدور یا مزدورنی یا گھیسارا بھی نہیں ہے جو پڑھا لکھا نہ ہو... [۴۰]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر بچوں کے لیے تعلیم کو کس قدر ضروری سمجھتے تھے اور لندن میں رائج نظام تعلیم سے کس قدر مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ اس اقتباس سے ان کے نظریہ تعلیم پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شرر نے ہر قسم کے موضوعات کو اپنے خطوط میں جگہ دی ہے۔ نجی، ذاتی مسائل اور دلچسپیوں کا اظہار بھی ان خطوط میں نمایاں ہے۔

ان تمام خطوط میں شرر نے لندن میں اپنی مصروفیات زیست اور اہل خانہ سے اپنے دلی لگاؤ، ان کے مسائل اور ان کی خیر و عافیت کا ذکر کیا ہے اور لندن میں لکھے گئے خطوط میں وہاں کے موسموں، پھلوں، کرسمس، وہاں کی رائج تعلیم، خدمت گاروں کے رویوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تمام خطوط بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان خطوط سے ہمیں شرر کی عادات وخصائل کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی مصروفیات اور لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ کچھ خطوط مختصر ترین ہیں اور کچھ طویل۔ شرر کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ہفتہ گھر والوں کو ایک خط لکھا کرتے تھے۔ ان کے یہ خطوط اگرچہ نجی اور ذاتی نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان خطوط کا اندازِ بیان ان کی ناول نگاری، تاریخ نگاری اور دیگر غیر افسانوی نثر سے مختلف ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں امور خانہ سے کسی قدر لگاؤ تھا۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا گر جانتے تھے۔ شرر کے خطوط کے مطالعے سے ان کی ذات و شخصیت اور ان کے فرائض کی انجام دہی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

تم نے وعدہ کیا تھا کہ مکان کا نقشہ روانہ کرو گی۔ وہ نقشہ درکنار خط بھی غائب ہے۔ [۴۱]

مکان کا نقشہ روانہ کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ عزیزہ فاطمہ نے ایک نقشہ بھیجا تھا جس سے اس کی صورت میری سمجھ میں آ گئی۔ اب کچھ ضرورت نہیں کہ تم نقشہ بنوا کر روانہ کرو۔ [۴۲]

شرر نے اپنے خط میں لندن کی سواری کا ذکر بھی کیا ہے:

... سواری یہاں اس قدر آسان ہے کہ صبح تڑکے سے بارہ بجے رات تک ہر وقت ہم جا سکتے ہیں۔ ایک تو ریل ہے جو مکانوں کے نیچے زمین کے اندر جاتی ہے اور یہ پانچ منٹ

> کے بعد ایک ٹرین چھوٹتی ہے۔ دوسری ایک اور گاڑی ہے جس کو یہاں ''بس'' کہتے ہیں۔ تین پیسہ میں وہاں تک پہنچا دیتی ہے۔ ہے تو گھوڑوں کی مگر اس پر چالیس آدمی تک بیٹھ سکتے ہیں۔[۴۳]

اس اقتباس سے ذرائع آمد ورفت پر روشنی پڑتی ہے۔شرر کے خطوط کو پڑھتے وقت قاری اپنے آپ کو اسی فضا میں لے جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔وہاں کے موسم کا ذکر شرر ایک اور خط میں اس طرح کرتے ہیں: ''میں اچھا ہوں۔لیکن کل موسم بدل رہا ہے۔ جاڑا شروع ہوتا ہے اور گرمیوں کا خاتمہ ہے پانی روز برستا ہے جس کی وجہ سے رطوبت بہت زیادہ رہتی ہے۔''[۴۴] اب جاڑا شروع ہو گیا ہے اور دو تین روز سے بڑے غضب کی سردی ہے۔[۴۵]

ایک اور خط میں لندن کے موسم کا حال یوں لکھتے ہیں:

> اب سردی زیادہ ہونے لگی ہے۔بارش قریب قریب روزانہ ہوتی ہے مگر اس پر بھی موسم کا تغیر جاری ہے۔دن بھر میں دو دو حالتیں بدل جاتی ہیں۔کسی وقت قیامت کی سردی اور کسی وقت گرمی۔[۴۶]

درج بالا اقتباسات سے لندن کے موسموں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔شرر چونکہ ایک ادیب تھے۔اس لیے ان کے لیے زندگی کا ہر رنگ اور موسم کی ہر ادا بڑی اہمیت رکھتی ہے۔شرر کی وسعت نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔شرر اِردگرد کے حالات وواقعات اور قدرت کے قائم کردہ تغیر کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔موسموں کے تغیر کا بیان جس انداز سے شرر نے کیا ہے اس کے مطالعے سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور قاری کو وہاں کے موسموں کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر لڑکوں کی تعلیم اور تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔مثلاً جب وہ یہ لکھتے ہیں: ''فاروق کے پڑھانے کا کچھ انتظام کیا گیا یا نہیں؟ ابا نے تھوڑا بہت پڑھایا تھا۔اگر تم لوگ بھی کچھ گھنٹہ دو گھنٹہ محنت کیا کرو تو اچھا ہو۔مگر بچوں کے پڑھانے میں بڑی محنت پڑتی ہے۔''[۴۷]

شرر اپنے قریبی رشتہ داروں سے کس قدر لگاؤ رکھتے ہیں؟ رشتہ داروں اور عزیزوں کے حقوق و فرائض کو بخوبی سمجھتے تھے۔ان خطوط کے مطالعے سے شرر کی شخصیت، سیرت و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ان کے ذاتی اوصاف کا اندازہ اگر کسی نے لگانا ہو تو ان کے خطوط کا مطالعہ کرے۔چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے

بڑی بات کو وہ یکساں اہمیت دیتے تھے۔ ہر ایک کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے ذاتی اور شخصی اوصاف کا مجموعہ ان کے خطوط ہیں۔عبدالحلیم شرر کے خطوط سے ان کی قومی ہمدردی اورقومی دردمندی کی بھی عکاسی ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد خان کی طرح وہ بھی قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے اوران کی بیداری میں اہم کردار تعلیم ہی کوقرار دیتے ہیں۔ شرر کی بھی خواہش ہے کہ ان کے ملک کے لوگ بھی ترقی کرسکیں۔آقا اور غلام کے فرق کو مٹانے والی چیز تعلیم ہی ہے۔جس کے حصول کے بعدان کے ملک کا ہرفرد بھی انگلستان کےلوگوں کی طرح ترقی کر سکتا ہے۔شرر انگلستان کےمزدوروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> تم لکھتی ہو کہ وہاں کے مزدور پڑھ جائیں گےتو ان کے دماغ پھر جائیں گے اور پھر وہ زمین پر قدم نہ رکھیں گے۔حقیقت میں صرف اس بات کی ہندوستان میں ضرورت ہے۔ اگر ہر شخص کو اپنی قدر معلوم ہو جائے تو پھر سارا ملک ترقی کرنے لگے۔وہاں کی شامت تو یہی ہے کہ سوا چند خاص لوگوں کے جو اپنے آپ کوشریف خیال کرتے ہیں۔باقی سب لوگ پاجی سمجھے جاتے ہیں اوروہیں کے شریفوں نے ان کو یہاں تک ذلیل کیا کہ آخر وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گئے اور رفتہ رفتہ جانوروں سے بدتر ہو گئے۔یہاں تعلیم کا یہ نتیجہ ہوگیا ہے کہ درحقیقت خدمت گار اور آقا میں کوئی فرق نہیں رہا۔خدمت گار روپیہ کے معاوضہ میں کام تو کر دیتا ہےمگر اپنی عزت اتنی ہی خیال کرتا ہےجتنی کہ آقا کے دل میں اپنی عزت ہوگی ......[۴۸]

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ شرر انگلستان کی ترقی کا اصل راز یہ بتاتے ہیں کہ وہاں ہر ایک فرد کی عزتِ نفس کا خیال رکھا جاتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اسلامی اصولوں کوپیش نظر رکھ کرترقی کی ہے اور ہماری قوم وملت کی ذلت ورسوائی کا اصل سبب اسلام سے دوری اور آقا وغلام کا امتیاز ہے جس کی وجہ سے آج ہم اس مقام تک نہ پہنچ سکے جس تک انگریز پہنچ چکا ہے۔اگر ہمارےلوگوں کے اندر بھی یہ شعور بیدار ہوجائے تو کوئی شک نہیں کہ ہماری قوم بھی ترقی کی منازل طے کرسکتی ہے۔

شرر کے خطوط میں انگریزوں کی تہذیب وثقافت کے بارے میں مواد موجود ہے اور وہاں کی تہذیب و ثقافت، پھلوں اور دیگر اشیاء، لوگوں کے رویوں کا موازنہ اورتقابل بھی ہندوستانیوں سے کرتے ہیں اور یہ سبب بھی بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے کس وجہ سے ترقی کی ہے اور ہم کیوں ذلیل ورسوا ہور ہے ہیں؟ درج بالا خط کا ایک اقتباس بطورنمونہ درج ہے۔

مسلمانوں کی شامت یہ ہے کہ حکومت ہاتھ سے چلی گئی اور آج تک ویسے ہی اکڑے ہوئے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر مرتبہ ذلیل ہوتے ہیں۔ یہاں انگلستان میں ایک ادنی سے ادنی فرد اپنی اور ملکہ وکٹوریہ کی عزت میں فرق نہیں سمجھتا۔ سارے لوگ ایک قوم اور عدالت کے سامنے برابر خیال کئے جاتے ہیں اور صرف اسی وجہ سے ساری قوم ترقی کر رہی ہے اور اقبال روز بروز چمکتا جاتا ہے۔[۴۹]

عبدالحلیم شرر نے مختصر اور طویل خط لکھے ہیں۔ لندن سے روانگی کے وقت اور ''جبرالٹرا'' پہنچ کر جو خط شرر نے لکھے ہیں وہ بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔ تاکہ ان کے انداز نگارش اور خط لکھنے کے انداز کا پتہ چل سکے کہ وہ کس طرح کے خطوط لکھتے تھے؟

۳۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء

Arnold villas

Slougr

England

عزیزہ ام محسنہ

دعایا۔ اب تمہیں کوئی خط یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں ۳ نومبر کو یعنی آج کے چوتھے دن یہاں سے ہندوستان کو روانہ ہوں گا لہذا اس کے بعد تم میرے خط کا انتظار نہ کرنا۔ اب میں اگر درمیان میں موقع نہ ملا تو حیدر آباد پہنچ کے خط لکھوں گا۔

باقی خیریت ہے۔

(راقم محمد عبدالحلیم شرر)[۵۰]

شرر کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق سے بھی ان کے روابط قائم تھے۔

یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب کو کوئی باورچی ملا یا نہیں... مجھے اتنا معلوم ہوا کہ اگر کوشش کی جائے تو اچھا باورچی بھی ہفتہ عشرے کے اندر مل جائے گا۔ مگر یہ بتاؤ کہ

> تنخواہ کہاں تک دی جا سکتی ہے؟ اچھا باورچی تین روپیہ سے کم پر مشکل سے ملے گا.....
> جب وہ فرمائیں مجھے خبر دو کہ پوری کوشش کی جائے۔ فی الحال مقبول حسین صاحب وصّل
> مولوی محمد سبحان اللہ خان صاحب کی نوکری چھوڑ کر میرے یہاں دلگداز پریس میں آنے کو
> تیار ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی خواہش یہ ہے کہ میں تم کو اور مولوی عبدالحق صاحب کو خطوط
> بھیج کر خواہش کروں کہ انجمن کے کام میں ان سے مدد لیں۔ بہر حال مولوی صاحب سے
> تذکرہ کرو۔ میں بھی انہیں بلا واسطہ لکھتا ہوں ۵۱

خطوط شرر کے مطالعے سے ان کی صلاحیتوں کا صحیح طور پر پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انہوں نے زندگی کے ہر پہلو اور مسئلے کو اس فن میں سمیٹ دیا؟ بقول پروفیسر محمد معین الدین: ''عبدالحلیم شرر نے تاریخی موضوع پر لکھنے میں اپنا جواب نہیں چھوڑا''۵۲ جس طرح تاریخی موضوع پر لکھنے میں ان کا جواب نہیں اسی طرح خطوط نویسی میں بھی وہ تنہا اور منفرد انداز کے مالک ہیں۔ شرر کے خطوط اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ اس سے قاری کو پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں طریقہ تعلیم کیا تھا اور شرر بچوں کے لیے کون سا طریقہ تعلیم پسند کرتے تھے؟ کن کن مضامین کی تعلیم سات سال کے بچے کو دی جاتی تھی فارسی، عربی، اردو اور انگلش چاروں زبانوں کا سیکھنا بچوں کے لیے لازمی تھا۔ شرر کے خطوط میں خصوصاً لڑکوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ شرر جہاں بچوں کے لیے سکول اور مدرسے کی تعلیم لازمی سمجھتے تھے وہاں بچوں کے لیے گھر پر تعلیم کے حصول پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> .....افتخار، اختر اور ضیاء کی لڑائیوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک استاد سے پڑھ ہی
> نہیں سکتے .....لیکن تجربہ یہ ہے کہ ماسٹر صاحب تینوں کو بمشکل پورے دو گھنٹے پڑھاتے
> ہیں۔ لہٰذا مناسب یہ نظر آتا ہے کہ ہر لڑکے کے لیے جداگانہ ماسٹر مقرر کر دیا جائے۔ بلکہ
> اسکول بھی بدل دیا جائے۔۵۳

شرر کے خطوط میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات، تعلیمی نظریات، دلگداز اور مطبع کی صورت حال، لڑکوں کی تعلیم و تربیت جیسے امور، بچوں سے والہانہ محبت کا اظہار، تاریخ اسلام لکھنے کی ذمہ داری، ناولوں کا بیان، ڈرامہ نگاری، مولوی عبدالحق، مولوی وحید الدین، سلیم اور دیگر ادبی شخصیات سے شرر کے تعلقات۔ شرر کی پسند اور ناپسند۔ انجمن ترقی اردو کا ذکر، آخری ایام میں خرابی صحت کا ذکر اور دیگر مصروفیات وغیرہ کا اظہار موجود ہے۔

شرر کی شخصیت خطوط کے آئینے میں :

ان کی ہر صنف ادب میں ان کی شخصیت کے پہلوس نمایاں ہیں۔لیکن خطوط شرر میں شخصیت کا جو عکس دکھائی دیتا ہے وہ دوسری اصناف نثر میں نظر نہیں آتا۔بقول رفیع الدین ہاشمی: ''خطوط کو شخصیت کا بے تکلفانہ اظہار بھی کہا جا سکتا ہے۔''[54] ادب جہاں حالات و ماحول کی عکاسی کرتا ہے وہاں ادیب کی ذات اس کی شخصیت، کردار اور اخلاق پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔بقول معین الدین احمد انصاری:

> ادب نہ صرف حالات اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کا مطالعہ ادیب کی ذہنی کیفیات اس کے احساسات، اس کی طبیعت کے انداز اور اخلاق اور کردار کو بھی ایک حد تک بے نقاب کرتا ہے۔بشرطیکہ ہم اس کی تحریروں میں اس کی فطرت اور شخصی تاثرات کا عکس تلاش کریں۔[55]

شرر کے خطوط کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کے کئی ایک پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور قاری خطوط کے مطالعہ سے شرر کو چلتا پھرتا اور مصروف کار دیکھتا ہے۔کہ بقول معین الدین احمد انصاری:

> خطوط کے ذریعے سے ہم مکتوب نگار کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس کو چلتا پھرتا اور اپنے مشاغل میں مصروف پاتے ہیں... دیگر اصناف ادب سے لکھنے والے کی شخصیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے اس لیے کہ وہاں اس کا قلم محتاط ہو جاتا ہے۔بے تکلفی یکسر غائب ہو جاتی ہے۔وہ جو کچھ لکھتا جاتا ہے اس کا محاسبہ بھی کرتا جاتا ہے اور مخالفت کی عینک سے اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالتا جاتا ہے۔لیکن اس کے برخلاف خطوط میں وہ ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا اس لیے خطوط اس کی زندگی کے بعض ایسے رخ کو بھی نمایاں طور پر پیش کر دیتے ہیں جس کو وہ ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو۔[56]

اردو ادب میں شبلی کے خطوط عطیہ کے نام اور انگریزی ادب میں کیٹس کے خطوط ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔اس لیے کہ ان کے مطالعہ سے ان کی شخصیت اور نفسیات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ایک اچھا خط ہی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔یہی وہ آئینہ ہے جہاں شخصیت کا اصلی روپ واضح طور پر نظر آتا ہے۔بقول مولوی عبدالحق:

> خطوں میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔یہاں بچپن کی سی سادگی سے انسان بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گذرتے

> ہیں۔جنھیں نہ انشاء کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔گویا وہ کاغذ کے صفحہ پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے۔جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔۵۷

خطوط کی طلسماتی دنیا میں مکتوب نگار کی شخصیت کا جو عکس ابھرتا ہے اس میں کہیں وہ خوشیوں میں مسکراتا نظر آتا ہے تو کہیں غموں سے نڈھال اور اُداس۔کبھی غموں میں مسکراتا اور خوشی میں منہ بسورتا نظر آتا ہے۔کبھی دوستوں کے ساتھ قہقہے لگاتا ہوا چلتا ہے۔کہیں عزیزوں کا گلہ کرتا ہے اور رقیبوں سے گلے ملتا نظر آتا ہے۔ان تمام حالتوں میں اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ دل کی دنیا میں کیسی ہل چل ہوتی ہے؟ جذبے کہاں شدید اور کہاں دھیمے ہوتے ہیں؟ ان میں کتنی پیچیدگی اور تہ داری ہوتی ہے؟ یہ سب کچھ خطوط کی عبارت،مضمون،طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کے حسین پردوں سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔مختصر یہ کہ نجی زندگی کی متحرک اور واضح تصویریں خطوط میں جس قدر واضح نظر آتی ہیں اتنی کسی دوسری صنف ادب میں نظر نہیں آتیں۔کشاف تنقیدی اصلاحات میں بھی درج ہے: ''مکتوب میں شخصیت کے اظہار اور ذاتی جذبات و احساسات کے شمول کی گنجائش ہر دوسری تحریر کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔''۵۸ ڈاکٹر سید عبداللہ شخصیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> شخصیت ایک پُر معنی لفظ ہے کسی شخص کی داخلی اور خارجی ہستی کے خصائص اور میلانات سے مل کر جو ایک مجموعی پیکر بنتا ہے اسے شخصیت کہتے ہیں۔گویا شخصیت داخلی اور خارجی خصائص اور میلانات کا امتزاج ہوتی ہے۔۵۹

شرر کے خطوط کے مطالعے سے قاری پر شرر کی شخصیت کے داخلی اور خارجی خصائص اور میلانات کے دروازے وا ہوتے ہیں اور شرر ان خطوط کے آئینے میں اپنی شخصیت کے ہر پہلو کو عیاں کرتے ہیں۔بقول پروفیسر سید مسعود ہاشمی:

> خطوط میں ہماری شخصیت کا پرتو جتنا صاف اور منور نظر آتا ہے وہ ہمارے ادبی کارناموں میں ہرگز واضح نہیں ہو سکتا... شخصیت کی تمام رفعت، وسعت اور گہرائی جس واشگاف رنگ میں صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتی ہے وہ مکتوب نگاری ہی کے مخصوص فن کا کرشمہ ہے۔۶۰

خطوط مکتوب نگار کی شخصیت اور سیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اکثر مشاہیر کی سوانح مرتب کرنے میں خطوط بہت مددگار ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں روزمرہ کے واقعات اور جزئیات شامل ہوتی ہیں۔شخصیت کی تشکیل

میں یہ دونوں پہلو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔اس لحاظ سے ادیبوں اور شاعروں کے نجی خطوط ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ان کے ذریعے ہم ان کی شخصیتوں کے ان پہلوؤں کو بھی اجاگر کر سکتے ہیں جن کا ذکر سوانح عمریوں، تاریخی کتابوں اور تذکروں میں نہیں ملتا۔ڈاکٹر خورشید الاسلام اپنے مضمون خطوط نگاری میں لکھتے ہیں:

> خطوں میں ہمارے لیے وہی کشش ہوتی ہے جو ہمارے لیے ہمارے دوستوں میں ہوتی ہے ......جس طرح فن کی خوبی فن کے چھپانے میں ہے اسی طرح انسان کا کمال خود کو چھپانے میں ہے۔ ریاضی کے مسئلے، ایمان کی نفاستیں، انسانوں کی پرچھائیاں یہ سب پردے ہیں......خطوں میں آپ حکومتوں کا زوال دیکھیں گے۔ان میں بیمار بعض اوقات تندرست معلوم ہوں گے۔غم پسند خوش نظر آئیں گے۔جنہیں آپ مغرور سمجھتے ہیں انہیں انسان دوست پائیں گے۔جنہوں نے میدان سر کیے ہیں ان میں گہری نسائیت ملے گی۔ خاک کے تودوں میں جذبہ پائیے گا۔مردم بیزاری میں نرمی، نزاکت اور خلوص کی آنچ ہو گی ....بید مجنوں پر بہار نظر آئے گی اور کہیں کہیں وہی پائے گا جو جانتے ہیں جو دیکھا ہے جو سنا ہے جن لمحوں میں انسان نے اپنے اوپر قابو پا لیا ہو۔ جہاں وہ خود ہو۔ جہاں آپ اس کے راز داں بن سکیں۔[۲۱]

خطوں سے انسان کی شخصیت کا جیسا اظہار ہوتا ہے ویسا کسی اور صنف نثر میں نہیں ہوسکتا۔ یہ چونکہ نجی اور خالصتاً ذاتی تحریر ہوتی ہے جو اپنوں کو، عزیزوں، دوستوں، رشتہ داروں وغیرہ کو لکھی جاتی ہے اس میں تکلف و تصنع نہیں ہوتا۔ بلکہ مکتوب نگار کے دل میں جو آتا ہے وہ اسے زیب قرطاس کر دیتا ہے۔اس کی شخصیت کا صحیح اور سچا عکس خطوط میں نظر آتا ہے۔اس کی شخصیت کی خوبیاں اور خامیاں اسی صنف نثر میں نمایاں طور پر ابھر کر قاری کے سامنے آتی ہیں۔انسانی شخصیت کے اعلیٰ اور ادنی پہلوؤں کی صحیح ترجمانی انہی خطوط میں ہوتی ہے۔شرر کی شخصیت کا ہر پہلو، ہر رنگ، ہر انداز ہمیں ان خطوط میں ملتا ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> دنیا کی ہر اہم زبان میں ادیبوں اور شاعروں کے ذاتی خطوط کو جو ضرورتاً لکھے گئے ہیں۔دو اعتبار سے اہم گردانا گیا ہے۔ایک تو ان کی نثر کے اعتبار سے دوسرے اس اعتبار سے کہ کسی ادیب یا شاعر کے خطوط سے اس کی ذات یا زمانے پر کیا روشنی پڑتی ہے۔یعنی سوانحی اور تاریخی نقطۂ نظر سے کسی کے خطوط میں قابل ذکر مواد ہے یا نہیں۔[۲۲]

اس لحاظ سے شرر کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے خطوط کے مطالعے سے ان کی ذات و

شخصیت اوران کے عہد کے حالات و واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔سوانحی اور تاریخی نقطہ نظر سے بھی ان کے خطوط میں قابل قدر مواد موجود ہے جن کی وجہ سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔شرر کے خطوط کے مطالعے سے ان کی شخصیت و کردار کی نمایاں خوبیاں سامنے آتی ہیں۔شرر ایک مصروف کار شخصیت تھے۔ان کے شب و روز خدمت ادب میں صرف ہوتے تھے۔ان کے خطوط کے مطالعے سے ان کی فنی وفکری، علمی و ادبی، تعلیمی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی، ذاتی و نجی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ آخری عمر میں بھی وہ اپنی ذمہ داریوں کو باحسن طریق سے نبھاتے تھے۔وہ ایک فرض شناس اور محبت و خلوص رکھنے والی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ان کی مصروفیات اگر چہ بہت زیادہ تھیں لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ ہر ایک کے لیے وقت نکال لیتے تھے اور ہر ایک کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔دوسروں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔شرر مہمان نواز بھی تھے اس کا ثبوت ان کے اس اقتباس سے ملتا ہے:

> ابھی ابھی مولوی وحید الدین صاحب سلیم تشریف لائے تھے جو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے اور میں ان کی کوئی خاطر مدارت نہ کر سکا۔کیونکہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔فقط دو ناول نذر کر دیئے ایک طاہرہ اور دوسرا مینا بازار۔[۶۳]

شرر کی شخصیت کا نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ سے کوئی بات چھپاتے نہیں تھے۔ہر چھوٹی بڑی بات کا اظہار برملا کر دیتے تھے۔وہ اپنے اہل خانہ کا بہت خیال رکھنے والی شخصیت تھے۔اس کا پتہ بھی ان کے خطوط کے مطالعے سے چلتا ہے۔ان کا میل ملاپ بھی بڑے اچھے لوگوں سے تھا۔بڑے بڑے ادیبوں سے ان کے تعلقات تھے اور دیگر افراد سے بھی ان کی شناسائی تھی۔ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا وہ اپنے دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں، اہل خانہ کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔

شرر کے خطوط کی اہمیت وافادیت:

عبدالحلیم شرر نے اپنے عزیزوں، دوستوں، اہل خانہ اور دیگر احباب کو جو خطوط لکھے ہیں ان کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔اس لیے کہ ان سے ہم شرر کے میلانات ورجحانات پسند و ناپسند، اخلاق و عادات، جذباتی و نفسیاتی کیفیت کا اندازہ جہاں لگا سکتے ہیں وہاں ان کی ذہنی قلبی، احساسات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

یہ وہ صنف نثر ہے جو کئی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔خطوط میں مکتوب نگار کی سیرت وشخصیت کے وہ گوشے بھی بے نقاب ہوتے ہیں جو بالعموم عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یہ لکھنے والے کے ذاتی خیالات و عقائد کے علاوہ اس کے دل کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور اس طرح دل کا معاملہ کھل جاتا ہے۔علمی اظہار سے کسی شخصیت کے خطوط کا ذخیرہ اس کی سیرت وسوانح نگاری کا بہترین مآخذ ہے کیونکہ خطوط کی حیثیت آپ بیتی کی سی ہوتی ہے۔خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔خطوں میں مکتوب نگار،مکتوب الیہ سے بلکہ بعض اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے۔اس طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔مکتوب نگار جب تنہا ہوتا ہے اور وہ اپنی تنہائی کو مجلسی رنگ دینا چاہتا ہے تو وہ قلم کاغذ اٹھا کر کسی عزیز یا دوست سے مصروف کلام ہوجاتا ہے اور خلوت کو جلوت کا رنگ دے دیتا ہے۔اور بڑے اعتماد سے اپنی ذات کے احساسات وجذبات سے لے کر بڑے بڑے موضوعات پر یوں خیال آفرینی کرتا ہے کہ تیسرا شخص درمیان سے محو ہوجاتا ہے اور یوں خط لکھنے والا پراثر انداز سے دلی کیفیات،جذبات واحساسات کا اظہار شروع کر دیتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

> اچھا خط روشنی کا وہ دھارا ہے جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف رکاوٹ کے بغیر سفر کرتا ہے اور نا آگہی کو آگہی میں اور اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر ڈالتا ہے۔مکتوب نگار،ادیب،شاعر یا عالم ہو تو خط کی نوعیت یک سر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور یہ محض فراہمی اطلاعات کا پرزہ نہیں رہتا بلکہ ادیب کا نہاں خانہ خیال تک رسائی حاصل کرنے میں بھی معاونت کرتا ہے۔ چنانچہ اچھا خط لکھنا ایک جبلی عطیہ نہیں بلکہ ایسی ویسی قوت ہے جیسے روبہ عمل لانے کی صلاحیت چیدہ چیدہ لوگوں ہی کو عطا ہوتی ہے۔[۶۴]

عبدالحلیم شرر چونکہ ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے۔لہٰذا ان کے خطوط میں بھی یہ روشنی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند خطوط کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> خطوط میں انسان کسی رنگ وروغن کے بغیر اصلی شکل میں ظاہر ہوتا ہے چونکہ خط یہ جانتے ہوئے لکھا جاتا ہے کہ اسے شائع نہیں کیا جائے گا۔اس لیے یہ مکتوب نگار کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کا سچا آئینہ ہوتا ہے۔[۶۵]

عبدالحلیم شرر کے مکاتیب میں بھی جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کا سچا آئینہ دکھائی دیتا ہے۔شرر نے بھی اپنے خطوط میں اپنے دلی جذبات واحساسات کو موثر انداز سے پیش کیا ہے۔شرر کے خطوط اس لحاظ سے اہمیت کے حامل

ہیں کہ ان سے ہمیں شرر کے تعلیمی نظریات، مقاصد تعلیم، بچوں کے لیے تعلیم کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے خطوط سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کس قسم کا طریقہ علاج ہوتا تھا اور کون کون سے ڈاکٹر حضرات نامی گرامی تھے؟ شرر کے خطوط علمی وادبی لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں شرر کے فن کے مختلف پہلوؤں کا پتہ چلتا ہے اور ان کی ادبی مصروفیات وخدمات کا اظہار بھی انہی خطوط میں پوشیدہ ہے۔ مثلاً اپنے برخوردار کو مارچ ۱۹۲۴ء کو دلگداز پریس، کڑہ بزن بیگ خان لکھنو سے ایک خط لکھتے ہیں۔ جس میں اپنی علمی و ادبی خدمات ومصروفیات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> ہمایوں نامہ آج میں روانہ کرتا ہوں۔ شکنتلا کا ترجمہ پہونچا اور اصل کتاب بھی آئی۔ منشی فضل حسین صاحب پھر نہیں آئے۔ ورنہ میں نے ایک ان کے حوالے کر دیا ہوتا ..... مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اس کتاب کے خاص اہتمام سے چھپوانے اور عمدہ ڈزائنز کی تصویریں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہندو آرٹسٹوں نے اس ڈراما کے متعلق تصویریں تو بہت بنائی ہیں مگر اصلیت سے سب دور ہو گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے جو تجویزیں بتائیں وہ بہت بکار آمد ہیں اور اگر ان پر عمل ہو سکا تو اردو ڈراما بلحاظ چھپائی کی نوعیت کا پہلا اور سب سے اعلیٰ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ہر سین کی تصویر جدا ہو۔[۲۶]

شرر کے ان خطوط میں ادبی مصروفیات اور شرر کی تصانیف کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ دو اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> مولوی محمد عبدالحق صاحب امید ہے کہ اچھے ہوں گے۔ دلگداز میں ایک مختصر سا ریویو ''اردو'' پر کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں جم کے مضامین لکھتا رہا جس سے یہ ہوا کہ دسمبر ۲۳ء تک کے پرچے مکمل ہو گئے۔ جنوری اور فروری ۲۴ء کے بھی اس سلسلے میں لکھنے کے بعد ناول نذرانہ لکھنا شروع کروں گا۔ اب کے ارادہ ہے کہ روم کا عہد قدیم اور آغاز مسیحیت کا ایک تاریخی ناول لکھوں جس کا مواد گبن وغیرہ سے لیا ہے۔[۲۷]

تاریخ اسلام بہت اہمیت کی حامل کتاب شرر نے لکھی ہے۔ جس میں شرر نے اپنی معلومات اور وسیع علم اور تاریخی شعور ودلچسپی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی ان کے خیالات اپنے برخوردار کے نام خط میں موجود ہیں۔ لکھتے ہیں:

اب میں نے تاریخ اسلام کا آگے کا حصہ لکھنا شروع کر دیا۔حضرت معاویہ کا عہد لکھ رہا ہوں اور ارادہ ہے کہ ایک جلد مرتب ہونے کے بعد صاف کر کے بندگان فسردی کے ملاحظہ میں بھیج دوں۔ چاہیں لیں یا واپس کر دیں۔[۶۸]

ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں شرر لکھتے ہیں:

دعائے ترقی وعمر و اقبال۔ تمہارا خط پرسوں ملا تھا اور اسی دن مولوی عبدالحق صاحب کا رپورٹ وموازنہ انجمن ترقی اردو پہنچے جن پر مختصر نوٹ لکھ کے اور دستخط کر کے میں نے کل واپس کر دیئے ہیں۔[۶۹]

آخری عمر میں شرر بہت بیمار رہنے لگے تھے۔لیکن اس بیماری کی حالت میں بھی ان کے ادبی مشاغل اور لکھنے پڑھنے کا کام جاری وساری تھا۔جس کا ثبوت اس خط کے اقتباس سے ملتا ہے:

حکیم صاحب اور ڈاکٹر اور احباب سب منع کرتے ہیں کہ لکھنا پڑھنا بالکل چھوڑ دوں،لیکن آخر کیا کروں اور کس طرح زندگی گذاروں۔ اب کی اتنا غنیمت ہے کہ اگر لکھنا پڑھنا چاہوں تو ہوسکتا ہے۔ پہلی مرتبہ کی طرح معذوری نہیں ہے کہ کچھ کر ہی نہ سکوں...... میرے لیے خرابی یہ ہے کہ اب دلگداز نکالنا ہے جون تک کے پرچے نکل گئے......۔[۷۰]

۱۹۲۶ء میں لکھے گئے خطوط بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک تو ان میں شرر کے نجی اور ذاتی زندگی کی عکاسی ہے دوسرے ان کی بیماری کا تذکرہ اور تیسرے ان کی ادبی مصروفیات جو آخر دم تک جاری وساری رہی ہیں کا بھی تذکرہ انہی خطوط میں ملتا ہے۔دفتر دلگداز لکھنو سے ۱۸ ربیع الثانی ۴۵ھ سہ شنبہ (اکتوبر ۱۹۲۶ء) کو اپنے لخت جگر کو جو خط لکھتے ہیں اس میں بھی اپنی ادبی مصروفیات کا ذکر کرتے ہیں۔

تم نے میرا لکھا ہوا مسودہ ''ابوالحسن اشعری'' کی لائف (مجھ سے) لے کر کہیں رکھا تھا اس کو تمہارے پاس ہو تو بھیج دو اور یہاں رکھا ہو تو بتاؤ میں آج کل مسلم اکادمی کے لیے ایک بڑا دوسو صفحہ کا لیکچر تیار کر رہا ہوں۔ جو فرقہ معتزلہ کی تاریخ اور اس کے عروج وزوال پر ہے۔ اس کے لیے کتابوں کی ورق گردانی کرنے میں اس کے لیے تیار ہو گیا ہوں کہ اس لائف کو ایک ہفتہ میں تیار کر دوں۔ لہٰذا یاد کر کے اور کوشش کر کے اس کا پتہ دو تا کہ ایک اچھی سی کتاب تیار ہو جائے۔[۷۱]

شرر کے خطوط اپنے اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔شرر نے خطوط لکھنے کا گر اپنے قاری کو سیکھا دیا۔ایک سوانح نگار کے لیے یہ خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔شرر کی زندگی کے کئی ایک پہلو ان خطوط کے پیرائے میں پوشیدہ ہیں۔شرر کی ذات، شخصیت، ان کی خدمات، زندگی کے تمام پہلو ان خطوط میں موجود ہیں۔ان خطوط کی اہمیت وافادیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ شرر کی ادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے۔ان کی معلومات، ان کا مشاہدہ، وسعت مطالعہ، وسعت نظر کا صحیح عکس یہی خطوط ہیں۔شرر کے فن ان کی شخصیت ان کی ادبی خدمات کو اگر کوئی سمجھنا چاہتا ہے تو ان کے خطوط کا مطالعہ کرے۔ یہاں پر تاریخی ناول نگار شرر نہیں بلکہ ایک اور ہی شخصیت دکھائی دیتی ہے۔شرر کی مجلسی زندگی، ان کی نشست و برخواست، ان کی ہمدردانہ شخصیت، ان کا قومی درد، غرض ہر پہلو ان خطوط میں موجود ہے۔شرر ایک باہمت اور بہادر انسان تھے۔اپنے فرائض کو پہنچانے والی شخصیت تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی انہوں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے منہ نہ موڑا۔شرر کے خطوط میں ایک مخلص اور بے ریا انسان کا دل دھڑکتا ہے۔مسلمانوں کی پستی، ذلت اور نکبت پر دل سوزی اور ہمدردی و غمگساری کا جذبہ موجود ہے۔وہ غم نہیں جو زندگی کو مفلوج بنا کر رکھ دے۔ بلکہ وہ کسک ہے جو زندہ دلی، عزائم کی بلندی اور احساسات کو زندگی عطا کرتی ہے۔شرر نے خطوط اپنی ضروریات کے تحت لکھے تھے۔اس لیے یہاں صاف اور سیدھا راستہ موجود ہے۔کام کی باتیں کام کی زبان میں ہیں۔ملکی وقومی مسائل بھی ہیں۔ بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت اور نوجوانوں کی ہمت افزائی کا پہلو پایا جاتا ہے۔شرر، دوست، مخلص، بزرگ اور صالح شفیق ہر حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔شرر کے خطوط دوسروں کے خطوط سے منفرد ہیں۔حالی کے خطوط میں سادگی پائی جاتی ہے۔سرسید کے خطوط میں مقصدیت کا پہلو نمایاں ہے۔ غالب کے خطوط میں آرزوئے ہم کلامی اور شبلی کے خطوط میں جوش حیات پایا جاتا ہے۔محمد حسین آزاد کے خطوط میں زبان کی رنگینی اور لطافت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔اکبر کی دنیا سب سے الگ تھی۔ وہ تو طنز ومزاح کے دلدادہ اور دکھتی رگوں کو پکڑنے والے تھے۔اکبر کے خطوط میں ان کی ذات اور ان کا فن باہم شیر وشکر ہوگئے ہیں۔مہدی کی نکتہ رسی خطوط نگاری کے فن میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی بھی اچھے خطوط نویس تھے۔شرر کے خطوط میں مکتوب نگاری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔غرض غالب سے لے کر مولوی عبدالحق رشید احمد صدیقی تک تمام مکتوب نویسی کی بزم کو سجاتے رہے۔شرر بھی ان لوگوں میں سے اور اسی عہد کے ادیب تھے۔ جنھوں نے اس بزم کو سجانے میں اہم کردار ادا کیا۔ان کے مکتوبات بھی اپنی جگہ مسلم اہمیت وافادیت کے حامل ہے اور کوئی بھی فرد اس حیثیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

علمی، قومی اور مذہبی وادبی خدمات انجام دینا شرر نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ جوانی کے دور

سے انہوں نے تخلیق ادب کے میدان میں قدم رکھا اور زندگی کے آخری ایام تک اس میدان کی آبیاری کرتے رہے۔شرر کی زندگی کا یہ سارا زمانہ مختلف خدمات اور مسلسل مصروفیات کی نظر ہوا۔ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں انہیں اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل خانہ سے محبت وعقیدت تھی وہاں قومی ہمدردی، جذبہ ایثار و قربانی بھی موجود تھا۔اصلاح پسندی اور مقصدیت کو لے کر وہ میدان ادب میں داخل ہوئے تھے۔دنیا اور دینی علوم پر چونکہ مہارت تھی۔وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے مقابلہ کرنا جانتے تھے۔ان کی طبیعت میں جدت پسندی بھی تھی اور مذہبی لگاؤ بھی۔سرسید احمد خان کی طرح انہوں نے بھی اپنی قوم اور ملت کے دل میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ انہیں تاریخ سے خاصا لگاؤ تھا۔اس لیے تاریخ کے ہر پہلو اور موضوع کو اپنے فن میں جگہ دی اور اس کے ذریعے سے اپنی قوم وملت کی خدمت کی۔

شرر نے جو خطوط مختلف لوگوں کو لکھے ہیں وہ اپنی جگہ اہمیت وافادیت رکھتے ہیں۔اگر چہ مکتوب نگاری کا بنیادی مقصد ترسیل خیالات وجذبات اور احساسات ہے۔خطوط نویسی کا ایک خاص رشتہ ادب کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر شہناز انجم لکھتی ہیں:

> مکتوب نگاری کا تعلق چونکہ انسانی زندگی اور اس کے تمدن سے وابستہ ہے اور تمدن انسانی افکار و اعمال کی جہت پر محیط ہے جس میں معاشرتی اصول، ادبی قدریں اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سب کچھ شامل ہے۔لہٰذا مکتوب نگاری کا جو رشتہ تمدن سے ہے وہی ادب سے بھی ہے۔اس تعلق کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے سماج نے ارتقائی مدارج طے کیے اور تمدنی حالتوں میں تبدیلیاں ہوئیں ویسے ویسے ہی مکتوب نگاری کا فن بھی نکھرتا اور سنورتا گیا۔خط چونکہ زندگی کی ''چھوٹی چھوٹی باتوں'' سے عبارت ہوتے ہیں اسی لیے ان میں زندگی کی جزئیات، تفصیلات، رنگا رنگی، بوقلمونی سب کچھ ہوتی ہے۔خط انسان کے رنگ افشاں جذبات/ مجروح تمناؤں، کرب ناک لمحوں کا عکس ہوتا ہے۔اس کے نشہ ونشاط کی کیفیت ہوتی ہے اور ایسے ذاتی خطوں میں زندگی کا حسن اور اس کی رعنائیاں نظر آتی ہیں۔حقیقت کی تلخیوں کے ساتھ ہی پُر امید خوابوں کی لطافت اور خوابنا کی ملتی ہے۔دل نوازی کے ساتھ دل گدازی کا پہلو بھی ہوتا ہے۔لکھنے والے کی شخصیت بےنقاب ہوتی ہے اس کے مزاج، کردار اور ردِ عمل سے اسلوب پر روشنی پڑتی ہے۔اس کے عہد، خاندان اور ماحول کی جھلکیاں بھی ہوتی ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب میں خطوط نویسی کا اہم مقام ہے اور اس کا ادب سے گہرا تعلق ہے۔[۴۷]

کی تحریروں میں بعض جگہ پر منظر کشی عروج پر بھی دکھائی دیتی ہے۔ مناظر قدرت کی تصویر کشی کے بہت عمدہ اور فطری نمونے ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں موجود ہیں۔ ''فردوس بریں'' میں انہوں نے اپنے آپ کو اچھا منظر نگار ثابت کیا ہے۔ یہاں انہوں نے منظر کی مناسبت سے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں: ''منظر نگاری بھی اس ناول میں معتدل، حسین، دل کش اور رنگین ہے۔ خصوصاً جنت کی مرقع کشی تو غضب کی ہے۔ اس میں شرر نے محاکات کا حق ادا کر دیا ہے۔''[۱۸]

بقول مولانا صلاح الدین احمد: ''جہاں کہیں وہ منظر نگاری کرتے ہیں، ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر گل گلزار کھلاتا چلا جاتا ہے۔''[۱۹]

ڈاکٹر سہیل بخاری شرر کی منظر نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں: ''منظر نگاری میں البتہ شرر کو قدرے شہرت حاصل ہوگئی ان کے مناظر رنگین اور جاندار ہوتے ہیں۔''[۲۰]

شرر کی منظر نگاری کے بارے میں پروفیسر عبدالسلام اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> شرر بھی منظر کشی کے بڑے شائق ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شرر میں یہ شوق اسکاٹ کی تقلید میں پیدا ہوا ہو جو لوگ صرف عبارت آرائی یا انشا پردازی پر جان دیتے ہیں وہ شرر کے مناظر کے بڑے مداح ہیں...... ان کے مناظر مرثیوں کے مناظر کی طرح ہیں۔ ان کے بیانات سنے سنائے اور کتابی سے نظر آتے ہیں۔[۲۱]

شرر کے مناظر کی رنگینی اور تازگی ان کے شاعرانہ مذاق کی بدولت ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ اکثر شرر نے منظر کشی کے دوران میں احتیاط سے کام نہیں لیا کیونکہ منظر کشی کرتے وقت انہوں نے حقیقت و تخیل میں امتیاز کو روا نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں اکثر مناظر ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے زبردستی ان کو شامل کر لیا ہے۔ ان آوردہ مناظر کی وجہ سے ان کی منظر کشی میں خصوصی رنگ پیدا ہو جاتا ہے لیکن جہاں قدرتی مناظر کی منظر کشی شرر نے کی ہے وہاں پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے فطری اور عمدہ نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ خاص طور پر ان کی افسانوی نثر میں ''فردوس بریں'' میں منظر کشی کر کے شرر نے ثابت کر دیا کہ وہ اس فن میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور اس میں وہ خود کو ایک اچھا منظر نگار ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے قاری پر یہ بات کھلتی ہے کہ اس میں منظر کشی کرتے وقت شرر نے منظر کے مطابق الفاظ استعمال کیے ہیں تاکہ تاثر کا طلسم قاری پر طاری ہو جائے۔ شرر کی مقصدیت اور قومی اصلاح کے جذبے نے ان کے اسلوب میں خطیبانہ رنگ پیدا کر دیا ہے۔ ان کا یہ خطیبانہ انداز جذبے و اخلاق کی آمیزش سے

اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شرر کے خطوط اگر چہ ذاتی اور نجی ہیں۔لیکن ان خطوں میں بھی زندگی کا حسن اور رعنائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔دل نوازی اور دل گدازی کا پہلو بھی یہاں موجود ہے۔ یہاں شرر کی شخصیت بے نقاب ہوتی ہے ان کے مزاج، کردار اور اسلوب پر روشنی پڑتی ہے۔شرر کے عہد، خاندان اور ماحول کا عکس یہاں نظر آتا ہے۔اس لیے ان کا بھی اردو ادب میں ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ جو ان کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ بقول پروفیسر سید مسعود ہاشمی:

> خطوط نگاری، خلوت نگاری اور نہاں نگاری کا وہ آئینہ ہے جس میں درون پردہ رازوں کا انکشاف بھی ہے۔سوانح عمری کا خام مواد بھی ہے۔خط نگار کی شخصیت کا مکمل آئینہ بھی ہے اور اسلوب کی نادر کاریوں سے ادبی شان کے بھی ہیں۔خطوط نگاری حقیقت میں ایک ایسا شائستہ فن ہے جس میں ذاتی معاملات ادب پارے کی سی لطافت اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور یہ بات اسی صنف کے ضمن میں بہت اہم ہے کہ یہ صنف ادب دوسری تمام اصناف سے زیادہ شخصی نوعیت کی ہے۔[۴۷]

عبدالحلیم شرر کے خطوط اگر چہ ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن ان خطوط کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے۔شرر نے خطوط کے مقاصد و آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔شرر کے خطوط میں مدعا نگاری کا عنصر شامل ہے۔چونکہ خط کا اولین مقصد مدعا نگاری ہی ہوتا ہے۔خطوط شرر کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوئی ہے کہ وہ اپنا مدعا اور مقصد کس پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ان کا ہر ایک خط چاہے وہ ان کی بیوی، بچوں، بھائی، دوستوں، عزیزوں یا اہل خانہ کے کسی بھی فرد کے نام لکھا گیا۔ ہر ایک میں مدعا نگاری کا عنصر شامل ہے ان میں بھی اختصار پایا جاتا ہے۔دلکش انداز بیان بھی موجود ہے اور قاری کے لیے دلچسپی اور تاثیر کے عناصر بھی۔خطوط شرر کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شرر نے بھی غالب کی طرح خطوط کے مقاصد اور آداب کو ملحوظ خاطر رکھا۔وہ خط لکھنے کا گر جانتے تھے۔ان کے خطوط بھی اردو نثر کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔خط کی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہو اختصار و ایجاز اور سادگی و سلاست موجود ہو تا کہ قاری کو صحیح طور پر سمجھ میں بھی آ سکے کہ موضوع اور مفہوم کیا ہے خط میں مندرجہ ذیل خوبیاں ہونی چاہیں۔سادگی، بے تکلفی، لفاظی و مسجع و مقفیٰ عبارت سے گریز، زبان و بیان کی خوبی، طرز ادا، انداز تخاطب، القاب و آداب، اعتدال کی روش، درد و خلوص کا عنصر، شگفتگی و دلکشی، دلچسپی، سیرت و کردار کا جامع مرقع، غیر فنی، غیر آرائشی۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> خط کا حلقہ اثر مختصر اور بالعموم صرف ایک آدمی تک محدود ہوتا ہے۔خط میں اطلاع آفرینی

خبر رسانی کا عمل بڑی سادگی سے سر انجام پاتا ہے اور اس میں مصنوعی لفاظی، اسلوبی رعنائی یا اہتمام بالا ارادہ کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ خط میں انسان اپنی ذات کی کمیں گاہ کے دروازے صرف اپنے دوست کے لیے کھول دیتا ہے اور اپنی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں میں مکتوب الیہ کی شرکت کو ایک دوستانہ فعل شمار کرتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے خط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام تر صداقت پر مبنی ہو اور مکتوب نگار کے مافی الضمیر تک رسائی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالے۔ خط جتنا غیر فنی اور غیر آرائشی ہو اتنا ہی جاذبِ نظر اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔[۷۳]

دلچسپی، تنوع، دلکشی، رنگا رنگی، عمومیت، سادگی، پیدا کرنا ایک اچھے مکتوب نگار کا اولین فریضہ ہے۔ اگر مکتوب نگار میں دیکھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت ہے تو یہ ساری چیزیں خود بخود خطوط میں آ جاتی ہیں۔ عبدالحلیم شرر دیکھنے اور محسوس کرنے کی خدا داد صلاحیت رکھتے تھے۔ اس صلاحیت سے ان کے خطوط میں جدت پیدا ہوئی اور اسلوب بھی بنا۔ انداز مخاطب خط کی جان ہوتا ہے اور بقول معین الدین احمد انصاری: ''خط چونکہ ملاقات کا نعم البدل ہے اس لیے خطوط میں اندازِ تخاطب ایسا ہوتا ہے۔ جیسے مخاطب سامنے موجود ہے۔ وہی سادگی ہو اور وہی بے تکلفی۔''[۷۵] شرر کے خطوط میں تخاطب کا اندازِ پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

تم یقین ہے کہ اب اورنگ آباد آ گئے ہو گئے۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ اب کہ تم نے موٹر کتنے کو لی۔ کے سلنڈر اور کتنی سیٹوں کی ہے۔ اس زمانے میں تو سنتا ہوں کہ اطراف میں بھی سخت مون سون ہے۔ اس وجہ سے تم کو پہاڑوں کا سفر کرنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہو گی۔ اپنی خیریت سے جلدی اطلاع دو۔[۷۶]

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے کہ شرر کس طرح مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے ہیں۔

مژدہ تازہ یہ ہے کہ رات کو ۲ بج کر ۲۰ منٹ پر اختر سلمہ کا بھائی پیدا ہوا ہے اور صد شکر کہ کوئی زیادہ زحمت اور تردد کی نوبت نہیں آئی۔ ابھی تک کوئی تاریخی نام خیال میں نہیں آیا۔ ایک نام ہے ''مظہر الاسلام'' جو اختر الاسلام کی جوڑ کا ہے مگر اس میں کل ۱۳۲۸ء آتے ہیں۔ ۱۳ اور بڑھائے جائیں تو پورے ۱۳۴۱ھ ہوتے ہیں۔ اگر ''آزاد'' کا لقب بھی اس میں قرار دے دیا جائے تو یہ کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آزاد کے عدد ۱۳ ہیں ایک اور نام ہے جس میں پورے ۱۳۴۱ھ آتے ہیں۔ وہ نام ''محمد منظور احمد'' ہے تم کو ان میں سے جو نام پسند ہو

رکھ دیا جائے۔ تاریخی نام رکھنے کے ساتھ یہ وضع نہیں نبھ سکتی کہ ناموں کا قافیہ بھی ملتا رہے۔ میں تو محمد منظور احمد کو پسند کرتا ہوں۔''

شرر کے خطوط تصنع اور تکلف سے پاک ہیں۔ ان میں غیر ضروری طوالت بھی نہیں ملتی اور شرر کم لفظوں میں زیادہ اور کام کی باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے انداز میں دلکشی اور تاثیر دونوں چیزیں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ مکتوب نگاری کے فن سے شرر بخوبی آگاہ تھے۔ معمولی باتوں کو بھی بڑے موثر انداز سے بیان کرنے کا گر جانتے تھے۔ عبدالحلیم شرر کے خطوط سادہ، سلیس، رواں و دلکش، اسلوب کے بھی عمدہ نمونے ہیں۔ ان میں آمد ہی آمد ہے آورد کا نام ونشان تک نہیں پایا جاتا۔ شرر کے خطوط میں بھی بہت ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ موضوعات کی رنگا رنگی اور اندازِ بیان کی سادگی و پرکاری، دلکش و دلچسپی کے سبب یہ خطوط ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شرر کے خطوط میں ہمیں ان کا مخصوص اندازِ بیان بھی ملتا ہے اور کبھی کبھی وہ انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

2 Arnold Villas

Slough

(England)

(2) Slough (England)

لندن، آرنلڈ ولا

3 23rd october 96.

شرر کے خطوط کے آغاز اور اختتام پر تاریخ اور سال کا اندراج ان خطوط کی اہمیت کو اور بڑھاتا ہے۔ وہ تاریخ، مہینہ اور سال کو اس انداز سے لکھتے ہیں۔ مثلاً:

۱۶ اگست ۱۸۸۶ء

۲۶ دسمبر ۱۸۹۵ء پنجشنبہ

☆ ۳۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۸۹۶ء

روز پنج شنبہ

☆ ۱۲ رمضان ۱۳۱۳ھ

۲۷ فروری ۱۸۹۶ء

☆ ۲۴ اپریل ۱۸۹۶ء

☆ ۱۰ اپریل ۱۸۹۶ء جمعہ

☆ مورخہ ۲ مئی ۱۸۹۶ء انگلستان

اور کبھی کبھی تاریخ، سن اور روز کے ساتھ خط کے آغاز میں جگہ اور مقام کے بارے میں بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً ''عزیزہ ام محسنہ'' کے نام خط کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

☆ حیدرآباد دکن کینٹ

مکان مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی ۷ جنوری ۱۹۰۲ء روز سہ شنبہ

عزیزہ ام محسنہ طولعمر ہا دعا''

۳۱ دلگداز کڑہ بزن بیگ خان ۱۱ محرم الحرام ۱۴ھ

لکھنو

لخت جگرم سلمہ اللہ تعالی۔ ۴۸

شرر کے خطوط میں خود کلامی پائی جاتی ہے۔ وہ بغیر کسی خوف وڈر اور خدشے کے اپنے احساس وجذبات و تصورات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان ایسا ہے کہ تصنع، تکلف اور بناوٹ نہیں ہے، برملا اپنی ذات و شخصیت، اپنی کامیابیوں و ناکامیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ خطوط نویسی کا سب سے بڑا مقصد پروفیسر اسرار احمد سہاروی کے خیال میں یہ ہے:

> خطوط نویسی کا ایک بڑا مقصد راز داری بھی ہے۔ انسان اپنی بعض باتوں کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا ہے اور برملا کوئی بات اگر نہیں کرسکتا تو تحریر کے ذریعے سے اپنے پیغام کو اپنے مخاطب تک بڑی آسانی اور حفاظت سے پہنچا سکتا ہے۔ یہ راز داری کا داعیہ ہی دراصل

> خطوط نویسی کی جان ہے۔ خط دراصل وہی ہے جس میں ایسی باتیں بیان کر دی گئی ہوں جو دوسروں کے لیے نہ ہوں بلکہ صرف مخاطب کے لیے مخصوص ہوں۔ بلکہ ان کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا مقصود ہو اس لیے مشرقی آداب میں خطوط کی راز داری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔[۷۹]

شرر کے خطوط میں ہمیں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو وہ اپنے مخاطب سے برملا کہہ دیتے ہیں۔ شاید کسی تیسرے بندے سے ایسی باتیں کرنا مشکل ہو۔ شرر کے خطوط میں بھی ناصحانہ انداز پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ محسنہ سے کہتے ہیں کہ اپنی باجی سے یہ باتیں کہے تو ان میں نصیحت کا عنصر موجود ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے: ''......اور بچوں کی اچھی طرح خبر گیری کرتی رہیں اور سب سے مقدم یہ امر ہے کہ بچوں کو پاک صاف رکھیں۔ روز نہلائیں، کپڑے روز بدلوائیں، ان کو کوئی میلے کپڑے پہنے نہ دیکھے......''[۸۰]

ایک اور اقتباس بطور نمونہ درج ہے:

> بہتر ہوتا کہ تم حکیمن اور افتخار کو میرے پہونچنے سے پہلے لکھنو میں بلا لو۔ جو عرضداشت حکیمن کی جانب سے میں نے بھیجنے کو لکھی تھی اسے یقین ہے کہ تم نے روانہ کر دیا ہوگا اور اگر نہ بھیجا ہو تو فوراً بھیج دو۔[۸۱]

ایک اور اقتباس دیکھئے جس میں شرر اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

> تم کو کم از کم پندرہ روز کے لیے آنا چاہیے۔ بغیر اس کے نہ کام چلے گا اور نہ اس سے پہلے تم کو فرصت ہو سکے گی۔

> ننھے کی اچکن کے لیے ابھی تک انتظام نہیں ہوا۔ اب بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے جامہ دار کا ایک تھان جو مردانہ وضع کا نفیس ہو۔ اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ میاں میں تم کو اس کی قیمت دے دوں گا۔ میں ۲ دسمبر کو تمہارا منتظر رہوں گا۔ ۳۰ سے پہلے روانہ ہو سکو تو اچھا ہے۔ تاریخ عقد میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ ۱۹ ربیع الثانی، ۹ دسمبر کو ٹھیک دس بجے صبح عقد ہوگا۔[۸۲]

خطوط کی زبان و بیان اور طرز ادا کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اچھے خط کی پہچان یہی ہے کہ اس کا طرز ادا کیا ہے؟ مکتوب نگار نے کیسی زبان استعمال کی ہے؟ جیسا خیال ہو اگر ویسی ہی زبان استعمال کی جائے تو عبارت کا

حسن ودلکشی بڑھتااوراثر وتاثیر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔تکلف اورتصنع کی بجائے سادہ اور عام فہم زبان میں خط لکھنا چاہیے بقول پروفیسر نظیرصدیقی: ''خط گفتگو کا بدل ہوتا ہے اور گفتگو کی زبان پر تکلف نہیں ہوتی۔''۸۳

ممتاز حسین اسلوب اور زبان کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''تکلف کی صورت میں اسلوب کی صفائی پر حرف آتا ہے۔زبان وہی خوبصورت ہے جو خیال کی زبان ہو۔''۸۴

زبان خیالات کے اظہار کا آلہ ہے۔اس لیے اسے خیالات کا پابند ہونا چاہیے اگر خیالات بلند ہیں تو زبان بھی اسی قدر بلند ہو۔اگر خیالات میں ندرت ہے تو زبان کی ندرت ملحوظ رہے۔خطوط چونکہ گفتگو کا نعم البدل ہوتے ہیں اس لیے ان کی زبان تکلف اور تصنع سے پاک ہونی چاہیے۔تکلف کی وجہ سے اسلوب متاثر ہوتا ہے۔ جیسا خیال ہو ویسی ہی زبان استعمال کی جائے۔ چونکہ زبان ہی وہ آلہ ہے جو ہمارے خیالات و جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔جیسے خیالات، جذبات اور احساسات ہوتے ہیں ویسی ہی زبان بھی استعمال کرنی چاہیے۔اس سے نثر پارے کا حسن بڑھتا ہے اور اثر وتاثیر بھی متاثر ہوتی ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں: ''طرز ادا کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں آجائے .....''۸۵ شرر کے خطوط میں بھی طرز ادا کا یہ حسن موجود ہے۔وہ اپنے دل کی بات برملا کہتے ہیں اور دوسرے کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔ شرر جیسے خیالات، جذبات اور احساسات بیان کرتے ہیں۔ویسی ہی زبان اور انداز بھی اپناتے ہیں۔جس سے اثر وتاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔چونکہ خط گفتگو کا نعم البدل ہوتا ہے۔شرر کے خطوط کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ شرر بھی عام فہم اور بول چال کا انداز اپناتے ہیں اور سادہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ایک اقتباس بطور نمونہ درج ہے:

> اختر کی والدہ کی طبیعت تمہارے جانے کے بعد اچھی نہیں رہی۔قلب نہایت کمزور ہے اور ایک دورہ سا ہوتا ہے جس میں ٹھنڈا پسینہ اس قدر آتا ہے کہ پانی برستے میں بھی سارا کُرتا پسینہ سے تر بتر ہو گیا۔اور ہو جاتا ہے۔ساتھ ہی کمزوری اور سستی یہاں تک بڑھتی ہے کہ غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔کل میں نے حکیم عبدالسعید صاحب کو بلا لیا تھا۔ انھوں نے ایک نسخہ لکھ دیا جو کل سہ پہر سے پلایا مگر ابھی تک کوئی نمایاں افاقہ نہیں نظر آتا۔ یقین ہے کہ دو ایک روز میں ضرور فائدہ ہوگا۔۸۶

خطوط نویسی کا ایک لازمی جز اثر انگیزی بھی ہے۔خط اس انداز سے لکھا جائے کہ مکتوب الیہ پر اس کی عبارت اور مفہوم کا اثر بھی ہو۔اثر انگیزی کے بارے میں پروفیسر اسرار احمد سہاروی لکھتے ہیں کہ: ''اثر انگیزی بھی

خطوط نویسی کا ایک اہم اور فطری جز تصور کی جاتی ہے۔ وہ خط خط نہیں جو حسب دلخواہ مخاطب کے دل پر اثر پیدا نہ کر سکے۔''۸۷ شرر کے خطوط میں بھی اثر انگیزی کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لندن میں قیام کے دوران ایک حادثے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مجھے کل رات کو بڑی چوٹ آ گئی اور بات یہ ہوئی کہ رات کو بائیسکل پر سوار جانا تھا۔ ایک موڑ پر مجھے مڑنا تھا۔ میں نے ہزار روکا مگر بائیسکل گاڑی پر جا پڑی اور میرا منہ زور سے گاڑی سے جا ٹکرایا۔ بائیں طرف کے کان میں ایک بہت گہرا زخم ہو گیا۔ میں اسی وقت واپس آ کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے یہ خیال کر کے کہ زخم کا منہ بڑا ہے اور ذرا بھی ٹھہرا تو ورم بہت پھیل جائے گا اور پھر اس کا نشان کبھی نہ جائے گا۔ دو ٹانکے لگا کے باندھ دیا۔ اب تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی قسم کی تکلیف نہیں ایک خفیف سی سوزش ہے اور ڈاکٹر کا بیان بھی یہی تھا، دو دن میں اچھا ہو جائے گا۔ بہر حال کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ مگر خدا نے بڑا فضل کیا اگر بائیسکل ذرا بھی اور آگے بڑھتی تو میں گھوڑے کے نیچے اور پھر پہیوں کے نیچے جا پڑتا۔۸۸

شرر نے جب یہ واقعہ عزیزہ ام محسنہ کو بتایا تو اہل خانہ پر اس کا شدید اثر ہوا اور ۲۴ ستمبر ۱۸۹۶ء کو عزیزہ ام محسنہ کے نام خط میں اس کا اظہار شرر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> دعا یا۔ تمہارا خط آیا جس میں تم نے اپنی اور تمام گھر کی اور والدہ صاحب کی پریشانی میرے منہ کے زخم کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اب اس کی کوئی شکایت نہیں چونکہ چوٹ لگنے میں ڈاکٹر صاحب سے مدد لی گئی۔ لہٰذا زخم بھرنے میں بالکل اچھا ہو گیا۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اس کا نشان باقی ہے اور امید نہیں کہ یہ نشان مٹے۔ اب میں بہت اچھا ہوں۔۸۹

اردو ادب کے جتنے بھی خطوط نویس تھے ان کے سامنے فارسی کے خطوط کے نمونے تھے۔ فارسی خطوط کی عبارت جہاں مسجع و مقفع ہوتی تھی وہاں طرز ادا انتہائی پر تکلف اور القاب و آداب بھی طویل اور گرانبار ہوتے تھے۔ مرزا غالب سے قبل اورنگ زیب اور حضرت مجدد الف ثانی نے خطوط میں بڑے بڑے القاب و آداب کی جگہ چھوٹے اور مختصر القاب و آداب لکھنے کی روایت ڈالی۔ حضرت مجدد الف ثانی بھی ایک دو لفظ میں القاب لکھ کر براہِ راست اصلی مطلب پر آ جاتے تھے۔ عبدالحلیم شرر نے بھی اسی روایت کو آگے بڑھایا اور خطوط میں قدیم قسم کے رائج القاب و آداب کی جگہ مرزا غالب جیسے القاب و آداب ہی لکھے۔ مثلاً جناب من، السلام علیکم، ملجائے و ماوائے من،

آداب و نیاز اور السلام علیکم، لخت جگرم، سلمہ دعا، برخوردار من سلمہ، برخوردار من، دعائے ترقی عمر و اقبال، برادر مکرم و محترم، بردار عزیز سلمہ، برادر عزیز سلمہ السلام علیکم، برادر مکرم السلام علیکم، عزیزہ محسنہ سلمہا، عزیزہ ام محسنہ طول عمر باد عا، عزیزہ ام۔ وغیرہ وغیرہ۔ عبدالحلیم شرر نے جہاں بڑے بڑے القاب و آداب کی جگہ غالب کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے خطوط کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی خط کے آغاز میں آپ تاریخ اور جگہ لکھتے ہیں اور کبھی خط کے اختتام پر تاریخ اور مقام کو واضح کرتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے خطوط میں سادگی کا عنصر بھی موجود ہے اور کہیں تصنع اور بناوٹ نظر نہیں آتی۔

خطوط میں سادگی اظہار کے بارے میں پروفیسر اسرار احمد انصاری کا کہنا ہے کہ:

> خطوط میں خصوصاً سادگی ادا کی اس لیے بھی ضرورت پڑتی ہے کہ لکھنے والا ایک بے تکلف فضا میں ایک دوست یا عزیز کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ بے تکلفی کا ماحول قدرتی طور پر اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اظہار مطلب بھی بے تکلفانہ ہو۔ عالمانہ اظہار ایسی فضا کے لیے سازگار نہیں ہوسکتا۔[۹۰]

عبدالحلیم شرر نے بھی اپنے خطوط میں سادہ زبان، سادہ الفاظ اور عام فہم انداز کو اپنایا ہے۔ کہیں تصنع اور بناوٹ کا اظہار نہیں ہوتا۔ موضوع کی مناسبت سے آسان اور عام فہم الفاظ کو استعمال کرنا شرر کا خاصا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے ان کی یہ خوبی بھی دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح اس عہد کے دیگر مکتوب نگاروں کے ہاں یہ خوبی پائی جاتی ہے اسی طرح شرر کے خطوط میں بھی اس خوبی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

فن خطوط نویسی ادب کی دل کش اور جاندار صنف ہے۔ جس میں تصنع اور تکلف کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ سادگی، بے ریائی، دردمندی اور اخلاص مکتوب نگاری کا اصل جوہر ہے۔ یہی خصوصیت اس صنف کو نہ صرف ادب کا حصہ بناتی ہیں بلکہ اس میں جاذبیت اور تاثر بھی پیدا کرتی ہیں۔ شرر سے قبل اگرچہ مرزا غالب نے اردو خطوط میں سادگی اور سلاست کو رواج دیا تھا لیکن شرر کے خطوط کے مطالعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خطوط نے بھی اردو نثر کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ غالب کی طرح انہوں نے بھی سادگی اور سلاست کو اپنایا۔ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ چھوڑا اور ایسا انداز اپنایا کہ دو انسان باہم گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پرتاثیر انداز بیان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ موقع محل کے مطابق الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی منظر کا نقشہ پیش کرتے ہیں تو اس انداز سے کہ قاری کے سامنے اس چیز کی پوری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ ان کے خطوط میں ادبی اور علمی بحث بھی پائی جاتی ہے۔

مختصراً یہ کہ شرر کے خطوط ان کی نجی و ذاتی اور شخصی زندگی کے بہترین عکاس ہیں۔ ان کی سوانح حیات کا زیادہ مواد انہی خطوط میں پوشیدہ ہے۔ شرر کے خطوط نے مکتوب نویسی کو ایک معیار دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شرر کے خطوط میں تصنع اور تکلف نہیں ہے۔ مسجع اور مقفیٰ عبارت موجود نہیں۔ شرر کے یہ خطوط سادگی و پرکاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان خطوط میں تکلف، تصنع اور خشکی مطلق نہیں ہیں۔ عبارت کی روانی اور سلاست کا یہ عالم ہے کہ قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہے اور مضامین کا یہ عالم ہے کہ دیا رلڈ آتا ہے۔ ان کے خطوط میں باتوں کا مزا بھی موجود ہے۔ یہ خطوط شرر کے ماحول کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہیں۔ شرر کے خطوط ادبی، تاریخی اور سوانحی و شخصی حیثیتوں سے اہم ہیں اور شرر کی زندگی کے آخری سالوں، ان کی مصروفیات، ان کی ادبی سرگرمیوں پر اچھی طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ شرر کی شخصیت اور سیرت و کردار کی خوبیاں خطوط میں پوشیدہ ہیں۔ شرر کے خلوص اور محبت کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے خطوط کا مطالعہ کیجیے۔

ج۔ شرر کا اسلوب

عبدالحلیم شرر کے اسلوب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا اس مقالے میں ممکن نہیں پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ شرر کی تحریر کی نمایاں خصوصیات کی طرف توجہ دی جائے۔ ذیل میں شرر کی تحریر کی نمایاں خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد اسلوب کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> اردو میں اسلوب انگریزی لفظ (Style) کے معنوں میں مستعمل ہے۔ Style فرانسیسی لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی وہ نوکدار اوزار ہے جو پودوں کی جڑوں کو ٹھیک کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس نب دار قلم کو بھی Style کہا جاتا تھا جو لکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اصطلاح میں اس سے مراد اظہار، لکھنے کا رویہ، لکھنے کا طریقہ، خیال کو پیش کرنے کی ہیئت اور عمل کا ایک خاص رویہ ہیں۔ اردو میں Sytle کے لیے اسلوب مستعمل ہے۔ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی طور طریقہ اور ڈھنگ ہیں۔ اصطلاح میں اسلوب سے مراد لکھنے کا انداز، اظہار اور خیال کو پیش کرنے کا طریقہ ہے۔[۹۱]

اردو میں اسٹائل کے لیے اسلوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلوب کے لغوی معنی طور طریقہ اور ڈھنگ کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد لکھنے کا انداز، اظہار اور خیال کو پیش کرنے کا طریقہ کار ہے۔ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے۔ حسن عسکری اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

> اچھا اور کارآمد اسلوب وہ ہے جو ہمارے طرزِ احساس سے پیدا ہوا ہو اور اس کا ساتھ دے سکے۔ برا اسلوب وہ ہے جو ظاہر میں کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ معلوم ہو مگر ہمارے تجربے کو اصل شکل میں پیش کرنے یا اس کی قلب ماہیئت کرنے کے بجائے اسے مسخ کر کے رکھ دے اور اس طرح نئے تجربات کا راستہ روک دے یا یوں کہے کہ ہمیں خود اپنی ہستی کو سمجھنے کی اجازت نہ دے۔ اس قسم کے ازکار رفتہ اسالیب خود ہماری شخصیت انفرادی شخصیت اور اجتماعی دونوں کو کچل سکتے ہیں۔[۹۲]

اس سے ثابت ہوا کہ اچھا اسلوب وہ ہے جو طرزِ احساس سے جنم لے اور اس کا ساتھ دے۔ برا اسلوب وہ ہوگا جو دیکھنے میں تو بھلا معلوم ہو لیکن طرزِ احساس کو اصل صورت میں پیش کرنے سے قاصر ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ لکھتے وقت کچھ باتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ صرف و نحو کی پابندی کرنی پڑتی ہے لیکن ان باتوں کا خیال رکھنے سے بھی بعض اوقات وہ اسلوب پیدا نہیں ہوسکتا۔ سید عابد علی عابد کا خیال ہے کہ:

یہ درست ہے کہ معانی اور بیان کی کچھ خصوصتیں ہیں جن کا لکھنے میں دھیان رکھنا پڑ تا ہے۔ صرف ونحو کی کچھ پابندیاں ہیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ محض ان باتوں کا لحاظ رکھنے سے اسلوب پیدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس معنی میں بھی جہاں وہ مہارت تحریر سے عبارت ہوتا ہے۔میرے خیال میں تو اعلیٰ درجے کے فن کار صرف ونحو اور معانی و بیان کی پابندیوں اور حدود کو توڑ سکتے ہیں اور اس کے باوصف وہ اسلوب بھی اپنی تحریر میں پیدا کر سکتے ہیں جو مقصودِ فن ہے۔[۹۳]

اسلوب کے ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

اسلوب کسی چیز کو عصری تازگی کے ساتھ ساتھ تصدیقی پہچان بھی عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جے براؤن کا کہنا ہے کہ اگر خیال کی مثال سونے کی ہے تو اسلوب وہ ہیرا ہے جو اسے عصری سچائی دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ یہ کس بادشاہ کی ٹکسال سے جاری کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جے براؤن نے اسلوب کو اس لحاظ سے فوقیت دی ہے کہ ہر دور کا اسلوب اپنے عہد کی پہچان ہوتا ہے۔......اسلوب ہر عہد میں نہ صرف تبدیل ہوتا ہے بلکہ ایک لکھنے والے کو دوسرے لکھنے والے سے جدا بھی کرتا ہے۔[۹۴]

ہر ایک ادیب کی اپنی پہچان ہوتی ہے اور یہ پہچان اسے اپنے اسلوب بیان کی وجہ سے ملتی ہے۔اسلوب بیان شخصیت کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔جیسی شخصیت ہوتی ہے ویسا ہی اس کا اسٹائل بھی ہوتا ہے۔ بقول سجاد نقوی:

...ہر قابل ذکر ادیب اپنے اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ ادب کے بنیادی مضامین اور خیالات تو ہر کسی کے یہاں ہیں۔مگر جو چیز انہیں پہچان اور شناخت عطا کرتی ہے وہ ان کا اسٹائل ہے۔جس طرح حسن کی مختلف صورتیں ہیں حُسن سادہ، حُسنِ رنگین، حسن پر تکلف ہیں۔اس طرح یہ تنوع اسلوب میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔یہ مسلمہ ہے کہ حُسن کا جو احساس سچے فنکاروں کو ودیعت ہوتا ہے اس سے دیگر لوگ بہت حد تک محروم ہوتے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ احساس حسن ہی وہ بنیادی قدر ہے جو اکتسابی نہیں۔ وہبی ہے اور یہی کسی کو فنکار کا منصب جلیلہ عطا کرتی ہے۔فنکار اس احساس حسن کا اظہار اپنے اسلوب میں کرتا ہے اور یہ اسلوب گواہی دیتا ہے کہ فنکار کے اندر کس رنگ کا حسن پایا جاتا ہے۔یہ حسن سادہ معلوم ہوگا تو فنکار کے اسلوب میں بھی سادگی و معصومیت جھلکتی نظر آئے

> گی۔اسی طرح اسلوب میں رنگینی فنکار کے اندر چھپے ہوئے حسن رنگین کا اظہار کرے گی اور پر تکلف اور آرائشی اسلوب اس بات کی چغلی کھائے گا کہ فن کار سادگی کے برعکس چکا چوند پیدا کرنے والا حسن اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہے۔[۹۵]

اس سے ثابت ہوا کہ ہر ادیب اپنے اسلوب بیان کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے ہر ادیب کا اپنا الگ اسلوب ہوتا ہے جو اس کی پہچان اور شناخت کا وسیلہ بنتا ہے۔اسلوب مصنف کی شناخت کا ذریعہ ہوتا ہے۔جیسی ادیب کی شخصیت ہوتی ہے ویسا ہی اس کا اسلوب بھی ہوتا ہے۔ڈاکٹر رشید امجد اسلوب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> اسلوب ذات اور شخصیت کا اظہار ہے۔تنقید میں اسلوب سے مراد لکھنے کا وہ انداز ہے جس سے لکھنے والے کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے عصر کا مزاج بھی واضح ہو۔گویا اسلوب شخصیت اور روح عصر کے ساتھ خیال کے اظہار کا وسیلہ بھی ہے۔[۹۶]

اسلوب کسی لکھنے والے کے اس ذاتی وصف کو کہا جاتا ہے جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔اسے لکھنے والے کی شخصیت سے جدا نہیں کر سکتے۔اسلوب ان تمام حالات و واقعات سے تشکیل پاتا ہے۔جس سے لکھنے والا گزرتا ہے اور وہ حالات و واقعات لکھاری کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔عبدالحلیم شرر بھی ایک اعلیٰ پائے کے صحافی اور اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ان کی زبان دلکش و دلنشین اور رواں دواں ہے۔شرر کے سامنے اصلاح کا مقصد تھا۔لہٰذا انھوں نے سادہ اور عام فہم انداز بیان اپنایا ہے اور سادہ و شگفتہ لہجے میں لکھا ہے۔

شرر کی جتنی بھی تحریریں ہیں سب کا رنگ انتہائی دلکش ہے۔وہ تشبیہات و استعارات کو بھی اپنی تحریر میں جگہ دیتے ہیں۔انگریزی الفاظ کو اردو کا جامہ پہناتے ہیں۔اپنی نثر کو موثر بنانے کے لیے اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن سوانح عمریوں میں یہ رجحان کم نظر آتا ہے۔کبھی کبھی ان کی عبارت گنجلک ہوجاتی ہے۔شروع میں ان کا طرزِ تحریر زیادہ مقبول نہ ہوا تھا مگر بعد میں اس قدر مقبول ہوا کہ اخبارات و رسائل میں بھی ان کے رنگ عبارت اور طرزِ تحریر کو اپنایا گیا۔انھوں نے سرسید کا طرزِ تحریر اختیار کر کے سادگی کو اس قدر اپنایا کہ ہر آدمی ان کی تحریر سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔مولانا آزاد کی بے تکلفی اور روانی بھی انھوں نے اپنائی مگر جب وہ اپنی تحریر کو متانت سے مزین کرنا چاہتے ہیں تو اس میں عربی اور انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔شرر کی عبارت میں دو طرح کا رنگ پایا جاتا ہے۔جہاں وہ کوئی سماں کھینچتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کی اور سرور کی عبارت میں یکسانیت پیدا ہوجاتی ہے۔مبالغہ اور قافیہ پیمائی بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔دوسرا بے تکلف انداز بھی ان کی تحریر میں پایا جاتا ہے۔استدلال ان کی تحریر کا خاص رنگ ہے۔مختلف واقعات کا حوالہ دے کر وہ

اپنی تحریر کو مضبوط بناتے ہیں۔ تخیل کی پرواز، فلسفہ زندگی کے ساتھ منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔ شرر کے اسٹائل (Style) یا طرز بیان کے متعلق فیض احمد فیض اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> وہ ہمیشہ بے تکلف اور بے تکان لکھتے ہیں۔ تحریر کی سہولت اور روانی میں کہیں فرق نہیں آتا۔ کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ لکھنے والے کو الفاظ کی تلاش ہے یا اسے کسی بات کے اظہار میں دقت ہو رہی ہے۔ دقت ہو بھی کیسے؟ وہ کسی ایسی پیچیدہ اور انوکھی بات کا نام ہی نہیں لیتے جس کا اظہار مشکل ہو۔ اس لیے ان کی تحریر صرف اونچ نیچ سے پاک ہی نہیں بلکہ بار یکی اور نزاکت سے بھی عاری ہے۔ وہ ہر بات ایک ہی لہجہ اور ایک ہی انداز سے لکھتے ہیں۔[۹۷]

بقول سید وقار احمد رضوی:

> ..... نذیر احمد نے ناول سے پندونصیحت، اخلاق ... اور اصلاح معاشرت کا کام لیا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں اخلاق اور انسانیت دوستی کو اہمیت دی ..... نذیر احمد جزئیات کے بیان پر قادر ہیں۔ جبکہ عبدالحلیم شرر کے ہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ شرر کے ہاں زبان کی لطافت کو انگریزی بندشوں سے مربوط کیا گیا ہے۔ ان کے تشبیہات و استعارات ایشائی ہیں۔ لیکن خیالات پر انگریزی کی چھاپ ہے۔ شرر کے ہاں صناعی ہے لیکن ان کو نذیر احمد کی طرح کردار نگاری نباہنا نہیں آتا۔ شرر تاریخی ناول نگار ہیں۔ جبکہ نذیر احمد معاشرتی ناول نگار ہیں۔ شرر نے چونکہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے ہاں تاریخی رنگ زیادہ ہے۔[۹۸]

اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ اچھا اسلوب وہ ہوتا ہے جس میں مصنف کی شخصیت جھلکتی ہو اور یہ مصنف کے دماغ کا آئینہ ثابت ہو۔ بقول اظہر پرویز:

> ..... اسلوب خود بھی مصنف کی شخصیت کی غمازی کرتا ہے۔ چونکہ اچھا اسلوب تصنع یا بناوٹ سے پاک ہوتا ہے اور فطری ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مصنف کے دماغ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اچھے اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے مصنف کی شخصیت اس ادب پارے میں سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے .....[۹۹]

عبدالحلیم شرر کی افسانوی و غیر افسانوی نثر کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے۔ اسلوب بیان

مصنف کی شخصیت کی غمازی کر رہا ہے۔ ان کا اسلوب تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے اور فطری رنگ لیے ہوئے ہے۔ اسلوب مصنف کے دماغ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شرر کے اسلوب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں شرر کی شخصیت واضح طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ ان کے انداز تحریر میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی جن کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

اسلوب ہی شخصیت کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اسلوب شرر کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے ذہنی خد و خال کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ جن سے شرر کی شخصیت وجود میں آئی ہے۔ شرر اپنے دور کی بڑی شخصیتوں کی طرح بہت سے متنوع اور رنگا رنگ چشموں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ یہ تنوع ان کے ادبی کارناموں میں نمایاں ہے۔ یہی وہ تنوع ہے جس کے زیر اثر ان کے اظہار اور اسلوب بیان میں وہ رنگا رنگی ہے جو اس زمانے کے دوسرے ادیبوں کے ہاں نہیں ہے۔ عبدالحلیم شرر کا انگریزی اور انگلستان سے مسلسل رابطہ کسی نہ کسی صورت عمر بھر رہا تھا اور یہ تعلق ان کے ذہنی ارتقاء پر مسلسل اثر انداز ہوتا رہا۔ اردو نثر میں انگریزی خیالات اور انشا پردازی کا یہ رجحان اس کا غیر شعوری نتیجہ ہے۔ شرر کی تعلیم منتشر اور بکھری ہوئی ہے۔ مٹیا برج کا قیام شرر کی ذہنی تعمیر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی قیام پذیری نے ان کی صلاحیتوں کو ایک خاص دیوار پر لگا دیا تھا۔ مٹیا برج اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ کلکتہ میں انگریزی معاشرے خیالات اور تہذیب کا رنگ خاصا موجود تھا۔ شرر نے یہ رنگ عمر کے ابتدائی دور میں قبول کیا تھا۔ شرر کا تعلق نظم طباطباتی سے بھی تھا جو شہزادوں کے اتالیق تھے۔ شرر نے نظم طباطباتی سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس تعلیم کی بدولت ان کا ذہین عقل مندی کی ان شاہراہوں پر چلنے کے قابل ہوا کہ بعد میں وہ سر سید احمد خان کی عقل مندی کے مداح ہوئے تھے۔ میٹا برج میں شرر نے مقولات اور عربی کی تعلیم حاصل کی اور قیام کلکتہ میں انگریزی تعلیم کے حصول کے بعد ان میں ایسا ذوق وشوق پیدا ہوا کہ وہ اعلیٰ زبان لکھنے پر قادر ہو گئے۔ ادبی ذوق ان میں موجود تو تھا ہی شہزادوں کی صحبت نے اسے اور نکھارا۔ شہزادوں کے ساتھ بے تکلف مراسم تھے۔ جن کی بدولت زنان خانے میں آنا جانا ہوا اور یہیں سے شرر نے زندگی کی لطیف کیفیتوں کو بیان کرنے کا سلیقہ سیکھا۔ شرر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میٹا برج میں ان کی اخلاقی حالت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ چاہیے اس دور کے تجربات نے ان کی اخلاقی زندگی کو پامال کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے فن نے انھیں تجربات سے فائدہ حاصل کیا تھا۔ شرر ایک مورخ بھی تھے۔ تاریخ کا یہ ذوق وشوق مولوی عبدالحی اور مفتی میر عباس سے عربی کی درسی کتب پڑھنے کے بعد ایک شیعہ عالم مولوی حامد حسین کی صحبت سے پروان چڑھا۔ ۱۸۷۹ء میں شرر حدیث کی تعلیم حاصل کرنے دہلی گئے۔ علی گڑھ میں سر سید احمد خان سے ملاقات کی۔ سید نذیر حسین کی وساطت سے محمد بن عبدالوہاب کے ایک رسالے کا ترجمہ کیا۔ عبدالوہاب کی تحریک نہ صرف اصلاحی تھی بلکہ انقلابی بھی تھی۔ شرر اس سے بھی متاثر ہوئے۔ شرر زندگی کے جمود اور سکون سے مطمئن نہ تھے۔ وہ ایک ہلچل پیدا کرنا چاہتے تھے۔ شرر کے

اسلوب پرلکھنو کی صحافتی سرگرمیاں قیام حیدرآباد کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔انگلستان کے سفر اور انگریزی خیالات اور انگریزوں سے براہ راست واسطہ بھی ان کے اسلوب پر اثر انداز ہوا۔لکھنو میں شرر نے نولکشور کے اودھ اخبار میں جب ملازمت اختیار کی تو انھوں نے خود مضامین لکھے اور اپنے صحیفے اور رسالے جاری کیے اور بہت سے عمدہ اسالیب یہاں انہوں نے پیدا کیے۔قیام حیدرآباد میں سب سے زیادہ اثر محسن الملک نے ان پر ڈالا۔ان کی محبت و رفاقت نے شرر میں عقل پسندی اور نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے کا میلان پیدا کیا اور شرر سرسید اور محسن الملک سے بھی آگے بڑھ گئے۔آپ نے پردہ اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں لکھا۔شرر پر شبلی نعمانی کے بھی اثرات نمایاں ہیں۔شبلی کے نظریہ تاریخ اور مورخانہ دلچسپیوں کا اثر شرر پر بہت پڑا۔شرر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ''اودھ پنچ'' اور ''اودھ اخبار'' سے کیا تھا۔اس زمانے میں ان کی انشا پردازی پر تکلف تھی۔جو نہ صرف لکھنوی اثر کا نتیجہ تھی بلکہ نوجوانی کا زمانہ بھی اس پر اثر انداز ہوا۔اس زمانے میں ان کی تحریروں میں اعلی خیال آفرینی،فلسفیانہ معنی آفرینی اور لٹریری ذوق وشوق دکھائی دیتا ہے۔اس زمانے میں شرر خیالی مضمون نگاری کیا کرتے تھے۔جس میں عبارت آرائی اور شاعرانہ مبالغہ ہوتا تھا۔یہ وہ دور تھا جب ملک میں 'تہذیب الاخلاق' کی مضمون نگاری کا چرچا تھا۔ شرر اور 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین میں نمایاں فرق تھا۔'تہذیب الاخلاق' پر مقصدیت کی چھاپ تھی جبکہ شرر کے مضامین میں شوخی اور ادبیت نمایاں تھی۔ان کے مطالعے سے مسرت اور ذہنی کشادگی حاصل ہوتی تھی۔

شرر کے اسلوب میں نمایاں رنگ اس وقت نظر آیا جب انھوں نے ''محشر'' رسالہ جاری کیا۔اس رسالے کا مقصد چونکہ ادبی مضمون نگاری کا احیاء تھا۔یہی وہ رسالہ ہے جس کی بدولت شرر ایک ادیب کے طور پر ابھرے اور اردو دان طبقے میں پہچانے جانے لگے۔اس رسالے کے رنگ عبارت نے ملک میں ہر طرف دھوم مچا دی تھی۔ ''محشر'' میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا اس میں فارسی تشبیہات و استعارات تو موجود تھے مگر بندشیں انگریزی تھیں۔شرر نے انگریزی عروس سخن کو فارسی اور اردو کا لباس پہنا دیا۔''اودھ پنچ'' اور ''اودھ اخبار'' کے زمانے میں شرر کی تحریروں میں رعایت لفظی اور رنگینی کا جو عنصر تھا وہ اب کم ہونے لگا۔اب شرر نے ایسا انداز بیان اپنایا جو خیالی مضمون نگاری کے لیے نہایت موزوں تھا۔خیالی انشا کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں معنی سے زیادہ لفظوں اور ترکیبوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔اسی نثر میں فکریت کے عناصر کم اور شعریت کے زیادہ ہوتے ہیں۔''رسالہ محشر'' میں اشعار کا استعمال کم سے کم ہوگیا۔لیکن نثر میں شعریت کے عناصر بڑھ گئے۔۱۸۸۷ء میں شرر نے اپنا مشہور و معروف رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا۔حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ رسالہ ہے جو شرر کے ادبی کارناموں اور اسلوب بیان کے متنوعات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔شرر نے اپنا بیشتر ادبی سرمایہ اسی رسالے میں شائع کیا۔''دلگداز'' کا زمانہ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۵ء تک کا ہے۔اس دور میں جو مضامین،ناول اور دیگر نگارشات اس رسالے میں شائع ہوئیں۔ ان میں بے ہنگم خیال آرائی کم نظر آتی ہے۔اس سے پہلے شرر کی تحریروں میں خیال الفاظ کے گورکھ دھندوں میں

پھنس کے رہ جاتا تھا لیکن اب یہ رنگ کم نظر آنے لگا۔ واقعات کے بیان میں دلچسپی اور احساس وشعور اجاگر ہونے لگا۔ یہی وہ رسالہ ہے جس کی تحریروں میں تاثیر ودلکشی نمودار ہوتی تھی۔ شرر کا قلم ضبط کا خوگر دکھائی دیتا ہے۔ وہ بے ساختہ سچائی اور صداقت کو بیان کرتے ہیں۔ جہاں شرر کے اسلوب بیان نے ارتقائی منازل ''محشر'' اور ''دلگداز'' کی اشاعت سے طے کیں۔ وہاں حیدرآباد کے قیام کا زمانہ بھی ان کے اسلوب بیان کی ارتقائی منزل ثابت ہوا۔ حیدرآباد میں شرر دو میلانات سے روشناس ہوئے۔ ایک تو یہاں کی مذہبی فضا اور دوسرا محسن الملک کے طفیل ایک خاص قسم کی نیچر پرستی جس کی بنیاد عقل و سائنسی مشاہدہ پر ہو۔ پہلے میلان کی وجہ سے شرر نے **ملت** و مذہب کی پاسداری کی اور تاریخی ناولوں سے ہٹ کر انہوں نے تاریخیں لکھیں۔ یہی وہ دور تھا جب شرر پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ ان کی تحریروں میں تخیلیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شرر نے ان اعتراضات کا جواب اپنے مضمون ''تاریخی واقعات پر خیال آرائی'' میں دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تخیل سے تاریخی واقعات مسخ نہیں ہوئے۔ لیکن شرر کو اپنی اس کوتاہی کا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخی کتب لکھتے وقت اور خاص طور پر ''تاریخ اسلام'' لکھتے ہوئے اپنے قلم کو بہت روکا اور سنبھالا یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخی کتب کا رنگ سادہ واقعہ نگاری کا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے ادب کے مختلف میدانوں میں قدم رکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں بے پناہ تنوعات پائے جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلوب بیان نہ صرف شخصیت کا عکاس ہوتا ہے بلکہ اس کی تعمیر میں عصر اور اجتماعی و تہذیبی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ شرر پر ایک بڑا اثر لکھنوی روایات کا تھا۔ رنگینی، تکلف، لذئیت کے عناصر سے شرر اپنا دامن نہ بچا سکے اور یہ چیزیں ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں نظر آجاتی ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ یہ اثر ان کی تحریروں میں کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ جاری وساری رہا۔ دوسرا بڑا اثر ان پر شبلی نعمانی کا تھا۔ رنگینی اور تکلف لکھنو کی عادت ہے۔ یہ رنگ شرر کی تمام تصانیف میں جاری و ساری ہے۔ شبلی نے **ملت** کی عظمتِ رفتہ اور عظیم الشان ماضی کے وقار کو زندہ کرنے اور قوم کے اندر اپنی تہذیب وثقافت کے احترام وتحفظ کے جذبہ کو پیدا کرنا اپنا نصب العین قرار دیا اور جذبہ انگیزی سے کام لیا۔ شرر نے بھی شبلی سے یہ اثر قبول کیا۔ شرر کی تحریروں میں رقت آمیز کیفیتیں، افسوس، الجھن، خود کلامی اور تخاطب کے انداز بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اثر پیدا کرنے کے لیے تقابل سے بھی کام لیتے ہیں۔ ''ٹوٹا ہوا کھنڈر'' میں لکھتے ہیں:

> وہ تاریخ کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ ورق ہے کسی اگلی بزمِ طرب اور گذشتہ صحبت عیش کے گل ہونے کے قریب پہنچی ہوئی شمع ہے اور اس کے نقش ونگار کسی گزرے ہوئے اور مٹے ہوئے حسن کے بگڑے ہوئے خط وخال میں اس کے شکستہ اور گرے ہوئے کنگرے وہ سر

ہیں جنھیں سرکشی کے جرم میں زمانے کے بے رحم ہاتھ نے مار مار کے زبردستی اپنے آگے جھکایا۔ وہ مجسم کتاب نصیحت اور مرقع عبرت ہوتا ہے۔ ۱۰۰

اعجاز الرحمٰن لکھتے ہیں:

شرر نے دگدازی اور رقت پیدا کرنے کے لیے موازنہ کے ہتھیار سے خوب کام لیا ہے اور یہ چیز ان کے اسلوب بیان میں خاص مقام رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شرر کا مطلب عبرت پیدا کرنا ہے۔ ایک مخصوص طرز زندگی اور احساس حیات کو اجاگر کرنا ہے لیکن بعض جگہوں پر یہی جذبہ تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ جب کہ ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوگا اور وہ کھوکھلی لفاظی کرتے ہیں۔ ایسے مبالغہ آمیز بیانات کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنو کی آخری دور کی شاعری جن باتوں کے باعث بدنام ہوتی تھی شرر نے انھی سانچوں کو اپنی نثر میں استعمال کیا ہے۔ جو شاید شعر میں تو کسی نہ کسی حد تک گوارا ہو جاتے ہیں مگر نثر میں ڈھونگ بن کر رہ گئے مثلاً:

> ''اے افکارِ عمر! جانا کہ تمھیں ہم سے دشمنی ہے۔ عداوت ہے۔ تم ہمیں خوش و خرم نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری مسرت تمہارے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ ہرگز نہیں چاہتے کہ ہماری کوئی آرزو بر آئے ...... مگر ہمیں رونے تو دو تم تو رونے بھی نہیں دیتے۔''

(کسی کی یاد)

آلام زمانہ دنیا کی بنیادی حقیقت ہے۔ غم سے انسان کو مفر نہیں۔ سوچنے والے بڑے انسانوں نے اس غم سے فلسفہ حیات استوار کیا مگر شرر کا رویہ ایک اعصابی مریض کا سا دکھائی دیتا ہے جو گھبرا کر روتا اور چلاتا ہے مگر اس شور و غوغا میں کوئی اثر نہیں جو کسی کے دل میں کسی نوع کی کیفیت پیدا کر سکے۔ اور ''رونے کی خواہش'' کا تذکرہ کرنے کے بعد کیا زندگی کو بند کر دینا انتہائی مایوسی کی بات ہے جو ایک صحت مند معاشرے میں قابل قبول نہیں۔ شرر کا اس نوع کا اسلوب بیان ان کے ناولوں میں جگہ جگہ ملتا ہے جب وہ جوشیلے پن کی حدوں کو توڑ کر ہجائیت اور اعصابی اضطراب کا شکار نظر آتے ہیں... ۱۰۱

قدیم نثر میں جو اسلوب اپنایا جاتا تھا وہ تکلف و تصنع پر مبنی تھا اور یہ اسلوب میر امن غالب اور سرسید کے ہاتھوں ختم ہوگیا تھا۔ شرر نے بھی میر امن، غالب اور سرسید کے انداز کو اپنایا۔ یہی سلاست و لطافت جدید نثر کا سب سے بڑا تقاضا بھی ہے۔ شرر نے اس تقاضے کو نہ صرف یہ کہ پورا کیا بلکہ اپنے بعد آنے والے ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ سرسید نے اپنے طرز تحریر میں جس انداز کو اختیار کیا تھا شرر نے بھی اس طرز تحریر کو اپنایا اور اس کے شعلے سے اپنا چراغ روشن کیا۔ یہی سبب ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بے باکی اور بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں اور پڑھنے والا بھی ان کا مطلب جلد سمجھ جاتا ہے۔ پروفیسر جعفر رضا لکھتے ہیں:

''شرر نے سادہ اور عام فہم نثر کو رواج دیا۔ جس میں بے تکلفی اور بے باکی ہے۔ چند شگفتہ اور رواں دواں عبارتیں ملاحظہ ہوں۔

''سورج تمہارے نور کا جلوہ دکھا رہا ہے چاند تمہارا آئینہ'' (ہم تم اور وہ)

''اور تم ناقص بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن کیے رہتے ہو'' (مغرور جوتا)

''تہذیب دراصل ان اخلاقی تکلفات کا نام ہے جن کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔'' (گذشتہ لکھنو) ۱۰۲

شرر کی تحریروں میں قارئین سے تخاطب کا انداز بھی ملتا ہے جو سرسید کے تتبع میں ہے ''اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں''، ''ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں''، ''ہم بقدر ضرورت بتا چکے''، ''ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے'' وغیرہ۔ پروفیسر افضل حسین اظہر شرر کے اسلوب کی اس خوبی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

......قدیم رنگین عبارتوں کا تکلف اظہار مطلب میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ مقفی و مسجع انداز ہر چند اپنے طور پر ایک فن ہے مگر اس کی افادیت جدید تقاضوں سے بیگانہ ہے۔ سرسید نے اپنے طرز تحریر کے ذریعے جس سادہ اور عام فہم اردو نثر کو عام کیا شرر نے اسی شعلے سے اپنا چراغ جلایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بے تکلفی اور بے باکی سے کہتے ہیں اور پڑھنے والے کو بھی ان کا مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ذیل کے جملے ان کے شگفتہ اور رواں پیرائے کو ظاہر کرتے ہیں:

۱۔ یک بہ یک اسلام کی طرف سے اس بات کا ڈھنڈورا پٹ گیا کہ عالم الغیوب سوا خدا کے کوئی نہیں اور جو کوئی اس کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔'' (کہانت)

۲۔ ''سورج تمہارے نور کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ چاند تمہارا آئینہ ہے'' (ہم تم اور وہ)

۳ ''میں اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے کو تاررہا تھا کہ اس نے اور دانت نکال دیئے'' (مغرور جوتا)

۴۔ ''تہذیب دراصل ان اخلاقی تعلقات کا نام ہے جن کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔ آج ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے دیکھتے ہیں کہ ملنے جلنے میں چناں وچنیں اور معاشرت کے تعلقات ایک قسم کی فضول ریا کاری ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ یوں تو فضول ریا کاری لباس اور بود وباش کا انتظام بھی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کو انسانی تہذیب نہیں آتی انہوں نے اپنے لیے غدرداری کا بہانہ اس بات کو قرار دے دیا کہ ہمیں شہر والوں یا مہذب لوگوں کو ایسی دکھاوے کی باتیں نہیں آتیں'' (گزشتہ لکھنو) ۱۰۳

عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر میں شگفتگی کے عناصر موجود ہیں۔ ان کا انداز بیان دلکش، شگفتہ اور دل آویز ہے۔ جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ شرر کے طرزِ بیان میں جہاں دلکشی اور شگفتگی ہے وہاں روانی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ مولانا شرر نے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے تشبیہ اور استعارہ کا بقدر ضرورت موزوں اور مناسب استعمال کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے تشبیہ اور استعارہ پر ہی اپنے اندازِ تحریر کی بنیاد رکھی تھی لیکن شرر نے اپنی عبارتوں کو رنگین اور دلکش بنانے کے لیے اور اپنی جذباتی وخیالی تصاویر کو نمایاں اور واضح کرنے کے لیے تشبیہ اور استعارہ کو بڑی اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ شرر نے جہاں عناصر اور ماحول کو پیش کیا ہے وہاں ان کی تشبیہیں دل پذیر ہیں۔ اگر چہ وہ طویل ہیں۔ شرر کے مضامین اور غیر افسانوی نثر کی تمام اصناف میں موجود ہیں۔ پروفیسر جعفر رضا رقمطراز ہیں:

> شرر نے اپنی تحریروں میں بسا اوقات تشبیہات و استعارات کے ذریعہ عبارتوں کو رنگین بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان میں تخلیقی جوہر نہیں ہے مثلاً: ''رنگیلے شوخ طبع اہل بغداد ان کی تھکن مٹانے کے لیے ایسی زندہ دلی اور فراخ دلی کے ساتھ گھروں سے نکلتے ہیں کہ گویا دن کوئی ایسا ظالم رقیب تھا۔''
>
> ''جس کے نظر سے ہٹتے ہی اس وقت لیلیٰ شب کے وصال کا لطف اٹھانے آپہونچے۔''
> (زوال بغداد)

''ہزارہا چراغ ہیں جو ملیحہ شب کے لباس پر روشن موتیوں اور لعل شب چراغ کی طرح جگ مگا رہے ہیں۔'' (زوال بغداد)

’’تم آفتاب جہاں تاب ہو ہم ستارہ پرست ۔تم بت ہو یا برہمن‘‘ (ہم تم اور وہ)

’’آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا بہا رکھی تھی کہ کوئی منشا اور سیر اب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔‘‘ (گذشتہ لکھنو)[۱۰۴]

عبدالحلیم شرر نے اپنی تحریروں میں تشبیہ اور استعارہ کا استعمال کر کے اپنی عبارت کو دلکش بنایا ہے۔شرر نے اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے تشبیہ اور استعارہ کا بقدرِ ضرورت اور موزوں استعمال کیا ہے۔ پروفیسر افضل حسین اظہر لکھتے ہیں:

شرر نے اپنی عبارتوں کو رنگین بنانے کے لیے اور اپنی خیالی وجذباتی تصاویر کو نمایاں اور واضح کرنے کے لیے تشبیہوں اور استعاروں کو بڑی اچھی طرح استعمال کیا ہے۔خاص طور پر مناظر اور ماحول کی پیشکش کے موقعوں پر ان کی تشبیہیں طویل ہونے کے باوجود دلپذیر ہیں ......وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیان ملک کو رہا کرتی تھی آج ایک وحشتانِ فنا اور عبرت کدہ ہے۔‘‘ (گذشتہ لکھنو ص۲۷)

شرر نے اپنے تاریخی اور سوانحی مضامین میں بھی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔

’’ایک کالی گھٹا اٹھی۔جس سے عالم بالکل تیرہ وتاریک ہوگیا۔عقل دوربین بھی اس طوفان خیز بلا سے متحیر ہو کر ایک حیرت خیز بیابان میں جا پڑی‘‘ (اسلامی سوانح عمریاں۔ابن مسکویہ)

’’دوپہر کی دھوپ اور شدتِ تمازت سے زمین صحرا آتش کدہ بن گئی۔‘‘ (ابن مسکویہ)

’’تم آفتاب جہاں تاب ہو ہم ستارہ پرست۔تم بت ہو ہم برہمن‘‘ (ہم تم اور وہ)

’’تجرد کی سنساں بستی میں اکیلا نہ بیٹھا گیا۔طلسم خانۂ ہستی کے قفل میں کُن کی کنجی بھری‘‘ (ہم تم اور وہ)

’’آصف الدولہ نے یہاں روایت کی سچی گنگا نہیں بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیر اب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔‘‘ (گذشتہ لکھنو)[۱۰۵]

شرر کی تحریر کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اوران کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔ایس ایم معین قریشی لکھتے ہیں: ''عربی فارسی کے الفاظ ادا کرواتے ہیں اور کبھی کبھار نثر میں شاعری کرواتے ہیں۔''[۱۰۶۱] عربی و فارسی الفاظ وتراکیب کے استعمال کے بارے میں پروفیسر جعفر رضا اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''شرر نے اپنی عبارتوں میں فارسی مرکبات کا استعمال کثرت سے کیا ہے مثلاً: نفع رسائی خلق، دولت سرحدی، آتش فشاں، آشیانہ، خلافت، خرقِ عادت، شدت گرسنگی، شدائد عرب، غیر شائز وغیرہ۔''[۱۰۷] عبدالحلیم شرر کو عربی اور فارسی زبان پر عبور تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریر میں فارسی مرکبات بہ کثرت استعمال کرتے ہیں مثلاً ممتاز عہد، یگانہ عصر، دولت سرحدی، شدائد عرب، شدت گرسنگی، عالم بے بدل، خرق عادت، آتش فساد، حسن عقیدت، آستانہ خلافت وغیرہ وغیرہ پروفیسر افضل حسن اظہر لکھتے ہیں:

> شرر کا رجحان اکثر اختصار کی بجائے وضاحت کی طرف رہتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہ وضاحت کہیں کہیں غیر ضروری بھی محسوس ہوئی ہے۔مگر شاید وہ اسی انداز کو مفید سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیے عربی و فارسی جملوں اور اشعار کا بے باکانہ استعمال کرتے ہیں۔نیز حدیثوں اور آیتوں کا بھی بے محابہ حوالہ دیتے ہیں اس سے ان کے مذاق اور معلومات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان کی تصنیف اسلامی سوانح عمریاں اس قسم کی مثالوں سے بھرپور ہیں۔

۱۔ مشہور حدیث ہے ''المومن ......'' یعنی مومن کی شان نہیں کہ لوگوں پر لعنت کرے۔(اسلامی سوانح عمریاں)

۲۔ ''فارقت کسم ومیت بعدکم ماھا کدالذی نجیت''

(حیرت ہے تو مجھ سے جدا ہوا اور میں زندہ رہوں، ایسی زندگی میرے وہم میں نہ تھی (اسلامی سوانح عمریاں)

۳۔ الخلق والا مر کل للہ وخلق (خلق اور امر سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔(اسلامی سوانح عمریاں)

اسی طرح وہ فارسی ضرب الامثال کے حوالے بھی بڑی چابکدستی سے استعمال

کرتے ہیں۔

۴۔ ''آں قدح شکست وآں ساقی نماند'' (مضامین شرر)

۵۔ ہرلحظہبہ وضع دگرآں یار برآمد (مضامین شرر ص۲۵)

۶۔ کھش چوں دنداں نماید میلینداز پائے رور (مغرور جوتا) ۱۰۸

شرر کی تحریر استدلالی ہے مگر خشک نہیں۔ ادبی اور صحافتی مرحلوں میں ایسے بہت سے مقامات بھی آئے جب شرر نے منطق اور استدلال سے کام لیا۔ ان موقعوں پر شرر اپنی اکتسابی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کامیاب رہے۔ شرر کو احادیث کے علم پر عبور تھا۔ وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی بات کو موثر اور اپنے بیان کو پرزور بنانے کے لیے وہ یہ حوالے دیتے ہیں۔ بقول پروفیسر جعفر رضا:

> شرر نے اپنی عبارتوں میں نہ صرف عربی و فارسی اشعار کا فطری استعمال کیا ہے بلکہ حسب ضرورت آیتوں اور حدیثوں کے حوالے بھی درج کیے ہیں۔ مثلاً:
>
> ''یہی تعلیم مذہب دے رہا ہے کہ! من طلب وجد'' (اسلامی سوانح عمریاں)
>
> ''اور کس قدر سچا ہے کلام پاک کہ: ان مع الصر یسرا'' (ایضاً) ۱۰۹

عبدالحلیم شرر چونکہ شاعر بھی تھے۔ لہذا شاعرانہ مزاج و ذوق کی بنا پر ان کی نثر میں بھی شعریت موجود ہے۔ شرر ذہنی طور پر نثر سے زیادہ شاعری کے لیے موزوں تھے۔ قدرت نے ان کو یہ ملکہ عطا کیا تھا لیکن اس عہد کے حالات و واقعات نے انہیں نثر کے راستے پر لگا دیا اور ان کے قلم سے افسانوی اور غیر افسانوی نثر تحریر ہونے لگی۔ چونکہ قدرت کی طرف سے یہ ملکہ ان کو ملا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے شاعرانہ مزاج کا اظہار نہ صرف منظوم ڈراموں میں بلکہ نثر میں بھی ہوا۔ استعارہ، تشبیہ اور تمثیل کی فراوانی اور کہیں قافیہ پیمائی، خیالی تصویروں اور پیکروں کی تراش خراش ان کی افراط اور الفاظ کی مترنم تکرار، ان کے شاعرانہ مذاق ہی کے بدولت ہے۔ ان کی نثر میں اشعار بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بھی ان کے شاعرانہ مذاق کے عکاس ہیں۔ ان کی افسانوی نثر میں اور خصوصاً ناول میں ہر بات کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے اور واقعات کا اس شعر سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد محض رومان پسندی اور ذوق جمال کی تسکین معلوم ہوتا ہے۔ اپنے بعض مضامین کے دوران بھی وہ اکثر شعر اور مصرعے اپنے مطالب کی وضاحت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ہوالاول، ہوآلاخر، ہوالظاہر، ہوالباطن، عشاق زیادہ بے تاب ہوئے اور کہہ اٹھے:

آتے ہیں خیالوں میں دماغوں میں دلوں میں

پھر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم پردہ نشیں ہیں

(ہم تم اور وہ)

(ii) یکا یک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا: ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔'' (گذشتہ لکھو، ص۲۷)

(iii) اور سعدی کا یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے: ''کہ یاراں فراموش کردند عشق'' (گذشتہ لکھنو، ص۹۰)

شرر اپنے مضمون ''ہم تم اور وہ'' میں لکھتے ہیں:

ہم نہیں تو تم بھی نہیں اور تم نہیں اور ہم بھی نہیں

ہم تم ہیں ایک جان دو قالب

آپس میں بڑی محبتیں ہیں''

بقول پروفیسر جعفر رضا:

شرر کی تحریروں میں رومان پسندی اور ذوق جمال کی تسکین کے لیے اشعار بھی نظر آتے ہیں جو بیان کی وضاحت اور تاثیر میں اضافہ کرتے ہیں۔ شرر نے بعض موقعوں پر اردو اور فارسی اشعار کا استعمال اپنی عبارت کو خوب صورت اور جاذب نظر بنانے کے لیے کیا ہے لیکن ان کا انداز بیان روایتی رہتا ہے۔ البتہ جب یہی مصرعے نثر میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو شرر کی عبارت آرائی دو آتشہ ہو جاتی ہے۔[۱۱۰]

پروفیسر اعجاز الرحمٰن لکھتے ہیں:

شرر ذہنی طور پر نثر سے زیادہ شاعری کے لیے موزوں تھے مگر حالات زمانہ نے انہیں نثر کی منزل پر لگا دیا۔ مگر ان کی شاعرانہ حس مردہ نہ ہو سکی۔ اس کا اظہار نہ صرف منظوم ڈراموں

بلکہ نثر میں بھی ہوا ہے۔تشبیہ و استعارہ اور تمثیلوں کی فراوانی کہیں کہیں قافیہ پیائی خیالی پیکروں اور تصویروں کی افراط، اشعار کا جا بجا استعمال، خیالی حقائق کو منتخب کرنے کا رجحان اور الفاظ کی مترنم تکراران کے شاعرانہ ذوق ہی کی بدولت ہے......۱۱

پروفیسر افضل حسین اظہر رقمطراز ہیں: اپنے مختلف مضامین کے دوران میں بھی وہ اچھے اچھے شعر اپنے مطلب کی وضاحت کے لیے پیش کرتے ہیں۔۱۲

اگر چہ شرر کوئی بڑا ڈرامہ ہمیں نہ دے سکے لیکن ان کی ڈرامہ نگاری کی صلاحیت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر خصوصاً ناولوں اور مضامین میں بے شمار ڈرامائی کیفیات کا اظہار ہوا ہے۔کبھی مکالموں کی تیزی وتندی کی صورت میں تو کبھی خودکلامی کی شکل میں اور کبھی چونکا دینے والے واقعات کی صورت میں۔شرر کا اردو ادب پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اسے وہ زبان عطا کی جس کی نسبت سب کا کہنا ہے کہ یہی جدید اردو ہے۔انہوں نے وہ زبان اردو کو دی جو آج ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے۔شرر نے اردو نثر کو انگریزی رنگ دیا۔بقول پروفیسر عبدالسلام:

اگر ہم شرر سے پہلے کی زبان کا شرر کی اور بعد کی زبان سے مقابلہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر شرر کی کس قدر احسان مند ہے۔شرر سے پہلے کے لکھنے والے بھی انگریزی سے واقف تھے،مگر اردو نثر کو انگریزی کا رنگ دینے والے شرر ہی ہیں۔۱۳

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں: ''......شرر ہی نے درحقیقت وہ زبان استعمال کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہے کہ ''یہی جدید اردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے''۔۱۴

اس میں شک نہیں کہ مولانا نے جو زبان استعمال کی ہے وہ افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے لیے موزوں ترین زبان ہے۔ سکسینہ نے جس زبان کی تعریف کی ہے۔وہ ان کی افسانوی نثر کی عام زبان نہیں بلکہ غیر افسانوی نثر اور ان کے خیالی مضامین اور ان مقامات کی زبان ہے جہاں وہ کوئی منظر پیش کرتے ہیں۔بعض حضرات شرر کی زبان کو پھیکا قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہمارے ذہنوں میں پر تکلف وتصنع اور مسجع ومقفع عبارتوں کی حکمرانی ہے۔ڈاکٹر سہیل بخاری کے بقول: ''ان کا طرز بیان شگفتہ اور عام فہم ضرور ہے لیکن بیسوں صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی کہیں کوئی ایسی عبارت نظر نہیں آتی جو یاد کرنے کے قابل ہو''۔۱۵

انہوں نے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ

شگفتہ اور عام فہم ہے۔عبدالحلیم شرر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں برجستگی اور خوبصورتی سے محاوروں کو استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کہا جا تا ہے کہ ان کی زبان لکھنو کی ٹکسالی زبان ہے۔حالی کا کہنا ہے کہ روزمرہ کی پابندی کے بغیر محاورات کا جا بے جا استعمال سے کوئی فائدہ نہیں مگر شرر نے روزمرہ اور محاورہ دونوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔پروفیسر افضل حسین اظہر لکھتے ہیں:

شرر نے نہ صرف روزمرہ زبان کی پابندی کی ہے بلکہ محاوروں کو بڑی خوبصورتی اور برجستگی سے استعمال کیا ہے۔اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان لکھنو کی ٹکسالی زبان ہے۔حالی نے لکھا کہ روزمرہ کی پابندی کے بغیر محاورات کے جا بے جا استعمال سے کوئی فائدہ نہیں مگر شرر نے روزمرہ اور محاوروں دونوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔محاوروں کا استعمال نہ صرف طرزِ تحریر کو معیاری اور دلکش بناتا ہے بلکہ اس سے مطالب کی توضیح میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔شرر نے محاوروں کے ذریعے اپنے طرزِ تحریر میں اختصار، جامعیت اور حسن پیدا کر دیا ہے۔"[۱۲]

محاورات کا استعمال نہ صرف طرزِ تحریر کو معیاری اور دل کش بناتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے مطلب کی توضیح میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔شرر نے محاوروں کے ذریعے سے اپنے طرزِ تحریر میں جامعیت اور حسن پیدا کیا ہے۔ محاورات کے استعمال کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

''جس کا کانٹا زندگی بھر ان کے دل میں کھٹکتا رہا۔'' (گذشتہ لکھنو، ص۳۳)

''اپنے وعدے کا خیال آیا تو سناٹے میں آ گئے'' (......ص۳۴)

''ہرطرف ہائے ہائے پڑ گئی! جو تھا ان کی جان کو رو رہا تھا'' (......ص۳۴)

''میٹا برج کی انیٹ سے اینٹ بج گئی۔'' (......ص۳۷)

آپ کی تحریروں میں مقصدیت پائی جاتی ہے اس لیے کہ آپ نے جو کچھ بھی لکھا وہ اس نقطۂ نظر سے لکھا ہے کہ بزرگوں کے حالات ان کے کارنامے قاری تک پہنچائے جائیں تا کہ نئی نسل میں غیرت وحمیت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔شرر نے جب قلم اٹھایا تو انہوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ انگریز مسلمانوں کے شاندار ماضی کی غلط تصویر پیش کر رہے ہیں۔جس کے اثرات اس دور میں تو دکھائی دے رہے تھے لیکن انہیں خدشہ تھا کہ مستقبل بھی مسلمانوں کا تاریک ہو جائے گا۔اس دور کے حالات وواقعات اور انگریزوں کی غلط پالیسوں نے شرر جیسے ادیب

کو سوچنے پر ابھارا۔ جب انہوں نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے سامنے ان کا شاندار ماضی رکھا جائے۔ اس کی تصویر کشی کی جائے تا کہ وہ اسلاف کے کارناموں کو پڑھ کر اپنے حوصلوں کو بڑھائیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں ایسے تاریخی واقعات کا انتخاب کیا جو ان کے مقصد کو پورا کر سکتے تھے۔ انہوں نے تاریخی حالات وواقعات کو تخیل کا رنگ دے کر پیش کیا اور دلچسپی ودلکشی کے پہلو کو مدنظر رکھا۔

شرر نے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں یہی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے اندر جوش اور ولولہ پیدا کیا جائے اور ان کو ترقی کے راستے پر گامزن کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی غیر افسانوی نثر کو بھی قومی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ شرر کی یہ مقصدیت تحریک علی گڑھ کے مقاصد سے ہم آہنگ ہے۔ مولانا شرر بنیادی طور پر تاریخی ناول نگار اور معاشرتی ناول نگار تھے اور کسی بھی ناول نگار کا فرض اولین موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے موضوع منتخب کرتا ہے اور پھر واقعہ نگاری کے جوہر کو اس میں برتتا ہے۔ شرر نے بنیادی طور پر افسانوی اور غیر افسانوی نثر لکھی ہے اور ہر نصف میں چاہے وہ افسانوی نثر سے متعلق ہے یا غیر افسانوی نثر۔ اس میں واقعہ نگاری کے جوہر اور سلیقے وہنر مندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ افسانوی نثر میں ''فردوس بریں'' میں ان کی واقعہ نگاری اپنی معراج کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے واقعات میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر کو واقعہ نگاری کا جو ملکہ حاصل ہے۔ اس کی بنا پر واقعات باہم مربوط ہیں۔ ان میں تسلسل اور کہیں بھی کوئی خلا نظر نہیں آتا تمام واقعات زنجیر کی مسلسل کڑی معلوم ہوتے ہیں اور یہی واقعہ نگاری کا کمال ہے۔ سیرت نگاری وسوانح، مضامین وتاریخ وصحافتی ادب میں بھی جہاں وہ واقعات کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کے جوہر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کو اردو ادب کے رومانوی دبستان کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کے بیشتر ناول اور مضامین میں ہمیں رومانوی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں عقل کی بجائے، تخیل اور جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو ان کے رومانوی رویوں کی تخلیق میں مدد دیتی ہے۔ مضامین شرر کی جلد اول کے پہلے اور دوسرے حصے میں ہمیں رومانوی فضا ملتی ہے۔ جلد سوم کے پہلے اور دوسرے حصے میں انہوں نے ''سیر نسوان'' کے تحت عورتوں کی داستانیں بیان کی ہیں۔ جن سے ان کی رومان پسندی کے رجحان کی عکاسی ہوتی ہے۔ شرر کے شاعرانہ وعاشقانہ مضامین میں بھی رومان پسندی کے ثبوت ملتے ہیں۔ ان کے تاریخی ناولوں اور تاریخوں میں بھی رومان پسندی اور خیالی دنیا کی فضا موجود ہے۔ ان کی ہر افسانوی اور غیر افسانوی تحریر میں یہ جوہر ملتا ہے اور خصوصاً شرر کا رومانوی مزاج ان کے ناولوں اور ان کے مضامین دونوں میں صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ اعجاز الرحمٰن رقمطراز ہیں:

شرر نابغہ رومانی ادیب ہیں۔ تفکر وتعقل کے مقابلے میں جذبات کی شدت، تخیل پرستی، خیالی

دنیاؤں کا آباد کرنا، زندگی کے سنگین حقائق کی بجائے ماضی کی دھندلی فضاؤں سے لو لگانا، حسن اور عشق اور خاص کر عورت کے تصور سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی، رنج وغم کا شدید احساس، یہ وہ تمام خصوصیات ہیں جو ایک رومانی ادیب میں ہوتی ہیں۔شرر پر اگر لکھنوی روایات کا اثر نہ ہوتا تو شائد ان کی رومانیت زیادہ نکھری ہوئی ہوتی۔اس لیے آل احمد سرور نے لکھا ''شرر کے عاشقانہ و شاعرانہ مضامین میں ایک رومانیت ہے اور ان کے تاریخی ناولوں میں ماضی کی حسین یادوں کا ایک رنگ محل ہے۔''[۱۱۷]

شرر کو تاریخ نگاری کے ساتھ ایک خاص ربط تھا۔خصوصاً اسلامی تاریخ سے آپ کو ایک خاص لگاؤ تھا۔اس لگاؤ اور دلچسپی کی وجہ سے شرر نے تاریخی واقعات کو انتہائی چابکدستی سے اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں سمویا ہے۔ناولوں میں ''ایام عرب'' میں شرر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعث سے پہلے کے واقعات کو جس خوبی سے بیان کیا ہے۔یہ انہی کا خاصہ ہے۔اس طرح ''فتح اندلس'' میں اسلامی عہد کی عکاسی بڑے دلکش اور خوبصورت انداز سے کی ہے اور ''فردوس بریں'' میں بھی ان کا تاریخی شعور اوج پر نظر آتا ہے اور ان کی مذہبی معلومات کی وسعت پر دلالت کرتا ہے۔مضامین شرر کی جلد دوم اور سوم جو تاریخ سے متعلق ہیں اس کے مطالعہ سے بھی شرر کے تاریخی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ان کی تاریخی کتب میں بھی ان کا تاریخی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے۔سوانح عمریوں اور سیرت نگاری میں بھی اس عنصر کی جھلک نمایاں ہے۔مختصراً یہ کہ ان کی ہر ایک تحریر سے ان کا تاریخی مزاج ٹپکتا ہے۔چونکہ آپ کا تعلق دبستان لکھنو سے تھا۔اس لیے آپ کی تحریروں میں لکھنوی تکلف وتصنع پایا جاتا ہے اور عموماً آپ اسی ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔شرر کی شخصیت میں لکھنوی روایات کا اثر بہت گہرا تھا۔لذتیت، تکلف، تصنع اور رنگینی لکھنوی تہذیب کا خاصہ ہیں اور شرر لکھنوی تھے یہی وجہ ہے کہ آپ بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔شرر کی تمام تصانیف میں یہ رنگ جاری وساری ہے۔

اگر چہ شرر کی تحریروں میں سادگی وسلاست کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن کہیں کہیں محققانہ وفلسفیانہ اندازِ بیان بھی موجود ہے۔

شرر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں جہاں انسانی جذبات کو بیان کرتے ہیں وہاں ہر چیز آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔شرر کو انسانی جذبات کے بیان پر قدرت حاصل ہے۔شرر کے مناظر رنگین اور دلکش ہیں اور اس کی وجہ ان کا شاعرانہ مذاق ہے۔شرر منظر نگاری کرتے ہوئے احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شرر نے حقیقت اور تخیل کے امتیاز کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں منظر نگاری فطری کے بجائے منصوعی ہوجاتی ہے۔یہ محسوس ہوتا ہے کہ شرر نے زبردستی یہ مناظر تحریر میں شامل کیے ہیں لیکن ان

بنا ہے۔اسی مقصدیت، قومی اصلاح اور اخلاق وجذبے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں زور بیان اور جوش خطابت کے عناصر شامل ہوگئے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات وہ اس طرح کے جملے استعمال کرتے ہیں:

''اے موجودہ زمانے کے مسلمانو''

''اے ہمدردی قوم کے لفظ بار بار منہ پر لانے والو''

''اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں''

شرر جب اپنی تحریروں میں اس طرح کے جملے استعمال کرتے ہیں تو ان کی نثر میں ایک گونج کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اسی گونج کی بدولت وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ان کی بات قاری کے ذہن پر چھا جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی بات قاری کے دل میں اترنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔بقول پروفیسر اعجاز الرحمٰن: ''شرر کی صحافیانہ سرگرمیوں نے ان کے اسلوب کے خطیبانہ رنگ کو اور شوخ کردیا ہے''۔[۱۲۲]

پروفیسر افضل حسین اظہر رقمطراز ہیں:

> شرر کے ہاں سرسید جیسا اندازِ تخاطب بھی پایا جاتا ہے۔اکثر اوقات وہ یہ جملے استعمال کرتے ہیں۔''اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں''، ''ہم یہ کہہ چکے ہیں''، ''ہم بقدر ضرورت بتا چکے''، ''ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے''[۱۲۳]

آپ کے اسلوب کا نمایاں ترین عنصر آپ کا خطیبانہ انداز ہے جو خلوص وجذبے سے اور اس کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔آپ ہر بات خلوص دل سے کہتے ہیں اور اس انداز سے کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن نشین ہوجاتی ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر آپ اپنی ذات میں زور پیدا کرنے کے لیے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور ہر بات جوش وخروش سے بیان کرتے ہیں۔شرر کے اسلوب میں جہاں خوبیاں پائی جاتی ہیں وہاں کچھ خامیاں بھی موجود ہیں۔ان کی خامیوں کے متعلق پروفیسر افضل حسین اظہر لکھتے ہیں: ''شرر کے اسلوب کی خامیاں کہیں قابل معافی نہیں تو کہیں ایسی بھی ہیں کہ بادی النظر میں ہی ناگوار معلوم ہوتی ہیں اور ان خامیوں نے ان کی انشا پردازی کی چمک دمک کو گہنا کر رکھ دیا ہے......''[۱۲۴]

عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں انگریزی الفاظ جابجا ملتے ہیں۔سرسید اور ان کے رفقاء کی طرح شرر نے بھی انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں۔شرر نے اپنی تحریروں میں وہ انگریزی الفاظ جگہ جگہ استعمال کیے ہیں جن کے

متبادل اردو زبان میں موجود ہیں۔شرر کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں اس زبان کے الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں۔حالانکہ شرر خود دعویٰ کرتے ہیں کہ: بقول پروفیسر جعفر رضا:

اس مسئلہ میں شرر لکھتے ہیں:

''آج کل انگریزی الفاظ کے جا و بے جا استعمال کو انگریزی دان اپنی علمی ترقی کا ثبوت خیال کرتے ہیں اور نہایت بدتمیزی سے انگریزی الفاظ اپنی زبان میں بھرتے جاتے ہیں''

اس تصور کے ادیب سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کم ازکم اپنی تحریروں میں غیر ضروری انگریزی الفاظ استعمال نہیں کرے گا۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کا رواج سرسید اور ان کے رفقاء کی بدولت ہوا۔ مولانا حالی نے جس زمانے کے چلن کے مطابق اس معاملہ میں پیروی مغربی سے زیادہ پیروی سرسید کی اور انگریزی الفاظ کا جابجا استعمال کیا۔شرر کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال سرسید اور ان کے رفقا حالیؔ، شبلیؔ وغیرہ سے کم نہیں، حالانکہ ان میں بیشتر الفاظ کے اردو متبادل موجود ہیں۔

مثلاً سوسائٹی، کورٹ شپ، انٹرویوز، نیشنل ڈریس، اسپکٹشن، آرتھاڈاکس، پریچر وغیرہ عبارتوں کے درمیان بعض انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال ملاحظہ ہو۔

علمائے دین کو پالیٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ مدبر سلطنت ہوسکتے ہیں نہ اسٹیٹس مین'' (گذشتہ لکھنو)

''بادشاہ کے زندہ نیچرل ہسٹر میوزیم میں ایک ہاتھی بھی تھا۔'' (ایضاً)[۱۲۵]

شرر ''شاعرانہ و عاشقانہ'' مضامین کے حصہ اول میں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ: ''بے حمتی اسی حد سے بڑھی ہوئی کہ اپنی آنر کا ذرا پاس ولحاظ نہیں''[۱۲۶]

شرر نے سیرت وسوانح نگاری، مضمون ومقالات وانشائیہ، تاریخ اور صحافتی ادب میں بکثرت انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

شرر چونکہ زود نویس تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں زبان کی غلطیاں موجود ہیں۔ بقول پروفیسر

جعفر رضا:

شرر کی تحریروں میں جا بجا زبان کی غلطیاں ملتی ہیں جو غالباً ان کی زود نویسی کا نتیجہ ہیں مثلاً:

''طرح طرح کے معنی پہنا کے کہانت کو اور چمکاتے تھے'' (کہانت)

''حضرت گنج کے مغربی حصہ میں اِب سڑک موجود ہے'' (گذشتہ لکھنو)

''جن کے منوں پر داڑھیاں باقی رہ گئی تھی وہ بھی تشریف لے گئے'' (ایضاً)

شرر نے سنجیدہ موضوعات پر لکھتے ہوئے بعض اوقات انتہائی عامیانہ انداز اختیار کیا ہے۔ جو ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ مثلاً: شرر کے ایک متین صوفیانہ مضمون ہم تم اور وہ کے مندرجہ ذیل فقرے ملاحظہ ہوں:

''اس لیے وہ، اے پیارے وہ، دلدار، وہ ناز آفرین، وہ ہمیں بس تو ہی تو چاہیے''

''تم ہائے تم، پس تم ہی تم، وصال ہے تو تم سے فراق ہے تو تمہارا''

''میری تمام جوروں پر طلاق''[۱۲۷]

پروفیسر افضل حسین اظہر اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

جس طرح سرسید کے ہاں عبارت کے جوش اور روانی میں صحت زبان کا پہلو کہیں کہیں نظر انداز ہو گیا۔ اس طرح شرر سے بھی یہ کوتاہی ہوئی ہے۔ سرسید کے مقابلے میں شرر کے ہاں ایسی مثالیں کم نہیں اور یہ ان کے دامن تحریر کا نمایاں داغ ہیں۔ ان کے ہاں کہیں کہیں محاورہ غلط ہو جاتا ہے اور کبھی املا بھی غلط ہو جاتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ املا کی غلطی اس دور کی کتابت کی وجہ سے ہو۔ بہر حال ان تمام قسم کی غلطیوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہوتے ہوتے آخر کے متنوں پر سے ڈاڑھیاں غائب ہو گئیں۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۱۷۳)

۲۔ جتنے منوں پر ڈاڑھیاں باقی رہ گئی تھیں وہ بھی تشریف لے گئیں۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۱۷۲)

۳۔ سلام جو حضرت رسالت کا پیام ہے تم کو پہونچے، (گذشتہ لکھنو، ص ۲۸۷)

۴۔ طرح طرح کے معنی پینا کے کیانت کو اور چمکاتے تھے۔ (کیانت)

۵۔ غسل کے بعد کفن پہنا جاتا ہے۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۳۱۵)

۶۔ ہم پر ''وہ'' کی ''وصیت'' اس قدر جاری ہے کہ سوا ''وہ'' کے ہمیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ (ہم تم اور وہ)

۷۔ جو بلحاظ (مضبوطی کے ناقص اور باعتبار ضروریات زندگی کے نہایت ہی دلفریب تھی۔ (گذشتہ لکھنو، ۳۵)

۸۔ حضرت گنج کے مغربی حصے میں لب سڑک موجود ہے۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۵۱)

۹۔ غفلت و جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہونچ گیا۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۵۲)

۱۰۔ قے و دشت جاری ہو گئے۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۳۷)

۱۱۔ اور بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے لوگوں کو اپنے گھروں میں آنے کی اجازت ملی۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۲۷)

۱۲۔ از روئے قانون پنشن، بادشاہ کی پنشن میں سے ایک ثلث گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے۔

۱۳۔ ابوبکر خطیب نے لاپروائی سے جواب دیا۔ (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۹۶)

۱۴۔ لوگ اس ولولے کے ثبوت کے لیے دیوان کشا جم خرید کرتے (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۱۷)

۱۵۔ جسم ڈھنکا رہتا ہے۔ (گذشتہ لکھنو، ص ۳۴۶)[۱۲۸]

عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر میں عامیانہ انداز بیان بھی پایا جاتا ہے۔ شرر کی افسانوی و غیر افسانوی نثر

میں تکرار الفاظ بہت زیادہ ہے۔ یہ شرر کے اسلوب بیان کی خامی ہے۔ شرر عام طور پر ایک ہی بات کو دھرا دھرا کر بیان کرتے ہیں اور اکثر دو دو الفاظ و مرکبات استعمال کرتے ہیں۔ یہ خامی شرر کے مضامین وانشائیہ، سوانح عمریوں اور تاریخی کتب، صحافتی ادب میں موجود ہے۔ شرر کی تحریر کے اس نمایاں نقص پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر افضل حسین اظہر رقمطراز ہیں:

> شرر کی تحریر کا ایک نمایاں نقص یہ ہے کہ وہ عام طور پر ایک ہی بات کو دہرا دہرا کر اور ایک ہی مطلب کے لیے دو دو الفاظ یا مرکبات استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کی یہ فضول خرچی بہت گراں گزرتی ہے...... یہ عیب شرر کے مضامین اور ناول دونوں میں یکساں طور پر موجود ہے کہ وہ مترادفات کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔[۱۲۹]

شرر کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں الفاظ کی تکرار موجود ہے۔ مثالیں حسب ذیل ہیں:

''ان کے طرزِ عمل اور ان کی پالیسی میں ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پراسرار بیقراری نظر آتی ہے'' (گذشتہ لکھنو، ص ۳۳)

''ملک کا انتظام انہوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی وشائستگی سے کیا'' (گذشتہ لکھنو، ص ۳۷)

''بعض اوقات ان کا دل تاج وتخت فرمانروئی وجہاں بانی سے کھٹا ہوگیا'' (گذشتہ لکھنو ص ۳۷)

''انہوں نے حسابات کی جانچ کی اور ادنی ادنی رقموں پر نظر ڈالی'' (گذشتہ لکھنو، ص ۱۳۳)

''صاف ظاہر ہے کہ یہ کاغذ جعلی ہے اور بنایا ہوا ہے'' (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۱۵)

''کل شائقین علوم کو بڑی خوشی اور مسرت ہوگی'' (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۱۰)

''ان سے مستحکم عہد اور مضبوط وعدہ لیا'' (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۱۷۹)

''وہ ایک حسین لڑکی پر مفتون اور شیدا تھا'' (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۱۴۲)

''ان امورات کو توضیح اور تفصیل سے کیا مطلب'' (اسلامی سوانح عمریاں، ص ۱۴۳)

شرر کے اسلوب کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ سلیس، رواں دواں اور شگفتہ تحریر کے درمیان ایسے الفاظ

استعمال کرتے ہیں جس کے مطالعے سے یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ رنگ شرر کا نہیں کسی اور ادیب کا ہے۔ پروفیسر افضل حسین اظہر کا خیال ہے:

> شرر اپنے سلیس اور شگفتہ طرزِ تحریر کے دوران ہی ایسے الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں کہ اچانک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کسی دوسرے ادیب کا رنگ ہے اور اس سے ان کے اپنے اندازِ تحریر میں ناہمواری دکھائی دیتی ہے۔ سرسید یا حالی کے ہاں جس طرح مسلسل ہموار موزوں اور یکساں اندازِ تحریر پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں یہ کیفیت نہیں۔ رواں دواں اندازِ بیان کے دوران ہی الفاظ کی گرانی دخیل ہو کر ان کی انشا پردازی کو گرانبار کر دیتی ہے۔[۱۳۰]

شرر کے ہاں طنز کے مقابلے میں مزاح تو آٹے میں نمک کے برابر ہے اور جو ہے وہ بھی اعلیٰ درجے کا نہیں ہے۔ شرر کی غیر افسانوی نثر میں طنز بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔......ان کی عرب پسندی نے ان کے اسلوب بیان کو بھی متاثر کیا۔ ان کو تشبیہات واستعارات، لفظی مصوری، محاکات اور اظہار بیان کے مختلف سانچوں میں یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے......عربی شعر وادب کے مطالعے نے سب سے زیادہ شرر کی امیجری کو متاثر کیا وہ اپنی تحریروں میں عربی ادب اور زندگی و معاشرت سے بے پناہ استفادہ کرتے ہیں۔

شرر نے جو کچھ بھی لکھا وہ اس انداز سے لکھا کہ جو لوگ مولانا کی تصانیف کو نہیں پڑھتے تھے۔ وہ بھی مجبور ہوتے کہ ان کا مطالعہ کریں اور یہ صرف ان کے طرزِ تحریر کی وجہ سے ہوا۔ ان کی نگارشات میں تہذیب وتمدن کا عنصر بھی موجود تھا۔ پورے ہندوستان میں ان کے طرزِ تحریر نے شہرت پائی۔ اس ضمن میں پریم چند اپنے مضمون ''عبدالحلیم شرر'' میں لکھتے ہیں: ''تمام ہندو مسلمان سوسائٹی میں ان کا طرزِ تحریر مقبول عام ہوا اور تمام مہذب لوگوں نے اسے اپنے کتب خانہ میں جگہ دی اور ان کے اقتباسات درسی کتب میں داخل ہونے لگے''۔[۱۳۱]

بقول رام بابو سکسینہ:

> مولینا کا رنگ عبارت اسٹڈی کیا جائے اور اس میں خاص حیثیت سے انسان منہمک ہو تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اردو میں کیا چیز پیدا کی ہے......انہوں نے خالی مضامین کو لیا اور ان میں بالکل انگریزی جادو نگاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجیب خوبصورتی کے ساتھ انہیں اردو میں کھپا دیا۔ اردو پبلک میں ابتدا یہ نیا رنگ تھا۔ انگریزی دانوں کو اردو میں وہ چیز مل گئی جیسے وہ ڈھونڈ رہے تھے اور صرف اردو جاننے والوں کو تھوڑی وحشت کے بعد جب اس کی چاٹ پڑی تو ان کے نزدیک اس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہیں۔[۱۳۲]

شرر کے اسلوب کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے کہ انہوں کے درمیان میں کبھی کبھی سوالیہ انداز اختیار کیا ہے اور اس طرح بحث طلب نکتہ کے متعلق جتنے موافق ومخالف سوالات ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ خلش جو ایک سمجھدار قاری کے دل میں پیدا ہوتی ہے نہایت خوبصورتی سے اس کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں پڑھنے والے کو ندرت بیان کے ساتھ ساتھ تاثیر اور زور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ شرر کبھی کبھی عام بول چال کے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ شرر کو تاریخ سے خاص شغف تھا جس کی وجہ سے وہ اسلام کے سیاسی وسماجی کارناموں پر اس خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں کہ گمنامی اور غلط فہمی کی تاریک گھاٹیوں سے واقعات نکل کر حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ شرر نثر لکھنے میں ایک طرز خاص کے مالک تھے۔ ان کی عبارت میں ادبیت وپختگی کے ساتھ ساتھ علمیت کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہے لیکن اس علمیت کا بیان نہیں ہے جو کانوں کو گراں گذرے۔ وہ عربی اور فارسی الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتے ہیں لیکن اسے الفاظ جواب ہمارے لیے ناگزیر ہیں اور جن کے بغیر ہم اپنے بلند خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے۔ ان کی عبارت میں تسلسل اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ خشک سے خشک مضمون کو بھی اپنے طرز بیان سے دلچسپ بنا لیتے ہیں اور الفاظ کے برمحل استعمال سے سلاست ہر جگہ پر قلم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ وہ کبھی کبھی شگفتگی وشوخی اور ظرافت کی حد تک پہنچ کر مضمون کو زیادہ مزیدار بنا دیتے ہیں۔ شرر کی نثر میں کبھی کبھی خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انداز بیان میں برجستگی اور مضمون میں ایک خاص لطف آ جاتا ہے۔ اپنی تحریروں سے آپ ملک وقوم کو کورانہ تقلید سے بچانے کے لیے اکثر نہایت پر اثر الفاظ میں لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں لیکن جو بات آپ کہنا چاہتے ہیں وہ ناصح کی طرح نہیں کہتے بلکہ خلوص اور لطیف اشاروں سے کہتے ہیں۔ آپ کے مضامین ورسالہ دلگداز اور دیگر رسائل نے ایک عرصہ تک ادب وقوم کی قابل قدر وخدمت کی اور اپنے مضامین کے اعتبار سے ملک میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔

مولانا کا انداز تحریر نہایت صاف، سلیس اور سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی چمک اور زور وقوت دکھائی دیتا ہے۔ ان کے انداز تحریر میں نہ آزاد کی سی شوخی ورنگینی ہے نہ نذیر جیسی نازک اور لطیف ظرافت ہے۔ پھر بھی زور بیاں پایا جاتا ہے۔ وہ نفس مطلب پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سرسید کے عہد کے دیگر نثر نگاروں کی طرح شرر بھی آرائش بیان کو ثانوی اور مقصدیت کو اولین حیثیت دیتے ہیں۔ صنائع بدائع کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ ان کی تحریر صاف ستھری اور ٹکسالی ہے۔ محاورات کا استعمال بھی کہیں کہیں کرتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر کی نثر کی خصوصیات کا جائزہ لینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرر کی نثر کی عام خصوصیات شگفتگی، رنگینی، لطافت اور نزاکت، دلکشی، عام فہم انداز۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کے ہر موضوع میں ملتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہر موضوع کے لیے اپنا وہی مخصوص انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ تاریخ، تنقید، تحقیق، سوانح، سیرت، مضامین، انشائیے، مقالہ، مضامین کی وادی میں ان کا قلم ایک ہی قسم کی گل کاری کرتا دکھائی دیتا

ہے۔عبدالحلیم شرران مضامین نگاروں میں سے ہیں جو اپنے فن کے تقاضوں اوراس کی محدودات کو بطریق احسن جانتے سمجھتے اور نبھاتے ہیں۔

پروفیسر اعجاز الرحمٰن رقمطراز ہیں:

شرر کے اسلوب بیان میں ہمیں تین رنگ نمایاں ملتے ہیں:

۱۔ لکھنو کی تربیت یافتہ غیر معتدل تخیلات ،جس میں تکلف بے جا ہے۔

۲۔ رومانیت اور جنسیت کا خوشگوار اور مزیدار پہلو۔

۳۔ جوزندگی کائنات، ادراک، احساس کے انتہائی ہیجان خیز پہلوؤں پر مشتمل ہے اوران تینوں چیزوں کو جوعنصر جلا بخشتا ہے وہ ہے شرر کی تحریروں کا آہنگ۔شرر کے انشاء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک خروش ایک گونج کی سی کیفیت اور بلند آوازی پائی جاتی ہے اوراس آہنگ کو پیدا کرنے کے لیے وہ لفظی تکرار سے بھی کام لیتے ہیں۔

غم کدہ ہجران کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جو کالی کالی بھیانک صورتیں نظر آ آ کرفرقت زدوں کو ڈرایا کرتی ہیں تو یہی انہیں بھگا بھگا دیتی ہے اور مٹا مٹا دیتی ہے۔

بعض مقامات پر تکرار حروف سے بھی کام لیا ہے۔''کوئی اتنا بھی نہیں پوچھتا کہ سفر میں کیا کیا دیکھا۔کہاں کہاں گئے۔کس کس جگہ کی سیر کی۔کن کن مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔کیسی کیسی جھیلی ......''۱۴۳

مختصراًیہ کہ عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں حقیقت نگاری بھی ہے اور تخیل آمیزی بھی۔ان کے ہاں تاریخ نگاری میں سادگی ہے اور مضامین میں علمی ذوق وشوق اور نکتہ سنجی کے اعلیٰ مذاق کا اظہار ہوتا ہے۔سیرت وسوانح میں داستان گو کی سی نرمی گرمی اور محققین کی سی تحقیق وجستجو بھی نظر آتی ہے۔عبدالحلیم شرر کے اسلوب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ ہرقسم کی تحریر کے لیے موزوں ترین اور مناسب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔بعض اوقات عربی، فارسی کے ثقیل سالفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن یوں کہ وہ اسی مقام وجگہ کے لیے بنے ہیں۔شرر کے ہاں ندرت خیال، لطافت بیان، وسعت علم اور فکر کی گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی دلاویزی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔جس کی بدولت خشک سے خشک موضوع بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، پروگریسو بکس لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۸

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۰

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں خطوط نگاری، مشمولہ، سہ ماہی اردو، شمارہ۔۲، ۱۹۸۵ء، انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی، ص ۵۳

۴۔ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱

۵۔ شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق حیات اور کارنامے، انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۰

۶۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، خطوط نگاری، مشمولہ، اردو نثر کا فنی ارتقاء، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹۶، ۳۹۷

۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، طیف نثر، مرتب، ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ص ۸۱

۸۔ یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ، نقوش، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۵ء، ادارہ فروغ اردو، ص ۴۲، ۴۳، ۷۲

۹۔ ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر بحوالہ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، ص ۲۶۰

۱۰۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، خطوط نگاری، ص ۳۹۸۔۳۹۹

۱۱۔ سید مسعود ہاشمی، پروفیسر، بیسویں صدی میں تنقید، روزن پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۹۸ء، ص ۵۱۷۔۵۱۸

۱۲۔ شمس الرحمٰن محسنی، اردو خطوط، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۷ء، ص ۲۰۔۲۱

۱۳۔ معین الدین انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳

۱۴۔ محمد عسکری، مرزا، ادبی خطوط غالب، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۴

۱۵۔ احسن مارہروی، تاریخ نثر اردو، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۵۳۰

۱۶۔ مالک رام، اردو کے منفرد مکتوب نگار، مشمولہ، نقوش خطوط نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۳۹

۱۷۔ خواجہ احمد فاروقی، تحقیقی مقالہ، مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء، دہلی یونیورسٹی دہلی، س۔ن، ص ۱۵۸۔۱۵۹

۱۸۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، لکشمی نرائن گروال، آگرہ، ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۴۔۲۳۵

۱۹۔ اولیس احمد، ادیب، تنقیدیں، اردو پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، ص ۱۰۱

۲۰۔ آفاق حسین، مرتب، نادرات غالب، ہیشور پریس، کراچی، ۱۹۴۹ء، ص ۶۵

۲۱۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، س۔ن، ص ۲۵۴۔۲۵۳

۲۲۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، غالب آشفتہ نوا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۹

۲۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اردو ادبی تاریخ کا خاکہ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۵۵۔۵۶

۲۴۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، تنقیدی نقوش، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۵۰۔۱۵۱

۲۵۔ جمیل یوسف، سرسید احمد خان، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۳۔۱۵۴

۲۶۔ مفتون احمد، مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۱

۲۷۔ سید مسعود ہاشمی، پروفیسر، بیسویں صدی میں تنقید، ص ۵۱۸

۲۸۔ رشید حسن خان، ذاتی خطوں سے متعلق چند مفروضات، مشمولہ، سہ ماہی فنون، شمارہ۔۳، ستمبر دسمبر ۱۹۹۲ء، ملک چرز، لاہور، پاکستان، ص ۳۹

۲۹۔ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، ص ۷

۳۰۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی نثر کی اصناف، مشمولہ نقوش، شمارہ ۱۳۴۰ء، دسمبر ۱۹۸۶ء، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۹۱

۳۱۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، خطوط نگاری، ص ۳۹۵

۳۲۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی، مشمولہ نقوش، شمارہ۔۷۹۔۸۰، ۱۹۶۰ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۲۰۵

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۳۴۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام نواب سید علی حسن، مشمولہ نقوش، ص ۲۰۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۳۶۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، مشمولہ نقوش خطوط نمبر، شمارہ۔۱۰۹، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۲۱۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۱۴

۳۸۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام فاطمہ محسنہ، ص ۲۱۵

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۴۰۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ص ۲۱۹

۴۱۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیز ام فاطمہ ومحسنہ، ص ۲۱۵

۴۲۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ص ۲۱۸

۴۳۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ص ۲۲۰

۴۴۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ۱۸ ستمبر ۱۸۹۶ء، ص ۲۲۸

۴۵۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ۲۴ ستمبر ۱۸۹۶ء، ص ۲۲۹

۴۶۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ۱۰۱ کتوبر ۱۸۹۶ء، ص ۲۳۰

۴۷۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ فاطمہ، مورخہ ۶ مئی ۱۸۹۶ء ص ۲۲۱

۴۸۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ۱۴ جولائی ۱۸۹۶ء، ص ۲۲۲

۴۹۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ۲ جولائی ۱۸۹۶ء، ص ۲۲۵

۵۰۔ عبدالحلیم شرر، خطوط شرر، مشمولہ نقوش خطوط نمبر ا، شمارہ ۔۱۰۹، ۱۹۶۸ء، ادارہ فروغ اردو، ص ۲۳۱

۵۱۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار من سلمہ، ص ۲۳۸۔ ۲۳۹

۵۲۔ محمد معین الدین، پروفیسر، تحقیقی مقالے، پاکستان کتاب گھر، س۔ن، ص ۸۹

۵۳۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخودار، ص ۲۴۰

۵۴۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۸

۵۵۔ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۹

۵۶۔ ایضاً، ص ۷، ۸

۵۷۔ مولوی عبدالحق، مقدمات، (حصہ دوم) مرتب: مرزا محمد بیگ، مکتبہ ابراہیمہ، حیدرآباد، ۱۹۳۱ء، ص ۹۸

۵۸۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب) کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۶

۵۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، طیف نثر، ص ۴۷

۶۰۔ سید مسعود ہاشمی، پروفیسر، بیسویں صدی میں تنقید، ص ۵۱۷۔ ۵۲۱

۶۱۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر، خطوط نگاری، ص ۳۹۷

۶۲۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، غالب اور اقبال، روحانی پرنٹرز، اسلام آباد، س۔ن، ص ۱۰۷

۶۳۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار من سلمہ، اپریل ۱۹۲۵ء، مشمولہ نقوش، ص ۲۴۳

۶۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں خطوط نگاری، مشمولہ، سہ ماہی اردو، شمارہ ۲، ۱۹۸۵ء، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۵۴

۶۵۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی نثر کی اصناف، مشمولہ، نقوش، شمارہ ۔۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۹۱

۶۶۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار، مارچ ۱۹۲۴ء، مشمولہ نقوش، خطوط نمبر ا، شمارہ ۔۱۰۹، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۲۴۰

۶۷۔ عبدالحلیم شرر بنام برخوردار، فروری ۱۹۲۴ء، ص ۲۴۰

۶۸۔ عبدالحلیم شرر بنام برخوردار، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۲۴۲

۶۹۔ عبدالحلیم شرر بنام لخت جگر سلمہ، اپریل ۱۹۱۶ء، ص ۲۴۳

۷۰۔ عبدالحلیم شرر بنام لخت جگرم، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۲۴۷

۷۱۔ عبدالحلیم شرر بنام لخت جگرم، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۲۴۸

۷۲۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، ص ۲۶۸، ۲۶۹

۷۳۔ سید مسعود ہاشمی، پروفیسر، بیسویں صدی میں تنقید، روزن پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۹۸ء، ص ۵۲۱

۷۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں خطوط نگاری، مشمولہ، سہ ماہی اردو، شمارہ۔۲، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۵۳

۷۵۔ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۶

۷۶۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار، (جون ۱۹۲۶ء) مشمولہ نقوش، خطوط نمبر ا، ص ۲۴۶

۷۷۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار، ص ۲۳۶

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۷۹۔ اسرار احمد سہاروی، پروفیسر، فکر و نظر، فروغ ادب اکادمی، گوجرانوالہ، ۱۹۹۱ء، ص ۵۸

۸۰۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ص ۲۱۵

۸۱۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام حکیم عبدالحی صاحب، ۲۰ اگست ۱۹۱۸ء، ص ۲۳۴

۸۲۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار، ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۲۳۸

۸۳۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، غالب اور اقبال، ص ۹۴

۸۴۔ ممتاز حسن، ادبی مسائل، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۱۵۱

۸۵۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، تنقیدی مضامین کا مجموعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۳

۸۶۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام برخوردار، اگست ۱۹۲۲ء، مشمولہ نقوش خطوط نمبر ا، ص ۲۳۶

۸۷۔ اسرار احمد انصاری، پروفیسر، فکر و نظر، ص ۶۳

۸۸۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ۱۳ اگست ۱۹۹۶ء مشمولہ نقوش خطوط نمبر، ص ۲۲۸

۸۹۔ عبدالحلیم شرر، خط بنام عزیزہ ام محسنہ، ص ۲۲۹

۹۰۔ اسرار احمد انصاری، فکر و نظر، فروغ ادب اکادمی، گوجرانوالہ، ۱۹۹۱ء، ص ۶۳

۹۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۹

۹۲۔ محمد حسن عسکری، ستارہ یا بادبان، مکتبہ سات رنگ، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۶

۹۳۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۵۰

۹۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، ص ۲۹

۹۵۔ سجاد نقوی، مطالعے، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۷

۹۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، ص ۲۹

۹۷۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۹

۹۸۔ سید وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ نقد، آگہی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۳۹۔۳۴۰

۹۹۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، دبستان ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۰

۱۰۰۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، ٹوٹا ہوا کھنڈر، ص ۶۸

۱۰۱۔ اعجاز الرحمٰن، شرر کا اسلوب بیان، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، آئینہ ادب، لاہور، جون ۱۹۷۲ء، شمارہ ۷، ص ۱۷۸۔۱۷۹

۱۰۲۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۵۔۱۲۶

۱۰۳۔ افضل حسین اظہر، پروفیسر، شرر کی انشاپردازی، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، شمارہ ۔۷، جون ۱۹۷۲ء، آئینہ ادب، لاہور، ص ۱۸۷۔۱۸۸

۱۰۴۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۰۵۔ افضل حسین اظہر، پروفیسر، شرر کی انشاپردازی، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، ص ۱۸۷

۱۰۶۔ ایس ایم معین قریشی، اردو زبان و ادب، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۱

۱۰۷۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۲۹۔۱۳۰

۱۰۸۔ افضل حسین اظہر، پروفیسر، شرر کی انشاپردازی، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، ص ۱۸۹

۱۰۹۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص ۱۳۰

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۱۱۱۔ اعجاز الرحمٰن، شرر کا اسلوب بیان" مشمولہ، خیابان شرر نمبر، ص ۱۸۱

۱۱۲۔ افضل حسین اظہر، پروفیسر، شرر کی انشاپردازی، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، ص ۱۹۰

۱۱۳۔ عبدالسلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۸۶

۱۱۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص ۱۳۱

۱۱۵۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۷۰

۱۱۶۔ افضل حسین اظہر، پروفیسر، شرر کی انشاپردازی، مشمولہ خیابان شرر نمبر، ص ۱۹۲

۱۱۷۔ اعجاز الرحمٰن، شرر کا اسلوب بیان، مشمولہ، خیابان شرر نمبر، ص ۱۸۰

۱۱۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، ص ۶۸

۱۱۹۔ مولانا صلاح الدین احمد، صریر خامہ، جلد دوم، المقبول پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۹

۱۲۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، ص ۶۷

۱۲۱۔ عبدالسلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، ص ۶۵

۱۲۲۔ اعجاز الرحمٰن، شرر کا اسلوب بیان، ص ۱۸۳

۱۲۳۔ افضل حسین اظہر، پروفیسر، شرر کی انشاپردازی، ص ۱۸۸

۱۲۴۔ ایضاً،ص۱۹۴

۱۲۵۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص۱۳۱

۱۲۶۔ عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، جلد اوّل، حصہ اوّل، شاعرانہ و عاشقانہ، ایس عبدالرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن، ص۴

۱۲۷۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، ص۱۳۲

۱۲۸۔ افضل حسین اطہر، پروفیسر، شرر کی انشا پردازی، ص۱۹۴۔۱۹۵

۱۲۹۔ ایضاً،ص۱۹۸

۱۳۰۔ ایضاً،ص۱۹۹

۱۳۱۔ پریم چند، مضمون، عبدالحلیم شرر، ص

۱۳۲۔ رام بابو سکسینہ، تالیف: تاریخ ادب اردو، مترجم، مرزا محمد عسکری، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۲۹ء، ص۵۴۷۔۵۴۸

۱۳۳۔ اعجاز الرحمٰن، شرر کا اسلوب بیان، ص۱۸۳۔۱۸۴

باب ہفتم

مجموعی جائزہ

شرر کو سیرت نگاری و سوانح نگاری، تنقید اور تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔شرر کے عہد کے ادیب کچھ مخصوص میدان ادب میں مقام و مرتبہ کے حامل تھے۔ برعکس اس کے شرر ہر صنف ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔اگر چہ ادبی دنیا میں وہ ناول نگار کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن تاریخی ناول نگار کے علاوہ بھی ان کے کئی ایک میدان تھے۔جن کا ذکر اس مقالے میں ہوا ہے۔شرر کے ہاں وسعت خیال بھی ہے اور تنقیدی نظر بھی۔عبدالحلیم شرر کی ذات ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اور ان کی ادبی کاوشیں اردو زبان و ادب کے لیے ناقابل فراموش ہیں۔ان کا نام بطور سیرت نگار، سوانح نگار، مضمون نگار، خاکہ نگار، ڈرامہ نگار، تاریخ نگار، نقاد، صحافی کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

شرر اردو ادب کی معروف و مشہور شخصیت ہیں۔انہوں نے سرسید احمد خاں اور ان کے ہم عصروں کے ساتھ مل کر ادب میں قدیم و فرسودہ روایات کو نکال پھینکنے اور اصلاح معاشرہ کا عظیم کام سرانجام دینے میں اہم کردار ادا۔کیا وہ اگر چہ اردو ادب کے پہلے تاریخی ناول نگار ہیں اور اسی وجہ سے مشہور و معروف بھی ہیں۔لیکن اس مقالے کی وجہ سے ان کی دیگر حیثیات اور مقام ادب کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ عبدالحلیم شرر کی غیر افسانوی نثر جو گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے اس کو منظر عام پر لایا جائے۔اس کوشش میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔اس کا فیصلہ تو اہل ادب ہی کریں گے۔عبدالحلیم شرر کا دور ادب نوازوں اور ادب کے خیر اندیشوں کا ایسا دور تھا جو حسن بیان اور حسن خیال کی توسیع کوششوں میں ہی مصروف رہا۔شرر کی تحریریں ایک مصلح کی تحریریں نہیں۔ان کی تحریروں میں خوش ذوقی، ادب نوازی اور اصلاح پسندی کے عناصر کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔شرر کی تحریروں کے عنوانات و موضوعات ان کے نقطۂ نظر اور اصلاح پسندی کی پیداوار ہیں۔

انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کا آغاز اردو ادب کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس لیے کہ شاعری کا رنگ بدلنے کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی نئے اصناف ادب کا داخلہ ہوا۔ناول، سوانح نگاری، مضمون نگاری، تاریخ نگاری، تنقید وغیرہ کی ابتدا اسی دور سے ہوئی ہے۔سرسید، حالی، آزاد، ذکاءاللہ، نذیر، شبلی، اکبر، سرشار اور شرر کے ہاتھوں اردو ادب کی نئی دنیا نے جنم لیا۔ان میں سے ہر ایک کا کارنامہ بہت اہمیت کا حامل اور اردو کے خزانہ کے لیے بہت قیمتی ہے۔مولانا عبدالحلیم شرر بھی اردو نثر کے بڑے بڑے ستونوں میں ایک ہیں۔انہوں نے اردو ادب میں جو اضافے کیے ہیں ان کو سامنے رکھ کر ادیبوں اور شاعروں نے اردو ادب کے دامن کو وسعت عطا

کی اور زمانے کی جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ادب کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔عبد الحلیم شرر نے اردو ادب کو اعلیٰ پائے کی نثر دی۔انہوں نے ذوق وشوق سے ادب کے ہر شعبہ کو چمکانے کی کوشش کی۔آپ نے مغرب سے آنے والے نئے علوم وفنون، معلومات وخیالات سے استفادہ کیا۔آپ نے نئی شاعری، ناول، ڈرامہ، تنقید، سوانح نگاری، سیرت نگاری، انشا، علمی مضمون نگاری ہر چیز کو فائدہ پہنچایا۔آپ نے اپنے فن سے قومی زندگی میں جوش اور گہرائی پیدا کی اور اردو ادب کا دامن مالا مال کر دیا۔شرر نے اپنی نگارشات کے ذریعے سے نثری خزانے کو نادر کتابوں سے بھر دیا۔ان کا تخلیق کیا ہوا غیر افسانوی ادب زندگی کا ترجمان ہے۔انہوں نے اپنے موضوعات مادی زندگی اور معاشرے کی بدلتی ہوئی صورتحال سے اخذ کیے۔انہوں نے جو کچھ بھی لکھا معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے لکھا۔اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ ادب کے بیج ہماری مادی زندگی اور معاشرے سے پھوٹتے ہیں لیکن اس بات میں بھی بڑی صداقت ہے کہ ادب ایک ایسی طاقت ہے جو زندگی کو زندگی اور آدمی کو انسان بناتی ہے۔ہمارے وجود کی اصل روح ادب ہی ہے جس کی بدولت ہم دنیا میں جینے کا سلیقہ، مقصدِ حیات، مثبت اندازِ فکر ونظر اور سچی خوشیاں حاصل کرتے ہیں۔اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ادب ہی قوموں کی تقدیر بناتا ہے۔یہ اپنے اندر ماضی، حال اور مستقبل کو سمیٹ لیتا ہے۔

اردو ادب میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں شرر کے کارنامے اہمیت کے حامل ہیں۔آپ نے ناول بھی لکھے اور ڈرامے بھی۔ان کو شہرت تاریخی، ناول نگار کی وجہ سے ملی۔اگر چہ بعض نقاد انہیں اردو کا بہترین ناول نگار تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سرشار، نذیر احمد، رسوا اور شرر کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔ان پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں میں سماجی زندگی کی جزئیات نہیں ہیں۔ان پر عامیانہ انداز کا مذہبی غلو حاوی رہتا ہے۔حقیقت نگاری کے بجائے رومان اور داستان آفرینی غالب رہتی ہے۔کرداروں کی تخلیق میں بھی یہ ناکام رہے۔ایک ناول کے کردار کی جگہ دوسرے ناول کا کردار رکھ دیا جائے تو نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ان کا نظریہ عشق بسا اوقات مخربِ اخلاق بھی کہا جا سکتا ہے۔عورت کے بارے میں شرر کا تصور بہت ناقص ہے۔اس طرح کی متعدد خامیوں کے باوجود ان کی اہمیت پر حرف نہیں آتا اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شرر نے افسانوی نثر کے فن کو جس تسلسل اور انہماک کے ساتھ اپنا سرمایہ حیات بنایا۔ان کے پیش روں اور ہم عصروں میں کسی نے اس طرح اختیار نہیں کیا۔شرر اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں طرزِ ادا کی بنا پر منفرد وممتاز ہیں۔انہوں نے محاوراتی زبان کو فطری آہنگ عطا کر کے بیانیہ کے لائق بنایا۔فطری اندازِ بیان کو ترقی دی۔فضا آفرینی ومنظر نگاری کی خوبصورت مثالیں قائم کیں جن کا جواب نہ تو اس دور میں ممکن تھا اور نہ آج کے دور میں۔شرر نے غیر افسانوی نثر لکھ کر اردو ادب کی بہت خدمت کی۔انہوں نے سیرت وسوانح، مضمون و انشائیہ نگاری، مقالہ نگاری، تاریخ و صحافت، رپوتاژ، خطوط وغیرہ لکھ کر اردو ادب کے دامن کو اپنے زندہ کارناموں سے بھر دیا۔نثر کی بہت ساری اقسام

ہیں لیکن دو بڑی اقسام افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر ہیں۔افسانوی نثر میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ شامل ہیں جبکہ غیر افسانوی نثر میں دیگر اصناف نثر شامل ہیں مثلاً سیرت نگاری، سوانح نگاری، سفر نامہ، صحافت، لسانیات و ڈائری، مکتوبات، انشائیہ، مضمون نگاری، مقالہ نگاری، خاکہ نگاری، تنقید، تاریخ، رپورتاژ، مزاح نگاری وغیرہ۔شرر جامع الحیثیات ہیں۔بطور سیرت نگار اردو ادب میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہمارے لیے خیر وفلاح کی جانب لے جانے والی منور کہکشاں ہے۔جب تک کائنات ارضی پر سورج طلوع ہوتا رہے گا سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہماری ہدایت کا سامان مہیا کرتی رہے گی۔زندگی کا کوئی گوشہ، دنیا کا کوئی خطہ اور زمانے کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں پیش آنے والے مسائل وواقعات کے لیے آپ کی سیرت سے رہنما اصول نہ ملتے ہوں۔سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ کا موضوع ہر لحاظ سے عظیم لشان، ہر اعتبار سے ایک نہایت جلیل القدر اور رفیع المرتبت اور ہر جہت سے انتہائی مقدس ومبارک موضوع ہے۔اس لیے کہ اس موضوع کا تعلق جس ذات اقدس سے ہے وہ ہمارے عقیدے کی رو سے انسانی عظمت و بزرگی کے اعلیٰ ترین مرتبے اور بشری رفعت و بلندی کے انتہائی معراج کمال پر فائز ہے۔بالفاظ دیگر وہ تمام صفات وفضائل اور وہ جملہ محاسن ومکارم جن پر انسانی عظمت و بزرگی کا دارومدار ہے وہ اپنی صحیح ترین، کامل ترین اور اعلیٰ ترین شکل میں اس ذات اقدس کے اندر پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے اور وہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کا صحیح اور حقیقی صداق ٹھہری۔سیرت طیبہ پر ہر زبان میں، ہر پہلو پر، ہر گوشے اور ہر عنوان سے مفصل اور مجمل مورخانہ اور محدثانہ، علمی اور تحقیقی انداز سے لکھی جانے والی کتابوں کے عظیم ذخیرے کے باوجود بے شمار نادر پہلو اور متعدد اسالیب بیان کے امکانات آج بھی باقی ہیں۔فکر قلم کی نادرہ کاری کا یہ میدان اس موضوع مقدس کا وہ اختصاص ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اس قدر پہلو دار ہے کہ رہتی دنیا تک مصنفین ومولفین لکھتے رہیں گے اور حیات مقدسہ کے نئے زاویئے ابھرتے رہیں گے۔

حضور ختم المرسلین، فخر النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو جاننا، سمجھنا اور اس کا اتباع کرنا ہر اس شخص کا فریضہ ہے جو اپنی اور دوسروں کی فلاح کا طالب ہے۔آپ ﷺ کی سیرت کا اتباع کیے بغیر نہ انسان راہ راست کو پا سکتا ہے اور نہ ہی رب العزت کی رضا وخوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی اعتبار سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔اگر زمین وآسمان صفحات میں تبدیل ہو جائیں تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی میں تبدیل ہو جائیں تب بھی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے مقامات سیرت اور کلام واخلاق کا احاطہ ناممکن ہے۔امت مسلمہ اگر تا قیامت آپ ﷺ کے شمائل تحریر کرتی رہے تو پھر بھی وہ اپنے عجز بیان کی معترض رہے گی۔

سرور دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پوری انسانیت کے لیے نمونہ کمال ہے۔ خالق کائنات نے آپ کی ذات بابرکات میں اعلیٰ اقدار کی تمام خوبیاں جمع کر دی ہیں۔ جو انسانیت کا جوہر ہیں۔ ان کے اتباع کو فلاح دارین کی ضمانت قرار دیا۔ صحابہ اکرام آپ ﷺ کی ایک ایک ادا کو دیکھتے اور اسے حرز جاں بنانے کو نہ صرف اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے بلکہ زندگی کے تمام مشاغل میں آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کو تمام جزئیات کے ساتھ محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی عظیم ہستیاں ملت کی امین ہیں جنہوں نے یہ اصول امامت بعد میں آنے والے لوگوں تک پہنچانے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ تاریخ اسلام کا کوئی عہد ایسا نہیں جس میں سیرت پاک پر کوئی کتاب نہ لکھی گئی ہو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پوری انسانیت کے لیے رحمت ہے۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات اقدس پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوا۔ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں آپ ﷺ کی سیرت کو تمام مسلمانوں کے لیے اسوہ قرار دیا گیا۔ آپ ﷺ کے دین پر تمام شریعتوں کا اختتام ہوا۔ آپ ﷺ کا پیغام مکمل ترین اور ہر دور اور ماحول کے انسانوں کی ضروریات کی تکمیل کرنے والا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی تیرہ شب کو تابانی عطا کی۔ پیغمبر اسلام، محسن انسانیت، سرورکونین، حضور پرنور آقائے نامدار، ختم الرسل حضرت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی عظیم ترین مکمل شخصیت ہیں۔ حضور پرنور کی سیرت طیبہ رہتی دنیا تک نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کی عظمت و سیرت طیبہ کو دائرہ تحریر میں لانا بشر کا کام نہیں صرف ذاتِ خداوندی ہی ہے جو نبی کریم کی عظمت کی شاہد ہے۔

شرر کے عہد کو اگر عمیق نظروں سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے سیرت نگاری پر قلم کیوں اٹھایا ہے۔ اس زمانے کا تقاضا یہی تھا کہ قوم کی اصلاح اور ان میں دینی حمیت اور اپنی تاریخ و اسلاف سے محبت پیدا کرنے کے لیے اسی صنف ادب پر بھی قلم اٹھایا جائے۔ شرر نے تاریخ اسلام، جویائے حق اور خاتم المرسلین جیسی کتب سیرت لکھ کر اس درخشاں عہد اور شخصیت کو موضوع بنایا۔ جس سے محبت و عقیدت ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ شرر نے سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ تاکہ مسلمان اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر کامیاب و کامران زندگی بسر کر سکیں۔ اپنے تنزل کے اسباب پر غور و فکر کریں۔ اسی اصلاح کے جذبے کے تحت شرر ایک واضح مقصد لے کر آگے بڑھے اور اپنی قوم کو غنودگی کی کیفیت سے آزاد کرایا۔ سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخ کے پیرائے میں ناول کے پیرائے میں بیان کیا تاکہ تاریخ سے دلچسپی لینے والے بھی فیض یاب ہوں اور ناول سے دلچسپی لینے والے بھی اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ شرر نے تین مختلف تجربے کیے جن میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے۔

تاریخ اسلام کی پہلی جلد جو کہ سیرت رسول پاک سے متعلق تھی۔ وہ بہت اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ شرر

نے یہ تاریخ تین حصوں میں لکھی اور اس کی پہلی جلد شائع ہوتے ہی عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہوگئی۔ یہ شرر کا آخری علمی کارنامہ تھا جو کہ بڑی اہمیت کا حامل گردانا جاتا ہے۔شرر نے عرب کے تاریخی واقعات اور سیرت رسول پاک کو اپنے مخصوص انداز سے قاری تک پہنچایا۔ تاکہ مسلمانوں میں اسلام سے محبت اور رسول پاک سے عقیدت کا جذبہ پروان چڑھے اور وہ بھی اپنے آبا واجداد کے نقش قدم پر چلیں اور اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر زمانے میں اپنا نام دوبارہ روشن کریں۔شرر نے ان کتب سیرت میں عرب کے تاریخی واقعات، مسلمانوں کی تہذیب، دین داری، فیاضی، علمی مشاغل اور وضع داریوں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو اس انداز سے لکھا کہ پڑھنے والا اس سے اثر ضرور قبول کرتا ہے۔مصنف کی خوبی یہ ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکز بناتے ہوئے اس سے متعلقہ وہ تمام معلومات بھی قاری تک پہنچانے کی کوشش کی جس سے سیرت پاک کا پورا تاریخی ماحول مع سیاق وسباق کے قاری کے سامنے آجاتا ہے اور یوں قاری کو سیرت رسول پاک کا فہم بہتر طریق سے ہوتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیرت نگاری کا ذوق خصوصی طور پر ودیعت ہوا تھا۔انہوں نے اس عطیہ خداوندی کو دیانتداری اور صداقت کے ساتھ استعمال کرنے کی پوری کوشش کی۔ان کی تحریر کی ایک ایک سطر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے مملونظر آتی ہے۔رسول پاک کی محبت ہی وہ بنیادی جوہر تھا جس نے ان سے ایسا منفرد اور ممتاز کارنامہ سرانجام دلوایا۔اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ان کی سیرت کی کتب ان کے ہم عصر سیرت نگاروں کی کتب سے منفرد اور ممتاز ہیں۔عبدالحلیم شرر چونکہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ مصنفوں اور ادیبوں میں شامل تھے۔اس لیے انہوں نے سرسید احمد خان کے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کے لیے ہر صنف ادب میں کچھ نہ کچھ لکھا۔سیرت نگاری پر کتب لکھ کر شرر نے اس صنف نثر کو بھی منفرد مقام عطا کیا۔

عبدالحلیم شرر کی 'تاریخ اسلام'، 'جویائے حق' اور 'خاتم المرسلین' کتب سیرت میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ یہ کتابیں کئی اعتبار سے سیرت کی کتابوں میں نہ صرف منفرد اور نمایاں مقام رکھتی ہیں بلکہ اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے یکتا اور امتیازی درجے پر فائز ہیں۔اردو زبان میں یہ کتابیں اپنی نوعیت کی اولین کتب سیرت ہیں۔ان کتب کو اگرچہ عبدالحلیم شرر نے تاریخ، ناول اور سیرت کے انداز میں لکھا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کتب کو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مختصر اور جامع انسائیکلوپیڈیا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کے مولف نے سیرت کے بیان کے لیے جو اصول تالیف اور طرز بیان اختیار کیا ہے وہ نہ صرف تاریخ نویسی اور ناول نگاری کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے بلکہ ایک نیا اور قابل تقلید معیار بھی قائم کرتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم وجدید مصادر اور کتب حوالہ سے استفادہ کیا ہے۔ان کتب سیرت میں عبدالحلیم شرر نے سرزمین عرب کی

معلومات، جگہوں، مقامات و آ ثار کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتب سیرت کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ مصنف نے دلکش، منفرد اور دل نشین اسلوب بیان اختیار کیا۔ عبدالحلیم شرر کو اللہ تعالیٰ نے نہایت درجہ خوبصورت اسلوب تحریر کی صلاحیت ودیعت فرمائی تھی۔ ان کتب سیرت میں دلکش اور ضمنی عنوانات سے واقعات کے بیان تک شرر نے عمدہ نثر نگاری کا ایک معیار قائم کر دیا ہے۔ نہ کہیں قلم کو شرر نے بھٹکنے دیا اور نہ ہی بیان میں تخیل کو دخل اندازی کی اجازت دی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ان کتب سیرت کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ ان میں سیرت پاک کا یک رخا بیان نہیں بلکہ حالات وواقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ سرزمین عرب کی فضا، ماحول اور صورت حال کو بھی مصنف نے بیان کیا ہے۔ سیرت کے حوالے سے متعلقہ اقوام وقبائل، ادیان اور انبیائے اکرام کے احوال بھی شرر نے بیان کیے ہیں۔

ان کی کتب سیرت اختصار کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ ومقدس زندگی اور عمدہ اخلاق و عادات کو بیان کرتی ہیں۔ یہ کتابیں سلیس وشگفتہ زبان اور موثر ودلکش پیرایہ بیاں کی مثالیں ہیں۔ سیرت پر مشتمل ان کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ ان کتب میں جہاں واقعات کے بیان میں تسلسل پایا جاتا ہے وہاں اوصاف حمیدہ کے بیان میں توازن بھی موجود ہے۔ معلومات کی فراوانی، حسن ترتیب، اخلاقی امور کو استدلال کے ذریعہ حل کرنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کو ممکنہ تفاصیل اور جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے یہ کتب سیرت اعلیٰ پایہ کی سیرت نگاری کا نمونہ ہیں۔ انداز بیان علمی لیکن عام فہم ہے۔ ان کتب میں حضور کی نبوت سے پہلے کی زندگی اور بعثت کے بعد کی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ موجود ہے۔

مصنف صاحب علم وقلم ہے۔ اس نے اپنے علم سے فیض پہنچانے کے لیے ایسا طریق تحریر اختیار کیا ہے جس میں سنجیدگی اور وقار ہے۔ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ بغیر ثبوت اور دلیل کے وہ کسی واقعہ کو بیان نہیں کرتے۔ یہی سیرت نگاری کے بنیادی تقاضے ہیں۔ یوں تو اس دور میں بھی سیرت النبی پر بہترین معلومات کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی متعدد کتابیں لکھی گئی لیکن عبدالحلیم شرر نے جویائے حق، ''تاریخ اسلام'' اور ''خاتم المرسلین'' میں اس مقصد کی وضاحت کی کہ موجودہ دور کی طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں حضور کی پیروی ہی باعث نجات ہوسکتی ہے۔ واقعات کا انتخاب مصنف کے وسیع مطالعہ اور ذوق کا مرہون منت ہے۔ انداز تحریر نے ان کو دلنشین بھی بنا دیا ہے اور سبق آموز بھی۔

عبدالحلیم شرر تحریک علی گڑھ سے متاثر تھے۔ اس تحریک کی مقصدیت کا اثر ان کے فن پر بھی پڑا۔ یہی وہ تحریک ہے جس نے اردو ادب کو نئے راستے پر لگایا۔ اس تحریک نے جذباتیت کو فروغ دینے کی بجائے تدبر، شعور اور گہرے تعقل کو فروغ دیا۔ ادبی سطح پر اس تحریک نے اردو نثر کو سنجیدہ، باوقار اور متوازن معیار عطا کیا۔ اسے

شاعری کے مقفّی و مسجع اسلوب سے نجات دلائی ۔ سادگی ومتانت کوفروغ دیا۔اس طرح ادب کی افادی اورمقصدی حیثیت ابھر کر سامنے آئی ۔اس تحریک نے سائنسی نقطہ نظر اور اظہار کی صداقت کواہمیت دی اوراس کا سب سے زیادہ اثر سوانح اورسیرت نگاری کی صنف پر پڑا۔عبدالحلیم شرر نے اس تحریک سے متاثر ہوکر سیرت نگاری کی صنف کو اپنایا۔مسلمانوں میں جذبہ حریت، مذہبی لگاؤ اوراسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کے لیے کتب تحریر کیں ۔اٹھارویں صدی میں عیسائی مبلغین نے اسلام اورنا موران اسلام کے غلط سوانحی کوائف شائع کر کے اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی اوراس میں ہندومورخ بھی شریک ہو گئے تھے۔شرر نے اپنی غیرافسانوی نثر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کوفروغ دینے کے لیے لکھی ۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسلام اور بانی اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہموں کے ازالے کی کوشش کی ۔شرر نے بانی اسلام اورنا موران اسلام کی سوانح عمریوں کوموضوع بنایا اوران کی زندگی اورکارناموں کوتاریخ کے سچے تناظر میں پیش کر کےعوام الناس کواسلام کی مثالی شخصیتوں سے روشناس کرا دیا۔شرر نے ۔تاریخ اسلام، جویائے حق، خاتم المرسلین جیسی نادر کتب تحریر کیں تا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکیں۔معاشرے میں بلند مقام حاصل کرسکیں۔ان کی سیرت نگاری کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر پاک وہند کے مسلمان اپنی زندگیوں کواسوہ حسنہ کے مطابق بسر کریں اورموجودہ ذلت ورسوائی سے نکل سکیں ۔شرر نے رسول پاک ﷺ کی حیات اوراسوہ حسنہ کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے جس کا ثبوت ان کی کتب سیرت کے مطالعے سے ملتا ہے ۔عرب کے زمانہ جاہلیت کی سوسائٹی، اسلامی دوراوردورنبوی ﷺ کواس طرح سے دکھایا کہ پڑھنے والا سیرنہیں ہوتا ۔قاری دلچسپی اورعقیدت واحترام سے ان کتب کو پڑھتا ہے اوراس کا ایمان تازہ ہوتا ہے ۔شرر نے ان کتب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے سماجی، سیاسی، معاشی، مذہبی اوراخلاقی انقلاب کا یہ اثر ہوا کہ معاشرہ ہراعتبار سے نہ صرف مربوط و مستحکم ہوا بلکہ ہرقسم کی برائیوں سے پاک بھی ہوا۔اس کے اثرات پوری عالم انسانیت پر مرتب ہوئے ۔آنحضورﷺ کی ذات وبابرکات، نافذ کردہ اصلاحات وانقلابات کا اعتراف مسلم اورغیرمسلم ہرایک نے کیا ہے۔مختصراً یہ کہ شرر کی کتب سیرت میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی پہلو ملتے ہیں۔ان کتب میں ایک بڑے انشاپرداز کا پورا زورقلم نظر آتا ہے ۔ان کے اسلوب میں والہانہ پن ہے جوش بیان، خطیبانہ رنگ، منطقی استدلال، حسن بیان، بہترمعلومات ان کتب میں موجود ہیں ۔

اردوجیسی نوخیز زبان سے یہ توقع رکھنا کہ شرر کے زمانے میں ہرلحاظ سے بےعیب اورمکمل سوانح عمریاں اس کے ادب میں وجود میں آگیں ہوں گی۔ بے جا اور بے محل ہے، فارسی زبان کے ہزارسالہ ادب میں ہمیں ایسی سوانح عمریاں نظرنہیں آتی جن کوفنی اعتبار سے اعلیٰ اورکامل کہا جا سکے ۔شرر کا زمانہ ایک ایسا زمانہ ہے جس میں فنی شعور ابھی تک ناپختہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ اردوزبان وادب نے جو کچھ حاصل کیا وہ عربی وفارسی ادب سے حاصل کیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ سوانح نگاری کے فن میں بھی اس کا ابتدائی سرمایہ عربی وفارسی نمونوں کے مطابق ہے ۔سوانح

نگاری کی اہم اور قدیم ترین شاخ سیرت نگاری ہے ۔اس کی ایک اوراہم شاخ تذکرہ نگاری ہے ۔ابتدا میں تذکرہ نگاری بہت مقبول ہوئی ۔تذکروں سے الگ صحیح معنوں میں سوانح عمریاں لکھنے کا رواج جدید مغربی اثرات کا مرہون منت ہے ۔ ہندوستان میں سترہویں اوراٹھارویں صدی میں عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کے ردِعمل میں سوانح نگاری کا فن ابھرا۔شرر کے دور میں اکثر مورخ اور سوانح نگاران اثرات سے متاثر ہوئے ۔سرسید احمد خان کی 'خطبات احمدیہ'، مولوی چراغ علی کے ۲ رسالے' بی بی ہاجرہ' اور'ماریہ قبطیہ' اور مولوی نذیر احمد کی کتاب' رسالت الامۂ' اسی مناظرہ فضا میں منظر عام پر آئیں ۔شرر کے دور کے سب سے بڑے سوانح نگار حالی اور شبلی تھے ۔ان کی تصانیف میں فنی محاسن بھی موجود ہیں ۔شرر کے دور میں اکثر علمی کوششیں دفاعی اور مدافعتی تھیں ۔اس لیے کہ ان کا مقصد علم برائے علم یا ادب برائے ادب نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد مغربی خیالات سے نباہ کی صورت پیدا کرنا ۔قومی محاذ بنانا تھا ۔اسی مقصد کے حصول کے لیے سوانح نگاری اور تاریخ نگاری سے بڑا کام لیا گیا اور سلسلہ ناموران اسلام اس کی کڑی ہیں ۔اس دور میں شرر جیسا صاحب قلم بھی موجود تھا ۔جس نے جارحانہ دستورالعمل اختیار کیا اور اس میدان میں پیش قدمی کی ۔اس میں شک نہیں کہ اس قومی محاذ نے تقویت پائی ۔

سوانح نگاری کے فن میں شرر پر شبلی اور حالی کو ترجیح حاصل ہے ۔حالی کی سوانح عمریاں اصول فن کے لحاظ سے شبلی سے بہتر ہیں ۔ان کی سوانح عمریوں میں اگر چہ نام وارانِ عالم کا ذکر ہے مگر ان کا مقصد اور نصب العین شبلی کے مقصد اور نصب العین سے مختلف ہے ۔حالی کی سوانح عمریوں میں ادبی تحریک جبکہ شبلی کی سوانح عمریوں میں معنوی تحریک کارفرما ہے ۔شرر کے دور میں رفقائے سرسید کے علاوہ جن لوگوں نے سوانح عمریاں لکھیں ان میں شرر کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے ۔شبلی ، حالی ، ذکاءاللہ ، نذیر احمد ، چراغ علی اور شرر نے سوانح عمریاں لکھ کر اس صنف ادب کی بہت بڑی خدمت کی ۔ذکاءاللہ کا سوانحی کام ملکہ وکٹوریہ کی لائف تک محدود تھا ۔نذیر احمد اور چراغ علی نے بھی سوانح عمریاں لکھی جو اتنی اہمیت کی حامل نہیں ہیں ۔شرر کی سوانح عمریاں ، خاکے اور مرقعے اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ مصنف کی نظر سوانحی اور شخصی جزئیات پر زیادہ ہے اور ان کا نصب العین بھی سوانحی ہے ۔اگر دوسرا کوئی مقصد نظر آتا بھی ہے تو وہ ثانوی اور ضمنی ہے ۔ان کتب کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر شرر خالص سوانح نگار بنتے تو وہ اس میدان ادب میں بہت بڑا نام کماتے اور کامیاب بھی ضرور ہوتے ۔شرر کی زودنویسی اور بہت سارے موضوعات پر لکھنے کی عادت نے ان کو اس میدان میں جم کر لکھنے نہ دیا لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بہرحال بہت عمدہ اور سبق آموز ہے ۔

شرر کے دور کی سوانح نگاری میں ایک طرح کا تذبذب پایا جاتا ہے ۔اس عہد کے سوانح نگار پرانی روایت سے قطع تعلق ہونے کی خواہش تو رکھتے ہیں لیکن ان کی تصانیف میں اس کے باوجود قدیم خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔

اس زمانے کے سوانح نگاروں کا یہ دعویٰ تو ہے کہ وہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں گے اور اپنے موضوع کے متعلق بے تکلفی کا ثبوت دیں گے۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عذر بھی پیش کرتے ہیں کہ بے لاگ صداقت کے لیے زمانے کی فضا ابھی سازگار نہیں اور وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ کسی شخص کی سوانح عمری تنقیدی طریقے سے لکھی جائے اور اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو بھی دکھایا جائے اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ ساتھ اس کی لغزشیں بھی دکھائی جائیں۔مغربی تصورات کو اپنانے کی آمادگی تو نظر آتی ہے مگر ان تصورات کی جھلک ہمیں اس دور کے سوانح نگاروں کی سوانح عمریوں میں کم ملتی ہے۔اس کا سبب شاید مغربی زبانوں سے ناواقفیت تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس دور کے سوانح نگار ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے دعوے کے باوجود فن کے صحیح تقاضوں کی تکمیل نہیں کر سکے۔

شرر کے دور کی سوانح نگاری کا سرچشمہ تحریک احیائے قومی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اچھی اور عمدہ سوانح عمریاں بزرگوں اور نا موروں کی یادگار کے بجائے قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے نظریے کے مطابق لکھی گئی۔الطاف حسین حالی نے غالب کی سوانح عمری اسی لیے لکھی تھی کہ غالب کی خوش طبعی اور ظرافت سے قوم میں زندہ دلی اور شگفتگی پیدا ہو۔''حیات سعدی'' اور ''حیات جاوید'' بھی اسی مقصد کے تحت لکھی گئی۔شبلی کی بھی تمام تر توجہ اسلام کے قابل فخر کارناموں کی تاریخ پر مرکوز رہی ہے۔اس دور کی سوانح نگاری کا ایک خاص رجحان یہ ہے کہ اس میں سوانح عمری مقصود بالذات نہیں۔سوانح نگاروں کا مقصد کچھ اور ہے۔'الغزالی'،'سوانح مولانا روم'،'سیرۃ النعمان' وغیرہ ہر ایک کا مقصد اشخاص کے حالات کی اصلی تدوین نہیں بلکہ ان کے ذریعے سے علم و ادب کی ان شاخوں کو نمایاں کرنا ہے جن کی نمائندگی ان علماء اور ادباء نے کی ہے۔عبدالحلیم شرر کی سوانح نگاری میں تاریخی نقطۂ نظر خاصا کارفرما ہے۔

عبدالحلیم شرر کی سوانح عمریاں فن کی اس معراج تک نہیں پہنچی۔اعمال و افعال کا خارجی رخ اور زندگی کے وہ مظاہر جن کو مظاہر جلوت کہا جا سکتا ہے ان کے پیش نظر تھیں۔ان کی بعض سوانح عمریاں ایسی ہیں جن میں اشخاص کی حیثیت ایک دائرے کے درمیان ایک نقطے کی ہوتی ہے۔شرر اشخاص کا حال مختصراً اور اس زمانے کی تہذیب و ثقافت وطن سے باہر کے حالات و واقعات کا بیان زیادہ کرتے ہیں۔اس وجہ سے بعض سوانح عمریاں صرف نام کی سوانح عمریاں ہیں۔ان کو اس دور کی جامع تاریخ کہا جا سکتا ہے۔شرر پر بھی سرسید تحریک کے اثرات نمایاں تھے۔ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں جو علمی روح کارفرما ہے وہ سرسید تحریک ہی کی پیدا کردہ ہے۔شرر اپنی افسانوی اور غیر افسانوی نثر دونوں کے اعتبار سے اردو کے عظیم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں شرر کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔آپ ایک مخصوص طرز انشا کے مالک تھے۔

اگر شرر کی سوانح عمریوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کا مقصد سوانح نگاری ابھر کر سامنے آتا ہے۔انہوں نے سوانح عمری کو ذریعہ موعظت بنا کر پیش کیا ہے اس لیے کہ سوانح عمریاں بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہوتی

ہیں۔ وہ قومیں جنہوں نے ترقی کے بعد تنزل کا منہ دیکھا ہے ان کے لیے یہی ''تازیانہ'' ہیں۔شرر نے بھی اس مقصد کے تحت سوانح عمریاں لکھیں تا کہ اپنی قوم کوخواب غفلت سے بیدار کرسکیں۔یہ وہ صنف ادب ہے جس کے ذریعے سے نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی تحریک دل میں ابھرتی ہے۔سوانح عمریاں ہمیں زندہ رہنے کا آرٹ سکھاتی ہیں۔شرر کی سوانح عمریوں کا تعلق ریسرچ اور تحقیق سے ہے۔ایک سوانح عمری کے مصنف کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے ہیرو کے متعلق تمام موادا کھٹا کرے پھر اس میں تحقیق وتدقیق کے ذریعے سے مستند کوغیر مستند سے الگ کرے۔عبدالحلیم شرر سوانح نگار کے علاوہ بھی کئی حیثیات کے مالک تھے۔ان کی نثر ان کے عہد کے نثر نگاروں کے مقابلے میں مختلف ہے۔سوانح نگاری میں بھی ان کا رنگ اپنے عہد کے دیگر سوانح نگاروں کے رنگ سے جدا ہے۔شرر مورخ بھی تھے اور سوانح نگار بھی۔شرر کا طریق کار اور نصب العین مورخانہ بھی ہے۔

تاریخ کی بنیاد انسانی واقعات ہیں جبکہ سوانح کی بنیاد صرف ایک انسان ہے۔تاریخ کا موضوع کوئی ملک یا ایک خاص دور ہوتا ہے جبکہ سوانح کا موضوع کوئی ایک شخصیت ہوتی ہے۔تاریخ کی حدیں لامحدود ہوتی ہیں سوانح کی حدیں پیدائش سے موت تک محدود ہوتی ہیں۔تاریخ تعصب و جانبداری سے پاک ہوتی ہے جبکہ سوانح میں جانبداری اور پسند و ناپسند کو بھی بڑا دخل ہے۔سوانح عمری تاریخ کا جزو تو ہوسکتی مگر تاریخ نہیں ہوتی۔مورخ اور سوانح نگار کے طریق کار میں فرق ہوتا ہے۔شرر مورخ بھی تھے اور سوانح نگار بھی۔بطور سوانح نگار انہوں نے شخصیت کی سچی ہمدردانہ تصویر کھینچی ہے۔اگر چہ سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن شخصیت سے محبت ان کے فن کا سنگ بنیاد ہے۔شرر کی کتب سوانح نگاری کے عمیق مطالعے کے بعد یہ نقطہ نظر واضح ہوتا ہے کہ باوجود کوشش کے شرر سوانح نگار سے زیادہ ایک مورخ معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے متعدد سوانحی مضامین، خاکے اور سوانح عمریاں لکھی ہیں لیکن مطالعے سے یوں لگتا ہے کہ ان کا طریق کار مورخ کا سا ہے۔ان کا ذہن مرکز سے دائرے کی طرف کھلتا ہے۔اشخاص کے ذکر میں وہ زمانے کی کروٹوں اور انقلابوں کا بیان کرتے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ اشخاص سے زیادہ وہ عصر اور زمانے سے محبت و دلچسپی رکھتے ہیں۔شرر نے جتنی بھی سوانح عمریاں لکھی ہیں سب میں تاریخی پہلو کسی نہ کسی انداز سے اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شرر اصولاً مورخ ہیں اور ان سوانح نگاروں کی صف میں نہیں رکھا جاتا۔اگر چہ شرر اردو کے ایک بلند پایہ مورخ تھے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اچھے سوانح نگار بھی تھے۔شرر کی سوانح عمریاں بھی کئی خصوصیات کی حامل ہیں۔شرر کی سوانح عمریوں میں سچائی اور صداقت کا پہلو نمایاں ہے۔شرر نے بشری خدوخال کو سادہ انداز سے بیان کیا ہے۔پرانے دور کی سوانح عمریوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ صاحب سوانح کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے ایک مافوق البشر ہستی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔شرر کی سوانح عمریوں میں فطرت انسانی کی جھلک نظر آتی ہے۔شرر نے کوشش کی ہے کہ اپنے ہیرو کے وہ خصائل دکھائیں جن میں انسانی فطرت کی جھلک موجود ہو۔

شرر نے سوانح عمریوں میں تصویر کے دونوں رخ پیش کیے ہیں۔ ہیرو کے محاسن و معائب پر روشنی ڈالی ہے۔ شرر کی سوانح عمریوں کا بڑا مقصد اصلاح اخلاق، اصلاح قوم وملت اور قومی ترقی کے جذبے کو ابھارنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی سوانح عمریوں میں یہ پہلو نمایاں ہے۔ شرر کی سوانح عمریوں کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سوانح نگار کا ہیرو کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہیرو کوئی پیغمبر، نامور مصلح، جنگجو یا جابر حکمران ہو یا مشہور و معروف ہستی۔ ایک غیر معروف، معمولی اور گمنام شخصیت بھی موضوع بن سکتی ہے۔ شرر کی سوانح عمریوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شرر کو صاحب سوانح سے گہری دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے محنت، تحقیق، جستجو سے کام لے کر سوانح عمریاں مرتب کی ہیں ان کا نقطہ نظر ہمدردانہ ہے۔ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی پیش کیا ہے تا کہ تصویر یک رخی نہ ہو۔ شرر نے غیر جانبداری، صداقت اور انصاف سے کام لیا ہے۔ مبالغہ آرائی سے بہت حد تک اجتناب کیا ہے۔ ان کا انداز بیان تحقیقی اور سائنٹیفک ہے۔ واقعات کے بیان میں تاریخی تسلسل کا خیال رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سوانح عمریاں لکھتے وقت شرر بیک وقت مورخ، مبصر، ماہر نفسیات اور اعلیٰ پائے کے ادیب نظر آتے ہیں۔

سوانح عمری کا فن جذباتی اور شخصی خصائص سے ابھر کر نشو ونما پاتا ہے۔ اس فن کی تربیت کسی فرد سے الفت ومحبت اور انس کے جذبے سے ہوتی ہے۔ اس لیے شرر کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے ان کی شخصیت سے اور ان کے سیرت و کردار سے انس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طبیعت کے اس رجحان نے انہیں سوانح نگاری کے میدان میں اترنے دیا۔ شرر طبعاً ادیب ومورخ تھے لیکن ساتھ ساتھ مذہبی لگاؤ، تصوف سے والہانہ عشق اور وسیع معلومات و مطالعہ بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمریوں میں ایک ادیب اور مورخ اور سوانح نگاری کے پہلو پائے جاتے ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں میں شخصیت وسیرت و کردار بھی ہوتا ہے اور دوسرے مطالب و معلومات اور واقعات بھی اور ہر سوانح عمری میں مقصدیت اور قومی ترقی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ شرر نے جس عہد میں سوانح عمریاں لکھنی شروع کی تھیں اس دور میں سرسید کی تحریک سے یہ صنف نثر متاثر تھی اس دور کی ساری سوانح نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قوم کی ترقی شرر کے فن کا بھی بنیادی اصول تھا۔ جس کے تحت انہوں نے سارا ادب تخلیق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سارا ادب مقصدی اور اجتماعی مقاصد کا آلہ کار بنا رہا۔ شرر کی سوانح عمریاں سادہ بھی ہیں اور ادبی بھی اور ساتھ ساتھ معلوماتی بھی۔ مگر ہر سوانح عمری میں قومی خدمت کا جذبہ پیش پیش ہے۔ انہوں نے جو بھی سوانح عمری لکھی قوم کے اخلاق کی اصلاح اور قومی ترقی کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر لکھی۔ اگر چہ وہ صحافی بھی تھے اور تجارتی پہلو بھی ان کے مدنظر تھا، لیکن زیادہ تر جو جذبہ ان سوانح عمریوں میں کارفرما تھا وہ اصلاحی اور مقصدی ہی تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> شبلی کی طرح شرر نے بھی اسلاف میں سے برگزیدہ اشخاص کو منتخب کر کے ان کی سیرتوں کو مشعل راہ بنانے کی اپیل کی۔ شبلی نے جہاں غیر معمولی ہستیوں کی مکمل زندگیوں کو پیش کیا ہے۔ وہاں شرر نے محض دل چسپ (گو قابل توجہ) شخصیتوں کی ہمہ رنگ سیرتوں کے صرف چیدہ پہلوؤں کے خاکے پیش کیے ہیں۔ مگر اس غرض سے کہ قوم کو ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے......۱

یہ کہا جاتا ہے کہ شرر نے اردو سوانح نگاری کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن یہ انداز نظر ضرور دیا ہے کہ قوم کو ان بزرگوں سے سیکھنے کا موقع ملے اور وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن شخصیات پر انہوں نے قلم اٹھایا وہ نامی گرامی اور مشہور و معروف شخصیات ہیں۔ انہی کے مطالعے سے قومی اصلاح و ترقی ممکن ہو سکی ہے۔ ان کی سوانح عمریاں نہ صرف اس دور میں بلکہ آج کے زمانے میں بھی یہ اصلاحی پہلو رکھتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے آج بھی ہم اپنے لیے راہ مستقیم منتخب کر سکتے ہیں۔ شرر نے جہاں ناولوں میں تاریخ اسلام کے درخشاں دور کی تصویر کشی کی وہاں سوانح عمریوں میں بھی زمانہ ساز شخصیات کو شامل کر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مختلف قسم کی سوانح عمریاں لکھ کر اس فن کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ حالی، شبلی اور شرر نے سوانح عمری کی صنف کو ترقی دی اور اتنی ترقی دی کہ آج تک اس صنف خاص میں کوئی سوانح نگار ان سے آگے نہ بڑھ سکا۔ سوانح نگاری کے حوالے سے شرر کا ایک خاص مقام ہے اور اس مقام کا ذکر نہ کرنا ادبی ناانصافی کے مترادف ہے۔ شرر سوانح نگار کی حیثیت سے اگرچہ حالی و شبلی کے معیار و مقام تک نہ پہنچ سکے لیکن ان کی دیکھا دیکھی انہوں نے جن ہیروز آف اسلام کے حالات پیش کیے ہیں وہ بڑی جستجو، تحقیق اور سلیقے کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ جن میں حضرت صدیق اکبر، ذی النورین اور ابوالحسنین، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، قرۃ العین وغیرہ اہم ہیں۔

شرر کے مضامین آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ مختلف موضوعات پر شرر نے مضامین لکھے ہیں۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جو عاشقانہ اور شاعرانہ نظریات کے عکاس ہیں۔ کچھ تاریخی وجغرافیائی ہیں۔ مشرقی تہذیب وتمدن پر لکھے گئے مضامین ہیں اور دنیا کے مختلف مردوں اور عورتوں کے تذکروں اور خاکوں پر مشتمل مضامین بھی ہیں۔ ادبی اور تحقیقی مضامین بھی شرر نے لکھے ہیں اور اصلاحی مضامین بھی۔ تاریخی واقعات پر بھی شرر نے مضامین لکھے۔ نظموں، ڈراموں کا بھی ایک مجموعہ مضمون اور مقالات شرر بھی ہے۔ کچھ ایسے مضامین شرر کے قلم سے نکلے ہیں جن میں اصلاح معاشرت و اصلاح مذہب کی بحث ہے۔ ان میں شرر ایک مصلح کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں کچھ ایسے مضامین ہیں جن کا تعلق زمانے کی سیاست سے ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن میں شرر ایک ادیب اور انشاپرداز کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں شرر بطور ڈرامہ نگار اور بطور شاعر نظر آتے

ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں ہم شرر کا مطالعہ بطور تاریخ نگار کرتے ہیں۔شرر کے مضامین میں متنوع موضوعات اور عنوانات موجود ہیں۔شرر مصلح قوم، مذہبی نقاد، مورخ، ادیب، خاکہ نگار اور شاعر کی حیثیتوں سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ادیب کی حیثیت سے شرر بحیثیت مضمون نگار اور بحیثیت انشا پرداز بڑا بلند مقام رکھتے ہیں۔

شرر کے مضامین کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اگر شرر دوسرے مشاغل سے میں مصروف نہ ہوتے اور اس عہد زمانے اور مقصد کی ضرورتیں انہیں دوسری تحریروں کی طرف مائل نہ کرتیں تو وہ ایک بڑے اعلیٰ پائے کے مضمون نگار ہوتے۔اس لیے کہ قدرت کی طرف سے یہ ملکہ ان کو ملا تھا۔لیکن آپ کی عادت متفرق نویسی تھی۔آپ نے ہر صنف نثر میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ان کے مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی لکھنے کا خاص میلان رکھتے تھے اور جزویت کو بھی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> شرر عہد سرسید کے محبوس فکری اظہار میں آزادہ روی اور اظہار کا رومانی زاویہ ہے۔شرر کے تخیلی مضامین میں ان کا نرم سریلہ لہجہ خود کلامی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ان کی صدا بانسری کی مدھم لے بن جاتی ہے جو گھنے جنگلوں کی پر اسرار خاموشی کو سحر نغمہ سے جگا رہی ہے۔۲

ان کے مضامین سے زیرکی اور دانش کا سبق ملتا ہے۔شرر کے مضامین کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ سہل نگار تھے۔سلیس اور بے تکلف تحریر جس میں بسا اوقات گھریلو انداز بیان کا عکس جلوہ گر ہوتا ہے۔یہ چیز ان کے مضامین کو دلچسپ اور دلکش بنا دیتی ہے۔ان کے مضامین کے مجموعوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر شرر کو موقع ملتا۔دوسرے مشاغل دیگر تصانیف، مقصد کا دباؤ انہیں مجبور نہ کرتا وہ بہت اچھے مضمون نگار بن سکتے تھے۔اب بھی اگر چہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مضمون نگار ہیں لیکن تب ان کا مقام کچھ اور ہوتا۔

شرر کے مضامین میں مقصدیت، سنجیدگی، متانت، خطابت کی روش بھی پائی جاتی ہے۔علمی، مقصدی، فلسفیانہ، اور استدلالی انداز بیان بھی پایا جاتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ شرر کے عہد میں ہندوستان کے ہر حصے سے اخبار جاری ہونے لگے تھے اور اس کی وجہ سے اردو انشا پروازی نے بہت ترقی کی۔شرر نے بھی مضمون نگاری کا آغاز ''اودھ پنچ'' سے ہی کیا تھا۔اخبارات کو ہر قسم کے تمدنی، تہذیبی، اخلاقی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے اور شرر نے بھی ہر قسم کے مضامین لکھے۔شرر کے عہد میں سرسید کے تہذیب الاخلاق میں ایک طرف سرسید اور ان کے ساتھی مضامین لکھ رہے تھے اور دوسری طرف تن تنہا شرر مضامین لکھ رہے تھے جو دلگداز اور دیگر رسائل میں چھپتے تھے۔شرر نے مضمون نگاری اور انشا پردازی کو بلند مقام تک پہنچایا۔شرر کا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے

مختلف موضوعات پر لکھ کر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر قسم کے موضوعات اس صنف ادب میں سموئے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شرر نے اردو انشا پردازی کو جس مقام تک پہنچا دیا اور جتنا اثر ڈالا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لاتعداد ان کے مقلد اور خوشہ چین اردو ادب میں ابھرے ہیں اور ان کے اندازِ مضمون نگاری کو اپنانے کی کوشش میں سرگرم عمل رہیں گے۔

عبدالحلیم شرر نے نہ صرف مضامین لکھے بلکہ پورے ادراک کے ساتھ اس کے اصول و اسالیب اور خدوخال کو بھی واضح کیا ہے۔ انہی کی کوششوں سے عام قاری نے بھی مضمون سے مکمل آگاہی حاصل کی۔ شرر ''مضمون نگاری'' کی عمارت کے معمار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات، جذبات، احساسات، تخیلات کے ذریعے سے اس عمارت کو تعمیر کیا۔ شرر ذاتی، ہلکے پھلکے، فلسفیانہ، تخیلاتی مضامین کے فن سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کے مضامین اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ وہ وسیع مطالعے اور قریبی مشاہدے سے گزر کر تخلیقی سطح پر آئے ہیں۔ لہٰذا ان کے مضامین سے عام قاری اور نقاد بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ان سے قبل بھی مضمون نگار موجود تھے اور بعد میں بھی کئی مضمون نگاروں نے اردو ادب میں قدم رکھا لیکن شرر صف اول کے وہ مضامین نگار ہیں جنہوں نے مضامین کو ماہیت کے اعتبار سے اور افادیت کے نقطۂ نظر سے صحافت کا معیار اور نصاب کا اعزاز بنا دیا تھا۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرر نے زندگی کے قریبی مشاہدے کو تبصرے کے انداز میں پیش کیا ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں کو اندازِ نظر سے جانچا ہے اور اسلوب میں منفرد مقام پایا ہے۔

عبدالحلیم شرر جتنے بڑے ناول نگار تھے اتنے ہی بڑے مضمون نگار بھی۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نئے سماج کی تشکیل کا جذبہ رکھتے تھے۔ شرر نے اپنے قاری کے ذہن میں وہی شعور منتقل کیا جو ان کی اپنی زندگی میں موجود تھا۔ مضمون نگار کی حیثیت سے انہوں نے قاری کو اس صنف سے آشنا کیا۔ انیسویں صدی کا آخری دور اگرچہ انحطاط کا دور تھا لیکن اس دور میں ادب اور علم نے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ اس دور کی نثری تخلیق کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس دور میں شرر نے بھی شاعرانہ و عاشقانہ، تاریخی وجغرافی، سیر نسواں، سیر رجال، ادبی وتحقیقی، اصلاحی، تاریخی واقعات پر خیال آرائی اور مقالے لکھ کر ایک طرف ملک وقوم کے دل و دماغ میں وسعت پیدا کی اور دوسری طرف اردو ادب کو رنگا رنگ موضوعات عطا کیے۔ شرر مضامین میں عربی، فارسی اور انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ روزمرہ کے ہلکے پھلکے شیریں اور شگفتہ الفاظ بھی استعمال کیے۔ ان کی نثر میں موسیقیت کے بھی کچھ عناصر موجود ہیں۔ شرر کے مضامین میں فارسی کے نازک الفاظ اور اشعار گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے مضامین میں قرآن پاک کی آیات اور احادیث مبارکہ بھی موجود ہیں۔

موضوع اور اظہار بیان مضمون میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔شرر کے مضامین کے موضوعات اور اندازِ بیان مثالی ہے۔وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ موضوع خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی مضمون نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اسے ہلکے پھلکے انداز اور دوستانہ رنگ میں پیش کرے۔اس انداز کے مضمون لکھے کہ مضمون نگار اور قاری گھریلو فضا میں بیٹھے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔بات چیت کا یہ بے تکلفانہ انداز ہی تھا جس نے انہیں کامیاب مضمون نگار بنایا۔موضوع خواہ کتنا ہی سنجیدہ اور معلوماتی حیثیت خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو شرر نے اس انداز سے مضامین لکھے ہیں کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

عبدالحلیم شرر کے مضامین میں مٹے ہوئے ماضی کو خیالی سطح پر باز آفرینی کا رجحان غالب ہے۔یوں لگتا ہے کہ انقلابات زمانہ نے زندگی کی جونعمتیں ان سے چھین لی ہیں۔وہ تاسف کے بعد اپنے مضامین میں دوبارہ انہیں پانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔شرر نے اپنے مضامین میں مسلمانوں کے اجتماعی قومی اضمحلال کے خلاف ردعمل پیش کیا ہے۔مسلمانوں کے اس شاندار ماضی میں آسودگی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔جب مسلمانوں کا جاہ و جلال اور ہیبت وجبروت نے مشرق ومغرب میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔شرر نے اپنے مضامین کے ذریعے سے اس عہد کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں اس شاندار دور کا نقش بھی ثبت کیا ہے۔شرر کے مضامین کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مضمون نگاری کی شرائط سے مکمل آگاہی رکھتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ مضمون کی طوالت درمیانی ہو۔مضمون کا تعلق موضوع کے خارجی پہلو میں ہو اور مضمون نگار اپنے نقطۂ نظر سے انتخاب کردہ موضوعات پر ہی لکھے۔

شرر نے ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔دوسرے مضامین کی طرح ان کے یہ مضامین بھی اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔شرر نے یہاں ادبی مضامین لکھے وہاں اصلاحی اور تاریخی مضامین لکھ کر بھی خاص مقام حاصل کیا۔عوج بن عنق، حسن بن ثابت اور اسی طرح کے کئی تاریخی مضامین لکھ کر معلومات کا وسیع ذخیرہ قارئین تک پہنچانے کی شعوری کوشش کی ہے۔پردہ، نکاح وشادی اور بہت سے اصلاحی مضامین بھی لکھے ہیں جن میں انہوں نے سماج کی بری رسوم پر نہایت دلیری اور بے باکی وصاف گوئی سے بحث کی ہے۔

اگر چہ شرر کے مضامین میں کوئی ایسی ٹھوس معلومات نہیں ملتی ہیں جنہیں ہم اردو ادب کا گراں سرمایہ و اضافہ کہہ سکیں۔ان مضامین میں نہ تو غالب کے خطوط کی طرح لکھنے والے کی شخصیت کا اظہار ہے نہ ظرافت وطنز کی چاشنی موجود ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے مطالعہ سے ایک کامل اور چابکدست مضمون نگار کا تصور ضرور ذہن میں ابھرتا ہے۔مضمون پڑھتے وقت ذہن کو کوئی جھٹکا نہیں لگتا۔قاری کہیں رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔مضامین شرر کے مطالعے کے بعد کچھ اور پڑھنے کی چاٹ نہیں ہوتی۔ان کی غیر افسانوی نثر پر مشتمل کتب اردو نثر کا آخری زینہ نہ

سہی پہلا زینہ ضرور ہیں۔ان کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں فطری مناظر کشی عمدہ ہے۔عشق ومحبت کی رنگین کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔تاریخ ومعاشرت اور سماج، تہذیب وثقافت کے متعلق وافر معلومات موجود ہیں۔ادبی مذاق کی ترتیب اور بیداری میں مضامین شرر کا مقام بہت بلند ہے۔

سرسید احمد خان، حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد کی مضمون نگاری شرر کا ادبی ورثہ تھی۔ان مضامین نگاروں نے انہیں دو باتوں کا شعور عطا کیا۔دبستان سرسید سے شرر نے مقصدیت وافادی پہلو کو لیا۔محمد حسین آزاد کی مضمون نگاری سے شرر نے وہ اسلوب بیان پایا جو ان کے لیے تاثراتی قوت اور تزئینی صلاحیت کی بنیاد بنا۔ان چیزوں کو اپنا کر شرر نے اپنی ادبی کاوشوں سے کچھ اسے نقش تخلیق کیے جن کی بدولت رومانوی تحریک کو زبردست قوت وتوانائی عطا ہوئی۔

شرر کے انداز بیان پر اگرچہ بہت اعتراضات کیے گئے لیکن شرر نے اسی اسلوب میں سیاسی، سماجی، اخلاقی اور علمی ہر طرح کے مضامین لکھ کر ثابت کر دیا کہ کوئی بھی موضوع ہو اس انداز میں لکھا جا سکتا ہے۔اردو ادب میں مولانا عبدالحلیم شرر کا ایک خاص مقام ومرتبہ ہے۔ان کے مضامین موضوعات کی بوقلمونی اور اسلوب بیان کی سلاست ودل کشی اور عام فہم ودلچسپ ہونے کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہیں۔شرر نے تاریخی واقعات، اسلامی اقدار وروایات، بزرگان دین کی بہادری، اسلام کی جرأت سرفروشاں، ان کے اخلاق وکردار، رحم وانصاف، ایثار ومحبت، اعلیٰ خدمات کو پیش کیا۔شرر کے دور کا مسلمان، مایوس اور افسردہ دکھائی دیتا تھا۔شرر نے اپنے مضامین کے ذریعے سے اس کی افسردگی کو کم کرنے اور مایوس کن فضا سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی۔ان میں عزائم، جوش وجذبہ، شجاعت وبہادری کے جذبے کو ابھارا۔کم وبیش نصف صدی تک شرر نے اپنے قلم کو مصروف رکھا۔ان کے مضامین جو مختلف پرچوں میں چھپتے تھے۔بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔مضامین شرر میں جہاں مسلمانوں کی ترقی کا ذکر موجود ہے وہاں ان کی تحریر میں خوشیوں کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور جہاں مسلمانوں کے تنزل اور قومی زوال کا ذکر کرتے ہیں۔وہاں ان کی تحریر میں افسردگی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے جو دل پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔

شرر کے تمام مضامین نہ صرف اس دور میں بلکہ آج کے دور میں بھی قبول عام کی سند رکھتے ہیں۔شرر نے ان موضوعات پر لکھا ہے جو اس دور میں بھی نئے تھے اور آج کے دور میں بھی۔ان کے مضامین کی عبارت جدید نثر اردو کے ارتقاء میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔اگرچہ بعض ناقدین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے مضامین میں دل کشی اور جامعیت نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنے عہد کے مقالہ نگاروں اور مضمون نگاروں میں شرر کا ایک خاص مقام تھا۔انہوں نے شاعری، سیاست تاریخ، معاشرت اور متعدد موضوعات پر صدہا مضامین لکھیں ہیں۔شرر

نے اپنے مضامین کے ذریعے سے جدید خیالات وتصورات کوفروغ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔شرر نے اردو میں رومانوی طرزتحریر میں مضامین وانشائیے لکھنے کی روایت کا آغاز کیا۔ان کی مضمون نگاری نے ان کےتصورات کووسیع پیمانے پرفروغ دینے میں اہم کردارادا کیا ہے۔تہذیب الاخلاق کی طرح شرر کے مضامین نے بھی اردو زبان وادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔انہوں نے اردونثر میں تمثیلی اندازنگارش کوفروغ دینے کی کوشش کی۔شرر پرسرسید کی مقالہ نگاری کا اثر واضح ہے۔

عبدالحلیم شرر نے جہاں مضامین و مقالے لکھے وہاں اردو انشائیہ کی بھی بہت خدمت کی۔آپ نے کئی انشائیے لکھے۔انشائیہ ایک جدید صنف نثر ہے۔اس کا موجد فرانسیسی مصنف مونتین ہے۔اس کے تتبع میں انگریزی انشائیے کا آغاز اردو میں انشائیہ نگاری انگریزی ادب سے آئی ہے۔اگرچہ انشائیہ لفظ ایسے (Essay) کا مترادف ہے اور ایسےاردو ادب میں مضمون بھی کہا جاتا ہے۔لیکن مضمون کے مفہوم میں خاصی وسعت پائی جاتی ہےاور اس کا اطلاق ہراس تحریر پر ہوتا ہے جوکسی خاص موضوع پرلکھی جاتی ہےاور یہ کہ مضمون کی حدود متعین نہیں ہوتی اور انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے۔اس کا موضوع عام طور پر علمی اور تحقیقی نہیں ہوتا۔اس کی نوعیت ذاتی اورانفرادی ہوتی ہے۔اس کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہوتا ہے اور سارا کھیل طرزادا اورانداز کا ہوتا ہے۔

اردو میں انشائیہ کا آغاز سرسید کے عہد سے ہوتا ہےاگرچہ بعض نقاداس کے آغاز کو ملاوجہی سے وابستہ کرتے ہیں۔سرسید احمد خان کا ’’تہذیب الاخلاق‘‘ اردوانشائیہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ رسالہ سرسید احمد خان نے ایک مقصد کےتحت جاری کیا تھا اور اس کا مقصد اصلاح قوم اورتحریک سرسید کے اصلاحی پہلوؤں کو عام کرنا تھا۔اس میں زیادہ مضامین سرسید احمد خان ہی کے ہوتے تھےلیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی، چراغ علی، ذکاءاللہ، محسن الملک، وقارالملک وغیرہ کےمضامین بھی چھپتے تھےاوران مضامین کی نوعیت مذہبی،تہذیبی،سماجی اوراخلاقی تھی۔ان میں افادیت کا پہلو غالب ہوتا تھا۔موضوعات کاتعلق اس عہد کے تہذیبی،سماجی،فکری مسائل سے ہے۔ان میں مفکرانہ آہنگ اورقطعیت بھی ہوتی تھی۔’’تہذیب الاخلاق‘‘ میں لکھنے والے سیدھا سادہ، بےتکلف اورکسی قسم کی آرائش سے خالی انداز بیان اختیار کرتے تھے۔لیکن باوجود اس کے ان میں اچھوتا پن موجود ہوتا تھا۔اردونثر کا آغاز ہی صحیح معنوں میں ان مضامین سے ہوتا ہےاورانشائیہ کی داغ بیل ان ہی مضامین کے ہاتھوں پڑی ہے۔

عبدالحلیم شرر کے عہد میں ’’تہذیب الاخلاق‘‘ میں انشائیہ نے خوب ترقی کی۔اگرچہ اس رسالے کے سب مضامین کوانشائیہ نہیں کہہ سکتے لیکن رسم ورواج،تعصب، حکایت، بحث وتکرار، امید کی خوشی وغیرہ اہمیت کے

حامل ہیں۔ اگر چہ سرسید نے ان مضامین میں سیدھا سادہ انداز اختیار کیا ہے مگر اس میں خلوص زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کا شعور جگہ جگہ نمایاں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی شخص مختلف موضوعات پر بیٹھے بٹھائے باتیں کر رہا ہے۔لوگ اس میں دلچسپی لے رہے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں اور یہی انشائیے کی اصل فضا ہے اور یہ فضا سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے پیدا کی۔ سرسید احمد خان نے انشائیہ کے فن کو اجاگر کیا۔ یہ وہ چراغ ہے جس سے دوسروں نے اپنے اپنے فن کے چراغ روشن کیے۔عبدالحلیم شرر کے عہد میں محسن الملک کے مضامین میں کم وبیش وہی خصوصیات ہیں جو سرسید کے ہاں ملتی ہیں۔ان کے موضوعات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ تاریخی، اخلاقی، تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر انہوں نے خوب لکھا ہے۔بعض میں انشائیہ کا سا انداز ملتا ہے۔موجودہ تعلیم کے بارے میں محسن الملک نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں انشائیہ کے تمثیلی انداز کو انہوں نے خوب برتا ہے۔وقار الملک بھی تہذیب الاخلاق میں مشتاق حسین کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

تنوع، شریں زبانی، اعتدال، مہمان ومیزبان، ان کے انداز میں سادگی وسلاست پائی جاتی ہے۔شرر ہی کے عہد میں ذکاء اللہ بھی مشہور زمانہ مضمون نگار تھے۔اگر چہ تاریخ اور دوسرے علوم ان کا میدان ہیں۔لیکن انہوں نے بطور مضمون نگار بھی شہرت پائی اور بعض مضامین کو انشائیہ کی ذیل میں لایا جا سکتا ہے۔ ذہانت، آزادی اور آگ وغیرہ اس ضمن میں شمار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ''آگ'' ایسا مضمون ہے۔جس کو انشائیہ کا عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مضمون ہے۔قوت تخیل کا عنصر اس میں پایا جاتا ہے۔

شرر ہی کے عہد میں سرسید احمد خان کے رفقاء میں سے حالی بھی ایسے مضمون نگار ہیں جنہوں نے انشائیہ کے عناصر کو اپنے مضامین میں شامل کیا۔ زبان گویا، تدبر، بدگمانی، علم اور عمل، ہمدردی وغیرہ ایسے مضامین انہوں نے لکھے جن کو انشائیہ کی ذیل میں لایا جا سکتا ہے۔ حالی سیدھے سادے انداز میں بڑے پتے کی باتیں کرتے ہیں۔جن کا اثر دل ودماغ، دونوں پر ہوتا ہے۔ان کے خیالات میں رنگینی اور بلند پروازی نہیں ہے۔شرر کے عہد میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے اس وقت انشائیہ کی داغ بیل ڈالی جب اس کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یوں ان کی کوششیں قابل صد ستائش ہیں۔انہوں نے انشائیہ کو ترقی کی راہ پر ڈالا بلکہ آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔

شرر کے زمانے میں شبلی، نذیر احمد اور آزاد بھی اہم ادیب تھے۔شبلی اور نذیر احمد میں انشائیے لکھنے کی صلاحتیں زیادہ تھیں۔لیکن انہیں لکھنے کا موقع نہیں ملا۔البتہ آزاد اس کام میں پیش پیش رہے۔''نیرنگ خیال'' میں آزاد کے جو مضامین شامل ہیں ان میں انشائیہ کا وہ انداز پایا جاتا ہے جس سے اردو زبان نا آشنا تھی۔ یہ مضامین تمثیلی انداز میں لکھے گئے۔تخیل کا کمال اور ندرت کا عنصر غالب ہے۔ان مضامین نے انشائیہ کو نیا رنگ بخشا وہ

رنگ جس کو دوسرے نہ اپنا سکے۔ انہوں نے یہ طرز انگریزی زبان سے لی۔ ان کے موضوعات زندگی کے عام موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً انسانی زندگی کیا ہے اور کیا کیا رنگ اختیار کرتی ہے؟ ان کے انشائیوں میں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

عبدالحلیم شرر کے عہد میں ایک طرف سرسید احمد خان کا ''تہذیب الاخلاق'' انشائیہ کے ارتقاء وترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا تو دوسری طرف رفقائے سرسید بھی اپنا اپنا حصہ اس میں ڈال رہے تھے۔ اگرچہ شرر کے عہد میں دوسرے مضمون نگار بھی تھے اور ان کا بھی کچھ نہ کچھ رول انشائیے میں ضرور رہا ہے لیکن شرر کا کمال یہ ہے کہ ''تہذیب الاخلاق'' اور سرسید کے رفقاء نے مل کر انشائیے کو ترقی دی اور شرر تن تنہا اس میدان میں آئے اور اپنے مشہور زمانہ رسالہ دلگداز میں اتنے انشائیے لکھے جتنے کسی اور مضمون نگار نے نہیں لکھے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جلد اول کے دو حصہ اول اور دوم انشائیوں کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔

یوں ان انشا پردازوں نے انشائیہ کو ترقی کے راستے پر ڈالا۔ انشائیہ لکھنے کے اہم تجربات کیے اور اس فن کی روایت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس سے پہلے کوئی خاص روایت موجود نہ تھی۔ آزاد کو چھوڑ کر باقی تمام انشائیہ نگار جن کا ذکر کیا گیا وہ 'تہذیب الاخلاق' کی پیدوار ہیں اور شرر کا بھی ایک خاص مقام ومرتبہ ہے۔ انشائیہ کے ارتقاء اور اس کی روایت کا سنگ بنیاد رکھنے میں 'تہذیب الاخلاق'، 'دلگداز' اور شرر کے دیگر رسائل نے اہم کردار ادا کیا۔

یہ درست ہے کہ اس دور کے انشائیوں میں ہلکا پھلکا انداز نہیں ہے۔ وہ ایک سنجیدہ ماحول کی پیدوار ہیں۔ سنجیدگی غالب ہے۔ منطقیت پائی جاتی ہے اور شگفتگی کا پہلو کم ملتا ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ خلوص ان میں موجود ہے اگرچہ اس عہد کے انشائیہ نگاروں نے مغرب سے یہ چراغ روشن کیا تھا لیکن کمال ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا۔

مجموعی طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو شرر کا یہ عہد انشائیے کی ترقی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف اردو انشائیے کی بنیاد ڈالی گئی بلکہ اس کی بنیاد کو مضبوط بھی بنایا گیا اور اس میں شرر کا رول سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے تنہا اس عمارت کی بنیاد کو مضبوط بنانے کے لیے کام کیا۔ جب بھی انشائیہ کا نام لیا جاتا ہے یا اس پر بات کی جاتی ہے تو شرر کے تذکرہ کے بغیر یہ بات نہیں ہوسکتی۔ اس صنف ادب میں شرر کے مقام ومرتبہ کو کوئی نہیں گھٹا سکتا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ شرر کا نام اور ان کا کام اور زیادہ نمایاں صورت میں ابھرے گا۔

مولانا شرر کی تاریخی کتب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا رجحان اسلامی تاریخ کی طرف بہت زیادہ تھا۔ تاریخی کتب میں ان کا یہ رجحان نمایاں ہے۔ انہوں نے قدیم اسلامی حالات کو پردہ گمنامی سے نکالا۔

اسلاف کے کارناموں کو بیان کر کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو اپنی دلکش تحریر سے دلچسپ بنایا۔ تاریخ حروب صلیبیہ جس کے مصنف سر جارج ڈبلیو تھے اس کا ترجمہ بھی شرر نے کیا۔ ۱۹۰۵ء میں یہ تاریخ مکمل ہوئی اور دلگداز کے ساتھ شائع ہوتی رہی۔ ۱۹۱۷ء میں تاریخ یہود دو جلدوں میں شائع کی۔ پہلی بنواسرائیل کی تاریخ ہے اور دوسری ارض مقدس کے کوائف وواقعات ہیں۔ اگر شرر کی تاریخی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کا بڑی زیرک نظری سے ایک ہونہار طالب علم کے شوق کی مانند مطالعہ کیا۔ گزرے ہوئے زمانوں اور عہد رفتہ کی تہذیب ومعاشرت کا عمیق جائزہ لیا۔ معلومات حاصل کر کے قاری تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

شرر ایک سچے مسلمان تھے۔ وہ اپنی تاریخی کتب میں اسلامی افکار وشعار کی پاسداری کرتے ہیں۔ ان کی تاریخوں میں اسلامی تہذیب اپنی پوری آب وتاب سے جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کتب میں قرونِ اولیٰ کی اسلامی دنیا زندہ وتابندہ ملتی ہے۔ اسلامی واقعات بھی ایک خاطر خواہ تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے ذکر سے قارئین میں شوکت رفتہ کا ایک خوشگوار احساس بیدار ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ مولانا نے اپنی تاریخوں کے ذریعے سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

شرر تاریخ نگاری کرتے ہوئے ایک دم سے عہد رفتہ میں نہیں پہنچ جاتے بلکہ وہ اپنے ماحول سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور دونوں زمانوں کا ارتباط اپنے تخیل سے کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر ان کی فنی خوبیاں اور جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور عوامی دلچسپی کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخیں کسی مخصوص طبقے یا دور کی نمائندگی نہیں کرتیں بلکہ یہ پوری قوم کی میراث بنتی ہیں۔ شرر نے اپنی تاریخی کتب میں اندازِ بیان اس قدر شستہ اور دلکش رکھا ہے کہ قاری اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے اور ہر واقعہ پورے پس منظر کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کی تاریخی کتب کے مطالعے سے معاشرے کی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے کہ ایک قوم جب تک اپنے علاقے میں محدود رہتی ہے تو اس کی دلچسپی اور معلومات کیا ہوتی ہیں؟ لیکن جب یہی قوم تجارت سفارت اور جنگوں کے ذریعے دوسری اقوام سے واقف ہوتی ہے تو اس کی معلومات تاریخ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کتب کے مطالعے سے معاشرہ کی تجارتی سرگرمیوں، ثقافتی ارتقاء اور اس کی فتوحات وشکست کا پتہ چلتا ہے۔ شرر کی تاریخ نویسی معاشرہ کے حالات کی پیداوار ہے۔ یہ مورخ کے ذہن وفکر سے جنم لیتی ہے۔ جو کہ اسی معاشرے کا ایک فرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تاریخ نویسی میں ان کا عہد حالات اور واقعات جھلکتے ہیں۔ اگر چہ وہ ماضی کے بارے میں لکھتے ہیں مگر یہ ماضی ان کے عہد کے حالات کی تصویر پیش کرتا ہے۔ قومیت کی تحریک میں ان کی تاریخ نویسی نے اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے کہ اس عہد میں قوم اپنی شناخت کے مراحل میں تھی۔ اس کو متحد کرنے کا عمل جاری وساری تھا۔ شرر

نے تاریخ نویسی کے ذریعے ماضی کی تشکیل کے ذریعے سے اپنی قوم کو عمل پر ابھارا۔ ماضی کے پرانے اور فراموش شدہ ہیروز کو دوبارہ زندہ کیا۔ شرر واقعات کی تعبیر و تفسیر اپنے نظریات کی بنا پر کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ نویسی کے ذریعہ سے ان کے رجحانات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جو ان کی تحریر میں جھلکتے ہیں۔ جب مورخ اپنے نظریات و افکار کے ذریعہ سے واقعات قلم بند کرتا ہے تو وہ ان میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ تاریخ میں واقعات کہیں نہیں بدلتے مگر ان واقعات کو بیان کرنے کا نقطۂ نظر ہر عہد اور ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے تاریخی کتب لکھ کر عوام میں شعور پیدا کیا۔ وہ اپنے حقوق سے واقف ہوئے اور انہیں معلوم ہوا کہ ماضی میں جن شخصیتوں اور طبقوں نے ان کے حقوق غصب کیے تھے اور ان پر ظلم و ستم کیا تھا ان کی اصل حقیقت سب کے سامنے واضح ہوئی تاکہ آئندہ ان کے دھوکے میں نہ آئیں اور باشعور ہو کر اپنی تقدیر خود بنائیں اور یہ کام خود کریں دوسروں کے حوالے نہ کریں۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخوں میں کئی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ قصے میں روانی اور تسلسل پیدا کرنے کے لیے وہ تاریخ نویسی کے اہم اصول کو پس پشت رکھ دیتے ہیں اور سن و تاریخ کا اندارج نہیں کرتے۔ جو تاریخ نویسی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے انہوں نے زبان اور اندازِ بیان بھی وہ اپنایا ہے جو تاریخ نویسی کے لیے ناموزوں ہے۔ ان کا انداز بیان کسی قدر شاعرانہ ہوتا ہے۔ الفاظ و محاورے کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتے ہیں اور انہی چیزوں کے استعمال کی بنا پر وہ تاریخ نویسی میں خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

تاریخ نویسی کے وقت مورخ کو اپنی شخصیت کی جملہ حیثیتوں کو بدلنا چاہیے، لیکن شرر کی تاریخوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ناول نگار شرر اور انشاپرداز شرر مورخ شرر پر فوقیت رکھتا ہے۔ شرر ناول نگاری کو تاریخ نویسی سے زیادہ مقدم سمجھتے ہیں اور یہی سوچ کا انداز ان کی تاریخی کتب میں نظر آتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کی تاریخی کتب کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کو اور خاص طور پر اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اسٹڈی کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخوں میں اور تاریخی ناولوں میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ ساتھ سادہ الفاظ میں جوش پیدا کرنے اور واقعات کو انتہا سے زیادہ دلکش بنانے کا رجحان غالب رہا۔ شرر نے جتنی بھی تاریخی کتب لکھی ان میں وہ سب اہمیت کی حامل ہیں۔ انہی کتب کی وجہ سے شرر ایک مورخ کے طور پر ابھرے ہیں۔ ان کی تاریخ نویسی میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ ہیں۔ وہ ایک اچھے مورخ تھے اور اس کا ثبوت ان کی تاریخی کتب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کی تاریخی کتب کے مطالعے سے جہاں شعور کی نشوونما ہوتی ہے وہاں عقل و دانش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ کمالات کے حامل افراد کے قصوں، حالات اور واقعات کے مطالعہ سے ویسا بننے کا ذوق و شوق جنم لیتا ہے۔ مصائب کا مقابلہ کرنے کی سکت پیدا ہوتی ہے۔ مختلف حکمرانوں کے عہد حکومت اور طرزِ حکومت کا پتہ

چلتا ہے۔ان کتب کے مطالعے سے ترقی کا جذبہ ابھرتا ہے۔اسلاف کے کارناموں اوران کے حالات وواقعات سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ان کتب کے مطالعے سے نگاہ میں وسعت اورقلب و ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ان کتب کا مطالعہ درس ہدایت دیتا ہے۔خاص کر اسلامی عہد کی تاریخ کے مطالعے سے نسل نو کوعزم و حوصلہ ملتا ہے۔اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اوران جیسا بننے پرفطرت آمادہ ہوتی ہے۔حضرت علی کے بارے میں لکھتے ہیں:''بچپن میں ایمان لانے کی یہ برکت تھی کہ حضرت علیؓ نے کبھی کسی بت کے آگے سرنہیں جھکایا اورنہ کسی بت کدے میں جاکر پوجا کی۔''[۳]

ان کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کرہ ارض پرکون کون سی قومیں آبادتھیں؟ ان کے طرز بودوباش، ان کے عروج وزوال کا پتہ چلتا ہے۔شررکی یہی کتب جن کی وجہ سے حجاب ماضی اٹھتا ہے۔تاریخ اسلام اورخاص طور پر رسول پاکؐ اوران کے صحابہ اکرام (خلفائے راشدین) کے حالات وواقعات ان کےطرزِ حکومت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے مصائب انہوں نے برداشت کیےاورکس صبر و رضا کا انہوں نے مظاہرہ کیا؟ ''اسوہ حسنہ''پرعمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔مختلف حکمرانوں اورقوموں کےعروج وزوال کی داستانیں ان کتب میں پڑھ کرانسان عبرت حاصل کرتا ہے۔شررکی تاریخ نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر انورسدید لکھتے ہیں:''تاریخ نگاری میں شررسرسید سے متاثر تھے۔تاہم تاریخ میں تخیلی واقعہ نگاری، اصول تاریخ نویسی کے خلاف ہے اورشرر نے اس سے زیادہ کام لیا ہے۔''[۴] اگر چہ ان کی تاریخ نویسی میں تخیلی واقعہ نگاری زیادہ ہے لیکن اس سے انکارنہیں کیا جا سکتا کہ شرر نے جوکچھ لکھا ہے۔ایک تاریخ کے طالب علم کے لیے معلومات کاخزانہ موجود ہے۔

رپوتا ژفرانسیسی زبان کالفظ ہے۔اس کے معنی اطلاع اورخبر کے ہیں۔اس صنف نثر میں مصنف پیش آمد واقعات کو بیان کرتا ہے۔رپوتا ژ نگاری ایک نئی صنف نثر ہے۔اس میں گذشتہ واقعات کی سرگذشت اورواقعات کا روزنامچہ بغیر رنگ آمیزی کے پیش کیا جاتا ہے۔اردو رپوتا ژ نگاری کےابتدائی نقوش انیسویں صدی کے آواخر میں ظاہر ہوئے۔یہ وہ عہد تھا جب ملکی زندگی میں اصلاحی تحریکوں کا زور بڑھ رہا تھا۔ان تحریکوں سے متعلق جلسوں کی رودادا خبار و رسائل میں شائع ہوتی تھی۔شرربھی اردو رپورتا ژ نگاری کے اولین معماروں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اتوار ۹ مئی ۱۸۸۷ء کو انجمن دارالسلام سے متعلق جلسے کا رپورتا ژ لکھا۔یہ جلسہ لکھنو میں قیصر باغ کی تاریخی عمارت میں منعقد ہوا تھا۔شرر کے بیان کے مطابق اس جلسہ میں ۲۰ ہزارافرادشریک تھے۔اس یادگار جلسے سے متعلق رپوتا ژشرر نے لکھا جوکہ چھ صفحات پرمشتمل تھا اوراسے دلگداز کے اپریل ۱۸۸۸ء کے شمارہ میں شائع کیا۔شرر نے اپنے مخصوص اندازِ بیان اوردلکش اسلوب میں اس جلسے کا آنکھوں دیکھا حال لکھا۔

شرر نے جومضامین مختلف رسائل میں لکھے ان میں انہوں نے مختلف تنقیدی تصورات پیش کیے ہیں۔ان

کی بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ وہ نقاد بھی تھے۔انہوں نے اردو میں نظم معریٰ کی ابتدا کی اور اس کے حق میں مختلف مضامین لکھ کر نظری بنیاد پر اس کے فروغ کے لیے راہ ہموار کی۔نظم معریٰ کو ڈرامے کی شکل میں استعمال کر کے اس کی مثال قائم کی۔شرر نے اردو ادب میں ناول نگاری کے حق میں پُر دلائل مضامین لکھ کر اپنی تنقیدی بصیرت کا نمونہ پیش کیا۔ شرر نے شاعری، ادب، معاشرت، تہذیب وتمدن جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔آپ نے علم وادب اور صحافت میں تحقیق وتنقید کا معیار قائم کیا۔شرر نے اپنی تنقیدی آرا مختلف مضامین میں پیش کیں جو عصری مباحث، وقتی تقاضوں اور ہنگامی موضوعات کے لحاظ سے لکھی تھیں۔ رومانوی تنقید کے ابتدائی آثار بھی شرر کے مضامین اور صحافیانہ تحریروں میں نظر آتے ہیں۔شرر کے تنقیدی تصورات اور رویوں کا اگر عمیق مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان پر حالی اور سرسید کی عقلیت، عملیت، افادیت اور اصلاحی واخلاقی رویوں کا اثر تھا اور دوسری طرف جمالیاتی حظ، شعری تاثرات اور شعر کے وجدانی وتخیلاتی سحر کے بھی قائل تھے۔شرر کے نزدیک شاعری قدرتی جذبات کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ یہ جذبات انسان کے دل میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔شرر کے نظریے کے مطابق شاعری انسانی دل کا معاملہ ہے جو ایک دل میں جنم لے کر دوسرے دل کو متاثر کرتا ہے۔

شرر نے جو مضامین اپنے ناولوں کے دفاع میں لکھے ہیں ان میں بھی ان کے تنقیدی نظریات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔شرر نے ادب کے متعلق بھی اپنے نظریات مختلف مضامین میں پیش کیے ہیں۔جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب کی جمالیاتی قدر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور افادی قدر کی حیثیت ان کے نزدیک ثانوی ہے۔شرر کے نظریات سرسید، حالی اور ڈپٹی نذیر احمد سے مختلف نظر آتے ہیں۔شرر رومانوی طرز احساس کے حامل تھے۔وہ سنہرے ماضی کا تصور رکھتے تھے۔شرر نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے متعلق بھی اپنے نظریات پیش کیے۔شرر دہلی کی شاعری کی خوبیوں کو لکھنوی شاعری کی خوبیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ دلی کی شاعری میں سادگی، جذباتی اپیل اور نیچر کا سماں دکھانے کی خوبی تھی اور اس خوبی کو شرر لکھنو کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی پر ترجیح دیتے ہیں۔شرر زبان کے اعتبار سے لکھنو کو دلی پر اور خیال کے اظہار سے دلی کو لکھنو پر فوقیت دیتے ہیں۔شرر کے نزدیک شاعری کی خوبی، سادگی اظہار اور خلوص جذبات ہے۔

مولانا جب انیس برس کے ہوئے تو آپ اودھ اخبار کے لیے خبریں بھیجتے تھے۔اس وقت شرر کا قیام مٹیابرج میں تھا۔یہی وہ دور ہے جب شرر کو انشا پردازی واخبا نویسی سے لگاؤ پیدا ہوا تھا۔مٹیا برج سے جب لکھنو آئے تو انہوں نے اخبارات میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔منشی نولکشور نے جب مولانا کے مضامین کے رنگ ڈھنگ اور ذوق وشوق کو دیکھا تو انہیں اخبار کے ادارہ تحریر میں لے لیا، یوں شرر نے مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ان کے رنگ عبارت کو ہر جگہ پذیرائی ملی۔سرسید احمد خان نے بھی ان کے مضمون روح سے چند اقتباس لیے

مولانا نے اپنی صحافتی زندگی کا جب آغاز کیا تو انہوں نے کئی رسائل و اخبارات شائع کیے۔جن میں محشر، دلگداز، مہذب، اتحاد، پردہ عصمت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔یہی وہ رسائل و اخبارات ہیں جنہوں نے مولانا کے نام کی دھوم مچا دی تھی۔مولانا نے اپنی زندگی میں آٹھ کے قریب رسائل و اخبارات نکالے تھے۔منشی احمد علی کسمنڈی ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے انہیں انشاپردازی کا شوق دلایا تھا۔مولانا کو صحافت کے میدان میں شہرت اس وقت ملی جب وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوئے تھے۔

مولانا نے اپنی صحافتی زندگی میں کئی رسائل و اخبارات شائع کیے تھے لیکن جو شہرت دلگداز کو ملی وہ باقی کسی کو نہ مل سکی۔۱۸۸۷ء میں شرر نے اپنا شیرہ آفاق رسالہ جاری کیا تھا۔''دل گداز'' نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے کبھی شائع ہوتا تھا اور کبھی بند ہو جاتا تھا۔''دل گداز'' کے علاوہ ''مہذب'' نامی ہفتہ وار رسالہ نکالا جس میں علمائے اسلام کی سوانح حیات کو شائع کرتے تھے۔اس رسالے کو بھی کافی شہرت نصیب ہوئی۔پردہ عصمت ایک پندرہ روزہ اخبار تھا۔جس میں شرر نے مروجہ پردہ کو غیر شرعی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

اردو نثر کی تاریخ میں بطور صحافی شرر کا خاص مقام و مرتبہ ہے۔ان کی ناول نگاری کا آغاز ''دلگداز'' سے ہوا، جس کی وجہ سے انہیں اردو کا پہلا تاریخی ناول نگار تسلیم کیا گیا۔شرر مضمون نگار اور صحافی تھے۔تاریخ دان اور معلم بھی تھے۔یہی وہ میدان ہیں جن میں شرر نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی احساس کی ترجمانی کی اور اردو ادب میں ایسے طرز تحریر اور اسلوب نگارش کی بنیاد ڈالی جو قاری کے لیے دلچسپ اور دل آویز ہے۔یہی وہ انداز تحریر ہے جو کہ جدید ذوق کے میلان کا صحیح مظہر بھی ہے۔اگرچہ بحیثیت صحافی شرر نے کئی رسائل و اخبارات شائع کیے۔لیکن شرر کی توجہ کا مرکز اور ان کی مختلف جہتوں کی پرورش کا گہوارہ صرف اور صرف ''دلگداز'' ہی تھا جو کہ اردو ادب میں نئے رنگ کا موجد ہے۔''تہذیب الاخلاق'' اور ''دلگداز'' اپنے عہد کے وہ رسائل تھے جنہوں نے مقالہ نگاری اور مضمون نگاری کے ارتقاء میں سب سے زیادہ مدد دی۔ان کی وجہ سے ادب، انشاپردازی اور فکر و تخیل کو پنپنے کا صحیح موقع نصیب ہوا۔دلگداز کے اداریوں کو اس لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل تھی کہ ان میں قومی، سیاسی مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ان اداریوں کو ہم بلاشبہ شرر کے شعوری دور کی ڈائری اور روزنامچہ قرار دے سکتے ہیں۔''دلگداز'' کے بعد قومی نقطہ نظر سے ''مہذب'' کو اہمیت حاصل ہے۔یہی وہ رسالہ تھا جس میں شرر نے دوقومی نظریے کو پیش کیا تھا۔

اردو نثر میں مقالہ، مضامین اور انشائیہ و ناول نگاری کے فروغ میں شرر کے صحافتی ادب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔شرر نے اپنی صحافت کے ذریعے سے سنجیدہ فکری کے فروغ میں فعال کردار ادا کیا ہے۔شرر نے بطور صحافی جو کچھ لکھا اس کی وجہ سے باذوق قارئین کا ایک حلقہ پیدا ہوا اور اہل قلم نے زبان و بیان کی لطافتوں اور اسلوب کی

نزاکتوں کی طرف شعوری توجہ دی۔ ''تہذیب الاخلاق'' اور ''دلگداز'' کے منظر عام پر آنے کے بعد اردو نثر کی مقبولیت کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔شرر نے جتنے بھی اخبارات و رسائل شائع کیے تھے وہ اپنے وقت کے مقبول ترین جرائد و رسائل تھے۔مقبولیت کی وجہ واقعات و معاملات پر بے لاگ رائے کا اظہار تھا۔وسعت مطالعہ، معاملات اور تعمیری نقطہ نظر بھی ان میں کارفرما تھا۔

شرر کے زمانے میں کئی اخبارات و رسائل شائع ہوئے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر اہمیت کا حامل تھا۔لیکن شرر کے دلگداز نے جو مقام حاصل کیا وہ شاید کسی اور کے حصے میں کم ہی آیا ہے۔اگر چہ یہ رسالہ کئی بار نکلا اور بند ہوا لیکن جب بھی یہ منظر عام پر آتا تھا تو ناقابل فراموش یادیں چھوڑتا تھا۔اس نے اردو داں طبقے کی ناقابل فراموش خدمت سرانجام دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسے اردو کے معروف ومقبول ترین ادبی رسالوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ رسالہ تھا جس میں شرر نے اپنے شاعرانہ وعاشقانہ، تاریخی، اصلاحی، محققانہ ہر قسم کے مضامین لکھ کر شائع کیے تھے۔انیسویں صدی عیسوی کے شروع کا زمانہ شرر کی صحافتی زندگی کے اوج شہرت کا زمانہ تھا۔دلگداز اپنے زمانے میں ملک کے ادبی رسالوں کا سردار تسلیم کیا جاتا تھا۔دلگداز میں شائع ہونے والے قصے درد والم سے بھر پور ہوتے تھے۔یہ آوارہ گردی سحرانوردی کی داستانیں بھی سناتا تھا۔شرر نے ''دلگداز'' اور ''مہذب'' کے ذریعے سے علی گڑھ تحریک کی معنویت کو آگے بڑھانے کی سعی وجدوجہد کی۔دلگداز شرر کا خاص رسالہ تھا۔شرر اس میں زیادہ تر تاریخی مضامین اور قصے شائع کرتے تھے۔

شرر نے اپنی صحافتی تحریروں کے ذریعے سے قوم کے مفہوم کو صحیح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا، تاریخ اسلام کے درخشندہ عہد کو بیان کیا تاکہ مسلمانوں کے اندر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔انھوں نے قومیت، حب الوطنی، سچی ہمدردی اور خلوص سے بھر پور باتیں لوگوں کو سکھائیں۔جس پر ہم جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔اردو ادب میں صحافتی ادب کا ارتقا سرسید کے بعد شرر ہی کا مرہون منت ہے۔اس میدان میں ان کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہیں۔ان کا رسالہ دلگداز اگر چہ اردو کا پہلا رسالہ نہ تھا لیکن صحافت میں کئی خوش آئند تبدیلیوں کا نقیب ضرور ثابت ہوا۔

شرر نے جب صحافتی زندگی میں قدم رکھا تھا قوم کی حالت بہت خراب تھی۔وہی قوم جو ایک زمانہ میں علم و فضل میں صنعت وحرفت میں، تجارت وحکمرانی میں ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ چکی تھی۔اب وہ ہی قوم تنزل کا شکار تھی۔ان حالات میں شرر نے اپنی صحافت کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔اور ہمہ تن ان کی اپنی مشکلات کے حل میں مصروف ہو گئے۔دل و دماغ۔قلم اور زبان کو ان کے لیے استعمال کیا۔شرر کے اخبارات و رسائل اور خصوصاً ''دلگداز'' اور ''مہذب'' نے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ان سریلی تحریر میں وہ غضب کی طاقت تھی کہ ہر دل میں

جادو سا اثر کر گئی۔ جس گھر میں پہنچی مقناطیس کا کام کر دکھایا۔ ان کی تحریروں نے سوتوں کو جگایا۔ مستوں کو ہوشیار کیا۔ مردہ تنوں میں روح پھونکی۔ یہی وہ رسالہ تھا جس نے بتا دیا کہ سچا اسلام کیا ہے۔ جس نے تاریخ اسلام کے باب کو روشن کیا۔ یہی وہ پرچہ تھا جس میں شرر نے گلزار نسیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کیا۔

> گلزار نسیم کے اختصار، اس کی ترکیبوں کی پختگی، تشبیہات کامل، کلام کی سادگی و روانی اور پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے بہت صحیح ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ہے۔ ہم لکھتے تو اس سے کچھ زیادہ ہی لکھتے۔ اس لیے کہ ہم ہمیشہ سے گلزار نسیم کے بہت بڑے معترف ہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے دوسرے رخ یعنی مثنوی گلزار نسیم کے عیوب کی طرف سے مسٹر چکبست نے بالکل چشم پوشی کی۔[۵]

۱۸۵۷ء کے بعد صحافت میں نئے موڑ کا اضافہ ہوا۔ شرر نے اپنی تحریروں سے ملک وقوم کی جہاں خدمت کی وہاں ادب اور صحافت کو بھی نئے راستے دکھائے۔ مقصدیت کو ان میدانوں میں داخل کیا۔ سماج کی اصلاح کو مقصد ادب بنایا۔ ''لگداز'' نے ادب وصحافت کی جو نا قابل فراموش خدمت کی وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس رسالے کی خوبی یہ ہے کہ موجودہ اردو ادب کی تاریخ کے آغاز وارتقا میں اس نے اپنا حصہ ڈالا۔ اس کے ذریعے سے زبان وادب کو فروغ ملا۔ اردو زبان اس قابل ہوئی کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات اور مضامین ادا ہونے لگے۔ اس زمانے کا کوئی ادیب اور صحافی ایسا نہ تھا جس پر اس کا اثر نہ ہوا ہو۔ شرر کا یہ اہم ترین رسالہ تھا۔ اس نے کسی فرد اور کسی فرقے کی دل آزادی بہت کم کی۔ ''تہذیب الاخلاق'' اور ''دلگداز'' نے ملک وقوم کی جو خدمت کی وہ کسی اور رسالے کو نصیب نہ ہو سکی۔ سید وقار احمد رضوی رقمطراز ہیں: ''......ماہناموں میں تہذیب الاخلاق سب سے آگے ہے۔ دلگداز لکھنو ادب وتاریخ سے بحث کرتا ہے۔ ان دونوں رسالوں نے ادب وتاریخ کو رواج دیا۔''[٦]

شرر نے کئی اصناف ادب پر لکھا لیکن خطوط نگاری میں ان کا جواندا ز ہے۔ وہ ان کی دوسری اصناف میں کم دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کہ نظم، ناول، ڈراما، مضمون، انشائیہ، سوانح عمری، تاریخ اور دیگر اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ یہ علمی وادبی کوشش غیروں کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ تکلف وتصنع کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کی بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن برعکس اس کے جب کوئی خط لکھتا ہے تو وہاں غیریت ختم ہو جاتی ہے۔ دوئی کا پردہ حائل نہیں ہوتا۔ مکتوب نگار ہر ایک بات کو اسی طرح لکھ دیتا ہے جیسے وہ سمجھتا ہے۔ دلی کیفیات واحساسات وجذبات کو صاف صاف اور سچ سچ کاغذ پر اتار دیتا ہے۔ یہی سادگی، بے ریائی دلوں کو بھاتی ہے۔

شرر نے زیادہ تر خانگی خطوط لکھے ہیں یا پھر اپنے عزیزوں اور مخلص دوستوں کو لکھے ہیں ۔ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے ۔شرر نے تکلف و تصنع سے کام نہیں لیا ۔تحریر میں سادگی ،سلاست اور دلکشی و دلچسپی موجود ہے ۔ ان میں صداقت وخلوص ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دوافراد کے مابین گفتگو ہو رہی ہے ۔خطوط شرر اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے مکتوب نگار کی سیرت وکردار کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ دوسرے اصناف نثر سے نہیں ہوسکتا۔ جو خیال جس طرح ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اس کو اسی طرح بیان کر دیتے ہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا دل کاغذ کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا ہے ۔

آج اگر چہ شرر کا نام بازار ادب میں ایک ہی صنف ادب کی حیثیت سے پہنچانا جاتا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب مسلمان اپنے خادموں کی تاریخ مرتب کرنا شروع کریں گے تو ہر صنف ادب میں ان کا ذکر ضرور آئے گا ۔شرر اپنے وقت کے نمایاں نثر نگار اور مشہور ادیب تھے ۔انہیں اپنے دور میں وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے ۔شرر کی ادبی خدمات کی وہ قدر افزائی نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی ۔شرر اردو زبان و ادب کے زبردست انشا پرداز اور تاریخ کے ماہر تھے ۔شرر نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ۔ان کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ انہوں نے نظم معریٰ کی داغ بیل ڈالی ۔شرر کا یہ سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم کی جامد ہیئت کو توڑ کر جذبہ وخیال کو ردیف وقافیے کی پابندی سے نجات دلائی اور نظم معریٰ کی ابتداء کی ۔

اردو ادب میں جب بھی شرر کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن فوراً عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے ۔اگر چہ اردو کے ناول نگاروں میں شرر سب سے زیادہ مشہور ومعروف ہیں ،انہوں نے ناول پڑھنے کا شوق لوگوں میں پیدا کیا ۔تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے ۔اردو ادب کے قارئین ان کو تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے ۔وہ ڈرامہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی ۔مورخ بھی تھے اور صحافی بھی ۔مضمون نگار ،انشائیہ نگار اور مقالہ نگار بھی تھے ۔سیرت نگاری اور سوانح عمریاں لکھ کر بھی ادب میں نام کمایا ہے ۔وہ اپنے دور کے نمائندہ نثر نگار تھے ۔جنہوں نے ہر ایک صنف نثر میں کچھ نہ کچھ پیش کیا ہے ۔

> ان کا قلم ادب کے کسی میدان میں بھی بند نہیں تھا وہ ناول نویس بھی تھے ،مورخ بھی تھے ، صحافی بھی تھے ،ڈرامہ نویس بھی تھے ،معلم بھی تھے ،نقاد بھی تھے ۔مترجم بھی تھے ،فنون لطیفہ کے نباض بھی تھے ۔ انشاء پرداز بھی تھے ، شاعر بھی تھے ،مصلح بھی تھے غرض کیا کچھ نہیں تھے؟ ان کے مقالات اور مضامین جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں ان کی ہمہ گیر طبیعت کا ثبوت ہیں ۔[۲]

اردو ادب میں شرر کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ اردو کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں ان کی نگارشات اضافے کا باعث بنتی رہیں گی۔ ان کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعین کے لیے قابل قدر کوششیں ہو چکی ہیں لیکن افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں شرر کے ادبی کارنامے زیادہ محنت و توجہ کے طلب گار ہیں۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں کوشش کی ہے کہ ان کی غیر افسانوی نثر سے انصاف کر سکوں۔ لیکن میری کوشش کہاں تک کامیابی سے ہمکنار رہوئی اس بارے میں میں حتمی فیصلہ نہیں دے سکتی۔ انصاف اور حق تو یہ ہے کہ ان کی غیر افسانوی نثر کا ہر پہلو توجہ طلب ہے اور اس سے انصاف کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجی سے عبدالحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۸

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۹

۳۔ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، جلد دوم، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۹۴۲

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۳۴۹

۵۔ محمد شفیع، مولف، معرکہ چکبست و شرر، منشی نول کشور، لکھنو، ۱۹۴۲ء، ص ۵۷

۶۔ وقار احمد رضوی، سید، ڈاکٹر، تاریخ نقد، آگہی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۴۱

۷۔ خاکی قزلباش، مولانا عبدالحلیم شرر، مشمولہ نقوش، شخصیات نمبر، شمارہ ۔ ۴۷ ۔ ۴۸، جنوری ۱۹۵۵ء، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۵۵

کتابیات

بنیادی کتب

۱ عبدالحلیم شرر، ابوبکر شبلی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۶ء

۲ عبدالحلیم شرر، ابوالحسین، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۵ء

۳ عبدالحلیم شرر، اسلامی سوانح عمریاں، وحید بک سنٹر، لاہور، ۱۹۹۹ء

۴ عبدالحلیم شرر، تاریخ ارض مقدس، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۳۱ء

۵ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، جلد اول، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

۶ عبدالحلیم شرر، تاریخ اسلام، جلد دوم، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

۷ عبدالحلیم شرر، تاریخ خلافت، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۳ء

۸ عبدالحلیم شرر، ثانی اثنین، دلگداز پریس، لکھنو، س۔ن

۹ عبدالحلیم شرر، جان عالم، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء

۱۰ عبدالحلیم شرر، جنید بغدادی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۳ء

۱۱ عبدالحلیم شرر، جویائے حق، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۲ عبدالحلیم شرر، حسن بن صباح، حافظ محمد الدین اینڈ سنز، لاہور، س۔ن

۱۳ عبدالحلیم شرر، خواجہ معین الدین چشتی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۷ء

۱۴ عبدالحلیم شرر، دل گداز (ترتیب و تدوین)، فاروق عثمان، ڈاکٹر بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۵ عبدالحلیم شرر، سرسید احمد خان کی دینی برکتیں، م۔ن، ۱۹۰۸ء

۱۶ عبدالحلیم شرر، سفرنامہ امام شافعی، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۴ء

۱۷ عبدالحلیم شرر، سکینہ بنت حسین، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۴ء

۱۸ عبدالحلیم شرر، صد پارہ دل/ شاہکار شرر، قومی کتب خانہ، دہلی، س۔ن

۱۹ عبدالحلیم شرر، صقلیہ میں اسلام، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۹ء

۲۰ عبدالحلیم شرر، عصر قدیم، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۵ء،

۲۱ عبدالحلیم شرر، فردوس بریں، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء

۲۲ عبدالحلیم شرر، فلورا فلورنڈا، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۸۶ء

۲۳ عبدالحلیم شرر، قاضی ابویوسف، اسلامی سوانح عمریاں، وحید بک سنٹر، لاہور، ۱۹۹۹ء

۲۴ عبد الحلیم شرر، قدیم مسیحیت، سید ظہور الحسن قومی پریس، دہلی، س۔ن

۲۵ عبد الحلیم شرر، قرۃ العین، دلگداز پریس، لکھنو، ۱۹۲۳ء

۲۶ عبد الحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، تصحیح و ترتیب، رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۲۰۰۰ء

۲۷ عبد الحلیم شرر، گذشتہ لکھنو، مرتب محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۸ عبد الحلیم شرر، محذرات، مہتاب پریس، دہلی، ۱۹۳۳ء

۲۹ عبد الحلیم شرر، مفتوح فاتح، سلطان حسن اینڈ سنز بندر روڈ، کراچی، ۱۹۵۷ء

۳۰ عبد الحلیم شرر، مولود شریف، دلگداز پریس، لکھنو، س۔ن

۳۱ عبد الحلیم شرر، میوہ تلخ، نسیم بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۷۱ء

۳۲ عبد الحلیم شرر، نام واران عالم، سید ظہور الحسن قومی پریس، دہلی، س۔ن

۳۳ عبد الحلیم شرر، مضامین شرر، جلد اوّل، حصہ اوّل، شاعرانہ و عاشقانہ، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۳۴ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد اوّل، حصہ دوم، شاعرانہ و عاشقانہ، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۳۵ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد اوّل، حصہ سوم، آغاز و اختتام سال کے مضامین، مرکنٹائل پریس، لاہور، س۔ن

۳۶ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد دوم، حصہ اول، تاریخی و جغرافیائی، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۳۷ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد دوم، حصہ دوم، تاریخی و جغرافیائی، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۳۸ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد دوم، حصہ سوم، ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۳۹ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد سوم، حصہ اول، سیر نسواں، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۴۰ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد سوم، حصہ دوم، سیر نسواں، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۴۱ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد سوم، حصہ سوم، سیر رجال، مرکنٹائل پریس، س۔ن

۴۲ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد چہارم، ادب و تحقیقی مسائل، گیلانی پریس، لاہور، س۔ن

۴۳ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد پنجم، اصلاح قوم وملت، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، س۔ن

۴۴ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد ششم، تاریخی واقعات پر خیال آرائی، مکتبہ کلیاں لکھنو، ۱۹۲۱ء

۴۵ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد ہفتم، نظم و ڈرامہ، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

۴۶ عبد الحلیم شرر، مضامین، شرر، جلد ہشتم، مقالات شرر، ایس عبد الرشید اینڈ برادرز، لاہور، س۔ن

ثانوی کتب

۱۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان، عظیم اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء

۲۔ آرنلڈ جے ٹائن بی، تالیف مطالعہ تاریخ، ترجمہ غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۶۴ء

۳۔ آزاد کوثری، پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں، ری پبلکن بکس، لاہور،۱۹۸۸ء

۴۔ آغا اشرف، روداد پاکستان، مقبول اکیڈمی، لاہور، س۔ن

۵۔ آغا محمد باقر، تاریخ نظم ونثر اردو، شیخ مبارک علی، تاجران کتب، لاہور،۱۹۴۵ء

۶۔ آفاق حسین، مرتب، نادرات غالب، ہشور پریس کراچی،۱۹۴۹ء

۷۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، غالب آشفتہ نوا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء

۸۔ آل احمد سرور، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، مرتب، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۶ء

۹۔ آل احمد سرور، ہمارا ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۱ء

۱۰۔ ابن ہشام، سیرت النبیؐ کامل، جلد اول، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن

۱۱۔ ابو اعلیٰ مودودی، مولانا تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اردو ادبی تاریخ کا خاکہ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۶۲ء

۱۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، فیروز سنز لمٹیڈ، لاہور،۱۹۷۵ء

۱۴۔ ابوالہاشم ندوی، جلیانوالہ باغ ایک ناقابل فراموش المیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن

۱۵۔ احسن مارہوی، تاریخ نثر اردو، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ،۱۹۳۰ء

۱۶۔ احمد سعید، پروفیسر، حصول پاکستان، نیو کریسنٹ پبلشرز، لاہور،۱۹۷۲ء

۱۷۔ ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، اردو فکشن کی تنقید، م ن، س ن

۱۸۔ ارشاد حسین نقوی، اکبر الہ آبادی کا سیاسی شعور، الحمرا اکیڈمی لاہور،۱۹۸۴ء

۱۹۔ اسرار احمد سہاوری، فکر ونظر، فروغ ادب اکادمی، گوجرانوالہ،۱۹۹۱ء

۲۰۔ اسلم فرخی، محمد حسین آزاد اور تصانیف، انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان، ۱۹۶۵ء

۲۱۔ اشتیاق طالب، تمہید، مشتاق بک ڈپو، کراچی،۱۹۸۲ء، ص۳۵

۲۲۔ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، دبستان ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء

۲۳۔ اطہر برلاس، مرزا، اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ، اودھ ادبی اکیڈمی، کراچی،۱۹۸۴ء

۲۴۔ اعتزاز احسن، سندھ ساگر اور قیام پاکستان، مترجم، مستنصر جاوید، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

۲۵۔ افتخار الدین صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء

۲۶۔ اکبر حمیدی، تتلی کے تعاقب میں، بڑ پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء

۲۷۔ اکبر حمیدی، جھاڑیاں اور جگنو (انشائیے) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

۲۸۔ اکبر حمیدی، مضامین غیب، بڑ پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۲۹۔ الطاف حسین حالی، مولانا، حیات جاوید، المقبول پبلشرز، لاہور، ۱۹۴۹ء

۳۰۔ الطاف حسین حالی، مولانا، کلیات نثر حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء

۳۱۔ الطاف حسین حالی، مولانا، مسدس حالی، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۰ء

۳۲۔ انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، سیرت پاک کی خوشبو، سیرت اکادمی بلوچستان، بار دوم، ۱۹۹۶ء

۳۳۔ انعام الحق، کوثر، ڈاکٹر، اردو کی علمی ترقی میں سر سید اور ان کے رفقا کا حصہ لائبریری پروموشن بیورو، کراچی، ۱۹۸۴ء

۳۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء

۳۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں خطوط نگاری،، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء

۳۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، انشائیہ اردو ادب میں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۵ء

۳۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

۳۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء

۳۹۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، اردو میں سیرت رسولؐ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۹ء

۴۰۔ اویس احمد ادیب، پروفیسر، ادبی تعارف، یونائیٹڈ بک سیلرز، کراچی، ۱۹۸۵ء

۴۱۔ اویس احمد، ادیب، تنقیدیں، اردو پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۴۴ء

۴۲۔ ایس ایم معین قریشی، اردو زبان و ادب، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۸۶ء

۴۳۔ ایم۔ایس ناز، اخبار نویسی کی مختصر تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔س۔ن

۴۴۔ بشریٰ جبین راٹھور، اردو زبان و ادب مختلف ادوار میں، سورج پبلشنگ بیورو، لاہور، ۱۹۹۸ء

۴۵۔ بشیر جامی، جنگل کی آگ، جامی اکادمی، کراچی، ۱۹۹۱ء

۴۶۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

۴۷۔ پریم چند، مضامین پریم چند، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۱ء

۴۸۔ پیر مونس زبیری، یار غار، بلیو ایریا، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۴۹۔ ثاقبہ رحیم الدین، محفل تنہائی، پکچوریل پرنٹرز لمٹیڈ، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۵۰۔ جعفر رضا، پروفیسر، عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء

۵۱۔ جمیل آذر، اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۶ء

۵۲۔ جمیل آذر، رت کے مہماں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۴ء

۵۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

۵۴۔ جمیل یوسف، سرسید احمد خان (شخصیت اور فن)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

۵۵۔ جواہر لال نہرو، تلاش ہند، تخلیقات لاہور، ۱۹۹۲ء

۵۶۔ جیلانی کامران، تنقید کا نیا پس منظر، الفائن پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۶۴ء

۵۷ چوہدری محمد علی، ظہور پاکستان، مکتبہ کاروان، لاہور، ۱۹۷۰ء

۵۸۔ حافظ تقی الدین، پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں، فکشن ہاؤس مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء

۵۹۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، لکشمی نرائن گروال، آگرہ، ۱۹۵۷ء

۶۰۔ حسام الدین راشدی، تاریخ سندھ، مرتب غلام رسول مہر، سندھ ادبی بورڈ کراچی، ۱۹۵۸ء

۶۱۔ حسن اختر، ڈاکٹر، تنقید اور تحقیقی جائزے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۳ء

۶۲۔ حسن عابدی، اردو جرنلزم، نگارشات لاہور، ۱۹۹۲ء

۶۳۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۷۱ء

۶۴۔ حفیظ الرحمٰن خان، خیال و نظر، کاروان ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء

۶۵۔ حکیم نثار احمد علوی، شب چراغ، کاکوری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

۶۶۔ خواجہ احمد فاروقی، تحقیقی مقالہ، مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء، دہلی یونیورسٹی دہلی، س۔ن

۶۷۔ خواجہ احمد فاروقی، ماسٹر رام چندر فن اور تنقید، مرتب: انور کمال حسینی، دہلی، ۱۹۶۶ء

۶۸۔ خواجہ طارق محمود، بریگیڈئیر، منتشر مضامین، بزم علم و فن پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

۶۹۔ خواجہ عابد نظامی، میاں دو کریم، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۵ء

۷۰۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۰ء

۷۱۔ راجہ طارق محمود، سرسید احمد خان، بک کارنر، جہلم، پاکستان، ۱۹۸۸ء

۷۲۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۲۹ء

۷۳۔ رام نرائن گپتا، مہاراجہ اشوک، پرکاش دیو، جارج سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۷ء

۷۴۔ رجب علی بیگ سرور، گلزار سرور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۵ء

۷۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، طیب اقبال پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۳ء

۷۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

۷۷۔ رشید حسن خان، مرتب، گزشتہ لکھنو، عبدالحلیم شرر، جامعہ مکتبہ، دہلی، ۲۰۰۰ء

۷۸۔ رشید خان، ڈاکٹر، افکار عالیہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۷۷ء

۷۹۔ رضی عابدی، تیسری دنیا کا ادب، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، س۔ن

۸۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۸۱۔ رؤف پارکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۹۶ء

۸۲۔ ریاض احمد، ریاضتیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۸۳۔ سجاد علی انصاری، محشر خیال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۵۷ء

۸۴۔ سجاد نقوی، مطالعے، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۷ء

۸۵۔ سردار محمد خان عزیز، سرگزشتِ پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء

۸۶۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادبی اشارے، نسیم بک ڈپو، لکھنو، س۔ن

۸۷۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۴ء

۸۸۔ سلیم آغا قزلباش، مغرب کے انشائیے، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۹ء

۸۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، مکتبہ جامعہ، لاہور، ۱۹۷۶ء

۹۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

۹۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

۹۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۹۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۶۸ء

۹۴۔ سلیمان بٹ، انشائیہ ۱۹۸۱ء، مسعود پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۲ء

۹۵۔ سورۃ الحجرات، آیت نمبر ۴۹۔۵۰

۹۶۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۹۰ء

۹۷۔ سید احتشام حسین، اردو کی کہانی، ادارہ فروغ اردو لکھنو، ۱۹۵۶ء

۹۸۔ سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، احباب پبلشرز لکھنو، ۱۹۶۳ء

۹۹۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، ادبی رجحانات، کتاب خانہ دانش محل، لکھنو، ۱۹۴۲ء

۱۰۰۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، س۔ن

۱۰۱۔ سید الیاس رضوی، سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن

۱۰۲۔ سید سلیمان ندوی، خطبات مدارس، المکتبہ الاثریہ سانگلہ، شیخوپورہ، ۱۹۲۶ء

۱۰۳۔ سید سلیمان ندوی، یادرفتگان مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۳ء

۱۰۴۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۰۵۔ سید صفدر حسین، ڈاکٹر، لکھنو کی تہذیبی میراث، بارہ گاہ ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۰۶۔ سید ظہور مہدی، آئینہ افکار، الحبیب دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۰ء

۱۰۷۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۰۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۱۰۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو ادب جنگ عظیم کے بعد، اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء

۱۱۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری وفنی جائزہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۱۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر، مکتبہ کاروان، لاہور، ۱۹۶۰ء

۱۱۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۱۳۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر، لکھنو کا شعر و ادب، الفلاح پبلی کیشنز نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

۱۱۴۔ سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، روح تنقید، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۵ء

۱۱۵۔ سید مسعود ہاشمی، پروفیسر، بیسویں صدی میں تنقید، روزن پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۹۸ء

۱۱۶۔ سید وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ نقد، آگہی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۷ء

۱۱۷۔ سیدہ جعفر، ڈاکٹر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ، ابوالکلام آزاد، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد، ۱۹۶۰ء

۱۱۸۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، فوائد جامعہ بر مجالہ نافعہ شرح مولانا عبدالحلیم چشتی، م۔ن، س۔ن

۱۱۹۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد چہارم، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء

۱۲۰۔ شفیق جالندھری، اردو کالم نویسی، علمی کتب خانہ، لاہور، س۔ن

۱۲۱۔ شفیق جالندھری، فیچر نگاری، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۲۲۔ شمس الرحمٰن محسنی، اردو خطوط، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۷ء،

۱۲۳۔ شوکت زیدی، طاق نیساں، ویلکم بک پورٹ پرائیویٹ لمٹیڈ، کراچی، ۱۹۹۵ء

۱۲۴۔ شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق حیات اور کارنامے، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۵ء

۱۲۵۔ شہزاد قیصر، صاف چھپتے بھی نہیں (انشائیے) بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۷ء

۱۲۶۔ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۲۷۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، فیروز سنز، راولپنڈی، ۱۹۵۸ء

۱۲۸۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۰ء

۱۲۹۔ صابر امداد احمد، روحِ صحافت، مکتبہ براہ، دہلی، ۱۹۶۸ء

۱۳۰۔ صابر علی خان، ڈاکٹر، سعادت یار خاں رنگین، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۹۲ء

۱۳۱۔ صاحبزادہ عبدالرسول، تاریخ پاک و ہند، ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۳۲۔ صالحہ عابد حسین، ادبی جھلکیاں، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۳۳۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، مسلم لیگ کا دور حکومت، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۴ء

۱۳۴۔ ضیاء الحسن فاروقی، مولانا ابوالکلام آزاد، فکر و نظر کی چند جہتیں، مکتبہ اخوت، لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۳۵۔ ظہیر الدین بابر، تزک بابری، مترجم نصیر الدین حیدر، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۶۲ء

۱۳۶۔ ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر، اردو اسیزس، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، بمبئی، ۱۹۵۸ء

۱۳۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، فروری ۱۹۷۲ء

۱۳۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، نویں جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء

۱۳۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقید اور اصول تنقید، ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۴۰۔ عبدالحق، ڈاکٹر، خطبات گارساں وی تاسی، انجمن ترقی اردو ہند، حیدر آباد، دکن، ۱۹۳۵ء

۱۴۱۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، دنیائے اسلام کی صحافت، مقدمہ، عبدالمجید سالک، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۴ء

۱۴۲۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، س۔ن

۱۴۳۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، کاروانِ صحافت، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۸۹ء

۱۴۴۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۷۳ء

۱۴۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، تنقیدی نقوش، مشتاق بک ڈپو، کراچی،۱۹۶۳ء

۱۴۶۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور،۱۹۶۴ء

۱۴۷۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، کریم سنز پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۷ء

۱۴۸۔ عبدالماجد دریابادی، معاصرین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن

۱۴۹۔ عبیداللہ قریشی، آزادی کی تحریکیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۵۰۔ عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

۱۵۱۔ عزیز ملک، صحافت اور تحریک آزادی، شعیب پبلشرز، لاہور،۱۹۸۴ء

۱۵۲۔ عشرت رحمانی، اردو کا کلاسیکی ادب مرقع لیلیٰ مجنوں، مجلس ترقی ادب، لاہور۱۹۶۳ء

۱۵۳۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو اصناف کی مختصر تاریخ، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۵۴۔ عظیم الحق جنیدی، اردو ادب کی مختصر تاریخ، فیمس بکس، لاہور،۱۹۸۹ء

۱۵۵۔ عفیرہ حامد، ڈاکٹر، تحریک پاکستان میں مسلم صحافت کا کردار، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۵۶۔ علامہ سید سلیمان ندوی، یادرفتگان، مجلس نشریات اسلام، کراچی،۱۹۸۳ء

۱۵۷۔ علی احمد فاطمی، عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار، نصرت پبلشرز امین آباد، لکھنو، ۱۹۸۶ء

۱۵۸۔ علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۰ء

۱۵۹۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، انڈین بک ڈپو، لکھنو، ۲۰۰۰ء

۱۶۰۔ عنایت علی قریشی، محسوسات، کتاب نگر، ملتان، ۲۰۰۲ء

۱۶۱۔ عین الحق فریدکوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، اورینٹ ریسرچ سنٹر، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۶۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۱۶۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ادب اور تنقید، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۶۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، منتخبات تہذیب الاخلاق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۳ء

۱۶۵۔ غلام ربانی، پروفیسر، حیات قدسیہ، مکتبہ بحرالعلوم، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۶۶۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۶۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

۱۶۸۔ فیروز مکرجی، لکھنو اور سرشار کی دنیا، مترجم مسعود الحق ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء

۱۶۹۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۸۷ء

۱۷۰۔ قاضی احمد میاں جوناگڑھی، مضامین اختر جوناگڑھی، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۸۹ء

۱۷۱۔ قاضی ذوالفقار احمد، عوامی دورِ حکومت کا پہلا سال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء

۱۷۲۔ قیوم نظر، اردو نثر انیسویں صدی میں، یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور، س۔ن

۱۷۳۔ کرم حیدری، مسلمانانِ برصغیر کی جدوجہد آزادی میں مسلم لیگ کا کردار، نیشنل پریس ٹرسٹ، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۱۷۴۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س۔ن

۱۷۵۔ لطیف حسین ادیب، سید، ڈاکٹر، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۷۶۔ لطیف ساحل، اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش، الحمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

۱۷۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ سندھ عرب دورِ حکومت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۷۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۷۹۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۲ء

۱۸۰۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، تنقیدی مضامین کا مجموعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۳ء

۱۸۱۔ محمد اسحاق بھٹی، فقہائے پاک و ہند، جلد اوّل، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۸۲۔ محمد اسلام، ڈاکٹر، جگر مرادآبادی حیات اور شاعری، دبستان جگر، کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۸۳۔ محمد اسماعیل ذبیح، برصغیر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا آئینہ، علوی پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۹ء

۱۸۴۔ محمد امین زبیری، مولوی، تذکرہ سرسید، یونائیٹڈ پبلشرز، لاہور، س۔ن

۱۸۵۔ محمد انوار الدین، ڈاکٹر، اردو اصناف، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، س۔ن

۱۸۶۔ محمد انیس الرحمٰن، انیس سخن، علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۸۷۔ محمد حسن عسکری، ستارہ یا بادبان، مکتبہ سات رنگ، کراچی، ۱۹۶۳ء

۱۸۸۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، اردو تنقید کا رومانوی دبستان، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۸۹۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، تاریخ اور مؤرخ، مرتب، مبارک علی ڈاکٹر، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء

۱۹۰۔ محمد شفیع، مؤلف، معرکہ چکبست و شرر، منشی نول کشور، لکھنو، ۱۹۴۲ء

۱۹۱۔ محمد عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن، ۱۹۴۶ء

۱۹۲۔ محمد عسکری، مرزا، ادبی خطوط غالب، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۵۴ء

۱۹۳۔ محمد معین الدین، پروفیسر، تحقیقی مقالے، پاکستان کتاب گھر، س۔ن

۱۹۴۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین، جلد اوّل، دارالاشاعت غازی آباد، دہلی، ۱۹۲۴ء

۱۹۵۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین، جلد دوم، دارالاشاعت غازی آباد، دہلی، ۱۹۲۴ء

۱۹۶۔ محمود الرحمٰن، جنگ آزادی کے اردو شعرا، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۱۹۷۔ محمود بریلوی، پروفیسر، مختصر تاریخ ادب اردو با تصویر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۱۹۸۔ محمود علی، پاکستان کی بنیادیں، مترجم، سید اشتیاق حسین، غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۹۹۔ مسرت شوکت چیمہ، اسلامک ایجوکیشن اینڈ کلچر، اسلامک ایجوکیشن ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۶ء

۲۰۰۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، صحافتی زبان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء

۲۰۱۔ مصباح الدین شکیل، سیرت احمد مجتبیٰ، پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی، کراچی، ۱۹۹۶ء

۲۰۲۔ مظفر عباس، ڈاکٹر، اسلامی تہذیب اور اردو شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

۲۰۳۔ معین الدین احمد انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں' اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۰۴۔ معین الدین، مضامین چکبست، مکتبہ معین الادب، لاہور، س۔ن، ص

۲۰۵۔ مفتون احمد، مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء

۲۰۶۔ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، مکتبہ جدید المعارف، لاہور، ۱۹۸۷ء

۲۰۷۔ ملک حسن اختر، تنقیدی نظریے، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۱ء

۲۰۸۔ ممتاز حسن، ادب اور شعور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۰۹۔ ممتاز حسن، ادبی مسائل، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء

۲۱۰۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء

۲۱۱۔ منصف خان سحاب، نگارستان، دارالتذکیر، س۔ن

۲۱۲۔ منصور عاقل، حرف بہ حرف، اردو اکیڈمی، بہاولپور، ۱۹۸۲ء

۲۱۳۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری، پیغمبر انسانیت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء

۲۱۴۔ مولانا صابری، اردو کے اخبار نویس، صابری اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۳ء

۲۱۵۔ مولانا صلاح الدین احمد، صریر خامہ، جلد دوم، المقبول پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء

۲۱۶۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، افکار حالی، انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان، ۱۹۷۹ء

۲۱۷۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، افکار عبدالحق، مرتب، آمنہ صدیقی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۲ء

۲۱۸۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، مقدمات، مرتب، محمد بیگ مرزا، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، ۱۹۳۱ء

۲۱۹۔ مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی، مکارم اخلاق مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء

۲۲۰۔ مہدی افادی، افادات مہدی، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۴۹ء

۲۲۱۔ نادر علی خاں، اردو صحافت کی مختصر تاریخ، بک چینل سمن آباد، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۲۲۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، نگاہ، تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۴ء

۲۲۳۔ نصرت ادریس، پاکستان میں شورائی نظام حکومت مسائل و امکانات، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۷ء

۲۲۴۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، غالب اور اقبال، روحانی پرنٹرز بلیو ایریا، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

۲۲۵۔ نعیم نقوی، ڈاکٹر، تنقید و آگہی، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء

۲۲۶۔ وحید الحسن ہاشمی، تنقیدی جہتیں، الحبیب پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۴ء

۲۲۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اردو تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۹ء

۲۲۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور مجلسی تنقید، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۶ء

۲۲۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین ایک انتخاب، مرتب سجاد نقوی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء

۲۳۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، خیال پارے، اکادمی پنجاب، لاہور، ۱۹۶۱ء

۲۳۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۰ء

۲۳۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دوسرا کنارہ، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء

۲۳۳۔ وقار عظیم، ڈاکٹر، شبلی بحیثیت مورخ، تصنیفات، لاہور، ۱۹۹۸ء

انگریزی کتب

1. Abdul Qadir, New School of Urdu Literature, third edition, Lahore.

2. Ishtiaq Hussain Qureshi, Dr. The Struggle for Pakistan , Karachi, 1965.

رسائل/ اخبارات

۱۔ ادبی دنیا، لاہور، شمارہ۔۲۱، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء

۲۔ ادیب، الہ آباد، ۱۹۱۰ء۔۱۹۱۳ء

۳۔ اردو نامہ، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء

۴ اوراق، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء

۵۔ پاکستانی ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

۶ ثقافت، لاہور، جنوری ۱۹۲۲ء

۷ جامِ جہاں نما، دہلی، ۹ مارچ ۱۹۸۵ء

۸۔ خیابان شر نمبر، لاہور، شمارہ ۷، جون ۱۹۷۲ء

۹۔ زمانہ، کانپور، فروری ۱۹۲۷ء

۱۰۔ زمیندار، لاہور، ۳۰ جنوری، ۱۹۲۷ء

۱۱۔ سہ ماہی، اردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۸۵ء

۱۲۔ سہ ماہی، اردو، کراچی، شمارہ ۲، ۱۹۸۵ء

۱۳۔ صحیفہ، لاہور، شمارہ ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء

۱۴۔ فکر و نظر، ماہنامہ، اپریل ۱۹۷۵ء

۱۵۔ فکر و نظر، ماہنامہ، اپریل ۱۹۷۵ء

۱۶۔ فنون، لاہور، شمارہ ۱۔۲، جولائی اگست ۱۹۸۲ء

۱۷۔ فنون، لاہور، شمارہ۔۳، ستمبر دسمبر ۱۹۹۲ء

۱۸۔ فنون لاہور، شمارہ۔۱۵، ۱۹۸۱ء

۱۹۔ فنون لاہور، شمارہ۔۲۳، دسمبر ۱۹۸۵ء

۲۰۔ ماہِ نو، لاہور، ۱۹۶۶ء

۲۱۔ ماہِ نو، شمارہ۔۴، جولائی ۱۹۸۳ء

۲۲ ماہِ نو، لاہور، شمارہ۔۲، ۲۰۰۷ء

۲۳۔ مجلّہ، کراچی، شمارہ۔۱۸، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء

۲۴ مجلّہ، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۱ء

۲۵۔ مہذب، لکھنو، شمارہ ۴، اگست ۱۸۹۰ء

۲۶ مہذب، لکھنو، اکتوبر ۱۸۹۰ء

۲۷ نقوش لاہور، شخصیات نمبر، ۱۹۵۵ء

۲۸ نقوش، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء

۲۹۔ نقوش، لاہور، خطوط نمبر، شمارہ۔۷۹۔۸۰، ۱۹۶۰ء

۳۰۔ نقوش، لاہور، آپ بیتی نمبر، شمارہ۔۱۰۰، ۱۹۶۵ء

۳۱۔ نقوش، لاہور، خطوط نمبر ا، شمارہ۔۱۰۹، اپریل مئی ۱۹۶۸ء

۳۲۔ نقوش، لاہور، رسول نمبر، جلد ا۔ دسمبر ۱۹۸۲ء

۳۳۔ نقوش، لاہور، افسانہ نمبر، ۱۹۸۲ء

۳۴۔ نقوش، لاہور، شمارہ۔۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء

۳۵۔ نقوش، لاہور، شمارہ۔۲، ستمبر دسمبر ۱۹۹۲ء

۳۶۔ نقوش، لاہور، آپ بیتی نمبر، س۔ن

۳۷۔ نگار، پاکستان، ۱۹۶۶ء

۳۸۔ نگار، کراچی، اصناف نمبر، ۱۹۶۶ء

۳۹۔ نوادر، لاہور، شمارہ ۱۶۔۱۷، جنوری تا اپریل ۲۰۰۶ء

۴۰۔ نئی تحریریں، لاہور، ستمبر ۱۹۵۴ء

مقالات

۱۔ محمد صالح طاہر، تحقیقی مقالہ، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کی ادبی خدمات، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل، کالج لاہور، ۱۹۹۸ء

انسائیکلوپیڈیا

۱۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء

۳۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا، جلد اوّل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

اردو لغات

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مرتب، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۵ء

۳۔ ارشاد احمد، اردو پنجابی لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء

۴۔ اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی (مرتبین) فرہنگ اصطلاحات اردو، سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۵ء

۵۔ انوار الحق، سید، اردو پشتو لغت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء

۶۔ جامع اللغات فارسی اردو، اورینٹل بک سوسائٹی، لاہور، س ن

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

۸۔ چھٹا خان مری عطا شاد، اردو بلوچی لغت، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۴ء

۹۔ حامد لطیف چشتی، سید، قائد اللغات، حامد اینڈ کمپنی، لاہور، س ن

۱۰۔ خلیل الرحمٰن نعمانی، مولانا، اردو عربی المعجم، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۸ء

۱۱۔ راجہ رام کمار پریس وارث، لغات کشوری، منشی نول کشور، لکھنو، س ن

۱۲۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل، لاہور، س ن

۱۳۔ سید احمد دہلوی، لغات النساء، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۴۔ شمس بریلوی، لغات سعدی، ایم سعید کمپنی، کراچی، س ن

۱۵۔ عبدالحمید، خواجہ، جامع اللغات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۶۔ عبداللہ خان، ڈاکٹر، لغات نظامی اردو، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۷۔ محمد رفیع، مولانا محمد وکیل مولانا، (مولفین)، جامع اللغات اردو، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۰ء

۱۸۔ محمد علی الفاروقی تھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون، بنگال ایشیا بک سوسائٹی، س ن

۱۹۔ مرتبین ندارد، جامع اللغات، اورینٹل بک سوسائٹی، لاہور، س ن

۲۰۔ مرتبین ندارد، جدید اردو لغات، اورینٹل بک سوسائٹی، لاہور، س ن

۲۱۔ نسیم امروہوی، فرہنگ اقبال، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء

۲۲۔ نورالحسن نیر، مولوی، نوراللغات، جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۵۷ء

۲۳۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۰ء

English Dictionaries/Encyclopedia

1. A Dictionary of Literary Terms , Kitab Mahal Lahore، Pakistan.

2. Cassell's New French-English, English-French Dictionry, Denis Wrard, Cassell & 2Co. Ltd., 1964, Fifth Edition 1964

3. Chambers Concise 20th Century Dictionary G.W David M.A Sention, Allied Publishers Limited. New Delhi Bombay, 1991

4. Chambers Concise Usage Dictionary, M.A Sention, W&R Chembers Ltd, Edinburgh, 1992.

5. Chambers English Student's Dictionary, Sandra Anderson Kay Culler, W&R Chambers Ltd Edinburgh, 1996

6. Chambers Everyday Paper Back Dictionary, A.M Macdonald and E.M Kirkpatrick (Revised Edition) W&R Chambers Ltd Edinburgh, 1984

7. Encyclopedia America, Danury, International Edition, Crolier Incoporated, 1986

8. English to English and Urdu Dictionary, Ferozsons Limited, Lahore.

9. Funk & Wachalls Standard Dictionary, Lippincott & Crowell Publishers, 1980.

10. New Websters Dictionary of the English Language, (Deluxe Encyclopedic Edition) by Harry E. Clarke, Lucinda R. Summers, The Delair Publishing company, 1984

11. Reader's Digest Great Illustrated Dictionary , Dr Robert Ilson by the Reader's Digest Acsociation Limited London, New York, 1918

12. The American Heritage Dicitonary, No- Editor, Houghton Mifflin Company Boston (Second College Edition), 1982

13. The Chambers Dicitonary, Catherine Schwarz,Chambers Harrap Publishers Ltd, Britain, 1993

14. The Concise English-Persian Dictionary, Abbas Aryanpur Kashan and Manouchehr Aryanpur Kashani, Amir Kabir Publishing Corp Tehran Iran, April 1981.

15. The Concise Heritage Dictionary, Houghton Mifflin Company, Boston,1976

16. The Concise Oxford Dicitonary of Current English, R.E Allen, Oxford University Press, 1990

17. The New Book of knowledge, Edited by Bernasel.S. Cuyne. Danbury: Crolier Incorporated, 1983.

18. The New Oxford Encyclopedia Dictionary, J Coulson, Sy ney, Oxford University, Press and Buy Books, Pvt, Ltd, 1983,

19. The Oxford Illustrated Dictionary, Helen Mary Petter,Second Edition, Oxford University press, 1975

20. The Oxford Illustrated Dictionary, J. Coulson, C.T Carr, Oxford Universtiy Press, (Second Edition) 1978

21. The Oxford Reference Dictionary, Joycem Hawkins, The oxford University Press, 1989.

22. The Pengunm Dictionary of Literary Terms and Literature, J.A Cuddon (Third Edition) England by Clays Ltd, Steves Plc, 1992

23. Webster's New World Dictionary of the American Language, David B-Guralnik, Modern Desk Edition, The World Publishing Co and Willian Collins, Inc. 1979